

معالم القرائت

جلد ششم

محمد علی الصیقلی کاندھلوی

علم و کتاب و انس ایپ گروپ

نام	معالم القرآن
موضوع	تشریح و تفسیر
ہکیت	ادارہ تعلیمات قرآن، سیالکوٹ
مکلف	حضرت مولانا الحاج محمد علی صاحب الصدیقی اسکاتہ صلی
حناوین	۳۸۸
آیات	۱۱۱
طابع	محمد اسلم قریشی
ترتیب و آرائش	سید محمد زور حسین لغیس رقم لاہور
کتابت	محمد حمد صوفی، گوجرانوالہ
نشر	قاری عبدالرحمان، ایم۔ اے
صفحات	۳۶
تاریخ اشاعت	شوال الحکم ۱۳۹۰ھ مطابق اکتوبر ۱۹۷۱ء
مطبع	

قیمت . ۱۵۰ روپے

منشی کاپتہ۔ دارالعلوم اشقاہیہ، رنگ پورہ روڈ، سیالکوٹ، پاکستان

دریابہ حجاب اندر

۴۰	وحدت ادیان کا غلط تصور	۱۱	انتساب
۴۱	یہودیوں پر فرد قرار اور ہر اقم	۱۲	حرف افاز
۴۲	سب سے بڑی دہر کشی کی سنگین سزا	۱۶	مقدمہ
۴۳	یہود کے مطالبہ اور حضرت موسیٰ کے شوق میں فرق	۱۹	پانچ ششتم ایک منظر میں
۴۴	گرسلا پرستی کا بڑھرم	۲۹	قرآنی اصطلاحات
۴۵	ارتداد کی سزا	۳۹	قانون ازالہ عیقت عرفی
۴۶	کوہ طور کے سلسلے میں عہد	۴۹	جماعتی زندگی کا ایک اہم مسئلہ
۴۷	فاستنا سرشاریاں اور ان کا علاج	۵۰	اللہ کرپسند نہیں کا مطلب
۴۸	نقص عہد کی ایک مثال	۵۱	بزرگانی سے بچنے کے مصالح
۴۹	یہودیوں سے عیقت کی کہانی	۵۳	اخلاق اور محبت الہی
۵۰	نقص عہد کی پاداش	۵۴	بزرگانی علانیہ اور پوشیدہ دونوں حرام ہیں
۵۱	افہارہ بیکر یا اظہار معذرت	۵۶	فضائل اخلاق کی ترغیب
۵۲	یہود کے دیگر سنگین جرائم	۵۷	قانون اور اخلاق کی مجموعی تعلیم
۵۳	حضرت مسیح ز منتول میں مذموم	۶۰	ایک نیکو کا انکار بھی کفر ہے
۵۴	قتل و صلب کی غلط توجیہ	۶۲	احکام دین، تعزیم کی حرمت
۵۵	وہم کا ازالہ	۶۵	سنگین فیصلہ اور اس کی وجہ
۵۶	تاریخ کی روشنی میں اشتباہ کی نوعیت	۶۶	کافروں کے لیے اخروی سزا
۵۷	چند شبہات اور ان کا ازالہ	۶۷	قانون میں معتبر ایمان

۱۵۸	قرآن میں سب نبیوں کا ذکر نہیں ہے	۱۰۳	ایک بار غلط
۱۶۰	نبوت کا معنی	۱۰۵	قرآن میں صلب مسیح کی نہایت
۱۶۲	نبوت کی غرض و غایت	۱۰۷	حضرت مسیح کے بارے میں اختلاف
۱۶۳	قرآنی وحی خاص علوم میں ممتاز ہے	۱۱۲	حیات عیسیٰ علیہ السلام کی پہلی دلیل
۱۶۶	ہدایت کا معیار	۱۱۶	رفع سے عزت کی موت مراد نہیں
۱۶۸	کافروں کی مجازات اور مکافات عمل	۱۱۸	کٹائی اور مجازسی معنی میں فرق
۱۶۹	عالمگیر اور دائمی نبوت	۱۱۹	حیات عیسیٰ علیہ السلام کی دوسری دلیل
۱۶۹	اہل کتاب یعنی عیسائیوں کا ظہور	۱۱۹	ایک غلطی کا ازالہ
۱۸۹	اللہ کے دین میں فساد کا دروازہ	۱۲۳	اہل ذریعہ کے لیے تازیانہ
۱۸۱	مہم کے بیٹے اور خدا کے رسول ہیں	۱۲۸	فضائل و ردائل کا تاجلی مطالعہ
۱۸۲	حضرت عیسیٰ کی اعجازی ولادت	۱۳۲	اللہ کی راہ سے رگنا اور روکنا
۱۸۵	حضرت مسیح کلمۃ اللہ ہیں	۱۳۳	اسلامی غیرت کا زوال
۱۸۹	حضرت عیسیٰ روح من اللہ ہیں	۱۳۵	یہودی رکاوٹ دہم ہرنگ نہیں ہے
۱۸۹	عیسائی مذہب میں خدا کا تصور	۱۳۵	یہود کو مسود کی ممانعت
۱۸۹	عقیدہ تثلیث	۱۳۸	لوگوں کے احوال کرنا جائز طور پر کرنا
۱۹۰	خواب پریشان	۱۳۸	آخری نماز
۱۹۲	حلول و تجسم کے عقیدہ کا بطلان	۱۳۹	اہل کتاب کے عقائد حتمی
۱۹۵	توحید الوہیت کا اعلان	۱۴۲	انبیاء میں حضور انور کا مقام
۱۹۹	عقیدہ انبیت پر ضرب کاری	۱۴۶	وحی اور اس کی عظمت
۲۰۱	اللہ کا بندہ ہونا شرف ہے	۱۴۹	وحی کی آواز
۲۰۲	خدا کی بندگی سے تنگ و حل	۱۴۸	وحی ذوالآیہ میں وحی کا مقام
۲۰۵	حضور انور کی جامعیت اور کاملیت	۱۴۹	وحی اور فکر جدید
۲۱۱	قرآن نور بین ہے	۱۵۱	وحی کی آمد کی کیفیت
۲۱۱	استیلاں توحید	۱۵۲	وحی کی شدت اور گہرائی
۲۱۲	صفات میں توحید	۱۵۳	حضور انور کی شہنجامیت

- ۲۵۲ دشمنی میں بھی انصاف کا دامن نہ چھوڑو۔
- ۲۵۵ نیکی میں سب کے شریک رہو۔
- ۲۵۶ اللہ کی نافرمانی سے بچو۔
- ۲۵۸ بر و تقویٰ اور اثم و حدود
- ۲۶۱ عمرات کی تفصیل
- ۲۶۴ فوج اور فوجانہ کی اسلامی اصطلاح
- ۲۶۵ سٹالوں پر مصیبت
- ۲۶۶ استقامت بالازام
- ۲۷۰ کفر سے معاشرتی انتطاع
- ۲۷۱ میرے سوا کسی سے ڈرو
- ۲۷۳ نیکی دین کا اعلان
- ۲۷۵ اکمال دین کے فطری تقاضے
- ۲۷۶ کمال دین اور ختم نبوت
- ۲۸۳ اتمام نعمت کیا ہے۔
- ۲۸۵ اسلام اللہ کا منظور کردہ دین ہے۔
- ۲۸۸ آیت پر مجموعی نظر
- ۲۸۹ اضطراب کی شرعی حد
- ۲۹۰ حرام کھانا واجب ہے یا رخصت
- ۲۹۲ تحلیل و تحریم کا ضابطہ عام
- ۲۹۴ سد حائے ہونے شکاری جانور کا شکار
- ۲۹۸ کسے کو شکار کی ترغیب
- ۳۰۰ شکاری جانور کو شکار پر چھوڑتے وقت بسم اللہ
- ۳۰۱ حدود اللہ کی یاد دہانی
- ۳۰۲ سب اچھی چیزیں حلال ہیں۔
- ۳۰۳ اہل کتاب کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے۔

- ۲۱۲ افعال میں توحید
- ۲۱۳ اللہ کی عبادت
- ۲۱۴ علم و عمل کی شاہراہ
- ۲۱۶ آیت کا زبردست ترجمہ
- ۲۱۹ میراث کا ایک ذیلی مسئلہ
- ۲۲۲ کلا لہ لغوی اور اصطلاحی تحقیق
- ۲۲۴ وارثوں میں ایسی بہن
- ۲۲۶ بھائی بہن کے سائے مال کا وارث
- ۲۲۷ کلا لہ لہ کی اگر دو بہنیں ہیں
- ۲۲۸ مرد و کرمات سے ڈگنا
- ۲۲۹ نزول قوانین کا مقصد
- ۲۳۰ مسرت سے کھانا
- ۲۳۳ زمانہ نزول سورہ مائدہ
- ۲۳۶ سورہ مائدہ کا موضوع
- ۲۳۹ معاشرتی زندگی اور تمدنی زندگی
- ۲۴۰ عقیدہ کا معنوی عموم
- ۲۴۱ چار پالیسی کی حلت
- ۲۴۲ تحلیل سے ایک استثناء
- ۲۴۳ حالت حرام میں شکار حرام ہے
- ۲۴۵ اللہ حاکم مطلق ہے
- ۲۵۰ اسلامی شاعر
- ۲۵۱ سویت وائے ہینوں کی بے ترمقی
- ۲۵۲ کعبہ کی نیاز اور قربانی
- ۲۵۳ طالب رضائے حق قابل احترام ہے
- ۲۵۴ احرام کوٹنے کے بعد شکار کی اجازت

- ۳۰۵ آیت میں طعام سے مراد
- ۳۰۶ کتابی عورت سے نکاح
- ۳۰۷ مسلمان کا کھانا لے لیا کیلئے جائز ہے
- ۳۰۸ شادی کا مقصد محنت ہے
- ۳۰۹ نکاح کا بنیادی مقصد عفاف ہے
- ۳۱۰ نکاح اسلام میں اخلاقی و روحانی باورہ ہے
- ۳۱۱ ایمان و کفر کا تقابلی مطالعہ
- ۳۱۲ حیدر عبودیت اور نماز کی اہمیت
- ۳۱۳ نماز کے لیے وضو کی فرضیت
- ۳۱۴ وضو میں پیروں کا دھونا
- ۳۱۵ اختلافِ قرآنہ کی تحقیق
- ۳۱۶ منظرِ مسجدِ نبوی کے معنی میں ہے
- ۳۱۷ ار حکمِ جوار کی وجہ سے مجبور ہے
- ۳۱۸ امام شافعی کی رائے
- ۳۱۹ مسجد علیٰ الغنیمین تاریخ کی روشنی میں
- ۳۲۰ فقر . . . کی شرط
- ۳۲۱ خفین میں مقامِ مسجد
- ۳۲۲ موزوں کے مسجد کی مدت
- ۳۲۳ اعمال و ضرر کا مسنون پیمانہ
- ۳۲۴ وضو میں نیت کرنا
- ۳۲۵ وضو کے آغاز میں بسم اللہ کرنا
- ۳۲۶ وضو میں مسواک
- ۳۲۷ حدیث اکبر یعنی غسلِ جنابت
- ۳۲۸ جنابت کی دو صورتیں۔
- ۳۲۹ پانی نہ ہو تو تھیم کافی ہے
- ۳۳۰ وضو کے نواقض
- ۳۳۱ سونا بھی وضو کو ٹوڑ دیتا ہے
- ۳۳۲ کیا عورت کو ہاتھ لگانا ناقضِ وضو ہے
- ۳۳۳ کیا شرمگاہ کو ہاتھ لگانے سے وضو ٹوٹتا ہے
- ۳۳۴ نزولِ شراعی کا مقصد
- ۳۳۵ معصی اور ظاہری طہارت
- ۳۳۶ روحانی و جسمانی طہارت
- ۳۳۷ اُمت کو فخر داریوں کی یاد دہانی
- ۳۳۸ اسلامی تصورِ تقویٰ کا آغاز
- ۳۳۹ میثاق کی اجتماعی و فمرداری
- ۳۴۰ راہِ عدل کی سب سے بڑی رکاوٹ
- ۳۴۱ عدل میں تقویٰ کی ضمانت ہے
- ۳۴۲ عدالتِ تقویٰ کا لازمی ذریعہ ہے
- ۳۴۳ تقویٰ کا منشا نفس کشی نہیں ہے
- ۳۴۴ اجتماعی و فمرداری کو پورا کرنے کے نتائج
- ۳۴۵ مخالفوں کی سازشوں کی پروا نہ کرو
- ۳۴۶ سادت و شقاوت کا معیار
- ۳۴۷ بنی اسرائیل کا سیاسی نظام
- ۳۴۸ اللہ کی معیت اور اس کا مقام
- ۳۴۹ میثاق کی تیسری دفعہ ایمان بالرسول
- ۳۵۰ اللہ کے رسولوں کی مدد
- ۳۵۱ اللہ کو قرضِ حسن
- ۳۵۲ نیکیاں برائیوں کو طہا میٹ کر دیتی ہیں
- ۳۵۳ کفر شاپہ مشیق سے جنگ جاتا ہے۔

- ۴۲۸ یہود و نصاریٰ کو قرآن کی تنبیہ
- ۴۲۹ زمانہ فرست
- ۴۳۰ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام
- ۴۳۱ اہل کتاب کو تنبیہ
- ۴۳۲ اسرائیل تاریخ کے ایک واقعہ سے استشہاد
- ۴۳۳ انبیاء کا مشن اور اقتدار
- ۴۳۴ ایک تفسیری نکتہ
- ۴۳۵ ایک اہم سوال اور اس کا جواب
- ۴۳۶ جہاد کے لیے حضرت موسیٰ کی تقریر
- ۴۳۷ جہاد سے گریز پائی
- ۴۳۸ ایمانی قوت کا فیصلہ
- ۴۳۹ نبوت کے متعلق میں بنی اسرائیل کا قہر
- ۴۴۰ حضرت موسیٰ کی دعا
- ۴۴۱ بنی اسرائیل کو صحرانوردی کی نیند
- ۴۴۲ بنی اسرائیل اور امت محمدیہ
- ۴۴۳ حسد کے لیے واقعاتی تشیل
- ۴۴۴ ہمارے کئی روایات میں اعتیلا
- ۴۴۵ بائبل و تائیل کی قربانی
- ۴۴۶ مدار قبولیت صرف تقویٰ ہے
- ۴۴۷ بائبل کا عظیم کردار
- ۴۴۸ بزرگوار پہل کرنے کا طے ہے
- ۴۴۹ قتل مومن کا انجام تباہ کاری ہے
- ۴۵۰ زمین میں مرنے کو دفن کرنے کی تعلیم
- ۴۵۱ قانون قصاص کی حکمت و عظمت
- ۴۵۲ انسانی جان کی حفاظت

- ۳۸۱ میثاق سے گریز پائی اور غداری
- ۳۸۵ کلام الہی میں تحریف
- ۳۸۶ تورات کے متعلق قرآن کا تاریخی انکشاف
- ۳۸۷ یہودیوں کی زندگی میں گمراہی ہے
- ۳۸۸ عہد و ذکر حسن کاری ہے
- ۳۸۹ عیسائی نصاریٰ ہونے کے مدعی ہیں
- ۳۹۰ نصاریٰ سے میثاق
- ۳۹۱ انجیل میں تحریف کا آغاز
- ۳۹۲ انجیل اور بعد کی تاریخی حقیقت
- ۳۹۳ عیسائیوں کا باہم بغض و عناد
- ۳۹۴ اہل کتاب کے لیے علم و بصیرت کی روشنی
- ۳۹۵ انبیاء کا رسول یہود کی کچھ چوہیاں کھولتا ہے
- ۳۹۶ اسلام کی شان کمال
- ۳۹۷ حضور کے نور ہونے کی پہلی وجہ
- ۳۹۸ دوسری
- ۳۹۹ تیسری
- ۴۰۰ چوتھی
- ۴۰۱ نبوت کے علم و عمل کا مقصد
- ۴۰۲ توحید کے متعلق غلط فہمیاں
- ۴۰۳ اللہ کی قدرت کا ملولہ اختیار مطلق
- ۴۰۴ کائنات میں سلطانی اللہ کی ہے
- ۴۰۵ اہل کتاب کا نہایت یافتہ ہونے کا غرور
- ۴۰۶ یہودیوں کی تردید خود ان کی تاریخ سے
- ۴۰۷ قانون کی بالادستی
- ۴۰۸ جزا و سزا اللہ ہی کے اختیار میں ہے

۵۸	ہمد اور اس کی قسمیں	۲۹۳	سب پرانے
۵۰۹	امر بالمعروف اور نہی عن المنکر	۲۹۴	اشارہ قتل کا گناہ
۵۱۱	مصلحتِ جماد	۲۹۵	ہتھیاروں پر پابندی اور اس کی وجہ
۵۱۲	کفر کے لیے عذاب کا اشتداد	۲۹۶	خون کی اہمیت اسلام میں
۵۱۳	کفر کے لیے عذاب کا امتداد	۲۹۷	زمین میں فساد کی ممانعت
۵۱۴	اسلام میں ضابطہ دیوانی	۲۹۸	ایک کا قاتل سب کا قاتل ہے
۵۱۵	ہجرت کی تعریف	۲۹۹	قانون کی ذمہ داریاں ہر فرد پر ہیں
۵۱۶	ہجرت کا نصاب	۳۰۰	قانون اور اس کی یاد دہانی
۵۱۷	ہجرت کا ثبوت	۳۰۱	مدینہ کے یہود اور ان کا اسراف
۵۱۸	قانون اسلام میں مساوات	۳۰۲	قانون اور نظم کے لیے خطرہ
۵۱۹	ہجرت کی نرا میں رعایت	۳۰۳	عمار میں کی نرا
۵۲۰	رشتہ داروں کی ہجرت کی ہجرت	۳۰۴	عمار کی شریطیں
۵۲۱	کب کون سا عضو کا مہلت ہے	۳۰۵	جماد وطنی کا مفہوم
۵۲۲	دوبارہ ہجرت کی نرا	۳۰۶	قتل درہزنی سے پہلے گرفتاری
۵۲۳	ہجرت کے مفاسد	۳۰۷	نرا جماعتی حیثیت سے دی جائے گی
۵۲۴	ہجرت کی نرا کی حیثیت	۳۰۸	عداوت نفس میں فرق
۵۲۵	ہجرت کی قیمت اسلام میں	۳۰۹	رہزنیوں کی ناز جانہ نہیں ہے
۵۲۶	ہجرت میں ہجرت کیوں کٹا جاتا ہے	۳۱۰	حقوق اللہ و حقوق العباد
۵۲۷	عدالت کو نرا معاف کرنے کا حق نہیں	۳۱۱	گرفتاری سے پہلے توبہ
۵۲۸	ہجرت کی نرا میں رحم کی اپیل نہیں	۳۱۲	قانون کی سختی اور سنگینی
۵۲۹	قرآن کے قانون ہجرت کا قاتل ملاحہ	۳۱۳	حدود و جرمیں کو افر نہیں
۵۳۰	ہجرت کی ہجرت سے توبہ اور اصلاح	۳۱۴	اسلام کی سب بڑی ذمہ داری
۵۳۱	ایمان باللہ اور تصدیق سیاست	۳۱۵	وسیلہ کے لغوی معنی
۵۳۲	ایمان اور سیاست کی کش مکش	۳۱۶	جواز تو تسل کے دلائل
۵۳۳	مناہضین کا چہرہ	۳۱۷	موقوفہ دہانی کی قیمت تحقیق

۵۷۶ بیویوں کے کلام الہی میں تحریف
۵۷۷ غرض پوری ہو کر مازور نہ ہیں
۵۷۸ شہادت کا قانون
۵۷۹ شہادت کا آخری مرحلہ
۵۸۰ اسلامی حکومت میں جنسیوں کے مقدمات
۵۸۱ اہم مسئلہ کو اس کے فرائض کی یاد دہانی
۵۸۲ خیریت سے یہود کی گریز پائی
۵۸۳ کتب الہی کا چہرہ اور ان کی قانونی حیثیت
۵۸۴ قورات صرف یہودیوں کے لیے دستور تھا
۵۸۵ عہد الہی کی حفاظت کی ذمہ داری
۵۸۶ اعلانِ حق میں کسی کی پروا نہ کرو
۵۸۷ قصداً افتاء میں قانون الہی کی خلاف ورزی
۵۸۸ یہودیوں کا ضابطہ فوجداری
۵۸۹ معافی گنہگاروں کا کفارہ ہے
۵۹۰ قانونی اور اخلاقی تقاضا
۵۹۱ خدائی قانون کے خلاف لیصلہ کرنے سے ناواقف
۵۹۲ قورات کی تصدیق
۵۹۳ قرآن کی اہل اسبیل کو تنبیہ
۵۹۴ قرآن کا چہرہ
۵۹۵ اہمیت اسلامی کی ذمہ داری
۵۹۶ کیا یہ آیت منافی عصمت ہے؟
۵۹۷ ہر اہمیت کے لیے شرح اور منہاج
۵۹۸ وحدتِ دین اور قرآن
۵۹۹ اختلاف بشریت تقاضا کرتے محکم
۶۰۰ خیر میں پیش رفت مقصود خیریت ہے

۵۹۱ خیرات میں مسابقت کا قانون
۶۰۲ دامِ ہر گنگ زمین
۶۰۳ قانون الہی سے روگردانی کرنے والی کو دانت
۶۰۴ قانون الہی اور قانونِ وضعی کا تقابل
۶۰۵ یہود و نصاریٰ سے ترکِ مہالات
۶۰۶ آیات کا پس منظر
۶۰۷ یہود و نصاریٰ کا سیاسی گٹھ جوڑ
۶۰۸ دشمن کا دوست دشمن ہے
۶۰۹ منافقین کے دل کا چہرہ
۶۱۰ مستقبل میں ان کی خدمت کا سامان
۶۱۱ منافقین کی روش پر مہل ایمان کا تعجب
۶۱۲ اجماعِ قرآنی کا ایک نمونہ
۶۱۳ مستقبل میں غلبہ اسلام کی پیشین گوئی
۶۱۴ حادثہ اترداؤ کی تاریخ
۶۱۵ صحابہ خدا کے محبوب اور خدا ان کا محبوب
۶۱۶ ان کی خدا سے محبت
۶۱۷ ایمان کے سامنے بچے ہو اور کفر کے مقابلے
۶۱۸ میں تنہا ہوتے
۶۱۹ تصحیح اخلاق کا اسلامی طریقہ
۶۲۰ خدا کے لیے محبت اور ناراضی
۶۲۱ راہِ خدا میں جہاد
۶۲۲ اسلام کے لیے وہ بے باک ہیں
۶۲۳ واقعاتِ کردارِ دینی میں مصداقِ آیت
۶۲۴ اللہ کی بڑی مہربانی اور فضل
۶۲۵ مہالات کے لیے اہل ایمان کا میدان

۶۸۲	والی مصر	۶۳۸	انٹرکلی جاعت کو غلبہ ہوتا ہے
۶۸۳	حکم یامر	۶۴۵	اخلاقی اور دینی زندگی کا انحطاط
۶۸۴	حادث بن ابی شمر غسانی	۶۴۷	آؤن کا مذاق اڑانا عقل سے محرومی ہے
۶۸۵	مزید قاصد	۶۴۸	بکات آؤن کا روحانی اثر
۶۸۶	متفرق دعوت نامے	۶۴۹	یسود کی یاد دہانی کی وجہ
۶۸۸	تشیعوں کا عجیب استدلال	۶۵۱	یسود کی ملعونیت اور مفسدیت
۶۸۹	غدر بر طم کا خطبہ اور تسلط امامت	۶۵۳	یسودیوں کا سازشی گروہ
۶۹۰	آیت تبلیغ کے بارے میں کاعرب بد نقشہ	۶۵۴	یسودی عوام اخلاقی جرائم کے شوگر ہیں
۶۹۱	تصدیق نبوت محمدیہ کے بغیر ایمان نہیں ہے	۶۵۵	علاء الدین کا کردار
۶۹۲	نجات و سعادت کا قانون	۶۵۶	داستان شہادت کی ایک اور تصویر
۶۹۳	یسود نصاریٰ کا تاریخی نقشہ	۶۵۷	گستاخیوں کی پاداش میں لعنت
۶۹۴	گناہوں کے نتائج سے بچنے پر رہائی	۶۵۸	صفیات ہادی کیفہ دم سے بالا ہیں
۶۹۵	عقیدہ الوہیت مسیح کی تردید	۶۵۹	اللہ کا قانون انفاق
۶۹۶	تسمیۃ الایمان	۶۶۰	اسلام کی ترقی سے یہودی میں اضافہ
۶۹۷	توحید کے ساتھ شرک کا ذکر	۶۶۱	یسودی اور عیسائی میں ننگ پائی کا پرچہ
۶۹۸	عقیدہ تبلیغ کا گھر ودا	۶۶۲	اہل ایمان کو کسلی کہ یسود کا میٹہ ہونے
۶۹۹	حضرت مسیح کا واقعی چہرہ	۶۶۳	اہل کتاب کو خاتم النبیین پر ایمان کی دعوت
۷۰۰	مسیح کے معبود نہ ہونے کی واضح ترین دلیل	۶۶۴	اہل کتاب کے ایمان کی آرزو
۷۰۱	عبادت صرف اللہ کا حق ہے	۶۶۵	میانہ رو اُمت
۷۰۲	عیسائیوں کی دو گرا بیایاں	۶۶۶	پوری دنیا کو اسلام کی دعوت
۷۰۳	عیسائیوں کی منکالت کا سرچشمہ	۶۶۷	سلاطین و روسا کو دعوت اسلام
۷۰۴	حضرت عیسیٰ اور داؤد نے لعنت بھیجا ہے	۶۶۸	سجاشی شام جبر کے نام مکتوب
۷۰۵	برائیوں سے باز آنے کا احساس نہ رہا	۶۶۹	قیصر روم کے نام والا نامہ
۷۰۶	یسود کی اخلاقی پستی کی انتہا	۶۷۰	خسرو پرویز شہنشاہ ایران کے نام
۷۰۷	ایمان و کفر میں تضاد ہے	۶۷۱	پرویز کی سیہ نصیبی

انتساب

میں تفسیرِ معالم القرآن کی چھٹی جلد کو جس میں اُمت کو دین کی تکمیل کی خوشخبری سنا کر رہتی دُنیا تک توامیت اور شہادت علی الناس کے منصبِ جلیل پر فائز کیا گیا ہے قابلِ صد احترام حافظ عبد الرشید خاں صاحب کے نام منسوب کرتا ہوں جن کی قرآن کی اشاعت میں ڈوبی ہوئی مخلصانہ مددِ یاری سے یہ جلد زیرِ طباعت سے آراستہ ہو رہی ہے۔

دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اس جذبِ خیر کو تادیر قائم رکھے اور ان کے لیے دُنیا اور آخرت میں کامیابی کا ذریعہ بنائے۔ آمین ثم آمین۔

قاری عبد الرحمن ایم۔ اے
ناظم ادارہ تعلیمات قرآن سیالکوٹ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

حرفِ آغاز

الحمد للہ وحدہ والسلام علی من لا نبی بعدہ ، اللہ سبحانہ کا بہت بڑا انعام ہے کہ معالم القرآن کی جلد ششم کی تکمیل کا سامان فرمایا۔ معالم القرآن کی پانچویں جلد شوال ۱۳۸۷ مطابق اکتوبر ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی۔ اب پورے چھ ماہ بعد اس کی جلد ششم آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ اس کی تالیف زیادہ تر سفر میں ہوئی ہے۔ گو جزائر اسکے الحاج عبدالغنی صاحب مالک المیوم الوطن شریع کویت کی دعوت پر کویت جانا پڑا۔ حاجی صاحب موصوف ہی کی فیکٹری میں صبح ۸ بجے سے ۱۲ بجے دوپہر تک تفسیر کا کام روزانہ معمول بن گیا۔ نومبر کے آغاز میں حاجی صاحب کے دوش ہمت پر سوار ہو کر اس جنگ پہنچنے کا ارادہ ہو گیا جہاں کی سرزمین پر نہ تو سبزہ کا فرش ہے اور نہ اس کی آغوش میں نہروں اور ندیوں کی ریل پیل ہے، اس کے چاروں طرف جلے ہوئے پہاڑ کھڑے پہرہ دیتے ہیں۔ لیکن بقول حنیف ہے

نہ اس میں گاس اگتی ہے نہ اس میں پھول کھلتے ہیں
مگر اس سرزمین سے اسکلن بھی جھک کے ملتے ہیں

اوائے کو عمل کا ہمارا پھانسنے کی ساری کوشش حاجی عبدالغنی کی مخلصانہ محنت کی رہیں منت ہے۔ خبر نہیں کہ لوگوں کو اس سلسلہ میں کتنے پاپڑ پلٹنے پڑتے ہیں مگر میں الحمد للہ ان سب جھیلوں سے بچے نیاز رہا۔ حاجی صاحب موصوف کی ہمت اور ریاض صاحب کی محنت سے تاریخ معرہ پر دستوں کے جلو میں جہاز پر سوار ہوا اور احباب کے پر خلوص نرغے میں جہہ پہنچ گیا۔ عزیز طارق کی محبت میں حرم پاک میں پہنچا۔ پچھلے بھی چار مرتبہ مجھے یہاں آنے کی سعادت نصیب ہوئی مگر اس بار میرا قلب عجیب کیفیات سے دوچار تھا۔ عمرہ کیا اور کچھ روز کے بعد حج کی سعادتوں سے ہمہ دوش

ہونے کا بھی موقع مل گیا۔ عرفات میں جب اس بار دعا کے لیے کھڑا ہوا تو یوں محسوس ہوا کہ ہاتھ اور پرجا ہے اور رحمت گنہگار بندوں کو پیار کر رہی ہے۔ اسی وقت میرے دل میں خیال آیا کہ ابھی
 کائنات انسانی میں اللہ کی عبادت کرنے والی مسلمانوں کے سوا کوئی قوم نہیں۔ اللہ اکبر کیا نسبت
 ہے دنیا کی قوموں کی رسوم عبادات کو اس عبادت سے جسے ہم حج کہتے ہیں کفن بڑوش ننگے سر ننگے
 بدن بال بڑے، چھوٹا، لالہ، لاکھوں انسان بلبلا رہے ہیں، آجیں بھر رہے ہیں۔ اس آہ و فغاں،
 کے شور میں جب نصایں یہ ترانے گونجتے ہیں بے لکھ لا الہ الا اللہ لا شریک لا شریک لا شریک
 اور لا الہ الا اللہ وحده لا شریک الا تو روح پروردگار کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اگر
 حج نہ ہوتا تو انسانیت کا اپنے مولیٰ سے عاشقانہ تعلقات کا نظور نہ ہوتا۔ اور پوری انسانیت سوز
 گداز، ذوق و شوق والی عبادت سے بیگانہ ہوتی۔ عرفات سے چل کر مزدلفہ پہنچے۔ رات گزاری،
 مزدلفہ سے منیٰ کی طرف پیدل مارچ کر دیا۔ منیٰ پہنچ کر مجھے سنا دیا گیا۔ قربانی کا کام الحاج نذیر احمد
 اور قادی عبدالرحمن نے اپنے ذمہ لے لیا۔ طواف کے لیے قادی صدیق مجھے حرم لے گئے۔ طواف
 اور سعی سے فراغت ہوئی، احرام کے پکڑے آٹھے میں بلکہ جنوں کی وادوں سے نکل کر فرزانگی میں
 آئے، پکڑے پہن کر پھر منیٰ روانہ ہو گئے۔ بخار زردوں پر تھا، مجھے تو علم نہیں مگر بتانے والے
 بتا رہے تھے کہ ۱۳۔ بخار ہے۔ الحمد للہ حج کے سانسے ارکان بیخ و ثریا پاتیکمیل کو پہنچے اور خوشی
 کی بات یہ ہے کہ بخار اور کمزوری کے باوجود کوئی نماز بھی بغیر جماعت کے نہیں پڑھی۔ ۱۳ کو مکہ
 میں واپسی ہوئی لیکن بخار اسی طرح رہا، وہاں سے یہ خیال کر کے جدہ گیا کہ تبدیل ہوا سے شاید بخار
 ہٹ جائے لیکن یہاں چند روز قیام میں طبیعت اور بگڑ گئی۔ یہاں احباب کی موجودگی سے اگرچہ
 دل باغ و بہار رہا لیکن کمزوری میں اضافہ ہو گیا۔ یہاں جن دوستوں کی اخلاص کیشی سے میں متاثر ہوا
 اور جو مجھے پوری زندگی دم بھونے کی ان میں قادی عبدالرحمن ایم اے، حاجی نذیر صاحب، حکیم محمد عبدالرحمن
 مولانا سعید احمد، حاجی محمد شیر، حاجی محمد نفیس اور برو فیہر عصمت اللہ اور محمد طارق صاحب خاص طور پر
 قابل ذکر ہیں۔ بالآخر ۲ نومبر کو کویت روانہ ہو گیا۔ عزیز عبدالرشید خاقان کے پاس فرادیر میں
 قیام کیا۔ الحمد للہ جاتے ہی دو روز کے بعد طبیعت سنبھل گئی اور بخار ختم ہو گیا۔ مکہ کے زمانہ قیام
 میں تفسیر کا کام بالکل بند رہا۔ کویت پہنچ کر پھر تفسیر کا کام شروع کیا۔ پورا دیکھ اور جنوری کی پسند
 تاریخ تک کام کیا۔ حج سے واپسی تو ہو گئی مگر نشاط کی کیفیت سے مرضی پر دل کڑھتا تھا۔ جی چاہتا
 تھا کہ بخار کی مڑھنتوں کے ہاتھوں مجبور ہو کر جو کام چھوڑ آیا ہوں پورا کروں اور شوق کے پردوں پر

آتا ہوا مدینہ منورہ کی طرف چلوں محبت اور وفا کی کشش مجھے مدینہ منورہ کی پہنچ رہی تھی۔ پھر جناب حاجی عبدالغنی کی دیوالی نے میری ہمت کے لیے ہمیشہ کا کام کیا۔ انہوں نے اپنی کار اور اپنے چھوٹے بھائی عبدالرحمن سلمہ کو اس کے لیے تیار کر دیا۔ بالآخر ۱۲ صفر المظفر مطابق ۱۱ جمادی شہ صبح ۸ بجے مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ مدینہ منورہ مغرب، الخضر پہنچا۔ یہاں ملک عباس حسین اور عزیزاں قادی محمد صدیق، اسرار نور شید اور بابر مصطفیٰ بٹ پہلے سے چشم براہ تھے۔ رات کو قیام کیا اور صبح ۸ بجے وہاں سے روانہ ہو کر رات کو ۹ بجے الریاض پہنچا، یہاں محمد رفیق صاحب کو انتظار تھا۔ رات کو میلان قیام کر کے صبح ۶ بجے مدینہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ ظہر کی نماز بریدہ میں پڑھی۔ نماز سے فارغ ہو کر شوق مدینہ نے سفر کو جاری رکھنے پر مجبور کر دیا۔ جب میں مدینہ منورہ زاد ہا اللہ شرفا پہنچا رات کے دس بجے چکے تھے۔ حرم نبوی بند ہو چکا تھا۔ فندق الزہراء میں قیام کیا۔ صبح ۳ بجے بیدار ہو کر اپنی حاجات ضروریہ وضو اور چائے سے فارغ ہوئی ہوا تھا کہ حرم سے آذان تہجد کی آواز بلند ہوئی فوراً حرم پہنچا۔ سب سے پہلے مسجد نبوی میں دو رکعت نماز ادا کی اور سادات کے نصیب ہوئے پر اللہ کا شکر ادا کیا۔ پھر بارگاہ نبوت میں حاضر ہوا۔ آپ پر درود و سلام پیش کیا اور گواہی دی کہ بے شک آپ نے اللہ کا پیغام کا حق پہنچا دیا۔ درود و سلام سے فارغ ہو کر ریاض الجنۃ میں آیا۔ بیڑی کا حصہ حضور انور کی خواب گاہ اور منبر کے درمیان چھوٹا سا قطعہ ہے۔ جہاں انوار و رحمت برستے ہیں اور جہاں سے اسلام کے جان نثاروں کی یادیں وابستہ ہیں۔ نماز تہجد ادا کی۔ صبح کی نماز سے فارغ ہو کر قبا گیا۔ قبا کی مسجد میں دو رکعت نماز پڑھی۔ عصر کی نماز کے بعد جنت البقیع کی طرف گیا۔ یہاں سے فارغ ہو کر اُحد گیا۔ یہی میدان ہے جہاں ایمان و یقین اپنی اصلی صورت میں نظر آیا۔ نماز عشاء کے بعد حضرت شیخ الحدیث جناب مولانا محمد زکریا صاحب کی زیارت کی۔ حضرت شیخ نے کلمے کی دعوت دی، دوسرے روز ان کے یہاں کمانے میں شریک ہوا۔ جمعرات کے روز صبح قیام گاہ میں غسل کر کے احرام کے لباس میں طبوس ہو کر مکہ کے لیے تیار ہو گیا۔ ۸ بجے مدینہ سے مکہ کی طرف روانگی ہو گئی۔ راستہ میں شہدائے بدر کی زیارت کی اور بالآخر بعد نماز عصر مکہ میں پہنچا۔ عمرہ ادا کیا یعنی بیت اللہ کا طواف کیا۔ سعی بین الصفا والمردہ کی۔ عمرہ ادا کرنے کے بعد جناب فضل حق صاحب کے یہاں قیام کیا۔ یہ باغ و بہار شخصیت ہیں۔ ہر بار پر تپاک خیر مقدم پر اصرار ان کی طبیعت کا تقاضا ہی تھی تھی۔ اس سفر میں الحمد للہ تفسیر کا کام جاری رہا۔ جہاں بھی قیام کیا۔ کچھ نہ کچھ کام ضرور کیا۔ اس بار مکہ کے قیام میں جن اصحاب کے صدق و صفا اور مہر و وفا سے سابقہ پڑا ہے ان میں جناب الحاج

فضل حق صاحب مالک فضل میڈیکل سٹور کے علاوہ جناب پرو فیئر عصمت اللہ صاحب، جناب الحاج عزت اللہ صاحب، جناب الحاج محمد طارق صاحب، جناب الحاج مولانا محمد سعید صاحب، جناب الحاج محمد بشیر صاحب، جناب الحاج محمد نفیس صاحب، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ۳۱ جنوری کو مکہ سے واپس ہو کر طائف، ارنہی، الریاض ہوتا ہوا الحجر پہنچا۔ الحجر میں دو روز قیام کے دوران ملک عباس حسین صاحب کے اصرار سے دو تبلیغی اجتماعات سے خطابات کا موقع ملا۔ جمعہ کے روز نماز کے بعد ملک صاحب موصوف قادری محمد صدیق، بابر مصطفیٰ بٹ اور ماسٹر محمد انور سے نشست ہو کر رات کے ۹ بجے کریت پہنچ گیا۔ کریت میں اگر مراقب میں جناب الحاج محمد ایاس صاحب کے مکان پر قیام کیا اور وہیں تفسیر کا کام کیا۔ میں مولانا احمد احسان خلیب مسجد کارپوریشن کویت کا بے حد مشکور ہوں کہ انہوں نے تفسیر کے کام میں مجھ سے کتابی تعاون کیا اور تفسیر کی ۲۰ کتابیں مجھے عاید دیں۔

فجراہم اللہ عنی خیر الجبار۔۔۔
الحمد للہ یہ طویل سفر تفسیر کے کام پر اثر انداز نہیں ہوا۔ ۲۸ فروری کو کریت سے چل کر سیالکوٹ پہنچا اور باقی کام پورا کیا۔

اس جلد میں مجھے جن علمی گہواروں سے مزید استفادہ کرنے کا موقع ملا ہے ان کے نام یہ ہیں:

- ۱۔ محاسن التاویل علامہ اشام محمد جمال الدین القاسمی۔
- ۲۔ تبشیر دلائل النبوة قاضی عبدالجبار بن احمد الہمدانی ۱۵ھ
- ۳۔ المجموع شرح المہذب للامام النووی
- ۴۔ الجواب المصیح للامام الحافظ ابن تیمیہ
- ۵۔ ہدایا الجیاری للامام الحافظ ابن الیقیم
- ۶۔ اعلاء السنن للشیخ الحدیث ظفر احمد عثمانی
- ۷۔ ازالۃ الخفاء للشیخ الامام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی
- ۸۔ شہادۃ القرآن حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹی
- ۹۔ کلمۃ اللہ فی حیۃ روح اللہ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی
- ۱۰۔ ازالۃ الشکوک مولانا رحمت اللہ صاحب مکی۔
- ۱۱۔ اظہار الحق " " "
- ۱۲۔ عقیدۃ الاسلام مولانا سید انور شاہ کشمیری

مقدمہ

الحمد لله رب العالمین، والسلام علی من بعث الی الناس کافۃً، معالم القرآن کی جلد ششم پیش خدمت ہے، قرآن کے معجزات امتیازات کی کوئی حد نہیں ہے اور ان میں سے ایک یہ ہے جس طرح یہ ماضی میں دنیا کی بڑی طاقتوں کے لیے ایک چیلنج بن کر آیا تھا جیسا کہ علامہ عبدالجبار ہمدانی نے بتایا ہے کہ حضور الفخر صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود و نصاریٰ کو اس قرآن کے ذریعے تنہا ہوتے ہوئے غلط فہم کر دیا، غلط اخلاق، غلط معیشت، غلط سیاست پر ہونے کا چیلنج کیا اور اعلان کیا کہ جو نظام میں لے کر آیا ہوں یہی حق ہے اور یہی غالب ہو کر رہے گا، اس کے مقابلے میں سامنے نظام پاش پاش ہو جاتے ہیں۔

مشیک اسی طرح جیسا کہ حضرت علی مرتضیٰ نے بتایا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے مستقبل کو سامنے رکھ کر قرآن کا یہ چہرہ پیش کیا ہے کہ :

اگاہ ہو جاؤ ایک بڑا لغز آنے والا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ اس فتنے سے بچنے اور سنہات پانے کا ذریعہ کیا ہے۔ فرمایا کتاب اللہ، اس میں تم سے پہلی امتوں کے واقعات ہیں اور تمہارے بعد کی اس میں اطلاعات ہیں اور تمہارے درمیان جو مسائل پیدا ہوں قرآن میں ان کا حکم اور فیصلہ ہے۔ وہ قول فیصل ہے، وہ فضول بات اور یاد گوئی نہیں ہے۔ جو کوئی جاہر و سرکش اسے چھوڑے گا اللہ تعالیٰ اسے توڑ کر دکھائے گا اور جو کوئی ہدایت کو اس کے بغیر تلاش کرے گا اس کے حصہ میں اللہ کی طرف سے گمراہی آئے گی۔ قرآن ہی جبل اللہ المتین اور مضبوط نصیحت نامہ ہے اور یہی صراطِ مستقیم ہے۔ وہی وہ حق میں ہے جس کے اتباع سے خیالدار کیجیے

محفوظ رہتے ہیں اور زبانیں اس میں گڑبڑ نہیں کر سکتی ہیں۔ اور علم والے کبھی اس کے علم سے سیر نہیں ہوں گے اور وہ کثرت مزاولت سے کبھی پرانا نہ ہو گا اور اس کے عجائب کبھی ختم نہ ہوں گے اور تو اور اسے سن کر تو جنوں کو ایمان لانا پڑا، جس نے قرآن کے موافق بات کہی اس نے سچی بات کہی اور جس نے قرآن پر حمل کیا وہ مستحقِ اجر و ثواب ہوا اور جس نے قرآن کے موافق فیصلہ کیا اس نے عدل و انصاف کیا اور جس نے قرآن کی دعوت دی اس کو صراطِ مستقیم کی ہدایت نصیب ہو گئی۔

(جامع ترمذی، مسند دارمی)

اس کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ قرآن کی تعلیمات عملاً صاف و واضح اور متعین ہیں۔ اور زمانہ با بعد میں انسانی تحریکات کی آمیزش اور تصرفات سے پاک ہیں اور اس کا اس طرح ہونا اس لیے ضروری تھا کہ اس پر نوع انسانی کی الہامی تعلیم کے درس کا خاتمہ ہو اسے۔ اسی لیے قرآن خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا علمی معجزہ ہے۔ سائے اختلافات کے باوجود اس پر امت میں کبھی دو رائے نہیں ہوئی ہیں کہ قرآن نے اہل عرب کی عام شاہراہ سے ہٹ کر اپنا انداز بیان الگ اختیار کیا یہ طرزِ بدیع اور اسلوبِ عجیب عرب میں موجود نہ تھا۔ ان کے کلام کا تمام تر نمونہ شعر اور نثر تھا۔ شعرا شعر کے ذریعے اپنے تاثرات ظاہر کرتے جبکہ خطباء نثر کو اظہارِ جذبات کا ذریعہ بناتے۔ قرآن نے دونوں راہوں سے ہٹ کر منظم و نثر کے درمیان ایک ایسا پسندیدہ اسلوب اختیار کیا جو بلغائے عرب کے تشکیل میں بھی نہ تھا۔ قرآن کے مطالع و مقاطع اور فواصل حد اعجاز کا شاہکار ہیں۔

یہاں سے یہ نکتہ بھی حل ہو جاتا ہے کہ قرآن حکیم اپنی تعلیمات اور معانی کے ساتھ اپنے الفاظ، کلمات اور تعبیریں بھی معجزہ ہے۔ اور اس کی فصاحت و بلاغت کے معجزانہ کمال کی دوسری آسمانی کتابیں حریف نہیں ہیں کیونکہ دوسری آسمانی کتابیں اگر وحی ہیں تو اپنے الفاظ کے لحاظ سے نہیں بلکہ اپنے معنی کے لحاظ سے وحی ہیں۔

تو خود ان کتابوں کو اور زبان کے ماننے والوں کو اس کا دعویٰ ہے اور نہ کبھی انہوں نے اپنی کتابوں کو کلام و عبارت کے لحاظ سے معجزہ کہا ہے چنانچہ اسی لیے وہ اصل الفاظ اور زبان جس کے قالب میں وحی موسوی تورات اور وحی عیسوی انجیل نے ظہور کیا مدت ہوئی کہ دنیا ان سے محروم ہو گئی۔ تورات کی زبان عبرانی کو حضرت موسیٰ کی زبان سے نکلی تھی بخت نصر کی آگ کھا گئی اور آرامی کی زبان کا قالب اختیار کر لیا اور آخر صد ہا سال بعد حضرت عزیر نے پھر اس کو عبرانی زبان میں منتقل کیا۔ اور انجیل کے متعلق ابھی تک یہ طے نہیں ہوا کہ اس

کی اصل زبان کیا تھی اور انجیل پہلے پہل کس زبان میں لکھی گئی تھی۔ انجیل کی سب سے قدیم زبان یونانی ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ وہ زبان نہیں ہے جو حضرت عیسیٰٰ علیہ السلام میں بولتے تھے۔ ایسی حالت میں ان کتابوں کی نصاحت و بلاغت کے اہماز اور ان کے الفاظ کے خدائی الفاظ ہونے کا دعویٰ کیوں کر ہو سکتا ہے۔ برخلاف اس کے دنیا میں وحی محمدی یعنی قرآن سب سے پہلی اور آخری وحی ہے جس نے اس حیثیت سے اہماز کا دعویٰ کیا چنانچہ قرآن حکیم کا حرف اور لفظ لفظ وحی ہے اور وہی ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ادا ہوا اور وہ ہر قسم کی تغیر و تسمیعات سے پاک ہے اس لیے اس کا شائبہ اس کی تعبیر اس کے کلمات اس کے الفاظ تک معجزہ ہیں اور اس وصف میں دنیا کی کوئی کتاب آسمانی اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی ہے۔ بتانا صرف یہ چاہتا ہوں کہ یہ خود دائمی ہے اس کے افکار و نظریات دائمی ہیں۔ اور جس مدلول کی اس عالم میں یہ دلیل بن کر آیا وہ دائمی ہے یعنی رسالت محمدیہ علی صاحبہا السلام اپنے لیے تو یہی کافی ہے اور یہ بھی اللہ کا خاص انعام ہے کہ اس کی کچھ خدمت کر کے اپنے سیاہ اعمال نامہ کو دھونے کے لیے اب رحمت کے چند قطرے فراہم ہو جائیں۔

پارہ ششم ایک نظر میں

صفات الہی

۶۴	اللہ جیسے چاہتا ہے خرچ کرتا ہے
۴۴، ۳۹، ۳۴، ۳۳	اللہ کی ذات سرپا رحمت ہے
۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱	حساب لینا، جزا دینا اور انتقام لینا اللہ کا کام ہے
۱۶	اللہ ہی جیسے چاہتا ہے پیدا کرتا ہے
۱۶۰، ۱۵۹، ۱۵۸، ۱۵۷، ۱۵۶، ۱۵۵، ۱۵۴، ۱۵۳، ۱۵۲، ۱۵۱، ۱۵۰، ۱۴۹، ۱۴۸، ۱۴۷، ۱۴۶، ۱۴۵، ۱۴۴، ۱۴۳، ۱۴۲، ۱۴۱، ۱۴۰، ۱۳۹، ۱۳۸، ۱۳۷، ۱۳۶، ۱۳۵، ۱۳۴، ۱۳۳، ۱۳۲، ۱۳۱، ۱۳۰، ۱۲۹، ۱۲۸، ۱۲۷، ۱۲۶، ۱۲۵، ۱۲۴، ۱۲۳، ۱۲۲، ۱۲۱، ۱۲۰، ۱۱۹، ۱۱۸، ۱۱۷، ۱۱۶، ۱۱۵، ۱۱۴، ۱۱۳، ۱۱۲، ۱۱۱، ۱۱۰، ۱۰۹، ۱۰۸، ۱۰۷، ۱۰۶، ۱۰۵، ۱۰۴، ۱۰۳، ۱۰۲، ۱۰۱، ۱۰۰، ۹۹، ۹۸، ۹۷، ۹۶، ۹۵، ۹۴، ۹۳، ۹۲، ۹۱، ۹۰، ۸۹، ۸۸، ۸۷، ۸۶، ۸۵، ۸۴، ۸۳، ۸۲، ۸۱، ۸۰، ۷۹، ۷۸، ۷۷، ۷۶، ۷۵، ۷۴، ۷۳، ۷۲، ۷۱، ۷۰، ۶۹، ۶۸، ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۴، ۶۳، ۶۲، ۶۱، ۶۰، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، ۵۴، ۵۳، ۵۲، ۵۱، ۵۰، ۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱	اللہ کی ذات ہی علم و خبر کا خزانہ ہے
۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱	معاف کرنا اللہ کا کام ہے
۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱	قوت، قدرت، غلبہ اختیار اللہ کا ہے
۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱	حاکمیت و اقتدار اور بادشاہی اللہ کی ہے
۱۶۱	کار سازی اور وکالت اللہ کا کام ہے
۱۵۸، ۱۵۷، ۱۵۶، ۱۵۵، ۱۵۴، ۱۵۳، ۱۵۲، ۱۵۱، ۱۵۰، ۱۴۹، ۱۴۸، ۱۴۷، ۱۴۶، ۱۴۵، ۱۴۴، ۱۴۳، ۱۴۲، ۱۴۱، ۱۴۰، ۱۳۹، ۱۳۸، ۱۳۷، ۱۳۶، ۱۳۵، ۱۳۴، ۱۳۳، ۱۳۲، ۱۳۱، ۱۳۰، ۱۲۹، ۱۲۸، ۱۲۷، ۱۲۶، ۱۲۵، ۱۲۴، ۱۲۳، ۱۲۲، ۱۲۱، ۱۲۰، ۱۱۹، ۱۱۸، ۱۱۷، ۱۱۶، ۱۱۵، ۱۱۴، ۱۱۳، ۱۱۲، ۱۱۱، ۱۱۰، ۱۰۹، ۱۰۸، ۱۰۷، ۱۰۶، ۱۰۵، ۱۰۴، ۱۰۳، ۱۰۲، ۱۰۱، ۱۰۰، ۹۹، ۹۸، ۹۷، ۹۶، ۹۵، ۹۴، ۹۳، ۹۲، ۹۱، ۹۰، ۸۹، ۸۸، ۸۷، ۸۶، ۸۵، ۸۴، ۸۳، ۸۲، ۸۱، ۸۰، ۷۹، ۷۸، ۷۷، ۷۶، ۷۵، ۷۴، ۷۳، ۷۲، ۷۱، ۷۰، ۶۹، ۶۸، ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۴، ۶۳، ۶۲، ۶۱، ۶۰، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، ۵۴، ۵۳، ۵۲، ۵۱، ۵۰، ۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱	اللہ کی ذات حکمت و دانائی والی ہے
۴۱	اللہ کی ذات ہی اعمال کی نگرانی ہے
۵۴	اللہ کی ذات و مستور والی ہے
۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱	اللہ سننے والا ہے
۱۵۸، ۱۵۷، ۱۵۶، ۱۵۵، ۱۵۴، ۱۵۳، ۱۵۲، ۱۵۱، ۱۵۰، ۱۴۹، ۱۴۸، ۱۴۷، ۱۴۶، ۱۴۵، ۱۴۴، ۱۴۳، ۱۴۲، ۱۴۱، ۱۴۰، ۱۳۹، ۱۳۸، ۱۳۷، ۱۳۶، ۱۳۵، ۱۳۴، ۱۳۳، ۱۳۲، ۱۳۱، ۱۳۰، ۱۲۹، ۱۲۸، ۱۲۷، ۱۲۶، ۱۲۵، ۱۲۴، ۱۲۳، ۱۲۲، ۱۲۱، ۱۲۰، ۱۱۹، ۱۱۸، ۱۱۷، ۱۱۶، ۱۱۵، ۱۱۴، ۱۱۳، ۱۱۲، ۱۱۱، ۱۱۰، ۱۰۹، ۱۰۸، ۱۰۷، ۱۰۶، ۱۰۵، ۱۰۴، ۱۰۳، ۱۰۲، ۱۰۱، ۱۰۰، ۹۹، ۹۸، ۹۷، ۹۶، ۹۵، ۹۴، ۹۳، ۹۲، ۹۱، ۹۰، ۸۹، ۸۸، ۸۷، ۸۶، ۸۵، ۸۴، ۸۳، ۸۲، ۸۱، ۸۰، ۷۹، ۷۸، ۷۷، ۷۶، ۷۵، ۷۴، ۷۳، ۷۲، ۷۱، ۷۰، ۶۹، ۶۸، ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۴، ۶۳، ۶۲، ۶۱، ۶۰، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، ۵۴، ۵۳، ۵۲، ۵۱، ۵۰، ۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱	ہر طرح کے امکان اختیار اللہ رکھتا ہے
۱۶۱	اللہ کی ذات تمام کمزوریوں سے پاک ہے

توحید الہیت و ربوبیت

- ۱۱ اہل ایمان کو اللہ پر توکل کرنا چاہیے
 ۶ عبادت کا مستحق وہی ہے جو نفع و نقصان کا مالک ہے
 ۷ یگانہ خدا کی عبادت
 ۸ توحید الہیت میں شرک کرنا جنت کو حرام کر دیتا ہے
 ۹ توحید الہیت میں شرک کا ذوق آنے پر عذاب الیم کی دھمکی
 ۱۰ اللہ کی بندگی کو عاریہ مجبنا اور تکبر کرنا دردناک سزا کا سامان ہے
 ۱۱ ہجوم مصائب میں اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیے
 ۱۲ توبہ قبول کرنا صرف اللہ کا کام ہے
 ۱۳ اللہ سے زیادہ بہتر فیصلہ کرنے والا کوئی نہیں ہے

رسالت و نبوت

- ۱۴ اسلام تمام نبیوں کا دین ہے
 ۱۵ نبوت کی بعثت کی غرض
 ۱۶ انبیاء میں تفریق کفر ہے
 ۱۷ سائے نبی اور قرآن
 ۱۸ انبیاء کی بعثت لوگوں پر اتمامِ حجت ہے
 ۱۹ نبوت سے یہود کا منہمک نہیں مطالبہ
 ۲۰ بعثت محمدی کے ذریعے اہل کتاب پر حجت
 ۲۱ حضرت عیسیٰ کی تواریک کے مصدق تھے
 ۲۲ حضرت عیسیٰ کے قتل کیے جانے اور صلیب دیے جانے کی تردید
 ۲۳ حضرت عیسیٰ کی موت سے پہلے عیسائیوں کا ایمان
 ۲۴ حضرت عیسیٰ کے بارے میں اہل کتاب کا غلو
 ۲۵ حضرت عیسیٰ کو لفظ اللہ نہیں

- حضرت عیسیٰ کو مسائیوں کا خدا قرار دینا ۱۶۱
 حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ کے کھانے کا ذکر ۷۵
 حضرت عیسیٰ اللہ کے رسول ہیں ۱۶۰، ۷۵
 حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ کی بشریت ۷۵
 حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی ۱۶۳
 آپ اپنے رب کی جانب سے حق لے کر آئے ۱۶۰
 آپ کے لیے اللہ کی جانب سے حفاظت کا وعدہ ۶۷
 حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی برطون ہیں ۱۶۴
 حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم انور مبین ہے ۱۵

دستوری قواعد

- قانون کی نظر میں نبوت پر ایمان اور اس کی طاعت ہر شہری پر ہے ۱۶۰
 اسلام کے قوانین نبوت کا لایا ہوا علم نور میں اور عمل برحان پر قائم ہیں ۱۶۴
 قانون کی اساس بر وقوعی پر تعادل ہے ۲
 اسلامی قانون کمال اور تمام کی خصوصیت کا حامل ہے ۳
 قانون کی نظر میں ہر شہری عدل کا حقدار ہے ۸
 اسلام، قانون جمود اور تنگ نگاہی سے بالا ہے ۶

صحابہ کا چہرہ

- دنیا کے انسانوں کے مقابلے میں صحابہ کا کامل ترین چہرہ ۵۴
 صحابہ اللہ کے محبوب اور محبوب ہیں ۵۴
 صحابہ کی لوری زندگی اللہ کے سامنے سرنگوں ہے۔ ۵۵
 دین خدا صحابہ کا دین ہے ۳
 صحابہ کرام اللہ کی پارٹی میں۔ ۵۶

اسلامی شعائر

- ۴ احرامِ شعائرِ اللہ میں سے ہے
۳ اشہر حرام کا احترام
۵۸ آذان کا تسبیح اور اس کی نقلیں آزارنا
۲ قربانی کے جانوروں پر دست اندازی
۲ بیت اللہ کے حاجی بھی قابلِ احترام ہیں
۱۶۲ اقامتِ صلوٰۃ اور ایما زکوٰۃ ایمان کی محسوس نشانیاں ہیں
۶ نماز کی ادائیگی کے لیے طہارت شرط ہے
۱۲ بنی اسرائیل کو نماز اور زکوٰۃ کی تاکید

اجتماعی قوانین

- ۱۵۲ صالح اجتماعیت کے لیے خدا کو اپنا واحد معبود ماننا اور تمام رسولوں پر ایمان لانا ضروری ہے
۱۵۵ غلط اور بری اجتماعی زندگی کا چہرہ یہودی زندگی میں
۱۶۲ اجتماعی زندگی میں فضا کی فراہمی اور ان کی نشاندہی
۱۶۶ رسولوں کی بعثت اجتماعی زندگی کی صلاح کے لیے ہوتی ہے
۱۶۶ اجتماعی زندگی میں بہت سے ملکر ہر نوع سے دور ہے
۱۶۸ اجتماعی زندگی میں بہت سے کفر اور باغیانہ زندگی اپنا کرتا ہے کہ راستہ پر ہے
اجتماعی زندگی کی کامیابی کا دارِ ایمان و عمل صالح ہے اور اس کا بگاڑ استنکاف اور
۱۴۳ استحکام میں ہے
۷۵ علم و عمل میں بہت سے دلچسپی اجتماعی زندگی کے لیے فضل و رحمت کا دروازہ کھولتی ہے
اسلام کی اجتماعی زندگی
۷ اجتماعی زندگی میں اللہ کے میثاق سے وفا داری کا مقام
۸ اہل ایمان کی اجتماعی ذمہ داری ہے کہ دنیا میں حق و عدل کے علمبردار بن کر رہیں
" اجتماعی زندگی کا سارا حسن افراد کے تقویٰ پر ہے

- اجتماعی زندگی جب اسلامی منظم پر قائم ہو جاتے اسے خراب کرنے کی سعی خدا اور اس کے رسول سے جنگ ہے ۳۲
- اجتماعی زندگی میں ایک کی جان سب کی جان ہے ۳۲
- اجتماعی زندگی کی فلاح و کامیابی کا دہر مدار ۳۵
- اجتماعی زندگی کا سارا حسن اللہ کی محبوبیت، اہل ایمان کے لیے نرمی، جہاد فی سبیل اللہ اور ہر ملامت گر کی ملامت سے بالا ہونے میں ہے ۵۴
- اجتماعی زندگی اللہ، رسول اور اہل ایمان کی رفاقت سے دنیا میں غلبہ حاصل کرتی ہے ۵۶
- اجتماعی زندگی اثم و عدوان میں گرم جوشی سے تباہ ہو جاتی ہے ۶۲
- اگر علماء و مشائخ برائی پر روک ٹوک نہ کریں تو اجتماعی زندگی صالح نہیں رہ سکتی ۶۳
- معصیان و عدوان اجتماعی زندگی کا گھٹن ہے ۷۸

اخلاقی قوانین

- بدگرائی پر زبان کھولنا اللہ کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہے ۱۴۸
- خلوت و جلوت میں بھلائی کے کام کرو اور برائیوں سے درگزر کرو ۱۴۹
- جس طرح پاکیزگی نفس ایک نعمت ہے اسی طرح پاکیزگی جسم بھی نعمت ہے ۶
- تم دنیا میں انصاف کے گواہ ہو اس لیے تمہاری گواہی محض خدا کے لیے ہونی چاہیے تمہاری زندگی متعاندہ سیرت سے راستہ ہونی چاہیے ۱۱
- عنود و درگزر اور پیغمبر کی سچی کرنا حسن کاری ہے ۱۳
- گناہ سے توبہ اور اصلاح حال سے اللہ کی مغفرت ملتی ہے ۳۹
- دو خلافین ہو کر سچائی سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا ہے ۴۱
- نرم خوئی با کمال لوگوں کی علامت ہے ۵۴
- بد اخلاقی اور بدکرداری انسان کو بدترین خلاق بنا دیتی ہے ۶۰
- اخلاقی بگاڑ اللہ کو پسند نہیں ہے ۶۴
- سعد منان کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے ۶۵
- خدا غوثی انسان کو ہر قسم کے ظالمانہ اقدام سے روکتی ہے ۶۸

معاشی قوانین

- ۳۱ سر و خوری اور حرام خوردی عذاب الیم کا پیش خیمہ ہیں
 ۱ معاملات میں حقوق اور مجہود کی ہر حال میں پابندی کرو
 ۴ شکار سے حاصل کردہ روزی حلال و طیب ہے
 ۴ معاشی کاروبار کے لیے شکاری جانوروں کی تعلیم و تربیت
 ۳۳ ذکیق، اروحانہ، لوٹ مار، آتش زنی ملک میں بگاڑ پیدا کرتا ہے
 ۳۸ بچوری کا کسب ایک معاشی سنگین مجرم ہے
 ۴۲ جھوٹی شہادتوں اور جھوٹی داستانوں کا کاروبار حرام خوردی ہے
 ۴۴ آیات الہی کا کاروبار سیودلوں کے عکار کا معاشی مسئلہ ہے
 ۶۲ حرام خوردی اور گنہگاروں میں چھوٹ ہو جانا بد علی ہے

سیاسی قوانین

- ۱۵ کائنات میں اقتدار اعلیٰ اللہ کے لیے ہے
 ۴۳۱ اسلام میں ریاست کی تشکیل برہان اور نور کے ذریعے ہوگی
 ۱ اللہ حاکم مطلق ہے جو چاہے حکم دے
 اسلام ایک مستقل نظام ہے اس میں کمال بھی ہے اور یہ تمام بھی ہے اب اسے کسی دوسرے
 ۳ نظام کی حاجت نہیں ہے۔
 ۶ اسلامی ریاست ایک میثاق کے ذریعے وجود میں آتی ہے
 ۸ اسلامی نظام کے علمبرداروں کی دنیا میں حیثیت
 ۱۲ بنی اسرائیل کا سیاسی نظام
 ۱۶ اسلام کا سیاسی نظام لوگوں کو سلامتی کی ضمانت دیتا ہے
 ۲۰ سیاسی نظام خود اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے اگر نبوت کی رہنمائی میں ہو
 ۳۳ اسلام کے سیاسی نظام کو خراب کرنا خدا اور رسول سے جنگ کرنا ہے

- ۴۲ جو لوگ الشریعہ کی حاکمیت کو نہیں مانتے وہ ایمان والے نہیں ہیں
۵۰ الشریعہ کی حاکمیت کے مقابلہ میں ہر حاکمیت جاہلیت ہے
۵۱ اسلام کے سیاسی نظام کا دو ٹوک اعلان کرو حفاظت کرنا اللہ کا کام ہے

عدلیہ کے ضوابط

- ۸ بین الاقوامی معاملات میں کسی قوم کی دشمنی عدل میں ہرگز یکاوت نہ ہو
۸ عدل اجتماعی ہی معاشرے میں حقیقی سیرت کا ضامن ہے
۱۶ اسلامی نظام سراسر عدل کا رہنما ہے
۴۳ غیر مسلموں کے مقدمات اسلامی عدالت سن سکتی ہے
۴۴ انبیاء عدالت میں فیصلے قانون الہی کے مطابق کرتے تھے
۴۴ عدالت میں قانون الہی کے مطابق فیصلہ دیکر نافرمانی ہے
۴۸ عدالت کو کسی حال میں قانون الہی سے ہٹنے کی اجازت نہیں ہے
۴۹ عدالت کسی کے مفاد اور خواہش کو فیصلہ میں ہرگز ملحوظ نہ رکھتی ہے
۵۰ عدالت کے لیے اللہ کے قانون کے مقابلہ میں ہر قانون جاہلیت کا قانون ہے

دفاعی قوانین

- ۲۲ دفاع میں مقابلہ کے وقت میدان جنگ سے گریز پائی عظیم خسارہ ہے
۲۳ دفاع میں حوصلے کا بلند رکھنا بہت اہم ہے
۲۳ دفاع میں فرائض کی ادائیگی پر نظر رکھنا چاہیے نہ کہ نتائج پر
۲۹ ظالماں کو ملحدانہ فتنے دیکر نا کوئی نیکی نہیں ہے
۳۵ جو قومیں اسلامی نظام کی راہ میں مزاحم ہیں ان کو بٹانا اسلامی فرض ہے
۳۵ مستقبل کو ملک کی نگاہوں سے دیکھنا اہمیت کا سامان ہے
۵۱ یہودیوں اور عیسائیوں سے دفاع کے نقطہ نظر سے روابط کا جائز نہیں
۵۱ دفاع کے موقع پر ان سے رفاقت کے تعلقات رکھنے والا ان میں شمار ہو گا

ایمان کے تقاضے

- ۱۶۲ ایمان اور اس کے تقاضے
۲ اللہ کے شائر کی تعظیم ایمان کا تقاضا ہے
۸ دُنیا میں حق کو لے کر کھڑے ہونا ایمان کی ذمہ داری ہے
۰ اللہ سے ڈرنا اور اللہ پر بھروسہ کرنا ایمان کا تقاضا ہے
۲۳ مقابلہ میں اللہ پر اعتماد ایمان کی راہ ہے
۳۵ اللہ کی راہ میں محنت کرنا ایمان کی کسوٹی ہے
۵۴ اہل ایمان کی صفات و علامات
۱ ایمان کے ساتھ شرعی پابندیاں ناگزیر ہیں
۳۵ اہل ایمان کو کن طاقتوں سے نبرد آزما ہونا پڑے گا
۴۱ ایمان صرف زبانی دعوے کا نام نہیں ہے
۶۳ قانونِ الہی سے روگردانی منافی ایمان ہے
۵۴ اللہ کو کیسے ایمان والے مطلوب ہیں
۵۵ اہل ایمان کا حلقہ رفاقت
۵۹ دین کا مذاق اڑانے والوں سے دوستی منافی ایمان ہے
۶۲، ۶۱ کون سے اعمال ایمان نہ ہونے کی گواہی دیتے ہیں
۱۲ ایمان کی ایک کھلی پہچان

منفاق کا چہرہ

- ۵۲ دینِ حق کی مخالفت کرنے والے یہودیوں اور عیسائیوں سے ان کی دلچسپیاں
۵۳ منافقین کے لیے ضبطِ اعمال کا فیصلہ
۶۱ نفاقِ آخر کار کھل کر رہتا ہے
۶۱ منافقین جاسوس بن کر اہل ایمان کی مجالس میں آتے ہیں
۴۱ منافقین راہِ کفر میں بڑی تیز گامی دکھاتے ہیں

منافعین مستقبل کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہیں

۵۶

فوجداری قوانین

ایک ماں کا قتل پوری انسانیت کے قتل سمجھا دیا ہے

۳۲

دکینتی، قتل و غارتگری، لوٹ مار قرآن میں فوجداری جرم ہے

۳۳

ہجرت کرنا اسلام میں فوجداری جرم ہے

۳۸

قورات میں قصاص کا حکم

۶۵

ازداد اسلام میں فوجداری جرم ہے

۵۷

معاشرتی قوانین

اہل کتاب کی عورتوں سے ازدواجی تعلقات کی اجازت

۵

مرنے کے بعد دفن کرنے کا طریقہ سکھانے کے لیے اللہ کا کوسے کو روانہ کرنا

۳۱

معاشرہ میں فساد پھیلانے والوں کی سنگین سزا

۳۳

آخرت کی زندگی

آخرت میں لیں دین نہ ہوگا دوستی و سفارش کی گنجائش ہوگی

۱۶۳

دنیوی سزا آخری سزا سے نہیں بچا سکتی

۳۳

آخرت میں تمام اختلافات کا آخری فیصلہ

۶۸

آخرت میں کبھی لوگ دیوالیہ ہوں گے

۵

دنیا کی کارگزاری کا دافعہ ہونے کا دل

۱۲

آخرت میں ظالمین کا کوئی مددگار نہ ہوگا

۶۲

قرآن کا تعارف

قرآن اہل ایمان کے لیے میعاد فیصلہ اور سرچشمہ قانون ہے

۶۸

قرآن کتابِ مبین ہے

۱۵

- ۱۶۴ قرآن نور مبین ہے
- ۱۶۶ قرآن کے منزل برسے پر اللہ اور اس کے فرشتوں کی گواہی
- ۳ قرآن کا نظریہ علت و حرمت
- ۱۶ قرآن اندھیرے سے نکال کر اجلے میں لاتا ہے
- ” قرآن سلامتی کے طریقے بتاتا ہے
- ۴۸ قرآن تمام آسمانی کتابوں پر مکمل ہے
- ۶۴ قرآن کا نزول یہود کے ظنیان و کفر میں اضافہ کرتا ہے
- ۶۶ قرآن کی تبلیغ کا نبوت کو حکم

قرآنی اصطلاحات

آیات اللہ

قرآن مجید نے انبیاء کے معجزات کو عموماً آیت کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ آیت نے معنی نشانی اور علامت کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو علم و احساس کے جو ذرائع عطا فرمائے ہیں وہ درحقیقت صرف آیات و علامات کی شناخت اور یاد ہے۔ دنیا میں جس قدر چیزیں ہم جانتے اور پہچانتے ہیں صرف آیات و علامات سے جانتے ہیں۔ کلیات سے لے کر جزئیات تک ہمارا اچھيلا ہوا علم وہ محض آیات کا ردینِ منت ہے بلکہ ہمارے تمام تجربے اور مشاہدے، طبیعیات، کیمیائیات، نباتات، حیوانات، ارضیات، ہندسیات، ریاضیات وغیرہ جو کچھ علوم ہیں وہ صرف علامات شناسی کا مجموعہ ہیں۔ قرآن میں آیت کا لفظ اس معنی میں بڑی بہتات سے آیا ہے۔ جس طرح آیات الہی عام، مندے اور خدا اور خالق و مخلوق کے تعلق اور رابطہ کو نمایاں کرتی ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے کسی خاص بندے سے اپنے تعلق و رابطہ کو اپنے مخصوص علامات و آیات کے ذریعہ سے نمایاں کرتا ہے۔ یہی وہ علامات ہیں جو اللہ سبحانہ اور پیغمبر کے درمیان رابطہ خاص اور علاقہ مخصوص کو نمایاں کرتی ہیں اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فرستادہ الہی ہے۔ قرآن کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اس کی نظر میں اصل چیز معجزات نہیں بلکہ اصل چیز نبوت ہے اس لیے وہ لوگوں کو قدم قدم پر اصل روح نبوت کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اس سلسلے میں قرآن نے نہایت وضاحت صفائی اور تصریح کے ساتھ ان غلطیوں کا پردہ چاک کیا ہے۔

سب سے پہلے اس نے یہ حقیقت واضح کی کہ نبوت اور معجزات میں کوئی لازم نہیں اور یہ معجزات اصل نبوت سے خارج ہیں۔ نبوت کے اصلی لازم وحی، مخاطبہ الہی، تزکیہ، اندازہ، تبشیر، تعلیم اور

ہدایت ہیں۔ عام لوگوں میں انبیاء کے معجزات کو دیکھ کر یہ غلط عقیدہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ براہِ راست کائنات میں تصرف پر قادر ہیں۔ چنانچہ موجودہ انجیل کے مصنفوں نے حضرت عیسیٰ کے معجزات کو جس انداز سے پیش کیا ہے اس نے عیسائیوں کے دلوں میں یہ یقین پیدا کر دیا ہے کہ یہ تمام کائنات حضرت عیسیٰ کے قبضہ و قدرت میں تھی اور وہ اس میں جس طرح چاہتے تھے تصرف کرتے تھے۔ یہی وہ بنیادی پتھر ہے جس پر انجیل کے مصنفوں نے دینِ حق کی دیوارِ کج کھڑی کی اور اسی کا نتیجہ ہے کہ توحید کی عمارت اس پر قائم نہ رہ سکی۔ قرآن نے نہایت شدت سے اور نہایت اصرار سے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ معجزات اور نشانات پیغمبر کی قوت اور ارادہ سے نہیں بلکہ خدا کی قدرت اور مشیت سے ظاہر ہوتے ہیں۔ قل انما لایات عند اللہ اور وما کان لمرسول ان ینطق

بایۃ الا باذن اللہ۔

اتباعِ ظن

۱۱۔ اہلِ رعب و ہمنامی فرماتے ہیں ظن اس خیال کو کہتے ہیں جو محلات و دیکھ کر دماغ میں پیدا ہوتا ہے۔ اب اگر قومی ہو گیا تو علم ہو جاتا ہے اور اگر بہت کمزور رہا تو وہم کے مرتبہ میں رہ جاتا ہے اور یہ سب کمزور درجہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ظن لغت کے لحاظ سے یقین اور شک کے خلاف کسی حالت کا نام نہیں بلکہ انسان کے اپنے ہی ایک تہذیب کا نام ہے، اس کے بعد وہ واقعات کے لحاظ سے یقین اور وہم دونوں کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے۔ صحابہ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ظن کو ٹھیک ان موقعوں پر استعمال کرتے تھے جہاں ہم اردو میں اٹکل بولتے ہیں۔ واقعی بات کو علم اور تحقیق سے بات کو ظن کہتے ہیں یہی کو قرآن کی اصطلاح میں ظن کہتے ہیں ماہم بہ من علم ۱۲۔ اتباعِ اظہار اس قسم کی آیات میں ظن ان ہی خیالات کو کہا گیا ہے جو خود اپنے دماغ سے تراش لیے جاتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ قرآنی محاورے میں بیشتر ظن کا اطلاق بے تحقیق بات پر ہوتا ہے۔ یہاں عیسائیوں کے پاس ہیں ایک ہی فقرے میں دو باتیں فرمائی ہیں، ایک یہ کہ وہ بے خبر ہیں اور دوسرے یہ کہ وہ اٹکل اور اندازے کے تیر چلا ہے ہیں، اسی لیے ان میں مسیح علیہ السلام کے مصلوب ہونے پر کوئی ایک متفق علیہ بات نہیں ہے بلکہ بیسیوں اقوال ہیں جن کا کثرت خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بے علم ہیں اور اس معاملہ میں وہ اٹکل کے تیر چلا ہے ہیں۔ ان میں سے کوئی کہتا ہے کہ صلیب پر جو شخص چڑھایا گیا وہ

مسیح د تھا بلکہ مسیح کی شکل میں کوئی اور تھا جسے یہودی اور رومی سپاہی ذلت کے ساتھ صلیب دے دیے تھے اور مسیح وہیں کسی جگہ کھڑا ان کی حماقت پر منہس رہا تھا۔ کوئی کہتا ہے کہ صلیب پر مسیح ہی چڑھایا گیا تھا مگر ان کی وفات صلیب پر نہیں ہوئی تھی بلکہ آسمان سے جانے کے بعد ان میں جان تھی کہ ان کو کتنا ہے کہ انہوں نے صلیب پر وفات پائی اور پھر وہ جی اٹھے اور کم و بیش دس مرتبہ اپنے حواریوں سے ملے۔ کوئی کہتا ہے کہ صلیب کی موت مسیح کے جسم انسانی پر ہوئی اور وہ دفن ہوا مگر الوہیت کی روح جو اس میں تھی وہ اٹھ اٹھی گئی۔ اور کوئی کہتا ہے کہ مرنے کے بعد مسیح علیہ السلام جسم سمیت زندہ ہوتے اور جسم سمیت اٹھ اٹھ گئے، ظاہر ہے کہ اگر ان لوگوں کے پاس حقیقت کا علم ہوتا تو اتنی مختلف باتیں ان میں مشورہ نہ ہوتیں۔

بہر حال ظن کے منہ اٹھل اور انداز کے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے ایک روز غلبہ میں فرمایا: لوگو! دین کے ہائے میں راتے تو صرف حضورؐ کی صواب تھی ہم تو صرف اٹھل کے تیر لگاتے اور تکلف کر کے خیال جھٹاتے ہیں انما بونا فلان و الکلف۔ ان مختصر الفاظ میں حضرت عمرؓ نے قرآن کی اس آیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

لنحكمن بين الناس بما نزل الله

لہذا جو رائے خدا کی آواز کے ساتھ ہو اس کا نام نازل ہے اور جو محض اپنی اٹھل ہو اس کا نام ظن اور تکلف ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا مکرمل یہ تھا کہ جب کسی معاملہ کے متعلق انہیں کتاب و سنت میں کوئی فیصلہ ملتا فرماتے کہ اگر تم چاہو تو میں تمہیں اپنے ظن اور گمان سے بتا دوں اسی ظن کو کہتے ہیں کہا جاتا ہے اور اسی معنی میں قرآن نے راتے زنی سے منع کیا ہے۔ یعنی معض اپنی عقل سے کسی شرعی فیاد کے بغیر کوئی بات کہہ دینا۔ حضرت ابو بکرؓ فرماتے ہیں کہ میں کس زمین کے اوپر اور کس آسمان کے نیچے رہ سکتا ہوں۔ اگر قرآن کی کسی آیت میں صرف اپنی رائے سے کوئی ایسی بات کہوں جس کا مجھے علم نہیں ہے۔

اتباع صحوی

جیسے ساری فکری مگر ہیوں اور کچ روایوں کا شجرہ نسب بالواسطہ اور بلاواسطہ اتباع ظن سے جاتا ہے ٹھیک اسی طرح عمل کی ساری مگر ہیوں کا سرچشمہ اتباع ہوئی ہے۔ وہاں ظن کے

مقابلہ میں اگر یقین ہے تو یہاں ہومی کا ذمہ مقابل ہڈی ہے۔ قرآن عزیز اتباعِ ہومی اور اتباعِ ہڈی کو دو متضاد چیزیں قرار دیتا ہے یعنی جو متبعِ ہومی ہے وہ متبعِ ہڈی نہیں ہو سکتا اور جو متبعِ ہڈی ہے وہ متبعِ ہومی نہیں ہو سکتا۔ اتباعِ ہڈی کے لیے اتباعِ ہومی کا چھوڑنا ناگزیر ہے۔ ہڈی اور ہومی اپنی اپنی جگہ دو حصے ہوتے رہتے ہیں۔ اللہ سبحانہ نے دونوں انسان کے مٹانے کے لیے دورانِ دونوں میں سے ایک پر چلنے کا اور دوسرے سے بچنے کا حکم ہے۔ ہڈی نبوت کا نیا ہوا علم و عمل ہے۔ اس کی اتباع میں محکمیت کا داغ لگتا ہے اور ہومی اپنے ہی نفس کے جذبات ہیں اس کے مان لینے میں حاکمیت کا منہ آتا ہے۔ کچھ سادہ لوح کو کشش کرتے ہیں کہ ہڈی اور ہومی کے درمیان اتفاق و سازگاری ہو جائے یعنی۔

وہن بھی خوش ہے راضی ہے میا دمی

لیکن یہ کوشش بیکار بھی ہے اور مذہب بھی۔ قرآن نے پہلے ہی اعلان کر دیا ہے کہ یہ دو ہیں الگ الگ ہیں۔ ایک کا سر زام ہدایت محمد رسول اللہ کے ہاتھ میں اور دوسری کا زام خلالت شیطان کے ہاتھ میں ہے ایک کا فستی جنت ہے اور دوسرے کا دوزخ۔ ہومی کا محرک چونکہ خود نفس انسانی ہے اس لیے وہ جسم انسانی میں جان کی طرح رگ رگ اور بیشہ ریشہ میں سرایت کی ہوئی ہے اس کا خلاف آنا ہی مشکل ہو تبھی جتنا کہ جسم کو جان کہا۔ ان میں اسی طرح فطرتی جاذبیت ہوئی ہے جیسا کہ لوہے اور مقناطیس میں۔ اور جب اس پر قرآن کا لیل لگایا جاتا ہے تو اب وہی ہومی ٹھیک ہڈی کی صورت میں نظر آنے لگتی ہے ورنہ دونوں کی اس مصالحت و ہم آہنگی سے جو خوشی میسر آتی ہے وہ گنگا و جمنہ کے سنگم پر ایسا تلف آنے لگتا ہے۔ اس حد پر پہنچ کر انسان اتنا سکون محسوس کرتا ہے کہ تلاش حق کا لفظ بھی سننا اسے گوارا نہیں ہوتا۔ اسی لیے سورہ جاثیہ میں حضور اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے بطور امتحان فرمایا ہے کہ دیکھئے اتباعِ ہومی کی اس گرم بازو میں ہم نے آپ کو ہڈی پر قائم کیا ہے یہ کتنے بڑا احسان ہے تو اب آپ ان بے خبروں کی اہوار کا ساتھ نہ دیں۔ ہومی کے اس غیر معمولی اثر اور برقی تاثیر کی اس ارشادِ نبوت میں نشاندہی کی گئی ہے۔

آئندہ میری امت میں کچھ لوگ ہوں گے کہ جن میں یہ اہوار اس طرح بوجھوں کی جیسے کتے کاٹے کے جسم میں ہڑک پرچ جاتی ہے کہ جسم کی کوئی رگ اور کوئی جوڑا ایسا نہیں رہتا جس میں یہ بیماری پھیلی ہوئی نہ ہو۔

واقعی ہوئی جب انسان کے رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے تو پھر ہوئی ہی اس کو حدی معلوم ہونے لگتی ہے اس لیے اس کو توفیق کی توفیق بھی نہیں ہوتی ہے کیونکہ توبہ کی توفیق اس وقت ہوتی ہے جبکہ قلب کا کوئی گوشہ ہوئی سے خالی ہو لیکن جب رگ و رگ میں ہوئی سرایت کر جاتے تو پھر توبہ کی توفیق کہاں سے آئے۔ عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ:

بشر شخص تم میں سے اپنے دین کی قدر کرنا چاہے اسے شیطان افحال اور مصاب
اہولہ سے علیحدہ رہنا چاہیے۔ کیونکہ ان سے اس میں گھٹنے سے ان کی بیماری خارش سے
زیادہ اثر کر گئی ہے۔

امام اذہامی فرماتے ہیں کہ

مصائب اہولہ سے بات چیت نہ کرو ورنہ ان سے جھگڑا کرو کہ وہ تمہارے دل میں
فتنہ کا بیج ڈال دیں گے۔

یہ ہوئی ہے جو فرقہ بندی کو جنم دیتی ہے اور ہدایت کی مراط مستقیم سے ہٹ کر سیکڑوں
راہیں بنالیتی ہے اور یہ سب راہیں ٹیڑھی ہوتی ہیں۔ ان مہبت سے فطرتوں کے درمیان
ایک ایسی راہ جو بالکل وسط میں ہو اور سیدھی ہو جس میں انسان کی تمام قوتوں اور خواہشوں کے ساتھ
اس کے تمام جذبات کے ساتھ اس کی روح اور جسم کے تمام مطالبوں اور تقاضوں کے ساتھ اور
اس کی زندگی کے تمام مسائل کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا گیا ہو جس کے اندر کوئی ٹیڑھ کوئی گچی
کسی پہلو کی بے رعایت اور کسی پہلو کے ساتھ ظلم نہ ہو اور بے انصافی نہ ہو یہی وہ الہدیٰ ہے
یہی انسانی زندگی کے صحیح ارتقا۔ اور اس کی کامیابی یا ناکامی کے لیے سخت ضروری ہے۔ انسان کی فطرت
فطرت اس کی طالب ہے۔ اسی کی نوبت رہنا بن کر آئی ہے۔ اسی کو قرآن سوار السبیل اور الصراط المستقیم
کہتا ہے۔ یہ شاہراہ دنیا کی اس زندگی سے لے کر آخرت کی دوسری زندگی تک سیدھی جاتی ہے جو
اس پر چلا وہ یہاں اللہ تعالیٰ علیہم میں داخل ہے اور آخرت میں کامیاب و بامراد ہے۔

الارض المقدسة

ارض مقدس سے مراد کنعان اور فلسطین کا علاقہ ہے اس کو مقدس کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہی علاقہ
ہے جہاں حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل اور حضرت یعقوب نے آوازہ حق بلند کیا۔ چونکہ توحید
اور خدا پرستی کی اذان سب سے پہلے اسی علاقہ میں گونجی تھی۔ اس وجہ سے اس کو ارض مقدس

کہا ہے اور اسی لیے ان تمام جگہوں کو جمال اہل حق نے حق کا بول بالا کرنے کے لیے مفسدین کی ہیں ان کو مفسد کہتے ہیں۔ مثلاً مکہ مقدس، مدینہ مقدسہ وغیرہ اور شاید یہیں سے مسجد اقصیٰ کو البیت المقدس کہنا شروع کر دیا ہے۔ جن بزرگوں نے ارض مقدسہ سے مراوشام نکھا ہے وہ بھی درست ہے کیونکہ پہلے کنعان اور فلسطین شام ہی کے علاقے شمار ہوتے تھے۔ تو ان میں ارض مقدس کے بائیس میں وعدوں کی مراعتیں موجود ہیں۔ مثلاً

اور دیکھو میں نے یہ زمین جو تمہارے آگے ہے تمہیں عنایت کی، داخل ہوا اور اس زمین کو جس کی بابت خداوند نے تمہارے باپ دادوں ابراہام اور اسحاق اور یعقوب سے قسم کی کہ تم کو اور تمہارے بعد تمہاری نسل کو دوں گا میراث میں لو۔ (استشراق ۱-۸)

تو اس سرزمین میں جس کی بابت خداوند نے تیرے باپ دادوں ابراہام اور اسحاق اور یعقوب سے قسم کیا کہ تمہارے لیے میں تمہیں دوں گا سکونت کرے۔ (استشراق ۳۰-۱۶)

مضطرب ہوجاؤ اور دلاور ہوجاؤ خوف نہ کھاؤ اور ان سے ڈرو کیونکہ خداوند تیرا خدا رہی ہے جو تیرے ساتھ جاتا ہے وہ تجھ سے غافل نہ ہوگا اور تجھ کو نہ چھوڑے گا۔ (۱۶-۱۷)

استقسام بالازلام

استقسام کے معنی ہیں حصہ قسمت یا تقدیر معلوم کرنا۔ ازلام زلم کی جمع ہے جوئے یا فال کے تیروں کو کہتے ہیں۔ عرب میں فال کے تیروں کا بھی رواج تھا جن کے ذریعے وہ غیب کے فیصلے معلوم کرتے تھے اور جوئے کے تیروں کا بھی رواج تھا جن کے ذریعے وہ گوشت یا کسی چیز سے حصے حاصل کرتے۔

الطاب میں ہے کہ قسمت معلوم کرنے والے تیرسات ہوتے تھے ان میں ایک پر مکھا تھا کہ انہی بلی میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے۔ ایک پر مکھا تھا خانی ربی میرے رب نے مجھے روک دیا ہے۔ ایک پر مکھا تھا منکم ام من سے ہے۔ ایک پر مکھا تھا من حیثکم اجنبی علیف ہے ایک پر مکھا تھا لمصنق ملا گیا ہے۔ ایک پر مکھا تھا العقل دیت ہے اور ایک پر مکھا تھا غفل کچھ نہیں ہے۔ زیادہ جاہلیت میں جب کوئی سفر کا، تجارت کا، شادی کا ارادہ کرتا یا نسب میں اختلاف ہوا یا کسی مقتول کے بارے میں اختلاف ہوتا یا دیت کا مسئلہ معلوم کرنا ہوا تو لوگ مکہ کے سب سے بڑے بت، بیل کے پاس تین سو درہم مقدارہ فیس لے کر جاتے

اور اس شخص کو دیتے جس کی تحویل میں یہ تیر ہوتے وہ ان تیروں کے ذریعے ان کو پیش ہانڈہ مسئلہ کا جواب دیتا۔

تیروں کے ذریعے جو کیسے کی یہ صورت تھی کہ اونٹ کو ذبح کر کے اس کے گوشت کو دس ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتے اور ان ٹکڑوں پر پہلے ڈالتے ان پانسوں کی صورت یہ تھی کہ دس تیر منہ پر لیے تھے جن کے نام یہ ہیں :

فد، تروم، رقیب، مجلس، مہبل، معلیٰ، منافس، منیع، نصیح و غد

ان میں سے ہر تیر کے مختلف حصے مقرر کر دیے تھے اور جب جو کیسے تھے تو ایک تھیلے میں ڈال کر ایک منصب یا شخص کے ہاتھ میں دیتے تھے اور وہ ان کو گڈ مڈ کر کے ایک ایک تیر کو ایک ایک شخص کے نام پر نکالتا تھا جن کے نام پر وہ تیر نکلتے تھے جن جن کے حصے مذہ تھے وہ کامیاب ہوتے تھے اور جن تیروں کا کوئی حصہ نہ تھا وہ جن کے نام پر نکلتے وہ ناکام و منحور ہوتے تھے۔ اس طرح گوشت کے جو ٹکڑے جمع ہو جاتے تھے ان کو تیروں پر تقسیم کر دیتے تھے چونکہ یہ سخاوت کے اظہار کا ایک طریقہ تھا اس لیے جوئے کی ان مجالس میں شریک نہ ہونا ایک ذمی عار تھا۔ قرآن نے یہاں انتقام بالا زام کو حرام کر کے ان دونوں پر قدغن قائم کیا ہے جنی مشرکانہ خال گیری جس میں قیمت کا فیصلہ معلوم کیا جاتا ہے یا غیب کی خبر دریافت کی جاتی ہے۔ جوئے کی قسم کے وہ سلسلے کیل اور کام جن میں انبیاء کی تقسیم کا مدار حقوق اور خدمات اور غنہ فیصلوں پر دیکھنے کے بجائے محض کسی اتفاقی امر پر رکھا جائے۔

انجیل

حضرت مولانا رحمت اللہ علیہ لکھنوی قدس سرہ العزیز اظہار الحق میں رقمطراز ہیں کہ اہل طبعی نے الاعلام بما فی دین النصارى من الفساد والادام کے باب سوم میں لکھا ہے کہ جو کتاب عیسائیوں کے ہاتھوں میں انجیل کے نام سے ہے یہ وہ ہرگز انجیل نہیں جس کا تذکرہ اللہ سبحانہ نے حضور اکرم ﷺ کی زبانی قرآن میں کیا ہے۔

کشف الظنون کے مصنف نے انجیل کے بارے میں لکھا ہے کہ

وہ ایک کتاب تھی جس کو اللہ نے عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام پر نازل کیا تھ۔

پھر ایک طویل جلدت میں ان انجیل اربعہ کے اصلی انجیل ہونے کی تردید کی ہے۔

کہا ہے کہ "حضرت عیسیٰ جو انجیل لے کر آئے تھے وہ ایک ہی انجیل تھی جس میں اخلاقیات اور ناقص کوئی نہ تھا ان عیسائیوں نے الشریعہ اور اس میں منہج حضرت عیسیٰ پر جمہوری تہمت رکھ دی۔"

کتاب تنجیل من حرف الانجیل کا مصنف اپنی کتاب کے باب دوم میں ان مشہور اناجیل کی نسبت لکھتا ہے۔

یہ انجیلیں وہ بھی انجیل منیں ہیں جن کو مے کر سچا رسول بھیجا گیا تھا اور جو خدا کی جانب سے اتاری گئی تھیں۔ اور سچی انجیل تو صرف وہی ہے جو عیسٰی کی زبان سے نکل ہے۔ پھر باب ۹ میں عیسائیوں کی قباحتوں کے سلسلے میں رقمطراز ہے۔

اس پولس نے ان کو اپنی لطیف فریب کاری سے دین سے قطعاً محروم کر دیا کیونکہ اس نے ان کی عقلوں کو ایسا بھرا پایا کہ جیسے چاہے ان کو بھلایا جاسکتا ہے اس لیے اس عجیبیت نے قرأت کے شانوں تک کو مٹا دیا۔

ان موجودہ اناجیل اربعہ کے زائد تعنیف کے متعلق وہی تباہی بلا سند کہانیاں ہیں۔ ہور ان اپنی تفسیر مطبوعہ ۱۸۷۷ء جلد چہارم قسم ۲ کے باب دوم میں لکھتا ہے :

ہم کہ مورخین عیسائیت کی معرفت اناجیل کی تالیف کے زمانے کے جو حالات پہنچے ہیں وہ ناقص اور غیر معین ہیں جن سے کسی مقرر چیز تک رسائی نہیں ہوتی اور مشائخ متقدمین نے وہی روایات کی تصدیق کی اور ان کو علم بند کر ڈالا۔ بعد کے آئے ملے لوگوں نے ان کی کبھی ہوئی چیزوں کو ان کی تنظیم کی وجہ سے قبول کر لیا اور یہ سچی جمہوری روایتیں ایک کتاب سے دوسرے کا تب تک پہنچی رہی ہیں۔ مدت مدید گزر جانے کی وجہ سے اب ان کی تنقید اور کٹر اکھڑا معلوم کرنا بھی دشوار ہو گیا۔ پھر اسی جلد میں لکھتا ہے :

پہلی انجیل ۱۲۰ یا ۱۳۰ یا ۱۴۰ یا ۱۵۰ یا ۱۶۰ میں تالیف کی گئی۔ دوسری انجیل ۱۷۰ اور اس کے ۱۸۰ یا ۱۹۰ تک کسی وقت میں اور غالب یہ ہے کہ ۲۰۰ یا ۲۱۰ میں تالیف ہوئی، تیسری انجیل ۲۲۰ یا ۲۳۰ یا ۲۴۰ میں تالیف ہوئی۔ چوتھی انجیل ۲۵۰ یا ۲۶۰ یا ۲۷۰ یا ۲۸۰ میں تالیف ہوئی۔

احوال نیر اللہ

احوال کے معنی عربی زبان میں نامزد کرنے اور شہرت دینے کے ہیں۔ مشہور نقوی علامہ ابوالفتح

ناصر بن عبداللہ المطرزی نے مغرب میں احوال کے معنی یہ بتائے ہیں۔
چاند دیکھنے کے وقت جو آواز بلند کی جاتی ہے اس کو احوال کہتے ہیں اور اسی طرح
بیم جب پیدائش کے وقت آواز بلند کرے تو اسے استحوال کہتے ہیں۔

اور امام راجع اعظمی لکھتے ہیں کہ
چاند دیکھنے کے وقت جو آواز بلند کی جاتی ہے اسے احوال کہتے ہیں اور یہ مطلقاً ہر آواز
کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور اسی سے پیدائش کے وقت بیم کے رونے
کی آواز کو بھی احوال کہتے ہیں اور ماہی پر بغیر اللہ کے معنی یہ ہیں کہ جس جانور پر
غیر اللہ کا نام ذکر کیا گیا ہو اور وہ انسان کی خاطر ذبح کیا جائے
اور لغت کی کتاب صراح میں علامہ ابو الفضل محمد بن عمر قرظی لکھتے ہیں
ماہی بہ لغیر اللہ کے معنی یہ ہیں کہ بغیر اللہ کا نام اس پر لیا جائے
اور احوال کے اصل معنی آواز بلند کرنے کے ہیں۔

مشہور محدث امام ابن جریر طبری فرماتے ہیں :
ماہی بہ اس کو اس لیے کہا گیا ہے کہ اہل جاہلیت جب اپنے حاجت رواؤں
کے تقرب کے لیے جانوروں کو ذبح کرنے کا ارادہ کرتے تو ان جانوروں پر اپنے
معبودوں کا نام لیتے اور بلند آواز سے اس کی تشبیہ کرتے۔

اور شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں کہ احوال کو ذبح پر معمول کرنا خلاف لغت و عرف ہے۔ احوال
عربی محاورہ اور لغت میں بمعنی ذبح نہیں آیا ہے بلکہ احوال کے معنی لغت عربی میں آواز بلند کرنے
اور شہرت لینے کے ہیں۔ جیسے آواز طفل نوا اور شہرت چاند وغیرہ۔ اصلیت لفظ اگر کوئی بولے
گا تو اس سے کسی نے نہ سمجھا جائے گا کہ میں نے اللہ کے نام پر ذبح کیا۔ بتایا نہ پتا ہوں کہ احوال
کے معنی ذبح کے ہرگز نہیں ہیں بلکہ شہرت لینے اور تقرب کے طور پر نامزد کرنے کے ہیں۔
اگر احوال کے معنی بھی ذبح کے ہوں تو پھر ما ذبح علی النسب جس کے معنی یہ ہیں
وہ جانور جو بتوں کے نام پر ذبح کیے جان میں کوئی معنویت نہیں رہتی۔ اگر ماہی بہ لغیر اللہ
کا مطلب بھی یہی ہو تو وہ عطف کے ساتھ ما ذبح علی النسب بے معنی ہو کر رہ جائے
گا۔ چنانچہ امام قزوینی اکیل فرماتے ہیں :

صنم اور بت کی قید مشرکین کی تردید کے لیے ہے در نہ مطلقاً بغیر اللہ

ہے خواہ وہ صائم ہو یا کوئی اور۔
 علامہ ابوجان الاندلسی نے مختلف اقوال نقل کر کے لکھا ہے :
 جو چیز اس آیت کریمہ سے ظاہر ہو رہی ہے وہ یہ ہے کہ جو جانور بھی غیر شتر
 کے لیے ذبح کیا جائے وہ حرام ہے۔ لفظ غیر الشتر میں شتر اور حضرت مسیح
 سب ہی شامل ہیں اور اس کو اہلال اسی لیے کہا گیا ہے کہ وہ لوگ ذبح کے
 وقت اس شخص کا نام بلند کرتے تھے جس کے لیے جانور ذبح کئے تھے
 پھر اس میں یہ وسعت اور کثرت آگئی کہ ہر ذبیحہ پر اس کا اطلاق ہمنے لگا جسے
 تبسیر کہنے کو اہلال کہتے ہیں اور یہ ہر حرام جانور کے اہلال ہے۔

اصل کتاب

قرآن کے سوا جن آسمانی کتابوں کے نام قرآن میں آئے ہیں ان کے پیروں کو اہل کتاب
 الذین اوتوا الکتاب کہا جاتا ہے یا یوں کہو کہ جو قرآن کو گواہی کتاب نہیں مگر ان کتابوں میں
 سے جن کا نام قرآن میں آیا ہے کسی کو وہ آسمانی کتاب مانتے ہوں خواہ وہ یہودی ہوں یا نصرانی۔
 یہ بات کہ یہودی و نصاریٰ کو اہل کتاب کہنے کے لیے کیا یہ شرط ہے کہ وہ صحیح اور پر اصلی تورات
 انجیل پر ایمان رکھنے ہوں یا محرف تورات اور انجیل کو ماننے والے بھی اہل کتاب ہی شمار کیے
 جائیں۔ قرآن کی تصریحات بتاتی ہیں کہ اہل کتاب ہونے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہے
 کہ وہ کسی آسمانی کتاب کو مانتے ہوں اور اس کی پیروی کا دعویٰ کرتے ہوں۔

قرآن حکیم نے جن کو اہل کتاب کہا ہے ان کے ہی اسے میں یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ
 وہ آسمانی کتاب میں تحریف کرتے تھے اور یہ بھی بتایا ہے کہ وہ عزیر کو خدا کا بیٹا اور مسیح کو
 خدا کا بیٹا کہتے تھے۔ ان اوصاف کے باوجود قرآن نے ان کو اہل کتاب کہا ہے۔ اس سے
 معلوم ہوا کہ یہودی اور عیسائی ساری برائیوں کے باوجود قرآن کے نزدیک اہل کتاب ہیں۔
 خبر نہیں لوگوں نے یہ بات کہاں سے معلوم کر لی ہے کہ :

آیت میں مسیح یا عیسائی سرے سے مراد ہی نہیں بلکہ نصاریٰ سے مراد
 نصاریٰ ہی ہیں جو کہ حضرت عیسیٰ کو بھی ماننے والا ذکر آپ کو ابن الشتر قرار دیتے
 والا ایک قدیم فرقہ ہوا ہے۔

حالانکہ خود قرآن ہی میں نصاریٰ کے بارے میں یہ انکشاف موجود ہے و قالت النصاریٰ
المسیح ابن اللہ۔ البصام نے احکام القرآن میں لکھا ہے کہ حضرت فاروق اعظم کے دور خلافت
میں آپ کے کسی عامل یا گورنر نے ایک خط لکھ کر آپ سے دریافت کیا کہ یہاں کچھ لوگ ایسے ہیں
جو تورات پڑھتے ہیں اور یوم السبت کی تعظیم کرتے ہیں مگر قیامت پر ان کا ایمان نہیں۔ ایسے
لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے۔ فاروق اعظم نے بتایا کہ وہ اہل کتاب ہی کا فرقہ ہیں۔ اہل
قرآن کی اصطلاح میں اہل کتاب وہ ہیں جو قرآن کے سوا تورات، انجیل اور زبور کو مانتے ہوں۔ یہ لوگ
جزیرہ فے کے اسلامی حکومت کے وفادار شہری ہو سکتے ہیں اور ایک شہری ہونے کی حیثیت
سے ان کو وہ تمام بنیادی حقوق حاصل ہوں گے جو مملکت کے دوسرے شہریوں کو حاصل ہیں۔
ان کے معابد اور مذہبی عمارات محفوظ ہوں گے۔ ان کو مذہب لانے پر مجبور نہ کیا جائے۔ ان
کی جان و مل اور عزت و ابرو کی مسلمان حکومت حفاظت کرے گی ان کی عورتوں سے مسلمان
نکاح کر سکتے ہیں۔ ان کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور کھا سکتے ہیں۔ ان کا جائز کھانا مسلمان کھا
سکتے ہیں اور مسلمان اپنا کھانا ان کو کھلا سکتے ہیں۔
یہیں سے ایسے لوگوں کے لیے جو قرآن، تورات، زبور اور انجیل کو تو خدائی کتاب نہیں
مانتے مگر وہ اپنی جگہ کسی آسمانی کتاب پر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں اسلامی قانون شہریت میں
شبہ اہل کتاب کی اصطلاح رونما ہو گئی۔

جاہلیت

احادیث میں اکثر جاہلیت کو اسلام کا مقابل بنا کر استعمال کیا ہے۔ قرآن میں ما نزل اللہ
کے مقابلے پر لفظ جاہلیت آیا ہے اور کہیں احادیث میں اسلامی نظام جماعت کے مقابلے
پر یہ لفظ لولا لگا۔ اسلام کے مقابلے پر یہ لفظ اس لیے آیا ہے کہ اسلام سر تا سر علم ہے کیونکہ اس
کی صرف خدا نے رہنمائی کی ہے جو تمام حقائق کا علم رکھتا ہے اور اس کے برعکس ہر وہ طریقہ
جو اسلام سے مختلف ہے جاہلیت کا طریقہ ہے۔

عرب کے زمانہ قبل اسلام کو جاہلیت کا دور اسی معنی میں کہا گیا ہے کہ اس زمانہ میں
علم کے بغیر محض وہم و قیاس اور گمان یا خواہشات کی بنا پر انسانوں نے اپنے لیے زندگی کے طریقے
مقرر کیے تھے۔ مگر جاہلیت ہر وہ دور ہے جس میں افکار و عقائد، اتباع ظن اور اعمال و

اخلاق کا سانچہ اتباع ہوا پورا استوار ہو۔ یہ طرز عمل جہاں اور جس وقت بھی پہلے جاہلیت ہی کہا جاتے تھا۔ مدرسوں اور یونیورسٹیوں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ محض ایک اتباعِ ظن ہے اور کسی معنی میں علم نہیں ہے لہذا خدا کے لیے ہوتے علم سے بے نیاز ہو کر جو فکر اس اتباعِ ظن پر قائم ہو گا اور جو انتظام زندگی اتباعِ ہوشی کی آمیزش کر کے بنایا جائے گا وہ بھی اسی طرح کی جاہلیت قرار دیا جاتے گا جو اسلام سے پہلے تھا۔ اسی بنا پر سورہ مائدہ میں جاہلیہ کا لفظ مازنل اللہ کے مقابلہ پر آیا ہے۔ اس وجہ سے ہر وہ قانون جو خدا کے قلم سے ہوتے قانون کے خلاف ہے وہ جاہلیت کا قانون ہے۔ مسلمان احمدیہ مائتہ شریٰ کے عقائد میں اسلام کا نظام عمل مان کیا ہے اس کے مقابلہ میں نظامِ عمل کو جاہلیت سے تعبیر کیا ہے۔

خضر اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں تم کو پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں جن کا اللہ نے مجھے حکم دیا ہے۔ جماعت، سمع، طاعت، ہجرت اور اللہ کی راہ میں جہاد۔ یعنی کرو کہ جو مسلمان جماعت سے بالشت بھر بھی باہر ہوا تو اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا اور جس نے اسلام کی جماعتی زندگی کی جگہ جاہلیت کی بے قیدتی کی طرف بلایا اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ لوگوں سے دریافت کیا کہ کیا ایسا شخص دوزخی ہو گا اگرچہ روزہ رکھتا ہو اور نماز پڑھتا ہو، فرمایا ہاں اگرچہ روزہ رکھتا ہو نماز پڑھتا ہو اور اپنے خیال میں اپنے نبی کے مسلمان سمجھتا ہو۔

بہرِ بالسود

بدگوئی پر زبان کو نہ لانا خدا کو پسند نہیں ہے لیکن مظلوم کو اس کی اہانت ملی ہے کہ وہ ظالم کی ظالمانہ کاہلوایوں کو علانیہ بیان کرے۔ یہ صرف اہانت ہے پھر بھی افضل یہی ہے کہ بدگوئی پر زبان نہ کھولے۔ ہر حال میں برائی سے بچ کر شے کیونکہ مومن ہونے کی حیثیت میں بندے کو اپنے اخلاق میں خدا کے اخلاق سے قریب تر ہونا چاہیے۔ یہ مسلمانوں کو ایک نہایت بلند درجہ کی اخلاقی تعلیم ہے۔ اور بتایا جا رہا ہے کہ غیبت و بدگوئی اور قانون کی زبان میں جنگ عزت بالکل ناجائز ہے اور فرد و جماعت اور شخص و ملت دونوں کو صلاح و فلاح کی یہ ایک راہ بتائی ہے۔ بہرِ بالسود میں پس پشت بھی کسی کے عیب کی تشہیر اور اس کے روبرو تلخ کلامی دونوں داخل ہیں۔ بلکہ خود او۔ بلاصلحت شرعی کسی کی بدگوئی کسی حال میں جائز نہیں، نہ سامنے نہ پیچھے۔ لیکن مظلوم کو

اس کی اجازت ہے کہ وہ ظالم کی کارروائی کو علانیہ بیان کرے اس کے دو فائدے ہیں ایک تو اس سے اپنی بدنامی کے درد سے ظلم کرنے میں کچھ چمکنا نہیں ہے دوسرا یہ کہ اس طرح لوگوں کو مظلوم کے ساتھ ہمدردی پیدا ہوگی۔ فقہانے تصریح کی ہے کہ جمہور کی بات کی تشہیر کی مظلوم کو بھی اجازت نہیں ہے۔

غلو فی الدین

غلو کے معنی بڑھنے، زیادہ ہونے، حد سے زیادہ ہونے کے ہیں۔ اسی سے قیمتوں کے گزراں ہونے کے لیے غلا السعربولا جاتا ہے۔ حضرت عیسیٰ کے بائیس میں یہود نصاریٰ دونوں نے غلو کیا ہے۔ ایک بنے تعزیر میں دوسرے نے افراط میں۔ افراط و تعزیر دونوں مذموم ہیں۔

مطرب بن عبداللہ نے اچھی بات فرمائی ہے،

ولا تغل فی شیئی من الامور واقصد

کلا طرفی قصد الامور ذمیر

غلو عقیدہ میں ہر عمل میں دونوں میں دین کے تعلق سے مذموم ہے۔ دین میں جس چیز کا جو درجہ و مرتبہ یا جو وزن و مقام ہے اس کو بڑھا کر کچھ سے کچھ کر دیا جائے جو چیز پادسیر ہے وہ من بھر کر دی جاتے جو حکم صرف استعجاب و استعجاب کا درجہ رکھتی ہے اس کو فرض و واجب کا درجہ دیا جائے۔ جو شخص ایک فتویٰ یا مجتہد ہے اسے امام معصوم بنا دیا جائے جس کو اللہ نے نبی یا رسول بنا یا ہے اس کو شریک خدا یا خدا بنا ڈالا جائے۔ جس کی صرف تعظیم و تکریم کا حکم ہے اس کی عبادت شروع کر دی جاتے۔ یہ اور اس قسم کی ساری باتیں غلو میں داخل ہیں۔ اور جس طرح دین میں تعزیر بہت بڑا جرم ہے اسی طرح افراط بھی بہت بڑا نقص ہے۔ اس سے مذہب کا وہ مزاج جو تہمتا مہر اعتدال ہے بالکل درہم برہم ہو جاتا ہے اور اس کی وہ خدائی ترکیب جو اس کے اجزاء کو حسن و جمال کا ایک دلا دیز پیکر بناتی ہے بالکل مسخ ہو جاتی ہے۔ یوں تو اس غلو میں ساری امتیں مبتلا ہوئی ہیں۔ ہم مسلمان بھی افکار، اعمال، اخلاق اور احوال میں اس سے نہ بچ سکتے لیکن نصاریٰ کو اس میدان میں امامت کا درجہ حاصل ہے۔ ان کی اصل بیماری یہی ہے کہ انہوں نے اپنے اس غلو کے سبب سے پورے دین کا حلیہ بگاڑ دیا۔

فرقة من الرسل

فرت کے لفظی معنی انقطاع عمل یا سکون کے ہیں۔ اصطلاح میں دو نبوتوں کے درمیان

زمانے کو کہتے ہیں حضرت عیسیٰ اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان وقفہ کم و بیش چھ سو سال کا ہوا ہے حضور انور کا سال ولادت ۶۱۰ھ اور سال رسالت ۶۱۰ھ ہے۔ حضور اور حضرت عیسیٰ کے درمیان کوئی تہی نہیں ہے۔ امام بخاری نے کتاب الاٰلیاء میں ابوہریرہ کے حوالے سے جو حدیث لکھی ہے اس سے اس کی تائید ہوتی ہے فرمایا کہ میں ابن مریم کے سب سے زیادہ قریب ہوں۔ میرے اور اس کے درمیان کوئی تہی نہیں ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں۔ یہ ارشاد نبوت ان لوگوں کے موقف کو طاقتور بنا آ ہے جو کہتے ہیں کہ حضور کے اور حضرت عیسیٰ کے درمیان کوئی تہی نہیں ہے۔ لیکن بعض روایات میں یہ مندر آتا ہے کہ جبرجیس اور خالد بن سنان نبی تھے جو حضرت عیسیٰ کے بعد ہوئے۔ مگر ابوہریرہ کے صحیح روایت کے مقابلہ میں ان کی تاریخی حیثیت کوئی نہیں ہے۔ علامہ جمال الدین قاسمی نے اس موضوع پر ایضاً الفطرہ فی اہل الفطرہ کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس آیت کا فائدہ از بعثت کی دنیا کا نقشہ پیش کرنا ہے۔ معنی محمد عبدہ مصری نے اپنے رسالہ توحید میں اس وعدہ کی لین انداز میں حکما سی کی ہے۔ ایک انگریز سیرت نگار، وی سی بروڈس نے اپنی کتاب پیغمبر میں زمانہ فترت کی دنیا کا عمومی جائزہ لیتے ہوئے اس وقت کے قابل ذکر ممالک و اقوام کا تذکرہ کیا ہے۔

قدیم روایات کے باوجود چھٹی صدی عیسوی کی اس دنیا میں عربوں کو کوئی اہمیت حاصل نہ تھی۔ حقیقت میں تو کسی کی بھی کوئی اہمیت نہ تھی۔ یہ ایک نزاع کا دور تھا جب کہ مشرقی یورپ اور مغربی ایشیا کی عظیم سلطنتیں اول ہی تباہ ہو چکی تھیں۔ اپنے شاہی دور کے اختتام پر تھیں، یہ ایک ایسی دنیا تھی جو اب بھی ایران کی فصاحت ایران کی عظمت اور روم کی شوکت و جلال سے مستحقر تھی اور کوئی ایسی ایک شے یا کوئی ایسا ایک مذہب بھی نہ تھا جو ان میں سے کسی کی جگہ لیتا۔

علاوہ برساتویں صدی عیسوی میں بسنے زمین پر کوئی قوم ایسی نظر نہیں آتی تھی جو مزاج کے اعتبار سے صالح کہی جاسکے اور نہ ایسی کوئی سوسائٹی تھی جو شرافت اور اخلاق کی قدروں کی حامل ہو نہ ایسی کوئی حکومت تھی جس کی بنیاد عدل و انصاف اور رحم پر ہو اور نہ ایسی قیادت تھی جو علم و حکمت اپنے ساتھ رکھتی ہو اور نہ ایسا کوئی دین تھا جو انبیاء کرام کی طرف صحیح نسبت رکھتا ہو اور ان کی تعلیمات و خصوصیات کا حامل ہو۔ اس گھاٹو پ اندھیرے میں محمد رسول اللہ بشر و نذیر بن کر تشریف لائے۔ اس عالمگیر تاریخی کا نقشہ قرآن نے علی فترت میں ارسال کے مختصر

جملہ کے ذریعہ پیش کیا ہے۔

قربان

قربان یہاں قربانی یعنی ذبح کے معنے میں نہیں ہے بلکہ لفظی معنے اور وسیع مفہوم میں ہے۔ نذر و نیاز کے مفہوم میں ہے۔ رغبہ اصطہالی نے مفردات میں اور البصاح نے احکام القرآن میں بھی معنے بتائے ہیں۔ سب نے ہی ایک زبان پر کر رکھا ہے مانتہا ابی اللہ یعنی قربان وہ چیز ہے جس کے ذریعہ اللہ کا قرب تلاش کیا جائے۔ اسلام و کفر میں حد فاصل صرف یہ ہے کہ مسلمان اپنے صدقہ، نذر و نیاز اور قربانی کے ذریعے اللہ کا قرب تلاش کرتا ہے جبکہ کافر بھی غیر اللہ کے لیے کرتا ہے۔ یہ غیر اللہ مشرکین، مکہ کے بت ہوں یا عیسائیوں کے حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ ہوں یا یہودیوں کے حضرت عزیر ہوں اور یا مسلمانوں کے شیخ جیلانی ہوں۔ اشخاص و افراد کی تبدیلی ممکن ہے اثر انداز نہیں ہوتی ہے۔ شاہ عبدالعزیز نے یہ بات کھول کر سمجھائی ہے :

کھانے پینے کی چیزیں اور اسی طرح دوسرے اموال کو غیر اللہ کے تقرب کی نیت سے دینا حرام اور منکر ہے۔ (فتاویٰ عزیزی)

کلالہ

کلالہ جس کا نہ والد ہو نہ اولاد ہو۔ یہ کلالہ الغلب سے بنا ہے جس کے معنے ہیں نسبت اس کو گھیر لیا۔ کچھ کہتے ہیں کہ کلالہ اس وارث کو کہتے ہیں جو نہ میت کا والد ہو اور نہ اس کی اولاد ہو۔ بعض کا خیال یہ ہے کہ باپ بیٹا آدمی کے دو کنا سے ہیں تو جب مرتے وقت نہ باپ چھوٹے نہ بیٹا تو گویا دونوں کنا سے اس کے مٹ گئے اس لیے اس کو کلالہ کہتے ہیں اور کچھ کہتے ہیں کہ جو چیز گھیرے اس کو اکلیل کہتے ہیں اور میت کو کلالہ اس لیے کہا ہے کہ دوسرے وارث اس کو گھیر لیتے ہیں۔ قانون کی اصطلاحی زبان میں کلالہ اس میت کو کہتے ہیں جس کی نہ اولاد ہو اور نہ والد ہو۔ یعنی نہ بالائی رشتہ ہو نہ زیری۔ صدیق اکبر نے کلالہ کی یہی تعریف کی ہے۔ ادب ابن کثیر فرماتے ہیں یہی حضرت عمر، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ ابن عباس اور حضرت زید بن ثابت کا ارشاد ہے۔ تابعین میں امام شعبی، ابراہیم سفہانی، حسن بصری، قتادہ، جابر بن زید اور الحکم کی یہی رائے ہے۔ اہل مدینہ، اہل کوفہ اور اہل بصرہ کا یہی فیصلہ ہے۔ فقہاء بسند اور

اگر ادب کا یہی موقف ہے بلکہ بتانے والوں نے بتایا ہے کہ اسی پر اجماع ہے۔ اس کے برعکس اہل لغت کہتے ہیں کہ کلام اس وارث کر کہتے ہیں کہ جو میت کا نہ باپ ہو اور نہ اولاد ہو۔ امام راجب فرماتے ہیں کہ بظاہر اصطلاح شریعت اور اہل لغت کے مابین تضاد ہے لیکن دونوں درست ہیں کیونکہ جس میت کے بلا واسطہ وارث نہ ہوں بلکہ دوسرے ہوں تو میت کا رشتہ دوسروں سے کمزور ہوگا کیونکہ بالواسطہ ہوگا۔ اسی لیے ان وارثوں کا رشتہ میت سے کمزور ہوگا جو میت کی اولاد میں سے نہ ہوں اور باپ بھی نہ ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ کلام کے معنی ضعف کے ہیں اور بالواسطہ رشتہ بلا واسطہ کے مقابلے میں ایک کمزور رشتہ ہے اس لیے دونوں پر اطلاق صحیح ہے۔

در اصل کلام کی اصل کلام ہے اور کلام کے معنی کمزوری کے ہیں۔ اعشی کہتا ہے،

فأبیت لا إغنیٰ لها من کلامہ

ولا من حفاحتی تلاقی محمداً

میں نے قسم کھالی ہے کہ اونٹنی پر اس کی تھکاوٹ اور فرسودہ پائی کی وجہ سے اس وقت تک رحم نہ کروں گا جب تک وہ مجھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ تک نہ پہنچائے گی اسی سے وہ زبان جس میں گویائی نہ ہے اور وہ آنکھ جس میں بینائی نہ ہے وہ تلواریں جو کند ہو گئی ہیں اور وہ شخص جو بوجھ نہ اٹھا سکتے۔ کلیل اور کل کہلاتے ہیں۔

خدیجہ ابوبکرؓ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا انک لعلی الکل آپ ترانہ کو اٹھاتے ہیں جو گریسے پڑے ہیں اور کمزوری کی وجہ سے اپنی مدد آپ نہیں کر سکتے اور یہی معنی ہیں اس ارشاد کے کہ من ترف مالاً خلوا رشتہ من ترف کلاً خالی و علی جو شخص مال و اسباب چھوڑ دیتے وہ اس کے وارثوں کا ہے اور جو بوجھ چھوڑ کر جاتے وہ میرے ذمہ ہے۔ تو بیع استعمال کے بعد عرف میں کلام سے وہ لوگ مراد ہوتے ہیں۔ جو منقطع الطرفین ہوں ذان کے والدین ہوں اور نہ اولاد ہو۔ اور جو شخص اباؤ اجداد کی خصوصیات سے محروم ہو جاتے اس کو بھی کلام کہتے ہیں۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے،

ورثتہ قناتہ الملک خلیع کلامہ

عن ابی عبد مناف عبد شمس و حاشم

عبد مناف کے دونوں بیٹوں عبد شمس اور حاشم سے حکومت کا نیزہ تھیں ایسا وراثت

میں ملا ہے جو کند نہیں ہے لیکن تم خود ان خصوصیات سے بے بہرہ ہو۔ قریب کے رشتہ کو چھوڑ کر دُور کے رشتہ کو بھی کلام کہتے ہیں۔ الجصاص رقمطراز ہیں کہ احادیث یاں کلام مرث اور وارث دونوں معنی میں آتا ہے۔

یہ لفظ دو مرتبہ آیا ہے ایک بار سورہ نساء کے آغاز میں پارہ ۴ میں اور دوسری بار سورہ نساء کے آخر میں پارہ ششم کے آغاز میں۔ بھائی بہن تین طرح کے ہیں، سب سے پہلے جن کو ہم کہتے ہیں سوتیلے جو صرف باپ میں شریک ہوں جن کو علاتی کہتے ہیں اور وہ سوتیلے جو صرف ماں میں شریک ہوں جن کو اغیانی کہتے ہیں۔ سورہ نساء کے آغاز میں اغیانی بہن بھائی کی میراث کا ذکر ہے اور اس پر اجماع ہے اور سورت کے آخر میں علاتی اور رضی بہن بھائیوں کی میراث کا ذکر ہے۔



لَا يُحِبُّ اللَّهُ الْجَهْرَ بِالشَّرِّ مِنَ الْقَوْلِ إِلَّا مَنْ ظَلَمَ

وَكَانَ اللَّهُ سَمِيعًا عَلِيمًا ۖ إِنَّ تَبْدُ وَآخِرًا أَوْ تُخْفَوُہ

أَوْ تَعْفُو عَنْهُ سَوْفَ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيرًا ۝

اللہ سبحانہ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ کوئی کسی کو علانیہ بُرا کہے مگر وہ جو مظلوم ہو، اور اللہ سبحانہ سب کچھ جانتا اور سنتا ہے۔ اگر تم لوگ بھلائی کلم کھلا کر دگے یا چھپا کر دگے یا برائی سے درگزر کر دگے تو بلاشبہ اللہ ہی معاف کرنے والا صاحب قدرت ہے۔

قانون ازالہ حیثیت عرفی

کسی کو بُرا کہنے کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک قسم تو قوتِ شرابہ سے تعلق رکھتی ہے اور اس کے مرتکب زیادہ تر زہد، بے باک، نوجوان اور بے تکلف دوست و اصحاب ہوتے ہیں مثلاً جب اس قسم کی بے تکلفانہ اور زندانہ صحبتیں قائم ہوتی ہیں تو عورتوں کے حسن و جمال کا ذکر ہوتا ہے اور اس سلسلے میں اس قسم کے حالات و واقعات بیان کیے جاتے ہیں جو بعض اوقات شرمناک حد تک پہنچ جاتے ہیں۔

کسی کو بڑکھنے کی دوسری قسم کا تعینِ قوتِ غضبیرہ ہے جس کا نام سب و شتم یا گالی گھڑچ ہے اور یہ صورتِ حمولہ جنگ و جدل کے موتی بہ پیش آتی ہے۔ گالی گھڑچ کی مختلف قسمیں ہیں۔ بعض اوقات انسان ایک شخص کے مالِ باپ کو بڑا بھلا کرتا ہے۔ اس کے نسب میں عیب نکالتا ہے۔ کبھی خود اس شخص کے عیوب ظاہر کرتا ہے یہاں تک کہ اگر وہ کسی نفرت انگیز بیماری مثلاً برص جذام میں مبتلا ہو تو اس پر بھی طنز کرتا ہے۔ بعض حالتوں میں اگر اس نے کوئی بُرا کام کیا ہے یا اس کے ساتھ کوئی جڑ بڑاؤ کیا گیا ہے تو اس کا اظہار کرتا ہے۔ قرآن نے اس آیت میں اجمالی طور پر ان تمام صورتوں کی ممانعت کی ہے۔ گویا یہ آیت قرآنی قانونِ ازد و بیثیتِ عرفی کی بنیاد ہے۔ پہلے کسی رکوعوں میں منافقوں کے حالات کو کھول کر بیان کیا ہے۔ اب یہاں بل ایمان کو ایک نہایت بلند درجہ کی اخلاقی تعلیم دی گئی ہے۔ منافق بُت پرست اور یہودی سب کے سب اس وقت ہر ممکن طریق سے اسلام کی راہ میں روڑے اٹھانے اور اس کی پیروی قبول کرنا والوں کو تسانے اور پریشان کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ کوئی بدتر سے بدتر تدبیر ایسی نہ تھی جو وہ اس نذرِ موت کے خلاف استعمال نہ کر رہے ہوں۔ اس پر مسلمانوں میں نفرت اور غضب کے جذبات کا پیدا ہونا ایک نغمی بات تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں اس قسم کا طوفان اٹھتے دیکھ کر فرمایا کہ بدگوئی پر زبانِ کرنا اللہ کے نزدیک کوئی پسندیدہ کام نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ تم مظلوم ہو۔ اور اگر مظلومِ ظالم کے خلاف بدگوئی پر زبان کھولے تو اسے حق پہنچتا ہے لیکن پھر بھی افضل یہی ہے کہ علانیہ ہر باخیز برمال میں بھلائی کے لیے کام کیے جاؤ اور بُرائیوں سے دُور رہو۔ کیونکہ تم کو اپنے اخلاق میں خدا کے اندر سے قریب تر ہونا چاہیے۔ جس خدا کا قرب تم چاہتے ہو اس کی شان یہ ہے کہ نہایت سلیم و بڑا ہے۔ سخت سے سخت مجرموں تک کو رزق دیتا ہے اور بُرے سے بُرے قصور والوں پر بھی دگر رکھے چلا جاتا ہے۔ لہذا اس سے قریب تر ہونے کے لیے تم بھی عالی اور وسیع الخوف ہو۔

۲۱۹ - اللہ سبحانہ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ کوئی کسی کو علانیہ بُرا کہے مگر وہ جو مظلوم ہو اور اللہ سب کچھ جانتا اور سنا ہے۔ یعنی اگر کوئی دین و دنیا کا عیب معلوم ہو تو اس کو مشہور نہ کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ سب کی بات سناؤ اور سب کے کام جانتا ہے، ہر ایک کو اس کے موافق جزا دے گا۔ اسی کو غیبت کہتے ہیں، البتہ مظلوم کو دھت ہے کہ ظالم کا ظلم و مکر سے بیان کرے، ایسے ہی بعض اور صورتوں میں بھی غیبت روا ہے اور یہ مکر بیناں شاید اس لیے فرمایا کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ کسی منافق کا نام مشہور نہ کریں۔ اس میں وہ بگڑ کر شاید بک ہو جائے بلکہ مبہم نصیحت کریں۔ اس طرح

من قی آپ مجھے لگایا تمہاری میں نصیحت کریں کہ شائد ہدایت قبول کرے چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم
 بھی ایسا ہی کرتے تھے کسی کا نام لے کر مشہور نہ کرتے تھے۔

اصل ارشاد میں الجھٹا بالسوء من القول ایسا ہے۔ جبر کسی چیز کے ظہور کو کہا جاتا ہے۔
 بینائی کی افراط سے ہر شے خدائی کی عمر میں مراد صرف اعلان ہے خواہ زبان دہن سے ہو یا زبانِ قلم سے۔
 سوء بُرائی، آفت، گناہ، بُرا کام، عجیب سوء سے اسم ہے۔ علامہ مرتضیٰ زبیدی نے لکھا ہے کہ سوء آفات
 اور امراض کا ایک جامع نام ہے۔ امام راجب فرماتے ہیں۔ سوء ہر وہ چیز ہے جو انسان کو غم میں
 ڈال دے چاہے دنیوی امور سے ہو یا اخروی۔ احوال نفسیہ میں سے ہو یا احوالِ بدنیہ سے یا ان حالات
 میں سے ہو جو کہ جاہ و مال کے چھوٹ جانے اور دوست کے پھرنے یا غم سے پیدا ہوتے ہیں۔ قرآن حکیم
 میں اس کا استعمال جن معانی میں ہوا ہے۔ حافظ سیوطی نے ان کو تفصیل کے ساتھ الاتقان فی علوم القرآن
 میں قلم بند کیا ہے فرماتے ہیں:

سوء کئی طرح پر استعمال ہوتا ہے۔ شدت اور سختی کے لیے یوم و لیلہ سوء العذاب
 کو پنجیں کاٹنے کے لیے لایا سوء ہا بسور زنا کے لیے من اراد باہلث سوء برص کے
 لیے یسار من غیر سوء عذاب کے لیے ان الخبیثات یوم والسوء علی الکافرین شرک کے لیے
 ما کنا فعل من سوء کالی طرح کے لیے لا یحب اللہ الجھٹا بالسوء گناہ کے لیے یعملون السوء
 بجمہالہ برے کے معنی میں لہم سوء الدار نقصان اور ضرر کے معنی میں و یكشف السوء
 شکست اور ہزیمت کے معنی میں لہم سوء۔

اس آیت میں بھی اسی طرح کی ایک تفسیر ہے جیسے آپ پیچھے پانچویں پارے میں لایا تھا
 لن اتقوا الحسد السلام لت مومنًا میں پڑھ آئے ہیں۔ جس طرح وہاں منافقین سے جب دعویٰ
 کا بہرہ کو حکم ہوا تو ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ ہدایت کر دی گئی کہ جو تمہیں سلام کرے تم اس کے سلام کا جواب
 دو اور مقصود اس سے یہ تھا کہ مبادا پڑھو جو مسلمان ان لوگوں سے سلام کلام ہی بند کر دیں جن پر ان کو
 منافقت کا شبہ ہو جاتے۔ اسی طرح یہاں بھی منافقین کے لیے ان المنافقین فی الدارک الاسفل
 من الناس کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں جس سے اس بات کا اندیشہ تھا کہ مسلمان علانیہ سخت الفاظ میں
 منافقین کی برائیوں کا اعلان شروع کر دیں گے۔ اس بنا پر یہ ہدایت کی گئی کہ تعین اشخاص کے ساتھ

لہ افادت شیخ الاسلام

برائی کا اظہار صرف مظلوم کے لیے جائز ہے دوسروں کے لیے اللہ اس کو پسند نہیں فرماتا۔

جماعتی زندگی کا ایک اہم مسئلہ

یہ بات چونکہ جماعتی زندگی کے اہم مسائل میں سے ہے اس لیے اس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ جماعتی زندگی میں کسی گروہ کے اندر اگر کوئی ایسی بڑی پکڑ رہی ہو یا پکڑ چکی ہو جو پوری جماعت کے لیے خطرہ بن سکتی ہو تو اس کا تدارک ضروری ہوتا ہے۔ اور اس تدارک کے لیے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ اس بڑائی کی قباحت اس کے بدنتائج اور اس کے ترجیحیں کے انتہام کو اچھی طرح واضح کر دیا جائے تاکہ جماعت کے افراد اس کے شر سے محفوظ ہو جائیں لیکن ساتھ ہی اس امر کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے کہ جماعت کے عام افراد، عام عنوان سے کئی برائی بات کو صرف اپنے انداز سے اقلیت اور گمان کی بنا پر خاص اشخاص پر منطبق کرنا نہ شروع کر دیں۔ اس سے نہ صرف اس بات کا اندیشہ ہے کہ بہت سے بے گناہ افراد تہمتوں کا نشانہ بن جائیں گے بلکہ جماعت میں انتشار و فساد پیدا ہونے کا بھی خطرہ ہے۔ یہاں منافقین سے متعلق جو باتیں بیان ہوئی ہیں دیکھ لیجئے بالکل عام انداز میں بیان ہوئی ہیں اور مقصد یہ ہے کہ جو لوگ یہ حرکتیں کر رہے ہیں وہ اگر اپنی اصلاح کرنا چاہیں تو اصلاح کر لیں اور اگر وہ اصلاح نہ کریں تو کم از کم مسلمان اپنے آپ کو ان فتنوں سے محفوظ رکھیں۔ اس حد تک یہ چیز نہ صرف یہ کہ ٹھیک ہے بلکہ جماعتی بقا کے لیے ناگزیر ہے، لیکن اگر یہی چیز یہ شکل اختیار کر لے کہ اس کو دلیل بنا کر عام افراد تعین کے ساتھ ایک دوسرے کو حضوں کا نشانہ بنانا شروع کر دیں کہ تو منافق ہے، تو کافر ہو گیا اور فلاں فی الدلائل الاسفل من الناس، مزارعہ ہے تو یہ پوری جماعت میں ایک طوفان مچا کر جاتے ہیں۔ اسی فتنہ کے سد باب کے لیے یہ ہدایت فرمادی گئی کہ تعین اشخاص کے ساتھ برائی کا اظہار و اعلان صرف اس شخص کے لیے جائز ہے جس پر شخصاً ظلم ہوا ہو۔ اس صورت میں ظلم ظالم اور مظلوم تعین مقرر ہوں گے اور قانون اس کا مادہ کر سکے گا جب یہ شکل نہ ہو بات کا انداز عمومی ہونا چاہیے جیسے قرآن نے منافقین کے ذکر میں اختیار کیا ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں بھی جب اس طرح کی کوئی بات آئی تو آپ ہمیشہ عام انداز اختیار فرماتے مثلاً ما بال قوم یغفلون کذا لوگوں کو کیا ہو گیا ہے جو اس طرح کے کام کرتے ہیں، البتہ جب کوئی متعین شخص کسی متعین جرم کے ساتھ سامنے آتا تو آپ اس پر قانون کے مطابق گرفت فرماتے۔

اللہ کو پسند نہیں کا مطلب

آیت نے اخلاق کی اصطلاح میں بدگوئی اور قانون کی زبان میں جھگ عزت کو بالکل ناجائز قرار دیا۔ اور فرد و جماعت، شخص و ملت دونوں کے ہاتھ میں فلاح و مصلح کی ایک بڑی اصل دی۔ الجھڑا بالسود من الغلہ کے تحت میں یہ پند بھی کسی کے عیب کی تشہیر آگئی اور اس کے رد و تبلیغ کا بھی۔ اللہ بعد نہیں کرتا کا مطلب یہ ہے کہ زبان کو بڑے الفاظ لعنت، طامت، گالی گلوچ، جھوڈت اور اس طرح کی جملہ بدگوئیوں سے آلودہ کرنا ممنوع اور خدا کی ناراضگی کا باعث ہے جن سے ایک طرف تو انسان کی بے قدرتی ہو اور دوسری طرف اس کی بے شرمی، بد طبیعتی اور بد تمدنی کا اعلان اور اس کی اس بے ضروری کا اظہار ہو کہ وہ اپنے نفس کو جا ملانہ جذبات اور شیطانی دوسرے مشاغب و غرور، تمغیک و تحقیر اور ہزل گوئی و بدگامی وغیرہ اخلاقی رذائل سے اپنی زبان کو روکنے پر قابو نہیں رکھتا۔ بدگوئی کی شامت اور نگرانی کا اندازہ آیت قرآنی کے اس بلیغ اور مؤثر انداز بیان سے کیجئے جو اس کی ممانعت کے لیے اس نے اختیار کیا ہے۔ اس ممانعت کا عام اور معمولی طریقہ یہاں تو یہ تحذیریں کہہ لیتا لا تجھڑوا بالسود من الغلہ انہی بات نہ کہو، لیکن اس کے بجائے لا یحب اللہ الجھڑ بالسود من الغلہ کا اسلوب اختیار کر کے دراصل حکیمانہ طور پر اس امر کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ یہ چیز ناراضی خدا کا باعث ہے۔ اس لیے خواہ کچھ ہو اس کا ارتکاب نہ ہونے پڑے۔

بدگوئی کا یہ حکم عام نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس میں ایک استثناء بھی رکھا ہے اور مظلوم کو ظالم کے خلاف زبان طامت کھولنے کی اجازت دی ہے۔ یہ بات بہت سے مصالح پر مبنی ہے مظلوم اگر ظالم کے ظلم و ستم سے تنگ آکر بددعائیں دے، نالہ و فریاد کرے اور اس کی برائیوں اور مظالم کو بیان کرے تو اللہ تعالیٰ کو مظلوم کی یہ بدگوئی پسند نہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ لوگ اس کی مظلومیت اور بے بسی پر ترس کھائیں اور ظالم کو اس کے ظلم سے روکیں یا ایسا ہو کہ بدنامی اور رسوائی کے خوف سے ظالم خود ہی باز رہے۔ اس کے علاوہ تھنا سے فطرت ہے کہ زخم خوردہ اور مظلوم انسان اگر کچھ نہیں کر سکتا تو کم از کم مظالم پر لعنت بھیج کر اور ظالم کو برا بھلا کہہ کر ہی اپنے غم و غصہ کی آگ بجھا لینا ہے اور اس اشتنا کی دوسری اہم وجہ اور مصلحت جس پر باطنی آملی شہادہ پہنچ سکتی ہے یہ ہے کہ ظلم بدترین گناہ اور ظالم ایک حیوان صفت انسان ہے جو اللہ کے نزدیک سخت مغضوب، ذلیل اور اس کی فحاشیوں سے محروم ہے حتیٰ کہ اس کی طامت اور بدگوئی کرنا بھی اللہ کو پسند نہیں ہے۔

بذر بانی سے پہنچنے کے مصالح

قرآن و حدیث میں جا سبھا بذر بانی سے پہنچنے کے حکم و مصالح نہایت تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں مثلاً اول یہ کہ بذر بانی میں لوگ علو تا ریادتی کرتے ہیں۔ یعنی اگر ایک شخص ایک بار کسی کے پاس سے بذر بانی کرتا ہے تو دوسرا دوبار کرتا ہے، اگر ایک شخص کسی کے باپ سے پاس سے بذر بانی کرتا ہے تو دوسرا اس کے باپ اور ماں دونوں کو اس میں شامل کر لیتا ہے، اس لیے دوسرے کی تعدی سے محفوظ رہتے کا طریق یہ ہے کہ کسی کے پاس سے بذر بانی نہ کی جائے۔ اللہ سبحانہ نے قرآن مجید کی اس آیت میں یہی نکتہ بیان کیا ہے۔

وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسْبُوهُمُ اللَّهُ عَذَابًا
بِغَيْرِ عِلْمٍ۔

مسلمان! ان لوگوں کو بُرا نہ کہہ جو خدا کے سوا دوسرے معبودوں کو پکارتے ہیں کہ یہ لوگ بھی نادانی سے بڑھ کر خدا کو بُرا کہہ بیٹھیں گے۔

اسی نکتہ کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں اس طرز بیان فرمایا ہے کہ سب بُرائی یہ ہے کہ آدمی اپنے ماں باپ پر لعنت بھیجے کہا گیا یا رسول اللہ! کوئی اپنے ماں باپ پر کیوں کر لعنت بھیج سکتا ہے فرمایا اس طرح کہ جب کوئی کسی کے باپ کو بُرا بھلا کہے گا تو وہ بھی اس کے ماں باپ دونوں کو بُرا بھلا کہے گا۔ (بخاری کتاب الادب)

دوسرے یہ کہ بذر بانی آدمی اجتماعی اور معاشرتی زندگی کے فوائد سے محروم ہو جاتا ہے اور لوگ اس سے فائدہ چھوڑ دیتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ ایک شخص حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے آیا آپ نے اس کو دیکھا تو فرمایا کہ اپنے قبیلہ میں یہ نہایت بُرا آدمی ہے لیکن جب وہ آپ کے پاس بیٹھا تو آپ اس سے نہایت خندہ پیشانی سے ملے۔ جب وہ چلا گیا تو حضرت عائشہ نے کہا کہ جب آپ نے اس کو دیکھا تو بُرا کہا۔ پھر اس سے نہایت لطف و محبت سے ملے۔ فرمایا عائشہ تم نے مجھے بذر بانی کب پایا۔ خدا کے نزدیک قیامت کے روز ان سب سے بُرا شخص وہ ہو گا جس کی بذر بانی کے خوف سے لوگ اسے چھوڑ دیں۔ (بخاری کتاب الادب)

تیسرے یہ کہ بذر بانی دورِ وحشت و جہالت کی یادگار اور تہذیب و شائستگی کے خلاف ہے ایک بار حضرت ابوذر نے ایک غلام کو ماں کی نکالی دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع

ہوتی تو فرمایا تم میں جاہلیت کا اثر باقی ہے۔ (صحیح بخاری)

امام بخاری نے ادب المفرد میں اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ غلاموں اور نوکروں سے بدزبانی کرنا جائز نہیں ہے۔

پوچھتے یہ کہ رفت و ملائفت اور شرم و عیا شریفانہ اخلاق میں اور اسلام نے خاص طور پر ان کی تعلیم دی ہے لیکن بدزبانی ان کے بالکل خلاف ہے۔ ایک بار کچھ یہود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام کی بھالتے، اسام علیکم دم کو موت آئے، کہا۔ حضرت عائشہ نے جواب میں کہا عینکم ولعنکم اللہ وغضب اللہ علیکم حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا کہ اے عائشہ نرمی اختیار کر اور سختی و بدزبانی سے بچ۔ (بخاری کتاب الادب)

پانچویں یہ کہ بدزبانی سے روکنے کا ایک دقیق نکتہ یہ ہے کہ اس میں عوامی شرعی اور بے حیائی کی باتوں کو الفاظ کی صورت میں منہ سے نکالا جاتا ہے اور سنایا جاتا ہے۔ اس سے سوسائٹی میں ان مکروہ باتوں کو سننے اور سنانے کی جرأت پیدا ہوتی ہے اور بے حیائی کے الفاظ بڑھ کر اعمال کی صورت اختیار کر لیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بدزبانی کو حیا کے بالمقابل ذکر فرمایا۔ ارشاد ہے کہ بدزبانی جس چیز میں شامل ہوتی ہے اس کو بدنا بنا دیتی ہے اور حیا جس چیز میں شامل ہوتی ہے اس کو زینت سے دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بدزبانی حیا کے خلاف ہے۔

چھٹے یہ کہ بدزبانی سے لوگوں کو اذیت پہنچتی ہے۔ حالانکہ مسلمانوں کو ایذا رسانی سے احتراز کرنا چاہیے اسی لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان وہ ہے کہ جس کے اٹھ اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں۔ (مسلم کتاب الایمان) مردوں کو برا بھلا کہنے کی ممانعت اسی لیے کی گئی ہے کہ اس سے زندوں یعنی مردوں کے عزیز و اقارب کو تکلیف ہوتی ہے۔ (ترمذی)

ساتویں یہ کہ بدزبانی باہم لڑائی کا پیش غیر ہے اور مسلمانوں کے ساتھ لڑا کفر ہے اس لیے جو چیز اس کا ذریعہ بنتی ہے وہ اگر کفر نہیں تو کم از کم فسق منور ہے۔ اسی بنا پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ "مسلمان کو برا بھلا کہنا فسق ہے اور اس کے ساتھ لڑا کفر ہے۔ (بخاری کتاب الادب)

ان تمام مراتب کے پیش نظر کہنے کے بعد یہ بات واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ بدزبانی قرآنی تعلیمات اور اسلامی خصوصیات کے منافی ہے اس لیے جو شخص صحیح اسلامی زندگی اللہ کی پسند کے مطابق بسر کرنا چاہتا ہے وہ اس بد اخلاقی میں مبتلا رہنا کبھی گوارا نہیں کرے گا۔

اخلاق اور محبت الہی

ذرا غور جائیے اور یہاں اس پہلو پر بھی غور فرمائیے کہ دین و دنیا کی سب سے بڑی نعمت اللہ سبحانہ کی محبت ہے یعنی وہ پیار جو اللہ سبحانہ کو اپنے بندے سے ہو۔ یہ آیت بتا رہی ہے کہ یہ غیر فانی نعمت اور یہ لازوال دولت جن دلوں سے حاصل ہوتی ہے ان میں دیگر ضروریات دین کے علاوہ سب بڑا اور اہم ذریعہ حسن اخلاق ہے۔ اللہ سبحانہ کی محبت پر زور تو قرأت اور انجیل میں بھی ہے۔ مگر اصل یہ ہے کہ خدا کی محبت کے حصول کا طریقہ کیا ہے؟ اور یہ دولت انسان کو کیوں کر حاصل ہو سکتی ہے اس کا جواب صرف قرآن نے دیا ہے۔ مختصراً یہ کہ ہر کام اور ہر چیز میں صاحب خلق عظیم داعی خیر کی پیروی محبت الہی کا ذریعہ ہے اس لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات ارشادات احکام، اخلاق اور اعمال کی پیروی محبت الہی کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں لیکن قرآن نے اس مختصر جواب پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس نے نام بنام بتایا ہے کہ خدا کی محبت کے مستحق اور سزاوار کون کون ہیں اور اس دولت سے محروم کون ہیں۔ اس سے اسلامی اصول اخلاق کا یہ مسئلہ سمجھ میں آتا ہے کہ ان کاموں میں جو خدا کی محبت کا ذریعہ ہیں، حسن خلق یہی ہے اور ان امور میں جن سے یہ نعمت چھین جاتی ہے۔ بد اخلاقی یہی ہے۔

قرآن نے منفی اور مثبت دونوں پہلو پیش کیے ہیں منفی پہلو کی حد تک اس کی پکار اگر یہ ہے کہ کفر، بدگوئی، بد لینے میں حد، آگے بڑھ جانے، فخر و غرور، حسد، خیانت، انانیت، فساد، اس ظلم اور گناہ وہ بد اخلاقیات ہیں جو انسان کو محبت الہی کے سایہ سے دُور کرتی ہیں۔ تو مثبت پہلو کی حد تک اس کا اعلان یہ ہے کہ ایمان، اسنان، توبہ، توکل، انصاف، تقویٰ، صبر، پاکیزگی اور جہاد وہ اخلاق حسنہ ہیں جو محبت الہی کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔

بدزبانی، علانیہ اور پوشیدہ دونوں حرام ہیں

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ علانیہ بُرائیوں کو ناپسند کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اللہ کو خفیہ بدزبانی پسند ہے۔ علانیہ اور جہر بالسوء کی قید استرازی نہیں بلکہ اتفاقی ہے اور منافقین کے یہاں فساد کی مناسبت سے ہے ورنہ جیسے جہر بالسوء اللہ کو پسند نہیں ہے ایسے اسرار بالسوء بھی اللہ کو پسند نہیں ہے قرآن میں سمجھائی بالاثم والعدوان کی ممانعت آئی ہے اور پھر قرآن نے صراحتاً متعدد آیتوں میں کسی کے پاس میں بدزبانی کے معنی طریقوں کی بُرائی بیان کی ہے۔

وہی مکمل ہندو مت لہذا ہر شخص جو لوگوں کی محبت چاہتا اور ان پر اواز سے کہتا ہے اس کی بڑی تباہی ہے۔

اس نتیجہ بدزبانی کے جن معنی اور دلغزاش طریقوں کی خدمت کی گئی ہے ان کی توضیح ترجمہ سے نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے لیے اہل لغت کی تصریحات پیش نظر رکھنی چاہئیں جو حسب ذیل ہیں :

- ۱۔ ہندو سامنے اور لہجہ پیچھے بڑائی کرنا۔
- ۲۔ حمز خاص طور پر لوگوں کے نسب کی بڑائی بیان کرنا۔
- ۳۔ حمز ہاتھ کے اشارے سے اور لہجہ زبان سے بڑائی کرنا۔
- ۴۔ حمز زبان سے اور لہجہ آنکھ کے اشارے سے بڑائی کرنا۔
- ۵۔ حمز بڑے الفاظ سے ہم نشینوں کی دل آزاری کرنا۔
- ۶۔ لہجہ آنکھ ہاتھ سر اور دھڑکے ہم نشینوں کی بڑائی کرنا۔

اس سے معلوم ہوا کہ بدزبانی کا دائرہ کہاں تک وسیع ہے۔

آخر میں ارشاد ہے وکان اللہ سمیعاً علیماً اس میں تنبیہ فرمادی۔

اذ لایہ کہ مظلوم کے علاوہ اگر کوئی شخص بدزبانی سے احتیاط نہ کرے گا تو اس کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ سبحانہ اس سے بے خبر اور ناواقف نہیں ہے بلکہ اس کی شان یہ ہے کہ وہ تمہاری بدزبانی کو سنتا اور جانتا ہے اس لیے اگر تم اس عادت کو نہ چھوڑو گے تو اس کی پاداش بہر حال تمہیں ملگنی ہوگی۔

ثانیاً، مسیح میں ایک طرف تو خاتم کو تنبیہ ہے کہ مظلوم کہیں فریاد نہ کر جائے نہ جائے اور تو بہر صورت اس کی سن ہی رہا ہے اور دوسری طرف مظلوم کو بھی ترغیب ہے کہ مظلومی کے سامنے خواہ مخواہ زیادہ وادیلہ نہ کرے یقین رکھے کہ اللہ تو سن رہا ہے اور علما کی صفت لاکر بھی ظالم و مظلوم دونوں کو یاد دلایا ہے کہ کوئی زبان سے بولے یا زبر لے اللہ پھر ظلم کی فریقت و حقیقت جہاں ہے

ثالثاً، اس میں اشارہ ہے کہ اگر کوئی شخص اس ہدایت کے خلاف روش اختیار کرے گا تو وہ یاد رکھے کہ اللہ سبحانہ سننے والا اور جاننے والا ہے یعنی اسی پر وہ گرفت کرے گا۔

فضائل اخلاق کی ترغیب

۲۲۰۔ اگر تم لوگ بھلائی کلمہ کھلا کر دو گے یا چھپا کر کر دو گے یا بڑائی سے درگزر کر دو گے تو بلا خیر

اللہ سبحانہ مصافحہ کرنے والا صاحب قدرت ہے۔ اس آیت میں مظلوم کو معافی کی رغبت دلائی

منظور ہے کہ حق تعالیٰ زبردست اور قدرت والا ہر کس خطا والوں کی غلطی بخشا ہے۔ ہندو زیر دست عاجز کو بطریق اولیٰ دوسروں کی خطاؤں کو معاف کر دینا چاہیے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ مظلوم کو ظالم سے بدلہ لینا جائز ہے مگر افضل یہ ہے کہ بر کرے اور بخش دے۔ آیت میں اشارہ ہے اس طرف کہ منافقوں کی اصلاح کرنا چاہئے ہوتو ان کی ایذا اور شرارت پر صبر کرو اور نرمی اور پردہ سے ان کو سمجھاؤ، ظاہر کی لعن و لعن سے بچو اور کھلا مخالفت نہ بناؤ۔ بلکہ

اس آیت میں اہل ایمان کو اخلاقِ حسنہ کی تعلیم دی گئی۔ یہاں تین وجہ سے بیان کیے ہیں۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ انسان نیکی کرتا ہے اور ساتھ ہی وہ اس کا اظہار بھی کر دیتا ہے۔ یہ ایک درجہ ہے لیکن بالکل ابتدائی اور سطحی قسم کا درجہ ہے ان تبدواخیروں کا منہموم یہی ہے۔ غیر سے مراد ہر قسم کی نیکی ہے لغتاً کی کردہ کی۔ صدقہ و خیرات کی۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ نیکی کرے اور اس کا اظہار نہ کرے بلکہ اپنے عمل کا تمام تر منہموم رہنا ہے۔ انہی دیکھے یہ اوسنچام تہ ہے اور ارشاد میں اودحتفوا سے اسی طرف اشارہ انصوریہ۔ نیکی میں عمل اور ضابطہ کی بات یہی ہے کہ اس کی پابجائی ہو۔ یہ بات کہ نیکی کا چھپا یا افضل ہے یا ظاہر کرنا۔ نیکی کرنے والوں کے احوال کے اختلاف سے تعلق رکھتی ہے۔ زندگی میں ایسے مواقع ضرور پیش آتے ہیں جہاں نیکی کا اعلان و اظہار بھی ضروری ہے۔ ایک شخص جو کہ پاس سے نہر حال ہے یا ہتھامی میں مبتلا شریک پر پڑا تو پ رہا ہے۔ آپ قریب سے گزر رہے ہیں اور آپ کے اختیار میں ہے کہ آپ اسے کھانا کھلا کر یا دھوا چاکر از سر نو زندہ کر دیں لیکن اس اندیشہ سے کہ کہیں آپ کی اس خدمت کا شمار یا کارنامہ میں نہ ہو جائے اس کے پاس سے گزرتے گزر جاتے ہیں۔ یہ تقویٰ نہیں عین معصیت اور وہم پرستی ہے۔ یہاں ضرورت فی الفور مدد رسانی کی ہے خواہ اس کا اعلان بھی کرنا پڑے۔ جن لوگوں نے نیکی کے اہتمام یا اخفا کی تاکید حد سے زیادہ کی ہے اور خدمتِ خلق کو مخفی رکھنے کے ساتھ محدود و متبہد کر دیا ہے ان کی تعلیم یقیناً ناقص یا ناقص یک طرفہ ہے اور انہوں نے زندگی میں پیش آنے والے بکثرت واقعات کو منظر انداز کر دیا ہے۔ ضابطہ یہی ہے کہ عمل خیر کے اعلان و اخفا میں اختیار ہے اور ساتھ ہی فضیلت اخفا کی ہے جب اظہار و اعلان میں خاص مصلحت نہ ہو۔

تیسرا مرتبہ یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کو ناگواریاں پیش آئیں اور وہ ان کو منظر انداز کر جائے اور

برائی کرنے والے سے بدلہ لیا جلتے یہ نفس کے لیے بہت شاق ہے اور اس کا درجہ سلوک و اخلاق کے غنہی کو ملتا ہے اور آخر میں عفو و قدر کا اضافہ کر کے بنادیا کر جب گنہگاروں اور بدکاروں کو معاف کرنا خدا کی صفت ہے تو بندوں میں بھی خدا کی اس صفت کا جلوہ پیدا کرنا چاہیے اور یہاں یہ بیخ شکہ قابل توجہ ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ تمہارا خدا تو ہر قسم کی قدرت علی الاطلاق رکھنے کے باوجود اپنے بندوں کو معاف کرتا ہے تو انسان جس کی قدرت محدود ہے اور جس کا اختیار مشروط ہے اور جس کی عاجزی و درماندگی ظاہر ہے اس کو تو بہر حال معاف بھی کرنا چاہیے۔ امام رازی نے یہاں یہ بات خوب ارشاد فرمائی ہے کہ آیت کے ان دو مختصر جملوں میں اخلاق و سلوک کا سارا خلاصہ آگیا ہے۔

قانون اور اخلاق کی مجموعی تعلیم

زیر نظر آیت کی تشریح نشترہ ہانے گی۔ اگر ہم اس پر مجموعی حیثیت سے ایک نظر نہ ڈالیں پہلی آیت میں مظلوم کو دوسری کی خاطر بدلہ لینے کی اجازت دی ہے۔ اور اس آیت میں مظلوم کو معاف کرنے کی ترغیب دی ہے۔ اس حیثیت سے یہ آیت بتا رہی ہے کہ اسلام قانون و اخلاق کا مجموعہ ہے۔ قانون اس نے ہر مظلوم اور صاحب حق کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ چاہے تو تورات کے حکم کے مطابق اس کا بدلہ لے لیکن اس سے بلند تر بات یہ ہے کہ وہ انجیل کے مطابق اس ظالم کو معاف کر دے بلکہ بڑائی کی جگہ اس کے ساتھ بھلائی کرے۔ اس مجموعی تعلیم نے حکومت کے قانون انتظام و عدل اور شخص کی اخلاقی روحانیت کی تکمیل دونوں کو اپنی لہی جگہ قائم رکھا ہے اور اس لیے وہ نسل انسانی کی حفاظت، ترقی اور نشرو نما کا پوری طرح مکمل ہے۔ وہ عدل و انصاف کے جزو قائم کرنے کی بھی صلاحیت رکھتی ہے اور ذاتی اخلاق کے ذریعے سے لوگوں کی روحانی تکمیل میں کسی طرح حرج نہیں۔ وہ نہ یہودیوں کی شریعت کی طرح صرف مردہ جسم ہے اور نہ عیسائیوں کی تعلیم کی طرح غیر محسوس روح ہے بلکہ وہ جسم و جان کا مجموعہ اور زندہ اور محسوس پیکر ہے۔

موسوی، عیسوی اور محمدی اخلاقی تعلیمات میں باہم جو باریک فرق ہے۔ اس کا جنی ہی ہے کہ موسویت اور عیسائیت میں قانون اور اخلاق الگ ہیں اور اسلام ان دونوں کی ترکیب کا نام ہے۔ اسلامی قوانین کو پیش نظر رکھ کر مخالفین نے اکثر کہا ہے کہ اسلام کی تعلیم اخلاقی روح نہیں ہے لیکن اگر وہ قانون محمدی کے ساتھ اخلاق محمدی کو سامنے لکھتے تو ان کو یہ شبہ پیش نہ آتا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے نام پر جو تعلیم پیش کی ہے وہ عفو اور عادلانہ انتقام یعنی اخلاق

اور قانون دونوں کا مجموعہ ہے۔ اس حیثیت سے آپ پورے اسلامی نظام پر منظر ڈالیں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ سیاسی نظام، معاشی نظام، معاشرتی نظام، مالیاتی نظام اور عائلی نظام میں ہر جگہ کس خوبصورتی سے قانون و اخلاق میں مناسبت کی گئی ہے۔

الفرض قانون و اخلاق یعنی انتظام و عفو میں سے کسی ایک ہی کو اختیار کرنا دنیا کے جسمانی یا روحانی نظام کا نقص ہے۔ اگر انتظام اور منرا کا اصول نہ ہو تو جماعت کا نظام قائم نہیں رہ سکتا اور نہ ملک میں امن و امان رہ سکتا ہے۔ اور نہ افراد کے بڑے حصے کو برائیوں سے باز رہنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر عفو کا اصول نہ ہو تو روح کی بلندی اور اخلاق کی پاکیزگی کی کوئی چیز نہ رہے حالانکہ وہ ہی ایک اچھے اور صحیح نظام حیات کا مطلب ہے۔ اس لیے ان میں سے کسی ایک کو لینا اور دوسرے کو چھوڑ دینا نظام ہستی کو آدھا رکھنا اور آدھا مٹا دینا ہے۔

اس لیے قرآن نے ایک ایسی تعلیم پیش کی ہے جس کی نظر انسانی ہستی کے پورے نظام پر ہے اس نے یہ کیا کہ منرا اور انتظام کو تو جماعت اور حکومت کے ماتحت میں لے دیا اور اس حکم کے ساتھ دیا کہ اس کے اجزاء میں کوئی رحم نہ کیا جائے اور نہ اس میں بڑے، چھوٹے، امیر و غریب اور اپنے اور غیر میں کوئی فرق نہ کیا جائے تاکہ جماعت اور ملک کا نظام قائم رہے۔ دوسری طرف عفو کو شخصیت کے مدارج کمال کا ذریعہ بنایا۔ تاکہ اشخاص کی روحانی پاکیزگی اور اخلاقی بلندی برابر ترقی کرتی جائے بہر حال انتظام و عفو دونوں کا اپنی اپنی جگہ مقام ہے۔ قانون کی حد تک انتظام ہے لیکن عفو کا درجہ اخلاق و احسان کا ہے۔ اس لحاظ سے اسلامی قانون موجودہ ترقی پذیر ملکوں کے قوانین سے زیادہ نرم زیادہ منصفانہ اور عقل کے زیادہ مطابق ہے لیکن عفو کی عام تعلیم کا دائرہ اسلام میں اس سے زیادہ وسیع ہے۔ اخلاق کی سب سے بڑی بھاری اور دشوار تعلیم جو اکثر نفوس پر شاق گزرتی ہے وہ عفو و درگزر، ضبط نفس، تحمل اور برداشت کی ہے لیکن اسلام نے اس سنگلاخ کو بھی نہایت آسانی سے طے کر دیا ہے اور قرآن نے ایک سے زیادہ آیات میں صبر و برداشت، تحمل اور عفو و درگزر کو بڑی ہمت اور اخلاقی بہادری کا کام بلکہ خدا کی محبوبی کا سبب بنایا ہے۔ اہل ایمان کو اس پر عمل کرنے کی دعوت دی ہے بلکہ یگانے تو بگائے قرآن نے تو ایمان والوں کو حکم دیا ہے کہ وہ بیگانوں اور اپنے دشمنوں کو بھی معاف کر دیں۔

قل للذین آمنوا لیغفروا للذین لا یرجون ایام اللہ

لئے پیغمبر اہل ایمان سے کہہ دو کہ وہ ان کو معاف کر دیں جو ایام اللہ کی امید نہیں۔

ایمان اللہ خدا کی گرفت کے دن کی ہوا امید نہیں رکھتے ظاہر ہے کہ وہی ہیں جو کافر ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ کفر کے خلاف اسلام کے جذبات کس قدر شدید ہیں۔ اس کے باوجود مسلمانوں کو یہ تاکید کی جاتی ہے کہ وہ ان کو صاف کر دیں اور ان کی غلطیوں سے درگزر کریں۔ کیا اس سے زیادہ اسلام سے کسی نرمی کا مطالبہ ہے؟ زیر تشریح آیت میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی ترغیب کی خاطر اس عمرو و درگزر اور معافی کو اپنا خاص وصف بنا کر اہل ایمان کو اپنی پیروی کی تلقین فرماتا ہے کہ تمہارے لیے بہتر اور اچھی اور پسندیدہ روش یہی ہے کہ اچھے جذبات دل میں پرورش کرو اور دوسروں کی برائیوں سے درگزر کرو۔ کیونکہ

در عفو لا قیست کہ وہ انتقام نیست

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ
 اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ
 أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَلِكَ سَبِيلًا ۖ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا
 وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ۖ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ
 وَرُسُلِهِ وَلَمْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ أُولَٰئِكَ سَوْفَ
 يُؤْتِيهِمْ أَجْرُهُمْ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا



جو لوگ خدا سے اور اس کے پیغمبروں سے کفر کرتے ہیں اور
 خدا اور اس کے پیغمبروں کے درمیان فرق کرنا چاہتے ہیں اور
 کہتے ہیں کہ ہم کچھ کو مانتے ہیں اور کچھ کو نہیں مانتے، اور ایمان
 و کفر کے درمیان ایک راہ نکالنا چاہتے ہیں۔ وہ بلاشبہ
 پکے کافر ہیں۔ اور ہم نے کافروں کے لیے ذلت والا
 عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اور جو لوگ اللہ اور اس کے

پیغمبروں پر ایمان لائے اور ان میں سے کسی کے درمیان
کسی میں فرق نہیں کیا ایسے لوگوں کو وہ عنقریب ان کے
اجر عطا کرے گا اور اللہ بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے۔^{۱۲۴}

ایک نبی کا انکار بھی کفر ہے

اہل کتاب اور منافقوں میں یہ چیز قدر مشترک تھی کہ وہ خدا اور رسول کی باتوں کو علم کی حد تک مانتے
تھے مگر عمل کی حدود میں انکار کرتے تھے۔ اور اہل کتاب میں یہودیوں میں یہ چیز زائد تھی کہ وہ کچھ رسول
کو مانتے تھے اور کچھ کو نہیں مانتے تھے۔ اسی مناسبت سے منافقین کے ذکر کے خاتمہ پر ربط معنوں
کے لیے یہود اور عیسائیوں کا ذکر کیا ہے اور پھر منافقین کے لفاظ کا سارا رد و مدار اہل کتاب سے
تعلقات تھے۔ ان سے سیاسی تعلقات، مقدمات میں ان کی عدالتوں سے جنگی، منافقین یہود و اہل
کتاب سے کاٹنے کے لیے تیار نہ تھے بلکہ وہ اپنے اس رویہ کو جائز ثابت کرنے کے لیے یہ حیل تراشتے
تھے کہ اہل کتاب بہر حال اہل کتاب ہیں۔ ان میں دینی لحاظ سے کچھ خرابیاں ہیں لیکن ان خرابیوں کی
وجہ سے ان کو بالکل کافروں کی صف میں کمر کر دینا اور ان کے ساتھ کافروں کا معاملہ کرنا درست
جہیں ہے۔ قرآن نے یہاں نہایت صراحت کے ساتھ بتایا ہے کہ پچھے کا فرق یہی ہیں کہ یہ اللہ اور اس
کے رسولوں کے درمیان تفریق کرتے ہیں۔ اللہ نے جن کو رسول بنا کر بھیجا ہے، ان میں سے جس کو
چاہتے ہیں مانتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں نہیں مانتے۔ قرآن کی زبان میں اسی کا نام تفریق بین اہل
ہے۔ یعنی خدا کے رسولوں میں باعتبار تصدیق تفرق و امتیاز کرنا یہی سہا بھگنا کر ان میں سے فلاح بچا تھا
فلاح بچا تھا، یا کسی ایک کی تصدیق کرنی باقی سب انکار کر دینا۔ سب کی تصدیق کرنی کسی ایک
کا انکار کر دینا۔ قرآن کہتا ہے ہر راست باز انسان کا جو خدا کے پچھے دین پر چلنا چاہتا ہے فرض ہے
کہ بلا کسی امتیاز کے تمام رسول، تمام کتابوں، تمام دعوؤں پر ایمان لاتے اور کسی ایک کو سب انکار
نہ کرے۔ راہیں صرف دو ہیں ایمان کی اور انکار کی۔ ایمان کی یہ ہے کہ سب کو مانو، انکار کی یہ ہے کہ

سب کا یا کسی کا انکار کر دو۔ کسی ایک کا انکار بھی وہی حکم رکھتا ہے جو سب کے انکار کا ہے۔ قرآن کا الفاظ پر غور کیجئے یہ صاف اعلان کرتے ہیں کہ کسی ایک رسول کا انکار بھی آخری درجہ کا کفر ہے اور اس ایک انکار کی موجودگی میں باقی سارے اہلیہ کا اقرار بھی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا۔

۲۶۱- جو لوگ خدا سے اور اس کے پیغمبروں سے کفر کرتے ہیں اور خدا اور اس کے پیغمبروں کے درمیان فرق کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کچھ کو مانتے ہیں اور کچھ کو نہیں مانتے۔ یہاں سے ذکر ہے یہود کا جو کھو بیوہ میں نفاق کا مضمون بہت تھا اور آپ کے زمانے میں جو منافق تھے وہ یہود تھے یا یہودیوں سے ربط اور محبت رکھنے والے اور ان کے مشورے پر چلنے والے تھے اس لیے قرآن شریف نے انہوں کو ذکر اکٹھا فرمایا ہے۔ آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں سے منکر ہیں اللہ اور اس کے رسولوں میں فرق کرنا چاہتے ہیں یعنی اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور رسولوں پر ایمان نہیں لاتے اور بعض رسولوں کو تو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے۔

مطلب یہ ہے کہ یہ خدا پر ایمان اپنی شرائط پر لانا چاہتے ہیں نہ کہ خدا کی شرائط پر۔ حالانکہ ایمان وہی معتبر ہے جو اللہ سبحانہ کی شرائط پر ہو۔ اگر ایمان کی شرطیں بھی مقرر کریں گے اور رسولوں کا انتخاب یہ اپنے ہی صوابدید اور اختیار تفسیری سے کریں گے تو پھر خدا کی خدائی کہاں رہی پھر تو خدائی کا منصب انہوں نے خود ہی سنبھال لیا۔

در اصل اس آیت میں ان پر جو فرض عائد کی گئی ہے وہ یہ ہے۔

اولاً یہ کہ اللہ اور اس کے رسولوں کا کفر کرتے ہیں۔

ثانیاً یہ کہ وہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق کرنا چاہتے ہیں۔

ثالثاً یہ کہ وہ کچھ پر ایمان لاتے ہیں اور کچھ کا انکار کرتے ہیں۔

اللہ و رسول سے کفر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کو مانتے ہیں اور نہ خدا کے رسولوں کو مانتے ہیں۔ صاحب مدح نے یہاں یہ بات بڑے پتے کی مکھی ہے کہ یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ زبان سے صراحتہ خدا اور رسول کا انکار کرتے ہیں بلکہ خشیائے اللہ اور رسول کے بائے میں ان کے انکار و اعمال کا تقاضا ہی ان کا انکار ہے یعنی ان کے فکر و عمل کا لازم یہ ہے کہ وہ خدا اور رسول کو نہیں مانتے ہیں۔

الہٰ اور اس کے رسولوں میں فرق کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ خدا کو مانتے ہیں مگر خدا کے رسولوں کو نہیں مانتے۔ یا یہ کہ خدا کے رسولوں میں سے کچھ کو نہیں مانتے اور کچھ کو مانتے ہیں۔ اور یہ بھی اس کے مفہوم میں داخل ہے کہ الہٰ کی بات مانتے ہیں اور الہٰ کے رسول کی بات نہیں مانتے۔

احکام دین، تفریق کی حرمت

اور یہ بھی اس کا مدلول ہے کہ زندگی کی مختلف شاخوں میں سے کچھ شاخوں میں الہٰ اور اس کے رسول کو مانتے ہیں اور کچھ میں نہیں مانتے۔ حالانکہ خدا اور رسول کو ماننے کا بنیادی عقائد ہے کہ احکام میں پروردگار کی حد تک ہرگز کوئی تفریق نہ رکھتے۔ درج بالا کے ہر سب کے احکام تو اطاعت کے لیے ہی دیے جاتے ہیں اور اس لحاظ سے حکم سب برابر ہیں۔ آج ملک کہیں بھی محکوم اور غلام کا یہ حق تسلیم نہیں کیا گیا ہے کہ وہ آقا کے احکام کی بجا آوری میں من مانی کر سکتا ہے۔ چاہے تو ان احکام کو حسب خواہش دو حصوں میں بانٹ دے۔ ایک حصے کو واجب الاطاعت سمجھ کر اس کی اطاعت کرے اور دوسرے کو غیر ضروری اور زائد قرار دے کر پس پشت ڈال دے۔ پھر فرمانبردار کے مطلق اُقتار سے حقیقی کے محکموں اور غلاموں کو کب یہ حق پہنچتا ہے کہ اس کے کچھ احکام کی تو وہ تعمیل کریں اور کچھ کو نظر انداز کر دیں، یہ طرز عمل الہٰ کی اطاعت نہیں ہے اس کی نافرمانی ہے۔ منافقین اور یہود کی یہ مشترک بیماری تھی۔

اس مسئلہ کے اس پہلو پر بھی غور فرمائیے۔ یہ بات دلائل کی پوری قوت سے ثابت ہو چکی ہے کہ الہٰ تعالیٰ نے انسان کو اپنی عبادت کے لیے پیدا فرمایا ہے۔ جب صورت واقعہ یہ ہے تو عقل اس کے سوا کچھ مان ہی نہیں سکتی کہ انسان کو اپنے مالک اور مہبود کی جانب سے جو احکام ملے ہیں خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے، معروف ہوں یا غیر معروف، مذاق عام والی مذہبیت کا رنگ ان پر نمایاں ہو یا نہ ہو، انسان کے ظاہر سے متعلق ہوں یا باطن سے، ذکر یا پرستش کی نوعیت کے ہوں یا تمدنی و اجتماعی نوعیت کے سب کے سب عبادت کا یہ پیدائشی وظیفہ انہماک لینے کی خاطر ملے ہیں ان میں سے کوئی ایک حکم بھی ایسا نہیں ہو سکتا جو اس فریضہ کی ادائیگی کے معاملے سے بالکل غیر متعلق ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے اس لیے حقیقت واقعہ یہی ہے کہ انسان کی اپنے فرائض حیات سے سبکدوشی ان سارے ہی احکام کی تعمیل پر موقوف ہے جو اسے عطا ہوئے ہیں، اور صرف کسی خاص حصے کی اپجائی کے نتیجے میں اسے اپنے اس فرض سے سبکدوش نہیں قرار دیا جاسکتا کیونکہ اس مجموعہ احکام کا ایک

ایک جز اس کی پیدائشی غرض دعاغت سے متعلق ہے اور کسی دُکسی پہلو سے اس کی تفصیل و تکمیل لازماً مطلوب ہے۔ کسی اور تصور دین کے تحت احکام دین میں تفریق کی گنجائش ہو تو جو لیکن قرآنی تصور دین کے تحت اس کے ایک ایک حکم کی تکمیل و بنداری ہے، اللہ کی اطاعت ہے، تعویض ہے، عبارت ہے۔ اسے نظر انداز کر کے کمال بندگی کا مقام پالینا محال ہے اور تکمیل بندگی کے لیے اسے غیر ضروری اور غیر ضرورت سمجھا کُفر ہے۔

قرآن نے احکام دین میں تفریق کی مخالفت کو بڑے مؤثر اور یلغ انداز میں پیش کیا ہے مثلاً:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمَةِ كَافَّةً

اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔

اس آیت میں اطاعت کرنے کے لیے اطاعت میں داخل ہونے کی یلغ تعبیر اختیار کی ہے۔ کسی چیز میں داخل ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ داخل ہونے والے کا پورا وجود اس کے اندر سما چکا ہے ہر طرف سے اس نے اسے ڈھک لیا ہے، اور اب اس کا کوئی جز بھی اس سے باہر نہیں ہے اس لیے اسلام میں یا اللہ رسول کی اطاعت میں داخل ہو جانے کا مطالبہ ہر بات کا مطالبہ ہے کہ اہل ایمان کتاب و سنت کے ایک ایک حکم کی بکادوری کے لیے اپنے آپ کو وقف رکھیں۔ اور چھوٹی بڑی کوئی ہدایت بھی فراموش نہ ہونے پائے۔

ایک اور جگہ تنبیہ کے انداز میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَاحْذَرُوا هَمًّا أَنْ يَفْتَنُوكَ عَنْ بَعْضِ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ إِلَيْكَ

اس بات سے ہوشیار رہو کہ کہیں نہ خدا فراموش ہوگ قبیل فتنے میں ڈال کر اس ہدایت کے

کسی جزو کی پیروی سے نروک دیں جھے اللہ نے تم پر نازل کیا ہے۔

بہر حال تفریق بین اللہ و رسول کے منطوق، مدلول اور مفہوم میں یہ ساری باتیں داخل ہیں، اگر بھی کہ اللہ کو مانتے ہیں اور اللہ کے رسولوں کو نہیں مانتے۔ یہ بھی کہ اللہ کے رسولوں میں سے کچھ کو مانتے ہیں اور کچھ کو نہیں مانتے اور یہ بھی کہ اللہ کی بات مانتے ہیں اللہ کے رسول کی بات نہیں مانتے اور یہ بھی کہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام میں کچھ کو مانتے اور کچھ کو نہیں مانتے۔ اور ارشاد یقیناً ہون فہم بعض و تکلف ببعض اور کہتے ہیں کہ ہم کچھ کو مانتے ہیں اور کچھ کو نہیں مانتے کے زیادہ مناسب تفریق بین الرسل اور بین الاحکام ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ توحید کے قائل ہیں مگر اللہ کو نہیں مانتے۔ اور جو لوگ رسالت کو مانتے ہیں مگر کسی رسول کو نہیں مانتے اور جو لوگ اللہ کی بات مانتے

ہیں مگر رسول کی بات نہیں مانتے اور بالآخر جو لوگ اپنی زندگی کی کچھ شاخوں میں انفرادی طور پر اس کے رسول کی بات نہیں مانتے وہ سب یفرقون بین اللہ ورسدہ کا مصداق ہیں کرتی صراحت کرتی دلالت اور کرتی اشارت، اگرچہ ان میں بعض مکلف بعض کا قریب بتاتا ہے کہ مراد وہی قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو کچھ رسولوں کو مانتے ہیں اور کچھ کو نہیں مانتے دوسرے وہ جو احکام کی حد تک تفریق دیا رکھتے ہیں۔

قرآن نے اس غلط کاربطہ کا چہرہ پیش کیا ہے جس نے احکام الہی میں تفریق کی روش اپنا کر رکھی اور اسے ان لفظوں میں سرزنش کی ہے۔

افستو منون بعض الکتاب مکلفون بعض فما جزاء من یفعل ذالک
منکد الاخری فی الحیاة الدنیا ویوم القیامۃ یردون الی اشتد
العذاب -

تو کیا تم کتاب الہی کے ایک حصہ پر ایمان رکھتے ہو اور دوسرے حصہ کا انکار کرتے ہو لہذا تم میں سے جو لوگ بھی ایسا کریں گے ان کی سزا اسی کے سوا کیا ہے کہ نبوی زندگی میں ان کے لیے ذلت و خواری ہو۔ اور قیامت کے دن سخت ترین عذاب کی طرف پھریے جائیں۔

کوئی شک نہیں کہ ان آئینہ انفاذ کی حیثیت پرش مند ہر وہ قرآن کے لیے ایک مستقل اور معنی خیز تبصرہ کی سی ہے جو برآن نہیں چوکتا دکھنا چاہتی ہے کہ خبردار اس مہلک غلط فہمی غلط کاری کے قریب برگز نہ مانا کیونکہ یہ کرتی معمولی بات نہیں بلکہ بڑا خوفناک جرم ہے جس کا ارتکاب بڑے سنگین نتائج پیدا کرتا ہے اس کے معنی کتاب الہی کے ایک حصہ سے کفر کے ہیں، دوسرے شکوں میں فریضہ عبادت کی ذمہ داریوں سے انکار کے بھی ہو سکتے ہیں اور اس کی پاداش آخرت میں سخت ترین عذاب اور دنیا میں دردناک ذلت و خواری کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی۔

غرض جس طرح انسان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی رائے اور خواہش سے جس نبی کا چاہے انکار کر دے اسی طرح اس کو یہ حق بھی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہر نئے احکام دین کی پیروی میں اپنے ذوق یا خواہش کے تحت کسی امتیاز سے کام لے۔ جن احکام کو چاہے عمل کے لیے مقبول کرے اور باقی سے بے پروا ہو ہے اس طرح کی کوئی بھی تفریق ایمان کے قطعی خلاف ہے۔

سنگین فیصلہ اور اس کی وجہ

۲۲۲۔ اور ایمان و کفر کے درمیان راہ نکالنا چاہتے ہیں یہی لوگ بلاشبہ بچے کافر ہیں مطلب یہ ہے کہ اسلام اور کفر کے درمیان ایک نیا مذہب بننے کیلئے نکالتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ اصل اور حقیقت کافر ہیں ان کے لیے خوارمی اور زنت کا مذاہب تیار ہے۔ اللہ کا ماننا جب ہی معتبر ہے کہ اپنے نماز کے پیغمبر کی تصدیق کرے اور اس کا حکم مانے۔ بدون تصدیق نبی کے اللہ کا ماننا غلط ہے اس کا اعتبار نہیں بلکہ ایک نبی کی تکذیب اللہ کی اور تمام رسولوں کی تکذیب سمجھی جاتی ہے۔ یہود نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی تو حق تعالیٰ کی اور تمام انبیاء کی تکذیب کرنے والے قرار دیے گئے اور کئے کافر سمجھے گئے۔

بظاہر یہ ایک سخت فیصلہ معلوم ہوتا ہے مگر حقیقت کا تقاضا یہی تھا کہ فیصلہ اس کے سوا کچھ اور نہ ہو اور ایک نبی کے انکار کو بھی اس سے کم تر وجہ کا جرم نہ قرار دیا جاتے۔ جب یہ معلوم ہے کہ خواہ کوئی بھی رسول ہر وہ اللہ سبحانہ ہی کی طرف سے آتا ہے اور اسی کے احکام لوگوں کو سناتا ہے۔ دوسرے نظموں میں یہ کہ وہ کائنات کے حقیقی فرمانروا ہی کی طرف سے مقرر کیا ہوا حکم مجاز ہوتا ہے تو اس کا انکار دراصل اس کا انکار نہیں ہے بلکہ فرمانروائے کائنات کے حق فرمان روائی کا انکار ہے۔ اس کے خلاف بغاوت کا اعلان ہے اور اس انکار و اعلان بغاوت کی موجودگی میں دوسرے انبیاء کا اقرار بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی حکومت کے مقرر کیے ہوئے دوسرے افسروں کو تو اس کا نمائندہ اور حاکم مجاز تسلیم کر لیا جاتے اور پھر اسی حکومت کے کسی ایک افسر کو اس کا نمائندہ اور حاکم مجاز ماننے سے انکار کر دیا جاتے۔ یہ حکومت کی اطاعت تو نہ ہوئی اپنی ملنے اور خواہش کی اطاعت ہوئی۔ اس کے تو معنی یہ ہیں کہ جن افسروں کو حکومت کا نمائندہ اور حاکم مجاز تسلیم کیا گیا ہے۔ ان کا یہ تسلیم کیا جانا بھی دراصل حکومت کے حق اطاعت کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اپنے جی کی خواہش کی وجہ سے ہے اس لیے اس تسلیم و اقرار کی بھی فی الواقع کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جو کسی ایک رسول کا انکار کرتے ہیں سارے رسولوں کا منکر قرار دیا ہے مثلاً قوم نوح کے بارے میں اس نے فرمایا ہے کہ جب انہوں نے ہمارے

رسولوں کو مبتلا دیا تو ہم نے بھی انہیں غرق کر دیا۔ وقوم فوج لما کذبوا المرسل فافترناهم
حالانکہ از روئے واقعہ انہوں نے صرف ایک رسول حضرت نوح علیہ السلام کی تکذیب کی تھی۔ باقی
رسولوں کا تو ان کے سامنے کوئی مسئلہ ہی نہ تھا۔ آپ پانچویں پاسے میں یہ پڑھ آئے ہیں کہ و ما
اسلنا من رسول الا یطاع باذن اللہ جو رسول بھی آتا ہے اسی لیے آتا ہے کہ اس کی اطاعت
کی جاتے اذن خداوندی کے مطابق اور یہ بھی سن آئے ہر من یطع المرسل فقد اطاع اللہ جو اللہ
کے رسول کی اطاعت کرتا ہے دراصل اللہ کی اطاعت کرتا ہے۔ جب واقعہ اور حقیقت یہ ہے تو
کیا اس کا کھلا اور واضح مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی رسول کو نہ ماننا فی الواقع اذن خداوندی کو ٹھکرانا
اور اللہ کی اطاعت کا انکار ہے۔ ایسی حالت میں ایک رسول کا انکار بھی کفر و بغاوت کا آخری درجہ
کیوں نہ ہو گا۔ اور اللہ کے ایک ایک رسول کو رسول برحق مانے بغیر ایمان کی سند کا ملنا اصول اور
انصاف کی بات کیسے ہوگی؟

کافروں کے لیے اخروی سزا

۲۲۴۔ اور ہم نے کافروں کے لیے وقت والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ یہاں دو باتیں غور طلب
ہیں، ایک یہ کہ کافرین پر لاف لام لا کر ان تمام کی طرف اشارہ کیا ہے جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے
یعنی خدا کو نہ ماننے والے اور رسالت کو تسلیم نہ کرنے والے۔ یا خدا کو ماننے والے اور رسول کو نہ
ماننے والے۔ یا خدا کی بات کو ماننے والے خدا کے رسول کی بات نہ ماننے والے خدا کے رسولوں میں سے
کچھ کو ماننے والے اور کچھ کو نہ ماننے والے یا پھر اپنی زندگی کے کچھ گوشوں میں نبوت کے علم و عمل کو
ماننے والے اور کچھ میں نہ ماننے والے، سب کے لیے عذاب مہین تیار کیا ہوا ہے، دوسری یہ کہ
ان کے لیے عذاب تیار کرنے کی علت ان کا کفر ہے۔ اگر ان کے دامنوں میں کفر نہ ہوتا تو اللہ
ان کے لیے عذاب تیار نہ کرتا۔ وقت آمیز عذاب تیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے خیالات و
منظریات کی تہ میں اصل روگ اپنی جڑاں کا ہوتا ہے شعوری یا غیر شعوری طور پر۔ بہر حال یہ لوگ
سمجھتے ہیں کہ ان کی عقل وحی الہی کے مقابلے میں زیادہ وزن دار ہے اور انبیاء سے معاذ اللہ
جو کہ انہیں رہ گئی ہیں ان کی قافیہ اپنی عقل آرائیوں سے کر دیں گے، اسی کبر و خود بینی کی سزا
انہیں آخرت میں یہ ملے گی کہ عدد و جمالی تعذیب سے یہ مخلوق کی منظروں میں ذلیل و رسوا
ہو جائے گے۔

قانون معتبر ایمان

۴۲۔ اور جو لوگ اللہ اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لاتے اور ان میں سے کسی کے فرمان کوئی فرق نہیں کرتے۔ لیکن لوگوں کو وہ مغفرت یہ ان کے اجر دے گا اور اللہ بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے یعنی اور جن لوگوں نے کسی نبی کو جہاد نہیں کیا بلکہ ایمان لاتے اور اللہ اور اس کے سب رسولوں پر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ان کو بڑے ثواب عطا فرمائے گا۔ اس سے مراد مسلمان ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سب نبیوں پر ایمان لاتے ہیں۔

یہ آیت پہلی آیت کے مقابلے میں ہے مگر اس آیت میں اولئک هم المؤمنون حقا نہیں فرمایا، صرف اجر اور ثواب کا ذکر فرمایا، وجہ یہ ہے کہ اس آیت میں فقط ایمان کا ذکر ہے اور اعمال صالحہ کا ذکر نہیں ہے اور بغیر اعمال صالحہ کے مومن کامل نہیں ہو سکتا۔ دوسری جگہ ارشاد ہے،

انما المؤمنون الذين اذا ذكر الله وجلت قلوبهم واذا تبعت عليهم اياته زادتهم ايمانا وعلیٰ ربهم يتوكلون الذين يقيمون الصلاة واما نزلناهم ینفقون، اولئک هم المؤمنون حقا لهم درجات عند ربهم ومغفرة ورنہم کافرون۔

مومنوں کی شان قریر ہے کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل دہل جاتے ہیں اور جب اس کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کے ایمان کو اور زیادہ کر دیتی ہیں، اور وہ ہر حال میں اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں، جو غماز قائم کرتے ہیں اور ہم نے جو کچھ دیا ہے اس میں سے ایک حصہ ہماری راہ میں بھی خرچ کرتے ہیں، بلا خسر یہی لوگ پکے اور پکے مومن ہیں، ان کے لیے ان کے پروردگار کے یہاں مرتبے ہیں، اور بنشائش، اور بڑی خوبی و عزت کی روزی۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہاں جس ایمان کے موضوع پر کفر کے مقابلہ میں گفتگو ہو رہی ہے وہ قانونی ایمان ہے جس پر نجات موقوف ہے اور مذکورہ بالا آیت میں جن لوگوں کو ہمد المومنین حقا کہا ہے وہ صفات فاضلہ اہل کمال ہیں۔ تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے عینی ایمان کا کفر سے مقابلہ کرتے ہوئے آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ خدا کو اپنا واحد معبود اور مالک تسلیم کر لیں اور اس کے نیچے ہوتے تمام رسولوں کی نبوت کو مان لیں، صرف وہی اپنے اعمال پر اجر کے مستحق ہیں وہ جس درجہ کا عمل صالح کریں گے اسی درجہ کا اجر پائیں گے، ایسے وہ لوگ جنہوں نے خدا کی لاشریک الوہیت و ربوبیت ہی کو تسلیم نہیں کیا، یا جنہوں نے خدا کے نامزدوں میں سے بعض کو ماننے اور بعض کو نہ ماننے کا طرز عمل اختیار کیا تو ان کے لیے کسی عمل پر کسی اجر کا سوال سر سے پیدا ہی نہیں ہوتا۔ کیونکہ ایسے لوگوں کا کوئی عمل خدا کی نگاہ میں قانونی عمل نہیں ہے۔

قرآن کی اس آیت سے جس سے ایمان کا یہ قانونی موقف معلوم ہوا ہے کہ تمام انبیاء کی یکساں طور پر تصدیق کی جائے یعنی یقین کیا جائے کہ سب سچے پرستے، سب خدا کی سچائی کے پیامبر تھے، سب کے ایک ہی قانون و اصل کی تعلیم دی ہے۔ پہلی آیت میں اہل کتاب کو ان کے جس طرز عمل کی بنا پر ان کا خداوند حقا کہا گیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ وہ جہاں دوسرے کو اللہ کے رسول مانتے تھے، حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی طرح ماننے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے حالانکہ جس طرح اللہ کے رسول وہ حضرات تھے اسی طرح آپ بھی تھے۔ پھر یہی چیز ہے جس کو ایمان و کفر کے درمیان کی راہ بتایا ہے کیونکہ دوسرے انبیاء کو مان کر اگر وہ ایمان باللہ کے تقاضے پورے کرتے نظر آئے ہوتے تو رسالت محمدی کا انکار کر کے اللہ کی معبودیت اور حاکمیت کو وہ ٹھکرا بھی بیٹھتے۔ پھر اسی رویہ کو اللہ رسول کا کفر کرنا بھی کہا گیا، کیونکہ خدا کے کسی رسول کو ماننا اور کسی کو نہ ماننا دراصل نہ خدا کو ماننا ہے نہ کسی رسول کو ماننا ہے بلکہ محض اپنی خواہش نفس کو ماننا ہے۔ ٹھیک ایسے ہی اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وحدتِ ادیان کا نظریہ لغو اور مہمل ہے۔ اس نظریہ کا فلسفہ یہ ہے کہ جب ہم اسے پاس بھی خدا ہی کا بھیجا ہوا دین ہے تو کیا اس پر ایمان رکھنا اور اس کی پیروی کرنا کافی نہیں ہے۔ کسی اور چیز کو اپنا ان کیوں ضروری ہوا وہ اپنی جگہ حق ہے اپنی جگہ حق۔ لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ ان کے اس فلسفہ کو اللہ تعالیٰ یقرضون بین اللہ و رسلا، خدا کے ذریعہ صرف یہ کہ معصی نہیں کہتا بلکہ

اے صاف طور سے کفر کا فلسفہ قرار دیتا ہے اور انہیں یہ بھی حق وہ بھی حق کہنے کے باوجود اصل حق کا منکر ٹھہراتا ہے۔

بہر حال اس موضوع پر جہان تک قرآن فیصلہ کا تعلق ہے وہ بالکل دو ٹوک انداز میں وحدتِ ادیان کے نظریے کو باطل قرار دے کر نبوتِ محمدیہ کی پیروی کو سامنے انسانوں کے لیے ضروری اور شرطِ نجات قرار دیتا ہے۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہ شخص ہو سکتا ہے جسے آپ کا پیغام ہی نہ پہنچا ہو یہ بات خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ گرامی سے معلوم ہوتی ہے۔ ارشاد ہے:

وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَا يَسْمَعُ بِي أَحَدٌ مِنْ هَذِهِ الْأُمَّةِ يَهُودِيٍّ
لَا نَصْرَانِيٍّ شَعْبِيٍّ وَلَا يَسْمَعُ يَوْمَئِذٍ بِالَّذِي أُرْسِلْتُ بِهِ الْكَافِرَانِ
مِنْ أَصْحَابِ النَّارِ۔

قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے اس امت میں سے جس کسی شخص تک شفا یهودی یا نصرانی میری نبوت کا پیغام پہنچا اور اس کے باوجود وہ میرے لئے ہوتے دریں پر ایمان لاتے بغیر مر گیا وہ دوزخی ہو گیا۔

(مشکوٰۃ بحوالہ مسلم)

اس میں لایسبہ کی قید لگا کر آپ نے یہ بات واضح فرمادی کہ جس شخص تک آپ کا پیغام نہیں پہنچا ہے وہ مستثنیٰ ہے کیونکہ اس صورت میں وہ معذور ہو گا اور جب تک ایک شخص فی الواقع معذور ہو اور اس کے پاس امرِ حق پہنچا ہی نہ ہو اس وقت تک اس پر اس کی پیروی کی ذمہ داری ڈالنا اور اسے اس بات سے میں جواب دہ قرار دینا بیجا ہے انصافی ہے۔ لیکن جو لوگ اسلام سے واقف ہو جانے کے بعد بھی اسے نہ مانیں ان کا پکڑا جانا کسی طرح بے انصافی نہیں ہے سب انصافی اگر ہے تو یہ کہ انہیں پکڑا جائے کیونکہ ان کا نہ ماننا کسی چھوٹی بات اور کسی معمولی حق کا نہ ماننا نہیں ہے بلکہ دنیا کی سب سے بڑی بات اور سب سے بڑے حق کا نہ ماننا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے حق فرمانِ روائی کا نہ ماننا ہے۔ اس لیے یہ مکمل ہوئی دعائے ہر گز کر لیے لوگوں کے بڑے سامنے کو انصاف اور معقولیت کے خلاف گماہاتے۔ دنیا کسی ایسے حکمران کا تصور تک نہیں کر سکتی جس نے اپنی رعایا کو اس بات کی کھلی چٹی دی ہو کہ وہ اس کے فرمانوں کو کھینچنی مرضی کے مطابق سلوک کرے چاہے تو اس کے موجودہ گورنروں اور راجہ الوقت قانونوں کو تسلیم کرے اور چاہے تو ذکر کرے اور ان کے بھاتے اس کے ریتا تر ہونے والے گورنروں کو صریحاً

قوامین کو ماننی ہے۔ پھر کیا یہ کوئی معقول بات - ہوتی کہ ایسے نوجوانوں کو اس حکمران کی طرف منسوب کرنے میں کوئی باک محسوس نہ کیا جائے جو سب سے حکمرانوں کا حکمران اور پوری کائنات کا حقیقی فرمان روا ہے؟ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس نے اپنے جن پیغمبروں کا دور ختم کر دیا اور اپنی جن شریعتوں کو طے کر دیا ہے۔ ان ہی کی اطاعت اور پیروی پر اصرار کرنے والوں کو وہ اپنا وفادار اور فوجی رہا کرنا ہے اور اپنے اس پیغمبر کی اطاعت اور اپنی اس شریعت کی پیروی سے انکار کے باوجود انہیں بنیاد کی منرا نہ دے جسے وہ اس دور کے لیے اپنا جہان بنا دیا اور ابدی پیغمبر اور اپنی عالمگیر شریعت قرار دے چکا ہے۔ یہ عجیب بندگی اور فرمانبرداری ہے کہ اللہ تعالیٰ تو اپنی پرستش اور اطاعت و رضا طلبی کے لیے فرید کو اپنا ہادی بنانے کا حکم دے مگر آپ کہیں کہیں ہم تو اس غرض کے لیے وحید کا دامن پھڑے رہیں گے اس کی یہ روش کسی طرح حق بجانب قرار نہیں دی جاسکتی ہے۔

بہر حال اس آیت سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

ایک یہ کہ قبولِ عمل کے لیے ایمان شرط ہے، دوسری یہ کہ ایمان و عمل کے لیے نبوت کی تصدیق ضروری ہے تیسرے یہ کہ تمام نبیوں اور رسولوں کا وعدہ اور مشترک دین کا اصل الاصول ایمان بانسٹا اور ایمان بارسات ہے یعنی خدا پر اور تمام رسولوں پر ایمان لانا اللہ کا دین ہے اور اسی کا نام اسلام ہے جس نے اس اصول کو قبول نہیں کیا۔ قرآن ہی میں یہود و نصاریٰ کے بارے میں کہا گیا ہے فان اسلموا فقد اهتدوا اگر انہوں نے اسلام قبول کر لیا تو انہوں نے سیدھی راہ پالی۔ اور البقرہ میں ہے فان امنوا بمثل ما امنتمو بحسبہ فقد اهتدوا اگر وہ بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جیسے تم ایمان لے آتے تو انہوں نے سیدھی راہ پالی۔ اس سے معلوم ہوا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہدایت کا طے ہیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جن آئینوں میں ایمان و عمل صالح پر غور و غم نہ ہونے کی غرض سے دی گئی ہے ان میں ایمان سے مقصود تو وحید کامل ہے اور اس کا یہ منشا نہیں ہے کہ یہود و نصاریٰ اپنے موجودہ گمراہ عقیدوں کے باوجود سنہات کے مستحق ہیں۔ یہود و نصاریٰ کیا خود مسلمان اس اسلام کامل کے بغیر سنہات کے مستحق نہیں جب تک مسلمانوں کا ایمان ان کے عمل صالح اس تعلیم کے مطابق نہ ہو جو محمد رسول اللہ کے ذریعے سے دُنیا میں آئی ہے نہ اصول ہر ایک کے لیے ہے خواہ وہ مسلمان ہو یا یہودی و عیسائی ہو یا صابئی، غرض کسی نبی کا پیروی کا دعویٰ ہر لحد لحد لغو و باطل ہے۔

وحدتِ ادیان کا غلط تصور

قرآن کا اس آیت میں لحد لحد لغو و باطل کا سہارا لے کر یہ اعلان جیسے دین کی وحدت کو تباہ

ہے ایسے ہی یہ وحدتِ ادیان کی بھی کھلی تردید کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ اب صرف محمد رسول اللہ کی پیروی کو برحق اور شرطِ نبوت تسلیم کیا جائے۔ دوسرے آسمانی مذاہب بھی حق اور عند اللہ مقبول اور ذریعہ نجات تھے مگر اس وقت ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جو باطل کی آمیزشوں سے یکسر پاک ہو۔ اور اللہ کے حضور اب بھی قابلِ قبول اور ذریعہ نجات ہو۔ اس کے باوجود کہنے والے کہہ رہے ہیں کہ سائے مذاہب آج بھی یکساں حق ہیں کیونکہ سب خدا ہی کی پرستش کی تلقین کرنے والے اور اس کی بارگاہِ کعبہ پہنچانے والے ہیں۔ اسی طرح بنیادی اصول اور پکائیاں سب مشترک ہیں، فرق جو کچھ ہے وہ الفاظِ اصطلاحات کا ہے یا زیادہ سے زیادہ رسوم و ظواہر کا اور یہ چیزیں ہرگز مذاہبِ حقانیت نہیں ہیں (معاذ اللہ)

اس نظریے کے حامیوں کو دیندار اور دینداروں کو دین ہی قسم کے لوگ ہیں۔ دیندار تو یہ نظریہ اپنے آخری منہبوم تک اپنا پھیلے ہیں۔ لیکن اس کی تاریخ بہت پرانی نہیں ہے، دہلی کے ایک مغل بادشاہ اکبر نے کفر و اسلام کو ملا کر ایک دین الٰہی ایجاد کیا تھا اور پھر تین پشتوں کے بعد ایک اور شہزادہ داراشکوہ نے بھی کچھ اسی قسم کی کوشش شروع کی تھی اور بعض محدِ طبع شاعر کے بعد آزاد ہندوستان میں بھی شرک و توحید اور اسلام و کفر کو مخلوط کر کے قسم قسم کے خوشنما ناموں کے ساتھ ایک نئے دین کی اختراع کی تھی جسے ہوتے ہیں۔ ذرا غور سے دیکھئے تو اس کے اسیر اور قلیل بہرہگاہ ہو دی ہیں۔ مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ خصوصاً اس کا سیاسی عنصر تیزی سے اس نظریہ کو قبول کر رہا ہے۔ ان کے صحافی، ان کے لیڈر کبھی اشدول کنیلوں میں اور کبھی کھلم کھلا اس کا درس دینے لگے ہیں۔ گیتا اور گرنٹھ کا تو پتہ نہیں مگر قرآن کا یہ نظریہ ہرگز نہیں ہے۔ قرآن وحدتِ دین کا تو یقیناً قائل ہے مگر وہ وحدتِ ادیان کو قطعاً تسلیم نہیں کرتا۔ وہ صرف اپنے ہی کو حق اور واجب الاتباع قرار دیتا ہے۔ یہ تو اس موضوع پر دنیا داروں کا حال ہے باقی سب دیندار لوگ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وحدتِ ادیان کے بارے میں ان کا تصور کیا رہا ہے لیکن ان حضرات کے کلام سے جو کچھ مترشح ہوتا ہے اس کو دیکھ کر یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ یہ حضرات اس نظریے کے اثر سے بالکل، واپس نہیں ہیں۔ آخر ہماری دیسی ادبیات میں جو اس قسم کے اشعار بھرے پڑے ہیں انہیں کس ذہنیت کا نتیجہ منظرِ کہا جائے گا۔

کفر و اسلام در رجت پوایاں

وحدہ لاشریک لہ مگویاں

ہر کس طالب یارانہ پر ہشیار چہرست

ہر جانناز عشق است چہ کجہر کشت

یا

باز پھر کفر و دین بظلالِ بسپار
بگذر ز مقابلے کہ خدا ہم مر فیست

یا

در حیرتم کہ دشمنی کفر دینِ پرست
از کبہ چرخ کعبہ و بت خازنِ دشمن است

یا

اگر کافر ز بت اکاہ گشتے
یکے از ساکنانِ راہ گشتے

یا

مسلمان مگر بدانتے کہ بت پرست
یقین کرے کہ دینِ در بت پرست است

ان جیسے اشعار کو معنی ہنوت دیکھئے کیونکہ یہ اچھے خاصے بزرگوں کے فرمائے ہوئے ہیں جو ایک خاص
وینی فلسفہ کے ترجمان ہیں۔ اچھا مان لیجئے کہ ہر ذراع از مبالغے ہیں جو شعرو شاعری کے باب میں نظر انداز کر
لینے کے لائق ہیں مگر اس طرح کے بنیدہ ارشادات کے کیا معنی ہوں گے اور انہیں کیا کہہ کر نظر انداز کیا جائے گا۔
حق یہ ہے کہ ایک ہی حقیقت کی آواز ساری دنیا میں گونج رہی ہے۔

گیتا ہندوستان کا قرآن ہے اور قرآن عرب کی گیتا،

یہ قولِ خوب اثر شاہ قلعہ دار دی کی طرف منسوب ہے اور اسے وحدتِ ادیان کے ایک ممتاز مبلغِ ہند
سند دلال نے اپنی کتاب گیتا اور قرآن کے سرورق لکھا ہے۔ اور اس طرح گویا انہوں نے اپنے نظریہ کے برحق
ہونے پر ایک مسلمان بزرگ کا یہ قول دلیلِ اولیٰ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

بہر حال قرآنی تصور دین کی دوسری وحدتِ ادیان کا نظریہ سر تا سر باطل ہے اور اس آیتِ قرآنی کے
قلعاً خلاف ہے۔

يَسْأَلُكَ أَهْلُ الْكِتَابِ أَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتَابًا مِنَ السَّمَاءِ
فَقَدْ سَأَلُوا مُوسَى أَكْبَرَ مِنْ ذَلِكَ فَقَالُوا أَلِنَا اللَّهُ جَهْرَةً
فَأَخَذَ تَهُمُ الصُّعْقَةُ بِظُلْمِهِمْ ثُمَّ أَخَذُوا الْعِجْلَ مِنْ
بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذَلِكَ وَإِنَّا مُوسَى
سُلْطَانًا مُبِينًا ۖ وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّورَ بِمِثْقَاتِهِمْ
وَقُلْنَا لَهُمْ ادْخُلُوا الْبَابَ مُجْتَدًا وَقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوا فِي
السَّبْتِ وَآخَذْنَا مِنْهُم مِيثَاقًا غَلِيظًا ۖ فِيمَا أَنْفَضِهِمْ
مِثْقَاتُهُمْ وَكَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ وَقَتْلِهِمُ الْأَنْبِيَاءَ
بَغْيًا حَتَّى وَقَوْلِهِمْ قُلُوبُنَا غُلْفٌ بَلْ طَبَعَ اللَّهُ عَلَيْهَا
بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا ۖ وَيَكْفُرُهُمْ قَوْلُهُمْ
عَلَىٰ مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيمًا ۖ وَقَوْلُهُمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ
عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ
وَلَكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۚ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي شَكٍّ

مِنْهُ مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوهُ
 يَقِينًا ۖ بَلْ رَفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ۝
 وَإِنْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ وَ
 يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكُونُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا ۝

اے پیغمبر! اہل کتاب آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ
 آسمان سے کوئی کتاب ان پر نازل کر دو۔^{۳۳۵} بلاشبہ وہ اس سے
 بڑی فرمائش حضرت موسیٰ سے کر چکے ہیں، انہوں نے کہا
 تھا کہ ہمیں خدا کو کھلم کھلا دو تو ان کی شرارت کی وجہ
 سے بجلی کی کڑک نے ان کو اُپکڑا۔^{۳۳۶} پھر واضح دلائل آنے کے
 باوجود انہوں نے گویا پرستی کو اختیار کر لیا، ہم نے اس سے
 درگزر کیا اور موسیٰ علیہ السلام کو واضح اقتدار دیا تھا۔^{۳۳۷} اور
 ہم نے ان پر کوہ طور بلند کر کے ان سے عہد لیا تھا۔^{۳۳۸} اور ہم

نے ان کو حکم دیا تھا کہ شہر کے دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو۔^{۲۱۹} اور یہ بھی ہم نے ان سے کہا تھا کہ سبت کے دن کے بائے میں قانون کی حد بندی نہ توڑو اور ہم نے ان سے پکا عہد لیا تھا۔^{۲۲۰} پھر ان کی عہد شکنیوں کی وجہ سے اور اللہ کی آیات کا کفر کرنے کی وجہ سے اور اس وجہ سے کہ وہ انبیاء کو ناحق قتل کرتے تھے، نیز اس بنا پر کہ انہوں نے کہا تھا کہ ہمارے دل غلافوں میں ہیں بلکہ ان کے کفر کی وجہ سے اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ معدوئے چند آدمیوں کے سوا سب ایمان سے محروم ہیں نیز ان کے کافرانہ طرز عمل اور حضرت مریم پر بہتان طرازی کی وجہ سے اور اس بنا پر کہ انہوں نے کہا ہے کہ ہم نے مسیح عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ کو قتل کر دیا ہے۔^{۲۲۱} حالانکہ انہوں نے نہ حضرت مسیح کو قتل کیا ہے اور نہ ان کو رسولی پہنچایا

بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ حقیقت حال ان پر مشتبہ ہو گئی۔^{۲۳۲} اور
 بلاشبہ جن لوگوں نے اس بائے میں اختلاف کیا ہے وہ
 شک و شبہ میں پڑے ہوئے ہیں، ظن و گمان کے سوا
 ان کے پاس کوئی علم و بصیرت نہیں ہے۔^{۲۳۴} اور یقیناً
 انہوں نے حضرت مسیح کو قتل نہیں کیا ہے بلکہ اللہ نے
 ان کو اپنی طرف اٹھالیا ہے، اللہ سب پر غالب اور اپنے
 کاموں میں حکمت والا ہے۔^{۲۳۵} اور اہل کتاب میں سے کوئی
 نہیں ہے جو اپنی موت سے پہلے اس پر ایمان نہ لے آئے
 اور قیامت کے روز وہ ان پر شہادت دینے والا ہوگا۔^{۲۳۶}

یہودیوں پر فرد قرار داد جراثم

یہاں سے بیان کا رخ یہودیوں کی طرف پھرا رہا ہے کیونکہ مدینہ کے منافقوں میں زیادہ تر یہودی
 تھے۔ یہودی کہتے تھے کہ اگر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سچے ہیں تو ان پر آسمان سے ایک کتاب
 اس طرح کیوں نازل نہیں ہوتی کہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ اس پر ان کو تنبیہ ہے اللہ نہیں
 بھی اتنی سخت ہے کہ لفظ لفظ جو ش غضب میں ڈوبا ہوا ہے۔ پوری تقریر از اول تا آخر فرد قرار داد

جرائم پر مشتمل ہے۔

اس پورے کوع میں بلاغت کا یہ اسلوب قابلِ توجہ ہے کہ بنی اسرائیل کے جرائم کی ایک طویل فہرست تونادی گئی ہے لیکن الفاظ میں یہ بات واضح نہیں کی گئی ہے کہ اس فہرست کے منانے سے مدعا کیا ہے۔ جرائم کی فہرست میں ایک جملہ معترضہ آگیا ہے اور اس کے ختم ہوتے ہی پھر ان کے جرائم کی داستان شروع ہو گئی ہے۔ اس کے بعد اقتضائے کلام سے ایک اور طویل جملہ معترضہ آگیا ہے۔ اور اس کے خاتمہ پر فہرستِ جرائم شروع ہو گئی۔ یہ انداز بیان قسطل کے زور بیان، سامع کی ذہانت، دعوے کی قوت اور فیصلہ کے دلیل سے بے نیاز ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔ عرب خطبات میں اس کی شاندار مثالیں موجود ہیں۔ اس انداز کے پر زور کلام کو ایک صاحبِ ذوق سامع تو کچھ سکتا ہے لیکن اس کے زور اور اس کی بلاغت کو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا ممکن نہیں ہے۔

منقولہ یہ ہے کہ یہود آپ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ تم ان پر آسمان سے کتاب اتار دو کہ وہ اس کا اترتے ہوئے مشاہدہ کریں۔ ان کا یہ مطالبہ ان کی تاریخ کے طالبِ علم کے لیے تعجب خیز نہیں ہے۔ یہ جن اسلاف کے خلف ہیں وہ اپنے پیغمبر سے اس سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر مطالبہ کر چکے ہیں۔ حق کی تاریخ یہ ہے، جن کا قولی مزاج یہ ہے ان سے کس خیر کی امید کی جا سکتی ہے ان کے ان مسلسل جرائم کی وجہ سے جن کا سلسلہ اسلاف سے لے کر اخلاف تک کہیں ٹوٹا ہوا نہیں ہے۔ خدا نے ان پر لعنت کر دی ہے اب کوئی معجزہ بھی ان کو دکھا دو، ایمان کی سعادت ان کو نصیب نہ ہوگی۔ یہ ہمیشہ ایسا ہی کرتے رہے ہیں اور ایسا ہی کرتے رہیں گے، جو طالبِ حق ہوتا ہے وہ کبھی ایسی فرمائشیں نہیں کرتا بلکہ یہ بات دیکھتا ہے کہ جو تعلیم دی جا رہی ہے وہ کیسی ہے اور جو تعلیم دینے والا ہے اس کا حال کیسا ہے ؟

۲۲۵۔ اے پیغمبر! اہل کتاب آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ آسمان سے کوئی کتاب

ان پر نازل کرادو۔ یہودیوں کے چند سردار آپ کی خدمت میں آئے اور کہا کہ اگر تم سچے پیغمبر ہو تو ایک کتاب لکھی نکالو گی یکبارگی آسمان سے لا دو۔ جیسے حضرت موسیٰ توریت لائے تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اے مطلب یہ ہے کہ مدینے کے یہودی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عجیب و غریب مطالبے کرتے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ہم آپ کی رسالت

اُس وقت تک تسلیم نہ کریں گے جب تک ہماری آنکھوں کے سامنے ایک مکھی مکھی کتاب آسمان سے نازل نہ ہو یا ہم میں سے ایک ایک شخص اوپر سے اس مضمون کی تحریر نہ آجائے کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے رسول ہیں ان پر ایمان لاؤ۔

حافظ ابن جریر نے سدی، محمد بن کعب القرظی، اور قتادہ کے حوالہ سے ان فرمائش کرنے والوں کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے یہ ہے کہ سدی کہتے ہیں کہ یہود نے یہ درخواست پیش کی کہ اگر آپ پچھے رسول ہیں تو حضرت موسیٰ کی طرح مکھی ہوئی کتاب آسمان سے لائیے۔ محمد بن کعب القرظی کہتے ہیں کہ یہودیوں کا مطالبہ تھا کہ جیسے حضرت موسیٰ اللہ کی جانب سے تختیاں لے کر آئے تھے آپ بھی اللہ کی جانب سے تختیاں لائیے۔ قتادہ کہتے ہیں کہ ان کی طلب یہ تھی کہ حضرت موسیٰ کی کتاب آسمان سے آ رہی جائے۔ اور ابن جریر کہتے ہیں ان کا مطالبہ یہ تھا کہ ہم آپ کی دعوت کو اس وقت تک قبول نہ کریں گے جب تک آپ فلاں فلاں کے نام اللہ کی جانب سے یہ خط لے کر نہ آئیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ بات خواہ کچھ بد اتنی بات صاف ہے کہ یہودیوں نے سوال کیا تھا اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ یہ سوال کرنے والے عوام نہیں بلکہ ان کے علماء ہیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لو آمن فی عشرۃ من الیہود ولا آمن فی الیہود یعنی اگر مجھ پر دس یہودی ایمان لے آتے تو تمام یہود ایمان لے آتے۔ وہ خود ایمان نہ لاتے تھے اور اس قسم کے سوالات کر کے عام مسلمانوں میں بے چینی پیدا کرتے تھے۔ مسند احمد کی روایت میں اس کی توضیح آئی ہے کہ دس یہود سے مراد یہودی علماء ہیں۔ چنانچہ الفاظ یہ ہیں۔ لو آمن عشرۃ من احبار الیہود اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی مراد مطلق یہود نہ تھی بلکہ خاص ان کے علماء تھے۔ حافظ ابن جریر عقیلی نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ میں تشریف آوری سے دو سارے یہود میں سے شاہیر کے حسب ذیل نام لکھے ہیں۔

عبد اللہ ابن سلام، البراء بن اخطب، حمی بن اخطب، کعب بن الاشرف، رافع بن ابی العقیق، عبد اللہ بن خنیف، فحاص، رفاعہ بن زید، زبیر بن باہلیہ، کعب بن اسد، شمویل بن زید۔

اس سلسلے میں کعب اور ابو ہریرہ کی روایت میں یہ اختلاف ہے کہ حضور انور صلی اللہ

علیہ وسلم نے عمارؓ یہودیوں کو دس کا عدد بیان فرمایا ہے یا بارہ کا کعب کا رجحان بارہ کی جانب ہے جب کہ ابو ہریرہؓ دس بتاتے ہیں۔ یحییٰ بن سلام فرماتے ہیں کہ دونوں باتیں اپنی جگہ صحیح ہیں ہو سکتا ہے کہ کعب سلمہ بن زید کا ذکر کیا ہو اور ابو ہریرہؓ نے صرف ان کا ذکر کیا ہو جو حلقہ اسلام میں داخل نہ ہوتے تھے۔ عبد اللہ بن سلام اور حیر بن اسلام قبول کر چکے تھے۔ بہر حال خلاصہ حدیث یہ ہے کہ اگر کہیں اس وقت یہ دس بارہ احبار کعبہ اسلام قبول کر لیتے تو جو یہودیوں کو ارباب کہتے تھے تمام کے تمام اسلام میں داخل ہو جاتے مگر چونکہ اس قوم کے حق میں من حیث القوم اسلام مقدور نہ تھا اس لیے ان کے عمارؓ کو بھی بہت کم اسلام کی توفیق ہوئی۔ اسی فطری شقاوت کی وجہ سے انہوں نے مختلف زمانوں میں اپنے پیغمبروں کو جھٹلایا "ان کو تکلیفیں دیں۔ حضرت موسیٰؑ اور ان کے بعد کوئی پیغمبر ان میں ایسا نہ آیا جس نے ان کی سنگدلی کا تمام دیکھا ہو اور ان کی سرکشی پر ان کے حق میں بددعا نہ کی ہو۔

بہر حال یہ دینے ازراہ گفت حضور انور سے یہ سوال کیا۔ ان کا مقصد طلب حقیقت نہیں بلکہ دوا راہ شرارت ایسا کر رہے تھے۔

بچے باکی و سرکشی کی سنگین سزا

۲۲۶- بلاشبہ وہ اس سے بڑی فرائش حضرت موسیٰ سے کر چکے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ ہمیں خدا کو کسلم کھلا دکھا دیے تو ان کی شرارت کی وجہ سے بھیگی کی کڑک نے ان کو اپکڑا۔ اس قسم رکوع میں الزامات کو ان کے جواب میں ذکر فرمایا ہے۔ اس کے بعد تحقیقی جواب دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہودی جو تم سے عناد ایسی کتاب طلب کرتے ہیں ان کی یہ بے باکی اور سرکش تعبیر کی بات نہیں ہے ان کے بزرگوں نے اس سے بھی بڑی اور سخت بات اپنے نبی موسیٰ علیہ السلام سے طلب کی تھی کہ خداوند تعالیٰ کو آشکارا ہم کو دکھا دو ورنہ تم تمنا یقینین ذکر کریں جیسا کہ سورہ بقرہ میں گزرا۔ اس پر یہ ہوا کہ ان کچھ والوں پر بھی ان بڑی اور سب مہ گئے۔ پھر حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کی قضا سے ان کو زندہ کر دیا۔

یہاں واقعہ کی تفصیل پیش کرنا مقصود نہیں بلکہ یہودیوں کے جرائم کی ایک مختصر فہرست کی طرف

اشارہ مقصود ہے اس لیے ان کی قریٰ تاریخ کے چند نمایاں واقعات کی طرف اشارات کیے جا رہے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہودیوں نے آپ سے صرف یہ مطالبہ کیا ہے کہ ہم آپ کی رسالت اس وقت تک تسلیم نہ کریں گے جب تک ہماری آنکھوں کے سامنے ایک مکمل مکمل کتاب آسمانی سے نازل نہ ہو اور انہوں نے حضرت موسیٰ سے کہا تھا کہ ہم تمہارا اس وقت تک یقین نہ کریں گے جب تک خدا کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔ دراصل بنی اسرائیل شک کے لیے بیمار تھے کہ انہیں کسی طرح یہ یقین ہی نہ آتا تھا کہ فی الواقع اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام سے کلام بھی کرتا ہے۔ اس وجہ سے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سے کہتے کہ اللہ سبحانہ انہیں حکم دیتا ہے تو وہ کہتے کہ جب تم سے خدا کلام کرتا ہے تو وہ ہم سے بھی کلام کرے اور ہم بھی اسے آنکھوں سے دیکھیں۔ اس کے بغیر ہم تمہاری بات کی صحت کیسے مان لیں۔

یہود کے مطالبہ اور حضرت موسیٰ کے شوق میں فرق

یہود نے دینِ الہی کا مطالبہ کیا اور حضرت موسیٰ نے دینِ الہی کا شوق ظاہر کیا۔ لیکن دونوں میں بڑا فرق ہے۔ اس بات میں کریں خواہش شرح صدر اور ایمان قلب حاصل کرنے کے لیے ہر اور اس بات میں کہ اس کو انکار و کذب کا بہانہ بنایا جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ خواہش اسی طرح تھی جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دیکھنا چاہا کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے مگر دعوت کے باوجود اس نے ان کو ہرگز ہلکا کرنا شروع نہ کیا اور ایمان حاصل ہو جائے۔ اسی لیے اللہ سبحانہ و تعالیٰ ابراہیم کی درخواست پر حضرت موسیٰ کو علامت نہیں کی بلکہ فرمایا کہ تم ان ماسوئی آنکھوں سے میرے جمال کا نظارہ نہیں کر سکتے صرف میری صفات ہی کو دیکھ سکتے ہو۔

اس کے برعکس یہود کا مطالبہ دینِ معنی ان کی بے یقینی اور شک پرستانہ ذہنیت کا ایک مظاہر تھا اور یہ مظاہر وہ قدم قدم پر اللہ تعالیٰ کی کھلی نشانیاں دیکھنے کے باوجود کرتے تھے۔ اس وجہ سے ان پر حساب ہوا۔

یہودیوں کی جانب سے سوال حضورِ نور سے کتاب کا ہو یا حضرت موسیٰ سے التوحید کا دیکھا کہ یہودیوں کا فتہ جہالت اور غنا ہے۔ کیوں؟

اس لیے کہ حضورِ نور سے آسمانی کتاب کے لیے نزول کی درخواست یا تو اس لیے ہے کہ وہ نبوت رسالت کی حقیقت سے آشنا ہیں اور ان کو انبیاء کے معجزات اور دوسرے عجیب و غریب امور کے درمیان فرق قریبی معلوم نہیں ہے۔ یہ خلاف واقعہ ہے ان کو نبوت رسالت کی حقیقت مجھ معلوم

ہے اور ان کی کتابوں میں بہت ان کے ماننے و ضاحت سے پیش کر دی ہے اس لیے ظاہر ہے کہ ان کا یہ سوال ہماں پر مبنی ہے۔

یا ان کے پیش نظر خدا کی وجہ سے صرف نبوت کو عاجز کرنا اور لاجواب کرنا ہے۔ وہ خواہ کچھ ہو ان کے سوال میں کوئی عقلیت نہیں ہے۔

حضرت موسیٰ سے دیدار الہی کے معاملہ کی پاداش میں ان پر عتاب ہوا عتاب کا ذکر البقرہ میں گذر چکا ہے اور یہاں بھی خلفہ تہمہ الصاعقہ بظلمہ کہہ کر ایسے بیان کیا گیا ہے اس کی تفصیل الامراف میں آ رہی ہے۔

گوسالہ پرستی کا خرم

۲۲۷۔ پھر واضح دلائل آنے کے باوجود انہوں نے گوسالہ پرستی کو اختیار کر لیا ہم نے اس سے بھی درگزر کیا اور موسیٰ علیہ السلام کو واضح غلبہ دیا تھا۔ یعنی ایسی عظیم نشان نشانیاں دیکھ کر پھر یہ کیا کر پھر یہ کر پڑ جئے گئے۔ بالآخر حق تعالیٰ نے اس سے بھی درگزر فرمائی۔ واقعہ سورہ بقرہ میں کسی قدر تفصیل سے گذر چکا ہے۔

واضح دلائل سے مراد وہ نشانیاں ہیں جو حضرت موسیٰ کے رسول مقرر ہونے کے بعد سے لے کر فرعون کے فرق ہونے اور بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے تک پے در پے ان لوگوں کے مشاہدے میں پہنچیں ظاہر ہے کہ سلطنت مصر کی عظیم نشان طاقت کے پتھوں سے جس نے بنی اسرائیل کو چڑایا تھا وہ کوئی کھائے کا بچہ نہ تھا بلکہ انڈر رب العالمین تھا مگر یہ اس قوم کی باطل پرستی کا کمال تھا کہ خدا کی قدرت اور اس کے فضل کی روشن ترین نشانیاں کا تجربہ اور مشاہدہ کر چکے کے بعد بھی جب جھکی تو اپنے من خدا کے آگے نہیں بلکہ ایک پتھر کے کی معصومی صورت ہی کے آگے جھکی بلکہ مطلب یہ ہے کہ انہوں نے باوجود اس قدر انعامات کے منم سے تعلق توڑ کر پتھر کے کی صورت سے عبادت تعلقات پیدا کر لیے تھے۔ کتاب خروج باب ۳۱ میں اس واقعہ کی تفصیلات موجود ہیں لیکن یہود نے اپنی عادت کے مطابق اس میں حضرت ہارون کو بھی عکس کر لیا ہے جس کی قرآن نے دوسرے موقع پر تردید کی ہے۔ اور جب لوگوں نے دیکھا کہ موسیٰ نے پہاڑ سے اترنے میں دیر کی تو وہ ہارون

کے پاس جمع ہو کر اس سے کہنے لگے کہ اٹھ ہمارے لیے درونا جو ہمارے اٹھے اٹھے چلے کر ہو
ہم نہیں جانتے کہ اس مرد کو سنی جو ہم کو ملک مصر سے نکال کر لایا ہے کیا ہو گیا
تب خداوند نے موسیٰ کو کہانیچے باکیو نکلی تیرے لوگ جن کو تو مصر سے نکال لایا پھر نے
گئے ہیں۔ وہ اس راہ سے جس کا میں نے حکم دیا تھا بہت جلد پھر گئے۔ انہوں نے
اپنے لیے دھالا ہوا پتھر بنایا اور اسے پوجا اور اس کے لیے قربانی پڑھا کر یہ بھی کہا کر لے
اور اسرائیل یہ تیرا وہ دیوتا ہے جو پتھر کو ملک مصر سے نکال کر لایا ہے اور خداوند نے موسیٰ
سے کہا کہ میں اس قوم کو گردن کش دیکھتا ہوں اس لیے تو مجھے چھوڑنے کو میرا غضب
ان پر پھڑکے اور میں ان کو مجسم کر دوں۔

(باب ۳۲ آیات ۱-۷)

ارتداد کی سزا

اس کے بعد ارشاد ہے فذوقوا من فالان ہم نے اسے معاف کر دیا۔ اس صفائی اور درگزر کی
تفصیل البقرہ میں گزر چکی ہے وہاں بتایا ہوا چکھا ہے کہ جن لوگوں نے گور سال پرستی کا جرم کیا تھا ان کے بارے
میں حکم ہوا تھا کہ فاقنوا انفسکم اس کے معنی یہ نہیں کہ اپنی تلواریں اپنی گودوں پر چلا دو بلکہ اس
کا مطلب یہ ہے کہ ہر قبیلہ میں سے جو لوگ اس فتنہ شریک اور گور سال پرستی سے اٹک رہے ہیں۔ اپنے قبیلہ
میں سے ان لوگوں کی گواہیں اردیں جنہوں نے قوم کے لیے اس فتنہ ارتداد کی راہ کھولی ہے۔ یہ حکم بیٹے میں
چند صلیتیں تھیں۔

اول یہ کہ اس طرح اس قرآن نے ایک اجتماعی توبہ کی شکل اختیار کر لی۔ گویا بنی اسرائیل کے اجتماعی
ضمیر نے ان لوگوں کو اپنے اندر سے مٹ دیا جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے عہد توحید کی اہانت کی تھی۔

دوم یہ کہ اس سے توحید کی حقیقی عظمت اور شرک کی حقیقی کراہت پر سب سے طرہ پر واضح ہو گئی
گویا شرک ایک ایسی برائی ہے کہ اگر آدمی کا یا ان کا امت اس کا ارتکاب کرے تو اس کے دایاں ہاتھ کا فرض
ہے کہ اپنے بائیں ہاتھ کو کاٹ لے۔

سوم یہ کہ ہر قبیلہ اور ہر خاندان کے اچھے لوگ اگر اپنے اپنے قبیلوں کے برے افراد پر تلوار اٹھائیں
گئے تو اس سے خاندانی معصیت ختم ہو جائے گی۔

تورات کے مطالعہ سے بھی قریب قریب یہی بات نکلتی ہے چنانچہ تورات کی کتاب شروع میں ہے

جب حضرت موسیٰ نے دیکھا کہ لوگ بے قابو ہو گئے کیونکہ ہارون نے ان کو بے حکم چھوڑ کر ان کو ان کے دشمنوں کے درمیان ذلیل کر دیا تو موسیٰ نے لشکر گاہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر کہا کہ جو خداوند کی طرف ہے وہ میرے پاس آجائے تب سب بے لادہ اس کے پاس جمع ہو گئے اور اس نے ان سے کہا کہ خداوند اسرائیل کا خدا یوں فرماتا ہے کہ تم اپنی اپنی زبان سے تلوار نکال کر چٹا چٹا گھوم کر سامنے لشکر گاہ میں اپنے اپنے بھائیوں اور اپنے اپنے پڑوسیوں کو قتل کرتے پھر وہ بے لادہ نے موسیٰ کے کہنے کے موافق عمل کیا۔ چنانچہ اس دن لوگوں میں تین ہزار مرد کھپ آئے اور موسیٰ نے کہا کہ آج خداوند کے لیے اپنے آپ کو مخصوص کرو بلکہ ہر شخص اپنے ہی بیٹے اور اپنے ہی بھائی کے خلاف ہو تاکہ وہ تم کو آج ہی برکت دے۔ (باب ۳۲)

اگرچہ تورات کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے مردوں کے قتل کے کام پر بے لادہ کو مقید کیا تھا لیکن عبادت کا آخری حصہ ہمارے موقف کی تائید کرتا ہے کہ ہر قبیلہ کے موجد یا کام کریں تاکہ یہ اہل ایمان کے مزید ایمان کی ایک شہادت ہو اور لوگ سبق حاصل کریں کہ شرک اتنا بڑا گناہ ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کی شریعت میں ارتداد و فساد کا ایک سنگین جرم تھا۔ مستوجبِ قتل، جیسا کہ ارتداد کی منہ شریعت اسلامیہ میں بھی قتل ہے۔

آخر میں فرمایا و ایتنا موسیٰ سخطاً ما مہیناً ہم نے موسیٰ کو واضح اقتدار دیا تھا حضرت شیخ ابند فرماتے ہیں اور دیا ہم نے موسیٰ کو غلبہ صریح۔

یہ اقتدار و غلبہ کیا ہے؟ شیخ الاسلام فرماتے ہیں، غلبہ یہ کہ حضرت موسیٰ نے اس پچھڑے کو توڑ کج کر کے آگ میں جلا دیا اور اس کی راکھ ہوا میں دریا پر اڑا دی اور ستر ہزار آدمی پچھڑے کو سجدہ کرنے والے قتل کیے گئے۔

پچھڑے کے موضوع پر تفصیلی مباحث سولہویں پارے میں آئے ہیں باقی مقتولین کی تعداد تو مفسرینِ قرآن نے حضرت عبداللہ بن عباس کے حوالے سے اور حضرت علی کے حوالے سے یہ اختلاف کیا ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس موضوع پر دو فقرہ حدیث میں ایک حرف منقول

نہیں ہے۔ تورات نے تصریح کی ہے کہ مقتولین کی تعداد تین ہزار تھی۔ تین ہزار ستر قرآن جو واقعہ پیش کر رہا ہے اس کی ہجرت تعداد پر نہیں بلکہ فعل پر ہے۔ اور مولانا آزاد فرماتے ہیں اور موسیٰ کو قیامت ہی د شریعت میں ظاہر و واضح اقتدار دیا۔ ہماری رائے میں سلطان حسین سے یہاں وہدبہ و طلبہ اعدہ اقتدار مراد ہے۔ اور اس فقرے کے ذیلیے قرآن اپنے مخاطبوں کے ذہن میں اتارنا چاہتا ہے کہ مرنے والے علیہ السلام نے گورسار پرستی کے سنگین جرم پر ایکشن لیا اور ان کو سزا دی۔ علامہ اوسی نے اسی کو اولیت کا درجہ دیا ہے۔ اگرچہ حافظ ابن جریر نے یہاں سلطان حسین سے معجزات مراد لیے ہیں۔

کوہ طور کے سایے میں عہد

۲۲۸۔ اور ہم نے کوہ طور کو بند کر کے ان سے عہد لیا تھا یعنی جب یہود نے کہا تھا کہ تورات کے حکم سخت ہیں ہم نہیں مانتے تو اس وقت کوہ طور کو زمین سے اٹھا کر ان کے سروں پر معلق قائم کر دیا تھا کہ ان حکموں کو قبول کرو اور مضبوطی سے پکڑو ورنہ پہاڑ ڈالا جاتا ہے۔ یہ مرقن اور میثاق کے معنی عہد و پیمان کے ہیں۔ اس لفظ کی روح و ثوق اور استحکام ہے۔ اس وجہ سے یہ خاص طور پر اس عہد و پیمان کے لیے استعمال ہوتا ہے جو کسی اہم معاملہ کے لیے پورے شعور اور پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ باندھا گیا ہو اور جس کی وفاداری کا تاکید کے ساتھ اظہار و اقرار کیا گیا ہو۔ یہاں اس سے مراد وہ عہد ہے جو بنی اسرائیل سے تورات کی پابندی کا لیا گیا۔ اللہ کی شریعت خود خدا اور بندوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اس کو میثاق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس معاہدے کا قرآن حکیم اور تورات دونوں میں ذکر ہے کہ بنی اسرائیل کے سرداروں سے کوہ طور کے نیچے عہد لیا گیا اور اس وقت اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک سخت زلزلہ نے پہاڑ کو ہلا دیا۔ اگر زلزلے کے وقت آدمی کسی اونچی دیوار کے زبر سایہ یا پہاڑ کے دامن میں ہو تو ایسا معلوم ہو گا کہ پہاڑ یا دیوار ساتبان کی طرح سر پر لٹک رہے ہیں اور اوپر گر چاہتے ہیں اس حالت کو قرآن نے پہاڑ کو ان کے سروں پر اٹھالینے سے تعبیر کیا ہے۔

فاتحانہ سرشاریاں اور ان کا علاج

۲۲۹۔ اور ہم نے ان کو حکم دیا تھا کہ شہر کے دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو۔ یہود کو حکم ہوا تھا کہ شہر میں داخل ہو سجدہ کر کے اور سر جھکائے ہوئے، انہوں نے سجدے کے بدلے سر پہ پر سر کیا اور صفا شرع کیا۔ جب شہر میں پہنچے تو ان پر طاعون پڑا، دوپہر میں قریب ستر ہزار مر گئے۔

میاں کسی واقعہ کی تفصیل بیان کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ یہودیوں کے جرائم کی ایک مختصر فہرست پیش کرنی مقصود ہے اس لیے ان کی قومی تاریخ کے چند نمایاں واقعات کی طے مرہری اشارات کیے گئے ہیں۔ اس فقرے میں جس واقعہ کا ذکر ہے اس پر تفصیلی تبصرہ پہلی جلد میں درج ہے وہاں مت لکھا جائے۔

میاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ باب سے مراد شہر کا بیٹھک ہے۔ قدیم شہروں کے ارد گرد ایک بلند چہار دیواری شہر پناہ کے نام سے موسوم ہوتی تھی۔ شہر میں داخل ہوتے وقت اسی شہر پناہ سے گزرنے ہوتا تھا۔ سجدہ میاں اپنے نمونے میں ہے یعنی عاجزی سے فروتنی کے ساتھ۔ سجدہ نماز کی ہیئت مخصوص مراد نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شہر کے دروازے میں فاتحانہ تمکنت کے ساتھ داخل نہ ہوں بلکہ عاجزانہ اور سرانگندہ ہو کر داخل ہوں۔ مقصد یہ بتانا ہے کہ ان کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ اس شہر میں داخل ہوں، اس کی زرخیزی و شادابی سے پروری آزادی کے ساتھ فائدہ اٹھائیں لیکن شہر میں داخل ہونے کے وقت خدا کا شکر کریں اور اپنے گناہوں کی معافی مانگیں۔ لیکن جس طرح انہوں نے برنعت کی ناقدری اور ہر ہدایت کی خلاف ورزی کی، اسی طرح اس نعمت اور اس ہدایت کی بھی ناقدری کی جیسے ان کو سجدہ کے ذریعے کردار کا پیمانہ بتایا تھا۔ ایسا ہی حطہ کے ذریعے مختار کا پیمانہ بھی ان کے لیے مقرر کیا تھا۔ حطہ کا لفظ ایک پورا جملہ ہے اس کا مبتدا محمدوف ہے۔ زخمی نے اس کی وضاحت یوں کی ہے مسئلہ تاحطہ ہمدی مانگ حطہ ہے حطہ حطہ ہے اس کے معنی جھاڑ دینے کے ہیں۔ یہاں اس سے مراد گناہوں کا جھاڑ دینا ہے۔ عربی اور عبری دونوں کے قریب الماخذ ہونے کی وجہ سے کچھ بزرگوں نے یہ گمان کر

لیجے کہ یہ مادہ جھاڑ لینے اور بخش دینے کے مفہوم میں عبری میں صحیح استعمال ہوا ہے اور یہ ان کے ہاں مستعار اور توہم کے کلمات میں سے تھا۔ وہیں سے یہ عربی میں منتقل ہوا ہے۔
قرآن نے بتایا ہے کہ دعا کے لیے گفتار کا جو میدان ان کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ اس کو انہوں نے بالکل مختلف مفہوم رکھنے والے لفظ سے بدل دیا۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہاں تضاد کی تبدیلی مراد نہیں ہے بلکہ روقیہ کی تبدیلی ہے۔ البتہ مسلم اصنافی کا یہ خیال ہے لیکن قرآن کے الفاظ سے اس خیال کی تائید نہیں ہوتی ہے۔ ہمارے نزدیک یہاں صرف روقیہ اور عمل کی تبدیلی کی طرف اشارہ نہیں ہے بلکہ یہ بتانا ہے کہ بنی اسرائیل کے بدبختوں نے حطہ کے لفظ کو اس سے بالکل مختلف مفہوم دے لے لیا تھا۔

نقص عہد کی ایک مثال

۲۳۰۔ اور یہ بھی ہم نے ان سے کہا تھا کہ بہت سے دن کے بائیسے میں قانون کی عدم بندی نہ توڑنا اور ہم نے ان سے پکا عہد لیا تھا۔ یہودیوں کو حکم تھا کہ ہفتہ کے دن پھسل کا شکار نہ کریں اور سب دنوں سے زیادہ ہفتہ ہی کے دن پھسلیاں دریا میں بھرت منتظر تھیں۔ یہودیوں نے یہ حیلہ لیا کہ دریا کے پاس حوض بنائے۔ ہفتہ کے دن جب پھسلیاں دریا سے حوضوں میں آئیں تو ان کو نہ لکھتے پھر دوسرے روز حوضوں میں سے شکار کرتے۔ اس فریب اور عہد شکنی پر اللہ تعالیٰ نے ان کو ہند بنا دیا جو جانوروں میں بہت خمیس اور مکار ہے۔

اصحاب بہت کا ذکر پہلی جلد میں گزر چکا ہے اور مفصل نویں جلد سورہ اعراف میں آگیا ہے بہت کی حرمت کے متعلق موسیٰ قانون میں بنی اسرائیل کو یہ ہدایات تھیں۔

پھر خداوند نے موسیٰ سے یہ کلام ہو کر کہا کہ تو بنی اسرائیل کو فرما اور ان کو کہہ کہ تم میرے سبتوں کو مانو اس لیے کہ یہ میرے اور تمہارے قرون میں نشانی ہے تاکہ تم جانو کہ میں خداوند تمہارا پاک کرنے والا ہوں، پس تم بہت کو مانو اس لیے کہ وہ تمہارے لیے مقدس ہے جو کوئی اس کو پاک نہ جائے وہ ضرور مار ڈالا جائے جو اس میں کچھ کام کرے وہ اپنی قوم سے کٹ جائے۔ چہر دن کام کرنا لیکن

ساتوں دن آرام کے لیے ہے وہ خداوند کے لیے مقدس ہے پس بنی اسرائیل بہت
کو نائیں اور اسے اپنی پشت اور پشت حمد ابدی جان کر اس میں آرام کریں۔
میرے اور بنی اسرائیل کے درمیان یہ علامت ابدی ہے۔

(خرع باب ۳۱ آیات ۱۲-۱۷)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد مبارک سے عرصہ دراز کے بعد بنی اسرائیل کی ایک جماعت
بحر قزم کے کنارے آباد ہو گئی۔ چونکہ یہ لوگ ساحل کے باشندے تھے اس لیے پھل ان کا قدرتی
شکار تھا۔ اور اس کو بہت محبوب مشغول سمجھتے تھے اور اس کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتے تھے
یہ ہفتہ کے چھ دن پھل کا شکار کیے اور سبت کا روز عبادت الہی میں صرف کرتے۔ قدرتی طور پر
پھلیاں چند روزہ جان بچانے کی خاطر پانی کی تریں پر نشیدہ رہتیں اور سبت کے روز پانی کی سطح
پر تیری نظر آتی تھیں۔ ساتھ ہی اللہ سبحانہ نے اس طریقہ سے ان کو آزمایا اور ان کی قوت ایمانی
کا امتحان لیا۔ حتیٰ کہ سبت کے علاوہ ہفتہ کے باقی دنوں میں پھلیوں کا حاصل ہونا مشکل تر ہو گیا۔
اور چھ دن یہ کیفیت رہنے لگی کہ گویا قزم میں پھل کا نام و نشان باقی نہیں رہا مگر سبت کے
روز وہ اس کثرت سے آئیں کہ جال اور کانٹے کے بغیر ہاتھوں ہی سے باسانی گرفت میں آجائیں۔
کچھ عرصہ تک تو یہودی اس حالت کو صبر آزما طریقہ پر دیکھتے رہے، آخر زور ہو سکے اور ان میں
سے بعض بعض نے خفیہ طریقوں سے ایسے جالے لگا دیے کہ جس سے یہ ظاہر ہی نہ ہو سکے کہ سبت
کے احکام کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔

کچھ تو یہ کہتے کہ جب کہ شام کو قزم کے قریب گڑھے کھود لیتے اور دیا سے ان گڑھوں تک نہر کی
طرح ایک ایک گول نکال لیتے اور جب سبت کے روز سطح آب پر پھلیاں تیرنے لگتیں تو وہ دیا کے پانی کو
کھول دیتے تا کہ پانی گڑھوں میں چلا جائے اور اس طرح پھلیاں جس پانی کے بہاؤ سے ان میں آجائیں
اور جب سبت کا دن گزر جاتا تو اتوار کی صبح کو ان پھلیوں کو گڑھوں میں سے نکال لیتے۔

اور کچھ یہ کہتے کہ جمعہ کے روز دیا میں جال اور کانٹے ڈال دیتے تا کہ سبت کے روز ان
میں پھلیاں چسپس جائیں اور اتوار کی صبح کو ان جالوں اور کانٹوں میں گرفتار پھلیوں کو کپڑا لاتے اور
یہ سب اپنی ان ترکیبوں پر بے حد مدد و نظر آتے تھے۔ چنانچہ جب ان کے عمل کے حق اور غلطیوں
امت نے ان کو ان کی اس حرکت سے روکا تو انہوں نے معترفین کو یہ جواب دیا کہ خدا کا حکم یہ
ہے کہ سبت کے روز شکار نہ کرو لہذا ہم اس کی تعمیل میں سبت کے دن شکار نہیں کرتے بلکہ

تورات کے روز کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کا دل اور ضمیر ملامت کرتا تھا مگر کج روی جواب دے کر ان کو طعن کر دیتے کہ ہماری یہ ترکیب خدا کے میاں ضرور چل جائے گی۔

اصل بات یہ ہے کہ وہ دین کے احکام پر ہدایت کے ساتھ عمل کرنا نہیں چاہتے تھے۔ قرآن نے ان کے اسی کردار کو یہاں عدوان فی السبت کہا ہے۔

یہودیوں سے میثاق کی کہانی

آخر میں ارشاد ہوا ہے **وَ اخذنا منهم ميثاقاً غليظاً** ہم نے ان سے مضبوط عہد لیا تھا۔ یعنی اس بات کا عہد لیا تھا کہ تورات کو اپنانا ہے اس پر عمل کرنا۔ اس میں بیان کردہ حدود الہی کو قائم کرنا ہے۔ تاریخ میں اگرچہ ایک سے زیادہ موثیق کا ذکر ہے۔ لیکن یہاں موقود و عمل کی مناسبت سے میثاق سے مراد تورات پر عمل کا عہد ہے اور تورات کے مشتملات کو ماننے اور قبول کرنے کا میثاق ہے۔ اسی میں حضرت عیسیٰ اور مسعود انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری بھی داخل ہے آج جو تورات موجود ہے اس میں حضرت موسیٰ کی پانچویں کتاب جو اس مشن کے نام سے موسوم ہے اس فصل ۱۴-۲۰-۳۱ اور ۳۳ میں ہمیں اس عہد میثاق کے آثار ملتے ہیں۔

۲۱ فصل ۱۴ آغاز اس فقرے سے ہوتا ہے۔

یہ اس عہد کی باتیں ہیں جو خداوند نے موسیٰ کو حکم دیا کہ وہ آپ کی سر زمین میں بنی اسرائیل سے بات کرے۔ اس عہد کے سوا جو اس نے ان کے ساتھ جوہد میں باندھا تھا۔ (استثنا باب ۲۹ ات ۱)

اس کے بعد آیت نمبر ۱۴ میں ہے:

اور میں فقط کہائے ساتھ ہی عہد اور قسم نہیں کرتا بلکہ اس کے ساتھ جو آج کے دن خداوند ہمارے خدا کے آگے یہاں موجود ہے۔

اس کے بعد باب ۳ کے آخر میں ہے:

اور ایسا ہوا کہ جب موسیٰ اس شریعت کی باتوں کو کتاب میں لکھ چکا اور وہ تمام یہوئیں تو موسیٰ نے لاویوں کو جو خداوند کے عہد کے صندوق کو اٹھاتے تھے فرمایا کہ اس شریعت کو لے کے خداوند اپنے خدا کے عہد کے صندوق کی ایک بنفل میں رکھو تاکہ وہ تمہارے برخلاف گواہ رہے۔ کیونکہ میں تیری بغاوت اور تیری گڑبگ

کو جانتا ہوں۔ دیکھو بزرگزمیں جیسا اور اُن کے دن تک تمہارے ساتھ ہوں تم نے خداوند سے عداوت کی ہے تو میرے مرنے کے بعد کتنا زیادہ کرو گے۔ اپنے فرقوں کے سارے بزرگوں اور منصب داروں کو مجھ پاس جمع کروانا کہ میں یہ باتیں اُن کے کانوں تک پہنچاؤں اور آسمان اور زمین کو درمیان لاسکے اُن پر گواہ کروں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میرے مرنے کے بعد تم اپنی تہمتیں خراب کرو گے اور اس راہ سے جس کی بابت میں نے تم کو حکم دیا تھا۔ پھر جاؤ گے اور کہہ آؤ گی کہ میں تم پر بدی پڑے گی اس لیے کہ تم خداوند کے حضور بدی کرو گے کہ اپنے ہاتھ کے کاموں سے اُسے غصہ دلانے لگے۔ سو موسیٰ نے اس گیت کی باتیں اسرائیل کی ساری جماعت کو کہہ سنائیں یہاں تک کہ وہ تمام ہوئیں۔ (استثنا: باب ۳۱ آیات ۲۰ تا ۳۰)

حضرت موسیٰ نے اپنی زندگی کی آخری وصیت جس پر ان کی تورات اور ان کے صحیفہ حیات دونوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے، بنی اسرائیل کو یہ فرمائی۔

یہ وہ برکت ہے جو موسیٰ مرد خدا نے اپنے مرنے سے پہلے بنی اسرائیل کو بخشی اور اس نے کہا کہ خداوند سینہ سے آیا اور سیرت ان پر طلوع ہوا اور فرمان کی چڑیوں پر وہ جلوہ گر ہوا، اس ہزار مقدسوں کے ساتھ آیا اور اس کے اپنے ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت ان کے لیے تھی۔ ہاں وہ اپنے لوگوں سے بڑی محبت رکھتا ہے اس کے سامنے مقدس تیرے ہاتھ میں ہیں اور وہ تیرے قدموں کے پاس بیٹھے ہیں اور تیری باتوں کو مانیں گے۔ (استثنا: ۳۲-۲۰-۱۰-۳)

نقض عہد کی پاداش

۲۳۱۔ پھر ان کی عہد شکنیوں کی وجہ سے اور اللہ کی آیات کا کفر کرنے کی وجہ سے اور اس وجہ سے کہ وہ انبیاء کو ناحق قتل کرتے ہیں، نیز اس بنا پر کہ انہوں نے کہا کہ ہمارے دل غلافوں میں ہیں بلکہ ان کے کفر کی وجہ سے اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ معدومے چن۔ آدمیوں کے سوا سب ایمان سے محروم ہیں۔ یعنی میوہ نے اس عہد کو توڑ دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی اس عہد شکنی پر اور آیات الہی سے منکر ہونے پر اور انبیاء علیہم السلام کے ناحق قتل کرنے پر اور ان کے اس کہنے پر کہ ہمارے دل غلاف میں ہیں ان پر سخت سے سخت عذاب مسلط کیے

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کو ہدایت کی تو کہنے لگے کہ ہمارے دل پر مسے میں ہیں۔ تمہاری بات دہان تک پہنچ نہیں سکتی تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ بات نہیں بلکہ اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے جس کی وجہ سے وہ نعمتِ ایمان سے محروم ہیں مگر تمہارے لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں جیسے حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی تھے۔

یعنی یہودیوں کی حمد شکنی کی وجہ سے اور آیاتِ الہیہ کے کھلم کھلا انکار کی وجہ سے اور انبیاءِ علیہم السلام کے ناحق خون بہانے کی وجہ سے اور ان کے اس کہنے کی وجہ سے کہ ہمارے دل غلاظتوں میں ہیں اللہ نے ان کے ساتھ وہ سب کچھ کیا جس کے وہ ان سنگین جرائم کی پاداش میں مستحق تھے۔ اللہ کی لعنت، اللہ کا غضب، ذلت و شکست، آزادی اور حکومت کا زوال وغیرہ وغیرہ۔ کیونکہ ان گناہوں نے ان کی قومی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا اور ان کی اجتماعی زندگی کو تار مار کر دیا تھا۔ ان کی قوت و شوکت پامال ہو گئی اور ان کی زندگی اخلاقی گزراؤں کا گہوارہ بن کر رہ گئی تھی۔ یہ سب کچھ حمد شکنی، کفر اور عصیان کے انگریز نتائج تھے۔

فباقتضاه فعل محذوف کے متعلق ہے چاہے متعلق عام نکال لیجئے جیسا کہ علامہ راوکی کا خیال ہے اور چاہے خاص یعنی لغت، بلاغت کا یہ اسلوب عربی زبان میں زیادہ ہے۔

اظہارِ تکبر یا اظہارِ معذرت

قلوبنا غلب کے معنی ہیں ہمارے دل غلاظتوں میں ہیں شادیٰ قرآن نے اس کی دو صورتیں بتائی ہیں۔ ایک یہ کہ اُغْلَب کی جمع ہے دوسرے یہ کہ غْلَاف کی جمع ہے۔ غْلَاف کی جمع ہونے کی صورت میں مطلب یہ ہے کہ ہمارے دل تو علم و حکمت یعنی نقل اور عقل علوم و فنون کا گہوارہ ہیں۔ پتہ نہیں کہ آپ کی دعوت کیا ہے ہمیں تو کیا محسوس ہوتا ہے کہ گنہگار علوم ہونے کی وجہ سے آپ کی دعوت ہماری جماعتی زندگی کی ضرورت نہیں ہے اور پہلی صورت میں یعنی جب غْلَف غْلَف کی جمع ہو۔ معنی یہ ہیں کہ آپ کی دعوت ہماری سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ ابو عبید کہتے ہیں کہ غْلَاف میں معنوی چیز کو اُغْلَف کہتے ہیں جیسے میان میں معنوی لحاظ کے لیے سیف اُغْلَف بولا جاتا ہے ابن عباس، حمادہ اور مجاہد نے دلوں کے غلاظتوں میں ہونے کا یہی مطلب بتایا ہے کہ آپ کی دعوت

ہماری کچھ میں نہیں آتی ہے۔

دونوں صورتوں میں جوہری فرق ہے۔ پہلی صورت میں یہود کا یہ کہنا اظہارِ تبحر ہے اور دوسری طرف اظہارِ معذرت ہے۔ اظہارِ تبحر کی صورت میں مطلب یہ ہے کہ ہمارے دل و دماغ اس قسم کی لامعنی باتوں کے لیے نہیں بنے ہیں اس لیے آپ کی دعوت کسی صورت میں ہمارے دلوں میں نہیں اترتی ہے۔ اگر آپ کی دعوت میں ذرا بھی معقولیت ہوئی تو ہم ضرور مان لیتے اور اظہارِ معذرت کی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ یہ باتیں جو نہرت پیش کر رہی ہے ہمارے دل میں تو کسی طرح نہیں اترتی مگر یہ خدا کی طرف سے ہیں تو خدا کے اختیار میں سب کچھ ہے۔ آخر وہ ہمارے دلوں کو ان باتوں کے لیے کیوں نہیں کھول دیتا۔

اگرچہ ہمارے شارعیین قرآن نے خلف کو اعلف کی جمع قرار دے کر اسی معنی کو ترجیح دی ہے کہ تمہاری دعوت ہماری کچھ میں نہیں آتی۔ یعنی اظہارِ معذرت کو اپنا پاس ہے اور ہم نے بھی جلد اول میں اس کی ہمنوائی کی ہے لیکن آیت کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ہم یہاں دوسرے مضموم میں یعنی اظہارِ تبحر کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہود کے اس قول قلوبنا غفلت کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہاں بل طبع اللہ اور پہلے پاسے میں بل لنعلم اللہ جو فرمایا ہے اس سے واضح تاہد اس کی برتی ہے یعنی وہ تو اپنے گمراہی اور غور کے سبب یہ سمجھتے ہیں کہ نہرت کی باتیں ایسی ہیں جو کسی معقول آدمی کے دل میں نہیں اترتی ہیں حالانکہ حقیقت اس کے بالکل خلاف ہے۔ یہ باتیں تو نہایت معقول اور نہایت دلنشین ہیں۔ لیکن ان لوگوں کے کفر اور ان کی ضد اور ہٹ و حرری کے سبب سے ان کے دلوں پر اللہ تعالیٰ نے مہر کر دی ہے اس وجہ سے اب ان کے اندر ان معقول باتوں کے قبول کرنے کے لیے کوئی صلاحیت باقی نہیں رہ گئی ہے یہ ہمارا بتلا کہیں نہیں لگتی جہاں ہی گنتی ہے اور یہاں تو اس کی تصریح بھی موجود ہے جگہ جگہ آخر میں فرمایا ہے فلا یؤمنون الا قلیلاً اس کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ وہ لوگ سائے ایمان سے محروم ہیں صرف متوڑے ایمان رکھتے ہیں اور دوسرا یہ کہ ان لوگوں میں اہل ایمان کی تعداد بہت متوڑی ہے۔ پہلی صورت میں قلیل کا موصوف ایمان مذہب ہوگا اور دوسری صورت میں قلیل کا موصوف عدد مذہب ہوگا۔ ایمان کی صفت ہونے کی صورت میں مطلب یہ ہے کہ جو ایمان سمات کے لیے ضروری ہے اس میں عقائد کے ساتھ معاملات، اخلاق اور اجتماعی و انفرادی زندگی کے متعدد اجزاء ہیں۔ یہود دینی زندگی کے سائے اجزاء میں سے صرف چند اجزاء تک

کتاب الہی کو مانتے تھے اور یہ کتاب الہی کے ساتھ معالجات میں سے چند کو مانتے تھے۔ کتاب الہی کے وہ معالجات جن کا تعلق حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد رسول اللہ کی نبوت سے تھا۔ ان کو رد و اعتناء سمجھتے، اور حد کی سنت جوئے کی صورت میں طلب یہ ہے کہ ان کی بڑی تعداد ایمان سے محروم تھی صرف چند آدمی ایمان رکھتے تھے جیسے عبدالعزیز بن سلام وغیرہ۔

یہود کے دیگر سنگین جرائم

۲۲۲۔ نیز ان کے کا فرانہ طرز عمل اور حضرت مریم پر بہتان غصیدہ کی وجہ سے اور اس بنا پر کہ انہوں نے کتاب کے جوئے حضرت بنی ابن مریم کو قتل کر دیا ہے۔ یعنی اور نیز اس وجہ سے کہ حضرت عیسیٰ ابن مریم سے ہجو کر اور کفر کیا اور حضرت مریم پر طوفان عظیم باغداد اور ان کے اہل قول پاکہ فرست گئے تھے کہ ہم نے حضرت عیسیٰ کو مار ڈالا ان تمام وجوہ سے یہود پر عذاب اور عیسیتیں آئیں۔

اس فقرے میں یہودیوں کے تین سنگین جرائم ملتے گئے ہیں
اول کفر

دوم حضرت مریم پر بہتان

سوم حضرت عیسیٰ ابن مریم کو قتل کا دعویٰ

کفر سے یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کفر مراد ہے۔ آلوسی لکھتے ہیں اکفر بیسی، قرطبی فرماتے ہیں بکفر تم ایسے، تافسی بیضاوی رقمطراز ہیں اسی بیسی ابن مریم۔ صاحب الفوائد السید رشید بن فرماتے ہیں واللہ اکفر۔۔۔ اکفر بیسی۔ قرآن یہاں یہودیوں کے سنگین جرائم میں ایک جرم یہ بتا رہا ہے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ ابن مریم کے کفر کا جرم کیا تھا اور نبوت کا انکار قرآن کے نزدیک سنگین جرم ہے جیسا کہ یہ بھی پڑھ آئے ہوں۔ یہود کا دوسرا جرم جسے قرآن نے یہاں بیان کیا ہے دو حضرت مریم پر بہتان ہے۔

حضرت عیسیٰ کی پیدائش کا مسئلہ یہودیوں میں ذرا برابر مشتبہ نہ تھا بلکہ جس روز وہ پیدا ہوئے تھے۔ اسی روز اللہ تعالیٰ نے پوری قوم کو اس بات پر گواہ بنالیا تھا کہ یہ ایک غیر معمولی شخصیت

کا پتہ ہے جس کی ولادت مجزہ کاغذ پر ہے ذکر کسی اخلاقی جرم کا۔ جب بنی اسرائیل کے ایک شریفینا اور مشہور دانشور مذہبی گھرانے کی بنیادی لڑکی گود میں پڑے ہوئے آئی اور بڑے چھوٹے سبکدوش ہزاروں کی تعداد میں اس کے گھر پر ہجوم کر کے آگے تواس لڑکی نے ان کے سوالات کا جواب دینے کے بجائے خاموشی کے ساتھ اس کو زانیہ بچہ کی طرف اشارہ کر دیا کہ یہ نہیں جواب دے گا۔ مجمع نے حیرت سے دیکھا اور کہا کہ اس بچہ سے ہم کیا پوچھیں جو گولے میں لٹا ہوا ہے۔ ٹھیکہ بے بارہ پتہ گویا ہو گیا اور اس نے نہایت صاف اور فصیح زبان میں مجمع کو خطاب کر کے کہا اذی عبد اللہ

اتنی اکتاب و جعثنی نبیاً میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اللہ نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کے لیے اُس شبہ کی بڑکاث دی تھی جو روت میں سے اُسے میں پیدا ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سن شباب کو پہنچنے تک کبھی کسی نے

حضرت مریم پر زنا کا الزام نہ لگایا۔ حضرت عیسیٰ کو ناجائز ولادت کا طعنہ دیا۔ لیکن جب تیس برس کی عمر کو پہنچ کر اپنے نبوت کے کام کی ابتدا فرمائی اور جب آپ نے یہودیوں کو ان کی بد اعمالیوں پر حاکم کرنی شروع کی ان کے ٹھکانے و قلعہ گمان کی ریاکاری پر ٹوٹا۔ ان کے عوام اور خواص سب کو اس اخلاقی زوال پر متنبہ کیا جس میں وہ مبتلا ہو گئے تھے۔ اور اس پر خطر طے کی طرف اپنی قوم کو دعوت دی جس میں خدا کے دین کو عملاً قائم کرنے کے لیے ہر قسم کی قربانیاں برداشت کرنی پڑتی تھیں۔ اور ہر مخالف شیطانی قوتوں سے لڑائی کا سامنا تھا۔ تو یہ بے باک مجرم صداقت کی آواز کو دہانے کے لیے ہر ناپاک سے ناپاک ہتھکڑیاں استعمال کرنے پر آمادہ تھے۔ اس وقت انہوں نے وہ بات کہی جو تیس سال تک نہ کہی تھی کہ مریم علیہ السلام صفا اللہ زانیرہ تھیں اور عیسیٰ علیہ السلام ولدا لہما۔ حالانکہ یہ ظالم بالیقین جانتے تھے کہ یہ دونوں ماں بیٹے اس جگہ سے باہل پاک ہیں پس حقیقت ان کا یہ بہتان کسی شبہ کی بنا پر نہ تھا جو واقعی ان کے دلوں میں موجود ہوتا بلکہ خالص بہتان تھا جو انہوں نے یہاں بوجہ کجی کی مخالفت کے لیے گھڑا تھا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اسے کفر قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس الزام سے ان کا اصل مقصد خدا کے دین کا راستہ روکنا تھا تاکہ ایک بے گناہ عورت پر الزام لگایا جائے۔

قرآن نے حضرت مریم پر یہودیوں کے اس الزام کو بہتانِ عظیم قرار دے کر حضرت مریم کی

پاکدامنی کا اعلان کیا ہے۔

یہود کا تیسرا جرم یہ بتایا گیا ہے کہ انا قتلنا المسیح عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ ہم نے مسیح ابن مریم اللہ کے رسول کو قتل کر دیا۔ یہاں لفظ رسول اللہ کے بارے میں شادین قرآن کے خیالات مختلف ہیں۔ علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ یہودیوں نے لفظ رسول اللہ استعزاز کا ہے مطلب یہ ہے کہ یہود حضرت عیسیٰ کو رسول خدا تو نہیں مانتے تھے یہاں وہ حضرت عیسیٰ کو رسول اللہ بطور تفسیر کہہ رہے ہیں۔ جیسے فرعون نے کہا تھان رسولکم الذی ارسل الیکم ليجنون۔ اسی طرح یہود بطور فخر طنز کہتے تھے کہ ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو جو خدا کا رسول ہونے کا دعویٰ کرتے تھے قتل کر دیا۔ اور کچھ کی گئے یہ ہے کہ رسول اللہ کا لفظ یہود کے قول کا جزو نہیں بلکہ ان کے جرم کی مشکلی، واضح تر کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے کہا لیکن زیادہ اچھا یہ ہے کہ یہ یہود ہی کا قول ہے اور ان کی جرات بھرا مذاںس قدر ترقی کر گئی تھی کہ رسول کو رسول جانتے ہوئے قتل کے اقدام کا اعلان کر رہے ہیں اور فخر یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم نے اللہ کے رسول کو قتل کیا ہے اور گواہی کے واقعہ کا جزو کر کیا ہے اس پر غور کرنے سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ یہودیوں کے لیے مسیح علیہ السلام کی نبوت میں شک کر لے کی گئی تھی باقی نہ تھی۔ پھر جو ردِ شکیاں انہوں نے حضرت عیسیٰ میں مشاہدہ کیں ان کے بعد تو یہ معاملہ بالکل ہی غیر مشتبہ تھا کہ وہ کسی غلط فہمی کی بنا پر نہ تھا بلکہ وہ خوب جانتے تھے کہ ہم اس جرم کا ارتکاب اس شخص کے ساتھ کر رہے ہیں جو اللہ کی طرف سے رسول بن کر آیا ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہاں یہ لطیف بات سمجھنے کی اور توجہ کی مستحق ہے کہ اس پروریِ کثرت میں کچھ کاموں اور کچھ باتوں کو یہودیوں پر لعنت کا سبب بنایا ہے۔ کام یہ یہ ہیں نقضِ میثاق، کفر بآیات اللہ، قتلِ انبیاء اور بائیں یہ ہیں۔ ان کا کہنا کہ ہمارے دل غلافوں میں ہیں۔ ان کا حضرت مریم پر تہمت لگانا اور ان کا یہ کہنا کہ ہم حضرت مسیح عیسیٰ رسول اللہ کو قتل کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قتلِ مسیح ان کے افعال میں سے نہیں بلکہ اقوال میں سے ہے۔ اگر یہود نے فی الواقع حضرت مسیح کو قتل کیا ہوتا تو ان کا یہ فعل قابلِ لعنت ہوتا اور تعبیر یوں ہوتی و قتلہم المسیح عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ تعبیر یہ نہیں ہے بلکہ یہ ہے و قتلہم انا قتلنا المسیح یہاں صرف قول کو موجبِ لعنت قرار دینا اور افعال کی فہرست میں اس کا ذکر نہ کرنا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ یہودیوں کا مجرور افتراء

بہتان ہے۔ ان کا یہ قول ہی ان کی طریت کا سبب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر فعل قتل صورت فعلیہ میں وہاں فی الواقع موجود ہوتا تو اللہ تعالیٰ فعل کو سبب لعنت قرار دیتا، ذکر صرف قول کو۔ اور یہاں یہود کی صرف اس لاف زنی کو سبب لعنت ہٹا کر افشا کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو حضرت مسیح کی نہایت یہ بات بیحد ناپسند ہے کیونکہ یہود کا یہ دعویٰ جیسی ابن مریم کے بائے میں اللہ سبحانہ اُنکے اُس کردار کی جزا گئے آ رہا ہے ساقط، اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی طرف اٹھایا تکذیب کرتا ہے۔

حضرت مسیح نہ مقتول ہیں نہ مصلوب

۲۳۳۔ حالانکہ انہوں نے نہ حضرت مسیح کو قتل کیا ہے اور نہ ان کو سولی پر چڑھایا بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ حقیقت حال ان پر مشتبہ ہو گئی۔ مطلب یہ ہے کہ وہ زبان سے کہتے ہیں کہ ہم نے حضرت مسیح کو قتل کیا حالانکہ انہوں نے نہ ان کو قتل کیا اور نہ سولی پر چڑھایا بلکہ ان کو اشتباہ و التباس ہو گیا۔ اس جگہ اللہ تعالیٰ نے دو لفظ استعمال فرماتے ایک ماقصدہ جس میں قتل کی نفی فرمائی۔ دوسرے ماصلبہ جس میں صلیب پر چڑھانے جانے کی نفی فرمائی۔ کیونکہ اگر صرف ماقصدہ کہتے تو یہ احتمال باقی رہ جاتا کہ ممکن ہے قتل نہ کیے گئے ہوں بلکہ صلیب پر چڑھائے گئے ہوں۔ اور ایسے ہی اگر صرف ماصلبہ فرماتے تو یہ احتمال رہتا کہ ممکن ہے صلیب پر نہ چڑھائے گئے ہوں بلکہ قتل کر دیے گئے ہوں علاوہ ازیں بعض مرتبہ یہودی بھی کرتے تھے کہ اقل قتل کر دیتے اور پھر صلیب پر چڑھاتے اس لیے قتل اور صلیب دونوں کو علیحدہ علیحدہ ذکر فرمایا اور پھر ایک حرف نفی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ حرف نفی یعنی لفظ ماکر قتل اور صلیب ہر ایک کے ساتھ علیحدہ علیحدہ ذکر فرمایا تاکہ دونوں کی الگ الگ نفی اور ہر ایک کی مستقل تردید ہو جائے اور خوب واضح ہو جائے کہ ہلاکت کی کوئی بھی صورت پیش نہیں آئی نہ مقتول ہوئے نہ مصلوب ہوئے اور نہ مقتول ہو کر صلیب پر چڑھائے گئے۔

ماقتلہ کہنے کے بعد ماصلبہ کے اضافے سے بتانا یہ چاہتے ہیں کہ حضرت کو قتل کر دینا تو الگ رہا یہود تو واقعہً اتنا بھی نہ کر سکے کہ اس زمانے میں اُس ملک میں جو طریقہ سزائے موت کا رائج تھا اسی تک آپ کو پہنچا دیتے۔ یعنی وہ آپ کو سولی پر چڑھا تک نہ سکے۔ صلیب کے اصل معنی جیسا کہ اہل لغت نے تصریح کی ہے سولی پر چڑھانے کے ہیں۔ اردو میں یہ مضموم سولی دینے سے نہیں سولی پر چڑھانے سے حاصل ہوتا ہے۔ شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالقادر شاہ

رفیع الدین نے اپنے تراجم میں اس کی خاص رعایت کی ہے۔ شاہ ولی اللہ نے اس کا ترجمہ اس طرح کیا ہے۔

دکشتند اورا دردار ذکر و ندادرا
شاہ بہر انقاد فرماتے ہیں۔

اور اس کو مارا ہے اور نہ سولی پر چڑھایا
اور شاہ رفیع الدین لکھتے ہیں۔

منہیں مارا اس کو اور نہ سولی دی اس کو
مولانا شیخ الہند لکھتے ہیں۔

منہیں مارا اس کو اور نہ سولی پر چڑھایا۔

ان شاہین قرآن کے تراجم کمر ہے ہیں اور صلب کے معنی سولی پر پڑھانے کے ہیں موت اس کے لیے لازم نہیں ہے۔ غاصر یہ ہے کہ قرآن اپنے غاصروں کو یہ بھجا رہا ہے کہ یہودیوں نے حضرت مسیح کو قتل کیا ہے اور نہ سولی پر چڑھایا ہے۔ ان کا یہ کہنا کہ انا قتلنا مسیح عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ محض ان کو زبانی دعویٰ اور قول ہی قول ہے۔ اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ یہودی محض اس کہنے کی وجہ سے اللہ کے غضب اور لعنت کا گھوارہ بنے ہیں اگر فی الواقع وہ قتل کر دیتے تو نہ معلوم کس قدر غضب اور لعنت کے مستحق ہو جاتے اور یہ بھی اس آیت سے معلوم ہوا کہ آج بھی جو شخص کہے مسیح عیسیٰ ابن مریم مقتول اور مصلوب ہوئے ہیں وہ بلاشبہ ملعون اور مضروب ہے۔

قتل و صلب کی غلط توجیہ

کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ ان آیت میں مطلق قتل اور صلب کی نفی مراد نہیں بلکہ ذلت اور لعنت کی موت کی نفی مراد ہے لیکن ایسا سوچنا درست نہیں ہے کیونکہ آیت قرآنی میں مطلق قتل اور صلب کی نفی بلا تہید کی گئی ہے۔ قید کا اضافہ اپنی جانب سے ہے نہ قرآن حکیم میں اس قید کا نام و نشان ہے اور نہ کسی صحیح اور ضعیف حدیث میں اور نہ کسی صحابی اور تابعی کے اثر اور قول میں اس کا کوئی نشان ہے محض وہم و گمان سے قرآن کے اطلاق کو کیسے مقید کیا جاسکتا ہے۔ اور اگر یہ سوچا جائے کہ یہود اس کے قائل ہیں تو جواب یہ ہے کہ یہود تو ہزار ہا اباہیل کے قائل ہیں تو کیا قرآن حکیم کی

تفسیر کو ان کے مخرجات فاسدہ اور خیالات باطلہ کے تابع کیا جاسکتا ہے۔ اور اگر یہ مان بھی لیا جائے تو پھر بھی اس آیت میں یہود کا بھرپور رد ہے اس لیے کہ یہود کا گمان یہ تھا کہ جیسا کہ نبی ضرور قتل ہوتا ہے اس کے جواب میں قرآن کہتا ہے کہ حضرت مسیح قتل ہی نہیں کیے گئے اور نہ مصلوب پر چڑھائے گئے کیونکہ وہ خدا کے پیچھے ہی تھے۔

علاوہ ازیں اگر یہود کے اس مضموم کی رعایت کی جائے تو قدسہ الانبیاء اور یقتلون الغیبین کے یہ معنی کیے جائیں گے کہ معاذ اللہ انبیاء ذات اور لعنت کی موت مرے۔

دہم کا ازالہ

پچھلے فقرے کے معنی یہ ہوتے کہ یہود نے مسیح علیہ السلام کو قتل نہیں کیا اور زنان کو سولی پر چڑھایا۔ اس انداز بیان کا منطوق یہ اور صرف یہ ہے کہ مقتول اور مصلوب حضرت مسیح نہیں ہیں۔ یعنی قتل کی نفی منقول پر مقصود ہے۔ یہ بتانا مقصود نہیں کہ وہاں قتل کا کوئی واقعہ نہیں ہوا بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ قتل و مصلوب کا واقعہ ہوا ہے لیکن مقتول و مصلوب حضرت مسیح علیہ السلام نہیں ہیں۔ یہاں ذہنوں میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ اگر حضرت مسیح مقتول و مصلوب نہیں ہیں تو پھر کون ہے کہ نہ تو قتل و مصلوب دونوں میں امریں نہ بھی اور خیال نہیں ہیں اس لیے کوئی مذکور کوئی تضرع مقتول و مصلوب ہے۔ اسی ذہنی دہم کا ازالہ کرنے کے لیے ارشاد ہوا ہے و لکن شبہ مہم یعنی مقتول و مصلوب حضرت مسیح نہیں بلکہ کوئی اور تھا۔

شاید یہاں آپ کے ذہنوں میں یہ غلطی ہو کہ اگر یہی مطلب ہے تو پھر فعل شبہ میں اسناد کس طرف ہے اور اس فعل کا مسند الیہ کون ہے کیونکہ اگر اس کا مسند الیہ حضرت مسیح کو قرار دیا جائے تو مسیح اس صمدت میں مشبہ ہوں گے اور یہاں ذکر مشبہ کا ہے۔ اور اگر یہاں کسی اور مقتول و مصلوب کو مسند الیہ بتایا جائے تو اس کا ذکر یہاں نہیں ہے۔

اس کا جواب بالاتفاق مجہور مضمرین وہ ہے جو امام ذہبی نے منافیہ العیب میں دیا ہے کہ شبہ کا مسند الیہ ضمیر ہے اور ضمیر کا مرجع وہ مقتول ہے جو ماضیہ کا مدلول ہے اس اعتبار سے مقتول مذکور ہے اور فعل مجہول کی ضمیر کا مرجع ہے۔

اس کے علاوہ انا قلنا المسیح میں بھی اس مقتول کا ذکر ہے جیسا کہ قاضی بیضاوی کی لکھتے ہیں چنانچہ قاضی صاحب رقمطراز ہیں۔

اس نفل کا مسند الیہ ضمیر ہے اس کا مرجع وہ مقتول ہے جو انا قتلنا کا بدلہ لول ہے۔
 یوں کہہ دیجئے جیسا کہ خود قاضی صاحب نے لکھا ہے کہ
 شبہ کا مسند الیہ جار مجرور ہے گویا یوں کہا گیا ہے کہ ان کو حضرت عیسیٰ اور مقتول
 میں مشابہت نظر آئی۔

پہلی صورت میں معنی یوں ہوں گے کہ مقتول کو حضرت عیسیٰ جیسا بنا دیا گیا اور دوسری صورت
 میں معنی یہ ہوں گے کہ یہودیوں کے لیے اصل معاملہ مشتبہ بنا دیا گیا۔ پہلے معنی کی رعایت سے حضرت
 شاہ عبدالقادر اس طرح ترجمہ فرماتے ہیں لیکن وہی صورت بن گئی ان کے آگے۔ حضرت عبداللہ بن
 عباس سے اسناد صحیح منقول ہے کہ جب یہودیوں نے حضرت مسیح کے قتل کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ
 نے حضرت مسیح علیہ السلام کو مکان کے کسی درپچے سے آسمان پر اٹھالیا اور انہی میں سے ایک شخص کو حضرت
 عیسیٰ کے مشابہ بنا دیا۔ یہودیوں نے اُسے حضرت عیسیٰ سمجھ کر قتل کر دیا۔ (ابن کثیر) یہ روایت حدیث
 کی متعدد کتابوں میں موجود ہے اور اس کے راوی علی بن خضر البغدادی ہیں۔ جس طرح فرشتوں کا بشکل
 بشر متشکل ہزارہ سوئی علیہ السلام کے عصا کا اثر وہاں جانا قرآن مجید میں مذکور ہے تو پھر ایک
 شخص کے عیسیٰ علیہ السلام کے مشابہ ہو جانے میں کیا استبعاد ہے؟ احیاء موتی کا اعجاز کا نام نہ
 القابہ شبہ کے معجزہ سے بہت زیادہ بلند ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے احیاء موتی کے معجزہ کو ماننا اور القابہ
 شبہ کے معجزہ کا انکار بڑا ہی عجیب ہے۔ اور دوسرے معنی کی رعایت سے مولانا آزاد فرماتے ہیں
 کہ صورت حال ان کے لیے مشتبہ ہو گئی۔ یہ ان یہودیوں کے بائیسے میں ہے جو اپنے اباؤ اجداد کی
 تقلید میں کہتے چلے آئے تھے کہ حضرت مسیح کو سولی سے دی گئی۔ یہ شبہ بین الناس کے زمانہ مسیح میں
 یہودیوں کے غلام بنے تھے۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے ہاتھوں سے قتل گئے تو انہوں نے
 کئی غلام پکڑ کر پھانسی سے دی اور کسی کو لٹے دیکھنے نہ دیا اور پھر وہی کو دیا اور لوگوں میں یہ مشہور
 کر دیا کہ حضرت عیسیٰ کو پھانسی سے دی گئی اس سے صورت حال مشتبہ ہو گئی۔ سید انور شاہ کشمیری
 نے عقیدۃ الاسلام میں حافظ ابن حزم کی دلیل نقل کی ہے۔ بہر حال مفسرین
 کا اس پر اتفاق ہے کہ یہودیوں کو دھوکہ دیا اور وہ حضرت عیسیٰ کے دھوکہ میں کسی اور کو سولی پر
 چڑھا گئے لیکن یہ شخص کون تھا اور دھوکہ کی صورت کیا ہوئی۔ اس کا تیسری جواب مذکور قرآن مجید
 میں ہے اور کسی صحیح حدیث میں۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ تاریخ کی روشنی میں واقعہ
 کی جزئیات کو یکجا کیا جائے۔

تاریخ کی روشنی میں اشتباہ کی نوعیت

اس موضوع پر مولانا دیوبندی نے بیسوط بحث کی ہے۔ ہم میان ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے ان کا بیان پیش کرتے ہیں۔

پہلی بات اس سلسلے میں یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ یروشلیم کے لوگوں سے بہت کم ملتے جلتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ عوام تو عوام خواص بھی آپ کو پوری طرح نہ پہچانتے تھے۔ چنانچہ جب آپ کی گرفتاری کا وقت آیا تو اس کے لیے اکابر یہود اور متعدد سپاہیوں کا ایک ہوراگروہ اس ضرورت کے لیے کالی ثابت نہ ہوا۔ بلکہ آپ کی شناخت کے لیے آپ ہی کی مختصر سی پارٹی کے ایک منافق و فداکار کو ساتھ لینا پڑا۔ یہ ایک خالص تاریخی حقیقت ہے لیکن امام المفسرین امام رازی اس راز سے بھی واقف ہیں۔ فرماتے ہیں: **اناس ماکانوا یرمون المیسح الا بالاسم** ماکان قلیل الخاطیۃ **اناس** دیکھ، متی اور مرقس دونوں انجیلوں میں ہے کہ گرفتاری کرنے والی پارٹی میں سردار اکاہنوں اور قوم کے بزرگوں کی طرف سے ایک ”بیسر تھواری اور لاشیاں لیے ہوئے“ سپاہیوں کی شامل تھی۔ اس پر بھی گرفتاری اور شناخت کے لیے انہیں یہود منافق کاسہارا دھونڈنا پڑا اور انجیل یوحنا میں ہے کہ جب یہ پلٹن اور پیانسے واپس پہنچے تو یسوع نے اُن سے پھر پوچھا کہ تم کسے دھونڈتے ہو، وہ بولے یسوع نامری کو۔ یسوع نے جواب دیا: میں تم سے تو کبہر چکا ہوں۔“ (۲۱: ۱۷-۱۸)۔ حضرت مسیحؑ کا تنظیمی خیال تو بہت بعد کی پیداوار ہے۔ معاصر مخالفین و معاندین کی نظر میں تو آپ کی حیثیت صرف یسوع نامری نامی ایک بڑا نام و غیر معروف مجرم کی تھی۔ وہ سامنے موجود تھا۔ اور پھر بھی کوئی پہچان نہیں رہا تھا۔ حالانکہ سب آتے تھے۔ اُس کی تلاش میں اور سری بات یہ خیال رکھنے کی ہے کہ حضرت عیسیٰ کو آیا، غلطاً یہود یسوع نامری کو تبدیل ہیئت میں خاص ملکہ تھا۔ انجیلوں میں حضرت کی اسی قدرت کو بطور معجزہ کے بیان کیا گیا ہے۔ ”چھ دن کے بعد یسوع نے پطرس اور یقوب اور اس کے بھائی یوحنا کو ہمراہ لیا اور انہیں ایک اونچے پہاڑ پر الگ لے گیا اور اُن کے سامنے اُس کی صورت بدل گئی۔ اور اُس کا چہرہ سورج کی مانند چمکا“ (متی ۱۷: ۲۴)۔ جب وہ دعائے الگ تھا تو ایسا ہوا کہ اُس کے چہرہ کی صورت بدل گئی اور اس کی پوشاک سفید براق ہو گئی۔“ (لوقا ۹: ۲۹) نیز مرقس (۱۰: ۲۹) یہ معجزہ تھایا تھا، یہ ایک الگ بحث ہے۔ بہر حال آپ کو نفس قدرت اس پر حاصل تھی

تیسرے "اس تاریخی حقیقت کا استعمار ذہن میں کر دیا جائے کہ ملک اشام و فلسطین، اکیلا وہی اُس وقت امرائیسوں، یہودی کی تھی اور اس پروردی کے ایک "رہ آپ بھی تھے لیکن ملک پر حکومت وہیوں کی تھی اور اعلیٰ عہدہ دار اور پولیس اور فوج وہیوں پر مشتمل تھی اور یہودی نہ صرف شرک یعنی دین و عقیدہ میں اسرائیلیوں سے علیحدہ تھے۔ بلکہ صورتِ شکل، وضع و لباس، زبان و معاشرت وغیرہ میں ان سے ایسے ہی الگ تھے جیسے آج انگریز ہندوستانیوں سے مختلف و متنازع ہیں اور جس طرح آج ہندوستانیوں کو سب فوجی گزے یکساں اور گوروں کے سائے "کالے" ایک سے معلوم ہیں، بدیسی وہی سپاہیوں اور فوجیوں کی نظر میں سب یہودی یہود اور اسرائیلی اسرائیلی بھی ایک ہی تھے۔ چوتھی کڑی اس سلسلہ کی یہ تھی کہ جس مقام پر وہی عدالت تھی وہاں سے سرکاری سولی گھراصلہ پر تھا۔ اور سولی یا صلیب جس کی شکل انگریزی چھاپہ کے بڑے حرف "A" کے مشابہ یا بیروے شکل سے مٹی جلتی ہوتی تھی۔ وہ سولی گھر میں پروردی گڑھی جڑی نہیں ہوتی تھی صرف اس کا سیدھا اور کھڑا ستون زمین میں گڑھا ہوا رہتا تھا۔ باقی جو مکڑی اس کے اوپر آڑی آڑی پڑتی تھی۔ اس کے نیچے قاعدہ یہ تھا کہ وہ مجرم کو عدالت سے اپنے اوپر لا کر سولی گھر تک لائی پڑتی تھی جہاں تک جو کچھ ماضی ہوا اس پر ایک خط دوبارہ کر کے امور ذیل کو بھی نظر کے سامنے لے آئیے۔ ۱۔ حکم جب سنایا گیا ہے مجرم کو دن تھا اور دن آخر ہو رہا تھا اور یہودی کہ جلدی تھی کہ ہر طرح فراغت پاکر شاموں شام گھر واپس آجائیں۔ جمعہ کے شام ہی سے ان کی یوم السبت شروع ہو جاتا تھا اور یوم السبت کے حدود کے اندر مجرم کی سزا دینی وغیرہ نہ ہوتی تھی اور پھر یہودی کا اہم تہوار، عید فصح (۱) بھی شروع ہو رہی تھی۔ غرض یہودی کو اس کی بہت ہی جھلٹ تھی کہ کسی طرح ان کا یہ مجرم سولی پاکر شام سے قبل ہی وطن ہو جائے۔ ۲۔ لاغر و ناتواں مجرم دینی خود حضرت مسیح کے لیے ممکن نہ تھا کہ اتنا وزنی مکڑی لا کر اتنا فاصلہ یہودی کی خاطر خواہ تیزی سے طے کر سکیں۔ خصوصاً جب کہ یہودی بچے اور شریعہ قسم کے یہودی وہی قدم قدم پر انہیں چھیڑتے جاتے۔ ۳۔ کاماستہ کھڑا کرتے جاتے۔ اب ساری صورت حال کو اس تفصیل کے ساتھ پیشِ مندر لکھ کر فرمائیے کہ وہی سپاہی، جو مجرم، بلکہ مجرموں کو رہا آپ کے ساتھ سولی کے لیے دو مجرم اور بھی تھے احرام میں لیے ہوئے تھے اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ وہ رعایا میں سے نہیں بلکہ حاکم قوم کے افراد تھے۔ ایسے موقع پر کیا کرتے؟ خود تو اپنے اوپر وہ سولی والی مکڑی کا بوجھ لٹانے سے ہے۔ انہوں نے وہی کیا جو ان کی جگہ پر کوئی بھی اُن جیسا انسان کرتا۔ انہوں نے مجمع ہی میں سے کسی بدتمیز

یہودی کو پکڑ لیا اور صلیب کی کڑی آس پر لاد دی۔ انگریز گارڈ ایسے موقع پر یعنی کسی ہندوستانی مجرم کو سزا سناتے میں لیے جاتا ہوتا تو کیا کتا! یہی کرتا کہ بھیڑ میں کسی ہندوستانی ہی کو پکڑ لیتا۔ اس پر لاد دیتا۔ یہ محض قیاس و تقریر نہیں۔ انجیلوں میں اتنے جزد کی تصریح موجود ہے۔ انہیں شہنشاہ نام ایک کرینی آدمی ملا۔ اسے بنگلہ پکڑا کر اس کی صلیب اٹھائے۔ (متی ۲۷: ۳۲) اور شمعون نام ایک کرینی آدمی اسکندر دقس کا باپ سمات سے آئے ہوئے اور سے گزرا۔ انہوں نے اسے بنگلہ سے پکڑا کر اس کی صلیب اٹھائے۔ (دور قس ۱۵: ۲۱) اور جب اس کو لیے جاتے تھے تو انہوں نے ایک شمعون نام کرینی کو پکڑا جو سمات سے آتا تھا پکڑ کر صلیب اس پر رکھ دی کہ یہ سوع کے چچے جیسے چچے ہے۔ (لوقا ۲۴: ۲۶) جب یہ مجمع (جو یقیناً کوئی باقاعدہ و منظم مجمع نہیں) بلکہ عوام کی ایک بھیڑ تھا۔ اس افراد قری کے ساتھ ایک دوسرے کو دلتا پھیلتا، مجرم سے جیسے بھاڑ کرتا، اس سے تھک رہا ہوا، سولی گھر کے چانگ پر پہنچا تو رومی جو لیس گارڈ جو ساتھ تھا اب اس کی ڈیڑی ختم ہو گئی۔ اب یہاں سے جیل کے سنہریوں کا عمل دخل شروع ہوتا ہے۔ وہ کیا جانیں کہ یہودی ناصری کسی کا نام ہے۔ وہ اپنے حسب دستور مجرم اسی کو سمجھتے جس کے اوپر صلیب لادی ہوئی تھی۔ ایک مرتبہ پھر اس حقیقت کو مستحضر کر لیجئے کہ جیل کے رومی سپاہیوں کے لیے سب یہودی اجنبی ہی تھے اور اس لیے ہم دگر ہشکل اور یکساں۔ انہیں ایک اسرائیل (یسوع ناصری) اور دوسرے اسرائیلی (شمعون کرینی) کے درمیان اشتباہ نہایت آسان تھا۔ انہیں دونوں کے درمیان کوئی نمایاں فرق ہی نہ تھا۔ شمعون نے یقیناً داویلا مچایا ہو گا۔ لیکن اور مجمع کا شور و ہنگامہ اور صلیب کے سپاہیوں کی اسرائیلیوں کی زبان سے نادانیت، اور پھر سولی پر ٹھکانے کی جلدی، اسی افراد قری کے عالم میں اسی شمعون کو پکڑ کر سولی پر چڑھا دیا گیا اور وہ جیغ اٹھاتا رہا۔ حضرت مسیح قدس سرہ اس ہڑنگ میں دشمنوں کے ہاتھ سے رہا ہو گئے اور دشمن دھوکے میں پڑے ہوئے ٹامک ٹوٹے مانتے رہ گئے۔ لیکن خدا ہر لمحہ یہ عقیدہ نوا بہادری نہیں خود سیکھوں ہی کا ایک قدیم ترین فرقہ باسیدیہ کے نام سے گز رہا ہے (انی فرقہ کا سال وفات سن ۱۸۵۷ء) وہ اسی عقیدہ کا قائل تھا اور کلمہ کھلا کرتا کہ مصلوب حضرت مسیح نہیں ہوئے بلکہ شمعون کرینی ہوا ہے قرآن مجید نے اسی عقیدہ کی تصویب کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔

چند شبہات اور ان کا ازالہ

قرآن نے حضرت مسیح کے مصلوب ہونے اور مقتول ہونے کی جس زور سے تردید کی ہے، وہ

کچھ لوگوں کے لیے حیران کن ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ

دنیا کی دو کثیر التعداد قومی یہود و نصاریٰ تو اتر قومی کے طور پر اس پر متفق ہیں کہ حضرت مسیح مصلوب ہوئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت مسیح کی مصلوبیت کا مسئلہ متواتر ہونے کی وجہ سے قطعی ہے۔ یہ غلط ہے کہ اس مسئلہ کی پشت پر تو اتر کی طاقت ہے اور یہ بھی بدیہی طور پر واقعہ کے خلاف ہے کہ یہ مسئلہ نصاریٰ میں اتنا ہی ہے۔

در اصل یہ بات کہ حضرت مسیح کی مصلوبیت تو اتر سے ثابت ہے صرف وہ ہی لوگ کہتے ہیں جن کو تو اتر کی حقیقت کا علم نہیں ہے۔ بے سرو پا غیروں اور افواہوں کا نام تو اتر نہیں ہے۔ بلاشبہ جو کام جو بات جو حالت تو اتر کے ساتھ ہم تک پہنچے وہ یقینی ہے اور عقل بھی یہ فیصلہ کرتی ہے کہ اسے ثابت شدہ حقیقت تسلیم کرنا چاہیے کیونکہ تو اتر کا مفید یقین ہر نامسلما ت میں سے ہے لیکن یہ بات کہ تو اتر کسے کہتے ہیں ذرا سمجھنے کی ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں۔

خبر کے متواتر ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں چار شرطیں ہوں اول یہ کہ بیان کرنے والوں کی اتنی بڑی تعداد ہو کہ عادیہ جن کا جھوٹ پر ایک کمال ہو۔ دوم یہ کہ از ابتدا تا انتہا سلسلہ روایت میں ہم آہنگی اور یکسانی ہو۔ سوم یہ کہ آخر میں علمی سہارا کوئی علم و فکر اور منظر نہ ہو بلکہ محسوس و مرئی اور مشاہدہ ہو چہاں ہم یہ کہ سننے والوں کو یہ خبر علمی قاطع ملے رہی ہو۔

اور علامہ سخاوی فنیح المغنیث میں رقمطراز ہیں :

یہ سب باتیں اس وقت قابل پذیرائی ہیں جب خبر کا آخری مرکز محسوس ہو۔ اگر مشاہدہ سے متعلق ہے تو مشاہدہ ہو اور اگر سماع سے متعلق ہے تو سماع ہو۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ تو اتر کے لیے ضروری ہے کہ بیان کرنے والوں کی اتنی تعداد ہو کہ جن کا جھوٹ پر اتفاق ناممکن ہو۔ اور پھر جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کا اپنے حواس سے ادراک کر رہے ہوں اور ان میں باہم کہیں اختلاف نہ ہو۔ اب آپ ہی خدا ملگتی فرمائیے کہ مصلوب مسیح کے موضوع پر اس قسم کا تو اتر کہاں موجود ہے۔ اس موضوع پر ہماری تاریخی معلومات کا سب سے بڑا سہارا انا جیل ہیں یا پھر کچھ رسائل ہیں۔ انا جیل کے مولفین میں عدد تو اتر ہے اور انا جیل کی روایات میں کسی مشاہدہ کرنے والے کا کوئی بیان ہے۔ واقعہ مصلوب کی روایت کا انا جیل میں مرکز چند عورتیں ہیں۔ راویوں میں عدد تو اتر مفقود ہے اور جو بھی بیان کرنے والے ہیں ان میں واقعہ کا چشم دید

گواہ کوئی نہیں ہے وہ تو اتر کھتے ہیں یہ افراد ہے اس کی قانونی حیثیت کچھ بھی نہیں۔
 باقی یہ رہا یہ مسئلہ کہ یہ نصاریٰ میں متفق علیہ ہے۔ یہ بھی تحقیق کی روشنی میں غلط ہے چنانچہ
 صاحبِ سیلِ قرآن عزیزی کے ترجمہ انگریزی میں بذیل آیت دمکر واد مسکن اللہ لکھتے ہیں:
 یہود کے خلاف اللہ لاکر یہ تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھالیا اور
 آپ کی شاہت ایک اور شخص پر ڈال دی جو آپ کی جگہ گرفتار ہو کر سولی دیا گیا۔ یہ
 مسلمانوں کا متواتر مسئلہ ہے۔ بعض عیسائی یہ گمان کرتے ہیں کہ یہ قصہ انکارِ شہادت
 کا معاذ اللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی اختراع ہے مگر رد لوگ یقیناً
 غلطی پر ہیں کیونکہ پھر کے نسخے بہت مدت پہلے عیسائیوں کے بہت سے
 فرقوں کا بھی اعتقاد تھا۔ چنانچہ فرقہ بے سولی دین جو عیسائیت کے نہایت
 شروع میں تھا۔ مسیح علیہ السلام کے مصلوب ہونے سے انکار کرتا تھا اور
 ان کا اعتقاد یہ تھا کہ سائینس آپ کی جگہ سولی پر لٹکایا گیا، ایسے ہی فرقہ برٹش
 جران سے بھی پیشتر تھا اور کارپاکرشن جو مسیح علیہ السلام کو صرف انسان ہی مانتے
 ہیں، ان کا بھی یہی اعتقاد تھا کہ مسیح علیہ السلام مصلوب نہیں ہوئے بلکہ آپ
 کے حواریوں میں سے ایک شخص کو جو آپ کا ہم شکل تھا صلیب دیا گیا۔ مصنف
 فرمیں کہتا ہے کہ میں نے ایک کتاب بنام نوسٹولوں کے سفر نامے، پڑھی جس میں
 پطرس، یوحنا، اندریاس، طاس اور پلوس کے عمال مندرج تھے اور من جملہ
 دیکھا کہ ایک امر یہ بھی تھا کہ مسیح علیہ السلام مصلوب نہیں ہوئے بلکہ آپ
 کی جگہ کوئی اور شخص صلیب دیا گیا تھا۔

ایک اور غلط

شاید آپ کے ذہن میں یہ غلطی ہو کہ ممکن ہے کچھ عیسائی فرقے حضرت عیسیٰ کے مصلوب نہ ہونے کا عقیدہ
 رکھتے ہوں، لیکن انجیل اور عہدِ جدید کے رسائل کی تصریحات تو مسئلہ صلیب کے کی مویہ اور مثبت ہیں
 جب ان کتابوں میں مسئلہ کی تصریح اور پھر ان میں لکھی نہ ہر ناد کوئی مستحکم ہے تو پھر صلیب مسیح کے عقیدے
 کو ماننا ضروری ہے۔

جواب یہ ہے کہ اولاً ان کتابوں کے لکھی سے محفوظ ہونے اور ان کے مصنفین کی مصحت کی کوئی دلیل

نہیں ہے مائینا یہ کتاب جن مصنفین کی طرف منسوب ہیں ان کی طرف ان کی نسبت بھی تو اتنے ثابت نہیں ہے۔ مثلاً ان انامیل کی تصریحات دوسری انامیل سے معارض ہیں جیسے ابجیل برنا باس اور دوج ترجیح کوئی جوڑ نہیں ہے۔ راجھا یہ انامیل خود اس مسئلہ میں باہم متعارض ہیں۔ خاصاً ان انامیل کی تصریحات قرآن سے معارض ہیں اور قرآن کی تاریخی حیثیت تو اترا ثابت ہے۔

بلاشبہ حضرت یسوع کو رسول لینے کا قصہ موجود چاروں انجیلوں میں موجود ہے لیکن قرآن کریم نے اس کی بڑی سختی سے تردید کی ہے کہ درحقیقت یہ غلط فہمی ہے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمان پر اٹھ چکے تھے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ انسانی مخلوقات کی ترقی کے ساتھ قرآن حکیم کی صداقت خود بخود واضح ہوئی چاہی ہے۔ چند سو سال پہلے ابجیل برنا باس کا سفر دریافت ہوا تھا۔ اس میں نہایت صراحت اور وضاحت کے ساتھ یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ حضرت عیسیٰ کو رسولی نہیں دی گئی تھی بلکہ ان کی جگہ یسوع اور اسکے یوٹی معسوب ہوا تھا۔ لیجئے آپ بھی پڑھ لیجئے:

۲۱۴۔ گھڑت نکل کر یسوع نماز پڑھنے باغ میں گیا اپنے نماز پڑھنے کے معمول کے موافق، سو بگڑ گئے جھکاتے اور سجدے میں گرے۔ چنانچہ یسوع وہ مقام جہاں یسوع اپنے شاگردوں کے ساتھ تھا۔ ہانا تھا۔ سودہ مرد اور کابین کے پاس گیا اور لو لگا کر تم مجھے دو جس کا وعدہ تھا تو آج رات میں یسوع کو جس کی تلاش میں تم ہو تمہارے ہاتھ میں بے دلی کا کیونکہ وہ گیارہ ماضیوں کے ساتھ آگیا ہے۔ مردوں کا کہن نے کہا کہ تو کیا مانگتا ہے۔ یسوع نے کہا میں کچھ سونے کے تب مزار نے فی الفور اسے دلم گن دی۔ اور ایک فریسی حاکم کے پاس اور میرو دیس کے پاس سپاہی لانے پہنچا دلا منوں نے ایک دستہ ساتھ کر دیا۔ کیونکہ وہ لوگوں سے ڈرتے تھے، سوا منوں نے اپنے ہتھیار یسوع اور ڈنڈوں پر مشعلیں اور تھعلیں یسوع پر دھلم سے نکلے۔

۲۱۵۔ جب یسوع کے ساتھ سپاہی اس مقام کے قریب پہنچے جہاں یسوع تھا تو یسوع نے بہت سے لوگوں کی آمدنی سودہ خوف سے گھر کے اندر جا رہا اور وہ گیارہ سو پہنچے تھے تب خدا نے اپنے خادم کا خلوہ دیکھ کر اپنے کا دروازوں جبریل، میکائیل، رفائیل اور انجیل کو حکم دیا کہ یسوع کو دنیا سے نکال دے۔ مقدس فرشتے آئے اور اس کو شکر میں سے جو دھن کی طرف کھلتی ہے یسوع کو نکال دے گئے۔ انہوں نے اسے میرے آسمان پر لا بٹھایا۔ ان فرشتوں کی صحبت میں ہوا ایک خدا کی حمد بیان کرتے ہیں۔

۲۱۹۔ یہود اچھٹ کر سبھوں سے پہلے اس حجرے میں داخل ہوا جہاں سے یسوع اٹھایا گیا تھا۔ اور ناکرد سوچتے تھے اس پر حیرت انگیز خدانے حیرت انگیز کام کیا۔ وہ یہ کہ یہود وہ بدل کر بول چال اور چہرے میں ایسا یسوع کی مانند ہو گیا کہ ہم لے یسوع ہی سمجھتے اور وہ ہمیں جگا کر دریافت کرنے لگا کہ اس کا کہاں ہے اس پر ہم نے تعجب کیا اور جواب دیا کہ آقا تو یہی تو ہمارا استاد ہے کیا تو اب ہمیں بھول گیا اور وہ مسکرا کر بولا، بھلا تم احمق ہو کہ مجھے یہود اسکر لوتی نہیں سمجھتے اور وہ یہ کہ یہی رہا تھا کہ سپاہ داخل ہوتی اور یہود وہ پڑا ہوا ڈال دیا کیونکہ وہ ایک طرح سے یسوع جیسا تھا۔ ہم یہود وہ کی باتیں سن کر اور سپاہیوں کا انہوہ دیکھ کر گر با جھوٹے کھڑے ہوئے۔ اور یوحنا جو ایک جہین چادر لپیٹے ہوئے تھا جاگ کر بھاگا۔ اور جب ایک سپاہی نے اسے چادر سے کھڑا کر دیا اور چادر چھوڑ کر نکلا بھاگ کھڑا ہوا۔ کیونکہ خدانے یسوع کی دعا سن لی اور گیارہوں کو آفت سے بچالیا۔

یہ انجیل بڑا لباس کا اقتباس ہے۔ اس انجیل کی روایتی اور تاریخی حیثیت پر تو ہم آئندہ بحث کریں گے لیکن حال ہی میں انجیل کا ایک اور نسخہ دریافت ہوا ہے جو پطرس حواری کی طرف منسوب ہے اس میں بالکل صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ حضرت یسوع کو سولی لینے سے کچھ پہلے آسمان پر اٹھایا گیا تھا۔ انجیل پطرس کا یہ جملہ طبعی اسٹریمر نے اپنی مشہور کتاب انجیل اربعہ ص ۱۰۰ میں نقل کیا ہے۔

قرآن میں صلبِ مسیح کی اہمیت

یہاں یہ سوال ہے حد اہمیت رکھتا ہے کہ قرآن عزیز نے صلبِ مسیح کو اس قدر اہمیت کیوں دی ہے جو اس کی یہ ہے کہ عیسائی دین نے اسے اپنے دین کی اساس اور قاعدہ میں اصل کی حیثیت سے پیش کیا ہے ان کے خیال میں اس کو مان کر آدمی نہات پاسکتا ہے اور اس کا انکار کر کے جلاک ہو جاتا ہے۔

اس عقیدے کے لیے افادہ بنایا گیا ہے کہ حضرت مسیح کو یہودیوں نے پھانسی عاکم کے ہمارے پیش کچھ کے عرض کیا د عالی ہا، یہ شخص نہ صرف ہمارے لیے جگہ حکومت کے لیے خطرہ بنا جا رہا ہے بلکہ خدا اس کا استعمال نہ کیا گیا تو ہمارا دین ہی صحیح حالت میں نہ لگے گا بلکہ ہمیشہ کے کہیں آپ کے ہاتھ سے حکومت کا اقتدار بھی نہ چلا جائے اس لیے اس شخص نے بڑے عجیب و غریب شبہے دکھا کر لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے اور ہر وقت اس گمات میں ہے کہ عوامی طاقت سے قیصر اور آپ کو

شکست دے کر خود بنی اسرائیل کا بادشاہ بن جائے۔ اس شخص نے لوگوں کو صرف دنیوی راہ سے ہی گمراہ نہیں کیا بلکہ اس نے ہمارے دین تک کو بھی بدل ڈالا اور لوگوں کو بددین بنانے میں لگا ہوا ہے لہذا اس فتنہ کی سرکوبی ضروری ہے۔ غرض کافی گفت و شنید کے بعد پیلاطس نے ان کو اجازت دے دی کہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کو گرفتار کر لیں اور شاہی دربار میں مجرم کی حیثیت سے پیش کریں۔ بنی اسرائیل کے سردار، قتیہ اور کاہن یہ فرمان حاصل کر کے بیدار سردار ہوتے اور فرد مباحات کے ساتھ ایک دوسرے کو مبارکباد دینے لگے کہ آخر پہلی سازش کارگر ہوئی اور کتنے بچے کہ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ خاص موقع کا انتظام کریں اور کسی ضرورت اور تنہائی کے موقعہ پر اس طرح اس کو گرفتار کیا جائے کہ عوام میں یہ جان نہ پھیلے پاتے۔

ابیل یوحنا میں اس واقعہ سے متعلق لکھا گیا ہے کہ

بسی سردار کاہنوں اور فریسیوں نے صدر عدالت کے لوگوں کو جمع کر کے کہا ہم کرتے کیا ہیں؟ یہ آدمی تو بہت سمجھنے والا ہے، اگر ہم اسے یوں ہی چھوڑ دیں تو سب اس پر ایمان لے آئیں گے اور رومی اگر ہماری جگہ اور قوم دونوں پر قبضہ کر لیں گے اور ان میں سے کا تمام ایک شخص نے جو اس سال سردار کاہن تھا۔ ان سے کہا تم نہیں جانتے اور نہ سوچتے ہو کہ تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ ایک آدمی اُمت کے واسطے ذکر ساری قوم ہلاک ہو۔

(انجیل یوحنا باب ۱۱: ۵۱ تا ۵۲)

یہ اس مشربے کا تذکرہ ہے جو بادشاہ کے پاس جانے سے پہلے آپس میں ہوا اور یہ خطرہ ظاہر کیا گیا کہ اگر اس ہستی کو بڑی چھوڑ دیا گیا تو، دشاہ وقت قیصر کہیں سلطنت کے لیے خطرہ سمجھ کر رہی ہوئی برائے نام حکومت یہود کا بھی خاتمہ کر دے۔

حضرت عیسیٰ اور ان کی دعوت کے بلے میں جو حالات قرآن نے پیش کیے ہیں ان میں اور انجیل میں بیان کردہ وحقی حالات میں اصولاً کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن اس کے بعد کے پورے حالات کے بیان میں قرآن اور انجیل دونوں کی راہیں متضاد سمتوں میں اور الگ الگ ہیں اور اس درجہ تضاد ہے کہ کسی طرح بھی مناجہت ممکن نہیں ہے۔ ہاں یہود و نصاریٰ میں یہ نقطہ اشتراک ہے کہ حضرت مسیح کو رسولی دی گئی۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہود اس کو اپنا کارنامہ سمجھتے ہیں اور عیسائی اس کو یہود کا ایک قابل نفی عمل سمجھتے ہیں۔ یہود کا دعویٰ یہ تھا کہ ہم نے حضرت مسیح کو قتل کیا ہے نصاریٰ نے یہود کے اس دعویٰ کو کھن لیا ہے۔ دونوں کا بیان یہ ہے کہ یہود کے سرداروں اور کاہنوں کو یہ اطلاع

ہجری ہجو۔

حیرت اس بات پر ہے کہ سب عقیدہ کفارہ کے مطابق حضرت مسیح کا یہ معاملہ خدا اور اس کے بیٹے کے درمیان طے شدہ تھا تو پھر اس درخواست کے کیا مننے۔ اور اگر لوازم بشریت کی بنا پر تھا تو خدا کی مرضی معلوم ہو جانے اور اس پر قناعت کر لینے کے بعد پھر یہ بے خبر اور بالوس انسانوں کی طرح جان دینے لگایا سبب؟

یہودی کی گھڑی ہوئی اس داستان کو چونکہ نصاریٰ نے قبول کر لیا تو یہود اناہم فز و غرور اس پر شادان تھے اور کہتے تھے کہ مسیح نامری اگر میں موجود ہوتا تو خدا تعالیٰ اس بے بسی اور بے کسی کے ساتھ اس کو ہمارے ہاتھ میں دیتا کہ وہ مرتے وقت تک خدا سے شکوہ کرتا۔ ہا کہ اس کو پہلے نے مگر خدا نے اس کی کوئی مدد نہ کی۔

واقعہ یہ ہے کہ عیسائیوں کے پاس اس الزام کا کوئی جواب نہیں ہے اور واقعہ کی تفصیلات کو مان لینے کے بعد عقیدہ کفارہ کی کوئی قیمت منہرہ رہ جاتی ہے اس لیے عیسائیوں نے واقعہ کی ان تفصیلات کے بعد یہ اضافہ کر دیا۔ یہوذا کا انجیل میں ہے:

لیکن جب انہوں نے یسوع کے پاس آکر دیکھا کہ وہ مر چکا ہے تو اس کی مانگیں
ڈٹوڑیں مگر ان میں سے ایک سپاہی نے ہمارے سے اس کی پہلی جھبڑی اور فی اللہ اس
سے غور اور پانی بہ نکلا۔۔۔ ان باتوں کے بعد ارمیہ کے بیٹے ولے یوسف نے جو یسوع
کا شاگرد تھا یہودیوں کے خوف سے خفیہ طور پر ہیلطس سے اجازت ہائی کہ یسوع
کی لاش لی جاتے۔ ہیلطس نے اجازت دے دی۔ پس وہ اگر اس کی لاش لے گیا اور
نیکدیس بھی آیا جو پہلے یسوع کے پاس رات کو گیا تھا اور اب اس سر کے قریب مرا
اور مردہ ملا ہوا لایا پس انہوں نے یسوع کی لاش لے کر اسے سوئی کپڑے میں خوشبودار
چیزوں کے ساتھ کھنایا جس طرح کہ یہودیوں میں دفن کرنے کا دستور ہے اور جس
جگہ اسے صلیب دی گئی وہاں ایک باغ تھا اور اس باغ میں ایک نئی قبر تھی جس میں
کبھی کوئی نہ رکھا گیا تھا۔ پس انہوں نے یہودیوں کی تیاری کے دن کے باعث یسوع
کو وہیں رکھا۔ ہفتہ کے پہلے دن مریم مگدالینی ایسے تڑکے کر ابھی اندھیل ہی تھا قبر پر
آئی اور پتھر کو قبر سے ہٹا ہوا دیکھا۔ پس وہ ثمنون، پطرس اور اس کے دوسرے
شاگرد کے پاس جے یسوع عزیز رکھتا تھا دوڑی ہوئی گئی اور ان سے کہا کہ خداوند

کو قبر سے نکال لے گئے اور ہمیں معلوم نہیں کہ اسے کہاں رکھ دیا لیکن مریم باہر قریبے پاس کٹری روتی رہی۔ اور جب روتے روتے قبر کی طرف جھک کر اندر نظر کی تو وہ فرشتوں کو سپید پوشاک پہنے ہوئے ایک کو سر ہالے اور دوسرے کو پانسی بیٹھے دیکھا۔ جہاں یسوع کی لاش پڑی تھی۔ انہوں نے اس سے کہا اے عورت تو کیوں روتی ہے؟ اس نے ان سے کہا اس لیے کہ میرے خداوند کو اٹھا کر لے گئے اور معلوم نہیں کہ اسے کہاں رکھا یہ کہہ کر وہ پیچھے مڑی اور یسوع کو کھڑے دیکھا اور نہ پہچان کر یہ یسوع ہے۔ یسوع نے اس سے کہا۔ مجھے نہ چھو کیونکہ میں اب تک باپ کے پاس اور پر نہیں گیا لیکن میرے بھائیوں کے پاس ان سے جا کر کہو کہ میں اپنے باپ اور تمہارے باپ کے اور اپنے خدا اور تمہارے کے پاس اور پر جاتا ہوں۔ مریم گلدی گئی نے آکر شاگردوں کو خبر دی کہ میں خداوند کو دیکھا اور اس نے مجھ سے باتیں کیں۔ (انجیل یوحنا)

ہر ایک شخص معمولی خورد و خوراک کے بعد آسانی سے یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ یہ پارہ بیان پہلے حصہ بیان کے ساتھ جبریں مربوط اور قطعاً جبریں ہیں۔ اگرچہ یہ ہے کہ یہ اندازہ لگانا ہی مشکل ہے کہ یہ دونوں تفصیلات ایک ہی شخصیت سے وابستہ ہیں کیونکہ پہلا پارہ بیان ایک ایسی شخصیت کا مرقع ہے جو بے کس اور بے بس اور مایوس خدا سے شاکی نظر آتی ہے اور دوسرا حصہ بیان ایسی مسمیٰ کا چہرہ پیش کرتا ہے جو خدائی صفات سے موصوف، ذات باری کی متدرب اور پیش آمدہ واقعات سے مطمئن اور خوش ہے بلکہ ان کے وقوع کی متنی اور ان کو اپنے اوائلی فرض کا اہم جز سمجھتی ہے۔

بہر حال چونکہ مشیت دوسری تھی اور ایک عہد و راز کے بعد عقیدہ کفاح کی بدعت لے عیسائیوں کو حقیقت کے خلاف اس افہام کے گمراہی پر مجبور کر دیا اس لیے قرآن حکیم نے یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق دوسرے گوشوں کی طرح اس گوشہ سے بھی جہالت و تاریکی کا پردہ ہٹا کر حقیقتِ حال کے مسخ و تحریف کو جلوا کر نا ضروری سمجھا اور اس نے اپنا وہ فرض انجام دیا جس کو خدا بے عالم کہتے ہیں قرآن کی دعوت سمجھنا و اصلاح کما جاتا ہے۔

حضرت عیسیٰ کے بارے میں اختلاف

۲۳۴۔ اور بلاشبہ جن لوگوں نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے وہ شک و شبہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ نکل و گلن کے سوا ان کے پاس علم و بصیرت نہیں ہے۔ اختلاف کرنے والے کون ہیں یہودی

اور عیسائی یا صرف عیسائی۔ یہ تو آیت قرآنی میں فیہ کی تعبیر بتا رہی ہے کہ اختلاف کا موضوع حضرت عیسیٰ کی ذات گرامی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ یہاں جس اختلاف کا ذکر ہے اس کا تعلق حضرت عیسیٰ کی تشریف آوری سے ہے یا والد الکی سے ہے۔ اگر اختلاف کا تعلق حضرت عیسیٰ کی تشریف آوری سے ہے تو بلاشبہ اس موضوع پر یہودیوں اور عیسائیوں کا اختلاف ایک واضح اور مکمل بات ہے۔ آپ کی پیدائش کا معاملہ یہودیوں اور عیسائیوں میں بالکل متضاد سمجھوں کا انتہائی گوشہ بن گیا تھا۔ یہودیوں ان کی پیدائش کو ناجائز تعلق کا نتیجہ قرار دیتے تھے برخلاف اس کے عیسائی نہ صرف جائز بلکہ ایک ربانی معجزہ منظر کرتے تھے۔ قرآن نے ثالث کی حیثیت سے دونوں میں فیصلہ کر دیا اس نے حضرت مریم کی پاکی کا اعلان کیا۔ یہودیوں کے الزام کو بہتان عظیم قرار دیا اور پیدائش عیسیٰ کی سرگزشت عظیم اسی طرح بیان کر دی جس طرح انجیل میں موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں اختلاف سے یہ اختلاف مراد نہیں ہے یہ اختلاف یہودیوں اور عیسائیوں کے مابین ہے اور اگر اختلاف کا تعلق حضرت مسیح کی والد الکی سے ہے تو اس میں یہودیوں اور عیسائیوں میں بھی اختلاف ہے اور خود عیسائیوں میں بھی اس موضوع پر شدید اختلاف ہے۔ ہماری سلسلے میں یہاں اختلاف کرنے والوں سے عیسائی مزدہیں ان میں مسیح علیہ السلام کے مصلوب ہونے پر کوئی متفق علیہ ایک قول نہیں ہے بلکہ اس موضوع پر عیسوں اقوال ہیں جن کی کثرت خود اس بات کی دلیل ہے کہ اصل حقیقت ان کے لیے بھی مشتبہ رہی۔ ان میں سے کوئی کتاب ہے کہ صلیب پر جو شخص چڑھایا گیا وہ مسیح نہ تھا بلکہ مسیح کی شکل میں کوئی اور تھا جسے یہودی اور رومی سپاہیوں نے ذلت کے ساتھ صلیب لٹے لٹے تھے اور مسیح وہیں کھڑا ان کی حماقت پر ہنس رہا تھا۔ کوئی کتاب ہے کہ صلیب پر چڑھایا تو مسیح ہی کو لیا تھا مگر ان کی وفات صلیب پر نہیں ہوئی تھی بلکہ آٹھ بجے کے بعد ان میں جان مٹی کوئی کتاب ہے کہ انہوں نے صلیب پر وفات پائی اور پھر وہ جی اٹھے اور کم و بیش دس مرتبہ آپ سواریلوں سے ملے اور باتیں کیں۔ کوئی کتاب ہے کہ صلیب کی موت مسیح کے جسم انسانی پر واقع ہوئی اور وہ دفن ہوا، مگر الوہیت کی روح جو ان میں تھی وہ اٹھ اٹھی گئی۔ اور کوئی کتاب ہے کہ مرنے کے بعد مسیح علیہ السلام جسم سمیت زندہ ہوئے اور جسم سمیت اٹھ اٹھے گئے۔ ظاہر ہے کہ اگر ان لوگوں کے پاس حقیقت کا علم ہوتا تو اتنی مختلف باتیں ان میں مشہور نہ ہوتیں۔

بہر حال عیسائیوں میں نفس واقعہ صلیب سے متعلق سچی جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے بڑا اختلاف ہے اور اس پر سو افشاہانوں نے تصنیف کیا ہے اس میں بڑے اختلافات ہیں۔

حیات عیسیٰ علیہ السلام کی پہلی دلیل

۲۳۵۔ اور یقیناً انہوں نے حضرت مسیح کو قتل نہیں کیا ہے بلکہ اللہ نے ان کو اپنی طرف اٹھالیا ہے اور اللہ سب پر غالب اور اپنے کاموں میں حکمت والا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے قول کی تکذیب کرتا ہے کہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کیا بلکہ ان کو اللہ تعالیٰ نے آسمان پر اٹھالیا۔ اللہ تعالیٰ سب چیزوں پر قادر ہے اور اس کے ہر کام میں حکمت ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں یہود کو جواب دینا مقصود ہے ان کا دعویٰ یہ تھا کہ انا قتلنا المسیح عیسیٰ ابن مریم یا یہود رسول اللہ ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو قتل کر دیا اس کے جواب میں اللہ بھانے فرماتے ہیں کہ یہود نے ان کو قتل نہیں کیا بلکہ ان کو اللہ نے اپنی طرف اٹھالیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس آیت میں قتلہ کی ضمیر منصوب کا مرجع عیسیٰ السلام ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام سے یہاں صرف ان کی روح مراد نہیں ہو سکتی کیونکہ قتل اور رسولی پر چڑھنا دو اعمال ہیں جن کا مواد صرف جسم ہی ہو سکتا ہے روح کا قتل کرنا اور روح کا رسولی پر چڑھنا قطعاً محال ہے۔ لہذا اہل مافقہ اللہ کی ضمیر بھی اسی جسم کی طرف راجع ہے جس جسم کی طرف مافقہ کی ضمیر راجع ہے۔ یہود روح عیسیٰ السلام کے قتل کے مدعی نہ تھے بلکہ جسم عیسیٰ کے قتل کے مدعی تھے اس لیے ان کی تردید میں ہی مافقہ اللہ فرمایا گیا ہے۔

عربی زبان میں لفظ علی ضرب اور اعراض کے لیے آتا ہے لہذا ما قبل اور ما بعد میں منافات ہوئی ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ رفع جسمانی ہی قتل کے منافی ہے۔ رفع روحانی اور رفعت شان قتل کے منافی نہیں اس لیے بنی دفعہ اللہ میں رفع جسمانی مراد ہے درزیہاں کلمہ علی کا لانا بالکل بے مرقعہ ہے بے محل ہو جاتے گا۔

رفع سے عزت کی موت مراد نہیں

لکھنؤ لوگوں نے یہاں رفع سے مراد عزت کی موت بتائی ہے جیسکہ مرزا قادیانی نے انزال اہام میں لکھا ہے، ایسا سمجھنا قطعاً غلط ہے۔ لغت کی کسی کتاب میں رفع کے معنی عزت کی موت نہیں ملتے ہیں۔ یہ کہہ کر لوگوں کو دھوکا دینا کہ رفع کا مصلوب الی آتے تو اس کے معنی اعزاز و اکرام کے ہوتے ہیں جیسے رفعتہ الی الحکم، لغت اور زبان میں دھاندلی کے مترادف ہے یہ کہہ کر اذکار رفعتہ الی الحکم کے معنی عزت کی موت کسی نے نہیں بتائے ہیں۔ اگر اس کے یہ معنی نہیں

تو اسے دلیل کے طور پر پیش کرنا جھٹ ہے۔

انہی اہل بیت کے ہاں اہل بیت کے لئے کھانا ہے وہاں سے یہ بتاتے ہیں۔ نزدیک گردانیدن کے راجحہ ملتہ بالی ومن ذالک قوم لہم من رفقۃ الی السلطان یہاں نزدیک گردانیدن کے راجحہ موجود ہے اس کا مدلول مرتبہ کی بلندی نہیں بلکہ جسمانی قرب ہے اس لیے رفقۃ الی السلطان کے معنی یہ ہیں کہ اس شخص کو گھر بیٹھے بغیر جسمانی حرکت و ملاوی بلکہ معنی یہ ہیں کہ میں اس کو راجحہ کے حضور میں لے گیا وہاں ہاکر اگر وہ منظرہ نظر ہے تو معزز ہے اور اگر کوئی مجرم ہے تو ذلیل و دسوا ہے کیونکہ بادشاہ اور حاکم کی حضوری میں عزت و ذلت اپنے مقام اور حیثیت سے ہوتی ہے نہ کہ قرب مکان کی وجہ سے۔ چنانچہ فتح الباری شرح صحیح بخاری میں محاورہ رافعه الی الحاکم کے معنی احضار لشکوہ یعنی شکایت کے لیے حاکم کے حضور میں جانا لکھے ہیں۔

بہر حال رفع کا اصل اگر الی آئے تو اس کے معنی عزت کی موت دینا نہیں۔ ایک سے زیادہ مثالیں لغت اور حدیث میں موجود ہیں۔

پہلی مثال لغت کی مشہور کتاب المصباح المنیر میں علامہ فریوقی رقمطراز ہیں رفعت المرء الی البیداء اور اس کے معنی صاحب صراح نے فارسی میں اس طرح کیے۔ برداشتم غلہ دور و دور و بخرمن گاہ۔ اور دم، یعنی میں کعبیت کو کاٹ کر اور غلہ اٹھا کر خرمن گاہ میں لے آیا۔ صاحب قاموس رفعوا المعداد کے معنی یہ بتاتے ہیں کہ کسان کعبیت کاٹ کر خرمن گاہ میں اٹھا کر لے آئے۔ علامہ فریوقی نے اساس البلاغہ میں بھی یہی معنی بتائے کیا کوئی عقل مند آدمی یہاں یہ معنی کر سکتا ہے کہ غلہ کو عزت دی اور اس کو کھرا م کیا۔

دوسری مثال صحیح بخاری میں ابو ہریرہ کی حدیث میں ہے کہ ابو ہریرہ مال زکوٰۃ کی نگرانی پر مقرر تھے، پھر نے چوری کی، ابو ہریرہ نے اس کو پکڑ لیا اور اس سے کہا کہ لا رافعۃ الی منحل اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ حافظ عسقلانی نے اس کے معنی بتائے ہیں لا ذہبن بلک اشکوہ یعنی میں تجھے حضور کے پاس لے جا کر تیری شکایت کروں گا۔ حافظ لکھتے ہیں کہ رفع الی الحاکم کے معنی حاکم حضور میں شکایت کرنے کے ہیں۔ کیا معاذ اللہ حضرت ابو ہریرہ چور کو دوبار نبوت میں لے جا کر معزز بنا چاہتے تھے۔

تیسری مثال مشکوٰۃ خریف میں ہے کہ حضرت اسید بن حضیر قرآن مجید کی تلاوت فرما رہے تھے۔ اثنائے تلاوت میں آپ نے سر اٹھایا چنانچہ الفاظ یہ ہیں فرفعہ سراجہ الی السحاب

آپ نے سر آسمان کی طرف اٹھایا، دونوں جگر رفع کے ساتھ الی ایسے اور دونوں جگر رفع شمالی طرف ہے
اعزاز اور کرام کے معنی نہیں ہیں۔

جو حقیقی مثال زماذ نہرت میں ایک ہجر کا انتقال ہو گیا اور وہ ہجر آپ کے پاس اٹھا کر لایا گیا۔
چنانچہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں یہ الفاظ ہیں کہ رفع الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
یعنی وہ ہجر آپ کے پاس اٹھا کر لایا گیا۔ ظاہر ہے کہ ہجر اسی جگرِ عنصری کے ساتھ اٹھا کر لایا گیا
تھا کسی کے نزدیک یہاں قرأت کی موت مراد نہیں ہے۔

پانچویں مثال لغتِ حدیث کی مشرک کتاب مجمع البحار میں ہے رفع الی یدہ لے کر فصلی
غایۃ طول یدہ لہذا الناس یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیالہ اپنے دستِ مبارک
کی لمبائی کی مقدار میں اوپر اٹھایا تاکہ لوگ دیکھ لیں۔ یہاں کوئی نہیں کہتا کہ یہ پیالہ کا رفع روحانی تھا۔
چھٹی مثال محدث میں ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم شب کو بیدار ہوتے، اٹھ کر بیٹھ جاتے
اور اپنا سر مبارک آسمان کی طرف اٹھا کر تین بار فرماتے سبحان اللہ القدوس الغلظہ ہیں
فرافع ماسد الی السماء یہاں کوئی نہیں کہتا کہ یہ سر کا رفع روحانی تھا۔

ساتویں مثال حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں عبد اللہ ابن عباس کا یہ بیان نقل کیا ہے
کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جب بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تو سلام
پھیرنے کے بعد سر مبارک آسمان کی طرف اٹھاتے۔ اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی فَلَئِنْ لَقِيتُمْ
قَبْلَتُمْ مَرَضًا۔

ان مثالوں سے صاف ظاہر ہے کہ رفع کا صلہ جب الی آتا ہے تو اس کے معنی اٹھانے کے ہوتے
ہیں۔ اس میں اعزاز اور کرام کے معنی قطعاً نہیں ہوتے۔ خلاصہ یہ ہے کہ لغت میں رفع کے حقیقی اور
وضعی معنی اوپر کر اٹھانا ہیں اور اس کی ضد وضع اور حقیقی ہے کہ ان کے معنی نیچے رکھنا ہیں۔ لہذا رفع کا منقول
جب کوئی جسمانی چیز ہوگی وہاں اس سے مراد جسم کو نیچے سے اوپر اٹھانا ہوگا۔ علامہ لیبہ المصباح المنیر
میں رقمطراز ہیں:

الرفع فی الاجسام حقیقۃ فی الحاکمۃ والانتقال فی العانی علی ما یقتضیہ
المقام۔

رفع اجسام میں معنی حقیقی کے لحاظ سے حرکت اور انتقال کا نام ہے اور عانی
میں موقع و مقام کی مناسبت سے ہوتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام بعد از انصراف آسمان پر اٹھائے گئے تھے کیونکہ خدا اللہ تعالیٰ میں غیر منضوب کا مرجع عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور عیسیٰ نام ہے جسم مع الروح کا ذکر صرف آدھ کا۔ اگر مان بھی لیا جائے کہ رفع کے معنی ہزار اور کرام کے ہیں تو اس کی دو ہی صورتیں ہیں ایک یہ کہ یہ معنی کنائی ہیں اور دوسرے یہ کہ مجازی ہیں۔

کنائی اور مجازی معنی میں فرق

دو دنوں میں ہر ایک فرق ہے کنائی معنی حقیقی معنی کے ساتھ جمع ہو سکتے ہیں لیکن حقیقی اور مجازی معنی کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔ کنایہ اور مجازی میں بھی فرق ہے جیسا کہ علامہ راجستانی نے معلول میں لکھا ہے کہ کنایہ ایک ایسا لفظ ہے جس سے اس کے لازمی معنی مراد ہوتے ہیں اور لازمی معنی کے ساتھ اس لفظ کے اصلی معنی کا مراد لینا بھی جائز ہے مثلاً لفظ طویل یعنی زیادہ کر اس کے کنائی معنی دراز قامت ہیں اور اس کے حقیقی معنی شریف المنصب ہیں۔ دونوں جمع ہو سکتے ہیں۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ کنایہ اور مجازی میں یہی فرق ہے کہ کنایہ میں حقیقی اور کنائی معنی دونوں جمع ہو سکتے ہیں برخلاف مجازی کے کہ اس کے ساتھ حقیقی معنی جمع نہیں ہو سکتے۔

اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں سرفہم اللہ الیہ کے حقیقی معنی یعنی جسمانی رفیع اور کنائی معنی یعنی رفیع منزلت دونوں جمع ہو سکتے ہیں کیونکہ جسمانی رفیع حضرت عیسیٰ کی بزرگی کی وجہ سے خود اعزاز و کرام کو لازم ہے جیسا کہ آیت و رفیع ابوبہ علی العرش میں دونوں جمع ہیں۔ بہر حال رفیع کا معمول جب کنائی جسمانی چیز ہوگی تو اس وقت جسمانی رفیع مراد ہوگا۔ اسی لیے قرآن حکیم میں جہاں کہیں رفیع سے روحانی رفیع عزت ہوتا ہے وہاں بلاشبہ کوئی قرینہ موجود ہوتا ہے جس سے پتہ لگتا ہے کہ رفیع جسمانی مراد نہیں ہے مثلاً ان آیات قرآنیہ کو بغور پڑھیے و رفیع بعضہم درجات ، و رفیع درجات من نشاء و رفیع بعضہم فوق بعض درجات اور سرفہمنا : لا شک ذلک ان آیات میں ذکر اور درجہ کی قید تباہی ہے کہ ان میں رفیع جسمانی مراد نہیں ہے۔

بتناہ چاہتا ہوں کہ سرفہم اللہ الیہ کے ذریعے اللہ نے معاملہ کی اصل حقیقت بتا دی ہے اسی میں جزم اور مراحت کے ساتھ جو کچھ بتایا گیا ہے۔ صرف یہ ہے کہ حضرت مسیح کو قتل کرنے میں یہودی کامیاب نہیں ہوئے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی طرف اٹھالیا۔ یہ سوال کہ اس اٹھانے

کی کیفیت کیا تھی؟ تو اسے واقعاتِ دنیا میں سمجھنے کے لیے یہ باتیں ذہن میں رکھیے کہ

اولاً عیسائیوں میں مسیح علیہ السلام کے جسم و روح سمیت اٹھائے جانے کا عقیدہ پہلے سے موجود تھا اور ان اسباب میں سے تھا جن کی بنا پر ایک بہت بڑا گروہ حضرت مسیح کی الوہیت کا قائل ہوا ہے لیکن اس کے باوجود قرآن نے نہ صرف یہ کہ اس کی صاف تردید نہیں کی بلکہ بعینہ رفع کا لفظ استعمال کیا جو عیسائی اس واقعہ کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ قرآن مزید کی شان سے یہ بعید ہے کہ وہ کسی منظر کی تردید کرنا چاہتا ہو اور پھر ایسی زبان استعمال کرے جو اس خیال کی تائید و تقویت سامان ہو۔

ثانیاً یہ کہ اگر حضرت مسیح کا اٹھایا جانا دوسرا ہی اٹھایا جاتا تھا جیسا کہ ہر مرنے والا دنیا سے اٹھایا جاتا ہے یا اگر اس دفع سے مراد محض درجات و مراتب کی تبدیلی ہوتی تو اس مضمون کو بیان کرنے کا انداز یہ نہ ہوتا جو ہم یہاں دیکھ رہے ہیں۔ اس کو بیان کرنے کے لیے اور زیادہ مناسب الفاظ یہ ہوتے کہ یقیناً انہوں نے مسیح کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو زندہ بچالیا اور پھر طبعی موت دی۔ یہودیوں نے ان کو ذلیل کرنا چاہا، اللہ نے ان کو بلند درجہ عطا کیا۔

ثالثاً یہ کہ اگر یہ دفع دوسرا ہی معمولی قسم کا دفع ہوتا جیسے ہم محاذ سے میں کسی مرنے والے کو کہتے ہیں کہ اللہ نے اسے اٹھالیا تو یہ ذکر کرنے کے بعد یہ فقرہ بالکل غیر موزوں تھا و کان اللہ عنہا حکیمانہ اللہ زبردست طاقت رکھنے والا حکیم ہے بلکہ یہاں سوزوں فقرہ و کان اللہ غفوراً رحیماً ہوتا۔ یہ عزت و حکمت کا حوالہ تو صرف کسی ایسے واقعہ کے بعد ہی موزوں ہو سکتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی قوتِ فائزہ اور اس کی حکمت کا طیر معمولی ظہور ہوا ہو۔

چہمیں افسوس ہے کہ معالم القرآن کے صفات اس سے زیادہ تفصیل کے متحمل نہیں ہیں۔ اگر آپ اس موضوع کے تفصیلی مباحث دیکھنا چاہتے ہیں تو حضرت الشیخ السید انور شاہ کشمیری کی عقیدۃ الاسلام، مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی کلمۃ اللہ فی حیاتِ علیؑ و روح اللہ اور مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی کی عقیدۃ القرآن پڑھیے۔ عقیدۃ الاسلام نگار کے لیے ایک عجیب علمی سوغات۔

حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام کی دوسری دلیل

۲۳۶۔ اور اہل کتاب میں سے کوئی نہیں جو اس کی موت سے پہلے اس پر ایمان نہ لے گئے گا اور قیامت کے روز وہ ان پر شہادت دینے والا ہوگا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ موجود ہیں آسمان پر۔ جب وہاں پہنچا تو کتاب اس جہان میں تشریف لا کر اسے قتل کریں گے اور یہود و نصاریٰ ان پر ایمان

لاہیں گے کہ بے شک عیسیٰ زندہ ہیں مرنے نہ تھے اور قیامت کے دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے حالات اور اعمال کو ظاہر کریں گے کہ یسوع میری کذب اور مخالفت کی اور نصاریٰ نے مجھے خدا کا بیٹا بتایا بلکہ وہ اصل اس فقرے کے دو حصے ہیں اہل کفر اور اہل ایمان میں دونوں کا احتمال ہے۔ ایک حصے سے وہ یسوع نے ترجمہ میں اختیار کیے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اہل کتاب میں سے کوئی ایسا نہیں جو اپنی موت سے پہلے عیسیٰ پر ایمان لے آئے۔ اہل کتاب سے مراد یسوع ہی ہیں اور ہو سکتا ہے کہ عیسائی بھی پہلے پہلے حصے کے لحاظ سے مطلب یہ ہو گا کہ عیسیٰ کی طبعی موت جب واقع ہو گی۔ اس وقت جتنے اہل کتاب ہوں گے وہ سب ان پر ایمان لا چکے ہوں گے۔ دوسرے حصے کے لحاظ سے مطلب یہ ہو گا کہ تمام اہل کتاب پر مرنے سے پہلے رسالت عیسیٰ کی حقیقت مشکوک ہو جاتی ہے اور وہ عیسیٰ پر ایمان لے آتے ہیں مگر یہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ ایمان لانا مفید نہیں ہو سکتا۔ دونوں حصے متعدد صحابہ تابعین اور اکابر مفسرین سے منقول ہیں اور صحیح مراد صرف اللہ کے علم میں ہے بلکہ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس آیت کا ترجمہ حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہ العزیز اس طرح فرماتے ہیں :

فما شد هیچ کس از اہل کتاب الا البتہ ایمان آورد عیسیٰ پیش از مردن عیسیٰ۔ روز قیامت باشد عیسیٰ گواہ بر ایشان۔

نہیں ہے گا کوئی شخص بھی اہل کتاب میں سے مگر ضرور ایمان لائے گا عیسیٰ علیہ السلام پر عیسیٰ علیہ السلام کی موت سے پہلے اور حضرت عیسیٰ قیامت کے روز ان پر گواہ ہوں گے۔

حضرت شاہ ولی اللہ کے ترجمہ سے صاف ظاہر ہے کہ زب قرآنی میں ہم اور موتہ کی دونوں ضمیریں حضرت عیسیٰ کی طرف راجع ہیں۔ قرآن حکیم کا ظاہر سیاق بھی یہی چاہتا ہے کہ ضمیروں کا مرجع حضرت عیسیٰ ہوں کیونکہ جیسے ما قتلوا ما صلبوا اور ما قتلوا یقیناً اور بل دفن اللہ کی تمام ضمیریں حضرت عیسیٰ کی طرف راجع ہیں۔ اور پھر آئندہ آیت و یوم القیامت یکون علیہم شہیداً میں بھی یکون کی ضمیر کا مرجع حضرت عیسیٰ ہیں ایسے ہی ضروری ہے کہ ہم اور موتہ کی ضمیروں کا مرجع بھی حضرت عیسیٰ ہیں۔

ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباس سے بھی بائنا و صحیح میں منقول ہے کہ بہ اور موتہ کی ضمیر کا مرجع حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں فرماتے ہیں :
اسی پر عبداللہ بن عباس نے جزم و یقین کیا۔ جیسا کہ ابن جریر نے بائنا و صحیح بحوالہ سید بن جبیر بیان کیا ہے اور ابی رہد کے حوالے سے امام الحسن البصری سے
اس آیت کی تفسیر قبل موت عیسیٰ منقول ہے۔ حسن بصری فرماتے ہیں واللہ حضرت
عیسیٰ اس وقت بھی زندہ ہیں، جب تشریف لادیں گے اس وقت ان پر سب
ایمان لادیں گے اور میں اکثر اہل علم سے منقول ہے اور اسی کو ابن جریر و غیرہ نے
راجع قرار دیا ہے۔ (فتح الباری ص ۳۵ ج ۶)

یہی بات علامہ عسقلانی نے ارشادِ اسی میں اس طرح پیش فرمائی ہے :
ابن کتب میں سے کوئی نہ ہوگا مگر حضرت عیسیٰ پر حضرت عیسیٰ کی موت سے پہلے
ایمان لے آئے گا۔ اسی پر ابن عباس نے یقین کیا ہے جیسا کہ ابن جریر نے سید
بن جبیر کے حوالے سے بتایا ہے۔ (ارشادِ اسی ص ۳۵ ج ۶)
اور حضرت قتادہ اور البراءک سے بھی یہی منقول ہے کہ قبل موتہ کی ضمیر حضرت یحییٰ کی طرف
راجع ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ہے جس کو امام بخاری اور امام مسلم نے روایت
کیا ہے۔ اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ بہ اور موتہ کی ضمیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف راجع
ہے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ :

جاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا ارشاد ہے ، قسم ہے اس ذات کی جس کے
قبضہ میں میری جان ہے۔ بے شک عنقریب تم میں عیسیٰ ابن مریم نازل ہوں گے
فیصلہ کرنے اور انصاف کرنے والے ہوں گے ، صلیب کو توڑیں گے اور حضور کو قتل
کریں گے ، لڑائی کو ختم کر دیں گے ، اور مال کی اتنی بہتات کر دیں گے کہ کوئی لینے
والا نہ ہوگا۔ اور ایک کھدہ دنیا و مافیہا سے زیادہ قیمتی ہوگا۔ پھر ابو ہریرہ فرماتے ہیں
کہ اگر چاہو تو اس کی تصدیق کے لیے یہ آیت پڑھو وان من اهل الکتاب الا
لیومئذ بہد قبل موتہ۔

حافظ ابن حجر عسقلانی اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں ،

حضرت ابو ہریرہ کا آیت قرآنی کو اس طرح پڑھنا اس بات کی دلیل ہے کہ ہر اور مرتبہ کی تفسیر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف راجع ہیں۔ یعنی ہر شخص زمانہ آنندہ میں حضرت عیسیٰ کی موت سے پہلے حضرت عیسیٰ پر ایمان ضرور لائے گا۔

مطلب یہ ہے کہ آیت قرآنی میں لیسو معنی لام تاکید اور نون تاکید یہ چاہتا ہے کہ مرد الہی یہ ہو کر آنندہ تک ایسا زمانہ آنے والا ہے جس میں سب اہل کتاب ایمان لے آئیں گے۔ اور آپ ان پر قیامت کے دن شاہد ہوں گے۔ اس آیت کے صحیح معنی یہی ہیں چونکہ ابھی تک تمام اہل کتاب کا حضرت مسیح مصلیان محقق نہیں ہوا، اس لیے آپ ابھی تک بتقید حیات ہیں۔

ایک غلطی کا ازالہ

ثابت کچھ لوگ یہاں یہ غلط محسوس کریں کہ اس حدیث میں اقروا ۱۱ شمسہ حضیٰ انور کا ارشاد نہیں ہے بلکہ خود حضرت ابو ہریرہ کا استنباط ہے جو حجت نہیں مطلب یہ کہ یہ حدیث مرفوع نہیں بلکہ صحابی کا اثر ہے۔

جواب یہ ہے کہ حدیث کتاب اللہ کی شرح ہے۔ قرآن عزیز میں جو بات بالاجمال بتائی گئی ہے۔ حدیث اس کی تفصیل ہے۔ اسی بنا پر فقہاء صحابہ اس تتبع اور تلاش میں رہتے تھے کہ ارشادات نبوت اور کلمات طیبہ کا خدا کتاب اللہ سے معلوم کریں۔ چنانچہ حافظ ابن القیم زاد المعاد میں رقمطراز ہیں۔

عنہما قدس صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اس کے بہت حریص تھے کہ ارشادات کو قرآن سے متنبط کریں۔

کتاب اللہ اور حدیث رسول اللہ میں تطبیق اور توفیق دینا اور حدیث کی تصدیق اور مزید توشیح کے لیے کتاب اللہ کی کسی آیت سے استشہاد کرنا یہ ہر شخص کا لام نہیں ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے تفقہ اور استنباط کی نعمت اور دولت سے سرفراز فرمایا ہے وہ ہرگز نہ سکتا ہے۔ ابن القیم فرماتے ہیں،

یہ علم کے مراتب میں سے بزرگ ترین مرتبہ ہے جس کو مل جائے وہ خدا کا مسک کرے اور جسے نہ ملے وہ اپنے سوا کسی کو ملامت نہ کرے۔

خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بسا اوقات کوئی مسئلہ بیان فرما کر اس کے مطابق قرآن کی آیت

تفاوت فرماتے۔ اسی طرح صحابہ کرام کی بھی عادت تھی کہ اگر شکرِ نبوت کو آیت قرآنی کے حوالہ سے بیان کرتے مگر ابو ہریرہ کی بھی یہی عادت تھی کہ اگر حدیث کی روایت کر کے استشہاد کو لٹی آیت قرآنی تفاوت فرماتے۔ اور وہ اکثر اپنی بات نہ بھولتی بلکہ حضورِ اقدس ہی سے منقول ہوتی کبھی تصریح فرماتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اور اختصاراً صرف آیت کی تفاوت پر ہی اکتفا فرماتے لیکن قبح اور استغناء کیا جاتا ہے تو دوسری سند سے اس کے مرفوع ہونے کی تصریح مل جاتی ہے۔ یہ آیت بھی اسی قبیل سے ہے۔ احادیث میں ایک سے زیادہ اس کی تفسیر موجود ہیں۔ چنانچہ اس حدیث کے متعلق بھی بعض راویوں کو اس کے مرفوع ہونے کا لگان ہے جیسا کہ سند امام احمد ص ۲۵۲۹ میں اس روایت سے معلوم ہوتا ہے۔

حدثنا عبد الله قال حدثني ابي نازيك ان ابا سفيان عن ابي هريرة عن حفصة عن ابي هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ينزل عيسى بن مريم فيقتل الخنزير ويكسر السليب (الى ان قال) ثم تلا ابو هريرة وان من اهل الكتاب الا يسومنون به قبل موتهم ويوم القيامة يكون عليهم شهيدا - فذكر حفصة عن ابي هريرة قال يوم من يوم قبل موتهم عيسى فلا ادرى هذا كمال حديث النبي صلى الله عليه وسلم او شئ قال ابو هريرة -

یہ روایت حافظ ابن کثیر نے بھی اپنی تفسیر میں نقل کی ہے دیکھو ابن کثیر ص ۳۳۵ ج ۳ اور حافظ ابو جعفر طحاوی کے شرح معانی الآثار میں حضرت ابن سیرین رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ کی سب روایتیں مرفوع ہیں۔ گو بظاہر موقوف ہوں۔ شرح معانی الآثار ص ۱۰۱ ج ۱ اور حافظ جلال الدین سیوطی نے تفسیر درخشوں ص ۲۵۲۲ میں اس روایت کو مرفوعاً بھی نقل کیا ہے۔

اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ ابو ہریرہ کا قول ہے پھر بھی حجت ہے کیونکہ ایک صحابی کا مجمع صحابہ میں کسی بات کو علی الاعلان کہنا اور صحابہ کا اس پر سکوت فرمانا اجماع سکوتی کہلاتا ہے۔ بالخصوص ایسی بات جو بار بار اور مجمع صحابہ میں کہی گئی ہو اور صحابہ میں سے اس پر کسی نے کوئی گرفت نہ کی ہو اس کی قطعی دلیل ہے کہ یہ امر صحابہ کے نزدیک بالکل مسلم ہے۔ اگر قابل الکاہل ہو تو صحابہ کرام اس پر مذکور نکیر فرماتے۔ صحابہ کرام سے یہ نا ممکن ہے کہ ان کے سامنے کوئی بات قابل

گرفت کہی جائے یا کوئی کام قابلِ اعتراض کیا جائے اور وہ خاموش رہیں۔ حضرت ابی ہریرہ کا قبل مسند کی ضمیر کا مرجع حضرت عیسیٰ کو قرار دینا اور صحابہ کے مختلف مجامع میں اس کو بار بار بیان فرمانا اور کسی صحابی کا اس پر انکار نہ کرنا اس امر کی قطعی اور صریح دلیل ہے کہ یہ امر تمام صحابہ کے نزدیک مسلم تھا۔

حافظ ابن حجر مستطانی فتح الباری میں رقمطراز ہیں :

ہر اور موتہ دونوں ضمیروں کا مرجع حضرت عیسیٰ ہونا۔ حافظ ابن جریر کا مختار ہے اور حلف کی ایک جماعت نے اسی کو راجع قرار دیا ہے۔ اور قرآن کا ظاہر سیاق اسی کا مقتضی ہے کہ جو گزشتہ کلام میں حضرت عیسیٰ ہی کا ذکر ہے۔ اور تابعین تبع تابعین کثرت سے اسی طرف ہیں کہ آیت کی مراد یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی موت سے پہلے ہر کتابی حضرت عیسیٰ پر ضرور ایمان لائے گا جیسا کہ ابن عباس سے مروی ہے۔

ہاں کچھ محسوس کی جاتے ہیں کہ موتہ کی ضمیر کتابی کی طرف راجع ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہر کتابی اپنے مرنے سے پہلے حضرت عیسیٰ کے رسول برحق ہونے اور اللہ کا بندہ ہونے پر ایمان لے آتا ہے مگر یہ لفظ گزشتہ ہے کیونکہ۔۔۔ اذلا اس صورت میں ایمان سے وہ ایمان مراد ہو گا جو یہودی فرغہ کی حالت میں آتا ہے ایسی صورت میں بلاغت کا تاضیاء یہ ہے کہ تعبیر قبل موتہ کی جگہ عند موتہ یا حین موتہ ہو۔

مانیا اگر موتہ کی ضمیر کتابی کی طرف۔۔۔ حج ہوگی تو مضارع مرکب بنون تاکید خالص استقبال کے لیے ذی ہے گا۔ کیونکہ اس صورت میں آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ ہر کتابی اپنے مرنے سے پہلے حضرت عیسیٰ پر ضرور ایمان لے آتا ہے اور یہ بات زمانہ مستقبل کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ اہل کتاب اس آیت کے نازل ہونے کے وقت بھی اور اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے بھی مرتے تھے لہذا اہل کتاب کا اپنے مرنے کے وقت ایمان لانا زمانہ مستقبل کے ساتھ خاص نہ رہا۔ حالانکہ تمام ائمہ نحو کے یہاں یہ مسلم ہے کہ مضارع مرکب بنون تاکید خالص استقبال کے لیے آتا ہے چنانچہ امام ابن ہشام نخعی متنی میں رقمطراز ہیں۔

اگر مضارع حال کے معنی میں ہو تو بنون تفعیل اور غنیفہ سے اس کی تاکید منوع ہے اور اگر مضارع مستقبل کے معنی میں ہو تو اس کی تاکید بنون تفعیل و غنیفہ سے واجب

جیسے تالافہ لکھنؤ (معنی جلد ثانی ص ۱۲)

ایسے ہی علامہ رضی شرح کافر میں لکھتے ہیں:

اس مستقبل میں جو معنی غری معنی لے رہا ہوں تاکید نہیں آتا، بل جب

شرع میں تاکید علامت موجود ہو جیسے لام قسم تو پھر نون تاکید لازم ہے۔

نشان یہ کہ اس صورت میں ہر کی ضمیر کا مرجع حضرت عیسیٰ کو اور قبل موت ہر کی ضمیر کا مرجع کتابی

کو قرار دیا جائے۔ یہ انتشار ضما ہے، یعنی کلام میں اس طرح کا انتشار نہیں ہوتا۔

بہر حال اس آیت سے پہلے آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو نہ سولی پر چڑھایا گیا

اور نہ قتل کیا گیا بلکہ ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف اٹھالیا۔ یہ یہود و نصاریٰ دونوں کے اس نظریہ کی

تردید ہے جو انہوں نے اپنے زعم بالی سے قائم کر لیا تھا۔ ان سے ہی کہا جا رہا ہے کہ حضرت مسیح کے

معلق صلیب پر چڑھاتے جانے اور قتل کیے جانے کا دعویٰ علی طور پر سراسر غلط اور یہود

ہے اس کے بعد اس آیت میں ان کو یہی اس بات کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے کہ اگر وہ آج اس غلط

اور علم وحیقت ہے دور عقیدہ پر فخر کر رہے ہیں تو وہ وقت بھی آنے والا ہے جب عیسیٰ علیہ السلام

خدا کے برتر کی حکمت و مصلحت پر را کہنے کے لیے کائناتِ ارضی پر واپس تشریف لائیں گے اور ان

عیسیٰ مثاہ سے کے وقت یہود و نصاریٰ میں سے ہر ایک کو جو کہی کو قرآن کے فیصلہ کے مطابق عیسیٰ

علیہ السلام پر ایمان لے آنے کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہ رہے گا۔ اور پھر جب وہ اپنی مدتِ حیات

ختم کرنے کے بعد موت سے دوچار ہوں گے تو روزِ قیامت اپنی اُمت پر اسی طرح گواہ ہوں گے

جیسے سائے انبیاء اپنی اُمتوں پر شاہد بنیں گے۔

یہ ایک بے غبار حقیقت ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے پاس میں اگرچہ یہود و نصاریٰ دونوں واقعہ

صلیب پر متفق ہیں لیکن اس سلسلے میں دونوں کے زاویہ نظر مختلف ہیں۔ یہود حضرت مسیح علیہ السلام

کو مغتری اور کاذب کہتے ہیں اور اس لیے فخر کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ کو سولی پر چڑھا

دیا اور اس حالت میں مار ڈالا۔ اس کے برعکس نصاریٰ کا خیال یہ ہے کہ دُنیا کا پہلا انسان آدم

علیہ السلام گنہگار تھا اور ساری دُنیا گنہگار تھی اس لیے خدا کی صفتِ رحمت نے ارادہ کیا کہ دُنیا کو

گناہوں سے نہایت دلائے اس لیے اس کی صفتِ رحمت نے جیسا ہونے یعنی انہیت کی صورت اختیار

کی اور اس کو دُنیا میں رواد کیا تاکہ وہ یہود کے ہاتھوں سولی پر چڑھے اور مارا جائے اور اس طرح

ساری کائنات ماضی و مستقبل کے گناہوں کا کفارہ بن کر دُنیا کی نہایت کا باعث بنے۔ یہاں ان

آیات میں قرآن عزیز نے صاف صاف بتا دیا کہ حضرت مسیح کے قتل کے دعویٰ کی بنیاد کسی بھی عقیدے پر مبنی ہو گرامی اور علم و حقیقت کے خلاف نفاذ کے کاتر ہے اور اس سلسلے میں مسیح اور پہنچے برستی حقیقت فیصلہ دہی ہے جو قرآن نے کیا ہے اور جس کی بنیاد علم و یقین اور وحی الہی پر قائم ہے۔ لہذا آج جب کہ تمہارے سامنے اس اختلاف کے فیصلہ کے لیے جو شک و گمان کی شکستہ بنیادوں پر قائم تھا۔ علم و یقین کی روشنی آپ کی ہے پھر بھی تم اپنے ظنون کا سدھ ادا و باہم فاسدہ پر اصرار کر رہے ہو۔ اور حضرت مسیح سے متعلق باطل عقیدے کا چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہو تو قرآن کا دوسرا فیصلہ اور وحی الہی کا یہ اعلان بھی سنو کہ تمہاری شکوں پر وہ وقت بھی آئے والا ہے جب قرآن کے اس فیصلہ فیصلہ اور اعلان برحق کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام سے کائنات ارضی کو واپس ہوں گے اور ان کی یہ آمد ایسی مشاہد ہوگی کہ یہود و نصاریٰ میں سے ایک فرد بھی ایسا نہ ہوگا جو بادلِ نخواستہ یا بادلِ خواستہ اس ذات گرامی پر ایمان نہ دے آئے کہ بلاشبہ وہ خدا کے کچھ رسول ہیں، خدا کے بیٹے نہیں، برگزیدہ انسان ہیں، مصلوب و مقتول نہیں ہوتے تھے بقید حیات ہمارے آنکھوں کے سامنے ہیں۔

اہل زینغ کے لیے تازیانہ

یہاں یہ بات خاص طور پر توجہ کے قابل ہے کہ سورۃ آل عمران کی طرح اس جگہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے لفظ توفی نہیں بولا بلکہ بعثت لفظ موت استعمال کیا گیا۔ سو جس کو ایسا کیوں کیا گیا ہے؟ صرف اس لیے کہ آل عمران میں جس حقیقت کا اظہار مقصود ہے اس کے لیے توفی ہی مناسب ہے جیسا کہ سورۃ آل عمران کے تشریحی نوٹوں میں آپ پڑھ چکے ہیں۔ اس جگہ براہ راست موت ہی کا تذکرہ مطلوب ہے اور اس حالت کا ذکر ہے جس کے بعد حضرت مسیح بھی کل نفس ذائقہ الموت، کا مصداق بننے لگے ہیں اس لیے یہاں موت کو بعثت لانا ہی مقام کا تقاضا ہے۔ اور مزید بتا دیتا ہے کہ اس بات کے لیے کہ آل عمران میں لفظ موت کی جگہ توفی کا استعمال ایک خاص مقصد کی خاطر کیا گیا ہے جیسے کہ آل عمران میں، آل کا احوال ہوا تھا اس طرح یہاں بھی کہا جاتا ہے جیسے یہاں لفظ موت لایا گیا ہے آل عمران میں جس لفظ موت ہی استعمال ہوتا۔ لیکن قرآن عزیز نے ان دقیق اسالیب بیان کو بالینا حق کے طالبوں ہی کا حصہ ہے نہ اصحاب زینغ اور ارباب ضلالت کا جو اپنی ذاتی اغراض کے پیش نظر پہلے ایک منظرہ ایجاد کرتے ہیں اور بعد ازاں اس سلسلے کی تمام آیات قرآنی کو اس سانچے میں محال کر اس کا نام تفسیر قرآن رکھتے ہیں۔

بہر حال جہود کے نزدیک آیت زیر تشریح کی تفسیر یہی ہے جو ہر دو قسم کی جاچکی ہے۔ مشہور حدیث جلیل القدر مفسر اور اسلامی مورخ حافظ علامہ الدین ابن کثیر اس تفسیر کو عبداللہ ابن عباس اور حسن بصریؒ کے بعد صحیح نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

قد وہ، عبد الرحمن اور بہت سے مفسروں کا یہی قول ہے اور یہی حق ہے جیسا کہ ہم عنقریب دلیل قاطعہ سے بیان کریں گے۔

اور جیسا کہ پہلے بتایا ہوں کہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں اسی کو مراد لیا ہے۔
ہاں اس صحیح تفسیر کے علاوہ کتب تفسیر میں احتمال عقلی کے طور پر دو قول اور بھی منقول ہیں۔
مگر وہ دونوں بلحاظ سند ضعیف اور ناقابلِ اعتماد اور بلحاظ سیاق و سباق غلط اور ناقابلِ التفات ہیں۔

ایک یہ ہے کہ موتہ میں ضمیر کا مرجع کتابی کو قرار دیا جاتے اور ترجمہ یوں کیا جاتے اور اہل کتاب میں سے کوئی فرد ایسا نہیں ہے جو اپنی موت سے حضرت عیسیٰ پر ایمان نہ لاتا ہو۔
دوسرا یہ ہے کہ ہر کسی ضمیر کا مرجع بھائے حضرت عیسیٰ کے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہوں اور ترجمہ یوں کیا جاتے کہ اہل کتاب کا ہر فرد اپنی موت سے پہلے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے۔

اس بات سے قطع نظر کہ یہ دونوں تفسیریں نقل روایت کے لحاظ سے ناقابلِ اعتبار اور غیر صحیح اور سیاق و سباق قرآنی کے خلاف ہیں۔ عقلی نقطہ نظر سے بھی غلط ہیں اس لیے کہ اگر اس آیت کے یہ معنی ہیں تو پھر یہ آیت معاذ اللہ اپنے مقصد بیان کے خلاف بنے سمے اور بے نتیجہ ہے کیونکہ قرآن کا یہ صاف اعلان ہے کہ انسان جب عالم دنیا سے کٹ کر عالم غیب سے وابستہ ہو رہا ہے تو لازمی کلیات اس پر طاری ہو جاتی ہیں تو اس وقت اس کے اعمال کا صحیفہ لپیٹ دیا جاتا ہے اور اس وقت تہدیلِ قضا اور اعترافِ حق کا کوئی نتیجہ اور ثمرہ نہیں ملتا یعنی اس وقت کا نہ اقرار و اعتراف معتبر اور نہ انکار مستند، تو ایسی صورت میں حضرت عیسیٰ یا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا خصوصیت کا تذکرہ کیا معنی رکھتا ہے؟ انسان جب اس حالت میں ہوتا ہے تو اس کے سامنے سے غیب کے سارے پڑے ہٹ جاتے ہیں اور دین حق کی بنیاد ہوتی غیب کی ساری حقیقتیں اس پر منکشف ہو جاتی ہیں۔ اس وقت کے ایمان کا اعتقاد ہی نہیں ہے۔ اور جب اس قسم کا ایمان قابلِ قبول ہی نہیں ہے تو اس کا ذکر اس انداز سے ہونا چاہیے تھا جو انداز عرقِ فرعون کے وقت

فرعون کے ایمانی اعتراف کے لیے اختیار کیا گیا اور جس میں اس وقت کے ایمان کا بے قیمت ہونا ظاہر کیا گیا، ذکر ایسے اسلوب اور انداز میں کر گیا مستقبل میں ہونے والے کسی عظیم اشیان واقعہ کی خبر دی جا رہی ہے۔ جو قرآن کے مخاطبوں یسود و نصاریٰ کے عقائد و عقائم کے خلاف حضرت عیسیٰ السلام سے تعلق قرآن کی تصدیق اور اس کے اہل فیصلہ کی زندہ شہادت بن کر پیش آنے والا ہے۔ ایک عیسائی اور یسودی ہنجر موت میں اُھلے کے وقت جان حزنیز سپرد کر دینے سے پہلے حضرت عیسیٰ پر ایمان لائے یا دلاتے۔ اس کی اس وقت کی تصدیق کائنات انسانی کے علم و ادراک سے، نگہ صرف اس کے خدا کے درمیان ہے۔ اس کا کوئی قانونی مقام نہیں ہے۔ ایسے موقع پر ایسی بات کا ذکر قطعاً بے محل ہے جہاں ایک قوم کو ایک خاص حق پر مزم اور مجرم کی حیثیت سے پیش کیا جا رہا ہے اور فیصلہ حق کی تائید کے لیے ماضی اور مستقبل میں کائنات ارضی میں پیش آنے والے واقعات کو پیش کیا جا رہا ہے یا کہ اس آیت کے سیاق و سباق سے ظاہر ہو رہا ہے اور اس پر غور فرمائیے کہ غرض کے حالات میں حضور الزور اور حضرت عیسیٰ کی رسالت پر ایمان ہر اس کتابی سے تعلق رکھتا ہے جو اس آیت کے نزول سے پہلے گزر چکا ہے۔ اگر اس آیت میں یہی بات بنائی پیش نظر ہوتی تو اس کے لیے مود مستقبل کی یہ تعبیر لیو معن بہم بلاغت کلام کے بالکل مناسب نہیں ہے اس کے لیے تو ایسی تعبیر ہونی چاہیے جو ماضی، حال اور مستقبل میں ہر یک پر یکساں حاوی ہو تاکہ بات اپنے توسع کے لحاظ سے پوری طرح ادا ہو۔ اور آیت میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان والی بات تو اس لیے بھی قطعاً غلط ہے کہ اس آیت سے پہلے اور بعد کی آیات میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے کیونکہ شروع آیات میں صرف حضرت مسیح علیہ السلام کا ذکر ہو رہا ہے اور آیت کے آخر میں یہ ارشاد ہے دیوم القيامة يَكُونُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا اور یہ بالکل واضح ہے کہ اس جگہ شہادہ سے حضرت عیسیٰ اور علیہم السلام کی ضمیر سے ان کی اُمت مراد ہے تو پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیے بغیر درمیان کی کسی ضمیر کا مرجع حضور انور کو قرار دینا نہ صرف یہ کہ فصاحت و بلاغت کے منافی ہے بلکہ قاعدہ عربیت کے قطعاً خلاف اور اختصار مضائقہ کا موجب ہے۔

غرض بے غل و غش صحیح معنی وہی ہیں جو جمہور نے اختیار کیے ہیں اور یہ دونوں خود ساختہ احتمالات آیت کی تفسیر تو کیا صحیح احتمال بھی کہلانے کے بھی مستحق نہیں ہیں۔

فَيُظْلَمُونَ الَّذِينَ مَا دُ وَاحَرَمْنَا عَلَيْهِمْ طَيْبَاتِ أُحِلَّتْ
 لَهُمْ وَبِصَدِّ هُمْ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ كَثِيرًا اللَّهُ وَأَخَذَ مِنْهُمُ
 الرِّبَا وَقَدْ نُهُوا عَنْهُ وَأَكْلِهِمْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ
 وَهَتَدُنَا لِلْكَفَى بَيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا لَكِنَّ الرِّجْزُونَ
 فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُونَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ
 وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيمِينَ الصَّلَاةَ وَالْمُؤْتُونَ
 الزَّكَاةَ وَالْمُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أُولَئِكَ
 سَنُؤْتِيهِمْ أَجْرًا عَظِيمًا

بس یہودیوں کی ظلم کاری کی وجہ سے ہم نے ان پر وہ پاکیزہ چیزیں
 جو ان پر حلال تھیں حرام کر دیں۔^{۲۳۸} اور اس وجہ سے بھی کہ وہ لوگوں
 کو اللہ کے راستہ سے روکتے تھے۔^{۲۳۸} اور اس وجہ سے کہ وہ باوجود
 منع کیے جانے کے سود لیتے تھے۔^{۲۳۹} اور اس وجہ سے بھی کہ وہ

لوگوں کے اموال ناہائز طور پر کھاتے تھے۔ اور ان میں کافروں کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ مگر ہاں جو لوگ ان میں سے علم میں پکے ہیں اور جو ایمان والے اس کتاب پر جو تم پر نازل ہوتی ہے اور ان پر جو تم سے پہلے نازل ہو چکی ہیں ایمان رکھتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور خدا اور آخرت کو مانتے ہیں ان کو ہم ضرور اجر عظیم دیں گے۔

فضائلِ روزِ آمل کا تعابلی مطالعہ

ان آیات میں روزِ آمل کا فضائل سے متباد کیا گیا ہے۔ پہلے روزِ آمل پیش کیے گئے ہیں، بعد ازیں ان کے منجملے پر فضائل بتائے گئے ہیں اور دونوں کے نتائج الگ الگ عذابِ الیم اور اجرِ عظیم بول کر بتائے گئے ہیں یعنی روزِ آمل کا نتیجہ عذابِ الیم اور فضائل کا اجرِ عظیم قرار دیا گیا ہے۔ ظلمِ کاری راہِ خدا یعنی نیکی کے کاموں میں رکاوٹیں کھڑی کرنا، سود ستانی اور لوگوں کا مال غلط طور پر کھانے کو روزِ آمل میں شمار کیا گیا ہے۔ گویا یہ ام الرزائل ہیں۔ باقی دوسرے روزِ آمل کا بلا واسطہ اور بالواسطہ غمخوارِ نسب ان ہی سے ملتا ہے۔

یہودیوں کے تذکرے میں ان روزِ آمل کا اضافہ یہ بتانے کے لیے کریموں کی جن اجتماعی برائیوں کا پہلے ذکر ہو چکا ہے ان کے ساتھ یہ برائیاں بھی ان کی قومی زندگی کا حصہ بن چکی تھیں۔ ان برائیوں میں طوٹ ہونے کی وجہ سے وہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے قبول کرنے سے گریز کر رہے ہیں اور اسی بنا پر وہ پہلے انبیاء کے گستاخ اور بے ادب اور قاتل بنے ہوئے۔ اس سے معلوم

ہوا کہ برائیوں سے برائیاں جنم لیتی ہیں اور نیکیوں کی قدریں گر جاتی ہیں۔ اہل ایمان کو اشاروں و اشاروں میں بتایا جا رہا ہے کہ تم ان برائیوں سے بچ کر رہنا ورنہ تمہارا انجام بھی یہی ہو گا جو یہودیوں کا تمہارے سامنے ہے۔

رذائل کے مقابلہ پر رسولِ علی، ایمان، اقامتِ صلوٰۃ، ایثار، زکوٰۃ، حکومتِ فضا، پیش کیا ہے اور اشارہ کیا ہے کہ یہ اس قدر طاقتور ہیں کہ اگر ان پر قابو پایا جائے تو باقی خوبیوں پر قابو پایا بہت آسان ہے۔ اسلام کے پیش نظر اخلاق کی علمی و منطقی حیثیت نہیں بلکہ عمل ہے کیونکہ اس کا فضا انسان کو صرف اخلاق کا علم بخشنا نہیں بلکہ انسان کو فضائلِ اخلاق کا عامل بنانا اور رذائلِ اخلاق سے علنا بچانا ہے اس لیے وہ یہ بحث نہیں کرتا کہ فلاں خلق کی اصلیت کیا ہے اور اس سے دوسرے اخلاق کس طرح پیدا ہوتے ہیں بلکہ اس سے بحث کرتا ہے کہ انسان کو کس طرح اچھے اخلاق کا پابند بنایا جائے اور کس طرح بُرے اخلاق سے بچایا جائے، اسی لیے اس نے اپنی تعلیم میں فلسفہ کا رنگ اختیار نہیں کیا۔ قرآنِ اخلاق کو دو ہی قسموں میں تقسیم کرتا ہے وہ اخلاق جن کو اللہ سبحانہ پسند کرتا ہے یہ فضائل کہلاتے ہیں اور وہ کام جن کو اللہ ناپسند کرتا ہے یہ رذائل کہلاتے ہیں۔ اس آیت میں قرآن نے دونوں کا اجمالی اور بنیادی نقشہ پیش کیا ہے۔

۲۳۶۔ جس ہم نے یہودیوں کی ظلم کاری کی وجہ سے ان پر وہ پاکیزہ چیزیں جو ان کے لیے حلال تھیں حرام کر دیں۔

یہاں سمجھنے کی باتیں ہیں۔ اولاً یہ کہ یہاں جسے ظلم کہا گیا ہے سہۃ انعام کی آیت ۱۲۶ میں اسے بھی فرمایا ہے ذالک جنہا نھم ببغیہم یہ ہم نے اللہ کو ان کی سرکشی کی سزا دی تھی۔ یعنی کے معنی زیادتی اور دست درازی کے آتے ہیں۔ اور اس لحاظ سے یہ ظلم کے مرادف ہے۔ دونوں میں ایک جوہری فرق ہے۔ ظلم کے معنی بے مروتی، بے عمل اور بے جا استعمال کے ہیں اور یہ اپنی ذات کی حد تک بھی ہو سکتا ہے برخلاف یعنی کے کہ یہ اپنی ذات کی حد تک زیادتی کے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے حقوق کو ٹپ کرنا، دوسروں پر دست دراز کر کے پر لولا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہودیوں کو ان کی قسم کی برائیوں میں مبتلا تھے، انفرادی اور ذاتی بھی اور اجتماعی اور قومی بھی۔ انفرادی حیثیت میں وہ جھوٹے تھے، زبان کے چھوٹ تھے اور جماعتی حیثیت میں وہ بدعبد اور بے ایمان تھے۔ قرآن نے یہاں ان دونوں قسم کے گناہوں کا ذکر نہیں کیا بلکہ صرف قومی اور اجتماعی قسم کے گناہوں کی نشاندہی کی ہے۔ یعنی آیت میں رذائل کو زمین منطوں میں پیش کیا ہے۔ ایک لوگوں کو اللہ کے راستے

سے روکتا۔ دوسرے خود اپنا تیسرے لوگوں کے اموال پر ناجائز قبضہ۔ ان وقعی، رذائل کی بنیاد پر مذہب اور ہر انسانی معاشرت کے بڑا کھسکا ہے۔ اگر تحصیل کی گاتے تو معلوم ہو گا کہ وہ درحقیقت خدا کے ناپسندیدہ کام ہیں، اور دین و شرافت کی نگاہ میں گناہ ہیں۔ اگر ان کو جائز ٹھہرا جائے تو شرلوں کے ابھی حقوق سے امان اٹھائے اور کسی کی جان و مال و آبرو محفوظ نہ ہے۔

ان تینوں کی ترتیب دو نظریوں کے مطابق دی جاسکتی ہے ایک ان میں سے کسی بڑائی کا اثر کا دائرہ کتنا وسیع ہے اور دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ ناپسندیدگی اور عدم رضا سے کسی کو کتنا نگاہ رکھتا ہے۔ دین میں ترتیب کے ساتھ اجتماعی، معاشی رذائل کو تین بڑے عنوانوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ سب سے پہلے صدق، سبیل، اللہ پھر اخذ، باپراکھل اموال، اناس بالباطل، صدق، سبیل، اللہ میں جس بڑائی کی طرف اشارہ ہے وہ اساتذہ پر گہر ہے، ایمان، اعمال اور اخلاق کی ساری خوبیوں اور اچھائیوں کے خلاف دشمن قائم کرنا اس سے جماعت کی پروری، دینی، اخلاقی اور معاشرتی زندگی متاثر ہوتی ہے۔ سودا سنی سے انسانی معاشرت تباہی اور بربادی کے دھانے پر کھڑی جاتی ہے، اور اکل اموال، اناس کی بڑائی وہ بڑائی ہے کہ جماعت سے آگے بڑھ کر پورے ملک و ملت کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ یہ تو ایک نظریہ کے مطابق ان رذائل کی ترتیب ہے، دوسرے نظریہ کو تو سے پہلے وہ ذمیم کردار ہے جس سے خدا کی رضا چھن جاتی ہے۔ پھر وہ بڑائی ہے جس سے خدا کی محبت سے محروم ہو جاتا ہے اور پھر وہ ہے جس سے خدا کی رحمت سے خالی ہو جاتا ہے۔

ثانیاً یہ مضمون قرآن مجید میں تین جگہ بیان ہوا ہے۔ سورۃ آل عمران میں گزر چکا ہے کل الطعام کان حلالاً یعنی امراتیل الا ما حرم امراتیل علی نفسہا من قبل ان تغزلی النورۃ۔ کھانے کی ساری چیزیں بنی اسرائیل کے لیے حلال تھیں، البتہ جو چیزیں ایسی تھیں جن کو تو روات نازل ہوئے تھے حضرت یعقوب نے اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔ پھر اس آیت میں فرمایا کہ بفضلہ من الذین ہادوا، منا علیہم طیبات احلت لہم ہم نے بہت سی پاکیزہ چیزیں بنی اسرائیل کے ظلم کی وجہ سے ان پر حرام کر دیں جو پہلے ان کے لیے حلال تھیں۔ اس کے بعد مثنوی پائے میں اس جملہ کی تفصیل آرہی ہے جس میں بتایا ہے کہ ان سرکشوں کی وجہ سے ہم نے ان پر تمام ناخن والے جانور حرام کیے، بکری اور گھاتے کی چربی بھی ان کے لیے حرام ٹھہر دی۔ ان تین آیتوں کے جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت اسلامی اور یہودی فقہ کے درمیان حیوانی غذاؤں کی حلت و حرمت کے معاملہ میں جو فرق پایا جاتا ہے وہ دو وجہ پر مبنی ہے۔

ایک یہ کہ نزدیکیِ تورات سے صدیوں پہلے حضرت یعقوب نے کچھ چیزوں کا استعمال چھوڑ دیا تھا اور ان کے بعد ان کی اولاد نے بھی ان چیزوں کو چھوڑے رکھا تھا تاں انکو یہودی علماء نے ان پر قانونی حرمت قائم کر دی۔ اور ان کی حرمت تورات میں نکل۔ ان اشیاء میں اونٹ، خرگوش اور سانپ شامل ہیں۔ آج بائبل میں تورات کے ہر اجزاء کو مجرور ہیں، ان میں ان تینوں چیزوں کی حرمت کا ذکر ہے چنانچہ اجماع کے باب ۱۱ میں ہے :

مگر ان میں سے جو جگہ لی کرتے ہیں یا کہ ان کے چرے ہوئے ہوتے ہیں ان کو نہ کھاؤ جیسے اونٹ وہ جگہ لی تو کرتا ہے پھر کہ اس کا چرا برا نہیں ہوتا، سودہ تمہارے لیے ناپاک ہے۔ اور صاف کر دہ جگہ لی کرتا ہے اور کہ اس کا چھرا برا نہیں تو وہ بھی تمہارے لیے ناپاک ہے۔ اور خرگوش کو نہ کھاؤ جگہ لی تو کرتا ہے پھر اس کا کہر چھرا نہیں ہے وہ بھی تمہارے لیے ناپاک ہے اور سودہ کہ اس کا دھوسہ ہوتا ہے اور اس کا پاؤں چر ہے، پھر وہ جگہ لی نہیں کرتا وہ بھی تمہارے لیے ناپاک ہے۔ تم ان کے گوشت میں سے کچھ نہ کھاؤ، اور ان کی لاشوں کو نہ چھو یہ تمہارے لیے ناپاک ہیں۔ (۲۔۵۔۶۔۷۔۸۔۹۔۱۰) اور استثنائے باب ۱۱ میں ہے :

لیکن ان میں سے کہ جگہ لی کرتے ہیں یا ان کے کھر چرے ہوتے ہیں۔ تم ان کو نہ کھاؤ جیسے اونٹ، خرگوش اور بر بوع اس لیے کہ یہ جگہ لی کرتے ہیں، لیکن ان کے کھر چرے ہوتے نہیں ہیں سو یہ تمہارے لیے ناپاک ہیں۔ اور سودہ کہ اس کے کھر چرے ہوتے ہیں یہ جگہ لی نہیں کرتا وہ تمہارے لیے ناپاک ہے تم ان کا گوشت نہ کھاؤ اور نہ ان کی لاش کو ہاتھ لگاتو۔ (۱۰۔۷۔۸۔۹۔۱۰)

لیکن آلی ہمران میں یہودیوں کو جو یہ پہنچ دیا گیا تھا کہ

فَاتُوا بِالتَّوْرَةِ فَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ كُفْرَكُمْ سَادِقِينَ

اور کھاؤ تورات اور پڑھو ان کو تم اپنے دعوے میں کچھ ہو۔

اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ تورات میں ان احکام کا اضافہ بعد میں کیا گیا ہے کیونکہ اگر

اس وقت تورات میں یہ احکام ہوتے تو یہودی فوراً لاکر پیش کر دیتے۔

دوسرے یہ کہ اللہ کی شریعت سے جب یہودیوں نے بغاوت کی اور خود ہی شارع بن گئے

قرآنوں نے بہت سی پاک چیزوں کو اپنی خوشگنائیوں سے خود حرام کر لیا۔ اللہ تعالیٰ نے منہ کے طور پر اسے قائم رکھنے دیا۔ ان شے میں ایک تو ناخن والے ہانڈوں شامل ہیں جیسے شتر مرغ، قاز، بطن، وغیرہ دوسرے کھائے اور بکری کی چربی۔ بائبل میں ان دونوں قسم کی چیزوں کو احکام تورات میں مٹل کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ تورات میں کتاب احبار کے گیارہویں باب میں ہے۔

اور پرندوں سے جن سے تم کھن کر دو اور جن کو ذکھاؤ اس لیے کہ وہ مکروہ ہیں۔
سورہ ہیں۔ سر، عقاب اور گدھا، اور جمل اور شاہین اور سب اس کی قسمیں اور کوسے اور اس کی اقسام، اور شتر مرغ اور آٹو اور کوکل اور باز اور سب اس کی قسمیں اور بوم اور ہر گلیا اور دم اور رچ ہنس اور حواصل اور چرہ مار، اور لقی اور ہلکا اور سب اس کی قسمیں اور بڈہ اور چٹکاڑ اور سب پرندے جو چار پاؤں پر چلتے ہیں وہ تمہارے لیے مکروہ ہیں (۱۳ سے ۲۰ تک)۔
اور تورات کے کتاب احبار کے باب ہفتم میں ہے :

پھر خداوند نے موسیٰ کو خطاب کر کے فرمایا کہ بنی اسرائیل کو حکم کر کہ بیل اور بھیڑ اور بکری کی چربی نہ کھائیں۔ اور اس حیوان کی چربی بھی جو خود بخود مر گیا یا جی کو زندوں نے چاٹا ہو تو اسے اور کاموں میں لائے ہو پھر اس کو ہرگز نہ کھائیں۔

لیکن قرآن کی اس آیت کا اشارہ بتایا ہے کہ یہ چیزیں تورات میں حرام نہیں بلکہ حضرت عیسیٰ کے بعد حرام ہوئی ہیں۔ اور تائید بھی شہادت دیتی ہے کہ موجودہ یہودی شریعت کی مذہب دوسری صدی عیسوی کے آخر میں رہنے والا ہوا کے ہاتھوں مکمل ہوئی تکریر والے کچھ زیادہ ذوق نہیں ہے اصل یہی ہے اور یہی عام مفسرین کی رائے ہے کہ نزول انبیاء بنی اسرائیل کے زمانے میں یہ سب چیزیں یہودیوں پر اللہ سبحانہ کی جانب سے بطور سزا حرام ہوئی ہیں۔ یہ صورت اپنی جگہ معنویت بھی رکھتی ہے اور اس کے لیے تاویل کے کسی کمزور سہارے کی بھی ضرورت نہیں ہے

پہلی صحت میں عیسیٰ کی یہ چیزیں حضرت عیسیٰ کے بعد خود یہودی علماء نے اپنے لیے حرام کی تھیں یہ سوال ابھرتا ہے کہ اگر ایسا ہی ہے تو قرآن نے یہاں حوا مطہیات احلت لفظ کی تعبیر کیوں اختیار کی ہے۔ اس کے جواب میں یہ کہنا کہ خدا کی تحريم کی صرف یہی ایک صورت نہیں ہے کہ وہ کسی پتھر یا کتاب کے ذریعے سے کسی چیز کو حرام کرے بلکہ اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے باطنی بندوں پر عبادت شاعری اور جعلی قانون سازوں کو سنبھالے اور

وہ ان پر طہات کو حرام کر دی، ایک بے سنے تاویل ہے، اصل میں ہے کہ یہ تحریم نبوت ہی کے ذریعے
 اللہ سبحانہ کی جانب سے ہوئی ہے اور بطور سزا ہوئی۔ مولانا آزاد کا یہ ارشاد بالکل بجا ہے کہ
 جب کسی جماعت میں راست بازی اور پرمیزگاری باقی نہیں رہتی تو مباح اور حائز بقول کا
 بھی استعمال اس طرح کرنے لگتی ہے کہ طرح طرح کی برائیوں کا ذریعہ بن جاتی ہیں اور اس وقت مسلح
 کے لیے ضروری ہو جاتا ہے سدا اللہ یہ ان حائز بقول کو بھی عارضی طور پر روک دے۔ چنانچہ یہودیوں کی
 بے تحاشہ طبیعت کا یہی حال تھا۔ نتیجہ نکلا کہ کتنی ہی حلال چیزیں جن کے لیے پہلے کوئی روک ٹوک
 نہ تھی مصلوہ روک دی گئیں۔ یہاں اسی معاملہ کی طرف اشارہ ہے۔

اللہ کی راہ سے روکنا اور روکنا

۲۳۸۔ اور اس وجہ سے بھی کہ وہ لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکتے تھے۔ صد کے عربی میں روکنے
 اور روکنے کے معنی آتے ہیں یعنی لازم بھی آتا ہے اور متعدی بھی۔ عامر شارحین قرآن نے یہاں متعدی
 معنی لیے ہیں۔ اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ وہ غلط قیادت کے ذریعے لوگوں کو اللہ کے راستے
 سے روکتے ہیں یا کہ لوگوں کو منکرات کا حکم دیتے ہیں اور معروف سے روکتے ہیں یعنی صرف اسی پر
 اکتفا نہیں کرتے کہ خود اللہ کے راستے سے منحرف ہیں بلکہ اس قدر بے باک ہو چکے ہیں کہ بحرین کی
 قیادت کر کے اکابر بحرین کا منصب اختیار کر لیتے ہیں اور دنیا میں خدا کے بندوں کو گمراہ کرنے کے
 لیے جو بھی آواز بلند ہوتا ہے اس کی قیادت بھی یہودی کہتے ہیں، اور اللہ کی طرف بلائے کے لیے
 جو آواز اٹھتی ہے اس کے مقابلہ میں سب سے بڑی روک ٹوک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں حلا فکیر اللہ کی
 کتاب، اللہ کے رسولوں کو ماننے لگے ہیں۔ دنیا میں تمام بری تحریکوں کا شجرہ نسب بالواسطہ
 اور بلا واسطہ یہود سے ملتا ہے۔ دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ جو منظم زندگی اور منظم حکومت
 خدا کے انکار اور اس کی کلمہ کلمات بغاوت پر قائم ہوا اس کا سہرا ان ہی کے سر پر ہے چاہے وہ
 فرماؤں کا نظریہ جنسیت ہو یا کادل مارکس کا نظریہ اشتراکیت، مذہب کے لباس میں نہیں بلکہ
 فلسفہ کے لباس میں نمودار ہو کر پوری انسانیت کو اللہ کے راستے سے روک رہا ہے۔ اس کی اسلام
 کے خلاف جارحانہ کاروائیاں مذاہب باطلہ کی جارحانہ کارروائیوں سے بالکل مختلف ہیں۔ مذاہب
 باطلہ براہ راست اور بلا واسطہ اسلام کے مقابلہ پر آتے تھے یہ باطل فلسفہ یعنی اشتراکیت اور
 جنسیت براہ راست اسلام کے مقابلہ پر نہیں آتا بلکہ علم اور عقل کے نام سے مقابلہ کرتا ہے۔ وہ

جب اسلام کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے تو اسلام کا نام نہیں لیتا بلکہ اسلام سے اس طرح قطع نظر کرتا ہے کہ گویا اسے معلوم ہی نہیں کہ اسلام بھی اس کے حریف کی حیثیت سے دنیا میں موجود ہے بلکہ وہ علمی تحقیق اور عقلی استدلال کے بل بوتے پر انسان اور کائنات کی ایسی تشریح کرتا ہے، خدا، رسول، کتاب اور آخرت کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کیونکہ اسلام بھی انسان اور کائنات ہی کا ایک منظر ہے۔ وہ عقیدہ اور سند کو قابل اعتناء نہیں سمجھتا بلکہ وہ ان کو علم اور عقل کے معیار پر پرکھتا ہے اور صرف اور اس کے ناقابل تغیر و تردید قوانین کے نام لاندہ ہیئت اور دہریت کی طرف دعوت دیتا ہے۔

اسلامی غیرت کا زوال

یہی یہودی جب مذہب کے نام پر اسلام کی راہ روکتا تھا تو ہماری اسلامی حیثیت جوش میں آجاتی تھی اور ہمارے دل میں اس کی مخالفت اور اس کے مقابلے میں اسلام کی مدافعت اور حفاظت کا جذبہ باہر آتا تھا۔ ہمیں وہ بھر خیر نہ ہوتا کہ اس کا ماننا اسلام کا انکار ہے اور اس کا اثبات اسلام کی نفی ہے لیکن یہی یہودی جب سے اشتراکیت اور جنسیت کے منظریات کے نام پر اسلام کی راہ میں رکاوٹ بن کر آیا ہے تو ہماری اسلامی غیرت کا جوش ششادہاں گیا اور اس کے مقابلے میں اسلام کی مدافعت اور حمایت کا جذبہ کڑو ہو گیا۔ جب اس کے دام ہمرنگ زمین میں پھنستے ہیں تو بے علمی اور جہالت قبول کرتے ہیں اور اسے علم کا نام دیتے ہیں اور بے عقلی و نادانی اختیار کرتے ہیں اور اسے عقل اور زیر کی سمجھتے ہیں۔ ہم اشتراکیت اور جنسیت کے نام پر ان کے منظریات کو مانتے ہیں اور ہمارے دل میں یہ بات کشمکش نہیں ہے کہ ان کے اثبات سے اسلام کی نفی ہوتی ہے اور ہمیں احساس تک نہیں ہوتا کہ یہ صد جن سبیل اللہ ہے۔ ہم ان کو حریف نہیں سمجھ رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری بربادی کی جن کوششوں میں یہودی معروف ہیں وہ ہمارے ہی ہاتھوں سے زیادہ موثر اور زیادہ کامیاب ہو رہی ہیں۔

یہودی رکاوٹ دام ہمرنگ زمین ہے

فلسفہ مذہب کے آئینے سے جب کوئی مسلمان اسلام کو غیر یاد کرتا تھا تو وہ مجبور ہوتا تھا کہ کسی گرجا یا مندر میں جا کر شادی یا جھوس کی ایک خاص رسی کا روادانی میں سے گزرنے کے بعد وہ مسلمانوں کی

جماعت سے الگ ہو جاتا تھا اور ان سے ہر قسم کی سماجی، اقتصادی اور سیاسی تعلقات منقطع کر لیتا تھا۔ اس کی عبادت کی رکیں اور بود باش کے طریقے بدل جاتے تھے اور وہ شادی بیاہ اور دوستی اور رشتہ داری اور میل و ملاقات کے لیے ایک دوسری قوم سے راہ و ربط پیدا کرنا تھا۔ اس طرح اس کا ٹکڑ ٹکڑ کرنا شروع آجاتا۔ اسلام سے اس کی دشمنی اور نفرت آشکارا ہو جاتی تھی اور مسلمان اس کی طرف سے ہوشیار ہو جاتے لیکن یہودی اہل فلسفہ کے اثر سے اب جب کوئی مسلمان اشتراکیت کو اختیار کرتا ہے تو وہ بجز، جنب، ہزار، ہزار قسم یا فحش کی طرح کی کسی کارروائی میں سے گزرتے یا مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہو جاتے یا ان سے اپنے سماجی، اقتصادی اور سیاسی تعلقات منقطع کر کے یا اپنی بود باش کے طریقوں کو بدلے کیونکہ یہودیت کے صد عن سبیل اللہ کے اس نئے روپ نے اپنے ہمنواؤں کو اجازت دے رکھی ہے کہ کرم مذہب سے بجز ہر کار و خداد اور شول کے دشمن بن کر بیٹھتے ہوئے اسلام کے دائرے میں اگر ہر ہر کوئی سرخ نہیں ہے۔ چنانچہ اس دشمن دین و ایمان سے آج مسلمان ایسے ہیں جو یا تو خدا کے منکر یا وہی درگاہ کے یا حیات بعد الموت کے یا جزا و سزا کے اور یا ان سب کے۔ ان میں کچھ ایسے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ اسلامی نظام اس زمانے میں ناقابل عمل ہے۔ اور بعض کا خیال ہے کہ مذہب ایک دھوکو سلا ہے۔ جو یا تو اقتصادی حالت کا نتیجہ ہوتا ہے یا دلی ہر تو منی غلامشات کا درمل۔ پھر ان میں سے کوئی اسلام کے معاشرتی نظام کو فرسودہ اور بیمار سمجھتا ہے۔ کوئی اسلامی حکومت کی تجویز کا مذاق اڑاتا ہے کوئی جنسی تعلقات پر اسلام کی ننگائی ہر تو پابندیوں کو ایک فطری عمل کی اہواز منہ صبرمت اور بے وقت رکاوٹ سمجھ کر ان کا استحباب کرتا ہے کوئی اسلام کے عبادت کے طریقوں کو بے معنی سمجھتا ہے۔ کوئی زکوٰۃ کو موقوف کرنا چاہتا ہے کوئی چاکر، کوئی ناز کو اور کوئی دوز کے کو۔ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو اسلام ہی کے نام پر اسلام کی بنیادی باتوں کا انکار کرتے ہیں اور اس کے اساسی اصولوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ وہ اپنے غیر اسلامی تصورات پر اسلام کا لیل نکالتے ہیں۔ ان ساری کارگزاریوں کے باوجود یہ لوگ مسلمان بنے ہوئے ہیں اور مسلمانوں سے شادی بیاہ اور دوستی اور رشتہ داری، میل و ملاقات اور کھانے پینے کے تعلقات یکجہ ہوئے ہیں۔ انا للہ فاللہ المشرقی۔

ہم اسے شارحین قرآن اس آیت میں اللہ کے راستے سے روکنے سے مراد یہ بتا کر کہ یہودی لوگوں کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے سے روکتے تھے۔ آیت کی معنویت میں بہت بڑی الجھن پیدا کر دی۔ کیونکہ اگر آیت سے مراد یہ ہے تو یہودیوں کا لوگوں کو نبوت محمدیہ کے ماننے سے روکنا طبابت کے حرام ہونے کی کیسے علت بن سکتا ہے، حالانکہ تحفہ گویہ کہ یہودی کی تو می زندگی کے

شناخت پر پور ہی ہے۔

آیت میں کثیر اُکے اضافے فقرے میں بہت بڑی معنوی وسعت آگئی ہے۔ کثیر اُکے ایک معنی تو یہی ہیں کہ وہ بہت لوگوں کو راجت سے روکتے تھے۔ دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ان میں لوگوں کو راجت سے ہٹانے اور روکنے کی عادت بہت زیادہ تھی۔ تیسرے معنی یہ بھی بتائے گئے ہیں کہ نہ سانا کثیر اُکے عرصہ دراز تک یہ کام کرتے سہے ہیں۔ بہر حال کثرت کا کینہ اور کینیت اور زما زینوں سے تعلق ہو سکتا ہے۔

یہود کو سود کی ممانعت

۲۳۵- اور اس وجہ سے بھی کہ وہ باوجود منہ کیے جانے کے وہ سود لینے تھے۔ آپ دیکھ لیں

ہیں کہ قرآن بتا رہا ہے کہ یہود لوں کے لیے بلا قید سود حرام تھا لیکن یہود کے اہل رادہ فقہاء نے اس میں بھی قیدی نگاہ کی تھیں۔ چنانچہ تورات کی کتاب خروج کے باب ۱۲ میں ہے:

اگر تو میرے لوگوں میں سے کسی محتاج کو جو تیرے پاس رہتا ہو قرض لے تو اس سے قرض خواہ کی طرح سلوک نہ کرنا اور نہ اس سے سود لینا۔ اگر تو کسی وقت اپنے ہمساہ کے پکڑے گرد کہ بھی لے تو سود کے ڈھپنے اس کو واپس کر دینا۔ کیونکہ مقتصد ہی ایک اس کا اڈھنا ہے اس کے جسم کا وہی لباس ہے۔ پھر کیا وہ اڈھ کر سوتے گا۔ پس جب وہ اڑے گا تو میں اس کو سنوں گا کیونکہ میں مہربان ہوں۔

(آیت ۲۵، ۲۶، ۲۷)

اور تورات کتاب اہل رادہ کے باب ۲۵ میں ہے:

اگر تمہارا بھائی تمہارے بیچ میں محتاج اور تھی دست ہو جائے تو تم اس کی دستگیری کرو خواہ وہ اجنبی ہو خواہ مسافر ہو اگر وہ تیرے ساتھ زندگانی بسر کرے تو اس سے سود اور لفع مت لے، پھر اپنے خدا سے ڈرو تاکہ تیرا بھائی تیرے ساتھ زندگانی بسر کرے تو تم سے سود پر وہ یہ قرض لے نہ لفع۔ یہ لے کھا نکلا۔ میں خداوند تمہارا خدا ہوں جو تم کو زمین مصر نکال لایا تاکہ تم یہاں انسان کی زمین دوں اور

تمہارا خدا ہوں۔ (۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱)

اور تورات کی کتاب حشریہ الاستخراج میں ہے:

تو اپنے بھائی کو سود پر قرض نہ دیکھو نہ نقد کے سود پر نہ غلجہات کے سود پر، دیکھی
چیز کے جس کی عادت پر سود پر کی جاتی۔ تو اب بھی کو سودی قرض سے سکتا ہے پر اپنے بھائی
کو سودی قرض نہ دیکھو نہ غلجہات کے سود پر اس سر زمین جس کا تو وارث ہونے جاتا ہے۔
ان سب کاموں میں جن میں تو ہاتھ لگاتے تجھے برکت ملے۔ (۱۹، ۲۰)

یاد رہے ابھی اور بھائی، لگانے اور بیگانے کی سود کے موضوع پر تفریق اس تورات کی ہرگز
اور نہیں ہے جو حضرت موسیٰ پر نازل ہوئی ہے۔ یہ یہودی اجداد کا تحریر کیا لانا مر ہے یا پھر اصل تورات
کی گتہ گی کے بعد روایت ماننے ہے۔ انبیاء بنی اسرائیل کی تصریحات بتا رہی ہیں کہ سود یہودیوں پر
بلا قید و شرط تھا اس میں بیگانے اور بیگانے کی کوئی تقسیم نہ تھی۔
حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ۱۵ زبور میں فرماتے ہیں،

میں نے خداوند تیرے نیچے میں کون ہے گا۔ تیرے کہ وہ مقدس پر کون سکونت
کرے گا۔ وہ جو سیدھی چال چلتا ہے اور صداقت کے کام کرتا ہے اور اپنے دل سے
ہرج بولتا ہے وہ جو اپنی زبان سے چٹلی نہیں کھاتا اور اپنے ہمسایہ سے بدی نہیں کرنا
اور اپنے پردی پر عیب نہیں لگاتا ہے۔ وہ جس کی نظر میں ٹھکانا آدمی خوار ہے پر وہ
انہیں جو خداوند سے ڈرتے ہیں عزت دیتا ہے۔ وہ جو اپنے ضرر پر تمہیں کھاتا ہے
اور بدلتا نہیں۔ وہ جو سود کے لیے قرض نہیں دیتا، اور بے گناہوں کو ستانے
کے لیے رشتہ نہیں لیتا وہ جو یہ کرتا ہے کبھی نہ ملے گا۔
حضرت سلیمان نے جہاں اشغال میں برے لوگوں کا چہرہ پیش فرمایا ہے وہاں یہ بھی ایک نشانی
دیا ہے۔

جو سود خوار سی اور ظلم سے اپنی دولت بڑھاتا ہے وہ اس کے لیے جو مسکینوں پر
رحم کرے بڑھتا ہے۔ (۸، ۹)

حضرت خرقہ ایل اپنی ربانی وحی میں اچھوں اور سچوں کے اعمال کی حکایہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں
اور کسی پر ستم نہیں کیا، اور قرض دار کا گرد و پیر دیا۔ اور ظلم سے کچھ چھین
نہیں لیا ہے۔ جس کو کوئی اپنی روٹی کھلاتی ہے اور نکلے کو کپڑے پہناتے ہیں۔ سود
پر نہیں دیا لیا اور بدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ (۴، ۵)

ظاہر ہے کہ ان انبیاء کی شریعت و قانون کا نام تورات ہے اس لیے اصل تورات میں سود

علی الاطلاق حرام تھا لیکن بعد میں یہودی فقہاء اور ان کے اصحاب کی ہاتھ کی صفائی نے اس میں تغیریں لگا دیں۔ اور سودی پر کیا موقوف ہے لین دین میں دیا ننداری کے جس قدر بھی دینی احکام ہیں یہودیوں وہ صرف اس لیے ہیں کہ اپنے آدمیوں کے ساتھ بد معاملگی نہ کی جاسکے لیکن اگر آدمی دوسرے مذہب اور گروہ کا ہو گا تو اس کے ساتھ سچائی اور دیانت داری سے پیش آنا کچھ ضروری نہیں۔ جس طرح بھی غیروں کا مال کھالیا جائے جائز ہے۔ گویا انہوں نے دین و صداقت کو اپنی نسل اور گروہ کا حق سمجھ لیا تھا۔ یہ قرآن نے اگر بتایا کہ دیانت تو ہر حال میں دیانت ہے اور خیانت ہر حال میں خیانت ہے۔

لوگوں کے اموال کو ناجائز طور پر کھانا

۲۴۰۔ اور اس وجہ سے بھی کہ وہ لوگوں کا مال ناجائز طور کھاتے تھے۔ اس فقرے کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ حاکموں کو رشوت دینے کو ناجائز فائدے اٹھاتے تھے، اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ لوگوں کی امانتوں میں خیانت کر کے لوگوں کا مال کھاتے۔ انفاذ میں اس قدر عزم ہے کہ اس کی افشاش میں ملنے کے وسائل آجاتے ہیں۔ اس فقرے میں قرآن نے یہود کے جرائم کی فہرست میں بتایا ہے کہ وہ ناجائز طریقہ پر لوگوں کا مال کھاتے تھے۔ اس فقرے میں ان تمام طریقوں کی جو لین دین میں ایسا ننداری کے خلاف ہیں داستان بیان کر دی ہے اور جن کی جزئیات کی کوئی حد نہیں ہے، یعنی وہ کسی کی چیز دھوکا اور فریب سے لیتے یا زور و ظلم سے لیتے، غصب کرتے، بھڑکی کرتے اس میں خیانت کرتے، رشوت لیتے غرض ہر ناجائز طریقہ سے دوسرے کا مال لیتے۔

آخر دی سزا

۲۴۱۔ اور ان میں سے کافروں کے لیے ہم نے دنیا تک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ دنیوی سزایان کرنے کے بعد اس فقرے میں ان کی آخرت والی سزایان پر دی ہے۔ مطلب یہ ہے یہودی کی اگلی پچھلی سخت سخت شرارتیں ذکر فرما کر جس سے ان کی نرسخی اور ان کا گناہوں پر دلیر ہونا ظاہر ہو گیا اب فرماتے ہیں کہ اسی واسطے ہم نے ان پر شریعت بھی سخت رکھی کہ ان کی سرکشی ٹوٹے تو اب شبہ زدہ ہو کر ستم طیبات تو ان پر تواریت میں کی گئی تھی، اور حضرت عیسیٰ کی مخالفت کرنا اور حضرت مریم پر جھٹ لگنا نازل تورات کے بعد میں ہوا تو سزا جرم سے کیسے مقدم ہو گی۔ اس تمام رکوع کا خلاصہ یہ ہوا کہ حضرت موسیٰ کے زمانہ سے اہل کتاب برابر ایک ایک نامہ شرارت، نافرمانی اور

عبد شکر، اور حضرات انبیاء کو ایذا رسانی کہتے چلے آتے ہیں۔ اب اگر اے محمد رسول اللہ تم سے
 علاوہ تو ریت جیسی کتاب و لغو و اصداف طلب کریں اور قرآن جو سب کتابوں سے افضل ہے اس پر
 کفایت ذکر کریں تو ان متعصب نادانوں سے کیا بعید ہے ان کی اس قسم کی ناشائستہ حرکات و چلچل
 ذکر اور تحقیر جو ان کی تمام حرکات چھوٹی بڑی انگو پھیلی ہم کو خوب معلوم ہیں۔ ہم نے بھی حسرت
 شریعت ان کے لیے دنیا میں رکھی اور آخرت میں عذاب عظیم ان کے لیے تیار کر رکھا ہے بلکہ
 مقصد یہ ہے کہ قرآن اور پیغمبر پر ایمان لائے ہیں جو چیزیں ان کے لیے مانع ہیں وہ حاصل
 ان کے یہ جرائم ہیں۔ یہ ہمیشہ سے گردن گردن کش اور نافرمان ہیں۔ انہوں نے اپنی سرکشی کے لیے
 اوپر علل و جزئی حرام کرائی ہیں اور اپنی سرکشی ہی کے سبب سے حق کی راہ میں روڑے بنے ہیں
 اور یہی چیز ہے جس سے ان کے تمام خدای کے سارے دروازے کھول دیے جن کا کردار یہ جو ان سے
 کس طرح توقع کرتے ہو کہ وہ کوئی بڑے سے بڑا معجزہ دیکھ کر قرآن پر ایمان لائیں گے فرمایا ان
 میں سے جتنے بھی کفر پر جم گئے ہیں ہم نے ان کے لیے دروازے عذاب تیار کر رکھا ہے بلکہ
 مقصد یہ ہے کہ اس قوم کے جو لوگ ایمان و طاعت سے محروم ہو چکے ہیں اور بھلائی و
 سرکشی کی روش پر قائم ہیں ان کے لیے خدا کی طرف سے دروازے تیار ہے۔ دنیا میں بھی اور
 آخرت میں بھی۔ دنیا میں جو جبر تنگ سزا ان کو مل رہی ہے وہ کبھی کسی دوسری قوم کو نہیں ملی ہے
 دو ہزار برس ہو چکے ہیں کہ زمین پر کہیں ان کو عزت کا ٹھکانا میسر نہیں۔ دنیا میں تہذیب و
 دیے گئے ہیں۔ اور ہر جگہ فریب الوطن ہیں۔ کوئی دور ایسا نہیں گزرتا جس میں وہ دنیا کے کسی
 خطے میں دولت کے ساتھ پامال نہ کیے جاتے ہیں۔ اور اپنی دولت مندی کے اوپر کوئی جگہ ایسی نہیں
 جہاں انہیں احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہو اور پھر غضب یہ ہے کہ قومیں پیدا ہوتی ہیں اور مشق
 ہیں مگر اس قوم کو کرم و محبت بھی نہیں آتی۔ اس کو دنیا میں لا یموت فیہا ولا یحیو کی سزا دی گئی ہے
 مگر قیامت تک دنیا کی قوموں کے لیے ایک زندہ نمونہ حیرت بنی ہے اور اپنی سرگزشت سے ہر سنی
 دیکھتی ہے کہ خدا کی کتاب بھل ہیں کہ خدا کے مقابلے میں باغیانہ جہاد میں کرنے کا یہ انجام ہوتا ہے
 رہی آخرت تو ان سوز و دلن کا عذاب اس سے بھی زیادہ دردناک ہو گا۔

اس آیت کے الفاظ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نبوی سزائیں تو عمومی اجتماعی ہوتی ہیں۔

نہ افادات شیخ الاسلام لے تدبر قرآن لکھ تفسیر القرآن

چنانچہ فلاں فتمتوں سے ساری قوم محروم کر دی گئی لیکن آخرت میں سزائیں تمام تر انفلوی اور شخصی حیثیت سے مٹتی ہیں۔ ہر ہر فرد اپنے اپنے اعمال کی سزا بھگتے گا۔ جہنم کا عذاب ایسا صرف ان ہی افراد کو چھوگا جو گمراہ ہوں گے۔

اہل کتاب کے علمائے برحقانی

۲۴۲ - مگر ہاں ان میں جو لوگ علم میں پختہ ہیں اور جو ایمان والے اس کتاب پر جو تم پر نازل ہوئی ہے اور اس پر جو تم سے پہلے نازل ہو چکی ہے ایمان رکھتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور خدا اور آخرت کو مانتے ہیں۔ ان کو ہم ضرور اجر عظیم دیں گے۔ یعنی بنی اسرائیل میں جن کا علم مضبوط ہے جیسے عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی اور جو لوگ صاحب ایمان ہیں وہ مانتے ہیں قرآن، توریت اور انجیل سب کو اور نماز کو قائم کرنے والوں کا تو کیا کہنا ہے اور دینے والے زکوٰۃ کے اور ایمان رکھنے والے اللہ پر اور قیامت پر اور ایسے لوگوں کو ہم اجر عظیم، بخلاف اول فریق کے کہ ان کے لیے سخت عذاب ہے۔

راسخین فی العلم سے مراد وہ علمائے جن کے قدم علم شریعت میں خوب جمے ہوئے تھے۔ علم میں طول و عرض اور عمق تینوں ہوتے ہیں، علم کا عمق ہی روشن کھاتا ہے، صحیح علم طول و عرض کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے روشن اور عمق کا نام ہے۔ اکتسابی اور علمی فنون چوتھو معنی انسانی دماغ کی تخلیقات ہیں اس لیے قطعی نہیں بلکہ ظنی ہیں اور ظنیات میں چونکہ یقین حاصل نہیں ہوتا اس لیے تحصیل یقین کی سعی میں دلائل اور تحقیقات کا طول خواہ مخواہ پیدا ہو جاتا ہے لیکن وحی کا علم قلس ہے وہ جتنا منظر طے سب سفر ہی سفر ہے۔ اس میں طول و عرض نہیں ہوتا۔ اس کی گہرائی بے اندازہ ہوتی ہے اس سے پہلے یہودیوں کے بارے میں یہ انکشاف کیا تھا ما لہم بہ من علمہ الاتباع الظن اب یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ ان یہودیوں میں کچھ ایسے ہیں جن کا علم ظنیات کا نہیں بلکہ علم میں روشن حاصل ہے۔ یعنی ان کا علم سطحی نہیں بلکہ عمیق علم حاصل ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم صلی چہرہ ان الفاظ میں پیش فرمایا اذلک اجرہم قلوباً و اعصاباً علما یہ لوگ دل کے بے حد نیک اور علم میں بڑے مگرے ہیں۔ علامہ شافعی فرماتے ہیں انہی نے المراتب

لے تفسیر مجدی لے افادات شیخ الاسلام

کے شریع میں تیرہ مقدمات رکھے ہیں ان میں ہر مقدمہ اہم اور ضروری ہے لیکن بارہواں مقدمہ سب سے زیادہ اہم گزرتا ہے جس پر علم ہمیشہ محقق اور راسخ فی العلم سے حاصل کرنا چاہیے۔ راسخ فی العلم کی نشانی یہ ہے کہ اس کے علم کا نسب نامہ صحیح ہو یعنی اس نے علم شیوخ کی زیر نگرانی حاصل کیا ہو محبت اور غلامت شیخ کو شیوخ علم میں بڑا دخل ہے اصحاب کا علم اسی طریق پر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ صحابیوں ایک قلیل صوالہ احد پر حصے والا مسئلہ توحید کو جس خوبی اور پختگی کے ساتھ سمجھا ہوا تھا۔ کچھ ہمدردا تیس پاروں کا حافظہ عالم بھی اس کا حشر حشر نہیں سمجھتا ہے۔ یہودیوں علماء کم دیتے بے شمار تھے لیکن شریعت ان کے لیے ایک ناقصی جہان کی حیثیت رکھتی تھی جس کو وہ پس کر بازاروں اور حرام میں نکال دیتے تھے۔ ان کے فکر و نظر اور قلب و روح سے علم کو کوئی تعلق نہ تھا۔ ہاں ابتر ان میں جو نفوس قدسی دین کی حیثیت سے آشنا تھے ان کے قدم علم شریعت میں راسخ تھے۔ یہاں ان ہی نفوس قدسی کو جو عام علماء یہود سے ممتاز کرنے کے لیے علماء سے نہیں بلکہ مباحثون فی العلم سے پیش کیا ہے یعنی یہ اندھی کے خس و خاشاک کی طرح ہوا کے رخ پر اڑنے والے نہیں ہیں بلکہ پتھروں کی طرح اپنے موقف حق پر جھنے والے ہیں۔

آیت میں المؤمنین سے مراد وہ سلیم الفطرت لوگ ہیں جو اگرچہ راسخین فی العلم کا درجہ تو نہیں رکھتے لیکن اپنی فطرت کی سلامتی، دل کی صلاحیت اور کردار کی پاکیزگی کے اعتبار سے تمام سوسائٹی میں ممتاز تھے اور یہود کے عام بگاڑ کے باوجود وہ خدا کی ہدایت و شریعت پر قائم رہے اور جب اسلام کی دعوت ان کے کانوں میں پڑی تو وہ اسے قبول کرنے کے لیے بھی آگے بڑھے۔ گویا ان کا علم راسخ اور ایمان ہی ان کی قیادت کر رہا تھا کہ دین کامل کو مانا جائے۔

تمام نبیوں کے واحد اور مستبرک دین کا اصل لا اصول دو باتیں ہیں توحید کامل اور رسالت عمومی، یعنی اللہ تعالیٰ کو ترمید کی تمام صفات میں کامل اللہ لا شریک ماننا اور اس کے تمام پیغمبروں کو یکساں صادق اوصاف سے تسلیم کرنا اور پس۔ اسی کا نام اسلام ہے جس نے اس اصول کو قبول نہیں کیا وہ آخرت میں گناہے میں ہے۔ ان یہودیوں کے دشمن علمی اور ایمان نے ان کو اس ہدایت نامہ کے قبول کرنے پر آمادہ کر دیا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کر تشریف لائے۔

اگرچہ شارحین قرآن نے ایسے یہودی علماء کے دور نبوت میں نام بھی بتائے ہیں لیکن الفاظ قرآنی عام ہیں اور قیامت تک کے لیے ہیں۔ اور یہود و نصاریٰ کی فلاح و نجات اسی کے ماننے پر منحصر ہے اسی لیے فرمایا یومنون بما نزل الیث و ما نزل من قبلہ یہ مبتدائی خبر ہے۔ یعنی یہ راسخین

فی السلم اللہ وسلم انظر لک اس قرآن پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور اس سے پہلی کتابوں کی ایمان رکھتے ہیں۔
اہل کتاب کا بھی گروہ ہے جس کی قرآن نے جگر جگر تعریف کی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جن آیتوں میں
یہ کہا گیا ہے کہ:

اب جو ایمان لاتے اور جو یہودی ہوتے اور نصرانی اور صابئی، جو بھی خدا اللہ پر آمین
پڑایمان لایا اور اس نے ایک کام کیا اس کو خوف و حرم نہ ہوگا۔

ان میں خدا پر ایمان لانے سے متصور ایمان کامل ہے اور اس کا یہ نشانہ ہرگز نہیں کہ یہود و نصاریٰ اپنے
موجودہ گروہ عقیدوں کے باوجود سکھات کے مستحق ہیں۔ قرآن نے ایمان کامل کا چہرہ پیش کیا ہے،
قل آمنّا بالله وما انزل علینا وما انزل علی ابراهیم واسماعیل واسحاق و
يعقوب والاسباط وما اوتی موسى وهیمن والنبیون من ربهم والاعمال

لفرق بین احد منهم ونحن لہ مسلمون۔

قرآن نے اس آیت میں ایمان کامل یہ بتایا ہے کہ خدا اور اس کے تمام رسولوں کو مانا جائے
کسی ایک کی تصدیق کرنی باقی سب کا انکار کر دینا یا سب کی تصدیق کرنی اور کسی ایک کا انکار کر دینا
ایمان کامل نہیں ہے۔ اس کے بعد ان اہل ایمان اور راہین فی العلم کی عملی زندگی پر تبصرہ کیا ہے۔ اور
اعمال میں اولیت نماز کو دی ہے اور نماز کی اہمیت کی وجہ سے عام انداز بیان چھوڑ کر اختصاصی اور
مدعی انداز اختیار کی ہے چنانچہ فرمایا: الم یقین الصلوٰۃ اور نماز قائم کرنے والے۔ عام تعبیر تو والنبیون
الصلوٰۃ ہوتا چاہیے مگر نہ اس کا حلف واللمؤمنون پر ہے لیکن نماز کی اہمیت اور زندگی میں اس کے
اختصاصی مقام کو اجاگر کرنے کے لیے یہ انداز اختیار کیا ہے۔ عربی زبان کا یہ قاعدہ ہے کہ جب کسی کی خصوصیت
اور امتیاز بیان متصور ہو رہی ہے تو اسے منصوب کر کے لاتے ہیں۔ شعرائے عرب کے کلام میں اس کی
بے شمار مثالیں ہیں۔ تبصیر کی اس تبدیلی کا قاعدہ یہ ہوتا ہے کہ عام انداز کو چھوڑ کر یہ خاص انداز سننے
والے کے لیے ایک طرف دلکش ہوتا ہے اور دوسری طرف بغیر کسی اضافے کے محض تبدیلی سے اس میں
اختصاص کی روح پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ گویا ان کی جن کے اوصاف بیان ہو رہے ہیں غیر معمولی تعریف ہو گئی۔
خاص شارحین قرآن نے اپنے ترجمہ میں بھی اس کی رعایت کی ہے مثلاً شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں۔ مدح
کی کلمہ بڑا و ازندگان نمازدار، اور شاہ عبدالقدور فرماتے ہیں اور آخرین نماز قائم کرنے والوں کو۔ نماز اور
زکوٰۃ میں چوٹی و امان کا ساتھ ہے اس لیے ان کی عملی زندگی کے تذکرے میں نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا
تذکرہ کیا۔ آخر میں واللمؤمنون باللہ والیوم الآخر کا مقام وہی ہے جو اللہ البقرہ کے شروع میں

و بالآخرۃ ہمدیوقنون کا ہے۔ جس طرح وہاں یہ منون بالغیب اور دوسری صفات کے ذکر کے بعد یقینِ آخرت کو بیان کیا، کیونکہ آخرت پر یقین اس زندگی میں تمام غیر اور تقویٰ کا (اصلی محرک ہے اسی طرح یہاں بھی آخرت کی تذکیر کے لیے اس کا اعادہ فرما دیا۔ کیونکہ تمام دینی زندگی کی اصلی بنیاد ایمان بالآخرت ہے۔

إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَى نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِنْ
بَعْدِهِ ؕ وَأَوْحَيْنَا إِلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ
يَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ وَعَيْنِيَ وَآيُوبَ وَيُونُسَ وَ
هَارُونَ وَسُلَيْمَانَ ؕ وَاتَّبَعْنَا دَاوُدَ زَبُورًا ۖ وَرُسُلًا
قَدْ فَصَّصْنَا عَنْكَ مِنْ قَبْلُ ؕ رُسُلًا لَمْ تَقْصُصْهُمْ
عَلَيْكَ ؕ وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَى تَكْلِيمًا ۖ رُسُلًا مُبَشِّرِينَ وَ
مُنذِرِينَ لِيَتْلُوَ النَّاسُ عَلَى اللَّهِ حُجَّةً بَعْدَ
الرُّسُلِ ؕ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ۖ لَكِنَّ اللَّهَ يَشْهَدُ
بِمَا أَنْزَلَ إِلَيْكَ أَنْزَلَهُ بِعِلْمِهِ ؕ وَالْمَلَكُ يَشْهَدُونَ
وَكَفَى بِاللَّهِ شَهِيدًا ۖ

اے پیغمبر ہم نے تمہاری طرف اسی طرح وحی بھیجی ہے، جس طرح
نوح اور اس کے بعد کے پیغمبروں کو روانہ کی تھی اور ہم نے ہی

ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولاد یعقوب، جیسی، ایوب، یونس، یارون اور سلیمان کی طرف وحی روانہ کی تھی، اور ہم نے ہی داؤد کو زبور دی۔^{۲۳۳} اور خدا کے وہ رسول جن کا حال ہم قرآن میں پہلے سنا چکے ہیں اور وہ جن کا حال ہم نے تمہیں نہیں سنایا اور اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا جیسا کہ واقعی طور پر کلام ہوتا ہے۔^{۲۳۵} یہ تمام رسول خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے تھے تاکہ ان کو روانہ کر دینے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی جھٹ نہ رہے اور اللہ بہر حال غالب رہنے والا اور حکیم و دانا ہے۔^{۲۳۶} (لوگ نہیں مانتے تو نہ مانیں) مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ جو کچھ اس نے تم پر نازل کیا ہے اپنے علم سے نازل کیا ہے اور اس پر فرشتے بھی گواہ ہیں، اور اللہ کی گواہی بس کرتی ہے۔^{۲۳۷}

انبیاء میں حضور انور کا مقام

یہودیوں کے اسی گروہ نے اعتراف کیا کہ آسمان سے ایک نیکو کتاب نہیں اتاری پہلے انہی

جواب دیا تھا اب اس نیت میں اس کا تحقیق بحساب دیا جا رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ یہ سوال بے اثر رہا اور
 ہے کیونکہ نبیؐ اُسے کہتے ہیں جس پر اللہ کی وحی آئے اُسے نہیں کہتے جو آسمان سے کتاب لے کر آئے۔ یہ
 ہے عوامی جو تواریخ کی مشہور شخصیات ہیں۔ ان میں سے کسی پر بھی ایسی کتاب نازل نہیں ہوتی کیونکہ
 ایسا ہر ناسمجھ الہی کے خلاف ہے۔ جس طرح خدا نے ہمیشہ نبیوں کو اپنی وحی سے مخاطب کیا ہے
 اسی طرح حضورؐ نور علیہ وسلم وحی الہی سے مخاطب ہوتے ہیں۔ امام بخاری نے اپنی تصحیح میں یہ
 حوالہ قائم کر کے باب کیف کان ہذا الوحی الامر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام آیات قرآن
 میں سے اس آیت کا انتخاب بھی کھانے کے لیے کیا ہے کہ نبی وہ گرامی قدر شخصیت ہوتا ہے جس کے
 پاس اللہ کی وحی آئے اور صرف اتنی بات نہیں بلکہ آیت کے انتخاب سے یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ انبیاء
 دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ۱۔ انبیاء موسین اور انبیاء مجددین۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق
 قسم اول سے ہے۔ اور اس آیت کے ذیلے پر بھی سمجھایا ہے کہ اللہ کا دین ہمیشہ اپنے اصول اور اپنی بنیادی
 تعلیمات میں ایک ہی رہا ہے۔ اس دین کے جو مختلف ایدین الگ الگ شریعتوں کی شکل میں نازل
 کئے آغا سے لے کر نزول قرآن تک آتے رہے ہیں، ان کی ظاہری صورتوں اور ان کی تفصیلات میں تو
 جغرافیائی، تمدنی، نسلی اور قومی حالات اور زمانے کے تقاضوں کے اختلاف کی بنا پر فرق ضرور ہو سکتا
 تھا۔ لیکن ان کی روح اور ان کے اصول و مبادی میں کسی فرق کا سوال خارج از بحث ہے۔ اور حضورؐ نور
 صلی اللہ علیہ وسلم کو مشہور اور انبیاء کو مشہور قرار دینے کے لیے بھی سمجھایا ہے کہ جو کلمات فرد فرداً سب میں
 تھے ان کا مجموعہ حضورؐ نور صلی اللہ علیہ وسلم میں سب کے وہ کلمات جو ان انبیاء میں انفرادی طور
 پر موجود تھے انھوں کو جمع میں مل گیا کہ تمام انبیاء موسین میں حضرت نوح اور ابراہیم کا تو دوسری طرف
 انبیاء مجددین میں حضرت اسماعیل، اسحاق، یعقوب، حضرت عیسیٰ، حضرت یونس، حضرت یونس،
 حضرت ہارون، حضرت سلیمان، حضرت داؤد اور حضرت موسیٰ کا ذکر کر کے بتا دیا ہے کہ وہ کلمات
 روحانی، مادی جو ان میں الگ موجود تھے وہ سب حضورؐ نور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی میں موجود تھے۔

۳۴۳۔ ۳۴۴۔ اے پیغمبرؐ ہم نے تمہاری طرف اسی طرح وحی روانہ کی ہے۔ اہل کتاب اور مشرکین
 ملکہ جملہ کفار قرآن مجید کی کفایت اور صداقت میں طرح طرح سے یہود و مشرک پیدا کرتے تھے۔ اس
 موقع پر بھی کہہ دیا کہ جیسے تدریت سب کی سب ایک دفعہ اتنی تھی ایسے ہی تم بھی ایک کتاب آسمان
 سے لاؤ تو ہم تم کو سچا جانیں۔ بقول شخصے خدائے بدراہمانہ بسیار، سو حق تعالیٰ نے اس جگہ چند آیتیں
 نازل فرما کر اس کی حقیقت واضح کر دی۔ اور وحی کی عظمت اور کفار کے سب خیالات اور شبہات

یہودہ کو روکا اور وحی الہی کی متابعت کو عامرہ اور قرآن مجید کی اطاعت کو خصوصاً بیان فرما کر بتلا دیا کہ حکم الہی کا ماننا سب پر فرض ہے۔ کسی کا کوئی خدا اس میں نہیں مل سکتا جو اس کو تسلیم کر لے میں تزلزل یا تامل کرے یا انکار کرے وہ گمراہ اور بے دین ہے۔ اب یہاں سے مختصری جواب دیا جا رہا ہے۔

وحی اور اس کی عظمت

ایکجا کا لفظ بول کر یہ بتانا مقصود ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کوئی الٰہ نہیں اور عجب چیز ہے کہ نہیں اسے جو پہلے کسی ذاتی ہو۔ آپ کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ میں دُنیا میں ایکلاہ پتھر کی کرتا ہوں، بلکہ دراصل وہ بھی اسی منبع علم سے فیض یاب ہوئے ہیں جن سے آپ سے پہلے انبیا فیض یاب ہوتے تھے ہیں اور وہ اللہ کی وحی ہے۔ وحی کے لغوی معنی کسی کا اپنے دل یا فہم کو لہجہ میں پیش کیے بغیر اخفا اور ہستگی سے دوسرے پر ظاہر کر دینا ہیں اور اصطلاحاً اس کے معنی خدا کا اپنے دل یا فہم سے اپنے خاص بندوں کو کسی طبیعی ذریعہ سے مطلع کرنا ہیں۔ یہ علم و اطلاع کے روحانی ذریعوں کی آخری سرحد ہے۔

جس طرح علم کی تین مادی قسمیں وجدانیات، حیات اور بدیہیات عام انسانوں کے لیے یقینی ہیں۔ اسی طرح روحانی ذرائع کے یہ تین شعبے کشف، الہام اور وحی انبیاء علیہم السلام کے لیے یقینی ہیں۔ اور جس طرح علم کے مادی ذرائع ہیں سے یقین کا سبب پہلا ذریعہ وہ ہے جو تمام مادی ہے یعنی وجدان جس طرح ظاہر اور پھر بدیہیات۔ اسی طرح علم کے روحانی واسطوں میں سب سے زیادہ یقینی وہ ہے جو تمام تر روحانی ہے یعنی وحی پھر الہام پھر کشف۔ ہم نے علم کے ذرائع کی جو تین قسمیں کی ہیں یعنی وحی، الہام اور کشف۔ یہ قرآن پاک کی اصطلاحیں نہیں ہیں۔ قرآن کی اصطلاح میں روحانی ذریعہ علم کا نام مکالمہ الہی ہے اور اس کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ وحی (اشارہ) بات کرنا یعنی دل میں کسی معنی کا بغیر آواز اور الفاظ کے آہا۔

۲۔ خدا کا پرے کے چہرے سے بات کرنا۔

۳۔ خدا کا فرشتے کے ذریعہ سے بات کرنا۔ یعنی فرشتہ خدا کا پیغام لے کر آتا ہے۔ وہ وحی پر وحی کرتا ہے جن کو نبی سن کر محفوظ کر لیتا ہے۔ اسی کو عام طور سے وحی کہتے ہیں کیونکہ قرآن پاک

کا نزول اسی آخری طریقہ سے ہوا ہے لیکن اس شہرت عام کے بغیر یہ نہیں ہیں کہ وہ اور دوسرے طریقے وحی کی قسمیں نہیں ہیں۔ مگر اللہ کے یہ تینوں طریقے وحی کی یہ تین مختلف قسمیں بھی ہیں اور پھر ان میں ہر ایک کا شہرت نام بھی وحی ہے یعنی یہ قسم بھی ہے اور اپنی تین قسموں میں سے بھی ایک پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

وحی کی آواز

حدیث عائشہ میں ہے کہ کبھی تو یہ صمدت ہوتی ہے کہ وحی آتی ہے تو مجھے ایک گھنٹی کی سی آواز آتی ہے اور یہ قسم محمد پر شدید ہوتی ہے۔ اور حضرت عمر فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آتی تھی تو آپ کے رونے اور سکے پاس ایک ایسی آواز محسوس ہوتی تھی جیسے شہد کی گھنٹیوں کے بجن بھانے کی ہوتی ہے۔ ان دونوں پر اگر آپ غور کریں گے تو معلوم ہو گا کہ اصل غرض سب جگہ ایک ہی ہے بھیرا بھیرا بھانے کی آواز بھی گھنٹہ کی آواز کی طرح ایک گونج رکھتی ہے۔ اس میں بھی سننے والے کو کسی خاص جہت کا ادراک نہیں ہوتا اور یہاں بھی انسانی کلام کے برخلاف مبداء اور متصل یعنی آغاز و انجام الگ الگ نمایاں محسوس نہیں ہوتے بلکہ ایک بیضا اور مسلسل آواز محسوس ہوتی ہے اور یہ عجیب بات ہے کہ جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آواز کو تشبیہ وحی تو گھنٹے کی آواز سے تشبیہ دی اور جب حضرت عمر نے اس کو تشبیہ وحی تو شہد کی گھنٹیوں کی بجن بھانے سے دی۔ غلغلے کے گھنٹے کی آواز اگرچہ ایک ناخوشگوار آواز ہے مگر وحی کو اس کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے کہ وہ بھی ایک بیضا آواز ہے اور بے جہت سنی جاتی ہے گھنٹیوں کی بھانے کی جتنی جہت سے بھی اسی قسم کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ ان دونوں تشبیہوں پر غور فرمائیے۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ دونوں ایک ہی حقیقت کی ترجمانی کر رہی ہیں۔ فرق ہے تو صرف یہ کہ صاحب وحی کو وہ آواز کچھ تیز محسوس ہوتی ہے اور سامعین میں سے کسی کو اس فیہی آواز کے سننے کی سعادت نصیب ہوتی ہے۔ ان کو خفیف اور ہلکی محسوس ہوتی ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وحی کی حقیقت خواب و خیال سے بالکل بالاتر ہے خواب کا سارا قاتل صرف سونے والے تک محدود ہوتا ہے اور یہاں آثار وحی سننے والوں پر بھی درجہ بدرجہ نودار ہوتے تھے حتیٰ کہ بعض اوقات وحی کی بے کیف آواز کا ادراک بھی ہوتا تھا۔ چنانچہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نزول وحی کے وقت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم یا متاثر نہ ہوتے تھے بلکہ وحی کی آمد کے وقت اگر آپ کا جسم اقدس کسی دوسرے کے جسم کے ساتھ فدا متصل ہو جاتا تو وہ بھی وحی کی غفلت سے پس پس جاتا تھا۔ بخاری میں ہے :

سبل بن سعد ساعدی کہتے ہیں کہ میں نے مروان کو مسجد میں بیٹھا دیکھا تو میں ان

کی طرف متوجہ ہوا۔ انہوں نے دنیا کو زیر بن ثابت نے ان سے بیان کیا ہے کہ حضور اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت قرآنی لا یستوی القاصدون من المؤمنین وللمجاهدین
فی سبیل اللہ مجھے اٹھا کر لے گئے تھے کہ عبد اللہ ابن ام کثرم آگئے۔ انہوں نے کہا کہ
یا رسول اللہ! اگر میں جہاد کر سکتا تو ضرور جہاد کرتا۔ عبد اللہ ابن ام کثرم نے بیان کیا
ان کی اس معذرت پیش کرنے پر اللہ نے آیت کا یہ حشر اپنے رسول پر نازل فرمایا
غیر ذلک الا نذر، اس وقت آپ کی ران میری ران سے مل گئی ہوتی تھی۔ یہ کربلا پر آنا دوزخ
پر ڈاکریوں محسوس ہوا کہ اب چہرا ہوتی۔

دوسرے جتنے کہ سب وحی میں آتے ہوتے ایک کلمہ کا وزن زیر بن ثابت کو نامحسوس ہوا کہ
روح پر یہ کلمہ نازل ہوا تھا ان کو اس کا وزن کتنا محسوس ہوا ہو گا اور پھر اندازہ کرنا چاہیے کہ جن پر پورا
قرآن نازل ہوا ہے ان کو عام انسانوں سے کتنا امتیاز ہو گا۔

علمی ذرائع میں وحی کا مقام

وحی علم کا ایک ایسا ذریعہ ہے جو اللہ کی جانب سے انبیاء کو عطا کیا جاتا ہے یہ نہ تخلیقی ہے اور نہ
کبھی۔ عام انسان میں حواس اور مشاعر علم کا ذریعہ ہوتے ہیں لیکن انبیاء میں حواس اور مشاعر سے بالا وحی
علم کا ذریعہ ہوتا ہے۔

یوں سمجھو کہ مخلوقات میں جیسے علمی ذرائع کا ایک ارتقا فی سلسلہ قائم ہے۔ جمادات بے حس ہیں لیکن
نباتات میں قوت احساس موجود ہے۔ حیوانات میں احساسات کے ساتھ کچھ مشاعر بھی کار فرما ہیں۔ انسان
احساس اور شعور کے کالات کا انور ہے، ایسے ہی انسانوں میں انبیاء کو احساس و مشاعر سے بالا ایک ایسی
قوت دی جاتی ہے جو عام انسانوں کو نہیں ملتی۔ حواس صرف مادیات کی دریافت کا ذریعہ نہیں مشاعر
مادیات سے آگے ذہنیات اور عقلیات کا اور رک کرتے ہیں اور وحی ذہنیات و عقلیات سے بالاتر
جلیبہ معلوم کرنے کا راستہ ہے۔

اس ذریعہ میں غور و بحث، منطقیانہ فکر و منظر اور ترتیب، مقدمات کی ضرورت نہیں پڑتی،
بلکہ حقائق اس طرح سامنے آتے ہیں جیسے وجدانیات، فطریات، بدیہیات اور محسوسات۔
چونکہ اللہ سبحانہ انبیاء کو ایک نئے ذریعہ سے علم عطا کرتا ہے اس لیے اس کا نام بھی عام ذرائع سے
الگ وحی رکھا ہے۔ عربی میں وحی کے معنی ایسا اور اشارے کچھ یہ گویا اللہ سبحانہ کا وہ اشارہ ہے

جو نبوت پر حقائق غیبیہ کے ادراک کی راہ کھول دیتا ہے۔ اسی کو امام رازی کی زبان میں مگر نبوت مجددانہ ثانی کی زبان میں نور نبوت اور علامہ اقبال کی اصطلاح میں تصور نبوت کہتے ہیں۔
مجددانہ ثانی فرماتے ہیں،

جیسے عقل کا مقام حواس سے بالا ہے کہ جن چیزوں تک ہم حواس کے ذریعہ رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ عقل کے ذریعے کر سکتے ہیں، ایسے ہی نبوت کا مقام عقل سے بالا ہے، جہاں عقل کی رسائی نہیں ہے نور نبوت کے ذریعے اس کا ادراک ہو جاتا ہے۔

اور ساتھ ہی مجدد صاحب نے طلیف الکشاف بھی فرمایا ہے کہ جو شخص عقل و حواس بھی کو علمی ذریعہ مانتا ہے اور اس کے سوا کسی علمی ذریعہ کو نہیں مانتا درحقیقت وہ نور نبوت کا منکر ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے مخصوص انداز میں یوں پیش کیا ہے جسے ہم نے شور نبوت سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس شخص کی موجودگی میں ذوقِ اقدس کو خود کسی چیز پر حکم لگانا پڑے گا، ان کے سامنے یہ سوال ہو گا کہ ان کی پسند کیا ہوا، ناپسند کیا ہو۔ ان کو یہ بھی سوچنے کی ضرورت نہ ہو گی کہ وہ اپنے لیے کیا راہ عقل اختیار کریں۔ یہ سب باتیں گویا پہلے ہی طے شدہ ہوں گی، یہ نہیں کہ ان کو اس بات میں خود اپنے فکر اور انتخاب سے تعبیر کرنا چاہیے۔ کیونکہ وحی الی الواقع حقیقت سے بالا ایک ایسے ذریعہ کا نام ہے جس میں وجدان نہیں مگر تمام حقائق ہوتا ہے خواہ یہ بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ، آواز کے ساتھ ہو یا بغیر آواز کے حصولِ علم کی حد تک نبوت کے عرفان کی دنیا ایسی ہی حقیقی اور واقعی ہوتی ہے جیسے ہمارے مشاہدات کی بلے صرف اس لیے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ اس کی اہمیت اور اس سے نہیں ہوتی۔ یہ کوئی غیر شخصی قسم کا وجدان نہیں بلکہ حقیقی اور واقعی عرفان کا نام ہے۔

امام غزالی فرماتے ہیں آدمی کے اطوار میں جیسے عقل معنویات کے ادراک کا ایک ذریعہ ہے۔ ایسے ہی نبوت بھی ایک طور ہے جس کے نور سے صاحبِ نبوت حقائق غیبیہ اور عقل سے بالا امور کا ادراک کر لیتا ہے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ کی طرف نگاہ ہی اس قسم کے مواقع پر بہت بڑی رہنمائی کرتی ہے وہ فرماتے ہیں۔ انسان کا کوئی عقلی اقتدار صرف صورتِ نوع کے لحاظ سے معارفِ الہیہ کے بغیر پایہ کمال کو نہیں پہنچ سکتا ہے۔ اس لیے حکمتِ الہی نے کچھ شخصیتوں کی عقلیت کو ایسا صاف پاکیزہ اور بلند تر بنا دیا ہے کہ جن میں حقائق غیبیہ کے ادراک کی پوری پوری قابلیت رکھی ہے۔ یہ عظیم المرتبت شخصیت باوجود الہی سے علوم کا فیضان لے کر آتی ہے اور انسانوں تک پہنچاتی ہے۔ اور انسانی زندگی اس کی بے چون و چرا اطاعت کرتی ہے۔ اس کی حیثیت انسانوں میں ٹھیک ٹھیک وہی ہے جو شہد کی

کیموں میں میسر ہے کہ ہر قسم کے اگر سلسلہ وحی نہ ہوتا تو فروع انسانی اس درجہ کمال کو نہ پا سکتی جو تقدیر الہی نے اس کے لیے مقرر کیا ہے گویا انسانوں میں وحی و نبوت فروع انسانی کے ارتقاء کی انہی کڑی ہے۔

یہی بات مولانا آزاد نے اپنے مخصوص خطبہ انداز میں اس طرح سمجھائی ہے جو ان لوگوں کی عقلی زندگی کا تعلق ہے عقل کی ہدایت نہ تو ہر حال میں کافی ہے اور نہ ہر حال میں مؤثر، نفس انسانی طرح طرح کے خواہشوں اور جذبول میں کچھ اس طرح منحرب ہے کہ جب کبھی عقل اور جذبات میں کشمکش ہوتی ہے تو اکثر حالات میں فتح جذبات کی ہوتی ہے۔ بسا اوقات عقل ہمیں یقین دلاتی ہے کہ غفلان کام نقصان رسان اور تباہ کن ہے لیکن جذبات ہمیں ترغیب دیتے ہیں اور ہم اس کے ارتکاب سے باز نہیں آتے۔ وہاں کے ساتھ اگر حواس کی ہدایت ضروری ہے اور اگر حواس کے ساتھ عقل کی ہدایت، کیونکہ اس کی ہدایت ایک خاص حد سے آگے نہ بڑھ سکتی تھی تو کیا یہ ضروری نہ تھا کہ عقل کے ساتھ کچھ اور بھی ملے کیونکہ عقل کی ہدایت بھی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی تھی اور عقل کی درستگی مانضہ لوگ لے کافی نہیں ہے مگر اس لیے وہاں کے ساتھ حواس کی غلطیوں میں غلطیوں کی لغزشوں میں نگرانی کا کام کریں۔ اور اگر حواس کے ساتھ عقل بھی دی ہو تو حواس کی غلطیوں میں غلطیوں اور قاضی و حاکم کا کام کرے تو کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ عقل کے ساتھ کچھ اور بھی دیا جائے کہ عقل کی دراندازیوں میں رہنما اور فیصلہ کن ہو۔ قرآن بتاتا ہے کہ خود خدا اور اسی لیے انسان کے لیے ایک چوتھے مرتبہ ہدایت کا بھی سامان کر دیا۔ اسی مرتبہ ہدایت کا نام وحی ہے۔

الفرض وحی و نبوت کا مقام عقل و فکر سے بالا ہے اور جیسے وحی کا مقام عقل سے بالا ہے ایسے ہی نبوت کا مقام ولایت سے بالا ہے۔ ولایت میں صرف وہاں ہوتا ہے اور اس میں غلطی کا احتمال ہے۔ اسی لیے ولی کے الہام میں دلیل و حجت ہونے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس نبوت مقام عرفان پر گامزن ہوتی ہے جس میں غلطی کا کوئی احتمال نہیں ہوتا۔

وحی اور فکر جدید

وحی سے متعلق فکر جدید نے ماویت اور فلسفہ کے دباؤ سے پہلے پہلے انکار کی راہ اختیار کی اور اس پر کبھی تھامت کی خرافات اور کبھی عصبی بیماری کی بھینٹ کھائی، لیکن یورپ کے محققین جیسے کہ فریڈرک نے دائرۃ المعارف الاسلامیہ میں بتایا ہے۔ وحی کے بارے میں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ وحی خود رُوح انسانی کی تسکینات میں سے ایک تسکین ہے جو انسان پر ظاہر ہو کر انسان کو معلومات فراہم کرتی ہے۔

ان کا مرتف یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کی ذات گرامی قید مکان سے منزہ ہے اور ملائکہ میں اللہ سے ہمکلامی اور اس سے کچھ سننے کے لیے اللہ کے لیے قید مکان کا اقرار ہے۔

در اصل انسان کی فکری نگاہوں کا سرچشمہ یہ ہے کہ وہ یا تو عقل و بینش سے کوڑا ہو جاتا ہے کہ ہر بات کچھ بیزبان لیتا ہے یا پھر فزانیکی اور عقلیت کا اس طرح غلط استعمال کرتا ہے کہ جہاں کوئی حقیقت اس کی شعلہ کی بجائے ہلاکت دہی۔ اس نے فزانیکی کی حقیقت کے اثبات و دھوکہ کا سارا دار و مدار صرف اس پر ہے کہ ایک شخص کی سمجھ اس کا ادراک کر سکتی ہے یا نہیں۔ دونوں علم و بصیرت کے خلاف اور دونوں کا نتیجہ عقل و بینش سے محرومی اور عقل ترقی کا فقدان ہے۔ اگر فرشتوں پر وحی آئے کی اور نہ حضور پر وحی آئے کی وہ فطرتاً ہی ہوئی جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمائی ہے تو ان پر اللہ سبحانہ کی منزل پر مشکف ہو جاتی۔

فی الواقع وحی کا معاملہ ان حقائق غیبیہ سے تعلق رکھتا ہے جس کے لیے ہماری تعبیرات کام نہیں لے سکتی ہیں۔ ہماری ہر تعبیر کسی ایسی حالت کا تصور پیدا کرے گی جو عام طور پر ہمیں پیش آتی رہتی ہیں۔ وحی ہمارے محسوسات و مضبوطی کے دائرے سے باہر ہے اور انسان کی ساری دریاغذگی یہی ہے کہ وہ حقائق غیبیہ کو اپنے معیار خیال سے تولنا چاہتا ہے، اور اس کے لیے مقدمات بناتا رہتا ہے حالانکہ حقائق غیبیہ اس کے ترتیب دیے ہوئے سارے مقدمات میں اس کے لیے ٹھوکر دوں پر ٹھوکر کی ہیں کیونکہ وہ جتنے مقدمات بناتا ہے اپنے احساس و ادراک کے اندر رکھتا ہے اور طبیعت حقائق اس دائرے کی رسائی سے بالا ہیں۔ نبوت کی دعوت حقائق غیبیہ کو ماننے کی ہے جاننے کی نہیں۔

وحی کی آمدنی کیفیت

اسی بنا پر حضرت ام بخاری اپنی صبح کے آغاز میں وحی کی آمدنی کیفیت سے متعلق یہ حدیث عائشہ لائے ہیں۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ عمارت بن ہشام نے حضور اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ آپ پر وحی کیسے آتی ہے حضور اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا گاہ گاہ وحی آتی ہے مجھ پر گھنٹے کی جھنکار کی طرح اور یہ مجھ پر سب سے زیادہ بھاری ہوتی ہے۔ پھر جب یہ پوری ہو جاتی ہے تو مجھے وہ سب محفوظ ہوتا ہے جو اس نے کہا ہوتا ہے اور کبھی کبھار فرشتہ آدمی کی صورت میں آتا ہے اور مجھ

ہمکلام ہوتا ہے۔ میں اس کی سلامی بات کو یاد کرتا ہوں۔

امام بخاریؒ اس حدیث کے ذریعے اپنے مخاطبوں کو یہ بات بتاتی ہے کہ وہی ایک غیبی مسلمان ہے اور یہ مسلمان ذریعہ ہمارے ادراک کی دسترس سے باہر ہے۔ ہم جو کچھ جان سکتے ہیں وہ وہی نہیں بلکہ وہی کی آدمی کیفیت ہے اور وہ بھی صرف تخیل کے وسیع میں۔ اصل یہ ہے کہ جس حالت و کیفیت سے انسان دوچار نہیں ہوتا، اس کی حقیقت کا بھی ادراک نہیں کر سکتا۔ وہی بھی ان حالات میں سے ایک حالت ہے جو صرف خاصہ نبوت ہے۔ اس کا ادراک وہی کر سکتا ہے جو اس سے دوچار ہو، اس لیے وہی کو علمی طور پر سمجھنے کے لیے صرف تخیل کے دائرے میں گنت گھر کر سکتی ہے اور معلوم ہے کہ تشبیہ و تخیل سے کسی چیز کی حقیقت معلوم نہیں ہوتی۔

یہاں وہی کو بتانے کے لیے صلی اللہ علیہ وسلم کی جھلکار کی تعبیر آتی ہے۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعبیر اس حالت کو مثلاً قائم کرنے کے لیے ہے جو وہی کی آمد کے وقت حضورؐ اور صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آتی تھی یعنی وہی چونکہ عالم غیب سے تعلق رکھنے والا ذریعہ علم کا نام ہے۔ اس عالم سے جس قوت کا تعلق پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے تو اس قوت کو دنیا کی تمام چیزوں سے بے تعلق کر دیا جاتا ہے۔ وہی چونکہ عالم غیب سے آتی ہے، اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قوتِ سامعہ کو ایک خاص جھلکار کے ذریعہ تمام وغیرہ علاقے سے بیگانہ کر کے حفظ وہی کے لیے تیار کر دیا جاتا ہے اس طرح حضورؐ اور صلی اللہ علیہ وسلم پر وہی کے ذریعے علوم الہیہ کا نزول ہوتا تھا۔

وہی کی شدت اور گرانی

وہی کی اس قسم کا جیسے حضورؐ اور صلی اللہ علیہ وسلم نے گھنڈ کی آواز سے تشبیہ دی ہے، خود حضورؐ نے اشدہ علی سے تعارف کرایا ہے یعنی وہی کی یہ قسم مجھ پر سب سے زیادہ بیماری ہوتی ہے۔ گرانی اور سنگینی کی وجہ یہ نہیں ہے کہ معانی کے سمجھنے میں وقت ہوتی ہے بلکہ اصلی وجہ یہ ہے کہ عالم غیب کی جو چیز بھی عالم شہادت میں واسطوں کے ساتھ آتی ہے۔ اس میں خفت اور آسانی ہوتی ہے اور عالم غیب کی جو چیز براہِ راست یا واسطوں کی کمی کے ساتھ آتی ہے اس میں زیادہ شدت اور گرانی ہوتی ہے سورج کی گرمی جہت سے پردوں اور بہت بڑی مسافت کے بعد اس قابل ہوتی ہے کہ ہم اس سے فائدہ اٹھا سکیں الغرض عالم غیب کی ہر چیز عالم شہادت میں واسطوں کے ساتھ پہنچتی ہے لیکن صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں حضورؐ اور صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وہی آتی ہے اس میں چونکہ حضورؐ اور

صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچنے میں کوئی واسطہ نہیں ہوتا اس لیے اس میں زیادہ سنگینی ہوتی ہے۔ علامہ ابنِ کثیرؒ نے اس صورت کے فیصلہ پر لکھا ہے کہ اس میں نبی کی بشریت مغلوب اور فرشتہ کی ملکیت غالب ہو جاتی ہے یعنی وحی کے اس صحت میں شدید ہونے کی وجہ یہ ہے کہ پیغمبر کی جمہانیت ایک بشری جمہانیت ہے اور جبریل کی جمہانیت ایک ملکی جمہانیت ہے۔ یہی کی بشری جمہانیت پر فرشتہ کی ملکی جمہانیت کا غلبہ ہو جاتا ہے۔

دراصل اللہ سبحانہ کی وحی ایک عظیم الشان ذمہ داری اور انسانی کمال کا آخری درجہ ہے۔ اس کا بوجھ برداشت کرنا بے حدود و شمار ہے۔ اللہ سبحانہ کی وحی ہماری قوت برداشت اور اس کی بخشی ہوئی توفیق ہی ہے جس کے صدقہ وحی کی امانت نبوت کے سینے میں محفوظ ہوئی ہے۔

حضور انور کی شانِ جمہانیت

۲۴۴۔ جس طرح نوح اور اس کے بعد پیغمبروں کی طرف وحی کی آمد جیسے ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور اولادِ یعقوبؑ، عیسیٰؑ، ایوبؑ، یونسؑ، ہارونؑ اور سلیمانؑ کی طرف وحی عطا کی تھی اور ہم نے داؤدؑ کو زبور دی۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ وحی خاص اللہ کا حکم اور اس کا پیام ہے جو انبیاء پر بھیجا جاتا ہے۔ اور انبیاء سابقین پر جیسے اللہ کی وحی نازل ہوئی ویسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی بھیجی۔ لہذا جس نے اس کو مانا اس کو بھی ضرور ماننا چاہیے اور جس نے اس کا انکار کیا گویا ان سب کا منکر ہو گیا۔ حضرت نوح اور ان سے پہلوں کے ساتھ مشابہت کی شاید یہ وجہ ہو کہ حضرت آدمؑ کے وقت سے جو وحی شراعت ہوتی تو اس وقت بالکل اجتہادی حالت تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام پر اس کی تکمیل ہو گئی گویا اول حالت تعلیمی حالت تھی، حضرت نوح کے زمانے میں وہ حالت پوری ہو کر اس قابل ہو گئی کہ ان کا امتحان لیا جائے اور فرمانبرداروں کو انعام اور نافرمانوں کو سزا دی جائے۔ چنانچہ انبیاء اولوالعزم کا سلسلہ بھی حضرت نوح علیہ السلام سے ہی شروع ہوا اور وحی الہی سے سزا کی کرنے پر بھی اولیٰ خدا حضرت نوح کے وقت سے شروع ہوا۔ خلاصہ یہ کہ پہلے حکم الہی اور انبیاء کی مخالفت پر عذاب الہی نازل نہیں ہوتا تھا بلکہ ان کو معذور سمجھ کر ان کو ڈھیل دی جاتی تھی اور سمجھانے ہی کی کوشش کی جاتی تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں جب مذہبی تعلیم خوب ظاہر ہو چکی اور لوگوں کو حکم خداوندی کی متابعت کرنے میں کوئی تخلف باقی نہ رہا تو اب نافرمانوں پر عذاب نازل ہوا۔ اول حضرت نوح کے زمانے میں طوفان آیا۔ اس کے بعد حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت شعیبؑ وغیرہ کے زمانے میں کافروں پر

قسم قسم کے غلاب آئے تو آپ کی وحی کو معزز لوح اور ان سے پھولوں کی وحی کے ساتھ تبشیر دیتے ہیں۔
اب کتاب اور مشرکین، مکہ کو لڑی طرح تبشیر کر دی گئی کہ جو آپ کی وحی یعنی قرآن کو نہ مانے گا وہ غلاب
عظیم کا مستحق ہو گا۔

حضرت یونس، حضرت ہارون، حضرت سلیمان اور حضرت داؤد۔ اسی میں اشارہ کر دیا کہ نبوت کے دو عظیم سلسلے ہیں۔ ایک فوجی اور دوسرے ابراہیمی، اور اللہ نے ان دو پیغمبروں اور ان کے خاندانوں کو نبوت و وحی کے لیے چن لیا ہے و جعلنا فی سورۃ المنبیۃ والکتاب۔ حضرت یعقوب کے ساتھ ربط کا اضافہ یہ سمجھانے کے لیے کیا ہے کہ اولاد پیغمبر میں انبیاء پر وحی آئی ہے مگر وہ صاحب کتاب نہیں ہیں جیسے حضرت یوسف، اساطیر جمع بسط کی ہے جیسے عرب میں قبیلہ کا اطلاق خاندان پر ہوتا ہے ایسے ہی بنی اسرائیل میں لفظ اسباط استعمال ہوتا ہے۔ اسباط بنی اسرائیل اور خاندانوں پر مشتمل ہے اور یہ بلکہ خاندان خود حضرت یعقوب کے دس بیٹوں اور حضرت یوسف کے دو بیٹوں سے لے کر بیٹے ہیں۔ حضرت یعقوب کے دس بیٹوں کے نام یہ ہیں۔

۱۔ روبین، ۲۔ شمعون، ۳۔ یہودا، ۴۔ یساکر، ۵۔ زبولون، ۶۔ یوہنا، ۷۔ دان، ۸۔ نفتالی،

۹۔ گاد، ۱۰۔ اشیر، حضرت یوسف کے دو بیٹوں کے نام، ۱۱۔ افرائیم، ۱۲۔ منشی۔

انہیں خاص طور پر زبور کا ذکر کیا ہے لیکن یاد رہے کہ موجودہ بائبل میں زبور کے نام سے جو کتاب پائی جاتی ہے وہ ساری کی ساری زبور داؤد نہیں ہے۔ اس میں بکثرت مزامیر دوسرے لوگوں کے بھی بھر دیے گئے ہیں اور وہ اپنے اپنے مصنفین کی طرف منسوب ہیں۔ البتہ جن مزامیر پر تصریح ہے کہ وہ حضرت داؤد کے ہیں ان کے اندنی الواقع کلام حق کی مدد شنی معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح بائبل میں اشال سلیمان کے نام سے جو کتاب ہے اس میں بھی اچھی خاصی آمیزش پائی جاتی ہے اور اس کے آخری دو باب تو صرف لائق ہیں مگر اس کے باوجود ان اشال کا بڑا حصہ صحیح و برحق معلوم ہوتا ہے۔ ان دو کتابوں کے ساتھ ایک اور کتاب حضرت ایوب کے نام سے بھی بائبل میں درج ہے لیکن حکمت کے بہت سے جواہر اس میں رکھنے کے باوجود اسے بڑھتے بڑھتے یقین نہیں آتا کہ واقعی حضرت ایوب کی طرف اس کتاب کی نسبت صحیح ہے اس لیے کہ قرآن میں اور خود اس کتاب میں حضرت ایوب کے جس مہر عظیم کی تعریف کی گئی اس کے بالکل برعکس وہ سلوک کتاب ہمیں یہ بتاتی ہے کہ حضرت ایوب اپنی مصیبت کے زمانے میں اللہ کے خلاف مراء شکایت بنے رہے۔ حتیٰ کہ ان کے ہم نشین ان کو اس امر پر مطمئن کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ خدا ظالم نہیں ہے مگر وہ کسی طرح ان کو دیتے تھے۔

ان صحیفوں کے علاوہ بائبل میں انبیاء بنی اسرائیل کے، مصاحف اور بھی درج ہیں جن کا بیشتر حصہ صحیح معلوم ہوتا ہے خصوصاً یسعیا، یرمیا، حزقیل، ایل، عاموس اور بعض دوسرے صحیفوں میں تو بکثرت مقامات ایسے آتے ہیں جنہیں پڑھ کر آدمی کی روح وجد کرنے لگتی ہے۔ ان میں ہلہامی کلام کی شان

صریح طور پر محسوس ہوتی ہے۔ ان کی اخلاقی تعلیم ان کا شرک کے خلاف جہاد، ان کا توحید کے حق میں زہد، استدلال، اور ان کی بنی اسرائیل کے اخلاقی زوال پر سنت تنقید پڑھتے وقت آدمی پر محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انجیل میں حضرت مسیح کی تعزیریں اور قرآن مجید اور یہ صحیفے ایک ہی سرچشمے سے نکلے ہوئے ہیں بلکہ

مطلب یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد جو انبیاء ہوئے ان سب کا بالا جمال و کبریا کر جو ان میں اولوالعزم پیغمبر ہیں، اور جو مشہور اور جلیل القدر ہیں ان کو تخصیص اور تفصیل کے ساتھ ذکر فرمایا جس سے خوب معلوم ہو گیا کہ آپ کے اوپر جو وحی آئی اس کا حق ہونا اور اس کا ماننا ایسا ہی ضروری ہے جیسا تمام اولوالعزم اور مشاہیر پیغمبروں کی وحی کو۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ انبیاء پر جو وحی آتی ہے کبھی فرشتہ پیغام لے کر آتا ہے۔ کبھی بھی ہوئی کتاب مل جاتی ہے۔ کبھی بذریعہ پیغام اور بدون واسطہ کے عہد اللہ تعالیٰ اپنے انصاف سے بات کرتا ہے ان سب صورتوں میں چونکہ وہ اللہ تعالیٰ ہی کا حکم ہے کسی دوسرے کا حکم نہیں تو بندوں پر اس کی اطاعت یکساں فرض ہے۔ بندوں تک پہنچنے کا طریقہ تحریر ہر باتقریر اور ذوالپیغام ہر تواب یسوعا یا کسنا کہ قرابت کی طرح پوری کتاب ایک دفعہ ہی آسمان سے لاؤ گے تو ہم تم کو چاہا نہیں گئے ورنہ نہیں کہنے بے ایمانی اور حماقت ہے۔ جب وحی الہی حکم الہی ہے اور اس کے نازل ہونے کی صورتیں البتہ متحد ہیں تو پھر کسی صورت میں اس کے ماننے میں تردد یا انکار کرنا یا یہ کہنا کہ فلاں خاص طریقہ سے تو ان لوگوں کا وہ نہ نہیں صریح کفر ہے اور کھلی حماقت ہے بلکہ

دراصل اس نکتہ میں تین باتوں کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔

ایک یہ کہ اللہ کا دین ایک ہے اور اس طرح آپ سے پہلے بے شمار پیغمبروں پر خدا کی ہدایت نازل ہوئی ہے اسی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی نازل ہوئی ہے۔

دوسرے یہ کہ یہودیوں کے اس گمراہانہ اعتراض کا جواب دے دیا کہ آسمان سے ایک بھی لکھائی کتاب کیوں نہیں آتی۔ فرمایا کہ یہ بے شمار پیغمبر جو تو رات کی مشورہ خفین ہیں ان میں سے کسی پر ایسی کتاب حضرت موسیٰ کے سوا نازل نہیں ہوئی۔ جس طرح خدا نے ہمیشہ نبیوں کو اپنی وحی سے مطالب کیا ہے اسی طرح حضور نور صلی اللہ علیہ وسلم بھی وحی الہی سے مشرف ہوئے ہیں۔

تیسرے یہ کہ حضور نور صلی اللہ علیہ وسلم کو مشہور اور مجملہ انبیاء کو مشہور برقرار رکھے کہ ان کے دیا کر

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء کے کمالات کے جامع ہیں۔ حضرت نوح کی زندگی کفر کے خلاف فیضان و غضب کا دلولہ پیش کرتی ہے، حضرت ہرود علیہ السلام سرکش و ظالم حکمرانوں کے خلاف برہنہ قرار میں حضرت صالح علیہ السلام مصرعین اور مسندین کی پیشوائی کے خلاف اعلان کر رہے ہیں۔ حضرت ابراہیم کی زندگی بت فکینوں کا منظر پیش کرتی ہے۔ حضرت عیسیٰ کی حیات صرف خاکساری، تواضع، حضور و درگزر اور فداقت کی تعمیل دیتی ہے۔ حضرت سلیمان کی زندگی شاہانہ اولوالعزمیوں کی جلوہ گاہ ہے۔ حضرت ایوب کی حیات صبر و شکر کا نمونہ ہے، حضرت یونس کی سیرت خداست و انابت اور حقوق کی مثال ہے۔ حضرت یوسف کی زندگی قید و بند میں بھی پوش نیلیخ اور دعوت کا سبق ہے۔ حضرت داؤد کی سیرت گریہ و بکا، حمد و ثناء اور دعا و زاری کا میضہ ہے، حضرت یعقوب کی زندگی امید خدا پر توکل اور اعتماد کی مثال ہے۔ حضرت اسماعیل کی زندگی جذب و شوق اور قربانی کا نمونہ ہے۔ حضرت اسحاق کی زندگی پارسائی اور زہد و تقویٰ کا نمونہ ہے۔ اور حضرت موسیٰ کی زندگی کفار سے جنگ و جہاد شاہانہ منظم و منسق اور اجتماعی دستور و قوانین کی مثال پیش کرتی ہے۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مجددہ کو دیکھو کہ اس میں نوح اور ابراہیم موسیٰ اور عیسیٰ، سلیمان اور داؤد، ایوب اور یونس، یوسف اور یعقوب سب کی زندگیاں اور سیرتیں سمٹ کر سما گئی ہیں۔

محدث خطیب بغدادی کی ایک ضعیف روایت میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے وقت خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہ ملوک ملوک چھاؤں اور سمندروں کی تہ میں بجاؤں۔ کہ تمام دنیا ان کے نام و نشان کو پہچان لے، جن و انس، چرند و پرند بلکہ ہر جاندار کے سامنے ان کو لے جاؤں۔ ان کو آدم کا اخلاق، شیب کی معرفت، نوح کی شجاعت، ابراہیم کی دوستی، اسماعیل کی زبان، اسحاق کی رضا، صالح کی فصاحت، ہود کی حکمت، موسیٰ کی سختی، ایوب کا صبر، یونس کی کثرت، یوشع کا جہاد، داؤد کی آواز و نال کی محبت، یوسف کا حسن، الیاس کا وقار، یحییٰ کی پاکدامنی اور عیسیٰ کا زہد عطا کر دو تمام انبیاء کے اوصاف و اخلاق میں ان کو غوطہ دو۔

جن علمائے اس روایت کو اپنی کتابوں میں جگہ دی ہے ان کا خداوند حقیقت یہی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس صفت جامعیت کو نمایاں کریں جس کی نشاندہی قرآن حکیم کی یہ آیت گرامی کر رہی ہے کہ جو کچھ اور انبیاء کو مستغرق طور پر عطا ہوا تھا وہ سب مجموعی طور پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو ملا ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں دیکھو۔ یہ جامعیت کی صفت کاملہ پورے طور پر نمایاں ہو جائے گی۔ مکہ کے پیغمبر کو جب مکہ سے یرش بجلتے دیکھو تو کیا

تم کو دیکھ کر یاد نہ آئے گا جو مصر سے مدین جانا نظر آتا ہے۔ کہ وہ لوگ کے غارتبین اور کوہ بینا کے قاتلانہ ایک
 حیثیت سے کسی کیسائی نظر آتی ہے مگر جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کی آنکھیں کھلی تھیں اور حضرت ابراہیم
 کی بندہ حضرت موسیٰ باہر دیکھ رہے تھے اور حضرت ابراہیم کو وہ زیتون پر درخت کہنے کا علم تھا مگر حضرت عیسیٰ
 اور مسنا پر چڑھ کر یا مصر پر تشریف لے کر کہہ کر پکارتے تھے کہ کس قدر مشابہت ہے۔ بدو زمین اور اعراب و دیگر
 نسل سے سالار اور مومنین اور غریبوں اور اوروں سے بڑا آدمی موسیٰ میں کس قدر مماثلت ہے حضور
 اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے سات مردانوں کے حرم میں بدو کا کی تو آپ کی زندگی حضرت موسیٰ کے مثل
 تھی حبیب انہوں نے ان غریبوں پر دعا کی۔ جو کھڑات پر کھڑات میں کھینچنے کے باوجود ایمان دلالتے۔ اور جب
 آپ نے احد میں اپنے قاتلوں کے حق میں دعا سے نیرنگی تو اس وقت گویا آپ حضرت عیسیٰ کے قالب میں
 جتے جنہوں نے کبھی اپنے دشمنوں کا بھی برا نہیں پایا۔ جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تم مسجد نبوی
 کی عدالت گاہ اور بیجا توں اور غزوات میں دیکھو تو حضرت موسیٰ کی سیرت کا نقشہ سامنے آجائے لیکن
 جب آپ کو مکان کے جبروں میں پہاڑوں کے غاروں میں، رات کی تنہائیوں اور تاریکیوں میں دیکھو تو حضرت
 عیسیٰ کا جلوہ نظر آئے۔ شب و روز کے ہم آگوشی میں آپ کی زبان مبارک کی دعاؤں اور مناجاتوں کو
 سنو تو زبور نزلے و از کلام کو دھوکا ہوگا۔ نفع نہ کہے عدم و مشرق اور برق و علم کے ساتھ میں آپ کو دیکھو
 تو نرگ و اختتام اور فوجوں والے سیماں کا مناظر ہوگا۔ اگر کعبہ الی طالب میں آپ کو تین برس اس
 طرح محصور دیکھو کہ کھانے کا سامان تک نہیں ہے تو مصری قید خانے کے پیچھے یوسف کا جلوہ دکھائی دے
 گا، غرض

موسیٰ یوسف دم غیبی یدر بیضا داری

آنچه نوبال بردارند تو تهنبا داری!

حضرت موسیٰ سیاست اور قانون سے کرا تے، حضرت داؤد و داود مناجات سے کرا
 عیسیٰ زہد و اخلاق سے کرا تے۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قانون و سیاست بھی لائے اور
 دعا و مناجات بھی اور زہد و اخلاق بھی۔ ان سب کا مجموعہ الفاظ و معانی محمد رسول اللہ ہیں۔

قرآن میں سب غیوروں کا ذکر نہیں ہے

۲۴۵۔ اور خدا کے وہ رسول جن کا حال ہم قرآن میں پہلے سنا چکے ہیں اور وہ جن کا حال ہم نے
 نہیں سنا، اور اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا جیسا کہ واقعی کلام ہوتا ہے۔ اس میں یہودیوں کو تنبیہ ہے کہ

وہ اس دھوکہ میں نہ رہیں کہ نبوت ان کی خاندانی میراث ہے اور یہ فردہ ذکر میں کہ اللہ نے بنی اسرائیل ہی میں سے انبیاء بنائے ہیں بلکہ اہل القریہ ہے کہ ان میں امتہ الاخلا فیجا غزیر کوئی قوم اور امت ایسی نہیں جس میں کوئی نہ کوئی خدا کی جانب سے آگاہ کرنے والا نہ آیا ہو۔ قرآن کی ممکنہ سورتوں میں کچھ بیسوں کا ذکر کیا ہے مثلاً سورہ انعام، سورہ ہود، سورہ الشعراء میں ان کا ذکر کر رہے ہیں۔ لیکن کچھ ایسے ہی بھی ہیں جن کا قرآن میں ذکر نہیں ہے۔ اس آیت میں انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے اصناف انسانی میں سے ایک خاص طبقہ کا قرآن نے اجمالی ذکر کر کے بتایا ہے کہ جن کے نام لیے گئے ہیں یہ سب جنہیں بلکہ سب میں سے کچھ ہیں اور کچھ وہ ہیں جن کا ہم نے ذکر نہیں کیا اور ذکر نہ کرنے کی وجہ اس کے احاطہ نہیں کر رہے انبیاء اور توہین قرآن کے مخاطبوں کے لیے حائلے پہلے نہیں۔ ان کی تاریخ، ان کے حالات سے قرآن کے مخاطب واقف نہیں، اور نہ معلوم توہین اور پیغمبروں کے حالات میں تاہنوں کے لیے کوئی سامان جبرت نہیں ہے اور واقعات و احوال کے بیان کرنے کا بنیادی قاعدہ جبرت پذیر ہی ہے، وہ ذکر نہ کر سکتا ہے کہ چین و جاپان اور ہندوستان میں یا امریکہ اور یورپ کے شمالی ملک میں ہدایت کی روشنی نہیں پہنچی ہے، یقیناً پہنچی ہے لیکن چونکہ قرآن کے مخاطب ان سے واقف نہیں ہیں اس لیے قرآن ان کا ذکر نہیں کرتا۔ یہودیوں کی ریاضیت کہ نبوت پر پوری دنیا میں ان کی اجارہ داری ہے قطعاً غلط ہے یہ نہ متفصلے حکمت ہے اور نہ اللہ کی وسعت رحمت کے خدایان شان ہے۔ قرآن نے اس علمی حقیقت کا انکشاف کیا ہے وہ نہ قرآن سے پہلے اہل کتاب اس سے قطعاً خبر تھے۔

یہ بات کہ کسی قدر انبیاء ہوئے ہیں اس کا شمار اور یہ بات فلاں مقام پر کون نبی ہوا ہے۔ ہماری قدرت اور علمی دسترس سے باہر ہے جب تک خود قرآن اور زبان نبوت اس کا انکشاف نہ کرے۔ اس موضوع پر قرآن نے اجمالی ایمان کی ہدایت کی ہے۔ آغاز قرآن ہی میں ما انزل من قبلہ فرما کر اس طرف اشارہ کیا ہے۔

آخر میں خصوصیت سے حضرت موسیٰ کے بارے میں فرمایا ہے کہ وکلمہ اللہ موسیٰ تکلیماً، لیے تو ہر وحی کلام الہی ہے اور ہر کلام الہی اللہ کی وحی ہے جیسا کہ قرآن کی یہ آیت بتا رہی ہے۔

وما کان لبشر ان یکلمہ اللہ الا وحیاً او من وراہ حجاب او یوسل
ما سولاً فیوحی باذنہ ما یشاء امنہ علی حکیم۔

کسی انسان میں اللہ سے بات کرنے کا یا را نہیں ہے ہاں یہ کہ اللہ وحی کرے یا پرے کے پیچھے سے بات کرے یا پیغام رسالہ روانہ کرے اور وہ وحی کرے اللہ کے حکم

سے جو اللہ چاہے اللہ کی ذات پر تو ہے اور محنت والی ہے۔

ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ کو ہمیں پروردہ کلام الہی کا خاص امتیازی شرف حاصل ہوا۔ اگر مقلد و تہذیب تو انہی زبان میں سب سے الگ نہ ہوتا۔ بعض شارحین قرآن کی رائے میں تکلیف کا زور ہمارا ہے کہ تمام نبیوں پر فرشتہ کے ذریعہ وحی آئی مگر حضرت موسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے یہ خصوصیت عطا کی کہ ان سے ہمیں پروردہ کلام کیا اور فرشتہ کا درمیانی واسطہ نہ تھا۔ یہ حضرت موسیٰ پر اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت تھی۔ اس سے یہ لازم نہیں، تاکہ جہاں یہ خصوصیت مذکورہ وحی نہیں ہے اور صاحب وحی نہیں ہے۔ ایسے ہی کبھی ہو سکتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی خاص خصوصیت تھی نبوت کی شرط نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ ہر نبی کو کسی خاص نصیبت اور کسی خاص مہم سے سرفراز فرماتے ہیں۔ کسی میں کوئی فضیلت رکھی اور کسی میں کوئی۔ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنا کلام سنایا مگر دیدار سے محروم رکھا۔ اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو شبہ معراج میں اپنے کلام اور دیدار دونوں سے مشرف فرمایا۔

بتا دیا ہے کہ نبی ہونے کے لیے صاحب وحی ہونا ضروری ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ وحی کی خاص نوع ہو اور نہ ضروری ہے کہ کبھی ہوئی کتاب اس کے پاس ہو۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ نبوت کا مشن کیا ہے!

نبوت کا مشن

۶۴۶- یہ تمام رسول و نوحی نبی نے اپنے لئے اور دہانے لئے بنا کر دیا کیسے گئے ہیں تاکہ ان کو روئے ذکر مینے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی جہت نہ رہے اور اللہ ہر حال غالب رہے وہاں اور حکیم و دانا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اہلبیاد کو برابر بھیجا کہ مومنوں کو خوشخبری سنائیں اور کافروں کو ڈرائیں تاکہ لوگوں کو قیامت کے دن اس عذر کی جگہ نہ رہے کہ ہم کو تیری مرضی اور غیر مرضی معلوم نہ تھی۔ معلوم ہوتی تو ہم ضرور اس پر چلتے سو جب اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو مجھنے سے روک دیا اور پیغمبروں نے راہ حق بتائی تو ب دین حق کے قبول نہ کرنے میں کسی کا کوئی عذر نہیں سنا جاسکتا۔ وحی الہی ایسی قطعی جہت ہے کہ اس کے رد و رد کوئی جہت چل نہیں سکتی بلکہ سب جہتیں قطع ہوجاتی ہیں اور یہ اللہ کی حکمت و تدبیر اور ذہن و ہمتی کرے کہ لوگوں کو روک سکتا ہے مگر اس کو پسند نہیں دے

نذیر نہ ہوتے تو کیا یہ دنیا کبھی تکمیل کو پہنچ سکتی ہے۔ ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔

نبوت کی غرض و غایت

نبوت کا مٹن بتانے کے بعد نبوت کی ضرورت کی طرف یہ کہہ کر اشارہ فرمایا ہے تاکہ لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت نہ رہے۔ یعنی انبیاء کے آجانے کے بعد کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ رہے کہ ہماری عقل مسائل و حقائق کے سمجھنے سے قاصر رہی۔ تشکیلین نے یہیں سے یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ بندوں پر حجت الہی انبیاء کے روا نہ کرنے کے بعد ہی قائم ہوتی ہے نہ کہ مجرد عقل کی وجہ سے۔ مطلب یہ ہے کہ ان تمام پیغمبروں کو روا نہ کرنے کی ایک ہی غرض تھی اور وہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ فرج انسان پر تمام حجت کرنا چاہتا تھا تاکہ آخری عدالت کے موقع پر کوئی گمراہ مجرم اس کے سامنے یہ عذر پیش نہ کر سکے کہ ہم ناواقف تھے اور آپ نے ہمیں حقیقت حال سے آگاہ کرنے کا کوئی انتظام نہیں کیا تھا۔ اس غرض کے لیے خدا نے دنیا کے مختلف گوشوں میں پیغمبر بھیجے اور کتابیں نازل کیں۔ ان پیغمبروں نے کثیر استعداد انسانوں تک حقیقت کا علم پہنچا دیا اور اپنے پیچھے کتابیں چھوڑ گئے ہیں جن میں سے کوئی نہ کوئی کتاب انسانوں کی رہنمائی کے لیے ہر زمانہ میں موجود رہی ہے۔ اب اگر کوئی شخص گمراہ ہوتا ہے۔ تو اس کا الزام خدا پر اور اس کے پیغمبروں پر عائد نہیں ہوتا بلکہ یا تو خود اس شخص پر عائد ہوتا ہے کہ اس تک مکمل پیغام پہنچا اور اس نے قبول نہیں کیا یا ان لوگوں پر عائد ہوتا ہے جن کو راہ راست معلوم تھی، اور انہوں نے خدا کے بندوں کو گمراہی میں مبتلا دیکھا تو انہیں آگاہ نہیں کیا۔ بلکہ بالفاظ دیگر بتایا گیا ہے کہ انبیاء دنیا میں اس لیے تشریف لائے ہیں کہ لوگوں کو یہ کہنے کا موقع نہ ہے کہ ان کے پاس خطرے سے آگاہ کرنے والا کوئی نہیں آیا۔ ورنہ وہ ہرگز کفر و بد عملی کی راہ اختیار نہ کرتے۔ اگرچہ اللہ کی ذات عزیز ہے اس پر انبیاء کا روا نہ کرنا واجب نہیں ہے اور اگر وہ مخلوق اور مملوک کو انبیاء کو روا نہ کیے بغیر ہی سزا دے تو اس سے پوچھنے والا کوئی نہیں ہے لیکن وہ حکیم بھی ہے۔ اس کی حکمت کا قصایہ ہے کہ وہ کسی کو سزا دے تو تمام حجت کے بعد ہی دے۔ رسولوں کی تشریف آوری ہی اللہ کی یہ حجت ہے۔ انبیاء کی آمد کی غرض یہ تھی کہ سب کی زبان اور خطیبانہ جوش میں بہت کچھ بتایا جاسکتا ہے لیکن یہاں مقصود یہ ہے کہ قرآن کی کتابی ہوتی غرض کی نشاندہی کی جاتے ہیں قرآن صرف یہی بتاتا ہے کہ نبوت

کی فرض ہے کہ اس کا وجود ہی آدم پر اقامتِ حجت ہے، لیکن ہے کہ آدم کے فرزند پر خدا کریں کہ ہمارے پاس کوئی یاد دہانے والا نہیں آیا اور ہمیں باطل کی تاریکی سے نکال کر حق کی روشنی میں لانے والا نہیں آیا۔ لوگ جب فاسد خیالات، یہود و ملحد، بے سود اعمال کی تاریکیوں میں پھنس کر فطری بصیرت اور دعائی معرفت کے نور سے محروم ہو جاتے ہیں۔ انبیاء ان آدموں کے ہاتھ پکڑ کر ان کو خطرات سے انوار میں لاتے ہیں۔ ان کو شک کی جگہ یقین، جہل کی جگہ علم، باطل کی جگہ حقانیت کی جگہ نور عطا کرتے ہیں۔

دراصل اس دنیا کی نعمات صرف اعتدال میں ہے۔ افراط و تفریط پیدا ہوگی، ارمکسے زمین پر فساد رونما ہوگا۔ انسانی زندگی میں بھی یہ ترازو جب اعتدال کے معیار پر پرورمی نہ ہوگی، کبھی دونوں پہلے برابر نہ ہوں گے۔ عقائد پر یا معاملات، اخلاق پر ان معاملات ان میں اسی توازن کا نام امتی و عدل ہے۔ آسمان سے زمین تک ایک ایک ذرہ اعتدال کی ترازو میں تلا ہوا ہے۔ یہ توازن اور برابر تولی جو بے ارادہ اور بے اختیار دنیا کے ذمے دہے اور اس کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک کام میں خالقِ فطرت کے انداز سے اور تدبیر سے قائم ہے۔ یہی توازن اور برابر کی تولی رسولوں کے ذریعے آئی ہوئی میزانِ شریعت کے مطابق ذی ارادہ اور خود اختیار انسانوں میں جو ناپا ہی ہے۔ بے ارادہ دنیا کی میزان کا نام قانونِ فطرت ہے اور بارادہ دنیا کی میزان کا نام قانونِ شریعت ہے۔ یہی اللہ کی حجت ہے جو انبیاء کے کوائے ہیں۔ انسانی دنیا کی سببیت، علمائیت اور امن و امان کا نظام اسی اللہ کی حجت کے ذریعے قائم ہو سکتا ہے، اگر یہ دہو کر سارا نظام و بہرہ برہم ہو کر رہ جائے۔

قرآنی وحی خاص علوم میں ممتاز ہے

۲۴۴۔ لوگ نہیں مانتے تو نہ مانیں لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ جو کچھ اس نے تم پر نازل کیا ہے اپنے علم سے نازل کیا ہے اور اس پر فرشتے بھی گواہ ہیں اور اللہ کی گواہی بس کرتی ہے۔ یعنی وحی برزخبر کو آتی رہی ہے۔ یہ کچھ نئی بات نہیں، سب کو معلوم ہے لیکن اس قرآن میں اللہ نے اپنا خاص علم اتارا اور اللہ اس حق کو ظاہر کرنے لگا۔ چنانچہ جاننے والے جانتے ہیں کہ جو علوم اور حقائق قرآن مجید سے حاصل ہوئے ہیں اور برابر حاصل ہوتے رہیں گے وہ کسی کتاب سے نہیں ہوئے اور جس قدر ہدایت لوگوں کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی اور کسی سے نہیں ہوئی۔ لے

اصل ارشاد میں لکن استعمال ہوا ہے اور عربی زبان میں لکن استدراک کے لیے آتا ہے۔ استدراک کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ پہلی بات میں پیدا شدہ شبہ کو دور کیا جلتے۔ سوال یہ ہے کہ کیا کیا شبہ پیدا ہوا؟ شارحین قرآن کہتے ہیں کہ شبہ یہ پیدا ہوا کہ جب ان بیانات کی روشنی میں یہ حقیقت کھل کر سامنے آ چکی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہیں جیسے دوسرے انبیاء تو پھر ان یہودیوں کی جانب سے یہ مطالبہ کیوں پیدا ہوا؟ کہ کتاب آسمانی کے کراؤ۔ اللہ سبحانہ نے بتایا ہے کہ ان کا یہ معاملہ آپ سے الگ تھا نہیں دوسرے ان یہودیوں کے ساتھ بھی ان کا یہی معاملہ رہا ہے جن کو وہ ہی مانتے تھے۔ معاملہ کے واضح اور صاف ہونے کے باوجود اگر یہودی آپ کو اللہ کا رسول نہیں مانتے ہیں اور آپ پر آتی ہوئی وحی کی شہادت نہیں دیتے ہیں تو ان کی شہادت پر آپ کا رسول ہونا مقوف نہیں بلکہ اللہ کی شہادت پر آپ کا رسول ہونا مقوف ہے۔ آپ کی رسالت پر اللہ اور اس کے فرشتوں کی شہادت ہے۔ آپ پر جو وحی اللہ نے نازل کی ہے اس کا سرشتہ علم الہی ہے ملاحظہ فرمائیے۔ یہ آپ کا وجدان نہیں بلکہ وہ عرفان ہے جس کی صلاحت پر کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے اس طرح آیت میں حضور اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی ہو گئی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَاصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ قَدْ ضَلُّوا
 ضَلَالًا بَعِيدًا إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَظَلَمُوا لَمْ يَكُنِ اللَّهُ
 لِيُغْفِرَ لَهُمْ وَلَا يَهْدِيَهُمْ طَرِيقًا إِلَّا طَرِيقَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ
 فِيهَا أَبَدًا وَكَانَ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ
 جَاءَكُمْ الرَّسُولُ بِالْحَقِّ مِنْ رَبِّكُمْ فَأَمِنُوا خَيْرًا لَكُمْ وَإِنْ
 تَكْفُرُوا فَإِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ وَكَانَ اللَّهُ

عَلِيمًا حَكِيمًا

بلاشبہ جن لوگوں نے راہ کفر اختیار کی اور اللہ کی راہ سے انہوں نے
 لوگوں کو روکا تو بلاشبہ وہ دُور کی گمراہی میں جا پڑے ہیں۔ بلاشبہ
 جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور ظلم کیا تو اللہ انہیں بخشنے والا نہیں ہے،
 اور نہ اللہ انہیں کوئی راستہ دوزخ کے راستہ کے علاوہ دکھائے گا
 وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔ ایسا کرنا اللہ کے لیے بالکل معمولی

بات ہے۔ اے انسانو! رسول تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی جانب سے حق کے کراچکا ہے لہذا ایمان لے آؤ تمہارے لیے یہی بہتر ہوگا، اور اگر راہ کفر اختیار کر و گئے تو یاد رکھو کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے اور اللہ سب کچھ جلنے والا اور اپنے تمام کاموں میں حکمت رکھنے والا ہے۔^{۲۵۰}

ہدایت کا معیار

اس سے پہلے آیات میں دلائل کی پوری قوت سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور آپ ہی کی ذات گرامی معیار حق ہے۔ آپ کی صداقت یہودیوں کے ماننے والے پر موقوف نہیں ہے۔ آپ کی صداقت کے لیے اللہ کی گواہی کافی ہے اور اللہ کی گواہی یہ ہے کہ اس نے علوم الہیہ، ادبیہ، سیاسی، دیوالی، فوجداری، اجتماعی اور اخلاقی علوم پر مشتمل اعجازی کتاب کو آپ کی نبوت کے لیے دلیل بنایا ہے اور فرشتوں کی گواہی یہ ہے کہ فرشتوں کے جبرئیل میں روح الامیں کتاب الہی کے کرازل ہوتے۔ اب اس کے باوجود اگر کوئی آپ کی وحی کو نہ مانے گا اس کو ہدایت نہ ملے گی۔ آپ عالم میں خدا کی تعلیم و ہدایت کے شاہد ہیں۔ نیکو کاروں کو فلاح و سعادت کی بشارت سنائے والے جبرئیل ہیں۔ ان کو جو اچھی تک بے خبر ہیں جو شیاد اور بیدار کرنے والے مذہب ہیں جھکنے والے مسافروں کو پکارتے والے داعی ہیں اور خود برکتی نور اور چراغ ہیں۔ یعنی آپ کی ذات اور آپ کی زندگی راستہ کی روشنی ہے۔ یوں تو ہر پیغمبر خدا کا شاہد، داعی، مبشر اور نذیر و حیرہ بن کر اس دنیا میں آیا ہے مگر یہ ساری صفاتیں حلقہ انبیاء پر مرکوز ظاہر نہیں ہوتیں۔ بہت سے انبیاء مٹے جو خصوصیت کے ساتھ شاہد ہوتے جیسے حضرت یعقوب، حضرت اسحاق، حضرت اسماعیل وغیرہ

بہت سے تھے جو نمایاں طور پر جڑتے جیسے حضرت ابراہیم حضرت عیسیٰ، بہت سے تھے جن کا خاص وصف مذکور تھا جیسے حضرت فرح، حضرت موسیٰ، حضرت ہود، حضرت شعیب بہت سے تھے جو امتیاز حیثیت سے داعی حق تھے جیسے حضرت یوسف، حضرت یونس لیکن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کچھ بیک وقت تھے اور آپ کے مرقع حیات میں یہ سائے نقش و نگار نمایاں تھے اور یہ اس لیے کہ آپ سب کے جاننے تھے آپ ایسی وحی لے کر آئے جو کامل ہے۔ آپ کی تعلیم دائی ہے اس لیے آپ کی ذات مجموعہ کالات ہے۔ آپ کا انکار اور آپ سے سرکشی ضلال بعید ہے اور آپ سے کافرا تعلقات کا نتیجہ دوزخ کی ہولناکی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس سے بچنے کا راستہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ پوری انسانیت آپ کو اللہ کا رسول مانے۔ قرآن نے اس آیت میں بلا تیز سب کو مخاطب کیا ہے۔

۲۴۸۔ بلاشبہ جن لوگوں نے رام کفر اختیار کیا اور اللہ کی راہ سے انہیں ملے لوگوں کو روکا تو بلاشبہ وہ دوزخ کی گڑبڑ میں جا پڑے ہیں۔ یعنی حق کے واضح ہونے کے باوجود جو لوگ آپ کی وحی کو نہیں مانتے اور آپ کے رسول ہونے کا انکار کر رہے ہیں۔ اور خود ہی نہیں مانتے بلکہ اوروں کے لیے رکاوٹ بننے ہوئے ہیں اور دوسروں کو اپنی غلط رہنمائی اور قسم قسم کے شبہات میں ڈال کر راہ حق سے روک رہے ہیں۔ وہ راہ حق سے بہت دور ہو چکے ہیں اور اتنی دور ہو چکے ہیں کہ ان کا پلٹ کر آنا ممکن نہیں ہے۔ اس آیت میں قرآن نے ایک معمول حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جب کفر کے ساتھ کفر کی پیشوائی اور قیادت کسی طبقہ کے پاس ہو تو حق کی پذیرائی کی اس طبقہ میں حق کی پوری وضاحت کے باوجود کوئی صلاحیت نہیں ہوتی۔ بالخصوص جب حق سے روگردانی کا پس منظر منافع ہوتے ہیں تو انسان منصف کشی میں اس قدر اندھا ہو جاتا ہے کہ اس کی زندگی کا ہر قدم حق کشی میں صرف ہونے لگتا ہے مطلب یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی اور نبوت کا انکار کرنے کے بعد ان کا ہدایت کی نعمت سے سرفراز ہونا ناممکن ہے۔ اس کا صاف اور کھلا تقاضا یہ ہے کہ آخرت کی نعمات حضور اقدس کے لائے ہوئے اسلام پر موقوف ہے کیونکہ جب آپ کی نبوت کا انکار ضلال ہدید ہے تو اس کے منہ سے بھی جس کے اسلام ہی شرط نعمت ہے۔ یہ صرف اس آیت کا مدلول ہی نہیں بلکہ دوسرے کو حق پر صراحت بھی قرآن نے یہ بات کہی ہے۔

وَمَنْ يَتَّبِعْ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ دَهُوًا فِي الْآخِرَةِ
مِنَ الْخَاسِرِينَ

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اسی فیصلہ خداوندی کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں،

قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے اس اُمت میں سے جس کسی بھی شخص تک شفا یودھی یا نصرا کی ملک میری نبوت کا پیغام پہنچا اور اس کے باوجود وہ میرے لاتے ہوئے دین پر ایمان کا بغیر نہ گیا وہ دوزخی ہو گا۔ (مسلم)

اس حدیث میں نام اگرچہ یودھ و نصارہ کے لیے گئے ہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ نام صرف مثال کے طور پر لیے گئے ہیں، ورنہ اس میں جو بات کہی گئی ہے وہ اپنی جگہ بالکل عام ہے جیسا کہ زیر تشریح آیت میں ان الذین کفروا بالکل عام ہے اور ایک طے اور اصول کی حیثیت رکھتی ہے۔ دنیا کا کوئی مگر وہ کوئی قوم اور کوئی ملت ایسی نہیں ہے جس پر اس کا اطلاق نہ ہو تاہم۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں جو آیت سے کچھ مان کر نکال جا رہی ہے بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جو اس آیت کے لفظ کفر و کافر کا صریح مفہوم ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ پر وحی آنے کو لائی سے ثابت کرنے کے بعد کفر کا لول صاف طور پر بتا دیا ہے کہ آپ کی نبوت کا انکار کھلے طور پر مگر یہی ہے اور اگر یہ گراہی ہے تو آپ کی نبوت کو مان لینا یقیناً ہدایت ہے۔ اسی لیے یودھ و نصارہ کی کو خاص طور پر آپ کی نبوت قبول کر لینے پر قرآن نے ہدایت لٹنے کی بشارت دی ہے۔ فان اسلوا فعدا ہندوا۔

قانون مجازات اور مکافات عمل

۲۴۹۔ بلاشبہ جن لوگوں نے نیک راہ اختیار کی اور ظلم کیا تو انہیں انہیں بخشے والا نہیں ہے اور انہیں ان کو دوزخ کے راستہ کے علاوہ کوئی راستہ دکھائے گا، وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے، ایسا کہ انہیں کے لیے معمولی بات ہے۔ قرآن مجید اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق اور توفیق کے بعد فرماتے ہیں کہ اب جو لوگ آپ کے منکر بوجہ اور توبہ میں جو آپ کے اوصاف موجود تھے ان کو چھپایا اور لوگوں پر کچھ کچھ ظاہر کر کے ان کو بھی دین حق سے باز رکھا سو ایسوں کو نہ مغفرت نصیب ہو نہ ہدایت جس خوب واضح ہو گیا کہ بابت آپ کی متابعت میں منحصر ہے اور گراہی آپ کی مخالفت کا نام ہے جس سے یودھ کی کڑی سزا سنائی ہو گئی اور ان کے خیالات کی تغلیط واضح ہو گئی۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ تافان مجازات اور مکافات عمل کیا ہے۔ کفر و ظلم کے نتائج ایمان و عدل کے نتائج سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ اعمال اور ان کے نتائج میں چرل و دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ اچھے اعمال کے اچھے نتائج اور

نہ سے اعمال کے برے نتائج کا ہونا نگزیر ہے۔ کفر و ظلم کے نتائج یقیناً خوفناک و نہروں گئے۔ کفر سے مراد خدا کی وحی کا انکار، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار اور ظلم سے مراد تورات میں بتائی ہوئی ان باتوں کا چسپا لینا جو حضور انور کی نبوت سے تعلق رکھتی ہیں یا پھر غلط قیادت کے ذریعے لوگوں کو دھوکہ دینا ہے۔ گویا انہوں نے اپنے کفر اور اپنے ظلم سے اپنے آپ کو اس قابل ہی نہیں سمجھوڑا ہے کہ خدا ان کی مغفرت فرماتے یا جہنم کے راستہ کے سوا ان کو کوئی راستہ دکھاتے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کی شان اور اللہ کا قانون یہ نہیں ہے کہ اس کفر کو معاف کر دیا جاتے اور یومِ حساب میں اس ظلم سے درگزر کیا جائے کیونکہ کفر و ظلم وہ دونوں نفسِ ہسانی پر اثر انداز ہو کر تاریکی اور فطری فساد کی ایسی کیفیت پیدا کرتے ہیں جو کبھی انسان سے جدا نہیں ہو سکتے اور ہمیشہ انسان کے انکار و اعمال پر اثر انداز ہوتے ہیں اس لیے کفر و ظلم کی مغفرت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی اللہ کا قانون نہیں ہے کہ ظلم و کفر کے لیے فلاح و نجات کی کوئی راہ نکالے بلکہ ظلم و کفر بالذات ایسی برائیاں ہیں کہ ان کو اپنانے والا جہنم کی طرف مائل جانے والے راستہ ہی پر گامزن ہوتا ہے۔ پھر یہی ظلم و کفر میں تمسک کر جہنم کی امید اللہ کے قانونِ عدل کو برباد کرتے اور پورے نظامِ عدل کو تباہ کرنے کے مترادف ہے۔

اس آیت پر غور کرو کفر و ظلم مقدم ہے اور لحدیکن اللہ لیغفر لھما الا مخرجہ۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی جانب سے مغفرت نہ ہونا اور جہنم کا راستہ ملنا علت اور اسانوں کا کفر و ظلم معلول نہیں ہے بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے یعنی انسانوں کا کفر و ظلم پہلے ہوتا ہے اور خدا کی طرف سے اس کے جواب میں عفو و مغفرت بعد میں ہوتی ہے اور یہی طبعی اصول بھی ہے۔ انسان جب گرتا ہے تو چوٹ لگتی ہے اگر کوئی اسے الٹ کر بیان کرے تو یہ کیسی نادانی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کی یہ عادت نہیں ہے کہ بندہ کے کفر و ظلم میں ملوث ہونے کے باوجود بندے کے لیے مغفرت اور جنت کی راہ کھول دے۔ آیت کا جبر سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔

عالمگیر اور دائمی نبوت

۲۵۰۔ اے انسانو! رسول تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی جانب سے حق لے کر آیا ہے لہذا ایمان لے آؤ تمہارے لیے بہتر ہو گا اور اگر راہِ کفر اختیار کرو گے تو یہ کوہِ کمر کا آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا ہے اور اپنے تمام کاموں میں حکمت رکھنے والا ہے۔ آپ کی اور آپ کی کتاب کی تصدیق اور آپ کے مخالفین یعنی اہل کتاب کی غلطی اور تبذیل بیان

فرما کر اب عام سب لوگوں کو منادی کی جاتی ہے کہ اے لوگو! ہمارے رسول بھی کتاب اور سچا دین لے کر تمہارے پاس پہنچ چکا ہے۔ اب تمہاری غیرت اسی میں ہے کہ اس کی بات مانو اور اگر نہ مانو گے تو خوب سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ کا ہے جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے اور تمہارے تمام احوال اور افعال سے خبردار ہے۔ تمہارے اعمال کا پورا حساب کتاب ہو کر اس کا بدلہ ملے گا۔ اس ارشاد سے صحیح صاف معلوم ہو گیا کہ وحی جو پیغمبروں پر نازل ہو اس کا ماننا فرض اور اس کا انکار کفر ہے۔

اس آیت میں یہودیوں کے مخاطب اور عیسائیوں کے مخاطب کے درمیان میں تمام انسانوں کو مخاطب کر کے فرمایا ہے۔ لفظ رسول پر الف لام تعریف لگا کر فرمایا ہے کہ وہ رسول تمہارے پاس آچکا ہے۔ اس سلسلے میں کہنے کی بات ہے کہ عیسائی اور یہودی دونوں اہل کتاب ہیں ان کے تذکرے میں پوری انسانیت کو مخاطب بنانے کی وجہ یہ ہے کہ جب اہل کتاب ہو کر ان پر ایمان لانا واجب ہے تو جو اہل کتاب نہیں ان کو توجہ دلائی جائے لانا ضروری ہے اور اُنے اور وہ رسول کی توجہ اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہودی اور عیسائی اپنی کتابوں کی تصریحات کی بنا پر رسول کے آنے سے متفق نظر تھے۔ ان سے کہا جا رہا ہے کہ جس کا تمہیں انتظار تھا وہ رسول آچکا ہے۔

تورات میں ایک بشارت ہے:

خداوند سینا سے آیا اور میرے ان پر طلوع ہوا۔ فاران کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر

(استشفا ۲۲-۲۳)

ہوا۔

اس بشارت کا ایک ٹکڑا حضرت حنیف بن قیس نے پھر دہرایا لکھا ہے۔

خدا تعالیٰ سے اور وہ جو قدوس ہے کوہ فاران سے۔ اس کی شرکت سے آسمان

چھب گیا اور اس کی حمد سے زمین محمود ہو گئی۔ ۳-۲-

حضرت یحییٰ جب ظاہر ہوتے ہیں تو لوگ ان سے پوچھتے ہیں کہ تین آنے والے پیغمبروں میں

تم کون ہو؟

یہودیوں نے یروشلیم سے کاہنوں اور لادیلوں کو بھیجا کہ اس سے پوچھیں کہ تو کون

ہے؟ اور اس نے اقرار کیا انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں مسیح نہیں ہوں۔ تب انہوں

نے اس سے پوچھا کہ تو اور کون ہے؟ کیا تو الیاس ہے؟ اس نے کہا میں نہیں ہوں،

میں آیا تو نہ نبی ہے، اس نے جواب دیا نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ تورات کی پیشین گوئی کے مطابق یہود کو تین پیغمبروں کا انتظار تھا جن میں سے دو کے نام ایلاس اور مسیح تھے لیکن تیسرے کا نام صرف وہ نبی لیا گیا ہے۔ یہ تیسرا ہی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کون ہے۔ صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی ذات ہے جو نبی اور رسول کے مطلق نام سے دنیا میں مشہور ہے۔ مسلمان آپ کو اکھنتر کہتے ہیں اور سیکورل میں آپ کا نام وی پرافٹ مشہور ہو گیا ہے۔ عرب روم اور یہودی و نصاریٰ سب کو تورات اور انجیل کی نبیائوں کے مطابق ایک آنے والے کا انتظار تھا۔ صحیح بخاری میں حضرت ابوسفیان کی زانی مروی ہے کہ جب قاصد نبوی رحمت نامہ اسلام لے کر قیصر کے دربار میں پہنچا۔ اور قیصر نے ابوسفیان کو بلا کر جو اس وقت تک مسلمان نہ ہوتے تھے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق چند استفسارات کیے اور ابوسفیان نے ان کے جو جوابات دیے ہیں۔ ان کو سن کر اس نے بھرے دربار میں کہنا شروع کیا کہ اگر وہ یہ ہے تو ایک ان یہ میرے پاؤں کے نیچے کی مٹی اس کے قبضہ میں ہوگی مجھ کو یہ ضرور خیال تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے لیکن یہ خیال نہ تھا کہ وہ عرب میں پیدا ہوگا۔ اگر ممکن ہوتا تو میں خود جاکر اس کی زیارت کرتا اور اگر وہاں جوتا تو خود اس کے پاؤں میں دھرتا۔

قیصر کے عزم راز اور شام کے شب ابن ماطور کا بیان ہے کہ قیصر کا خیال تھا کہ خضرؑ نے رسول کی پیدائش کا زمانہ قریب ہے اور رومیہ کے ایک مسیحی عارف نے بھی خط لکھ کر قیصر کے خیال کی تائید کی۔ مقروض شاہ مصر کے دربار میں جو قاصد حضور انور کا خط لے کر گیا تھا وہ بھی یہ جواب لے کر آیا کہ ہاں ہم کو بھی یقین ہے کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے لیکن خیال تھا کہ وہ شام میں پیدا ہوگا۔ جیسا کہ عیسائی بادشاہ نے حکم کیا کہ ہم کو ابھی دیتے ہیں کہ آپ پچھے پیغمبر ہیں۔ یمن کے شہر سبوان سے ایک عیسائی وفد آیا اور فیصلہ حق کے لیے یہ طے پایا تھا کہ دونوں فریق مباحثہ کریں جس کی تفصیل آپ جلد سوم میں پڑھ چکے ہیں۔ لیکن وفد کے سجدار عیسائیوں نے وفد کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں مبارک سے منع کیا اور کہا کہ خدا کی قسم اگر یہ سچے پیغمبر ہیں تو ہم جمعہ کے لیے تباہ ہو جائیں گے۔ اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ ان کو بھی پیغمبر کا انتظار تھا۔ درقد بن نوفل کا واقعہ صحیح بخاری میں آتا ہے کہ وہ جاہلیت میں عیسائی ہو گئے۔ بعثت کے پہلے ہی روز جب حضرت خدیج کو آپ کو وفد کے پاس لے کر گئے ہیں تو وفد نے آپ کی نبوت کی تصدیق کی اور از رو ظاہر کی کہ کاش میں آپ کی بھرت تک رہتا تو آپ کی مدد کرتا۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیوں کو آنے والے پیغمبر کا

اس وقت انتظار تھا۔

قرآن اسی ہی منظر میں یہاں مخاطب کر کے کہہ رہا ہے کہ لوگو! وہ رسول جس کی شہادت موسیٰ نے قرآن میں دی اور جس کی آمد کی خبر حضرت عیسیٰ نے انجیل میں دی ہے آپ چلا ہے اور انٹ ہیڈر ہے والی پکائی تمہارے پروردگار کی جانب سے لے کر آپ چلا ہے۔

اور اگر آیت کو اس منظر سے الگ کیا جائے تو اس رسول میں اللہ لام تعریف یہ بتانے کے لیے ہے کہ رسولوں میں وہ رسول کامل آپکا ہے جس کی رسالت میں محرم بھی ہے اور جو نبوت و رسالت کا خاتم ہے جس پر نبوت و رسالت کے سارے کالات ختم ہو گئے ہیں۔ کیونکہ قرآن کے سما کسی اور معجزے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ مکمل ہے اور اس کے ذریعے سے انشلا دین اپنے تمام اصول و فروع کے لحاظ سے تکمیل کو پہنچ گیا ہے بلکہ گزشتہ انبیاء میں سے ہر ایک نے اپنے وقت میں بھی کہا کہ اس کے بعد ایک اور نبوت آئے گی۔ جو ان کے کام کی تکمیل کرے گی، انشلا سب نے حضرت موسیٰ سے فرمایا۔

یہ ان کے بھائیوں میں سے تھے سارے نبی برہا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں نے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا۔ (استثنا - ۱۸)

اسی طرح حضرت عیسیٰ نے بھی کہا:

لیکن وہ فارقیطہ پاکیزگی کی روح ہے جیسے باپ خدا میرے نام سے بھیجے گا وہی تمہیں سب چیزیں سکھائے گا اور سب باتیں جو میں نے تم سے کہی ہیں تمہیں یاد دلانے گا

(یوحنا ۱۴: ۲۶)

اور دکھا ہے کہ

لیکن جب وہ یعنی سچائی کی روح آئے گی تو وہ نہیں ساری سچائی کی راہ بتائے گی۔

حضرت عیسیٰ نے بھی ایک آئندہ واسطے کا پتہ دیا جو اس کی تکمیل کرے گا۔ بالآخر وہ آیا اور عطا کیا کہ میں روح کی مانند بنی اسرائیل کے بھائیوں یعنی بنی اسرائیل میں سے آیا ہوں اور یہ دعویٰ کیا کہ میں ہی سچائی کی وہ روح ہوں جو موسیٰ کی اصلی چرائی کا ہر کرنے، سچائی کی راہ بتانے اور مسیح کی اوصد کی بات کو مکمل کر لے کے لیے آیا ہوں۔ اسی لیے حضور انور نے کسی اپنے بعد میں آئے واسطے کو پیغمبر کی پیشین گوئی نہیں کی کہ کسی نئے کلام کے نزول کی خبر دی کہ کسی نئی شریعت کا منظر کیا کیونکہ تکمیل کے بعد کسی نئے آئے واسطے کسی نئے کلام اور کسی نئی شریعت کا موقع کہاں؟ اور اسی بنا پر قرآن نے ہر جگہ ما نزل من قبلہ۔ پر ایمان لانے کی تاکید کی لیکن وما نزل من بعدہ کے قبول کرنے کا اشارہ تک نہیں

کیا۔ دوسری رسالتوں کے مقابلے میں رسالت محمدیؐ کہ اس امتیازی حیثیت کو نگاہ میں رکھیے اور پھر اس بات پر غور کیجئے کہ اس حیثیت کے لازمی تقاضے کیا ہو سکتے ہیں یہی ہو کہ دنیا کی ہدایت اور آخرت کی نجات آپؐ کی نبوت پر ایمان لانے پر موقوف ہے۔ آپؐ پر ایمان ہی دنیا اور آخرت میں ہر قسم کی طیر کا ذریعہ ہے۔ لیکن اس کے برعکس اگر کوئی نہیں مانتا تو اللہ کو کسی کی پر دہ نہیں ہے وہ کافروں کو کفر کی سزا فرمادے گا۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا
 الْحَقَّ إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ وَ
 كَلِمَةُ نَفْثِ الْقَبْلِ إِلَى مَرْيَمَ وَرُوحٍ مِنْهُ فَأَمْنُوا بِاللهِ وَرُسُلِهِ
 وَلَا تَقُولُوا ثَلَاثَةٌ إِنَّهُمْ اخْتِارَ الْكَلِمِ إِنَّمَا اللَّهُ إِلَهٌ وَاحِدٌ
 سُبْحَنَهُ أَنْ يَكُونَ لَهُ وَلَدٌ لَهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي
 الْأَرْضِ وَكَفَى بِاللَّهِ وَكِيلًا إِنَّ لَنْ يَسْتَنْكِفَ الْمَسِيحُ
 أَنْ يَكُونَ عَبْدًا لِلَّهِ وَلَا الْمَلَائِكَةُ لَنْ يَقْرَبُواهُ وَمَنْ
 يَسْتَنْكِفُ عَنْ عِبَادَتِهِ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ إِلَيْهِ
 جَمِيعًا فَاذْكُرُوا الَّذِينَ آمَنُوا وَاعْمَلُوا الصَّالِحَاتِ
 فَيَوْفِيَهِمْ أَجْرُهُمْ وَبَارِكُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَآلِهِ الَّذِينَ
 اسْتَنْكَفُوا أَوَّسْتَكْبَرُوا فَيَعَذِّبُهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا وَلَا
 يَجِدُونَ لَهُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا



اے اہل کتاب اپنے دین میں غلو نہ کرو، اور اللہ کے بارے میں حق کے
 سوا کچھ نہ کہو۔ مریم کا بیٹا عیسیٰ ابن مریم مسیح بس اللہ کا رسول ہے۔^{۲۵۲}
 اور اس کا کلمہ ہے جسے اللہ نے مریم پر القا کیا تھا، اور ایک نوع
 ہے جو اللہ کی جانب سے ہے۔ لہذا تم اللہ اور اس کے رسولوں پر
 ایمان لاؤ اور یہ نہ کہو کہ تمین ہیں، اس سے باز آ جاؤ اس میں تمہارے
 لیے خیر ہے۔^{۲۵۳} فائدہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ کی ذات یگانہ معبود
 ہے۔ اس کی ذات اس سے پاک ہے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو،
 آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے اور کار ساز ہونے کے لیے
 اللہ کافی ہے۔^{۲۵۴} مسیح کو ہرگز اس بات سے عار نہیں کہ وہ خدا کا
 بندہ سمجھا جائے اور نہ خدا کے مقرب فرشتوں کو اس سے ننگ ہا
 ہے۔ جو کوئی خدا کی بندگی میں ننگ و عار سمجھے اور گمند کرے
 اللہ ضرور سب کو اپنے حضور جمع کرے گا، پھر وہ لوگ جو

ایمان اور عمل صالح کی متاع رکھتے ہوں گے ان کو پوری پوری اجر میں
دے گا اور اپنے فضل سے مزید دے گا، اور وہ لوگ جو خدا کی بندگی
کو ننگ و عار سمجھتے ہیں اور گنہگار ہیں ان کو دردناک عذاب دے
گا اور اس روز ان کو خدا کے سوا کوئی رفیق و مددگار نہ ملے گا۔

اہل کتاب یعنی عیسائیوں کا غلط

اہل کتاب کی ایک بہت بڑی گمراہی دین میں غلو ہے یعنی حقیقت و اعتدال سے ہٹ کر بہت دور تک چلے
جانا، مورخین کا بیان ہے کہ تیسری صدی سے لے کر ساتویں صدی تک مسیحیت کی جو حالت رہی ہے اس کے
قرآن کے بیان کی تائید ہوتی ہے۔ مشرکانہ رسوم نے مذہب کی جگہ لی تھی۔ اصل رومی بت پرستانہ عقیدہ
نے مسیحی مذہب کا روپ بھر لیا تھا۔ حضرت مسیح کے ناسوتی اور لاہوتی دو عنصروں میں تحلیل معرکہ کرنا چاہا
لانے کے لیے کی گئی جس سے حضرت مسیح کی وہی ایک ہے کی تعلیم ان کے مذہب سے مٹ گئی ضعیف
الاعتقاد ہی اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ قرپرستی عام ہو گئی تھی۔ اور ہر بڑے پادری سے دعا مانگی جاتی تھی۔
ملک شام میں جوڑے بڑے پادری اور بطریق تھے ان کے مقتدان کو سجدے کرتے تھے۔ مسیح دیرم،
روح القدس اور حواریین اور مسیحیت کے دیگر اساطیر کے مجسمے بنا کر ان کی پرستش اس کثرت سے کرتے
تھے کہ اس کی نظیر زمانہ بعد کے دین سمیت کو ایک فرقہ کی بت پرستی میں بھی نہیں ملتی۔

کسی صاحب ترجمہ قرآن کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :

گرچہ اہل پادریوں نے مذہب کے ٹکڑے کر ڈالے تھے اور امن، محبت اور نیکی کو
منفرد کر دیا تھا، اصل مذہب کو بھول گئے تھے اور اس کے متعلق اپنی خیالی آرائیوں پر
جھگڑتے تھے۔ اسی تاریک زمانہ میں اکثر وہ توہمات جو دین چرچ کے لیے باعث تنگ
ہیں مذہبی صورت میں قائم کیے گئے، خصوصاً ولیوں اور مجسموں کی پرستش نہایت بے فہمی

سے ہونے لگی۔

مشراس اپنی کتاب میں ہندوستان میں مسلمانوں کے ایک موقع پر تحریر کرتے ہیں :

اس نازک موقع پر یعنی ظہور اسلام کے وقت ان سبہ بالان بدعات کے درمیان جو چرچ

کو ناپاک کر رہی تھیں اور اختلافات کے اس غیر منطقی سلسلہ کے درمیان جو چرچ میں ایک

بمبلی ڈالے ہوئے تھے، اگرچہ مشرق میں اصل مسیحیت کی شائع نظر آتی تھی لیکن بہت دم

الغرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام دنیا کو امن و سلام کا پیام سناسکر نصحت ہوتے ان کے رنج و صود کے

بعد ہی ان کے شاگردوں میں فرقہ اراتیاں شروع ہو گئیں۔ اور بالآخر پال نے جو ایک لویساوی یہودی تھا

اس طرح غلبہ پانک اس کی بدعات کی خاک میں اصل عیسویت ہمیشہ کے لیے دفن ہو گئی اور باب بیٹے روح

القدس کا مشرک عقیدہ اس میں داخل ہو گیا، اور قورات جس کا کوئی نقطہ خود حضرت عیسیٰ جی نہیں

کھتے تھے وہ ان کی روحانی شاگردی کے مدعی پال کے ہاتھوں ہمیشہ کے لیے لعنت قرار پائی۔

۲۵۱۔ اہل کتاب اپنے دین میں غلو نہ کرو۔ اہل کتاب اپنے انبیاء کی تعریف میں غلو سے کام لیتے

تھے اور حد سے نکل جاتے تھے۔ خدا اور خدا کا بیٹا کہنے لگے۔ سو خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ دین کی بات میں

مبالغہ نہ کرو۔ اور جس سے اعتقاد ہو اس کی تعریف میں حد سے نہ بڑھنا چاہیے، جتنی بات تحقیق ہو اس

سے زیادہ نہ کہے اور حق تعالیٰ کی شان مقدس میں بھی وہی بات کہو جو سچی اور محقق ہو اپنی طرف سے کچھ نہ کہو۔

تم نے یہ کیا غضب کیا کہ حضرت عیسیٰ کو جو اللہ کے رسول ہیں اور اللہ کے حکم سے پیدا ہوئے ہیں ان کی وحی کے

خلاف خدا کا بیٹا کہنے لگے اور تم میں خدا کے معتمد ہو گئے، ایک خدا، دوسرے حضرت عیسیٰ، تیسرے

حضرت مریم، ان باتوں سے باز آ جاؤ، اللہ تعالیٰ واحد یکتا ہے کوئی اس کا شریک نہیں اور نہ کوئی اس کا

بیٹا ہو سکے، اس کی ذات پاک اس سے منزہ ہے۔ یہ تمام خوالی اس کی ہے کہ تم نے وحی کی اطاعت اور

پابندی نہ کی۔ وحی کی متابعت نہ کر کے تو خدا کے لیے بیٹا نہ مانستے اور تم میں خدا کے قائل ہو کر صریح مشرک نہ

ہوتے اور محمد رسول اللہ سید المرسل اور قرآن مجید افضل الکتاب کی تکذیب کر کے آج ڈبل کافر نہ ہو گئے۔

اہل کتاب کے ایک فریق نے تو حضرت عیسیٰ کو رسول بھی نہ مانا اور قتل کرنا پسند کیا جس کا ذکر پہلے گزارا۔ اور

دوسرے فریق نے ان کو خدا کا بیٹا کہا، دونوں کافر ہو گئے۔ دونوں فریق کی گمراہی کا سبب یہی ہو کر

وحی کے خلاف کیا اس سے ظاہر ہو گیا کہ سنہات وحی کی متابعت میں ہے بیٹہ

پہلی بات میں حضرت عیسیٰ کے بارے میں یہودیوں کی تفریط کا ذکر تھا۔ اب اس کے مقابلے پر حضرت عیسیٰ ہی کے بارے میں عیسائیوں کے افراط کا ذکر ہے یا بقول حضرت متانوی اسی بات کو آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہودیوں کا غلو احکامِ ظاہری میں تعمق اور مسألِ باطنی کی طرف روگردانی کی صورت میں تھا اور عیسائیوں کا غلو مسألِ باطنی میں تعمق اور احکامِ ظاہر سے بے التفاتی کی صورت میں تھا۔ چنانچہ اعتدالِ ظاہر و باطن کی ہم آہنگی میں ہے۔

لا تغفلو غلو سے بڑا ہے۔ غلو کے معنی بڑھنے، زیادہ ہونے، حد سے بڑھ جانے کے ہیں۔ ہڈی کو اُبال آجاتے تو لہتے ہیں غلت الغد، یہاں فی دینکد کے اضافہ سے بتا دیا کہ دین میں غلو کمزور ہے دین میں غلو یہ ہے کہ اللہ کے دین میں اللہ کی کتاب اور اللہ کے پیغمبر نے جس کام، جس فکر، جس حالت کا جو درجہ اور مرتبہ بتایا ہے اس کو بڑھا کر کچھ سے کچھ کر دیا جائے۔ مثلاً جو حکم صرف استحباب کا اور جو مکہ تھا اس کو فرض اور واجب کا درجہ دیا جائے، جس عمل کی جو صورت بتائی ہے اسے بگاڑ دیا جائے۔ جو شخص ایک فقیہ، مجتہد یا صالحی ہے اس کو معصوم بنا دیا جائے۔ جس کو اللہ نے نبی و رسول بنایا ہے اس کو خدا کا شریک یا خدا بنا ڈالا جائے۔ جس کی صرف تعظیم و تکریم مطلوب ہے اس کی عبادت شروع کر دی جائے۔ یہ اور اسی قبیل کی ساری باتیں غلو میں داخل ہیں۔ اور جس طرح دین میں تفریط بہت بُرا جرم ہے اسی طرح یہ افراط بھی بہت بُرا فتنہ ہے۔ اس سے اللہ کے دین کا وہ مزاج جو سراسر اعتدال ہے دوہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے۔ یوں تو اس غلو میں سب ہی مبتلا ہوئے ہیں۔ یہودیوں کا جرم اگر یہ تھا کہ وہ حضرت مسیح کے انکار و مخالفت میں حد سے بڑھ گئے تو عیسائیوں کا جرم یہ ہے کہ وہ حضرت مسیح کی عقیدت و محبت میں حد سے بڑھ گئے بلکہ انہوں نے اپنے غلو کے سبب سے پورے دین کا حلیہ بگاڑ دیا۔ حضرت عیسیٰ خدا کے بندے اور رسول تھے۔ ان کو انہوں نے خدا کا بیٹا بنایا اور پھر ان کو خدائی کے عرش پر بٹھا دیا حضرت مریم حضرت عیسیٰ کی والدہ محبتیں۔ ان کو نعوذ باللہ خدا کی ماں بنایا۔ حضرت جبریل خدا کے بندے اور فرشتے تھے۔ ان کو بھی ایک اقنوم کی حیثیت دے کر تثلیث کے کمرے میں کھڑا کر دیا۔ حضرت مسیح نے دنیا اور اس کے زخارف سے پختے پختے ہونے کی تاکید فرمائی تو انہوں نے دہبائیت کا ایک پورا نظام کھڑا کر دیا۔ غرض اس غلو کے چکر میں کوئی چیز بھی اپنی اصلی حالت پر برقرار نہیں رہی، افکار، اعمال، اخلاق اور احوال سب کاچھو بکھڑا ہو گیا۔ ان غرض اہل کتاب کی بہت بڑی گمراہی دین میں غلو ہے۔ یعنی حقیقت و اعتدال سے تہا و ہر کر بہت دُور تک چلے جانا۔ اگر کسی کی محبت و تعظیم کی تو اتنی تعظیم کی کہ اسے خدا کے درجہ تک پہنچا دیا۔ مخالفت پر آئے تو اتنی مخالفت کی کہ اس کی صداقت ہی سے انکار کر دیا۔ اگر زہد و عبادت کی راہ اختیار کی تو اتنی

دو تک چلے گئے کہ ربانیت تک پہنچ گئے۔ اگر دنیا کے پیچھے پڑے تو اتنے جھوٹ درہے نکام ہوئے کہ نیک و بد کی تیز ہی اشادی۔ میوہ و نصاریٰ اسی گراہی کا شکار ہوئے۔ یہاں خطاب عیسائیوں سے ہے کہ انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کی محبت میں اس قدر غلو کیا کہ انہیں خدا کا بیٹا بنادیا۔ اور ایک خدا کی بجائے تین خدا بنائے۔ باپ بیٹا اور روح القدس کا اجتماع پیدا کر لیا۔

اللہ کے دین میں فساد کا دروازہ

۲۵۲۔ اور اللہ کے ہائے میں حق کے سوا کچھ نہ کہو۔ یعنی دین کے موضوع پر کوئی عقیدہ، کوئی عمل، عمل کی کوئی صورت میں اپنی رائے نہ گھڑو اور توحید میں شرک کا کوئی شائبہ بھی نہ آنے دو۔ دراصل دین میں غلو کا فتنہ جس راہ سے پیدا ہوتا ہے اور پھر اس کی تابید و تقویت کا سامان جہاں سے فراہم ہوتا ہے۔ یہ اس کا سبب بڑا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اللہ کی طرف وہی بات منسوب کی جائے جو اس نے فرمائی ہے تو اس سے کسی فتنہ کا دروازہ نہیں کھل سکتا۔ فتنہ کا دروازہ اس وقت کھلتا ہے جب اس کی طرف وہ بات منسوب کی جائے جو اس نے نہیں فرمائی ہے۔ یہی چیز بدعت ہے اور یہیں سے شیطان کو دین میں گھسنے کا اور اس میں فساد برپا کرنے کی راہ کھلتی ہے۔ نصاریٰ جہاں سے ہلاک ہوئے وہ یہی دروازہ ہے انہوں نے گمراہ قوموں سے غلط عقیدے اور باطل طریقے اخذ کیے۔ خصوصاً فلاسفہ یونان کی طرف جن کی تعلیمات سے متاثر ہو کر عیسائی اس رابطہ مستقیم سے ہٹ گئے جس کی طرف ابتداء ان کی رہنمائی ملے گی تھی۔ حضرت مسیح کے ابتدائی پیروکار جو عقائد رکھتے تھے وہ بڑی حد تک اس حقیقت کے مطابق تھے جس کا مشاہدہ انہوں نے خود کیا تھا اور جس کی تعلیم حضرت مسیح نے ان کو دی تھی مگر بعد کے عیسائیوں نے ایک طرف حضرت مسیح کی حقیقت اور تعلیم میں غلو کر کے اور دوسری طرف ہمایہ قوموں کے ادھام اور فلسفیوں سے متاثر ہو کر اپنے عقائد کی مبالغہ آمیز فلسفیانہ تعبیرات شروع کر دیں اور ایک بالکل ہی نیا مذہب تیار کر لیا جس کی مسیح کی تعلیمات سے کوئی نسبت نہ تھی۔

اس موضوع پر خود ایک مسیحی عالم دیونید چارج دلیم کا بیان قابل ملاحظہ ہے،

عقیدہ تثلیث کا فکری سانچہ یونانی ہے اور یہودی تعلیمات اس میں ڈھالی گئی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ہمارے لیے ایک عجیب قسم کا مرکب ہے۔ مذہبی خیالات بائبل کے اور ڈھلے ہوئے ایک عیسوی فلسفہ کی صورتوں میں۔ باپ، بیٹا، روح القدس کی اصطلاحیں یہودی ذرائع کی جہم پہنچائی ہوئی ہیں آخری اصطلاح اگرچہ خود مسیح نے شاذ و نادر ہی کبھی استعمال کی تھی، اور ہال نے بھی جو اس کو استعمال

کیا۔ اس کا مفہوم بالکل غیر واضح تھا۔ تاہم یہودی لٹریچر میں یہ لفظ شخصیت اختیار کرنے کے قریب پہنچ چکاتا ہے۔ اس عقیدے کا مولد یہودی ہے۔ اگرچہ اس مرکب میں شامل ہونے سے وہ بھی یزانی اثرات سے مغلوب ہو چکا تھا اور مستند خالص یزانی، اصل سراج میں پر یہ عقیدہ بنا وہ ذکر الہی اخلاقی سوال کا مذہبی جگہ وہ سراسر ایک فلسفیانہ سوال تھا۔ یعنی یہ کہ ان میزوں کا قیام باپ بیٹا، روح القدس کے درمیان تعلق کی حیثیت کیا ہے؟ لکھنا اس کا جواب ہو رہا ہے وہ اس عقیدے میں یسوعیائی کو نسل میں مقرر کیا گیا تھا اور اسے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تمام خصوصیات میں بالکل یزانی ٹھوکھا ہوا ہے۔

ایک اور مسیحی عالم کا بیان اناسیکلو پیڈیا برٹانیکا میں یسوع مسیح کے عنوان کے تحت لکھا گیا ہے۔
 محد پنکست کے موقع پر بطرس کے یہ الفاظ کہ ایک انسان جو خدا کی طرف سے تھا۔ "یسوع کو اس حیثیت میں پیش کرتے ہیں جس میں اس کے ہم عصر اس کو جانتے اور سمجھتے تھے۔" انجیلوں سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ یسوع یسوع کے جو انیمک بالکل فطری طور پر جمالی و ذہنی نشوونما کے خارج سے گزرا۔ اس کو بھوک پیاس لگتی تھی، وہ تھکتا اور سوتا تھا۔ وہ حیرت میں مبتلا ہو سکتا تھا اور دریافت حال کا محتاج تھا۔ اس نے ڈکھ اٹھایا، اس نے صرف یہی نہیں کر سیک، و بصیرت برسنے کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ مرسیا اس سے انکار کیا ہے درحقیقت اس کے حاضر و ناظر ہونے کا اگر دعویٰ کیا جائے تو یہ اس پر بڑے تصور کے بالکل خلاف ہو گا جو ہمیں انجیلوں سے حاصل ہوتا ہے بلکہ اس دعویٰ کے ساتھ آزمائش کے واقعہ کو اور متسننی اور کھوپڑی کے مقام پر جو درات گزریں ان میں سے کسی کو بھی مطابقت نہیں دی جاسکتی، تاہم ان واقعات کو بالکل غیر حقیقی قرار دے دیا جائے۔ یہ ماننا پڑے گا کہ مسیح جب ان سارے حالات سے گزرا تو وہ انسانی علم کی عام محدودیت اپنے ساتھ لیے ہوئے تھا اور اس محدودیت میں اگر کوئی استثنا تھا تو وہ صرف اسی حد تک جس حد تک پیغمبرانہ بصیرت اور خدا کے یقینی شہود کی بنا پر ہو سکتا ہے۔ پھر مسیح کو قادر مطلق سمجھنے کی گنجائش تو انجیلوں میں بہت کم ہے۔ کہیں اس بات کا اشارہ تک نہیں ملتا کہ وہ خدا سے بے نیاز ہو کر خود مختار کام کرتا تھا اس کے برعکس وہ بار بار دعا مانگنے کی عادت سے اور اس قسم کے الفاظ سے کہ "یہ چیز دعا کے سوا کسی اور ذریعہ سے نہیں لی جاسکتی۔" اس بات کا صاف اقرار کرتا ہے کہ اس کی ذات بالکل خدا پر منحصر ہے۔

بہر حال حضرت مسیح کی انہیت ان میں خدا کے حلول کا عقیدہ، تثلیث کا نظریہ سانچہ اور حضرت مسیح کے بارے میں دانستے جب، قادر مطلق، مختار کل، اور حاضر و ناظر ہونے کے تصورات کی حیثیت تو ال علی اللہ بیزالحق کے سوا کچھ نہیں ہے اور قرآن کے نزدیک یہ سنگین جرم ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ

دین میں غلو خواہ عقائد میں ہو یا اعمال میں اور چاہے اخلاق میں ہو یا احوال میں فی الواقع اللہ پر خلاف واقعہ بات حق پرنے کے مترادف ہے۔ یعنی اگر ایک کام ایک بات، ایک حال دین کے بنائے ہوئے علم و عمل میں نہیں ہے اور آپ کہتے ہیں کہ دین ہے تو آپ یہ کہہ کر کہ اللہ حکم ہے تو پر حشر بلا حشر یا دیگر حکم خدا کی کسی چیز کو دین کہنا اور موجب ثواب و عقاب بنانا اللہ پر جھوٹ بولنے کے مترادف ہے۔ قرآن میں ہے

دَمِنَ الظُّلُمِ مَنْ افترى على الله كذبا

اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ بولے۔

یہی حضرت عیسیٰ کے بارے میں یہ تصورات رکھنا اور ان کی اشاعت خدا پر جھوٹ بولنا ہے۔

مریم کے بیٹے اور خدا کے رسول ہیں

۲۵۳۔ مریم لایا بیٹا عیسیٰ بس اللہ کا رسول ہے۔ یعنی وہ معبود والہ نہیں، خدا نہیں اور منجبر خدا نہیں بلکہ وہ صرف اللہ کے رسول ہیں۔ رسول، رسالت سے بنا ہے۔ رسالت کے لفظی معنی سفارت کے ہیں قرآن کی اصطلاح میں رسالت اس سفارت کو کہتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں تک اپنے قانونی احکام پہنچانے اور انہیں اپنی مرضی کی راہ بنانے کے لیے قائم کیا ہے اس کا دوسرا نام نبوت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں تک اپنے احکام پہنچانے کے لیے ہمیشہ انسانوں کو ذریعہ بنایا ہے یعنی اللہ کے یہ رسول زمرہ مشورتوں میں سے ہوتے تھے نہ جنوں میں سے نہ کسی اور مخلوق میں سے اور دایا ہے کہ اپنے احکام بتانے کے لیے اللہ تعالیٰ خود ہی کسی انسانی یا غیر انسانی شکل میں یہاں اتار دیا ہو۔ اس کے برعکس واقعہ یہ ہے کہ جب بھی رسول بھیجا گیا تو یہ انسانی ہی میں سے بھیجا گیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَمَا ارسلنا من قبلك الا رجالا نسوحا اليهم

ہم نے تم سے پہلے مردوں ہی کو پیغمبر بنا کر روانہ کیا ہے جن کی طرف ہم وحی کرتے ہیں۔

اس لیے یہ بدیہی بات ہے کہ رسالت کے لیے ہمیشہ انسان ہی کا تصور ہو رہا ہے ٹھیک دیے ہی انسانوں کا جیسے کہ ہم اور آپ ہیں۔ ہماری ہی طرح وہ بھی جسم و جان رکھتے تھے، قومیں اور خواہشیں رکھتے، بڑی بچے رکھتے۔ قوانین طبعی کے تحت پیدا ہوتے، نشو و نما پاتے، اکھڑتے اور پیتے اور سوتے اور جاگتے، خوشی اور غم کا احساس کرتے، چلتے اور روتے، تندرست رہتے، بیمار پڑتے اور وفات پاتے۔ غرض وہ ہر پہلو سے انسان ہوتے اور انسانیت کی ایک ایک چیز ان کے اندر موجود ہوتی۔ قرآن نے متعدد آیات میں حقیقت حال کی یہ تفصیل بتائی ہے مثلاً ۔

اینعم فیما سکون الطعام ویشون فی الی سوات
باشیرہ اللہ کے رسول کھانا کھاتے اور بازاروں میں چلتے تھے۔

اور

وجعلنا لہم ازواجاً وذریۃ

ہم نے ان کے یومی بچے بناتے تھے۔

جس صلیبت کی بنا پر رسالت کے لیے انسانوں ہی کا تقرر ہوا اس کی بھی قرآن حکیم نے نشاندہی کر دی ہے۔ جب لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے خلاف یہ دلیل دی کہ اگر اللہ کو ہمارے پاس اپنا کوئی رسول بھیجا ہوتا تو کسی فرشتے کی بجائے، بلکہ ہمارے ہی جیسے ایک انسان کو تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قل لو کان فی الارض ملائکۃ یشون مطہتین نزلنا علیہم من السماء
مکسرات سوئ۔

اے رسول ان سے کہہ دو کہ اگر زمین میں فرشتے آباد ہوتے تو ہم مژدوران پر آسمان سے کسی فرشتہ بھی کو رسول بنا کر روانہ کرتے۔

یہ آیت رسالت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ضابطہ بنا رہی ہے کہ رسول کو اسی جنس اور اسی مخلوق میں سے ہونا چاہیے جس کے پاس ہمارے رسالت کا فرض انجام دینا ہے۔ بظاہر اگرچہ صرف ایک بات ہے لیکن فی الواقع یہ ایک ایسا حکمت ہے جو عقل سلیم کو پوری بات سمجھا دیتا ہے۔ اس سے یہ حقیقت آپ سے آپ کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ انسانوں تک اللہ کے احکام پہنچانے والے رسولوں کا انسان ہی ہونا ضروری تھا۔ ورنہ رسالت کا منشا پورا ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ قرآن نے اس آیت میں ابن مریم کو کہہ کر یہی بات سمجھائی ہے کہ انسان ہیں اور انسان ہو کر اللہ کے رسول ہیں۔

حضرت عیسیٰ کی اعجازی ولادت

۲۵۲۔ اور حضرت مسیح اللہ کا کلمہ ہیں جسے اللہ نے مریم پر اتار دیا تھا۔ یعنی حضرت عیسیٰ مریم کے بیٹے ہیں اور حضرت مریم سے ان کی ولادت عام تخلیقی ضابطہ سے نہیں بلکہ اللہ کے کلمہ کن سے ہوئی۔ مطلب یہ ہے کہ صرف کلمہ کن سے بلا توسط اسباب پیدا ہوتے۔ اگرچہ تمام لوگوں کی پیدائش اللہ ہی کے کلمہ سے ہوئی ہے مگر چونکہ بظاہر اور لوگوں میں کچھ اسباب ظاہری کا بھی منکاو ہوتا ہے۔ حضرت عیسیٰ کی

ولادت میں یہ بھی نہ تھا اس لیے ان پر کلمۃ اللہ کا اطلاق ہوا۔ یہاں مریم کی طرف کلمہ بھیجنے کا مطلب یہ ہے کہ مریم کے رحم پر اللہ نے یہ فرمان نازل کیا کہ کسی مرد سے تعلق کے بغیر حمل کا اشتقاق قبول کرے۔ عیسائیوں کو انتہائی مسیح کی پیدائش بے پدر کا یہی راز بتایا گیا تھا۔ مگر انہوں نے یونانی فلسفہ سے گراہ ہر کہ پہلے لفظ کلمہ کو کلام کا ہم معنی سمجھ لیا۔ پھر اس کلام سے اللہ کی ذاتی صفت کلام مراد لے لی۔ پھر یہ قیاس قائم کیا کہ اللہ کی اس صفت ذاتی نے مریم کے بطن میں داخل ہر کہ وہ جسمانی صورت اختیار کر لی جو مسیح کی شکل میں رونما ہوئی۔ اس طرح عیسائیوں میں مسیح علیہ السلام کے خدا ہونے کا لفظ عقیدہ پیدا ہوا اور اس غلط تصور نے جڑ پکڑ لی کہ خدا نے خود اپنے آپ کو یا اپنی ذاتی صفات میں سے صفت کلام کو مسیح کی شکل میں ظاہر کیا ہے۔ اس طرح عیسائیوں نے لفظ کلمہ کو بھنے ذات خدا یا اقنوم علم سمجھ لیا ہے اور اپنے ان اخراج معنی کو لے کر ہی ان کو قرآن کی اس آیت کے سمجھنے میں یہ شبہ ہو گیا کہ قرآن نے حضرت مسیح کو خدا کا کلمہ کہہ کر حضرت مسیح کی الوہیت کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن ان کا ایسا سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ سمجھنے والوں نے تو عیسائیوں کے اس ایک شبہ پر بہت کچھ لکھا ہے لیکن حضرت مولانا نذیر الرحمن قدس اللہ سرہ العزیز نے ازالۃ التکوک میں اس کا جو جواب دیا ہے وہ بے نظیر اور عجیب ہے۔ ہم معالم القرآن کے پڑھنے والوں کی ضیافت طبع کے لیے یہاں اس کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

لفظ کلمہ لغتاً ب میں کہیں بھنے ذات خدا یا اقنوم علم استعمال نہیں ہوا ہے۔ قرآن میں جہاں بھی کلمہ یا اس کی جمع کلمات خدا کی طرف صفات ہو کر آیا ہے جیسے کلمۃ اللہ، کلمہ ربکم، کلمات ربہا، کلمنا، اور کلماتہ، وہاں بھنے کلام خدا یا حکم خدا آتا ہے مثلاً سورۃ توبہ میں : کلمۃ اللہ ہی العلیا، اللہ کی بات ہمیشہ اوپر ہے۔ اور سورۃ انعام میں ہے : وقت کلمۃ اللہ جلت مد قادم یعنی صداقت اور صداقت کی دوسری تہرے رب کی بات پوری ہو گئی۔ اور سورہ صافات میں ہے : ولعلہ سبقت کلمنا لعبادنا المرسلین ہمارا حکم اپنے بندوں کے حق میں جو رسول ہیں پہلے ہو چکا ہے۔ بہر حال قرآن میں ہر جگہ لفظ کلمہ یا کلمات خدا کی بات اور خدا کے حکم کے معنی میں آیا ہے اور کہیں بھی بھنے ذات یا اقنوم علم نہیں آیا ہے۔

حضرت مسیح کلمۃ اللہ ہیں

حضرت مسیح جو کلمہ بغیر اب کے پیدا ہوئے یعنی عادت الہی کے خلاف بل کی ولادت اللہ تعالیٰ نے امر یعنی کن سے ہوئی اور اس طرح ان کو ولادت میں ایک قسم کا اختصاص ملا ہے اور یہودی ان کی

اس اختصاصی شان کو نہیں مانتے تھے اس لیے قرآن میں اللہ سبحانہ نے حضرت موسیٰ کو کلمۃ اللہ فرمایا۔ ورنہ سادگی ساری مخلوق ہی اللہ کے حکم سے پیدا ہوتی۔ اور اختصاصی شان کو ظاہر کرنے کیلئے کلمہ کا اطلاق عربی زبان میں عام طور پر ہوتا تھا۔ مخلوق پر لفظ مقدور پر لفظ قدرت ترجمہ لفظ اللہ تعالیٰ پر شہوت لولا جاتا ہے اسی طرح کلمہ کن کے ذریعے جس کی ولادت ہوتی ہے اس کو کلمہ کہہ دینا لغت اور محاورے کے مطابق ہے۔

خود عہد جدید اور قدیم کی کتابوں میں یہ لفظ بھنے کلام خدا اور حکم خدا آتا ہے۔ مثلاً زبور عربی میں ہے۔

بِکَلِمَةِ الْمَلَأْتِ السَّمَاوَاتِ وَبِرُوحِ حَبِیْبٍ جَمِیعَ جَنُودِهَا۔

اس کا فارسی ترجمہ یوں کیا گیا ہے :

۱۔ مملو کلام خدا و عدد قہری عساکر انہا بنفس و ہامش ساختہ اند۔

اور ۲۔ کلمہ کے ہندی ترجمہ میں ہے :

خداوند کے کلام سے آسمان بنے اور ان کے سامنے لشکر اس کے مژدے کے دم سے ۔

اور اخبار الایام کی پمیل کتاب کے سترہویں باب میں ہے ۔

اور اسی رات ایسا ہوا کہ خدا کا کلام ناتان نبی کو پہنچا ۔

اور انجیل لوقا کے تیسرے باب میں ہے :

خدا کا کلام بیابان میں زکریا کے بیٹے کیلئے پہنچا

اور اعمال کے چوتھے باب میں ہے :

خدا کی بات دلیری سے کہنے لگے

اور اعمال کے چھٹے باب میں ہے :

تب ان بارہ دستوروں نے سب مریدوں کو بلا کے کہا کہ مناسب نہیں کہ ہم خدا کی

بات کو جھوٹے میر کی خدمت کریں اور خدا کی بات پھیل گئی ۔

اور اعمال کے بارہویں باب میں ہے :

لیکن خدا کا کلام پھیل کر بڑھ گیا ۔

اور اعمال کے تیرہویں باب میں ہے :

اور سلامی شہر میں پہنچ سکے یہودیوں کی عبادت گاہوں میں خدا کے کلام کا وعظ

کرنے لگے ۔ چاہا کہ خدا کا کلام سننے ۴۴۔ دو سری بہت کے دن کو زیب سارے

شہر کی باہم آئی تاکہ خدا کی بات سنیں ۔ ۴۶۔ تب پادل اور برناہ نے دلیری کر کے

کہ ضرور تھا کہ خدا کا کلام پہلے تم سے کیا۔

نامر اولیٰ رحمان کے باب دوم میں ہے :

اے جوانو! میں نے تمہیں لکھا ہے کہ تم دلیر ہو اور خدا کی بات تم میں رہتی ہے۔

ان سب مقامات میں فقط کلمہ حکم اور بات کے مینہ میں آیا ہے یہ

بہر حال حضرت عیسیٰ کے بارے میں کلمہ اللہ ان کی تشریف و خصوصیت بتانے کے لیے آیا ہے ذکر ان کی

الوہیت، مطلب یہ ہے کہ ان کی خالق عادت و ولادت کو قیاسی چیز نہیں ہے جس کی بنا پر ان کو خدا کی علامت

دے دیا جاتے۔ ان کی ولادت اسی طرح لکھ کر ہے ہوتی ہے جس طرح آدم کی ولادت لکھ کر ہے ہوتی ہے۔

اسباب تو ظاہر کا پردہ ہیں و ہر داند زندگی ترجیحے بھی ملتی ہے خدا ہی کے حکم سے ملتی ہے ادبیں۔

حضرت عیسیٰ روح من اللہ ہیں

۲۵۵۔ اور ایک روح ہے جو اللہ کی جانب سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے ذمہ ایسے ہوتے اور

اللہ کی بنائی ہوئی روح ہیں جو بلا اسباب عادی ظاہری مریع کے بطن میں مہم ہو گئے۔ یعنی حضرت عیسیٰ خدا تعالیٰ

کی طرف سے ایک پاکیزہ روح ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے بغیر باپ کے محض نفخہ جبریل سے پیدا کیا جیسے جبریل میں

کو روح القدس کہا جاتا ہے اس لیے کہ وہ خدا تعالیٰ کے پیدا کردہ پاک روح ہیں۔ گویا حضرت عیسیٰ کو اللہ نے

وہ پاکیزہ روح عطا کی تھی جو بدی سے نا آشنا تھی، سرا سر حقانیت اور راست بازی تھی اور از سر تا پا

فضیلت، اخلاق تھی۔ حضرت عیسیٰ کی یہ تعریف عیسائیوں کو بھی بتائی گئی تھی مگر انہوں نے اس میں غلو کیا۔

روح من اللہ کہ عین روح اللہ قرار دے لیا اور مطلب یہ لیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی پہلی روح تھی جو مریع کے اندر ملتی کر

گئی۔ یہ عیسائیوں کا دوسرا زبردست غلو تھا جس کی وجہ سے وہ گمراہی میں مبتلا ہو گئے۔ اور تو اور کچھ دلیر

عیسائیوں نے قرآن کی اس تعبیر کا بھی منہ بگاڑ کر کہہ دیا اور برملا کہہ دیا۔ اس آیت کے سوانحی حضرت عیسیٰ

روح اللہ ہیں تو البتہ الوہیت کے مرتبہ میں ہیں۔ اس لیے کہ خدا کی روح کچھ خدا سے کمتر نہیں ہے۔ حضرت مرثا

رحمت اللہ قدس اللہ سرہ العزیز نے اس شبہ کا ازالہ الشکوہ میں جو جواب دیا ہے وہ صرف لطیف نہیں بلکہ

محققانہ ہے۔ اور بتایا ہے کہ قرآن میں حضرت عیسیٰ کو روح مزکیون کہا گیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ اس آیت میں روح

کی نسبت خدا کی طرف اگر حضرت یسح کے حق میں ہے تو دوسری آیات میں اور ان کے حق میں مجھ سے مثلاً

لے ازالہ الشکوہ۔

حضرت آدم کے بسے میں ہے لہذا سواہ و نفع فیہ من روحہ کہیں فرمایا و نفع فیہ من روحہ ان آیات میں حضرت آدم کے نفسِ ناطقہ کو اللہ نے اپنی روح فرمایا ہے اور روحہ و روحی اس پر بولتا ہے۔ ایک دوسرے موقع پر قرآن میں حضرت جبریل کو اپنی روح فرمایا فارسلنا الیجاں روحنا لہذا اس آیت میں روح نہ کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کا نفسِ ناطقہ اور جان اللہ کی جانب سے ہے۔

شاید آپ کے ذہنوں میں یہ غلطی ہو کہ اگر صرف اتنی سی بات ہے تو اس میں حضرت عیسیٰ کی خصوصیت کیا ہے جان تو سب کی اللہ کی دی ہوئی ہے۔ حضرت عیسیٰ کے بسے میں خاص طور پر یہ بات کیوں فرمائی گئی ہے۔ حضرت مولانا دکنہ اللہ قدس اللہ سرہ العزیز نے اس کی دس وجوہ بتائی ہیں۔ لیجئے آپ بھی پڑھ لیجئے۔ اولاً یہ کہ اللہ سبحانہ اپنی مخلوقات میں سے کسی مخلوق کو اپنی طرف اس لیے نسبت اور اضافت کرتے ہیں تاکہ لوگوں میں اس کی عظمت کی تلاش ہو جائے۔ یہ اضافت تشریفی ہوئی ہے۔ قرآن میں اس قسم کی اضافتیں متعدد ہیں۔ جتنی بزرگتر جنتی میری جنت، اس قسم کی اضافت صرف قرآن ہی میں نہیں ہے بلکہ حدیث و اور جدید کی کتابوں میں بحضرت موجود ہے مثلاً،

انجیل متی میں حضرت عیسیٰ کا ارشاد ہے کہ

میرا گھر بیت المقدس عبادت کا پہلا گھر کہلاتا تھا۔

کتاب پیدائش کے باب ۱۸ میں ہے

اور یہ پتھر جو میں نے کھڑا کیا خدا کا گھر ہوگا

سورہ بقرہ کی کتاب دوم باب کشمشم میں ہے:

اور داؤد اپنے سائے لوگوں کو رکھے کہ باطل میوہ سے چلا تا کہ خدا کی صندوق کو کر

جس کے پاس مشکروں کو ہوا کا نام لیا جاتا ہے جو دو کربوں کے بیچ میں دھرا تھا وہاں

سے پھر لاوے ۳۔ سوانہوں نے خدا کی صندوق کو نئی گاڑی میں رکھا۔

ان میں خدا کا گھر خدا کا صندوق میں اضافت تشریف کے لیے ہے۔

ہماریا یہ کہ کچھ چیزوں کی تخلیق عام عادتِ الہیہ کے خلاف اور عجیب طور پر ہوئی ہے۔ اللہ سبحانہ کو

جب اس تخلیقی عمل کو بتانا مقصود ہوتا ہے تو اس کی اضافت اپنی طرف کرتے ہیں جیسے ادنیٰ کو اللہ

فرمایا گیا ہے وہی ہے کہ اس کی تخلیق خلاف عادتِ الہیہ اللہ کی قدرت سے ہوئی ہے پتھر سے نکل

حق باقاعدہ کوئی ولادت نہ ہوتی تھی۔

ننانا یہ کہ روح کے سمنے چھونک کے آتے ہیں چونکہ حضرت عیسیٰ مریم کے بطن میں حضرت جبریل کی

پھر مک سے حل میں آئے تھے اور جبریل کی پھر مک محض اللہ کے حکم سے تھی اس لیے حضرت عیسیٰ کو روح اللہ کہہ دیا گیا۔

ابھائیہ کو روح کے معنی نعمت کے بھی آئے ہیں۔ حضرت عیسیٰ کی ذات مگر اسی بھی چونکہ اللہ کی رحمت تھی اس لیے ان کو روح اللہ کہہ دیا گیا۔

خاصاً عربی زبان میں روح پاکیزہ چیز کو بھی کہتے ہیں اور چونکہ حضرت عیسیٰ کی ولادت بغیر باپ کے نطفہ سے ہوئی تھی اس لیے ان پر عرب محاورے کے مطابق لفظ روح بولا گیا ہے۔

سادہ یہ کہ ہر ایسی چیز کو جو دینی امور میں مخلوق خدا کی بھلائی کا ذریعہ ہو عربی میں روح کہا جاتا ہے اسی اقبال سے قرآن کو روح کہا گیا ہے ارشاد ہے:

وَكَذَٰلِكَ أَدْعِينَا إِلَيْكَ رَوْحًا مِنْ أَمْرِنَا

ایسوی نے روح کی تفسیر قرآن سے کی ہے اور یہی خدا کی اسی کو قول مختار کہا ہے۔ حضرت عیسیٰ بھی چونکہ ہدایت و تزکیہ میں مخلوق کی بھلائی کا سبب ہیں اس لیے ان کو روح اللہ کہا گیا ہے۔

سادہ یہ کہ انجیل کی زبان میں ہر بچے کو روح اللہ اور روح الحق کہا گیا ہے۔ فی الواقع حضرت عیسیٰ ایک بچے کا عطف تھے اسی اعتبار سے قرآن نے ان کو روح کہا ہے۔ روح کے پہلے نام کے سچے باب میں ہے:

مے پیارو تم ہر داعط روح پر اعتقاد رکھو بلکہ دو سون داعطوں کو از ماؤ کو سے

خدا کی طرف سے ہیں کہ نہیں۔ کون روح (داعط) خدا سے ہے تم اسی سے ہانو ہر ایک روح

(داعط) جو آفر کرنا ہے کہ روح جس جسم میں ظاہر ہو خدا سے ہے۔ ہم خدا کے ہیں جو

خدا کو پہچانتا ہے۔ ہماری سناسا ہے اور جو خدا کا نہیں ہماری نہیں سناسا ہے ہم اسی سے

روح الحق بچے داعط اور روح الفضل اگر اسی کے داعط کو پہچانتے ہیں۔

اس میں روح اللہ روح الحق بچے داعط پر بولا گیا ہے۔

ثامناً یہ کہ انجیل اور عہد عتیق میں روح اللہ جسے قدرت خداوندی مستعمل ہے۔ چنانچہ انجیل متی کے

باب ۱۲ میں ہے:

لیکن اگر میں خدا کی روح سے دیو دوں کو دُر کرتا ہوں تو خدا کی بادشاہت تم تک

پہنچتی ہے۔

اور لوقا کی انجیل میں یہی بات اس طرح کہی گئی ہے کہ

اگر میں خدا کی قدرت سے دیو دوں کو نکالتا ہوں تو ابلتہ خدا کی بادشاہت تم

مکمل ہے۔

مسیح نے خدا کی روح سے بولا اور لڑتے خدا کی قدرت سے اسی کی تفسیر کر دی۔ حضرت مسیح بھی چونکہ بغیر باپ کے خدا کی قدرت سے پیدا ہوئے تھے اس لیے ان پر روح القدس اور روح من القدس کا اطلاق صحیح ہے۔ مسیح پر کہ کتبِ مہجد قدیم میں روح القدس میں نفسِ ناطقہ کو سمجھا گیا ہے جسے ادراکِ کاملی ہوا اور مصدرِ حیات ہو۔ چنانچہ کتابِ پیدائش کے باب ۳۱ میں بادشاہ مصر کا حضرت یوسف کے بائے میں قول آیا ہے۔ اور فرعون نے اپنے نوکر کو کہہ کر تم ایسا جیسا ہر مرد ہے جس میں خدا کی روح ہے پاسکتے ہیں۔

اور کتابِ دانیال کے باب چہارم میں ہے کہ روحِ خدایان مقدس دستِ او اس کے مقابلہ میں روحِ زنا وغیرہ آتی ہے۔ لوشیخ کی کتاب کے باب چہارم میں ہے اسرارِ کلامی کی روح نے انہیں گرا دیا ہے۔ چونکہ حضرت مسیح کا نفسِ ناطقہ ادراکِ کامل سے مالا مال، حسنت اور عجب و غرائب کا مصدر تھا، اس لیے ان کو روح القدس کہا گیا ہے۔ اس صورت میں اور پہلی اور دوسری میں روحِ منہ کا مصنف محذوف ہو گا اصل عبارت یوں ہے و ذور روح سے السیوطی نے مہالین اور قاضی بیضاوی نے انوار التنزیل میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔

عاشقِ آید کہ چونکہ مطلق روح کو تجرد اور اصل خلقت کے اعتبار سے اللہ کی ذات کے ساتھ ایک طرح کی نسبت ہے۔ اس لحاظ سے مطلق روح کی اضافت بھی خدا کی طرف صحیح ہے۔ چنانچہ فرقہ ایل کی کتاب میں اللہ سبحانہ نے ان سب لوگوں کو مخاطب کر کے جن کو حضرت خرقیل کے مجرہ سے زندہ کیا تھا فرمایا۔ اور جنب میں اپنی روح تم میں رکھوں گا۔ عربی میں تعبیر یوں ہے فاعطی فیکسہ روحی۔ اس میں اللہ سبحانہ نے ان لوگوں کی جان کو اپنی روح فرمایا ہے۔

بہر حال ان دعوہ کی بنا پر قرآن کی اس آیت میں اللہ سبحانہ نے حضرت مسیح کو روح فرمایا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ کلمۃ اللہ، روح اللہ قسم کے اعلانات سے حضرت مسیح کی الوہیت کو ثابت کرنا پرکے درجہ کی حماقت ہے۔ ہاں اس سے دوسری مخلوقات کے مقابلہ میں ایک طرح کی تفضیل ضرور ثابت ہوتی ہے۔

۲۵۶۔ لہذا تم اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور یہ ذکر کہ تم یقین ہیں۔ یعنی ان صحیح عقائد

کہہ لینے کے بعد اب صاحب ہے کہ اپنے خود تراشیدہ عقائد و خیالات کو چھوڑ کر اللہ اور اس کے رسولوں کی ہدایات پر ایمان لاؤ۔ اللہ کو الا واحد مالک اور تمام رسولوں کی رسالت تسلیم کرو جن میں سے ایک رسول مسیح بھی ہیں۔ یہی مسیح علیہ السلام کی اصلی تعلیم تھی اور یہی امر حق ہے جسے ایک بچے حضرت مسیح کے پیر کو ماننا چاہیے۔ اور نہ یہ کہو کہ تین ہیں۔ یعنی تین خداؤں کے عقیدے کو چھوڑ دو خواہ وہ کسی شکل میں ہو۔ وہ تین اقنوم ہوں یا تین مستقل بالذات ہستیاں ہوں۔ پہلے اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ ہر خدا کے تمام رسولوں کی تعلیم قرأت و انجیل میں موجود ہے اور اس تعلیم میں مسیح سے کہ آدم تک کہیں سراخ نہیں ملتا تو آخر یہ فہم نہ کہیں سے گھڑ لیا ہے۔ پس صحیح راستہ یہ ہے کہ الگ الگ جگہ مذہبی بنائے کے سمجھتے تم بھی اس مراطِ مستقیم پر چلو جس پر تمام نبی اور رسول چلے، آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ مسیح کی تعلیم اللہ اور اس کے رسولوں کے خلاف ہو۔

عیسائی مذہب میں خدا کا تصور

جہاں تک خدا کے وجود کا تعلق ہے عیسائی مذہب اس معاملہ میں دوسرے مذاہب سے مختلف نہیں ہے۔ وہ بھی خدا کو تعریف بنا انہی صفات کے ساتھ تسلیم کرتا ہے جو دوسرے مذاہب میں اس کے لیے بیان کی جاتی ہیں۔ ماس، لمن لکھتا ہے :

عیسائیت کا خدا کے بارے میں تصور ہے کہ وہ ایک زندہ جاوید وجود ہے جو تمام امکانی صفات کمال کے ساتھ متعسف ہے۔ اسے محسوس تو کیا جاسکتا ہے لیکن پلیدی طرح سمجھا جاسکتا نہیں سکتا اس لیے اس کی حقیقت کا ٹھیک ٹھیک تجربہ ہمارے ذہن کی قوت سے ماوراء ہے وہ فی نفسہ کیا ہے؟ ہمیں معلوم نہیں صرف اتنی بات معلوم ہے جو خود اس نے بنی نوع انسان کو وحی کے ذریعے بتلائی ہے۔

عقیدہ تثلیث

میان تک قرأت و واضح اور صاف ہے لیکن آگے چل کر اس مذہب نے خدا کے تصور کی جو تفصیلات بیان کی ہیں وہ بڑی الجھی ہوئی ہیں اور ان کا سمجھنا آسان نہیں ہے۔ یہ بات تو ہر کس نکس کو معلوم ہے کہ عیسائی مذہب میں خدا تین اقانیم سے مرکب ہے۔ باپ، بیٹا، روح القدس، اسی کو عقیدہ تثلیث کہتے ہیں لیکن بھگتے خود اس عقیدے کی تشریح و تعبیر میں عیسائی عقائد کے بیانات اس

قدر مختلف ہیں کہ یقینی طور پر کوئی ایک بات کہنا بہت مشکل ہے۔ وہ تین اقاہم کون ہیں؟ جن کا مجموعہ ان کے نزدیک خدا ہے۔ خود ان کی قیمن میں بھی اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ خدا باپ بیٹے اور روح القدس کے مجموعہ کا نام ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ باپ بیٹا اور کنواہی وہ تین اقنوم ہیں جن کا مجموعہ خدا ہے۔ پھر ان تین اقاہم میں سے ہر ایک کی انفرادی حیثیت کیا ہے اور خدا سے جوئے ثالث کہتے ہیں اس کا کیا رشتہ ہے؟ اس سوال کے جواب میں بھی ایک زبردست اختلاف ہے۔ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ ان تین میں سے ہر ایک بذات خود بھی ویسا ہی خدا ہے جسا مجموعہ خدا، ایک دوسرے گروہ کا کہنا ہے کہ ان تینوں میں سے ہر ایک الگ الگ خدا تو ہیں مگر مجموعہ خدا سے کتر ہیں اور ان پر نظر خدا کا اطلاق ذرا وسیع معنے میں کروا گیا ہے۔ تیسرے گروہ کا کہنا ہے کہ یہ تین خدا ہی نہیں خدا تو صرف ان کا مجموعہ ہے۔

خواب پریشان

غرض اس قسم کے بے شمار اختلافات ہیں جن کی وجہ سے تثلیث کا عقیدہ ایک خواب پریشان بن کر رہ گیا ہے۔ ہم اس جگہ عقیدے کی وہ تشریح پیش کرتے ہیں جو عیسائیوں کے یہاں سب سے زیادہ مقبول عام معلوم ہوتی ہے یہ تعبیر آنا سیکلو پیڈیا برٹانیکا کے الفاظ میں مندرجہ ذیل ہے ۱

تثلیث کے عیسائی نظریے کو ان الفاظ میں اچھی طرح تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ باپ خدا ہے، بیٹا خدا ہے اور روح القدس خدا ہے۔ لیکن یہ ٹکرتین خدا نہیں ہیں بلکہ ایک ہی خدا ہیں اس لیے کہ عیسائی نظریے کے مطابق ہم جس طرح محیوں میں سے ہر ایک اقنوم کو خدا اور آقا سمجھتے ہیں۔ اسی طرح ہمیں کیسٹرولک مذہب لے اس بات کی ممانعت کر دی ہے کہ ہم ان کو تین خدا یا تین آقا سمجھنے لگیں۔

اسی بات کو قدرے تفصیل سے بیان کرتے ہوئے تیسری صدی عیسوی کے مشہور عیسائی عالم اور فلسفی ہنٹ لگسٹن اپنی مشہور کتاب علی الثالث میں لکھتے ہیں :

عہد قدیم اور جدید کے وہ تمام کیسٹرولک علما جنہیں پڑھنے کا مجھے اتفاق ہوا ہے اور جنہوں نے مجھ سے پہلے تثلیث کے موضوع پر لکھا ہے وہ متدس صحیفوں کی روشنی میں اس نظریے کی تسلیم دینا چاہتے ہیں کہ باپ بیٹا اور روح القدس ٹکرتین خدا کی وحدت تیار کرتے ہیں، جو اپنی باہریت اور حقیقت کے اعتبار سے ایک اور ناقابل تقسیم ہے۔

اس وجہ سے وہ تین خدا نہیں ہیں بلکہ ایک خدا ہے اگرچہ باپ نے بیٹے کو پیدا کیا۔ لہذا بڑا باپ ہے وہ بیٹا نہیں ہے۔ اسی طرح بیٹا باپ سے پیدا ہوا ہے۔ اسی لیے جو بیٹا ہے وہ باپ نہیں ہے اور روح القدس بھی نہ باپ ہے نہ بیٹا بلکہ باپ اور بیٹے کی روح ہے جو دونوں کے ساتھ مساوی اور تثلیثی وحدت میں ان کی وحدت دار ہے لیکن یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ تثلیثی وحدت ہی انوار ہی مرم کے ہیٹ سے پیدا ہوئی ہے، اسے پیٹنس، پیلاطس نے چھانی دی اسے دفن کیا گیا اور پھر تیسرے روز زندہ ہو کر جنت میں چل گئی۔ کیونکہ یہ واقعات تثلیثی وحدت کے ساتھ نہیں، صرف بیٹے کے ساتھ پیش آئے تھے۔ اسی طرح یہ بھی نہ سمجھنا چاہیے کہ یہی تثلیثی وحدت یسوع مسیح پر کبر تر کی شکل ہیں اس وقت نازل ہوئی تھی جب اسے پتھر دیا جا رہا تھا بلکہ یہ واقعہ صرف روح القدس کو تھا۔ علیٰ ذہنیاں یہ سمجھنا بھی درست نہیں ہے کہ جب یسوع مسیح کو پتھر دیا جا رہا تھا یا جب وہ اپنے تین شاگردوں کے ساتھ پہاڑ پر کھڑا تھا۔ اس وقت تثلیثی وحدت نے اس سے پکار کر کہا تھا کہ تو میرا بیٹا ہے۔۔۔ بلکہ یہ الفاظ صرف باپ کے بنے جو بیٹے کے لیے لڑے گئے تھے۔ اگرچہ جس طرح باپ بیٹے اور روح القدس ناقابل تقسیم ہیں۔ اسی طرح ناقابل تقسیم طریقے پر وہ کام بھی کرتے ہیں، یہی میرا عقیدہ ہے اس لیے کہ یہ کیتھولک عقیدہ ہے۔

تین کو ایک اور ایک کر تین قرار دینے کی عیسائیوں کے پاس وجہ جواز کیا ہے۔ اس سوال کا جواب سننے سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ عیسائی مذہب میں باپ بیٹے اور روح القدس سے کیا مراد ہے۔

عیسائی مقلد کے نزدیک باپ سے مراد خدا کی تنہا ذات ہے جس میں اس کی صفت کلام اور صفت حیات سے قطع نظر کر لی گئی ہے۔ یہ ذات بیٹے کے وجود کے لیے اصل کا درجہ رکھتی ہے۔ مشہور عیسائی لکھائے سینٹ تھامس ایکنیاس کی تشریح کے مطابق باپ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس نے کسی کو جنم دیا اور کوئی ایسا وقت گزرا ہے جس میں باپ تھا اور بیٹا نہیں تھا بلکہ یہ ایک خدائی اصطلاح ہے جس کا مقصد صرف یہ ہے کہ باپ بیٹے کے لیے اصل ہے جس طرح ذات صفت کے لیے اصل ہوتی ہے اور جب سے باپ موجود ہے اسی وقت سے بیٹا موجود ہے اور ان میں سے کسی کو کسی پر کوئی زمانی اولیت حاصل نہیں ہے۔

خدا کی ذات کو باپ کیوں کہا جاتا ہے۔ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے الفرڈ ای ٹھارڈ نے لکھا ہے کہ

اس سے کئی حقائق کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔ ایک تو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تمام مخلوقات اپنے وجود میں خدا کی محتاج ہیں۔ جس طرح بیٹا باپ کا محتاج ہوتا ہے، دوسری طرف یہ بھی ظاہر کرنا ہے کہ خدا اپنے بندوں پر اس طرح شفیع اور مہربان ہے جس طرح باپ اپنے بیٹے پر مہربان ہوتا ہے۔

(انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن: اینڈینٹیکس ۵ ص ۳۵)

بیٹے سے مراد عیسائیوں کے نزدیک خدا کی صفت کلام ہے۔ لیکن یہ انسانوں کی صفت کلام کی طرح نہیں ہے۔ انسانوں کی صفت کلام اور خدا کی صفت کلام کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے ایکویناس لکھتا ہے۔
انسانی قدرت میں صفت کلام کوئی جوہری وجود نہیں ہے اسی وجہ سے اس کو انسان کا بیٹا یا سرورود نہیں کہہ سکتے لیکن خدا کی صفت کلام ایک جوہری ہے جو خدا کی ہئیت میں اپنا ایک وجود رکھتا ہے اسی لیے اس کو حقیقتاً ذہناؤں کا بیٹا کہا جاتا ہے اور اس کی اصل کا نام باپ ہے۔

عیسائی عقیدے کے مطابق خدا کو جس قدر معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ اسی صفت کے ذریعے ہوتی ہیں۔ اور اسی صفت کے ذریعے تمام اشیاء پیدا ہوتی ہیں۔ یہ صفت باپ کی طرح قدیم اور جاودانی ہے۔ خدا کی یہی صفت یسوع مسیح بن مریم کی انسانی شخصیت میں حلول کر گئی تھی جس کی وجہ سے یسوع مسیح کو خدا کا بیٹا کہا جاتا ہے۔ حلول کا یہ عقیدہ ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔

روح القدس سے مراد باپ اور بیٹے کی صفت حیات اور محبت ہے یعنی اس صفت کے ذریعے خدا کی ذات (باپ) اپنی صفت علم (بیٹے) سے محبت کرتی ہے اور بیٹا باپ سے محبت کرتا ہے۔ یہ صفت بھی صفت کلام کی طرح ایک جوہری وجود رکھتی ہے اور باپ بیٹے کی طرح قدیم اور جاودانی ہے۔ اسی وجہ سے اسے ایک مستقل اقنوم کی حیثیت حاصل ہے۔ عیسائیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ جب حضرت یسوع کو پتھر دیا جا رہا تھا تو یہی صفت ایک کبوتر کے جسم میں حلول کر کے حضرت یسوع علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ اس کے بعد جب حضرت یسوع کو آسمان پر اٹھایا گیا تھا تو عید پینٹی کوسٹ کے روز بھی روح القدس آتشیں زبانوں کی شکل میں حضرت یسوع کے حواریوں پر نازل ہوا۔

اب عقیدہ توحید فی التثلیث کا خلاصہ یہ ہوا کہ خدا تین اقنوم یا اشخاصوں پر مشتمل ہے۔ خدا کی ذات جسے باپ کہتے ہیں خدا کی صفت کلام جسے بیٹا کہتے ہیں اور خدا کی صفت حیات جسے روح القدس کہا جاتا ہے۔ ان تین میں سے ہر ایک خدا ہے۔ لیکن یہ تینوں مل کر تین خدا نہیں ہیں بلکہ

ایک ہی خدا ہیں۔

مولانا عبداللہ دہلوی نے اپنی تفسیر میں یہی تئلیٹ کا عقیدہ خود مسیحیوں کے الفاظ میں یہ بتایا ہے کہ ”اپ بے اور روح القدس کی الوہیت ایک ہی ہے۔ جلال برابر عظمت ازلی کیساں، جیسا باپ ہے ویسا ہی بیٹا اور ویسا ہی روح قدس ہے۔ باپ غیر مخلوق، بیٹا غیر مخلوق اور روح قدس غیر مخلوق۔ باپ غیر محدود، بیٹا غیر محدود اور روح قدس غیر محدود۔ باپ ازلی بیٹا ازلی اور روح قدس ازلی، تاہم تین ازلی نہیں بلکہ ایک ازلی، اسی طرح تین غیر محدود نہیں اور تین غیر مخلوق بلکہ ایک غیر مخلوق اور ایک غیر محدود اور تین ہی باپ قادر مطلق، بیٹا قادر مطلق اور روح قدس قادر مطلق۔ قریبی تین قادر مطلق نہیں بلکہ ایک قادر مطلق ہے۔ ویسا باپ خدا بیٹا خدا روح القدس خدا جس پر ہی تین خدا نہیں بلکہ ایک خدا تین ہیں ایک اور ایک میں تین کے اسی گرد کہ دھندے کو جیسا تین کے لیے ایک ناقابل حل چستان بنا دیا۔ تقریباً اسو برس سے مسیحی علماء اسی خود پیدا کردہ خلک کو حل کرنے پر سرکھپا ہے۔ تینوں فرشتے اسی کی مختلف تعمیرات پر بنے ہیں، اسی پر ایک گردہ نے دوسرے کی تکفیر کی ہے۔ اسی کے جھگڑوں میں کلیسا پر کلیسا الگ ہو گئے۔ اسی پر ان کے سارے علم کلام کا زور ہے۔ حلاکوہ کی شکل نہ خدا نے پیدا کی تھی اور نہ حضرت مسیح نے اور نہ اس چستان کا کوئی حل ممکن ہے۔ یہ اڑہن خود ان کے غلو کی تخلیق ہے۔ اس کا بس یہی ایک حل ہے کہ وہ غلو سے باز آجائیں اور تین کنجا چھوڑ دو اور بس۔

حلول و تجسم کے عقیدہ کا ابطال

۲۵۷۔ اس سے باز آھا اس میں تھساے لیے خیر ہے۔ یعنی تین خدا کہنے سے اور تین میں ایک اور ایک میں تین کے جکڑ سے باز آھا۔ یہ بات دھمکی کے انداز میں ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس کہنے سے باز آھا کہ خدا کی صفت کلام انسانوں کی صلاح کے لیے حضرت مسیح کے انسانی وجود میں حلول کر گئی۔ حضرت مولانا اشرف علی نے یہ بات بروقت فرمائی ہے کہ یہ آیت گرامی حلول و اتحاد کے بطلان صریح پر دال ہے۔ حضرت مسیح کے ہاں میں حلول و تجسم کا عقیدہ سب سے پہلے انجیل یوحنا میں ملتا ہے اس انجیل کا مصنف حضرت مسیح کی سوانح کی ابتداء ان الفاظ سے کرتا ہے۔

ابتداء میں کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خدا تھا یہی ابتداء میں

نے جیسا بت کیا ہے از مولانا محمد تقی عثمانی

خدا کے ساتھ تھا۔ (یوحنا ۱: ۲)

اور اُنکے چل کر دکھاتا ہے :

اور کلام مجسم ہوا اور فضل اور سچائی سے معمور ہو کر ہمارے درمیان رہا اور ہم

نے اس کا ایسا جلال دیکھا جیسا باپ کے اکلوتے کا جلال۔ (یوحنا ۱: ۱۴)

ہو نہ ہو عیسائی مذہب میں کلام خدا کے اقنوم ابن سے عبارت ہے جو خود مستقل خدا ہے اس لیے یوحنا کی عبارت کا مطلب یہ ہوا کہ خدا کی صفت کلام یعنی بیٹے کا اقنوم مجسم ہو کر حضرت مسیح علیہ السلام کے روپ میں آگیا تھا۔ ماس ریٹیں اس عقیدے کی تشریح کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

کیسٹرلک عقیدے کا یہ کہنا ہے کہ وہ ذات جو خدا متقی خدا کی صفات کو چھوڑے بغیر

انسان بن گئی یعنی اس نے ہمارے جیسے وجود کی کیفیات اختیار کر لیں جو زمان و مکان کی قید

میں مقید ہے اور ایک معتبر تک ہمارے درمیان مقیم رہی۔

بیٹے کے اقنوم کو یسوع مسیح علیہ السلام کے انسانی وجود کے ساتھ متحد کرنے والی طاقت عیسائیوں

کے نزدیک روح القدس تھی۔ روح القدس سے مراد عیسائیوں میں خدا کی صفت محبت ہے۔ اس لیے اس عقیدے کا مطلب یہ ہوا کہ چونکہ خدا کو اپنی بندوں سے محبت تھی اس لیے اس نے اپنی صفت محبت کے ذریعے اقنوم ابن کو دنیا میں بھیج دیا تاکہ وہ لوگوں کے اصلی گناہ کا کفارہ بن سکے۔

یہاں بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ عیسائیوں کے نزدیک بیٹے کے حضرت یسوع میں حلول کرنے

کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بیٹا خدا کی چھوڑ کر انسان بن گیا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ پہلے صرف خدا تھا اب

انسان بھی ہو گیا لہذا اس عقیدے کے مطابق حضرت مسیح ایک وقت خدا بھی تھے اور انسان بھی۔

انگریزی ایسا گارو کے اسی بات کو ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے :

وہ حضرت مسیح حقیقتہً خدا بھی تھے اور انسان بھی۔ ان کی ان دونوں حیثیتوں میں سے

کسی ایک کے انکار یا ان کے وجود میں دونوں کے متحد ہونے کے انکار ہی سے مختلف

بعضی نظریات پیدا ہوئے، انہما بے ٹیس نے آریوس کے مقابلہ میں اسی نظریہ کی پرزور

حمایت کی تھی لہذا منظور شدہ فارمولہ یہ ہے کہ حضرت یسوع کی ایک شخصیت میں دو

ماہیتیں جمع ہو گئی تھیں۔

انسانی حیثیت سے حضرت مسیح خدا سے کم مرتبہ تھے اسی لیے انہوں نے یہ کہا تھا کہ

”باپ مجھ سے بڑا ہے۔“

اور اسی حیثیت سے ان میں تمام انسانی کیفیات پائی جاتی تھیں لیکن خدائی حیثیت سے وہ باپ کے ہم مرتبہ ہیں اس لیے انجیل یوحنا میں آپ کا یہ قول مذکور ہے ۔
میں اور باپ ایک ہیں ۔

اگستان لکھتے ہیں ،

علیٰ هذا القیاس خدائی حیثیت سے انہوں نے انسان کو پیدا کیا اور انسانی حیثیت سے وہ خود پیدا کیے گئے ۔

بلکہ اگستان تو یہاں تک لکھ گئے ہیں کہ ،

چونکہ خدا نے بندے کا روپ اس طرح نہیں اپنایا تھا کہ وہ اپنی اس خدائی حیثیت کو ختم کر دے جس میں وہ باپ کے برابر ہے لہذا ہر شخص اس بات کو محسوس کر سکتا ہے کہ یسوع مسیح اپنی خدائی شکل میں خود اپنے آپ سے افضل ہے ، اور اسی طرح اپنی انسانی حیثیت میں خود اپنے آپ سے کمتر بھی ہے بلکہ

بہر حال کچھ جو قرآن کا مطالبہ ہے کہ ان سب خلیفہ عقائد سے باز آ جاؤ اور آخر میں فرمایا ہے کہ کسی میں تمہاری بہتری ہے ۔ یعنی اگر تم توحید کو مانو گے تو پھر تمہارے حق میں اچھا ہو گا اس دنیا میں بھی بہتر ہے اور آخرت میں بھی بہتر ہے ۔ دنیا کی بہتری یہ ہے کہ فروع انسانی جس مقصد کی خاطر دنیا میں آئی ہے اور اللہ سبحانہ نے جو کمالات اس کے لیے مقدر فرمائے ان کمالات تک پہنچنا ممکن ہو جائے گا اور آخرت کی بہتری یہ ہے کہ عالم غیب میں ان کمالات کے جو ناکہ اللہ سبحانہ نے متعین فرمائے ان سے جمدوش ہو گا ابدی زندگی ، راحت و انعام دلائل کے ساتھ ۔ اور اگر توحید کی جگہ تثلیث کو اپنایا تو مشرک زندگی بزرگی اور مشرک س دنیا میں انسان کو اپنے نوعی کمال تک پہنچنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے ۔ اور آخرت میں مشرک کے لیے سزا سرشار ہی خسارہ ہے ۔

توحید الوہیت کا اعلان

۲۵۸۔ اور واقعہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ کی ذات ہی یگانہ مبہوس ہے ، وہ ہر اعتبار سے اور ہر معنی میں واحد ہے ۔ تثلیث اور حلول و استودک و باطن منہا تشریح نہیں ۔ کسی بھی پیغمبر نے از مسیح تا

آدم تثلیث کی تعلیم نہیں دی ہے سب توحید کے منادی ٹکرائے ہیں، عہد قدیم اور عہد جدید میں سب نبیوں نے اس کی دعوت دی ہے یہی سائے نبیوں کا اشتراکِ سرایہ ہے۔ قرآن کے بیانِ توحید کی تائیدِ محرف عہدِ فاسق اور جدید کی کتابیں بھی کرتی ہیں مثلاً

تورات سفر استغنا باب ۴ آیت ۲۶، ۲۵

یہ سب تجھی کو دکھایا گیا تاکہ تو جانے کہ خداوند وہی خدا ہے اور اس کے سوا کوئی نہیں۔

تورات سفر استغنا باب ۴ آیت ۴

میں نے لے اسرائیل خداوند ہمارا اکیلا خدا ہے۔

تورات سفر استغنا باب ۳۲ آیت ۲۹

اب دیکھو کوئی معبود میرے ساتھ نہیں اور میں ہی اترتا ہوں اور میں جلتا ہوں اور میں ہی زخمی کرنا ہوں اور میں ہی چنگو کرتا ہوں، اور ایسا کوئی نہیں جو میرے باجہ سے چھڑائے۔

دومو حدیسی باب ۲۶ آیت ۹

تو بزرگ اور مجاہد کام کرتا ہے رہی ایلا خدا ہے۔

نبد باب ۴۴ آیت ۱۳

میںے خدا تیری راہ مقدس ہے، کون معبود خدا کے مانند بڑا ہے۔

اول کتاب السلاطین باب ۸ آیت ۶۰

تاکہ زمین کے سائے گردہ معلوم کریں کہ خداوند وہی خدا ہے اور اس کے سوا اور کوئی نہیں۔

کتاب اشعیا باب ۴۳ آیت ۱۱

اور میرے سوا کوئی پیمانے والا نہیں ہے۔

کتاب اشعیا باب ۴۵ آیت ۱۴

اور تیرے آگے سجدہ کریں گے اور تیرے آگے منت کریں گے اور کہیں گے کہ یقیناً تجھ میں ہے

اور کوئی دوسرا نہیں اور اس کے سوا کوئی خدا نہیں یقیناً تو ہی ایک خدا ہے۔

کتاب اشعیا باب ۴۶ آیت ۹

میں خدا ہوں اور کوئی دوسرا نہیں، میں خدا ہوں اور مجھ سا کوئی نہیں ہے۔

کتاب خروج باب ۱۵ آیت ۱۱

معبودوں میں خداوند تجھ سا کون ہے، پاکیزگی میں کون ہے تیرا سا جلال والا۔

کتاب دوم مکمل باب ۱۲ آیت ۱۲

اے خداوند کوئی تیری مانند نہیں اور تیرے سوا جہاں تک ہم نے اپنے لاکھوں سے سنا ہے کوئی خدا نہیں ہے۔

اول کتاب السلاطین باب ۸ آیت ۱۲

اور سیملان نے اسرائیل کی سلاطین جماعت کی رو برد کھڑے ہو کر اپنے ہاتھ آسمان کی طرف پھیلائے اور کہا اے خداوند اسرائیل کے خدا تجھ سا کوئی خدا نہ اور پر آسمان میں ہے ذیلچے۔

کتاب اشعیا باب ۴۰ آیت ۲۸

کیا تو نے نہیں جانا کیا کرتے نہیں مٹا خداوند سب ہی خدا ہے۔ زمین کے کناروں کا پیدا کرنے والا وہ شک نہیں جاتا اور ماندہ نہیں ہوتا اس کے فہم کی تباہ نہیں ہے۔

کتاب یرمیاہ باب ۱۰ آیت ۱۰ تا ۱۵

لیکن خداوند سچا خدا ہے وہ زندہ خدا اور ادبی بادشاہ ہے۔ زمین اس کے قبر سے قہر مٹاتی ہے اور قومیں اس کے جھلکا ہٹ کی برداشت نہیں کر سکتی ہیں تم ان سے اس طرح کہو کہ جس مجبوروں نے آسمان و زمین کو نہیں بنایا زمین پر سے اور آسمان کے نیچے سے نیست ہوں گے۔ اسی نے اپنی قدرت سے دنیا کو بنایا ہے۔ اسی نے اپنی حکمت سے جہاں کو قائم کیا ہے۔ مجددین کی طرح مجددید کی کتابوں میں جو جگہ جگہ توحید کی تعلیم موجود ہے مثلاً

یسوع کے کہا کہ میں اپنے خدا اور تمہارے خدا کے پاس (پر جاتا ہوں۔

یوحنا باب ۱۰ آیت ۱۵

ہمیشہ کی زندگی یہ ہے کہ وہ تجھ خدا سے واحد اور برحق کو اور یسوع مسیح کو جس کو تو نے

جیسا ہے جانیں۔ (یوحنا باب ۱۶ آیت ۳)

اس سے پہلے کہ سب حکموں میں اول کرن سہ ہے ۲۹۔ یسوع نے جواب دیا کہ اول یہ ہے

۲۰۔ اے اسرائیل سن خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے۔

مرقس باب ۱۲ آیت ۲۸

اے استاد کیا خوب تو نے سچ کہا کہ وہ ایک ہی ہے اور اس کے سوا اور کوئی نہیں ہے

مرقس ۱۳-۳۲

تو مجھ سے نیکی کی بات کیوں پرچھتا ہے نیک تو ایک ہی ہے ۔

متی ۱۹-۱۶

یسوع نے بڑی آواز سے پکار کر کہا ایلی ایلی لا نہبتقنی لے میرے خدائے میرے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا ہے ۔

متی ۲۶-۲۶

جو کلام تم سنتے ہو وہ میرا نہیں بلکہ باپ کا ہے جس نے مجھے بھیجا ہے ۔ (یوحنا ۱۴-۱۴)

زمین پر کسی کو اپنا باپ نہ کہو کیونکہ تمہارا باپ ایک ہی ہے جو اُکسانی ہے ۔

متی ۹-۲۳

یسوع نے شاگردوں سے کہا یہیں بیٹھے رہنا جب تک دُعا انگلیں ۔ متی ۲۶-۲۶

یسوع نے کہا مکھا ہے کہ تو اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر ۔

لوقا ۴ آیت ۸

ان تعریحات کے باوجود عیسائی تثلیث کے گورکھ دھندے سے چمٹے ہوئے ہیں لیکن ان میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جس نے اس گورکھ دھندے سے پریشان ہو کر صاف صاف کہہ دیا کہ حضرت مسیح کو خدا ماننا ہی غلط ہے وہ صرف انسان تھے ۔ مسٹر جیمس میک کنن نے اپنی فاضلانہ کتاب میں ان مفکرین کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے ۔ ان کے بیان کے مطابق اس نظریہ کے ابتدائی لیڈر پال آف سمرسٹا جن کا نام حافظ ابن خرم نے الملل والنحل یوس الشماہلی بتایا ہے اور لوسین ہے ۔ مسٹر میک کنن لکھتے ہیں ۔

دونوں کا نظریہ تھا کہ یسوع مسیح ایک مخلوق تھے ، البتہ دونوں کے نظریات میں

یہ فرق ہے کہ پال کے نزدیک وہ معنی ایک انسان تھے جن میں خدا کی غیر شخصی عقل نے

اپنا مظاہرہ کیا تھا ۔ اور لوسین اور اس کے مکتب فکر کے نزدیک وہ ایک اُسمانی

وجود تھے جس کو خدا عدم سے وجود میں لایا تھا اور جن میں خدا کی عقل اپنی شخصی کیفیت

میں آگئی تھی لہذا وہ حلول کے وقت ایک انسانی جسم کا مظاہرہ کرتے تھے مگر ان

کی رُوح انسانی نہیں تھی ۔ ان کا مشن یہ تھا کہ وہ باپ کا پیغام پہنچائیں لیکن نہ تو وہ

علی الاطلاق خدا تھے اور نہ قدیم و جاودانی ۔

گویا پال نے ترمسے سے حلول کے عقیدے ہی کا انکار کر دیا اور یہ کہا کہ حضرت مسیح کے وجود

میں خدا کے حلول کرنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ ان خدا کی طرف سے ایک خاص عقل عطا ہوئی تھی

اور یوسین نے حلول کے عقیدے کا تو انکار نہیں کیا۔ اس نے یہ تسلیم کیا کہ خدا کی صفت علم ان میں حلول کر گئی تھی لیکن یہ حلول ایسا نہ تھا کہ حضرت مسیح کو خدا، خالق، تعلیم اور ہادوا کی بنائے بلکہ اس حلول کے باوجود خدا بدستور خالق رہا اور حضرت مسیح بدستور مخلوق۔

پال اور امین ہی کے نظریات سے متاثر ہو کر پرمختی صدی عیسوی میں مشہور مفکر آریوس نے اپنے وقت کے کلیسا کے خلاف بڑی زبردست جنگ لڑی اور پوری عیسائی دنیا میں ایک مشکل پیدا کیا۔ اس نظریات کا خلاصہ یہ کہ کئی کے الفاظ میں یہ تھا۔

آریوس میں اس بات پر زور دیتا تھا کہ صرف خدا ہی قدیم اور ہادوا کی ہے اور اس کا کوئی تاج نہیں۔ اسی نے بیٹے کو پیدا کیا جب کہ وہ پہلے معدوم تھا۔ لہذا نہ بیٹا ہادوا کی ہے اور نہ خدا ہمیشہ سے باپ ہے کیونکہ ایک ایسا وقت تھا جس میں بیٹا موجود نہیں تھا۔ بیٹا باپ سے بالکل الگ ایک حقیقت رکھتا ہے اور اس پر تئیرات واقع ہو سکتے ہیں۔ وہ مسیح سمجھنے میں خدا نہیں ہے۔ البتہ اس میں مکمل ہونے کی صلاحیت موجود ہے اور وہ ایک مکمل مخلوق ہے۔ ایک عقل مجسم جو ایک حقیقی انسانی جسم میں پائی جاتی ہے اس طرح اس کے نزدیک مسیح ایک ثانوی خدائی کا حامل ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ نیم دیوتا جو خدائی اور انسانیت دونوں کی صفات سے کسی قدر صحت رکھتا ہے لیکن بلند ترین معنی میں خدا نہیں ہے۔

گویا اس کی نظریات حضرت مسیح کی حیثیت بعد از خدا بزرگ توئی تعدد مخفف

کی تھی۔ اور بس۔

عقیدہ انبیت پر ضرب کاری

۲۵۹۔ اس کی ذات اس سے پاک ہے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کہ ہے اور کلام ساز ہونے کے لیے اللہ کافی ہے۔ یعنی آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، سب اس کی مخلوق اور اس کی مخلوق اور اس کے بندے ہیں، پھر کیسے کوئی اس کا شریک یا اس کا بیٹا کہن اور کہوں کر ہو سکتا ہے۔ اور اللہ سب کام بنانے والا اور سب کی کار سازی کے لیے دی گئی کافی ہے، کسی دوسرے کی حاجت نہیں پھر بتلائیے اس کو شریک یا بیٹے کی حاجت کیسے ہو

ہو سکتی ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ کسی مخلوق میں اس کے شریک بننے کی قابلیت اور لیاقت اور ذاس کی ذات پاک میں اس کی گنجائش اور ذاس کو اس کی حاجت، جس سے معلوم ہو گیا کہ مخلوقات میں سے کسی کو خدا تعالیٰ کا شریک یا بیٹا کہنا اس کا کام ہے جو ایمان اور عقل دونوں سے محروم ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص حق تعالیٰ کے لیے بیٹا یا کسی کو اس کا شریک مانتا ہے وہ حقیقت میں جملہ موجودات کو مخلوق باری اور باری تعالیٰ کو خالق جملہ موجودات نہیں مانتا اور نیز اللہ تعالیٰ کو سب کی حاجت برآری اور کار سازی کے لیے کافی نہیں مانتا۔ گویا خدا کو خدا کی سے نکال کر مخلوقات اور ممکنات میں داخل کر دیا، تو اب ارشاد سبحانہ ان یکسون لہ ولد میں جس ناپاک کی طرف اشارہ غنی تھا اس کا پتہ چل گیا۔ اور فرزند حقیقی اور فرزند مہازمی اور ظاہری دونوں میں وہ ناپاک چونکہ برابر موجود ہے تو خوب سمجھ میں آ گیا کہ اس کی ذات مقدس مجھے اس سے پاک ہے کہ اس کے بیٹا پیدا ہو اس سے بھی پاک اور برتر ہے کہ اپنی مخلوق میں سے کسی کو بیٹا بنائے۔

یہ میسائوں کے چوتھے غلو کی تردید ہے۔ ولایت کا عقیدہ غلط ہی نہیں بلکہ اصلاً مہمل اور تفسیر الہیہیت کے لیے باعث توہین اور شان الہیہیت کے بالکل منافی ہے۔ خالی کا صحیح رشتہ مخلوق کے ساتھ صرف مالکیت کا ہے۔ مالک و مملوک میں مباہیت لازمی ہے برخلاف والد و مولود کے کران میں ہم جنسی اور ہم قومی شرط ہے۔ جب ہر مخلوق اللہ کی مملوک ہے تو کوئی مخلوق اللہ کی اولاد نہیں ہو سکتی۔ بائبل کے عہد جدید کی روایات مثلاً،

آسمان سے برآواز کری یعنی حضرت یسوعؑ میرا پیارا بیٹا ہے جس سے میں خوش ہوں

(متی باب ۲ آیت ۱۱)

تو ان سے زیادہ سے زیادہ بس یہی ثابت ہوتا ہے کہ مسیح علیہ السلام نے خدا اور بندوں کے تعلق کو باپ اور اولاد کے تعلقات سے تشبیہ دی ہے اور باپ کا لفظ وہ خدا کے لیے معنی مجازاً اور استعمال کے طور پر استعمال کرتے تھے، یہ تنہا مسیح کی خصوصیت نہیں ہے۔ قدیم ترین زمانہ سے بنی اسرائیل خدا کے لیے باپ کا لفظ برتتے چلے آئے تھے اور اس کی ہجرت مثالیں بائبل کے پرانے عہد نامے میں موجود ہیں۔ حضرت یسوع نے یہ لفظ اپنی قوم کے مہارے کے مطابق ہی استعمال کیا ہے وہ خدا کو صرف اپنا باپ ہی نہیں بلکہ سب انسانوں کا باپ کہتے تھے لیکن عیسائیوں

نے غلو سے کام لیا اور مسیح کو خدا کا اکلوتا بیٹا قرار دیا۔ ان کا عجیب و غریب نظریہ اس باب میں یہ ہے کہ چونکہ مسیح خدا کا مندر ہے اور اس کے کلمے اور اس کی روح کا جسدی ظہور ہے۔ اس لیے وہ خدا کا اکلوتا بیٹا ہے اور خدا نے اپنے اکلوتے بیٹے کو زمین پر اس لیے بھیجا ہے کہ انسانوں کے گناہوں کو اپنے سر کے صلیب پر چڑھ جائے اور اپنے خون سے انسانوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کرے جلاحدہ اس کا کوئی ثبوت خود حضرت مسیح کے کسی قول سے وہ نہیں دے سکتے۔ یہ عقیدہ ان کے اپنے تخیلات کا آفریدہ ہے اور اس لغو کا نتیجہ ہے جس میں وہ اپنے پیغمبر کی عظیم انسانیت سے متاخر ہو کر مبتلا ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں کفارے کی تردید نہیں کی ہے کیونکہ جیسا تہوں کے یہاں یہ کوئی مستقل عقیدہ نہیں ہے بلکہ مسیح کو خدا کا بیٹا قرار دینے کا شاخسانہ اور اس کی ایک صوفیانہ و فلسفیانہ توجیہ ہے۔ لہذا اس عقیدے کی تردید آپ سے آپ ہو جاتی ہے۔ اگر مسیح کے ابن اللہ ہونے کی تردید کر دی جاتی ہے اور اس غلط فہمی کو دُور کر دیا جائے کہ مسیح علیہ السلام صلیب پر چڑھاتے گئے تھے۔

اللہ کا بندہ ہونا شرف ہے

۲۶۰۔ مسیح کو ہرگز اس بات سے عار نہیں ہے کہ وہ خدا کا بندہ سمجھا جائے اور نہ خدا کے مقرب فرشتوں کو اس سے ننگ و عار ہے۔ یعنی اللہ کا بندہ ہونا اور اس کی عبادت کرنا اور ان کے حکموں کو بجالانا تو اعلیٰ درجہ کی شرافت اور عزت ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام اور ملائکہ مقربین سے اس نعمت کی قدر اور ضرورت پوچھتے ان کو اس سے کیسے ننگ و عار اُسکتا ہے، البتہ ذات اور غیرت تو اللہ کے سوا کسی دوسرے کی بندگی میں ہے جیسے نصاریٰ نے حضرت مسیح کو ابن اللہ اور معبود مان لیا اور مشرکین فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں مان کر ان کی اور جنوں کی عبادت کرنے لگے سو ان کے لیے ہمیشہ کو عذاب اور ذلت ہے بلکہ

نجران کے جیسا تہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ ہمارے خداوند یسوع کا رتبہ کم کرتے ہیں کہ آپ ان کو خدا کا بندہ کہتے ہیں، اس میں ان کی توہین ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو خود اللہ کا بندہ بننے سے عار نہیں ہے۔ اور یہ آیت نازل ہوئی۔ دراصل یہ بھی غلو کی ایک صورت ہے کہ جب کسی شخص کو مانتے ہیں تو یہ کوشش ہوتی ہے کہ جس سے عقیدت

کہتے ہیں اس کو بڑھا کر دکھائیں۔ عیسائیوں نے حضرت مسیح کو مانا تو صرف اس پر قانع نہ رہے کہ ان کو اللہ کا بندہ اور رسول کہیں بلکہ ان کو حاضر و ناظر، متاثر کل، دائمی غیب، ابن اللہ تین میں سے تیسرا بنایا یہاں قرآن نے عیسائیوں کی اسی ذہنیت کو سامنے رکھ کر فرمایا ہے کہ تم عبد اللہ کہتے ہو تے جھگڑے ہو اور اے مسیح کی شان میں گستاخی اور بے ادبی سمجھتے ہو لیکن خود حضرت مسیح تو عبد اللہ ہونے کو ہرگز عار نہیں سمجھتے، مسیح تو کیا عار سمجھیں گے وہ بھی عار نہیں سمجھتے جو نوری مخلوق ہیں اور جنہیں اللہ سے قرب ہے، خدا کا بندہ ہونا تو اتنا بڑا شرف ہے کہ اس سے اوپر کسی شرف کا تصور بھی نہیں ہے۔

یہاں شارحین قرآن نے تفضیل ملائکہ علی الانبیاء اور تفضیل انبیاء علی الملائکہ کی بحث چھیڑ دی ہے۔ معتزلہ کا مذہب چونکہ ملائکہ کی افضلیت کا ہے اس لیے اس آیت میں ملائکہ کے مسیح پر عطف کو دیکھ کر علامہ زنجیزی نے اپنے مسلک کی ترجمانی کا فرض ادا کرنا ضروری سمجھا ہے مگر سچی بات یہ ہے کہ اس قسم کے مسائل تفسیری نثر سے حل نہیں ہوتے۔ یہاں ایسے کوئی تصریح نہیں ہے کہ ذشتے انبیاء سے افضل ہوتے ہیں، صرف عطف کی تفسیر کے سہارے استدلال کیا جا رہا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ کوئی کلیہ نہیں ہے کہ عطف میں معطوف ضرور اعلیٰ ہو۔ بہر حال اس موضوع کی تفصیل مباحث کا یہ محل نہیں ہے۔

خدا کی بندگی سے ننگ و عار

۲۶۱۔ اور جو کوئی اللہ کی بندگی سے عار کرے گا اور گھمنڈی بنے گا اللہ ضرور سب کو اپنے حضور جمع کرے گا۔ پھر وہ لوگ جو ایمان اور عمل صالح کی تسارع نہ کھتے ہوں ان کو پوری پوری اجر تیس دے گا اور اپنے فضل سے مزید دے گا اور وہ لوگ جو خدا کی بندگی کو ننگ و عار سمجھتے ہوں اور گھمنڈی ہیں ان کو دردناک عذاب دے گا اور اس روز ان کا خدا کے سوا کوئی رفیق و مددگار نہ ہو گا یعنی جو شخص اللہ کی بندگی سے ناک چڑھائے گا اور سرکشی کرے گا تو وہ بوجہ نہ چھوڑ دیا جائے گا بلکہ ایک روز سب کو اللہ کے سامنے جمع ہونا اور حساب دینا ہے۔ لہذا جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے یعنی اللہ کی بندگی پوری سمجھ لائے ان کو ان کے کاموں کا پورا پورا ثواب ملے گا بلکہ اللہ کے فضل سے بڑی بڑی نعمتیں ان کو ثواب سے زیادہ بھی ان کو عنایت ہوں گی اور جنہوں نے اللہ کی بندگی سے ناک چڑھائی اور سرکشی کی وہ عذاب عظیم میں گرفتار ہوں گے اور کوئی ان کا فریاد نہ ہو گا۔

جن کو اللہ کی بندگی میں شریک کیا ہے عبادت کے کٹھن سے ہیں وہ بھی کام نہ آئیں گے۔ اب نصائی کو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ ان دونوں صورتوں میں سے ان کے مناسب حال کیا ہے اور حضرت مسیح کے موافق شان کیا ہے یہ

استنکاف کے معنی ہیں کسی چیز سے غیرت، محبت اور خوداری کی بنا پر روگردانی کرنا اور شکبارہ کہتے ہیں حقیر کچھ کر سامنے تن ہانا اور اٹھنا یعنی خود جو کچھ ہے اس سے زیادہ لینے کو کھٹنا اور دوسروں کو کھٹانا، حضرت مسیح سے استنکاف کی نفی کے بعد اس آیت میں یہ عام قانون بیان کر دیا ہے کہ جو بھی اللہ کی بندگی میں عار اور لینے کو بڑا بنا کر رکھے اس کی اللہ کی بادگاہ میں پیشی ضرور ہو گی۔ اس قانون کا اطلاق دائرہ صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ جن بزرگوں کو آپ مانتے ہیں ان کو خدا کا بندہ کہتے ہوئے یہ سوچ کر آپ ہچکچائیں کہ اس میں ان کی تو ہیں ہے بلکہ اس کی پٹھانیاں اس سے کہیں زیادہ ہیں۔ غیر مسلموں کے درمیان اگر آپ لینے کو مسلمان کہتے ہوئے ہچکچاتے ہیں غیر اسلامی نظاموں کے مقابلے میں اگر آپ اسلامی نظام کا ذکر کرتے ہوئے یا اسلامی نظام سے اپنی وابستگی ظاہر کرتے ہوئے شرماتے ہیں تو یہ استنکاف ہے۔ خدا کی بندگی اسلام سے وابستگی خزانے کی نہیں بلکہ فقر کرنے کی چیز ہے۔ نیشنلزم کے مقابلے میں اسلامیت سہ ستم کے مقابلے میں اسلامی نظام کو اگر آپ اس لیے نہیں لاتے کہ آپ اسلام کو ان کے مقابلے میں حقیر سمجھتے ہیں اور اسلام سے اپنے انساب کو اپنی بے عزتی تصور کرتے ہیں تو بلاشبہ یہ استنکاف بھی ہے اور شکبارہ بھی۔ قرآن نے اللہ کی عبادت سے استنکاف سے اس آیت میں سختی سے روکا ہے۔ عبادت خداوندی سے استنکاف کے ممنوع ہونے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اللہ کے سوا اوروں کی عبادت سے استنکاف ہونا چاہیے اور دوسرا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کی عبادت کے سامنے نظام جو اب تک آئے تھے، وہ سب منسوخ ہو چکے ہیں اور اب اللہ کے نزدیک عبادت نظام صرف اسلام ہے نہ رومی ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے اور ہر قوم، ہر ملک اور ہر زمانے کا انسان اسی کی پیروی کرے، کیونکہ اللہ کی عبادت کا یہ نظام ساری دنیا کا نظام ہے اور اس کا لانے والا پیغمبر پروردی لوح انسانی کا پیغمبر ہے۔ اسی لیے آئندہ دواہیوں میں یہ بات کسوں کی بتائی گئی ہے کہ خواہ کوئی کتنی بڑی رومی و سانی طاقت رکھتا ہو اور کیسی مادی طاقتوں سے سرشار ہو، قانون اور ضابطہ سب کے لیے ایک ہے

اس میں نبی غیر نبی، ولی غیر ولی، بادشاہ اور عام شہری سب یکساں ہیں سب کے مقابلہ ہے کہ عزت کے لاتے ہوئے خدا کی عبادت کے نظام کو جو اپنائے گا اور ایمان و عمل کی دولت سے مالا مال ہو گا وہ کامیاب ہو گا۔ اللہ کے یہاں اس کو ایمان و عمل کی مزدوری ضرور ملے گی یعنی جتنا اجر مقرر ہے وہ تو ملے ہی گا اس کے علاوہ اللہ ان کو اپنے فضل سے بھی ضرور نوازے گا اور وہ لوگ جنہوں نے اللہ سے عبادت و تقیات میں غافل ہو کر محسوس کی اور اگر کہہ کر مظلوم کیا تو اللہ ان کو دردناک عذاب دے گا اور ان کا کوئی کارساز و مددگار نہ ہو گا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ
نُورًا مُبِينًا ۖ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَاعْتَصَمُوا بِهِ
فَسَيُدْخِلُهُمْ فِي رَحْمَةٍ مِنْهُ وَفَضْلٍ وَيَهْدِيهِمْ إِلَيْهِ
صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا ۝

اے لوگو! تمہارے پروردگار کی جانب سے تمہارے پاس بُرہان
یعنی دلیل و حجت اُچھی ہے، اور ہم نے تمہاری طرف ایک
نورِ مبین اتار دیا ہے، لہذا جو لوگ اللہ پر ایمان لاتے اور اس
کا سہارا مضبوط پکڑا تو وہ انہیں ضرور اپنی رحمت کے سائے
میں داخل کرے گا اور ان پر اپنا فضل کرے گا اور انہیں اپنے
نیک پہنچنے کی راہ دکھائے گا اسی راہ جو بالکل سیدھی راہ ہے۔^{۳۶۳}

حضورِ نور کی جامعیت اور کاملیت

سابقہ آیات میں عیسائیوں پر رحمت تمام کر دی۔ اس سے پہلے یہودیوں کے تمام شہادت کا قطع قمع

کر دیا تھا۔ یہ دونوں طبقے نبوت اور قانونِ الہی سے واقف تھے اور یہی اہل کتاب ہیں۔ اس سے پہلے اسی سورت میں منافقین کو مخاطب کر کے ان کی حاکم تماشائی اور ساتھ ہی مشرکین کے خیالات و افکار کا بوداؤن بھی عیاں کیا۔ اس کے نتیجہ میں جب حضور انور کی نبوت ہر پہلو سے بے نقاب ہو کر سامنے آگئی۔ میوہِ انصاف کی منافقین اور مشرکین کے سلسلے شہادت جب تازہ ہو گئے تو اللہ سبحانہ نے پوری انسانیت کو اس آیت میں لٹکا دیا ہے اور بتایا ہے کہ بُراں اور نور میں دو چیزیں ہیں جن سے وابستہ کسی پر انسانی زندگی کی اطلاع اور نہایت موقوف ہے۔ نور میں سے مقصود قرآن حکیم ہے اور بُراں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی۔ بُراں آپ کو اس لیے کہا گیا ہے کہ آپ کی ذات گرامی مختلف طبقات انسانی کے لیے عملی نمونے اور مثالیں رکھتی ہے، یعنی انسانوں کے ہر طبقہ اور صنف کے لیے آپ کی ذات میں نصیحت پذیری اور عمل کے لیے بُراں ہے یعنی نبرا سر دلیل و حجت ہے۔ اس دُنیا کی بنیاد ہی اختلافِ عمل پر ہے۔ باہمی تعاون اور مختلف پیشوں اور کاموں ہی کے ذریعے سے یہ دُنیا چل رہی ہے۔ اس میں بادشاہ یا رئیس مجبور اور حکام بھی ضروری ہیں، اور محکوم و مطیع اور فرمانبردار و رعایا بھی۔ امن و امان کے قیام کے لیے قاضیوں اور ججوں کا ہونا بھی ضروری ہے اور فوجوں کے سپہ سالاروں اور افسروں کا بھی، غریب بھی ہیں اور دولت مند بھی، شب، بیدار، عابد و زائد بھی اور دن کے سپاہی اور مجاہد بھی، اہل و عیال بھی ہیں اور دوست و احباب بھی۔ تاجر اور سوداگر بھی ہیں اور امام و پیشوا بھی، غرض اس دُنیا کا منظم و نسق ان مختلف اصناف کے وجود اور قیام ہی پر موقوف ہے اور ان تمام اصناف کو اپنی اپنی زندگی کے لیے عملی تجربہ اور نمونہ کی ضرورت ہے۔ قرآن تمام انسانوں کے لیے حضور انور کی ذات گرامی کو بُراں بنا کر پیش کرتا ہے، اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ آپ کی ذات گرامی سب کے لیے حجت و دلیل ہے۔ ایک حاکم کیلئے محکوم کی زندگی۔ ایک محکوم کے لیے حاکم کی زندگی، ایک دولت مند کے لیے غریب کی زندگی اور ایک غریب کے لیے دولت مند کی زندگی، حجت اور دلیل نہیں بن سکتی۔ ان تمام مختلف طبقات کے لیے ضرورت تھی کہ ایسی کامل و جامع زندگی برپا ہو جس میں ہر نوع، ہر قسم، ہر گروہ اور ہر صنف انسانی کے لیے ہدایت کی مثالیں اور نظیریں رکھتی ہو۔ وہ ہی اس لائق ہے جو اس اصناف و انواع سے بھری ہوئی دُنیا کی عالمگیر اور دائمی رہنمائی کے لیے بُراں کا کام انجام دے اور بس۔

۲۴۲۔ اے لوگو! تمہارے پروردگار کی جانب سے تمہارے پاس بُراں یعنی دلیل و حجت آچکی ہے

یعنی تمہارے پروردگار کی جانب سے تمہاری تربیت اور تزکیہ نفس کی خاطر ایک عظیم بُراں یا ایک مکمل اور واضح دلیل آچکی ہے۔ یہ تمہارے سلسلے ایقانِ صحیح کی حقیقتِ محمول کر بیان کرتی ہے اور وہ تمام

باتیں نہیں بتاتی ہے جن کی تہیں زندگی کے مختلف گوشوں میں ضرورت ہے۔ یہ بُر بان خود حضور نور کی ذات گرامی ہے۔ یعنی آپ اپنی نبوت کی خود دلیل ہیں۔ کیونکہ ایک ایسی ہستی جس نے علمی طبکاری میں زندگی کا ایک لمحہ بھی صرف نہیں کیا اور جس نے کسی کے سامنے کبھی زانوئے ادب نہ نہیں کیا۔ اس میں یکا یک علم کی کمزوری ہوتی ہے اور وہ ایسوں، علم کے طلب گاروں کو علوم الہیہ اور صفات ربوبیت کا معلم بن جاتا ہے اور اپنے تعلیم کا دائرہ صرف عالم غیب سے متعلق افکار تک محدود نہیں رکھتا بلکہ اللہ سبحانہ کے مالک و معزوق، نفسِ انسانی کے تزکیہ اور حیاتِ اجتماعی کی صلاح و فلاح کے اصول و ضوابط تک پھیلا دیتا ہے۔ آپ کی ذات قانون کی علمی تشریح کے لیے بُر بان ہے ایسے ہی آپ کی علمی سیرت بھی پوری انسانی زندگی کے لیے بُر بان ہے۔ یہ محض شاعرانہ انداز پر دازی نہیں بلکہ تاریخی واقعات ہیں۔ آپ غیظ و غضب اور رحم و کرم، جود و سخا، اور فقر و فاقہ، شجاعت و ہمدردی اور عدلی و رقیقِ قلبی، خانداری اور خدائی دنیا و دینی دونوں کے لیے زندگی کے فنون سے مالا مال تھے۔ آپ دنیا کی بادشاہی کے ساتھ آسمان کی بادشاہی اور آسمان کی بادشاہی کے ساتھ دنیا کی بادشاہی کی بشارت دیتے تھے اور دونوں بادشاہوں کے قوانین و قواعد اور دستور العمل کو اپنی زندگی میں اپنے برت کر دکھایا۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ دنیا میں صرف غنودہ و گزرو، معافی و نرمی انسانیت کی تکمیل کے سبب بڑے ذریعے ہیں بلکہ فقط یہی ذریعے ہیں اس لیے جس ہستی میں صرف یہی ایک پہلو ہو وہی انسانیت کی سبب بڑی بُر بان ہے لیکن بتایا جائے کہ انسان کے اخلاق میں کیا صرف یہی قوتیں ہیں یا اس کے مقابل کی قوتیں بھی ہیں۔ ایک انسان میں دیکھ کر تو خضع و کرم، محبت و عداوت، خواہش و قناعت، انتقام اور ہر قسم کے فطری جذبات موجود ہیں اس لیے بُر بان کامل وہی ہو سکتا ہے جو انسانیت کے ان تمام قوی اور جذبات میں اعتدال پیدا کر کے ان کے صحیح مصرف کو مقرر کرے۔ جن لوگوں کو یہ دعویٰ ہے کہ ان کے پیغمبروں کی سیرتیں صرف رحم و کرم اور غنودہ و گزرو پر مبنی ہیں وہ براہ کرم بتائیں کہ اپنی اجتماعی زندگی میں وہ کتنے اوزان کی سیرتوں کے مطابق کر سکتے ہیں۔ قسطنطین پہلے عیسائی بادشاہ سے کہے کہ آج حکم عیسائی مذہب میں کتنے صاحبِ تاج و تخت گزرنے اور کتنی بادشاہیاں قائم ہوئیں مگر ان میں سے کسی نے اپنی سلطنت کا قانون اپنے پیغمبر کی سیرت کو قرار دیا۔ پھر ایسی سیرت جو عملی زندگی میں ہر حیثیت سے اپنے پیروں کے لیے نوز و زہود کیوں کہ بُر بان کسی جاسکتی ہے۔ اگرچہ شارحینِ قرآن نے حضور اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بُر بان ہونے پر جو تشریحی نوٹ لکھا ہے وہ تو صرف یہی ہے جیسا کہ ابن جریر نے لکھا ہے کہ اللہ نے آپ کو حجۃ قاطعہ بنایا ہے۔ اور آپ کو رسول بنا کر اپنی حجت تمام کر دی ہے یا اللہ نے آپ کو بُر بان اس لیے کہا ہے کہ آپ سبوبات

کے کرتے ہیں جیسا کہ قرطبی نے لکھا ہے اور ایسا پہلے جس کی شانِ اعجازِ معجزات اور منکوں کو بران کر دیتی ہے جیسا کہ النسفی رقمطراز ہیں یا آپ کی تشریف آوری ہے پر کج حجت دنیا داروں پر ہمدردی ہوگی اس لیے آپ کو بران کہے جیسا کہ التامی نے تصریح کی ہے لیکن بات صرف اتنی ہی نہیں ہے۔ آئیے آپ کے بران ہونے کا یہ پہلو بھی دیکھ لیجئے۔ بران میں تہذیب کی تعلیم کے لیے ہے یعنی آپ کی ذات ہی عظیم بران ہے جس کی آغوش میں تہذیبی ضرورتوں کی کفالت، ساری بیماریوں کا علاج، ساری پریشانیوں کا مداوا اور سارے سوالوں کا جواب ہے۔ دنیا میں دو قسم کی تعلیم گاہیں ہیں ایک وہ جہاں صرف ایک فن سکھایا جاتا ہے جیسے کوئی میڈیکل کالج ہے کوئی انجینئرنگ کالج۔ ایک آرٹ سکول ہے، ایک تجارت کا مدرسہ ہے ایک زرعی کالج ہے، ایک قانون کا مدرسہ ہے، ایک فوجی تعلیم کا مدرسہ حریر ہے۔ ان میں سے ہر مدرسہ صرف ایک ہی قسم کے طلبہ کی تعلیم کا انتظام کر سکتا ہے۔ میڈیکل کالج سے صرف ڈاکٹر نکلیں گے۔ زراعت کے کالج سے صرف زراعت کے ماہر پیدا ہوں گے، قانون کے مدرسہ سے صرف قانون دان تیار ہوں گے، تجارت کی تعلیم گاہ سے صرف تجارت کے واقف کا پیدا ہوں گے۔ طبری کالج سے صرف سپاہی پیدا ہوں گے۔ آداب ذرا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ بران دیکھو اور پتہ لگاؤ کیا مدرسہ نبوت کی حیثیت اس سکول اور کالج کی ہے جہاں ایک ہی فن کی تعلیم ہوتی ہو یا اس کی حیثیت ایک جامع اور عمومی درسگاہ اور عظیم الشان یونیورسٹی کی ہے۔ جہاں ذوقِ مناسب طبع اور استعداد کے مطابق ہر فلک سے لوگوں کو اور ہر قوم کے افراد کو الگ الگ تعلیم ملتی ہے۔ ہر فن کی کتابیں الگ ہوتی ہیں۔ ہر فن کے اساتذہ الگ الگ ہوتے ہیں۔ آؤ دیکھو یہاں کتاب بھی ایک ہے اساتذہ بھی ایک ہے اور درس گاہ بھی ایک ہے۔ اس کے باوجود ایک کتاب اور ایک اساتذہ سے پڑھ کر نکلنے والے طالب علموں کا حال یہ ہے کہ

ایک طرف عقلائے روزگار اسرارِ فطرت کے محرمِ دنیا کے جہاں بان اور ملکوں کے فرمانرواں درسگاہ سے تعلیم پا کر نکلے ہیں۔ ابو بکر صدیق ہیں، عمر فاروق ہیں، عثمان غنی ہیں، علی مرتضیٰ، معاویہ ابن ابی سفیان ہیں جنہوں نے مشرق سے مغرب تک، افریقہ سے ہندوستان تک فرمانروائی کی جو دنیا کے بڑے سے بڑے شہنشاہ اور حکمران کی سیاست و تدبیر اور نظم و نسق کے کارناموں کو منسوخ کر دیتی ہے۔ ان کے عدل و انصاف کے فیصلے ایرانی دستور اور رومی قانون کو بے اثر کر دیتے ہیں اور دنیا کی سیاسی و انتظامی تاریخ میں وہ درجہ حاصل کر لیتے ہیں جن کی مثال نہیں پیش کی جاسکتی۔ دوسری طرف خالد بن الولید، سعد بن ابی وقاص، اللہی، ابو عبیدہ بن جراح، عمرو بن العاص

ہو اسلام سے پہلے دشمن کے کپڑے پہنتے تھے اور ناز و نعمت میں پہنتے تھے اور جب اسلام لائے تو ثواب اور جنت اور بیوند لگے کپڑے پہنتے۔ عثمان بن عفرون ہیں، محمد بن مسلمہ ہیں اور ابوالدرداء ہیں جن کی راتیں نماز میں اور دن روزوں میں گزرتے تھے۔

آنکھوں کی طرف بھاؤ کا کار پر وازوں اور عجب کے مدبرین کی جماعت ہے، اسی میں ظلم ہیں، ذہیر ہیں، مغیرہ ہیں، مقداد ہیں، سعد بن معاذ ہیں، سعد بن عبادہ ہیں، اسید بن حضیر ہیں، اسد بن نضار ہیں، عبدالرحمان بن عوف ہیں۔

نہی طرف تاجر، یوہاری اور کاشت کاروں کی جماعت ہے ان میں عبدالرحمان بن عوف اور سعد بن ذہیر جیسے سربراہ دار اور دولت مند بھی ہیں۔

دوسری طرف حق کے شہیدوں کی جماعت ہے جنہوں نے خدا کی راہ میں اپنی عزیز جانیں قربان کر دیں۔ یہ ان گنت ہیں۔ ان کی داستانوں سے سیرت و تاریخ لکھتا ہیں ہماری پڑی ہیں۔ دنیا کے ایک مشہور مذہب کو صرف ایک سٹول پر ناز ہے لیکن یہاں کتنی سولیاں ہیں کتنے مذہب ہیں اور کتنے متقل ہیں؟

غزوہ کا مقام ہے۔ یہ وہی دہشت گرد، وہی بت پرست عرب، وہی باخلاق عرب ہیں۔ یہ کیا انقلاب ہو گیا تھا۔ ایک آدمی کی تعلیم جاہل عربوں کو عاقل، روشن دل، روشن دماغ اور متعین کیوں کر بنا گئی۔ ایک بھتے و بلبھ کا دلولہ تبلیغ کس پیرس عربوں کو سپہ سالار اور بہادر بنا کرتے زور اور قوت کا خزانہ کیسے عطا کر گیا۔ جو خدا کے نام سے بھی نا آشنا تھے وہ ایسے شب زندہ دار عابد و متقی اور طاعت گزار کیوں کر ہو گئے۔ آپ نے درگاہ محمدی یا مدینہ یونیورسٹی کی پوری سیر کر لی۔ ہر رنگ اور ہر مذاق کے طالب علم دیکھے، عالم بھی دیکھے، متعین بھی دیکھے، فوجی بھی دیکھے، حج اور عمرہ شریف بھی دیکھے۔ حکام اور وال بھی دیکھے، حزب و مکین بھی دیکھے، شاہ و امیر بھی دیکھے، غلام بھی دیکھے، آقا بھی دیکھے، لڑنے والے بھی دیکھے مرنے والے بھی دیکھے، راہ حق کے شہیدوں اور جاں نثاروں کو لگا دیکھا۔ آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟ اس کے سوا فیصلہ کیا ہو سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی ذات میں اپنے کمالات اور اپنی صفات کے لیے اپنے پروردگار کی جانب سے بھان چیں اور یہ سب آپ کے بڑوں ہونے کی جلوہ آرائیاں ہیں جو کبھی صدیق اکبر اور فاروق اعظم ہو کر چمکتی تھیں، کبھی ذی النورین اور مرتضیٰ ہو کر نمایاں ہوتی تھیں۔ کبھی خالد بن الولید اور ابو جحیفہ اور کبھی سعد و جعفر طیار ہو کر سامنے آتی تھیں۔ کبھی ابن عمر اور البرزخہ اور سلمان اور ابوذر و دیگر ہو کر مدد

مغرب میں نظرائی تھیں۔ کبھی ابن عباس اور ابی بن کعب، زید بن ثابت اور عبداللہ بن مسعود کی صورت میں علم و فن کی درسگاہ اور عقل و حکمت کا دستان بن جاتی تھیں۔ گویا محمد رسول اللہ کی برہان آفتاب عالم تاب تھی جس سے اوکھنے پہاڑ ریتلے میدان، بہتی نہریں، سرسبز کھیت اپنی اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق تابعل اور نور حاصل کر رہے تھے، یا برہان ایک ابر باران تھا جو پہاڑ، جنگل، میدان اور کھیت، ریگستان اور باغ ہر جگہ پر سنا تھا اور ہر ٹکڑا اپنی اپنی استعداد کے مطابق سیراب ہو رہا تھا اور قسم قسم کے درخت اور رنگارنگ کے پھول اور پتے جم رہے تھے اور آگ رہے تھے سید رشید رضا نے بالکل بہا فرمایا ہے کہ

و هو برحان بسيرته العلية كما ان الله برحان لا سيرة العلية

قرآن نور مبین ہے

۲۶۳۔ اور ہم نے تمہاری طرف ایک نور مبین اتارا ہے۔ نور مبین سے مراد قرآن حکیم ہے جس میں ہر شے چھوٹی، انفرادی اور اجتماعی مسائل کا حل موجود ہے۔ قرآن کو نور مبین اس لیے کہا ہے کہ اس سے احکام و قوانین نمایاں ہوجاتے ہیں، جیسے روشنی سے چیزیں نظر آتی ہیں۔ سید رشید فرماتے ہیں کہ اس کی بلاغت اور اس کے انداز بیان سے حقائق اس طرح کھل کر سامنے آجاتے ہیں کہ کسی غمزدہ و غمزدہ شخص کے لیے کوئی اشتباہ نہیں رہتا ہے۔ اس کی واضح ترین مثال توحید ہے۔ پہلے مذاہب میں جو حقیقت میں توحید ہی کا پام لے کر آئے تھے تین اسباب سے غلط فہمیاں اور گمراہیاں پیدا ہوئیں، ایک جسمانی تشبیہ و تمثیل دوسرے صفات کو ذات سے الگ اور مستقل ماننا اور تیسرے افضل کی نیزنگی سے دھوکہ کھانا۔ قرآن نے ان گمراہیوں کو کھولا، ان غلط فہمیوں کو دور کیا اور ان حقیقتوں کو واضح کیا۔

ذات میں توحید

خدا کو، خدا کی صفات کو اور خدا اور بندہ کے تعلق کو واضح کر کے لیے خیالی یا مادی تشبیہیں اور تشبیہیں دوسرے مذاہب کے معتقدوں نے ایجاد کیں۔ تجربہ، ہوا، اصل خدا کو تار یا اداس کی جگہ تشبیہیں اور تمثیلیں خدا ہی گئیں۔ ان ہی تشبیہوں اور تمثیلوں نے جسم ہرگز بشر کی شکل اختیار کر لی اور نت پرستی شروع ہو گئی۔ قرآن کی کمال روشنی نے ان تمام تشبیہی اور تمثیلی صورتوں طریقوں اور محاوروں کو یک قلم موقوف کر دیا اور ان کا استعمال شرک قرار دیا۔

صفات میں توحید

قدیم مذاہب کے عقیدہ توحید میں غلط فہمیوں کا دوسرا سبب صفات کا مسئلہ ہے یعنی صفات کو ذاتِ الہی سے الگ مستقل وجود کے طور پر تسلیم کرنا، بندوں کے عام مذہب میں جو لاتعداد خداؤں کا لشکر نظر آتا ہے وہ فی الواقع اسی غلطی کا نتیجہ ہے کہ ہر ایک صفت کو انہوں نے ایک علیحدہ اور مستقل وجود مان لیا اور اس طرح ایک خدا کے ۳۲ کردار خدا بن گئے۔ ہندو مذہب پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ وہ اسی سلسلہ صفات کے بحکم اور مستقل وجود کے خیال سے مختلف فرقوں میں بٹ گئی ہیں۔ اللہ سبحانہ کی تین بڑی صفتیں ہیں خالقیت، تربیت اور رحمتیت ہندو فرقوں نے ان تین صفتوں کو تین مستقل شخصیتیں تسلیم کر لیا۔ اور ہر ہمارا دشمن اور شیو یعنی خالق، تجرہ اور میت تین مستقل ہتیاں بن گئیں۔ عیسائیوں نے خدا کی تین بڑی صفتوں یعنی حیات، علم اور ارادے کو تین مستقل شخصیتیں تسلیم کر لیا۔ حیات باپ ہے، علم مَدَحِ القدس ہے اور ارادہ بیٹا ہے۔ اسی قسم کی چیزیں رومی، ایرانی اور مصری متخیلے میں بھی ملتی ہیں لیکن قرآن عزیز کی واضح روشنی نے اس غلطی کا پردہ چاک کیا اور صفات کی نیرنگی سے دھوکا کھا کر ایک کو چند سمجھنا انسان کی جمالت اور نادانی قرار دیا اور بتایا کہ تینوں ایک کی صفات ہیں۔ صفات کے تعدد اور اختلاف سے موصوف میں تعدد اور اختلاف نہیں ہوتا۔ یہ بات صرف قرآن کی روشنی میں نمایاں ہو کر سامنے آئی ہے اور زاوروں نے ترقوات سے صفات کو الگ کر کے ایک خدا کے متعدد خدا بنا ڈالے سبحان اللہ عما یشرکون۔

افعال میں توحید

لوگوں نے افعالِ الہی کی نیرنگی کو دیکھ کر یہ سمجھا کہ ان مختلف افعال کی کرنے والی مختلف ہتیاں ہیں کوئی رات ہے، کوئی بھلائی ہے، کوئی لڑوائی ہے، کوئی صلح کراتی ہے، کسی کا لام محبت ہے، کسی کا کام عداوت ہے، کوئی علم کا دیوتا ہے، کوئی دولت کی دیوی ہے، غرض ہر کام کے لیے الگ الگ سینکڑوں خدا ہیں۔ قرآن نے ان نادانوں کو بتایا ہے کہ یہ سب ایک ہی خدا کے کام ہیں۔ خدا نے یہ کائنات بنائی ہے، آسمان و زمین بندھے، ماوسے کو خلق کیا، اشیاء میں خاصیتیں رکھی ہیں اور ان کو مختلف قوتیں بخشیں، پھر انسان کو بنایا اس کو دل و دماغ، سمعہ، عقل و حکمت دی۔ اب دیکھو ایک انسان اس کائنات میں اشیاء کی ترتیب اور ان کی خاصیتوں کو دیکھ کر ایک خالقِ دفا و دہ کی

صفتِ کاری اور صورتِ گری پر تعجب کرتا ہوا فتیبارک اللہ احسن الخالقین پڑھ کر حضرت ابراہیم کی طرح یہ پکارا تھا ہے،

انی دعت دھمی للذی فطر السموات والارض حنیفاً و ما انا من المشرکین
اور دوسری طرف اسی مادہ اور اس کی قوتوں کی ظاہر و دلیلوں میں جھنسن کر انسان کے دل و دماغ کی عقل و حکمت خدا کا انکار کر چکے تھے اور ماوسے ہی کو اصل کائنات اور عمارۃ الععلل سمجھنے لگے تھے اور یہ کہتی ہے۔

ما ہی الا حیاتنا الدنیا فہوت و تخلف ما یعلکنا الا الدھر

کائنات ایک ہے، پیغام ایک ہے، البتہ دل دو ہیں اور یہ دونوں دل اور دونوں دماغ ایک ہی خالق کی مخلوق ہیں دو خالق نہیں ہیں۔ نتیجہ کیا نکلا، یہی نا کہ افعال کی دولی، غافل کی دولی کی دلیل نہیں ہے۔ یہ تمام نیرنگیاں ایک ہی قدرت کے تاشے ہیں۔

اللہ کی عبادت

اللہ سبحانہ کی عبادت ہر مذہب میں مسمیٰ اور ہے لیکن ایک عام غلط فہمی پھیل گئی تھی کہ عبادت کا مقصد جسم کو تکلیف دینا ہے یا دوسرے لفظوں میں کہو کہ یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ جس قدر اس ظاہری جسم کو تکلیف دی جائے گی، اسی قدر روحانی ترقی ہوگی اور دل کی اندرونی صفائی اور پاکیزگی۔ اسی کے نتیجہ میں ہندوؤں میں عام طور پر جوگ اور یوگا میں دیہانیت پیدا ہوتی اور بڑی بڑی ریاضتوں کا دہرہ ہوا اور ان کو روحانی ترقی کا ذریعہ سمجھا گیا، کوئی عمر بھر نہانے سے پرہیز کر لیتا، کوئی عمر جین ٹائٹ یا کل اوڑھے رہتا۔ کوئی ہر موسم میں یہاں تک شدید جاذبوں میں جی ٹنگا رہتا، کوئی عمر بھر کھڑا رہتا، کوئی ہلکی عمر فارغ میں گزار دیتا، کوئی ساری عمر صوف میں کھڑا رہتا، کوئی عمر بھر کے لیے کسی چٹان پر بیٹھ جاتا۔ کوئی حد کر لیتا تھا کہ پوری زندگی صرف ریاضتوں کی پٹیاں کھا کر گزار دے گا، کوئی عمر بھر سجدے میں گزارتا تھا اور قطع نسل کو عبادت سمجھتا تھا، کوئی ایک ہفتہ ہوا میں رکھ کر کھاتا دیتا، کوئی جس دم میں سانس روکے کر عبادت سمجھتا، کوئی درخت پر اٹھ کر رہتا، یہ محاذ قرآن کے اُٹے سے پہلے خلیفہ مسیح کا اعلیٰ درجہ اور روحانیت کی سب سے بڑی ترقی یافتہ شکل۔ قرآن نے اگر انسانوں کو ان مصیبتوں سے سہات و لادای اور تباہی کا یہ وحشت نہیں جمانی تاشے ہیں۔ ہمارے خدا کو جسم کی شکل نہیں بلکہ دل کا رنگ مرعوب ہے طاقت سے زیادہ تکلیف اس کی شریعت میں نہیں۔

ہر حال آیت گرامی میں کہ اللہ بھانے انسانیت کو دو چیزیں رحمت فرمائیں۔ ایک بُرہان دوسرے نور ربین۔ بُرہان سے مفہور اللہ کی ذات گرامی مراد ہے اور نور ربین سے قرآن حکیم سے دوسرے فطنوں میں آپ عمل اور علم بھی کہہ سکتے ہیں۔ بُرہان کو یہاں مقدم کر کے اس کی مقصودیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یعنی علم سے مقصود عمل ہے اور من و دیکھ کے اضافہ سے یہ بات جمادی ہے جیسا کہ علامہ ابراہیم سودنے لکھی ہے کہ اس سے مقصود انسانوں کی تربیت اور ان کا تزکیہ ہے۔

علم و عمل کی شاہراہ

۲۶۴۔ لہذا جو لوگ اللہ پر ایمان لاتے اور اس کا سہارا مضبوط پکڑا تو وہ انہیں ضرور داخل کرے گا اپنی رحمت کے ساتھ میں اور ان پر اپنا فضل کرے گا اور انہیں اپنے تک پہنچنے کی راہ دکھائے گا یہی راہ جو بالکل سیدھی راہ ہے۔ پہلے سے وحی الہی اور بالخصوص قرآن حکیم کی عظمت اور اس کی تعائیت کا بیان اور اس کی متابعت اور اتباع کی تاکیدات کا ذکر تھا۔ اسی کے ذیل میں حضرت مسیح علیہ السلام کی الوہیت اور ان کے ابن اللہ ہونے کا ذکر کیا تھا جس کے قابلِ نعتاری تھے ۱۰ اس کی تردید و ابطال کے بعد اب آخر میں پھر اسی اصلی اور ضروری بات کی سب کو تاکید فرمائی جاتی ہے کہ لے لوگ اٹھائے پاس رب العالمین کی جانب سے محبت کامل اور نور روشن پہنچ چکا ہے جو ہدایت کے لیے کافی و کافی ہے یعنی قرآن مجید اب کسی قابل اور تردد کی گنجائش نہیں سوجھو کوئی اللہ پر ایمان لاتے گا اور اس مقدس کتاب کو مضبوط پکڑے گا وہ اللہ کی رحمت اور فضل میں داخل ہوگا اور براہِ راست اس تک پہنچے گا اور جو اس کے خلاف کرے گا اس کی گمراہی اور خرابی اسی سے سمجھ لیجئے۔

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ خدا کی حاجت آتی ہوئے بُرہان اور خدا کی نازل کردہ کتاب کی روشنی میں اللہ سے بندگی کا تعلق رکھیں گے اور اس تعلق کے ساتھ اللہ سے احصاء پیدا کریں گے یعنی اللہ کی بھی ہوئی بُرہان اور اللہ کی نازل کردہ کتاب کو اپنی زندگی کے مختلف گوشوں میں تمام کر رکھیں گے اور زندگی کے اطوار، اقدار اور احوال میں ان دونوں کے ہر کر رہیں گے۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور کتاب اللہ سے ربط اور قرآن و سنت سے وابستگی کا نام اعتقاد ہے۔ قرآن اُس سورت میں احصاء کا تیسری بار ذکر کیا ہے سب سے پہلے آیت نمبر ۱۳ میں پھر آیت نمبر ۲۶ میں، دونوں پر تفصیلی تبصرہ جلد چہارم اور پنجم میں ہو

چکا ہے۔ اب یہاں اسی اعتصام کا تیسری بار ذکر ہر دہ ہے۔ اعتصام یہ ہے کہ فکر و عمل میں اللہ کے ارادہ فرمودہ علم و عمل سے وابستہ ہو جائیں۔ اعتصام ہی اس دنیا میں اولاً اہل ایمان کی انفرادی صلاح اور اجتماعی فلاح کا ضامن ہے اور یہی صراطِ مستقیم کا رہنما ہے۔ خدا کے بھیجے ہوئے بُرہان اور خدا کی نازل کردہ کتاب کے علاوہ ہر اعتصام خواہ یہ یہودیت کا ہو یا عیسائیت اور یہ ہے یہ وطنیت کا ہو یا قومیت کا، اذیت کا ہو یا معاش کا صراطِ مستقیم کا رہنما نہیں بلکہ سبیلِ منفرد کا رہنما ہے۔ آیت ۱۰۳ میں بتایا جا چکا ہے کہ صرف انفرادی زندگی میں نہیں بلکہ تمہیں قانونی، اخلاقی، سیاسی اور عائلی زندگی کے تمام گوشوں میں اجتماعی طور پر اعتصام والا بن کر رہنا چاہیے۔ اور اس سے زندگی کا کوئی گوشہ نہ ہٹا کر رہنا چاہیے۔ مختلف مکمل کوششیں اسی تمام اسی مرکز اسی سلسلہ اسی وجود اسی طاقت میں اپنی قدرتی اور مناسب ترکیب و ترتیب کے ساتھ ایک جاہر بنی جائیں۔ اور تمام اعمال اور قوتوں پر ایک ایسی اجتماعی کیفیت طاری ہو، ہر قوت ٹھنی ہوئی، ہر عمل باہم ملتا ہو، ہر شخص نے سب کے لئے ایک دوسرے سے متحد و متصل ہو۔ کوئی چیز کوئی گوشہ کوئی عمل اس سے علیحدہ نہ ہو۔ اسی کا نتیجہ صراطِ مستقیم ہے۔ یہاں ایمان کے ساتھ اعتصام کا ذکر کر کے اور باپنویں پائے میں اخلاص کے ساتھ اعتصام کا ذکر کر کے اور چوتھے پائے میں تقویٰ کا حکم دینے کے بعد اعتصام کا ذکر کر کے اشارہ کیا ہے کہ ایمان، اخلاص اور تقویٰ کی حقیقی کسوٹی اعتصام بکتاب اللہ بہت رسول اللہ ہے۔ ایمان خالص کا معیار یہی ہے کہ مسلمان نظامِ حیات کے مطلق کے مقابلے میں نبوت کے لئے ہوتے علم و عمل کا بلبل بالا کریں اور زندگی کے ہر گوشہ میں اس سے وابستہ ہو، کسی حال میں اس سے جدا نہ گراؤ نہ کھٹکے۔

اس آیت میں اس ایمان کے جس میں اعتصام موجود ہو دو مانگزیہ نتیجے ملتے ہیں اور میں بتا چکا ہوں کہ ان کے لئے ہیں فی جملہ منہ و فضل یعنی اللہ سبحانہ ان لوگوں کو جن کے ایمان میں نبوت کے لئے ہوتے علم و عمل سے اعتصام ہو گا اپنی خاص رحمت میں اور اپنے خاص فضل میں ضرور داخل کرے گا۔ رحمت سے مراد عام شارحینِ قرآن نے رحمت اور فضل سے مراد اہلِ رحمت کو مزید اگر اطمینانیت بتایا ہے لیکن ہماری رائے میں یہاں رحمت سے مراد انفرادی صلاح اور فضل سے مراد دوسروں کی اصلاح کی ہے۔ اسی لیے نبوت کو فضل قرار دیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ قرآن و سنت سے وابستگی کے نتیجہ میں جنہیں انفرادی طور پر اچھا بنانے کا ارادہ ہو اور دوسروں کو اچھا بنانے کا مقام عطا کرے گا، تمہارا وجود انسانیت کے لیے رحمت ہو گا۔ پوری انسانیت تمہارے انکار نہائے علم، تمہارے فضائل سے استفادہ کرے گا اور اس انفرادی صلاح اور اجتماعی فلاح کے بعد اللہ ایسی

شاہراہِ قہار سے یہ کھڑے گا جس پر ہل کر تم منزل مقصود کو پہنچ جاؤ گے۔ دنیا میں سیادت، قہادت اور امامت کا مقام ملے گا۔ آخرت میں جنت اور رضوان عطا کرے گا۔ یہی وہ صراطِ مستقیم ہے جس پر قائم رہنے کی ہر نازی ناز کی برکت میں اللہ کی جناب میں درخواست کرتا ہے۔

آیت کا زبردست احتجاج

قرآن کی یہ آیت مسلمانانِ عالم کے رہنماؤں اور ان کے حکمرانوں کے خلاف زبردست احتجاج ہے۔ موجودہ عالم اسلام اللہ کی برہان اور اس کے نازل کردہ فُورِ مبین کے اعتصام سے ہٹ کر یورپ کے لائے جوئے مختلف نظاموں سے جس طرح اعتصام کر رہا ہے اس کے مطالعہ سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ان رہنماؤں، لیڈروں اور حکمرانوں نے یورپ کے فکری فلسفہ کو اپنے ساری اقتصادی سیاسی اور ثقافتی پہلوؤں کے ساتھ نیز ان کی مادہ پرستانہ قومیت کو اپنانے کا عزم کر لیا ہے وہ اس اسلامی مزاج کے ساتھ جس کی جڑیں اور شاخیں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ اور اس کے علمی، اجتماعی و خاصہ کے ساتھ مستقل طور پر برسرِ پیکار اور معنوی اور روحانی قوتوں کے ساتھ برسرِ جنگ ہیں۔ وہ اپنے طرزِ عمل، نظامِ تعلیم و تربیت اور اعلانات کے ذریعے قوم کی اس قوتِ ایمانی اور جذبہِ دینی کو غیر شعوری طور پر داؤ پر لگا رہے ہیں اور یورپ کی طاقت کو ترقی کا ذریعہ سمجھ کر دھوکے میں پڑنے لگے ہیں۔ بے شک یہ رہنما وقتاً فوقتاً اسلام سے اپنی وابستگی اور دلچسپی کا ایمان کی حد تک اظہار کرتے رہتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ان کے اور عوام کے درمیان اسلام سب سے بڑا اور طاقتور رابطہ ہے اور اس کا نام ایسے ہیگز وہ لاکھوں عوام کے دلوں پر حکومت نہیں کر سکتے۔ لیکن اعتصام سے وہ تہی دامن ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں اسلام ایمان و اعتصام کا نام نہیں ہے بلکہ ان کے نزدیک اسلام اس ایمان کا ہے جس میں اعتصام نبوت کے علم و عمل سے نہیں بلکہ مغربی فکر، مغربی تمدن کے ساتھ ہو، صرف عقائد و اخلاقیات میں محدود رہ کر ساری زندگی میں بے قید و ہرے کو ہی وہ اسلام سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر سالم کی یہ بات بالکل درست ہے کہ

اس مقصد کی خاطر قومیت نے اسلام سے پروری ہم آہنگی کی ہے لیکن جس اسلام کو قومیت نے اپنایا ہے وہ قدیم اسلام نہیں بلکہ جدید ملِ شہ جدید اسلام ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کا نام تو لیتے ہیں لیکن صرف اس لیے کہ ہر اس چیز کے لیے سند جو اہل جانتے جیسے قوم پرور اختیار کرنا چاہیں۔

مطلب یہ ہے کہ ان کے یہاں اسلام ایمان و اعتقاد کا نہیں بلکہ چند عقائد اور چند رسوم کا نام ہے اور رسوم کے لیے بھی حقیقی ہونا شرط نہیں بلکہ وہ تمام دراجی رسمیں جو مسلمانوں میں رائج ہوں اسلام ہیں۔

يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللَّهُ يُفْتِنُكُمُ فِي الْكَلِمَاتِ إِنَّ أَكْثَرَكُمْ لَافْهَكٌ
 لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ وَلَكِنَّ خَيْرَ مِمَّا تَدَّعَوْنَ لَهَا زَيْفٌ وَلَهُ أَجْرٌ لَمَّا تَرَكَ^{٢٦٥} وَهُوَ يَرِيهَا إِنْ
 لَمْ يَكُنْ لَهَا وَلَدٌ فَإِنْ كَانَتَا أَتْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الشُّلْحُنُ مِمَّا تَرَكَ^{٢٦٦}
 وَلَنْ كَانُوا اخْوَةً رِجَالًا وَنِسَاءً فَلِلَّذَكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ
 بَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ أَنْ تَضِلُّوا وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ



اے پیغمبر لوگ! آپ کا حالہ کے باسے میں فتویٰ دریافت کرتے ہیں
 فرمادیجئے کہ اللہ تم کو کلامہ کے باسے میں حکم دیتا ہے کہ اگر کوئی
 ایسا شخص مرے ہو جس کی اولاد نہ ہو اور اس کی ایک بہن موجود
 ہو تو جو کچھ مرنے والا چھوڑ جائے اس کا ادا بہن کا ہے۔ اور بہن
 مر جائے اور اس کی اولاد نہ ہو تو اس کا وارث بھائی ہوگا، پھر
 اگر دو بہنیں ہوں تو انہیں ترکہ کے میں سے دو تہائی ملے گا، اور
 اگر بھائی بہن ہوں کچھ مرد اور عورتیں تو پھر مرد کے لیے دو عورتوں

کے برابر حصہ۔ اللہ تمہارے لیے اپنے احکام واضح کرتا ہے تاکہ
تم گمراہ نہ ہو اور اللہ تمام باتوں کا علم رکھنے والا ہے۔

میراث کا ایک ذیلی مسئلہ

سورت کے آغاز میں قرابت و اول کے حقوق و احکام بیان ہوئے تھے درمیان میں بھی ان مسائل کا تذکرہ ہوا اب سورت کا انتہام بھی اسی پر ہوا ہے۔ یہ آیت گرامی پوری سورت خدا کے نازل ہونے کے بہت عرصہ بعد نازل ہوئی بلکہ کچھ روایات سے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ نزول کے اعتبار سے قرآن کی آخری آیت ہے۔ بہر حال یہ آیت میراث کے مسائل میں ایک منیمہ کی حیثیت رکھتی ہے جو ابتدائے سورت کے بیان کردہ احکام وراثت کے ایک خاص مسئلہ کی وضاحت کے لیے بعد میں نازل ہوئی ہے۔ اتفاقاً نے یہ بات خوب لکھی ہے کہ سورت کا آغاز بھی مالیاتی مسائل سے ہوا تھا، خاتمہ بھی مالیاتی مسائل کی ایک خاص دفعہ پر مشاکلت کے لیے کیا گیا۔ اور شاید کلام کا مسئلہ آخر میں ذکر فرما کر اس طرف اشارہ ہو کر جس طرح کلام کا وارث اس کے بھائی ہوئے ہیں اسی طرح بنی اسرائیل کے وارث اب بنی اسماعیل ہیں۔ بنی اسرائیل حضرت یسوع کے بعد ایک کلام کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ حضرت مسیح اسرائیلی سلسلہ نبوت کے آخری فرد ہیں اس لیے اب نبوت بنی اسماعیل میں منتقل ہوئی ہے جو بنی اسرائیل کے بھائی ہیں۔ اور دونوں خاندانوں کو بابرکت کر کے لا و مدہ ہی حضرت ابراہیم سے تھا۔ حضرت یسوع الاسلام لہنے افادات میں یہاں ایک خاص نوٹ تحریر فرما گئے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ اس جگہ کلام کے حکم کو بیان فرماتے سے پسند یا نہیں معلوم ہو سکتی ہے۔

اولا یہ کہ جیسا پہلے وان تکلف ما فان لله ما فی السموات وما فی الارض فرما کر اس کے بعد بطریق تفسیل اہل کتاب کا ذکر فرمایا تھا ایسے ہی آیت فاما الذین آمنوا باللہ فامضوا کے بعد صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ بھی بطریق تفسیل ذکر کر دیا ہے تاکہ وحی سے انحراف کرنے والوں کی گمراہی اور بُرائی اور وحی کا اشتهار کرنے والوں کی حقانیت خوب سمجھ میں آجائے۔

لہذا اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ اہل کتاب کا حال تو یہ کہ انہوں نے ذاتِ قدس سبحانہ کے لیے

شریک اور اولاد جیسے شیعہ کلام کو اپنا ایمان بنالیا اور وحی الہی کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا حال یہ ہے کہ اکثر اہل ایمان اور رسوم عبادات تو درکنار معاملات جزئیہ اور معمولی مسائل متعلقہ نیز شائع نکاح وغیرہ میں بھی وحی کے متنازعہ اور اس کی انتظار میں رہتے اور زندگی کے ہر معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ اقدس کو دیکھتے کر کیا ارشاد ہوتا ہے اپنی عقل اور خواہش کو قطعاً حاکم نہ سمجھتے۔ اگر ایک بار تسلی نہ ہوتی تو مکرر حاضر خدمت ہو کر دریافت کرتے۔ یہیں تعادلت راہ از کہا بست تا بجا۔

ثالثاً یہ بھی معلوم ہو گیا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بلا حکم وحی اپنی طرف سے حکم نہ فرماتے تھے۔ اگر کسی معاملہ میں حکم وحی موجود نہ ہوتا تو حکم فرمانے میں نزول وحی کا انتظار فرماتے، جب نزول وحی ہوتا تو حکم فرمانے۔ اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ اللہ سبحانہ کے سوا حکم کوئی نہیں چنانچہ آیات متعددہ میں ان الحکماء لا لله وغیرہ صاف مذکور ہے، باقی حویں سب واسطہ ہیں۔ ان کے ذریعے سے اور ان کو حکم الہی پہنچایا جاتا ہے خواہ واسطہ قریب ہو یا بعید جیسا حکم سلطان کی پہنچانے کے لیے وزیر اعظم اور دیگر مقربین شاہی اور حکام اعلیٰ اور ادنیٰ درجہ بدرجہ واسطہ ہوتے چھہ اس سے زیادہ گراہی کیا ہوگی کہ کسی معاملہ میں وحی الہی کے مقابلے میں کوئی گراہ کسی کی بات سے اور عمل کرے۔

اناکہ زردے تو بہاتے مگر آئند
کو تر نظر آئند چہ کو تر نظر آئند

رابعاً اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ایک دفعہ تمام کتاب کے نازل ہونے میں جیسا کہ اہل کتاب درخواست کرتے ہیں وہ غور نہیں ہے جو حسب ضرورت اور حسب موقع متفرق نازل ہونے میں ہے کیونکہ ہر شخص اپنی ضرورت کے مطابق سوال کر سکتا ہے اور بذریعہ وحی اس کو جواب مل سکتا ہے جیسا کہ یہاں اور قرآن کے دوسرے مواقع میں موجود ہے۔ اور یہ صورت مفید تر ہونے کے علاوہ بوجہ خرافت ذکر خداوندی و عزت خطاب حق عزوجل ایسے فخر عظیم پر مشتمل ہے جو کسی اُمت کو نصیب نہیں ہے جس صحابی کی بھلائی میں یا اس کے سوال میں کوئی آیت نازل ہوئی وہ اس کے مناقب میں شمار ہوتی ہے اور اختلاف کے مواقع میں جس رائے یا جس کے قول کے موافق وحی الہی اتری تا قیامت ان کے نام کا بول بالا ہوا۔ لہذا کلام کے متعلق سوال و جواب کا ذکر فرما کر اس طرح کے بالعموم سوالات اور جوابات کی طرف اشارہ کر دیا، اور غالباً اسی اشارے کی خاطر سوال کو مطلق رکھا۔ مسئلہ عنہ کا سوال کے ساتھ ذکر نہیں کیا بلکہ جواب میں اس کی تصریح فرمائی جس کی قرآن میں کہیں مثال نہیں ہے۔ اور پھر جواب کی اللہ سبحانہ کی طرف شہادت فرمائی۔ اہل اصل جملہ احکام کے لیے

وہی اہل مشا اور اصل ہے۔ اور ہدایت اسی کی متابعت پر موقوف ہے اور کفر و ضلالت کسی کی مخالفت میں منحصر ہے اور چونکہ زمانہ نبوت میں یہود و نصاریٰ اور مجید مشرکین اور تمام اہل ضلالت کی گنجی کی مڑبڑبی مخالفت تھی اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں بہت جگہ وحی کی متابعت کی خبر لی اور اس کی مخالفت کی غواہ پر تنبیہ فرمایا، بالخصوص اس جگہ تو دور کر کے واضح ہے کہ ہمتیہ با نشان مضمون ہے۔ شاید حضرت ام بخاری نے اسی دہم سے اپنی کتاب میں

باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ

من بعد فرار منیت انا و جینا الیائک کا اوچینٹ الی نوح والنبیین من بعدہ کو ترجمہ اہباب میں داخل کیا اور ان دونوں رکوعوں کی طرف اشارہ کر کے گویا مطلب یہ ہے کہ یہاں سے مضمون وحی کے خزانہ تلاوت کر لو۔

۲۶۵۔ لے پھر باب سے کمال کے حصے میں فتویٰ دریافت کرتے ہیں، فرمائیے کہ اللہ قسم کہ کمال کے حصے میں حکم دیا ہے۔ شروع سورت میں کیت میراث میں کمال کی میراث کا ذکر کر کے چکا ہے۔ اس کے بعد جو بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کے متعلق زیادہ تفصیل پر چھنی چاہی تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ کمال کے حصے کو مرد اور ضعیف یہاں وہ شخص مراد ہے جس کے وارثوں میں باپ اور اولاد میں سے کوئی نہ ہو جیسا کہ پہلے بیان ہوا کیونکہ اصلی وارث والد و والدہ ہی ہیں، اس کے یہ نہ ہوں تو اس کے حقیقی بھائی جبین کریشا، بیٹی کا حکم ہے۔ اور اگر حقیقی نہ ہوں تو بیٹی کا حکم سوتیلوں کا ہے جو کہ باپ میں شریک ہوں۔ ایک بہن ہو تو ادا ادا وہ بہنیں ہوں تو دو تھائی۔ اور اگر بھائی بہن دونوں ہیں تو مرد کو دہرا حصہ اور عورت کو اکرا حصہ ملے گا۔ اور اگر صرف بھائی ہوں، بہن کوئی نہ ہو تو وہ بہن کے دل کے وارث ہوں گے یعنی ان کا کوئی حصہ مقرر نہیں بلکہ وہ حصہ ہیں جیسا کہ آیت میں یہ سب صورتیں مذکور ہیں۔ باقی رہ گئے ہیں وہ بھائی بہن جو صرف ماں میں شریک ہوں جن کو انبیاء نے کہتے ہیں تو ان کا حکم آغاز سورت میں بیان ہو چکا ہے کہ ان کا حصہ مقرر ہے۔

کمال کی معنوی تحقیق پر ہم جو تھی جلد میں سورہ نسا کی آیت ۱۲ میں تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔ یہاں ہم محض تعقیب سخن کی خاطر اس پر اجمالی تبصرہ کرتے ہیں۔

کلامہ کی لغوی اور اصطلاحی تحقیق

علامہ محمد الدین فیروز آبادی نے کلامہ کی لغوی معنی کے متعلق اہل لغت کے ساتھ اقوال نقل کیے ہیں۔ علامہ مشکوٰۃ فریقہ نے لسان العرب میں ابن باری کی جانب نسبت کر کے لکھا ہے کہ کلامہ اصل میں مصدر ہے۔ کل ایک کلامہ بولا جاتا ہے۔ کل اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنے پیچھے زبٹا چھوڑے اور باپ۔ نطق کلامہ وارث اور مرد۔ ث دونوں پر بولا جاتا ہے۔ اگر مرد۔ ث کے معنی ہیں تو مصدر یعنی اسم مفعول ہے جیسے غنم یعنی غنوق اور اگر کلامہ وارث کے معنی ہیں ہو تو مصدر یعنی اسم فاعل ہے جیسے عدل یعنی عادل، رجل عدل یعنی اور مار غنم میں یعنی غنم، نطق کلامہ مرد۔ ث کے معنی بصری کا مختار ہے اور نطق کلامہ یعنی وارث کو لینا کا مختار ہے۔ ابن الاثیر فرماتے ہیں کہ اب اور میثا آدمی کی دو طرفین ہیں، اگر دونوں طرفین نہ رہیں تو آدمی کلامہ کہلاتا ہے۔ زعفرانی نے اساس البلاغہ میں آدمی کے اب اور میثا نہ ہونے کو یعنی وارث کلامہ کو نماز قرار دیا ہے فرماتے ہیں ومن الجہاز کل غلام اذا لم یکن ولداً وولداً، اصل لغت میں کلامہ کے معنی کمزور ہونے کے ہیں۔ اسی سے وہ تلمذ جو کند ہو گئی ہو کیل اور اسی طرح وہ زبان جس میں توبہ گزرائی نہ ہے اور وہ آنکھ جس کی بینائی کمزور ہو جاتے کیل کہلاتی ہے۔ اسی سے قرآن میں اس کلام کہ جس کا بوجھ مالی کمزوری کی وجہ سے اس کا آقا اٹھائے کل اور اسی سے حدیث میں مذکور انکبوتی نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس میں بتایا ہے انکب العمل اکل آپ قرآن کا بوجھ اٹھاتے ہیں جو خود کمزوری کی وجہ سے اپنی مدد آپ نہیں کر سکتے۔ اور یہی معنی اس ارشاد و گرامی کے

من تروک مالا فلور شتہ ومن تروک کلاماً فالوعلی

جو شخص مال چھوڑ کر مرتے تو وہ اس کے وارثوں کا ہے اور جو بوجھ چھوڑ جاتے

یعنی بے کس اور بے بس اولاد چھوڑ جاتے یا قرین چھوڑ جاتے تو اس کا فقر دائرہ میں ہوں

استعمال میں وسعت کے بعد کلام سے مراد وہ ہوتے ہیں جو منقطع الطرفین ہوں ذراں کے والدین ہوں اور نہ اولاد ہو۔ اور جو شخص آباد اجداد کی خصوصیات سے محروم ہو اس کو بھی کلامہ کہتے ہیں۔ ایک جگہ فرماتا ہے

وہ تشتم قناتہ الملک علیہ کلامہ

عن ابن مناف عبد شمس و حاشم

یعنی عبد مناف کے دونوں بیٹوں عبد شمس اور حاشم سے تم کو حکومت کا نیزہ میراث میں تو ملا

ہے مگر تم خود ان کی خصوصیات سے بے بہرہ ہو۔ قرب کے رشتہ دار کو چھوڑ دینے کے رشتہ دار کو بھی کلامہ

کہتے ہیں۔ بالخصوص اگر عطا علیہ السلام میں مورث اور وارث دونوں کو کہتے ہیں۔ بہر حال اس پر علماء کا اجماع ہے کہ سورہ نسا کی پہلی آیت میں مرنے والے کی جائیداد میں کفار سے وہ مورث مراد ہے جس کے والد اور اولاد نہ رہنے کی صورت میں انبیائی بھائی بہن ہوں یعنی جو میت کے ساتھ صرف ماں کی طرف سے رشتہ رکھتے ہوں اور باپ ان کا دوسرا ہو۔ اور سورہ نسا کی اس آیت میں انبیائی نہیں یعنی اور علاقائی بھائی بہن مراد ہیں یعنی جو میت کے ساتھ باپ اور ماں یا صرف باپ کی طرف سے رشتہ رکھتے ہوں۔ گویا تین صورتیں ہیں، ایک یہ کہ کفار کے وارث انبیائی بھائی بہن ہوں، دوسرے یہ کہ کفار کے وارث یعنی بھائی بہن ہوں تیسرے یہ کہ کفار کے وارث علاقائی بھائی بہن ہوں۔ اس آیت میں انہی دو صورتوں کا ذکر ہے جبکہ پہلی آیت کفار میں پہلی صورت کا ذکر تھا۔

یعنی ہر ایک باپ اور ماں ایک ہی ہوں۔ علاقائی یہ کہ باپ ایک اور ماں تین مختلف ہوں یا در انبیائی یہ کہ ماں ایک ہو اور باپ مختلف ہوں۔

پہلی آیت میں چونکہ پہلی صورت بتائی گئی اس لیے سوال پیدا ہوا کہ باقی دوسری صورتوں کا کیا حکم ہے۔ علامہ خطابی فرماتے ہیں کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر دو آیتیں نازل فرمائی، ایک سورہ نسا کے شروع میں اور دوسری سورہ نسا کے آخر پر، پہلی آیت میں بات اجمالی بتائی گئی تھی، دوسری آیت میں بات کو تفصیل دیا گیا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلی آیت میں اس کفار کا ذکر تھا جو اپنے والدین میں انبیائی بہن بھائی چھوڑ کر مرتا ہے، اس آیت میں اس کفار کا ذکر ہے جو اپنے والدین میں عینی اور علاقائی بھائی بہن چھوڑ کر مرتا ہے۔ یہ بات کہ اس آیت میں اس کفار کا ذکر ہے جو اپنے والدین میں عینی یا علاقائی بھائی بہن چھوڑ کر مرتا ہو۔ حضرت ابو بکر صدیق نے ایک بار خطبہ میں ارشاد فرمایا اور صحابہ میں سے کسی نے اس کے خلاف نہ کیا اس لیے یہ بات اتنا قی اور اجماعی ہے اور اس سلسلے میں حضرت جابر کا وہ واقعہ بھی ہے جسے عام شارحین قرآن نے اس آیت کے پس منظر میں پیش کیا ہے۔

حضرت جابر کہتے ہیں کہ میں بیمار تھا اور بیہوش تھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے، حضور فرمایا اور حضور کے باقی ہانی سے مجھ کو چھینا دیا۔ مجھے ہر شے کیا تو میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں کفار ہوں، میرا کوئی وارث نہیں، میری میراث کا کیا بنے گا، اس پر قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی۔

یہ روایت صحیحین میں اور سنن اربعہ میں موجود ہے۔ اور حافظ ابن جریر کا یہ بھی انکشاف ہے کہ

حضرت ۳ برکے ۹ بہنیں تھیں۔ قرآن کے سیاق اور حضرت ہاجر کے واقعہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کلالہ کے معنی قطعاً بے غبار ہیں۔ قرآن نے موضوع میراث پر سب سے پہلے اولاد کی پھر اولاد کی موجودگی میں اور عدم موجودگی میں اور بھائیوں کی موجودگی اور عدم موجودگی میں والدین کی میراث کا ذکر کیا ہے پھر اولاد کی موجودگی اور عدم موجودگی میں میاں بیوی کی میراث کا ذکر کیا ہے۔ ان کا میت سے بلا واسطہ تعلق ہے اب ظاہر ہے جن کا تعلق میت سے بلا واسطہ ہو گا وہ کلالہ ہے اسی لیے اس کے بعد کلالہ کی میراث کا ذکر ہے اور گزشتہ مضامین میراث بولی رہا ہے کہ کلالہ وہ ہے جس کا باپ نہ ہو اور بیٹا نہ ہو کیونکہ ان کی میراث بیان ہو چکی ہے۔ اگر لغت سے کلالہ کے معنی معلوم نہ بھی ہوں تو قرآن کا سیاق خود معنی بتانے کے لیے کافی ہے اور شاید اسی بنا پر امام اعظم ابوحنیفہ نے کلالہ کے معنی میں دادی اور پوتے کی نفی کا بھی اضافہ کیا ہے، بہر حال اس آیت نے اور نسائی پہلی آیت نے یہ بات کھول دی ہے کہ ایسا شخص جس کا صاحب فرزند میں سے کوئی وارث نہ ہو اور اپنے بچے یعنی یا غلامی بھائی بہن چھوڑ کر مر رہا ہے تو ان کی وراثت کا مضابطر ہے۔

وارثوں میں اکیلی بہن

۲۶۶۔ اگر کوئی ایسا شخص مر ہو جس کی اولاد نہ ہو اور اس کی ایک بہن موجود ہو تو جو کچھ مرنے کے بعد اس نے چھوڑا ہے اس میں آدھا اس کی بہن کا ہے۔ یعنی اگر کوئی مرد مر گیا اور اس نے ایک بہن چھوڑی نہ بیٹا چھوڑا نہ باپ تو اس کی میراث میں نصف مال ملے گا۔

اصل ارشاد میں لفظ ھلک آیا ہے اس کے معنی مر جانے کے ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ اس کا استعمال تحقیر کے موضوع پر ہوتا ہے لیکن حقیقت کی نکتے میں یہ صحت حادث ہے ورنہ اصل میں اس کے معنی میں ایسی کوئی بات نہیں۔ اس معنی میں یہ لفظ خود قرآن و سنت میں آیا ہے اور تحقیر کا کوئی پہلو وہاں نہیں ہے۔ حضرت یوسف کے بارے میں ہے حتی اذا ھلک اور حدیث میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال مبارک ہوا تو مدینہ میں آدھ دفغان سے ایک ہنگامہ پڑا تھا۔ باہر سے آنے والے نے دریافت کیا یہ کیا ہو گیا۔ لوگوں نے جواب دیا کہ حلیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضور کا وصال ہو گیا ہے لیکن بکھنکھت میں یہ لفظ حقارت والی صفت پر بولا جانے لگا۔ اسی بنا پر علامہ مخاحی نے

شرح شفا میں تصریح کی ہے۔

انبیاء کے حق میں اس لفظ کو استعمال ذکرنا چاہیے اور لغت قدیم معنی کا خیال لیا جائے تو اعداد شریعہ سے تھوڑا سا نکلاؤ کہنے والا شخص بھی یہ بات بگولی جانتا ہے۔
علاء رضی زبیدی نے تاج العروس میں بھی یہ بات نقل کی ہے۔

یہ بات کہ اگر کلالہ وہ ہے جس کے باپ نہ ہو اور بیٹا نہ ہو تو قرآن نے صرف بیٹے کی نفی کیوں کی ہے اور یہ کیوں فرمایا ہے کہ لیس لہ ولد، اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن نے یہاں بیٹے نہ ہونے کی تصریح اس لیے کی ہے کہ اولاً بیٹا نہ ہونا کلالہ کے لغوی مفہوم میں موجود ہے

نمایا عمرہ آدمی کی وفات والدین کے وفات کے بعد ہوتی ہے اس کا مراد یا اپنی کمال سے ہونا ہے یا وراثت میں ملتا ہوتا ہے۔

ثالثاً، بھائیوں اور بہنوں کا والد کے ساتھ وارث نہ ہونا خرافتوں کی آیات سے پہلے معلوم ہو چکا ہے اس لیے یہاں باپ نہ ہونے کی شرط لگانے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ یہ بات خود قرآن سے، میراث کے قواعد سے پہلے ہی معلوم تھی اس لیے اختصاراً اسے حذف کر دیا۔

آیت میں ولد سے کیا مراد ہے؟ ولد سے مراد یہاں بیٹا ہے کیونکہ بیٹے کی موجودگی میں بہن والا تھا وارث نہیں ہو سکتی اور بیٹی کی موجودگی میں بہن کو وراثت میں حق ملتا ہے لیکن کچھ علماء کہتے ہیں یہاں ولد بیٹا اور بیٹی دونوں کے لیے ہے۔ زید بن ثابت سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص کا انتقال ہو گیا ہے اس نے اپنے پسماندگان میں ایک بیٹی اور ایک بیوی چھوڑی ہے میراث کا حکم کیا ہے فرمایا کہ بیوی کو آدمی اور بہن کو آدمی جائداد سے دی جائے اور فرمایا کہ میں بارگاہ نبوت میں حاضر تھا، آپ نے یہی فیصلہ فرمایا تھا۔ یہ حدیث مسند امام احمد میں ہے۔ حافظ ابن جریر نے عبد اللہ بن عباس اور عبد اللہ ابن الزبیر کا فیصلہ اس شخص کے بارے میں جو ایک بیٹی اور بہن چھوڑ کر انتقال کر جاتے یہ نقل کیا ہے کہ بہن کو کچھ نہ ملے گا لیکن جھوڑنے اس معاملہ میں عبد اللہ بن عباس اور عبد اللہ بن الزبیر سے اختلاف کیا ہے، ان کی رائے میں بیٹی کو نصف فرض کی بنا پر اور بہن کو نصف حصہ ہونے کی وجہ سے دیا جاتے گا۔ بہن کو حصہ بنا کر دینا اس واقعہ کی وجہ سے ہے جو صحیح بخاری میں بحوالہ سلیمان ازراہیم الاسود آیا ہے کہ حضرت معاذ نے زنا زہرت میں ایسے ہی واقعہ لڑکی کے لیے اور بہن کے لیے نصف کا فیصلہ فرمایا تھا۔

اور صبیح کنہاری میں ہندلی بن شریل کے حوالہ سے ہے کہ
حضرت ابو موسیٰ اشعری سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص کا انتقال ہو گیا۔ اس نے
پسماندگان میں ایک بیٹی، ایک پوتی اور ایک بہن چھوڑی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ بیٹی کو
نصف اور بہن کو نصف ملے گا یہ بنا کر فرمایا کہ عبداللہ بن مسعود سے بھی پوچھ لو۔ سائل
نے عبداللہ ابن مسعود سے دریافت کیا اور ساتھ ہی ابو موسیٰ کا فتویٰ بھی بتا دیا۔ عبداللہ
بن مسعود نے کہا پھر تو میں بے راہ ہو جاؤں گا اور مجھے راہ نہ ملے گی۔ میں تو وہی فیصلہ کروں
گا جو حضور نے فیصلہ کیا ہے۔ اُدھا، بیٹی کو ملے گا اور چھٹا پوتی کو ملے گا اور باقی بہن
کو۔ سائل کہتا ہے کہ میں ابو موسیٰ کے پاس آیا اور ان کو عبداللہ بن مسعود کے فتویٰ
سے آگاہ کیا، بولے جب تک یہ عالم تم میں موجود ہے مجھ سے مسائل نہ پوچھا کرو۔

بھائی بہن کے سائے مال کا وارث

۲۶۷۔ اور بہن مر جائے اور اس کی اولاد نہ ہو تو اس کا وارث بھائی ہوگا۔ یعنی اور اگر اس کے برعکس
ہو یعنی کوئی عورت لاد لہر گئی اور اس نے بھائی عیانی یا علاتی چھوڑا تو وہ بہن کے مال کا وارث ہوگا کیونکہ
وہ عصہ ہے اور اگر اس نے لڑکا چھوڑا تو بھائی کو کچھ نہ ملے گا اور اگر لڑکی چھوڑی تو لڑکی سے جو کچھ بچے گا
اور اس بھائی کو ملے گا اور اگر بھائی بہن، خیالی ہوں تو اس کے لیے چھٹا حصہ مقرر ہے جیسا کہ ابتدائے ستر
میں گزر چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بھائی اس کے سائے مال کا وارث ہوگا اگر اور کوئی صاحب
فریضہ نہ ہو۔ اگر کوئی صاحب فریضہ موجود ہو مثلاً شوہر تو اس کا حصہ ادا کرنے کے بعد باقی تمام ترکہ
بھائی کو ملے گا۔

مشار یہ ہے کہ بھائی بہن کے مال کا وارث ہوگا جب کہ اس کے بیٹا نہ ہوں، والدہ ہو جیسا کہ کلامہ کی
معنوی روح کا تقاضا ہے اور جیسا کہ فرائض اور میراث کے قواعد و ضوابط کی روح ہے۔

کلامہ برادر کی اگر دو بہنیں ہوں

۲۶۸۔ پھر اگر دو بہنیں ہوں تو ان کو ترکہ میں سے دو تہائی ملے گا۔ یعنی اگر دو سے

زیادہ بہنیں ہوں تو ان کو دو تہائی ملے گا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر مرنے والا کلاہ اپنے پیمانہ گان میں دو بہنیں چھوڑ کر مرے تو ان کو بھائی کے ترکہ میں سے دو تہائی ملے گا اور اگر دو سے بھی زیادہ ہوں جیسا کہ حضرت جابر کی نو بہنیں تھیں تو ان کو بھی دو تہائی ہی ملے گا اور باقی عصبہ کر لے گا بشرطیکہ اصحاب فرض میں سے کوئی نہ ہو۔ اہل فرض اور ہجرت کے وقت ہر حال میں ستم ہو گا۔ اس آیت میں کلاہ کی دو بہنوں کا خاص طور پر حکم دیا اور حکم بھی ایسے میں انداز میں بتایا کہ درہنوں کے لیے صرف تھنہ کی ضمیر پر اکتفا نہیں فرمایا۔ بلکہ آتشیں کا حد سے کرائے، صرف اس لیے تاکہ کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ جب ایک بہن کا اوصاف ہے تو دو بہنوں کا تو لازماً سارا ہو گا فرمایا یہ بات نہیں بلکہ بہنیں دو ہوں گی تو صرف دو تہائی ملے گا پورا نہیں ملے گا اور دسے زائد کے واسطے میں بات پھلے نہائی جا چکی ہے کہ خان کن نساہ طوق آتشیں فسدن ملشاماترث اس لیے یہاں اس کا ذکر نہیں کیا۔

مرد کو عورت سے دگنا

۲۶۹۔ اگر بہن بھائی ہوں، کچھ مرد کچھ عورتیں تو پھر مرد کے لیے دو عورتوں کے برابر حصہ ہے یعنی اگر میت کلاہ ہر اس کے زباب ہو نہ بیٹا اور اس کے وارثوں میں بھائی اور بہنیں ہوں تو میت کا ترکہ ان بھائی بہنوں میں دو اور ایک کی نسبت سے تقسیم ہو گا، اس کے لیے یہ مبلغ تعبیر انتیاء کی لفظ کے مثل حظ الا نثین یعنی لڑکے کو دو لڑکیوں جیسا ہے، یہ نہیں فرمایا الا نثین مثل حظ الذکر دو لڑکیوں کو ایک لڑکے جیسا ملے گا بالانقی مثل حظ الذکر کہ لڑکی کو لڑکے سے ادھا ملے گا اس میں اس داہی ذہن کی تردید ہے جو عورتوں کو وراثت سے محروم کرتا تھا۔

یہ بات کہ مرد کو عورت کے مقابلہ میں ڈبل کیوں دیا گیا ہے؟ یہ سوال بہتوں کے ذہنوں میں ابھرا ہے۔ اور شارحین قرآن نے اس پر مختلف انداز میں داہ تحقیق دی ہے۔ آئیے ذرا اس موضوع پر ایک اور پہلو سے غور فرمائیے۔ یہ صحیح ہے کہ قرآن نے صرف عورتوں کے حقوق کا اعتقاد ہی پیدا نہیں کیا بلکہ صاف صاف اعلان کر دیا کہ حقوق کے اعتبار سے مرد و عورت دونوں برابر ہیں۔

ولہن مثل الذی علیہن

اور یہ بھی درست ہے کہ جہاں تک معیشت اور مالیاتی استقلال کا تعلق ہے قرآن نے مرد و عورت دونوں کے استقلال کا اعلان کیا ہے۔

للرجال نصيب مما اكتسبوا وللنساء نصيب مما اكتسبن
اور یہ بھی امر واقعہ ہے کہ وراثت میں قرآن نے حدودی کی حد تک مرد و عورت دونوں کی برابری کا اعلان کیا ہے۔

للرجال نصيب مما ترك الوالدان والاقاربون وللنساء نصيب مما ترك
الوالدان مما قلی منه او کثیر

اس کے باوجود ترتیب اور تقسیم حقوق میں عورت کو مرد سے نصف دیا ہے، اوروں کا یہ نہیں مگر اس کی وجہ جہاں تک میں سمجھا ہوں یہ نہیں ہے کہ عورت کمزور ہے جیسا کہ علامہ آلوسی کی رائے ہے اگر بنیاد بھی برتنو پھر عورت کو ڈبل ملنا چاہیے اور طاقتور کو سنگل ملنا چاہیے۔ اور اس بات میں کوئی خاص وزن نہیں ہے کہ مرد کو خاندانی زندگی میں قوام بنایا گیا ہے اور یہ بھی کوئی وجہ نہیں ہے کہ عورت کی فطری ساخت، جسمانی ترکیب اور عضو یا قیامت نے اسے اس قابل ہی نہیں رکھا ہے کہ تربیت اولاد کے ساتھ اور کوئی کام کرے۔ واقعی وجہ اس کی یہ ہے کہ عورت کو میراث میں لڑکے کے مقابلہ میں ادھا اس لیے دیا گیا ہے کہ عورت کو بہر کی صورت میں شوہر کی جانب سے جو دق ملنے والی ہے وہ اس کی کو پورا کر دیتی ہے۔ نیز عورت پر شادی ہو جانے کے بعد اپنی رہائش، خوراک کی کوئی ذمہ داری نہیں برتنی ہے شوہر اس کی ہر قسم کی کفالت کرتا ہے۔ اسے خال سے روں سمجھتے کہ رشید کا انتقال ہوا ہے۔ اس نے دو بالغ بچے حمید اور فریدہ چھوڑے ہیں اور اس کا ترکہ تین ہزار روپیہ ہے۔ ظاہر ہے کہ دو ہزار حمید کو ملیں گے اور ایک ہزار فریدہ کو۔ اب دونوں کی شادی ہوتی ہے، حمید کو اپنی بیوی کو ایک ہزار روپیہ ہز دینا ہے اور فریدہ کو اپنے شوہر سے ایک ہزار روپیہ مہر لینا ہے۔ حمید پر اپنی اور اپنی اہلیہ کے ان و نفقہ کی ذمہ داری ہے جب کہ فریدہ اپنے ان و نفقہ سے بے فکر ہے۔ مہر کے باسے میں پڑ چکے ہو و اقوالہ صدقاتہن مخلصہ، اور و آیتہ اعداھن قنطلا۔

ان حالات میں آپ ہی ذرا انصاف فرمائیے کہ زیادہ کس کو ملا ہے، لڑکی کو یا لڑکے کو۔ لڑکے کے پاس صرف ایک ہزار ہے اور اس میں اس پر خاٹگی ذمہ داریاں ہیں۔ لڑکے پر مہر کی ذمہ داری ہے اس لیے اس کو ڈبل دیا گیا ہے۔ لڑکی کو مہر لینا ہے اس لیے ان کو میراث میں حصہ سنگل دیا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ شوہر کے مرجانے پر بیوی کو چھوٹا اور آٹھواں دیا ہے اور بیوی کے مرجانے پر شوہر کو

ڈبل اور چوہا لایا ہے کیونکہ بیوی کے مہانے پر شوہر کو دوسری شادی کرنی ہے بیوی کو مہر دینا ہے اور شوہر کے مہانے پر بیوی کو دوسری شادی کرنی ہے اس کو مہر لینا ہے۔

نزولِ قوانین کا مقصد

۲۶۰۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام واضح کرتا ہے تاکہ تم گمراہ نہ ہو اور اللہ تمام باتوں کا علم رکھنے والا ہے۔ یعنی اللہ رحیم و کریم محض اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے اور ان کو گمراہی سے بچانے کے لیے اپنے احکام حق و صادق بیان فرماتا ہے جیسا یہاں میراث کا لڑ کو بیان فرمادیا۔ اس کی اس میں کوئی غرض نہیں ہے وہ سب غنی اور بے نیاز ہے تو اب جو اس مہربانی کی قدر نہ کرے بلکہ اس کے حکم سے انحراف کرے اس کی شکایت کا کیا حکمانا، اس سے معلوم ہو گیا کہ بندہ کو جملہ احکام کی تابعداری لازم ہے اگر معمولی اور جزوی امر میں خلاف کرے گا تو گمراہی ہے پھر جو لوگ اس کی ذات پاک اور اس کی صفات کمال میں اس کے حکم کے خلاف کرتے ہیں اور اپنی عقل اور اپنی خواہش کو اس کے مقابلہ میں اپنا منہ بناتے ہیں۔ ان کی منکالت اور بغاوت کو اسی سے سمجھ لیجئے کہ کس درجہ کی ہوگی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ سبحانہ اپنے بندوں کی ہدایت پسند کرتا ہے آخر میں ارشاد ہے کہ اس کو سب کچھ معلوم ہے۔ تو مطلب یہ نکلا کہ مسائل و بنیہ میں جو ضرورت پیش آئے اس کو رو چھو لو۔ یہاں صحابہ نے جو کلام کے مسئلہ میں استفسار فرمایا تھا اس کی تحسین کی طرف اور اس کے ایسے سوالات کی ترغیب کی طرف اشارہ کر دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ اللہ سب کچھ جانتا ہے یعنی تم نہیں جانتے تم تو یہ بھی نہیں بتلا سکتے کہ کلام اور اس کے سوا دیگر صورتوں میں جو حصہ مقرر کیا گیا ہے فی الواقع اس کی وجہ کیا ہے؟ پھر آدمی کی عقل اس قابل کب ہو سکتی ہے کہ اس کے جبر سے حق سبحانہ کی ذات و صفات میں دھمکی کے خلاف پر جرات کرے جو اپنے تعلقات اور اپنے اقارب کے فرق اور امتیاز سے عاجز ہو وہ بے چرن و چگون اور اس کی مشقت کو بدون اس کے بتلانے کیا سمجھ سکتا ہے بلکہ ان تفصیلاً اصل میں علت بیان کرنے کے لیے ہے۔ اصل میں ثلاثاً تفصلاً ہے یعنی تاکہ تم بے راہ نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اسلامی احکام و قوانین کا بنیادی مقصد افراد کی تکمیل ذات اور انسان کی اجتماعی زندگی کی نشوونما ہے۔ فرد کی تکمیل ذات اور اجتماعی سیرت کی تشکیل و تعمیر ایک ایسا مقصد ہے جس سے سیاسی ترقی اور معاشی فارغ البالی کا مقصد

خود بخود مل ہو جائے کہ انسان کی شخصیت کا نشو و نما زندگی کی ایک ایسی حالت پر موقوف ہے جس میں افراد کی حقیقی اور لادبی ضروریات پوری ہوں۔ چونکہ اسلامی قوانین کا مقصد انسان کی تکمیل ذات اور اس کی اجتماعی خودی کا نشو و نما ہے اس لیے وہ مادی زندگی کے مالیاتی شبہ سے قطع نظر نہیں کر سکتا۔ اس کے فرائض میں اہم فرض یہ ہے کہ وہ معاشرے کی مالیاتی، معاشی اور سیاسی تنظیم کرے۔ اسی طرح اسلامی قانون باطنی زندگی اور اس کے مختلف شعبوں کی اصلاح کو کافی نہیں سمجھتا۔ وہ انسان کی حیات خارجی ہر اس کی باطنی زندگی دونوں کی بیک وقت اصلاح چاہتا ہے کیونکہ خارج و باطن دونوں ایک دوسرے سے اثر پذیر ہوتے ہیں اور ان میں سے کسی ایک کی اصلاح بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ دوسرے کی بھی اصلاح کی جائے۔ انسانی زندگی کے کسی شعبہ کو درست نہیں کیا جاسکتا جب تک خود انسان کا نفس مہملاتی کی طرف مائل نہ ہو جائے اور اگر نفس انسانی زندگی کی برخلاف میں خواہشوں کا پرستار ہو کر رہ جائے تو تقدن کی تمام اصلاحی کوششیں، معاشرتی زندگی کو درست کرنے کی ترکیبیں اور سیاسی نظام کا تئیر تبدیل ہو جائے گا۔ جب تک افراد میں مہملاتی کی طرف میلان نہ ہو تقدن کی زندگی امن و مسرت سے نا آشنا ہے گی۔ قرآن نے ہمیں اللہ کھد کا مفعول حذف کیوں کہ اس طرف اشارہ کیا ہے۔ ابھاس نے بالکل درست لکھا ہے کہ وہ تمام احکام اللہ سبحانہ ہمارے لیے بیان کرتا ہے جن کی ہمیں ضرورت ہے اور دوسرے شامین قرآن نے اسی کو احکامہ شراب سے تعبیر کیا ہے یعنی اللہ تمہارے لیے دین کے قوانین و احکام بیان کرتا ہے۔ مسورت کے آغاز سے یہاں تک جو معاشرتی، عائلی، اخلاقی، روحانی، معاشی، قانونی اور سیاسی اور مالیاتی احکام بیان ہوئے ہیں۔ ان سب کی طرف بحیثیت مجموعی اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ معاشرت اخلاق، سیاست اور مالیات کے وہ قانون ہیں جو اللہ تمہاری خاطر بیان کر رہا ہے اور اس لیے بیان کر رہا ہے تاکہ تم زندگی میں کسی مقام پر بے راہ اور گم کردہ راہ نہ ہو جاؤ۔

اور یہاں کم پر زور دے کر اشارہ کیا ہے کہ تم دنیا میں اس لیے روانہ کیے گئے ہو کہ اللہ سبحانہ تمہارے لیے اپنے احکام و ہدایات بیان فرمائے۔ نبوت کے بھائے خود امت کو مخاطب اس لیے کیا گیا ہے کہ آخری نبوت کے ذریعے ایک ایسی امت کو جو دین لانا مقصود ہے جو دنیا میں نبوت کی نیابت کر سکے اور جس دین کی حامل اور تمام انبیاء کی وارث ہو۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اگرچہ اللہ سبحانہ نے تمام عالم کی اصلاح کے لیے مبعوث فرمایا تھا اور اس بنا پر ایسی کامل شریعت عطا کی جو نہ صرف عرب بلکہ تمام عالم کے لیے ابد تک کافی ہے لیکن کوئی شریعت، کوئی قانون، کوئی دستور اس وقت تک مفید اور کارآمد نہیں ہو سکتا جب تک اس کے ساتھ ایسا گروہ نہ ہو جو اس شریعت کی عملی تصویر ہو۔ اس بنا پر

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ایک اہم مقصد ایک خاص قوم کو تربیت دینے کا اصلاحِ عالم کے لیے تیار کرنا تھا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ جو پیغمبر عالمی رحمت کا علمبردار ہو کر آتا ہے وہ علامہ ان اشول کے جو دوسرے انبیاء کے کچھ نئے اشول اختیار کرتا ہے۔ جہز اللہ الباقی میں ہے۔

وہ ایک قوم کو سنتِ راشدہ کی طرف دعوت دیتا ہے ان کو پاک اور درست کرتا ہے۔ پھر ان کو اپنا دست و بازو بناتا ہے اور ان کو دنیا میں پھیلاتا ہے اور ان کو دیرینہ بنا کر رحمت کرتا ہے۔ قرآن کی اس آیت کنتم خیر امتہ میں اسی طرف اشارہ ہے۔

دنیا کی تمام قوموں میں اس پیغمبرِ اکرام کی صلاحیت مفقود ہو چکی تھی صرف عرب کی سرزمین بن بروتی زمین کی طرح نشرو نما کے مائے سے لبریز تھی۔ اللہ سبحانہ نے اسی کا انتخاب فرمایا اور یسین نکتہ تاج ان کے سر پر رکھا اور فلاح و سعادت کی وہ راہ جس پر انبیاء صلیہ علیہم السلام، شہداء اور صالحین چل چکے تھے ان پر کھول دی اور بالآخر ان کی اس دعا کو شرف قبول عطا کیا اھدانا الصراط المستقیم یہاں ان تعضوا میں اسی طرف اشارہ ہے کہ وہ احکام و قوانین اس لیے تمہارے سامنے کھول کر بیان کر رہا ہے کہ صراطِ مستقیم سے نہ بہت جلد۔ ایسا نہ ہو کہ تم یہودیوں کی طرح روحانیت کو جسوڑ کر مادیت کے ہر جادو اور ایسا نہ ہو کہ تم کو نظر انداز کر کے روحانیت کے پیچھے پڑ جاؤ۔

سورۃ نسا کی یہ آخری سطر جس کو اس خطا کار کے قلم سے آج مورخہ ۲۵ ذیقعدہ ۱۳۸۵ھ مطابق ۱۰ نومبر ۱۹۶۶ء بروز دو خنبہ بوقت ۱۱ بجے دن بقام شریعہ المکویت فیکلٹی شریعہ الوطن از جناب الحاج عبدالغنی صاحب حوالہ قرطاس ہوتی ہیں، اللہ سبحانہ لغرضوں کو صاف فرمائے، اور خاص اپنے فضل و کرم سے معالم القرآن کو پوری کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

مرتبنا تقبل منا اللہ انت السميع العليم

سُورۃ کا نام

یہ قرآن کی پانچویں سُورۃ ہے۔ اس میں ۱۱۰ آیتیں ہیں۔ اس کا نام مادہ ہے۔ اس میں مادہ کا واقعہ ہے اور واقعہ اپنے اندر ایک سے زیادہ جملانات رکھتا ہے کیونکہ اس کے جملہ میں ایک سے زیادہ قدرت کی نشانیاں ہونے کے ساتھ اس دور کے اہل ایمان پر عظیم مہربانی اور مشکین کے لیے سنگین دھمکی ہے۔ اس لیے بندہ ہونے کی حقیقت میں یہ واقعہ بندوں کو ان ذمہ داریوں کے اٹھانے کا بہت بڑا محرک ہے جو اللہ کی جانب سے اس پر ڈالی گئی ہیں جس کے ذریعے اللہ اور بندوں کے درمیان رابطہ ایمانی استوار ہوتا ہے اس لیے پوری سُورۃ کو مادہ کے نام سے موسوم کر دیا گیا ہے۔

زمانہ نزول سورۃ مادہ

یہ سُورۃ مدنی اس معنی میں ہے کہ اس کے نزول کا زمانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام مدینہ بلکہ آخر عمر شریف کا زمانہ ہے۔ روز واقعہ اس کے بیشتر حصہ کا نزول مکہ مکرمہ میں حجۃ الوداع ۹ ذی الحجہ ۱۰ شہرہ میں ہوا ہے۔ اور کچھ صلح حدیبیہ سے واپسی کے وقت نازل ہوئی ہے۔ روایات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ صلح حدیبیہ کے بعد ۱۰ شہرہ ہجری کے اواخر یا ۱۱ شہرہ کے اوائل میں نازل ہوئی ہے۔ وہی تعداد ۱۱ شہرہ کا واقعہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم چودہ سو مسلمانوں کے ساتھ عمرہ ادا کرنے کے لیے مکہ تشریف لے گئے مگر کتابہ مکہ نے عداوت کے برعکس میں عرب کی قدیم ترین مذہبی روایات کے خلاف آپ کو عمرہ نہ کرنے دیا، اور بڑی دودکد کے بعد یہ بات قبول کی کہ آئندہ سال آپ زیارت کے لیے آ سکتے ہیں۔ اس کو قصہ پر ضرورت پیش آئی کہ مسلمانوں کو ایک طرف تو زیارت کعبہ کے لیے سفر کے آداب بتانے باقی باک آئندہ سال عمرہ کا سفر پوری اسلامی خانہ کے ساتھ ہو سکے اور دوسری طرف انہیں تاکید کی جائے کہ دشمن کافروں نے ان کو طرے سے روک کر جو زیادتی کی ہے اس کے جواب میں وہ خود کوئی ناروا زیادتی نہ کریں۔ اور کچھ فتح مکہ کے سال ۱۱ شہرہ میں۔

روایتوں میں آیا ہے کہ جس وقت اس سُورۃ کا نزول ہوا ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اونٹنی

پر سوار تھے نزلِ وحی کے ثقل کو ہاؤرنگ نے محسوس کیا اور وہ بیٹھ گئی۔

بیان کے انداز سے گمان بھی ہوتا ہے کہ برپوری شہرت ایک ہی خطبہ پر مشتمل ہے جو ایک وقت نازل ہوا ہو گا۔ ہو سکتا ہے کہ متفرق طور پر اس کی بعض آیتیں بعد میں نازل ہوئی ہوں اور مضمون کی مناسبت سے ان کو اس شہرت میں مختلف مقامات پر جوہرست کر دیا گیا ہو، لیکن سلسلہ بیان میں کہیں کوئی خفیف سا خلا بھی محسوس نہیں ہوتا جس سے یہ قیاس کیا جاسکے کہ یہ سورت دو یا تین خطبوں کا مجموعہ ہے۔

سورہ مائدہ کا موضوع

سورہ نسا کے نزل سے یہ بات مکمل کر سامنے آگئی تھی کہ اسلام صرف ایک عقیدہ و مسلک نہیں ہے جس کی محرکات صرف دلوں اور دھڑوں تک محدود ہو بلکہ وہ روحانی اور اخلاقی نظام کے ساتھ ایک سیاسی نظام بھی ہے جس کی حکمرانی عملیاتی حدود میں پہنچنے والے تمام لوگوں کی زندگی پر محیط ہوتی ہے۔ اب سلمان اس طاقت کے مالک بن چکے تھے کہ جس سیاسی نظام پر وہ ایمان لاتے تھے اس کے مطالبات پر دست بٹا کر زندگی بسر کر سکیں اور اس کے علاوہ کسی دوسرے سیاسی نظام یا قانون کو اپنے دائرہ حیات میں داخل انداز نہ ہارنے دیں۔ اس شہرت میں اللہ تعالیٰ نے اُمتِ مسلمہ سے آخری اُمت کی حیثیت سے اپنی آخری اور کامل شریعت پر پوری پابندی کے ساتھ قائم رہنے اور اس کو پوری دنیا میں قائم کرنے کا عہد و پیمان لیا ہے۔ گویا دوسرے غفلتوں میں شہرت کا موضوع ایسا ہے جس کا حکم الہی کی اطاعت کا جو عہد کر چکے ہو اسے سہمائی کے ساتھ پورا کر دے۔ پورا کرنا یہ ہے کہ جن باتوں کے کوئے کا حکم دیا گیا ہے وہ کر دے اور جس سے روکا گیا ہے ان سے رکھاؤ۔ چنانچہ آغاز ہی میں اذہوا بالعقود کے بعد اہام دلوں کا بیان شروع ہو گیا ہے۔ شہرت کے موضوع کے تقاضے سے اس میں جو مطالب بیان ہوئے ہیں ان میں چند نمایاں باتیں یہ ہیں۔

اولاً یہ کہ اس میں جو احکام و قوانین بیان ہوئے ہیں وہ دعوتِ اسلامی کے اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جب کہ تکمیلِ دین اور اقامتِ نعمت کا مرحلہ سامنے آچکا ہے۔ ظاہر ہے کہ عہد و پیمان لینے کے لیے سب سے زیادہ موزوں احکام بھی ہو سکتے ہیں۔

ثانیاً یہ کہ ان احکام میں امتحان کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ پچھلی اُمتوں کو اس طرح کے جو احکام دیے گئے تھے ان میں امتحان نے محور کر لی کہیں جس کے نتیجے میں وہ مستحب ہوئیں۔ اس اُمت پر اللہ کا خاص یہ فضل ہرگز عہد و پیمان لینے وقت ایسے احکام خاص طور پر دیئے گئے۔ یہ اُمت پاؤں پہننے

کے مقامات سے اچھی طرح واقف ہو جاتے۔

نمائندہ کہ اس سورت میں تفصیل کے ساتھ یہود و نصاریٰ کے نقصان جہد کی تاریخ بھی بیان ہوئی ہے اور اس کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

داعیہ کہ اس سورت میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ان پوشیدہ گوشوں کی خاص طور پر نشاندہی کی گئی ہے جہاں سے کفر اور اس کے ایجنٹوں کو گھس آنے کا موقع ملتا ہے اور پھر وہ نئے سرے سے اٹھتے ہیں جو روکے نہ جائیں تو پورا نظام شریعت درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے۔

خاص یہ کہ اس سورت میں دو اصول و ضوابط خاص طور پر پروری طرح واضح کر دیے گئے ہیں جن کا اہتمام صحابہ علیہ السلام پر قائم و استوار رہنے کے لیے ضروری ہے۔

پانچ باتیں اس وقت کہی گئیں جب کہ اسلامی اصول اور نقطہ نظر کے مطابق مسلمانوں کی اپنی ایک مستقل تہذیب بن چکی تھی جو زندگی کی تمام تفصیلات میں دوسروں سے الگ اپنی ایک امتیازی شہنشاہی رکھتی تھی۔ اخلاق معاشرت تمدن ہر چیز میں اب مسلمان غیر مسلمانوں سے ممتاز ہو چکے تھے۔ تمام اسلامی علاقے میں مساجد اور نماز، جماعت کا نظم قائم ہو گیا تھا۔ ہر بنی اور ہر قبیلے میں امام مقرر تھے۔ اسلامی قوانین سیاسی، فوجداری اور دیوانی بڑی حد تک بن چکے تھے اور ریاست کی تفصیل سیاسی قوانین کی روشنی میں ہو چکی تھی اور عدالتوں کے ذریعے دیوانی اور فوجداری قوانین نافذ کیے جا رہے تھے، لیکن دین خرید و فروخت کے پرانے معاملات بند اور نئے اصلاح شدہ طریقے رائج ہو چکے تھے۔ وراثت کا مستقل ضابطہ بن گیا تھا۔ نکاح طلاق کے قوانین، پردہ شرعی اور استیذان کے احکام اور زنا و قذف کی سزا کی عمارتیں بننے سے مسلمانوں کی معاشرتی زندگی ایک خاص سانچے میں داخل گئی تھی۔ مسلمانوں کی نشست و برخاست بول چال، کمانے پینے، وضع قطع اور رہنے بھنے کے طریقے تک اپنی ایک مستقل شکل اختیار کر چکے تھے اسلامی زندگی کی ایسی مکمل صورت گری ہو جانے کے بعد غیر مسلم دنیا اس طرف سے قطعی یا یوس ہو چکی تھی کہ یہ لوگ جن کا اپنا آباب الگ تمدن بن چکا ہے پھر کبھی ان میں آئیں گے۔

اس لیے اس سورت کو آخری سورت کہا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آخری مراحل میں نازل ہوئی ہے البحر محیط میں ابن حیان اندلس کی یہ بات زیادہ وزنی ہے کہ سورہ مائدہ کے کچھ حصے سفر عبد میں اور کچھ فتح مکہ کے سفر میں اور کچھ حجۃ الوداع کے سفر میں نازل ہوئے ہیں۔ علامہ ابوالوسی نے روح المعانی میں بحوالہ حضرت حمزہ ابن حبیب اور عطیہ ابن قیس یہ ارشاد نبوت نقل کیا ہے کہ سورہ مائدہ نزول کے اعتبار سے قرآن کی آخری سورت ہے۔ اس کے حلال و حلال اور اس کے حرام و حرام سمجھو۔ اسی قسم کی

ایک روایت حافظ ابن کثیر نے بحوالہ جبر بن عبد بنعل کی ہے کہ وہ حج کے بعد حضرت عائشہ صدیقہ کے پاس حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا جبر تم سورہ مائدہ پڑھتے ہو، انہوں نے عرض کیا ہاں پڑھتا ہوں، حضرت عائشہ نے فرمایا کہ یہ قرآن کی آخری سورت ہے جو احکام دیے ہیں وہ مکمل ہیں ان میں نسخ کا احتمال نہیں ہے۔ ان کا خاص اہتمام کرو۔

(۵) سُورَةُ الْمَائِدَةِ مَدَنِيَّةٌ (۱۱۳) (۱۱۴)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ ۚ أُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيمَةُ
الْأَنْعَامِ إِلَّا مَا يُبْتَلَىٰ عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَأَنْتُمْ حُرْمٌ
إِنَّ اللَّهَ يُخَكِّمُ مَا يُرِيدُ ۖ



اے مسلمانو! معاہدے پورے کرو، تمہارے لیے موشی جانور حلال
کر دیے گئے ہیں، ہاں مگر وہ جن کا ذکر آگے کیا جائے گا۔
لیکن جب تم حالت احرام میں ہو تو تمہارے لیے شکار حلال نہیں
ہے۔ بلاشبہ اللہ جیسے چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔

معاشرتی زندگی اور تمدنی زندگی

سورہ نائیں اسلامی معاشرت کو کھول کر بیان کیا تھا۔ اس سورت میں اسلامی تمدن کا ذکر ہر جگہ
ہے۔ دونوں باتوں کی طرف اشارہ کرنے کے لیے سورت کی ابتداء اذھوا بالعقود سے کی ہے چونکہ
اگر ایک طرف تمدن کی بنیاد معاہدات پر ہے تو دوسری طرف شریعت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے
چند عقود ہی کو کہتے ہیں اور عیسائیت نے چونکہ نہ صرف شریعت کا استغناء کر کے اسے بالکل غیر ضروری

قرار دیا حالانکہ اپنی اُسمانی کتاب کا نام نیا عہد نامہ ہی رکھا ہے بلکہ اسے معاہدہ ایک لعنت قرار دیا ہے۔ اسی لیے عیسائیت کے ذکر کی ابتداء اس حکم سے موزوں محسوس ہوئی اور دونوں باتوں کو اکٹھا کر کے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ جب نظام عالم مادی بغیر قوانین و حدود ایک دن بھی قائم نہیں رہ سکتا تو روحانی نظام بدون اتباع قوانین اور بدون ایفائے حدود الہی کیوں قائم رہ سکتا ہے۔ اور اس حکم سے ابتداء کرنے کے بعد کھائے پینے اور نکاح کے کچھ احکام بتائے کہ خواہشات حیوانی کی تعدیل کے لیے یہ احکام نہایت ضروری ہیں۔ اس رکوع میں تکمیل دین کا بھی اعلان ہے یہ گویا اشارہ ہے کہ دین کی تکمیل شریعت کی تکمیل کے بغیر ممکن نہیں ہے دوسرے رکوع میں پھر ضرورت شریعت کو بتاتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق اور صفات ملکوتی کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اول الذکر کے لیے غار کا ذکر کیا اور اس کی ایک چھوٹی سی فرع طہارت نہمانی کی طرف توجہ دلائی ہے اور اگر ایک طرف اللہ تعالیٰ کے سچے تعلق کو بتایا تو دوسری طرف انسانوں کے تعلقات میں اعلیٰ درجہ کے اصول انصاف کی طرف توجہ دلائی ہے یہاں تک کہ نہ صرف غیر قوموں بلکہ دشمنوں کے بھی عدل و انصاف پر قائم رہنے کا حکم دیا۔ تیسرے رکوع میں یہودیوں اور عیسائیوں کی عہد شکنیوں پر توجہ رکوع میں بنی اسرائیل کی نافرمانی کا۔ پانچویں رکوع میں ان اہل کتاب کے جو عہد شکنیوں کی وجہ سے راہ حق سے دور ہو گئے تھے منصفوں کا ذکر ہے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم خلاف وعدہ کرتے تھے اور جان و مال کی حفاظت کو واضح کیا ہے جس کے بغیر تقدیر قائم نہیں رہ سکتا، چھٹے میں بتایا ہے کہ اہل کتاب کے باہمی مقدمات انہی کی شریعت کے مطابق فیصلے کرو، اور ساتویں میں دنیوی جھگڑوں کے فیصلے اور دینی جھگڑوں کے فیصلوں کی طرف متوجہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ دینی اختلافات میں فیصلے قرآنِ حکیم ہی سے کرنا ہے۔ آٹھویں رکوع میں یہود و نصاریٰ سے تعلقات کا اور نویں میں ان کی حالت کا ذکر ہے۔ دسویں میں عیسائیت کے حق میں انحراف اور غلو کو واضح کیا ہے، گیارہویں میں بتایا کہ اس کے باوجود عیسائی مسلمانوں سے زیادہ قریب ہیں اور ان میں حق پذیر ہی کی زیادہ صلاحیت موجود ہے۔ بارہویں رکوع میں عیسائیوں کی غلطی پر مسلمانوں کو متنبہ کیا جنہوں نے ایک طرف تو یہاں تک غلو کیا کہ عبادت کی خاطر اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیزوں کو بھی حرام قرار دیا اور دوسری طرف دنیا میں اس قدر صمیمیت ہوئے کہ حرام چیزوں جیسے خراب کو بھی شیرازہ بنالیا۔ تیرہویں رکوع میں خانہ کعبہ کی حرمت کا ذکر کیا گیا کہ اگر ایک دفعہ پہلے عیسائیوں نے اس گھر کو دھماکے کا ارادہ کیا تھا تو علم الہی میں وہ دوسرا وقت بھی آئے والا تھا جب اس پاک گھر کے بارے میں عیسائی اقوام کے بد ارادے ہوں گے۔ چودہویں میں بتایا کہ شریعت کو موزوں ہے مگر اخراط و تفریط پسند نہیں ہے۔ اسی بنا پر جیسے چھوٹے غیر ضروری سوالات کرنے سے روک دیا۔

پندہوی دکر میں حواریوں کے مانند طلب کرنے کے ذکر میں عیسائیوں کے لذت دہیزی میں، انہماک کی طرف توجہ دلائل اور بتایا کر ان کی توجہ روحانی امور سے ہٹ کر کھانے پینے اور خواہشات نفس کی طرف رہ جانے لگی اور آخری دکر میں بنایا کہ حضرت مسیح کی الوہیت اور تثلیث کا مسئلہ خود حضرت مسیح کی تعلیم پر گزر نہیں ہے۔

۱۰۔ اے مسلمانو! اپنے معاملہ سے روکے کرو۔ ایمان شرعی دو چیزوں کا نام ہے، صحیح معرفت اور تسلیم و انقیاد۔ یعنی خدا اور رسول کے مجملہ ارشادات کو صحیح مان کر تسلیم و قبول کے لیے اخلاص سے گردن جھکا دینا۔ اس تسلیمی جڑ کے لحاظ سے ایمان فی الواقع تمام قوانین و احکام الہیہ کے ماننے اور مجملہ معنوں اور کرنے کا ایک مضبوط عہد و اقرار ہے۔ مگر با حق تعالیٰ کی ربوبیت کا ملکہ کا وہ اقرار جو خداست کے سلسلے میں لیا گیا تھا، جس کا نمایاں اثر انسان کی فطرت اور مرثیت میں آج تک موجود ہے۔ اسی کی تجدید و تشریح ایمان شرعی سے ہوتی ہے۔ پھر ایمان شرعی میں جو کچھ اجمال و حمد و بیان تھا اسی کی تفصیل پر اے قرآن و سنت میں دکھلائی گئی ہے۔ اس صورت میں دعویٰ ایمان کا مطلب یہ ہوا کہ بندہ تمام احکام الہیہ میں غواہان کا تعلق براہِ راست خدا سے ہو یا بندہ دل کی جسمانی تربیت سے یا روحانی اصلاح سے دہری مفاد سے بر یا خودی فلاح سے، شخصی زندگی سے ہر ایسا بات اجتماعی سے صلح سے ہو یا جنگ سے، اس کا عہد کرے کہ ہر پہلو سے اپنے مالک کا وفادار بن کر رہے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو حمد و پیمان اسلام، جہاد، سمیع و طاعت یا دوسرے حمد و تعالیٰ اور امور غیر کے متعلق صحابہ کرام سے بشکل بیعت لیتے تھے وہ اسی عہد ایمانی کی ایک عموماً صورت تھی، اور چونکہ ایمان کے ضمن میں بندے کو حق تعالیٰ کے جلال و جبروت کی صحیح معرفت اور اس کی شان انصاف و انتقام اور دعوں کی سچائی کا پورا یقین ہوتا ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ بدعہدی اور غدار کی کھلم کھلا عواقب سے ڈر کر اپنے تمام عہدوں کو جو خدا سے یا بندہ دل سے یا خود اپنے نفس سے کیے ہوں۔ اس طرح پرہیز کرے کہ مالک حقیقی کی وفاداری میں فرق نہ آنے پائے۔ اس تقریر کے موافق معنوی کی تفسیر میں جو مختلف تشریحات سلف سے منقول ہیں ان سب میں تطبیق ہو جاتی ہے اور آیت میں ایمان والو کے لفظ سے خطاب فرماتے کا مزید تعلق حاصل ہوتا ہے۔

اہل ایمان کو اپنے عہد پر ادا کرنے کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ ایمان وراصل ایک معاہدہ التزام ہے کہ میں دل و جان سے ان احکام کی تعمیل کروں گا۔ یہ عہد التزام اسی ایمان کی حقیقت ہے جس میں تمام احکام داخل ہیں اس طرح گویا ایمان تمام حقوق کی بھانڈی کا عہد و قرار ہے اس لیے حکم ہوا ہے کہ اے ایمان والو تم نے ایمان لاکر التزام احکام کا اجمالی طور پر جو عہد و پیمان کیا ہے اس کو پورا کرو، لہذا ایمان و تہمت التزام طاعت کا ایک اجمالی معاہدہ ہے۔ جسے کج زبان میں حلف و وفاداری کہتے ہیں۔ یہ اجمالی معاہدہ ایک امر بسیط ہے اور تمام احکام شرعیہ اس معاہدے کی دفعات ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایمان وراصل التزام طاعت خداوندی کے معاہدہ کا نام ہے اور یہ ایک امر بسیط ہے۔ اس میں فی صدارت تجرزی اور بعض نہیں جیسے عقد نکاح کہ حقوق و رویت کے التزام کا ایک اجمالی معاہدہ ہے اور ایک امر بسیط ہے جس میں کئی چیزیں نہیں ہو سکتی صرف ایجاب و قبول سے پورا ہو جاتا ہے، لیکن ثمان و نفعہ اور بعض و غیرہ پر تمام امور عقد نکاح کے اجزاء ترکیبی نہیں بلکہ اس کے لازم ہیں۔ اسی طرح اعمال صالحو عقد ایمان کے لازم ہیں جن کی بھانڈی لازم ہے۔ حضرت شام صاحب فرماتے ہیں کہ :

جب آدمی مسلمان ہوا تو سب حکم اللہ کے قبول کرنے ٹھہر چکا، اب فرماتے ہیں کہ ان کو قبول کرو۔

مطلب یہ ہے حسب عہد ان احکام کی بھانڈی کرو جن کے التزام کا تم نے عہد کیا ہے ، خلاف عہد کوئی کام نہ کرو بے دفائی بہت بُری چیز ہے ۔

عقد و کا مغہرہ عمومی عموم

عقد کا لفظ عہد و میثاق کے مقابل میں عام ہے۔ اس میں قول و قرار اور کسی معاملے میں گواہی کی ذمہ داری سے لے کر اس عہد و میثاق تک جو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان ہوا ہے۔ یعنی ہر عہد شرعی کو شامل خواہ اس کا تعلق خالق سے بنوخواہ مخلوق سے جبکہ حضرت عبداللہ ابن عباس کی بات ہے۔ اور ایمان و اندلسی نے بھی عام عقد مراد لیے ہیں۔ امام حسن فرماتے ہیں کہ ہر قسم کا عہد عقد میں مراد ہے خواہ کاروباری، لین دین، کرایہ نکاح طلاق، مزارعت، مصالحت، تملیک، تنجز و عتق وغیرہ۔ مطلب یہ ہے کہ عبادات کے علاوہ بھی جتنے عہد سیاسیات، تجارت، مصافرت وغیرہ معاملات و اخلاقیات سے متعلق ہر شے میں سب اس میں آگتے۔ ابوبکر الجصاص فرماتے

ہیں کہ عقد کیا جاتے یا عہد اس کا اطلاق ایسے معاملہ پر ہوتا ہے جس میں دو فریق نے اُمد و زمانے میں کوئی کام کرنے یا چھوڑنے کی پابندی ایک دوسرے پر ڈالی ہو اور دونوں متفق ہو کر اس کے پابند ہو گئے ہوں۔ امام راجع الصفا نے یہ بات بڑی لطیف لکھی ہے کہ معاملات کی قسمیں قسمیں ہیں سب اس کے حکم میں داخل ہیں اور پھر لکھا ہے کہ عقد کی ابتدائی تین قسمیں ہیں۔ ایک معاہدہ وہ ہے جو انسانوں کے اپنے۔ بے ہے مثلاً ایمان، طاعت کا عہد یا حلال و حرام کی پابندی کا عہد، دوسرے وہ معاہدہ جو ایک کا خود اپنے نفس کے ساتھ ہے جیسے کسی چیز کا نذر یا علف۔ تیسرے وہ جو ایک انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ۔ اس میں وہ تمام معاملات داخل ہیں جو وہ شخصوں یا دو جماعتوں یا دو حکومتوں کے درمیان ہوتے ہیں۔ حکومتوں کے باہمی معاملات یا بین الاقوامی معاملات، جماعتوں کے عہد و میثاق اور دو انسانوں کے درمیان ہر طرح کے معاملات اس میں داخل ہیں اور اس آیت کی روش سے ان کا ایسا واجب ہے چنانچہ اس سورت میں میثاق شریعت کی پوری تاریخ بھی اس کے تمام نتائج و عواقب کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ قسم اور شہادت کی ذمہ داریاں بھی واضح کی گئی ہیں۔

چار پالیوں کی مصلحت

۲۔ تمہارے لیے موشی جانور حلال کر دیے گئے ہیں۔ سورۃ نسا۔ میں گزر چکا ہے کہ یہود کو ظلم و بد عہدی کی پاداش حلال و طیب چیزوں سے محروم کر دیا گیا۔ فَيُظْلَمُونَ مِنْهُنَّ أَمْوَالُهُمْ حَرَمًا عَلَيْهِمْ طَبِئَاتٍ (نسا۔ رکوع ۲۲) جن کی تفصیل سورۃ انعام میں ہے۔ اس آیت سے مرعوم کر ایسا عہد کی ہدایت کے ساتھ ان چیزوں سے بھی منتفع ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ یعنی اونٹ، گائے، ہمیشہ بکری اور اسی جنس کے تمام اہل اور وحشی (پالتر اور جنگلی) پرہیز گارے مثلاً ہرن، نیل گائے وغیرہ تمہارے لیے ہر حال میں حلال کیے گئے۔ بجز ان حیوانات یا حالات کے جن کے متعلق حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی تمہارے صحابی یا روحانی یا اخلاقی مصلحت کے لیے ممانعت فرمادی ہے بلکہ اصل ارشاد میں ہیسمۃ الانعام ہے۔ اس میں انصاف و طہیر کے لیے ہے یعنی موشیوں

سے ملتے جلتے ہوتے چرہ پاتے جو زردندے ہوں نہ شکاری مراد ہیں۔ ہرن، نیل گائے وغیرہ ایسے چرہ پاتے جو شکاری اور زردندے نہ ہوں۔ میں موشیوں سے مشابہ ہوں۔ اضافت سے یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ اونٹ، گائے، بکری اور اس قبیل کے جانور ہی چرہ پاتے خواہ گریلو ہوں یا وحشی تمام ایسے جانور طہرائے گئے۔ احلت مکمل حلال کر دیے گئے سے مراد یہ ہے کہ جو پانہندیاں تم نے اپنے اولاد سے عائد کی ہیں وہ بھی ختم اور جو پچھلے صحیفوں کی روایات کی بنا پر تمہیں وہ بھی کالعدم۔ دراصل انعام امرئش، کانفظ علی زمان میں اونٹ، گائے، بھیڑ، بکری پر بولا جاتا ہے اور بہرہ کا اطلاق ہر چرہ پاتے پر ہوتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہوتا کہ انعام تمہارے لیے حلال کیے گئے تو اس سے صرف وہی جانور حلال ہوتے جنہیں عربی میں انعام کہتے ہیں لیکن حکم ان الفاظ میں دیا گیا ہے کہ موشی کی قسم کے چرند سب چرہ پاتے تم پر حلال کیے گئے۔ اس سے حکم وسیع ہو جاتا ہے اور وہ سب چرندے جانور اس دائرے میں آجالتے ہیں جو موشی کی نوعیت کے ہوں یعنی جو کھانا کھاتے ہوں۔ حیوانی غذا کے سبھتے نہاتی غذا کھاتے ہوں، اور دوسری حیوانی خصوصیات میں انعام عرب سے مماثلت رکھتے ہوں۔ نیز اس سے اشارہ یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ وہ چرہ پاتے جو موشیوں کے برعکس کھانا کھاتے ہوں اور دوسرے جانوروں کو مار کر کھاتے ہوں، حلال نہیں ہیں۔ اسی اشارے کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح کر کے حدیث میں صاف حکم دے دیا کہ زردندے حرام ہیں۔ اسی طرح حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر نذول کو بھی حرام قرار دیا جن سب بچے ہوتے ہیں جو دوسرے جانوروں کو شکار کر کے کھاتے ہیں یا مردار خواہ ہوتے ہیں۔ ابن عباس کی روایت ہے کہ

نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من کل ذی فہلبہ من الطیر۔

حضور نے پھول ملے پرندوں سے منع فرمایا ہے۔

دوسرے متعدد صحابہ سے بھی اس کی تائید میں روایات منقول ہیں۔ لے

تخیل سے ایک استثناء

۳۔ ہاں مگر وہ سن کا ذکر آگے کیا جائے گا۔ غالباً اس سے مراد وہ چیزیں ہیں جو اسی رکوع کی تیسری آیت میں بیان کی گئی ہیں یعنی حرمت علیکم المیتہ سے ذاکم فس تک

مطلب یہ ہے کہ بہزان جانور دل کے جن کی حرمت قرآن میں آگے بیان ہو رہی ہے۔ اصل یہ ہے کہ اشیاء میں عام قانون تمثیل ہے جیسا کہ پڑھ چکے ہو وہو الذی خلقکم ما فی الاصل فی میں قرآن نے اشیاء کی حلت کا اعلان کیا ہے حرام صرف وہ چیزیں ہیں جن کی حرمت کا قرآن و سنت میں ذکر ہے۔ یہاں صرف اشارہ کیا ہے۔ تفصیل آگے آرہی ہے۔ تفصیل کے موقع پر قرآن نے گیارہ چیزوں کا ذکر کیا ہے اول مردار جانور، دوسرے خون، تیسرے سور کا گوشت، چوتھے وہ جانور جو بقصد تقرب طیرانہ کے لیے امزد کر دیا گیا ہو، پانچویں وہ جانور جو گلا گھٹ کر مر جائے، چھٹے وہ جانور جو چوٹ کھا کر مر جائے، ساتویں وہ جو اوپر سے نیچے گر کر مر جائے، آٹھویں وہ جانور جو دوسرے جانور کے سیلنگ مانے سے مر جائے۔ نویں وہ جانور جس کو دوسرے نے چاڑ کھا یا، دسویں وہ جانور جو کسی ستھان پر بڑبڑ کیا جائے۔ اس آیت میں لطیف، بیضا، نکتہ یہ ہے کہ ایفا رحمہ کے حکم کے بعد تمثیل عام بیان کی اور پھر تمثیل عام کے بعد استثنا کر کے لیے علم و قدرت اور منہ مصلحت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

حالت احرام میں شکار حرام ہے

۴۔ لیکن جب تم حالت احرام میں ہو تو تم اسے لیے شکار حلال نہیں ہے۔ جمع کو صرف خشکی کے جانور کا شکار جائز نہیں دریا، قناری، شکار کی اجازت ہے۔ اور جب حالت احرام کی رعایت اس قدر ہے کہ اس میں شکار کرنا ممنوع ہے تو خود حرم شریف کی حرمت کا لحاظ اس سے کہیں زیادہ ہونا چاہیے یعنی حرم کے جانور کا شکار محرم یا غیر محرم سب کے لیے حرام ہو گا جیسا کہ صحتوا مشاعر اللہ کے محرم سے مترشح ہوتا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ حالت احرام میں حلال جانوروں کا شکار بھی ناجائز ہے۔ شکار سے یہاں صرف ان جانوروں کا شکار مراد ہے جن کا کانا جائز ہے جیسا کہ امام راجب نے تصریح کی ہے۔ باقی ساپ، بھو وغیرہ مروی جانوروں کا اس صاف سے کوئی تعلق نہیں ہے اور زمان کے ماننے پر شکار کا اطلاق ہوتا ہے۔ لفظ صید سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ان جانوروں کا شکار مراد ہے جو وحشی ہوتے ہیں اور جن کے پکڑنے میں کسی تدبیر و حیل کی ضرورت پڑتی ہے۔ عام گھریلو جانور جیسٹریجی گائے اونٹ وغیرہ جو عادتاً شکار کر کے نہیں لائے جاتے اور روزانہ محض ذبح کر کے کھاتے جاتے ہیں ان کو ذبح کرنے

کی کوئی ممانعت نہیں۔ وافر تعداد میں سے صرف حالت احرام ہی میں شکار کی حرمت ثابت نہیں ہوتی بلکہ یہ بھی معلوم ہوا کہ حرم کے علاقہ میں بھی شکار حرام ہے خواہ شکار کرنے والا احرام میں دہر برکت کا اصل مدار شکار کا حدود حرم میں ہوتا ہے۔

یہ گویا ان حرمتوں میں سب سے پہلی حرمت کا ذکر ہے۔ یعنی تمنا کے لیے انعام کے قسم کے تمام چہرے خواہ پالتو ہوں یا وحشی جانور ہیں یا بے پابندی کی حالت احرام میں شکار کو جائز کرنے والے ذہن جاننا۔ اس کے سب سے پہلے ذکر کرنے سے اس کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔

یہاں یہ بات ضرور سمجھ لینی چاہیے کہ احرام اس فقیر از لباس کو کہتے ہیں جو زیارت کعبہ کے لیے پہنا جاتا ہے۔ کعبہ کے گرد دیکھ کر کسی منزل کے فاصلے پر ایک حد مقرر کر دی گئی ہے جس سے آگے بڑھنے کی کسی نافر کو اجازت نہیں جب تک وہ اپنا معمولی لباس اتار کر احرام کا لباس نہ پہن لے۔ اس لباس میں صرف ایک قمیض اور ایک چادر ہوتی ہے جو اوپر سے اوٹھی جاتی ہے اسے احرام اس لیے کہتے ہیں کہ اسے پہن لینے کے بعد آدمی پر بہت سی وہ چیزیں حرام ہو جاتی ہیں جو عام حالات میں جائز ہیں مثلاً کھانا، خوشبو کا استعمال۔ ہر قسم کی زینت و آرائش اور قضا شہوت وغیرہ ان ہی پابندیوں میں سے ایک یہ بھی کہ کسی جاندار کو ہلاک نہ کیا جائے نہ شکار کیا جائے اور نہ کسی کو شکار کا پتہ بتایا جائے۔

در اصل اس سورت میں جو احکام بیان ہوئے وہ تکمیلی اور اتماہی نوعیت کے ہیں۔ اپنے اسی پہلو کے پیش نظر وہ اس سورت میں بیان ہوئے ہیں۔ الیٰ پر عمل لینے کے معنی یہ ہیں کہ پوری شریعت کی پابندی اور اس سے وفاداری کا عمل لیا گیا۔ کھانے پینے کے باب میں یہاں جو سورتیں اور حدیثیں بیان ہوئی ہیں وہ بالکل آخری نوعیت کی ہیں۔ اس سے پہلے اس موضوع کے بہت سے احکام سورہ بقرہ میں گزر چکے ہیں اور بقرہ سے زیادہ تفصیل کے ساتھ سورہ انعام میں بیان ہوئے ہیں جو ایک ہی سورت ہے صرف کچھ جزئیات باقی رہ گئی تھیں جو یہاں بیان کی گئی ہیں اور ان کے بعد یہ بیان بالکل مکمل ہو گیا۔

اللہ حاکم مطلق ہے

۵۔ بلاشبہ اللہ جیسے چاہتا ہے حکم دیتا ہے جس خدا نے تمام مخلوقات کو پیدا کیا پھر

لے تفہیم القرآن۔

کمال حکمت سے ان میں باہم فرق برآب رکھا۔ ہر لوح میں اس کی استعداد کے موافق جہاں ضرورت ہو وہی قوی و دبیعت کئے زندگی اور موت کی مختلف صورتیں تجویز کریں۔ بلاشبہ اسی خدا کو اپنی مخلوقات میں یہ حق حاصل ہے کہ اپنے اختیار کا الیٰ علم محیط اور حکمتِ الہیہ کے اقتضا سے جس چیز کو جس کسی کے لیے جن حالات میں حلال یا حرام کرے لایسے عیاض و مصالح و مصلحتوں سے یعنی ارادہ الہی سے بالاتر کر لے گا۔ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔ کسی کو حق نہیں۔ اس کے ماننے میں چون و چرا کرنے کا کوئی حق نہیں ہے اگرچہ اس کے تمام احکام حکمت و مصلحت پر مبنی ہیں لیکن بندہ مسلم اس کے حکم کی اطاعت اس حیثیت سے نہیں کرنا کہ وہ اسے مناسب پاتا ہے یا مبنی بر مصلحت سمجھتا ہے بلکہ صرف اس بنا پر کرتا ہے کہ یہ مالک کا حکم ہے۔ جو چیز اس نے حرام کر دی وہ صرف اس لیے حرام ہے کہ اس نے حرام کی ہے اور اسی طرح جو اس نے حلال کر دی ہے وہ بھی کسی دوسری بنیاد پر نہیں بلکہ صرف اس بنیاد پر حلال ہے کہ جو خدا ان ساری چیزوں کا مالک ہے وہ اپنے غلاموں کو اس چیز کے استعمال کی اجازت دیتا ہے۔ لہذا قرآن پورے زور کے ساتھ یہ اصول قائم کرتا ہے کہ ارشاد کیا۔ صحت و حرمت کے لیے مالک کی اجازت و عدم اجازت کے سوا کسی اور بنیاد کی ضرورت نہیں اور اسی طرح بندے کے لیے کسی کام کے جائز ہونے یا نہ ہونے کا مدار بھی اس کے سوا کچھ نہیں کہ خدا جس چیز کو جائز رکھے وہ جائز ہے اور ناجائز قرار دے وہ ناجائز ہے۔

اس میں شاید اس حکمت کی طرف اشارہ بھی ہے کہ انسان کے لیے بعض ماحولوں کو کھانے کی اجازت دینا کوئی علم نہیں۔ جس مالک نے سب جانیں بنائی ہیں اسی نے پوری بصیرت و حکمت کے ساتھ یہ قانون بھی بنایا ہے کہ ادنیٰ کو اعلیٰ کے لیے غذا بنایا ہے زمین کی مٹی درختوں کی غذا ہے اور درخت ماحولوں کی غذا اور جانور انسانوں کی غذا۔ انسان سے اعلیٰ کوئی مخلوق نہیں ہے اس لیے انسان کسی کی غذا نہیں بن سکتا۔ آجے اس فقرے پر اہتمام۔ امتحان کے زاویہ سے نگاہ ڈالیے تو آپ محسوس کریں گے حالتِ احرام میں شکل کی ممانعت کا معاملہ بالکل اس حکم سے مشابہ ہے جیسا کہ کربست کے دن سے متعلق دیا گیا تھا۔ ان کربست کے دن شکاک کی ممانعت تھی لیکن وہ اس جہد کو نباہ نہ سکے۔ مطلب یہ ہے کہ ان اللہ بھکسہ مایرید کا انصاف فرما کر اس حکم کے امتحانی پہلو کی طرف اشارہ کر دیا کہ یہ حکم تمہاری وفاداری کی جانچ کے لیے ہے۔ اس میں چون و چرا نہ کرنا اور

اس سے گریز کی راہیں نہ تلاش کرنا، خدا جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے اور اس کے احکام کی بے چارہ چڑا اطاعت ہی میں بندوں کے لیے نیر درکت ہے۔

یہ بات پیش نظر ہے کہ جو احکام محض تنبیہی ہوتے ہیں ان میں بندوں کی مصلحت کا پہلو مخفی ہوتا ہے اس لیے جب تک یہ عقیدہ دل میں مضبوط نہ ہو کہ خدا کو حکم دینے کا اختیار مطلق حاصل ہے اور اس کا ہر حکم بندوں ہی کی مصلحت کے لیے ہوتا ہے اس وقت تک بھی وفاداری کے ساتھ ان کی تعمیل نہیں ہو سکتی۔

حضرت مولانا اشرف علی خان صاحب نے یہاں یہ نکتہ آفرینی خوب فرمائی ہے کہ آیت میں امر اور احکام کی تفسیر کی ممانعت کی طرف اشارہ ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَحِلُّوا شَعَائِرَ اللَّهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ
وَلَا الْهُدَىٰ وَلَا الْقَلَائِدَ وَلَا أُمِينَ الْبَيْتِ الْحَرَامِ
يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّن رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا وَإِذَا حَلَلْتُمْ
فَأُصْطَادُوا وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ أَن صَدُّوكُمْ عَنِ
الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ أَن تَعْتَدُوا وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ
وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِلْثَامِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللَّهَ

إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ

اے اہل ایمان اللہ کی نشانیوں کی بے حرمتی نہ کرو، اور نہ
ان مہینوں کی بے حرمتی کرو جو حرمت کے مہینے ہیں۔ نہ
قربانی کے جانوروں پر دست درازی کرو اور نہ ان جانوروں
پر ہاتھ ڈالو جن کی گردن میں نذر خدا کی علامت کے طور پر پٹے
پڑے ہوئے ہیں۔ اور نہ ان لوگوں کو چھیڑو جو اپنے رب کے

فضل اور اس کی خوشنودی کی تلاش میں مکانِ محترم کی طرف
جائے ہوں۔ ہاں جب احرام کی حالت ختم ہو جائے تو تم
کو شکار کی اجازت ہے۔ اور یاد رکھو ایسا نہ ہو کہ اس گروہ کی
دشمنی جس نے تمہارے لیے مسجدِ حرام کا راستہ روکا تھا اس بات
پر نہ اجماع ہے کہ تم ان پر زیادتی کرنے لگو۔ تمہارا دستور یہ ہونا
ہونا چاہیے کہ نیکی اور پرہیزگاری کی ہر بات میں ایک دوسرے
کی مدد کرو، گناہ اور ظلم کی بات میں کسی سے تعاون نہ کرو۔
اللہ سے ڈرو، اللہ سنگین سزا دینے والا ہے۔^{۱۳}

اسلامی شاعر

جیسے شاعر ان اکاذم کو کہا جاتا ہے جہاں ان کو یاد کیا جاتا ہے، حج کے مشاعر اپنے گواہوں، ثمرات
کی بنا پر دوسرے فوائد و برکات کے علاوہ صدقِ قرآن اور ذکرِ الہی کی توفیق کے لیے بہتر سے بہتر
موقع پیدا کرتے ہیں۔ مشاعر کا جو تقدس اور عظمت ایک مسلمان کے قلب میں ہے، اس کا انبیائی
آخر بہت گہرا ہوتا ہے وہ مقامات جہاں انبیاء علیہ السلام پر برکتوں اور رحمتوں کا نزول اور انوارِ الہی
کی بارش ہوتی وہ ماحول اور فضا قدم قدم پر نبوی مناظر اور ربانی مشاہد جہاں حضرت درایم کو شہد
حج کی معرفت حاصل ہوتی مشاعر کہلاتے ہیں، ایسے ہی شاعر شیعہ کی جمع ہے، اس سے دین کی

تمام نشانیاں مراد ہیں۔ شاربین قرآن لے اس سے مراد وہ تمام امور لیے ہیں جو حدود و فرائض اور امر اور نہی کی صورت میں اللہ کی جانب سے ہیں۔ اسی لیے امام کا کہنا ہے کہ شارب اللہ سے مراد اللہ کا دین ہے مطلب یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو کسی مسک یا عقیدے یا طرز فکر و عمل یا کسی نظام کی ناسازگی کرتی ہو وہ اس کا خیرہ اور شارب کہلاتے گی کیونکہ وہ اس کے لیے عداوت اور نشانی کا کام دیتی ہے۔ سرکاری جھنڈے فرج اور پولیس وغیرہ کی یونیفارم، سکے نوٹ اور شامپ عکسوں کے شارب ہیں اور وہ اپنے عکسوں سے بدعین جن پر ان کا زور چلے سب ان کے احترام کا مطالبہ کرتی ہیں۔ اگر عداوت و قربان نگاہ اور صلیب مسیحیت کے شارب ہیں۔ چوٹی، زار اور مندر برہنیت کے شارب ہیں، کیس، بکڑ، کرپان وغیرہ سکھ مذہب کے شارب ہیں۔ ہتھوڑا اور درانتی اشتراکیت کا شارب ہے۔ ہر سب مسک اپنے اپنے پیروں سے اپنے ان شارب کے احترام کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی نظام کے شارب میں سے کسی شارب کی توہین کرتا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ اس نظام کے خلاف دشمنی رکھتا ہے اور اگر وہ توہین کرنے والا خود اس نظام سے تعلق رکھتا ہو تو اس کا یہ فعل اپنے نظام سے بغاوت کا ہم معنی ہے۔

۶۔ لے اہل ایمان اللہ کی نشانیوں کی بے حرمتی نہ کرو۔ یعنی جو چیزیں حق تعالیٰ کی خلعت و معبودیت کے لیے علامات و نشانات خاص قرار دی گئی ہیں ان کی بے حرمتی نہ کرو۔ ان میں حرم محرم، بیت اللہ شریف، جہازات صناد مروہ، ہبی احرام، مساجد، کتب، سداویہ وغیرہ تمام حدود و فرائض اور احکام و نذیر شامل ہیں آگے ان شارب میں سے بعض مخصوص چیزوں کا جو مناسک سے متعلق ہیں ذکر فرماتے ہیں جیسا کہ اس سے پہلے آیت میں بھی حرم کے بعض احکام ذکر کیے گئے تھے یہ اصل ارشاد میں شعائر اللہ آیا ہے اللہ کی نشانیاں یعنی وہ چیزیں جن کو اللہ تعالیٰ نے بندوں کے لیے نشان بندگی قرار دیا ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں۔ شارب شعیرہ کی جمع ہے اور ابن فارس نے اس کا واحد شارب بتایا ہے۔ ہر وہ شے جو کسی کے لیے نشان مقرر ہو یا جو کسی علامت کو بتاتے ہو شعیرہ کہتے ہیں اور امام ابو بکر الجصاص رقمطراز ہیں کہ اہل لغت کا بیان ہے کہ شارب شعیرہ کی جمع ہے۔ شعیرہ نشانی ہے جو اس چیز کو بتاتی ہے جس کے لیے وہ مقرر کی گئی ہے اشعار بدن کے معنی یہ ہیں کہ جانور پر ایسی نشانی لگا دی جائے جس سے معلوم ہو جائے کہ یہ قرانی کا جانور ہے

یہاں شہزاد سے اللہ کے دین کے تمام نشانات مراد ہیں یعنی دین کے وہ فرائض جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتایا ہے کہ ان کے حدود سے سہا و ذکر کریں اور ان کے حقوق میں کوتاہی نہ کریں اور ان کو ضائع نہ کرنے دیں۔ یہ معنی ان تمام معالیٰ کو جامع ہیں جو سلف سے اس کی تشریح میں منقول ہیں۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے حجتہ اللہ البالغہ میں تعظیم شہزاد ایک مستقل عنوان قائم کر کے شہزاد اللہ کی تشریح کی ہے فرماتے ہیں کہ شہزاد اللہ وہ محسوس اور مرئی امور ہیں جن کے ذریعہ اللہ کی عبادت کی جاتی ہے اور اللہ کے ساتھ مخصوص ہیں ان کی تعظیم اللہ کی تعظیم ہے۔ اور ان کی بے حرمتی و بے ادبی جناب الہی میں بے ادبی ہے۔ اسلام میں بزرگتر شہزاد چار ہیں قرآن، خاند کعبہ، ذات پیغمبر اور نماز اس کے بعد ہر ایک کے بارے میں ضعیف ہونے کی حیثیت بتائی ہے۔ شاہ عبدالعزیز نے شہزاد کے معنی میں ذرا وسعت کر دی ہے۔ فرماتے ہیں کہ دین کے عرف میں شہزاد، مکانات، اوقات اور علامات عبادت کو کہتے ہیں۔ کعبہ، عرفات، مزدلفہ، رمی جمار، ہضفا، مردہ، منیٰ اور مساجد، رمضان، حرمت کے پھیلے، حیدر العطر، حیدر الاضغی، جمعہ، ایام تشریق، اذان، جبکیر، ختمہ، نماز باجماعت، نماز جمعہ و عیدین سب اللہ کے شہزاد ہیں۔

بعض بزرگوں نے یہاں یہ نکتہ آفرینی کیا ہے کہ احکام شرعی کی دو قسمیں ہیں۔ کچھ احکام وہ ہیں جو امت کے لیے بطور تعبد مقرر کیے گئے ہیں مثلاً نماز بطریق مخصوص، اور نماز میں خاند کعبہ کی طرف رُخ کرنا، مناسک حج وغیرہ، یہ ایسے احکام ہیں جن کی شریعت کی مصلحت ہمارے اور اک سے بالا ہے۔ ان میں کمی بیشی کے ہم کماز نہیں ہیں۔ ان میں کسی کی رائے حجت نہیں ہے ان میں کمی بیشی کے ذریعے دین میں بدعت کو گھس آنے کا موقع ملتا ہے۔ ان کو شہزاد کہتے ہیں۔ یہ گویا ایک مسلمان کی اسلامی زندگی کی محسوس نشانیاں ہیں۔

کچھ احکام وہ ہیں جن کی شریعت انسانی مصالح کی خاطر ہوتی ہے ان کے اسباب و علل تک پہنچی رسائی ممکن ہے مثلاً احکام معاملات، سیاست، معاشرت، عدالت ان کو شہزاد نہیں کہتے، ان ددول قسم کے مجبور احکام کا نام اسلام ہے۔

در اصل شہزاد انسان کے اندر بندگی کا احساس و محاسن اجماعی اور اسے مکمل کرنے میں بڑا حصہ لیتا ہے اور یہ مومن کو ایک ذہنی عطا کرتے ہیں جو اسلام کے بارے میں پوری طرح مطمئن ہوتا ہے، ایک ایسا دل عطا کرتے ہیں جو دین کے حکموں پر برابر کان نگاہ رکھتا ہے۔ ایک ایسی روح عطا کرتے ہیں جو رضائے الہی کی طلب سے سرشار ہوتی ہے اور اس طرح وہ اللہ کی

عادت گزاری کے لیے ایسا مستعد ہو جاتا ہے کہ اس کی جناب سے جو حکم بھی ملے اس کی تعمیل کے لیے دوڑ پڑے۔ اس کے دل کی زمین جت کر اور کھا دپانی پا کر اس طرح شہادے کے ذریعے تیار ہو جاتی ہے کہ دینی ہدایات کا جو ختم بھی اس میں ڈلا جائے اُسے فوراً قبول کر لے۔ اور شہادہ دینے کے لیے اپنا عمل شریعت کے لیے بھی وجہ ہے کہ ان کو شہادہ کیا گیا ہے یعنی دین کے باقی اجزاء کے لیے نشان راہ قرار دیا گیا ہے۔ یقیناً یہ ایک بہترین تعبیر تھی جو قرآن نے اختیار کی ہے۔

حرمت والے مہینوں کی بے حرمتی

۴۔ اور زمان مہینوں کی بے حرمتی کرو جو حرمت کے مہینے ہیں۔ اور ہلے ہیسے چاہیں
 منما اب بعت حرم سورہ توبہ رکوع پنجم ذوالعقدہ، ذوالحجہ، محرم، رجب، ان کی تعظیم اور احترام
 یہ ہے کہ دوسرے مہینوں سے بڑھ کر ان میں ہیکل و نقویٰ کو اختیار کرو اور شہادہ سے پہلے کا اہتمام
 کرو بالخصوص حجاج کو ستارہ اور دق کر کے حج بیت اللہ سے زود کا جائے۔ اگرچہ یہ تمام سال کے
 بارہ مہینوں میں واجب العمل ہیں۔ لیکن ان محرم مہینوں میں بالخصوص بہت زیادہ موکد قرار دیا
 گئے باقی دشمنان دین کے مقابلہ میں مجموعی پیش قدمی تو جہور کا مذہب یہ ہی ہے بلکہ ابن جریر نے
 اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ اس کی ان مہینوں میں ممانعت نہیں ہے اس کا بیان انشاء اللہ سورۃ
 توبہ میں آیت کا مابعد عام شارحین قرآن کہتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ ہے کیونکہ اس میں مشرکین
 سے حرمت والے مہینوں میں جنگ کی ممانعت ہے اور البقرہ کی آیت فاقتلوا المشرکین
 حیث وجدتموہم کو نسخ جاتے ہیں مگر محققین کہتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے
 کیونکہ اول آیت میں مشرکین کی بات کوئی حکم نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کو بدی اور ان کے مآرم
 حج میں خلل اندازی سے ممانعت ہے۔ وہ بدستور اب بھی باقی ہے لیکر یہ سوچ درست نہیں
 ہے کیونکہ آیت میں یہ فقرہ ولا یجہ منکمہ شنان قسم اس توبہ کا ساتھ نہیں دیتا ہے بل
 بات یہ ہے کہ شہادہ اللہ کے عام احترام کا حکم لینے کے بعد اب یہاں چند خاص شہادہ کا نام لے
 کر ان کے احترام کا خاص طور پر حکم دیا گیا ہے کیونکہ اس وقت جنگی حالات کی وجہ سے یہ
 اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ جنگ کے جوش میں کہیں مسلمانوں کے ہاتھوں ان کی توبہ نہ ہو جاتے۔

ان چند شعائر کو نام نہاد بیان کرنے سے یہ مقصود نہیں ہے کہ صرف یہی احترام کے مستحق ہیں۔ اور پھر ان کے احترام کا یہ حکم اس زمانے میں دیا گیا تھا جب کہ مسلمانوں اور مشرکین عرب کے درمیان جنگ برپا تھی۔ مگر پر مشرکین تابعین تھے۔ عرب کے ہر حصے سے مشرک قبائل کے لوگ حج و زیارت کے لیے کعبہ کی طرف جاتے تھے اور بہت سے قبیلوں کے راستے مسلمانوں کی زد میں آتے تھے۔ اس وقت یہ حکم دیا گیا کہ یہ لوگ مشرک بھی۔ تمنا سے اور ان کے درمیان جنگ بھی مگر جب یہ خدا کے گھر کی طرف جاسے ہیں تو حج کے ہیمنوں میں ان پر حملہ نہ کرو۔ یہ مہینے قابل احترام میں تھیں ان کا احترام کرنا چاہیے۔

کعبہ کی نیاز اور قربانی

۸۔ ذکر قربانی کے جانوروں پر دست درازی کر داور نہ ان جانوروں پر ہاتھ ڈالو جن کی گردنوں میں نذرِ خدا کی علامت کے طور پر پٹے پٹے ہوتے ہوں۔ ہڈی قربانی کے جانوروں کو کہتے ہیں جو بطنِ نذرِ خدا کے حضور پیش کرنے کے لیے بیت اللہ لے جاتے جاتے ہیں۔ قلابہ قلابہ کہ جمع ہے جس سے مراد وہ ہڈیاں پٹے پٹے ہوں کہ جانور کے گلے میں نشان کے طور پر ڈالتے تھے تاکہ قربانی کا جانور سمجھ کر اس سے تعرض نہ کریں اور دیکھنے والوں کو اسی جیسا عمل کرنے کی ترغیب بھی ہو۔ قرآن عظیم نے ان چیزوں کی تعظیم و حرمت کو باقی رکھا اور ہڈی یا اس کی علامات سے تعرض کرنے کو منوع قرار دیا ہے۔ ہڈی کے بعد قلابہ کا ذکر عام کے بعد خاص کے ذکر کی رویت رکھتا ہے۔ اور مقصود اس سے تعرض کی سنگینی کو واضح کرنا ہے کہ جن جانوروں کے گلے میں خدا کی تخصیص کے پٹے بندھ گئے ہوں ان پر حملہ خاص خدا کے گلے پر حملہ کرنا ہے۔ ان جانوروں کی بے حرمتی کی ایک صورت تو یہ ہے کہ ان کو حرم تک پہنچنے سے روکا جائے یا پھینک لیا جائے، دوسری صورت یہ ہے کہ ان سے قربانی کے علاوہ کوئی دوسرا کام سواری یا دودھ حاصل کرنے کا لیا جائے اس آیت نے ان سب صورتوں کو ناجائز قرار دیا ہے۔

طالبِ رضانے حق قابل احترام ہے

۹۔ اور نہ ان لوگوں کو بھی مشرود جو اپنے رب کے فضل اور اس کی خوشنودی کی تلاش

میں مکان محرم کی طرف جاتے ہیں۔ بظاہر یہ شان صرف مسلمانوں کی ہے یعنی جو مخلص مسلمان حج و عمرہ کے لیے جاتے ہیں ان کی تعظیم و احترام کرو اور ان کی راہ میں روڑے مت اٹھاؤ۔ اور جو مشرکین حج بیت اللہ کے لیے آتے تھے۔ اگر وہ بھی اس آیت کے محرم میں داخل ہوں۔ کیونکہ وہ بھی اپنے زعم اور عقیدے کے موافق خدا کے فضل و قرب اور خوشنودی کے طالب ہوتے تھے تو کتنا بڑے لگا کر ان کے حکم اس وقت سے پہلے کا ہے جب کہ انما المشرکون نجس فلا تعربوا المسجد الحرام بعد ماہرم هذا۔ کی مٹا دی کرادی گئی۔ لے

مطلب یہ ہے کہ خدا کعبہ کا ادب یہ ہے کہ جو اس کی زیارت کو جا رہا ہے اس سے کوئی تعرض نہ کرے، اس لیے کہ جب خدا کعبہ کے ادب اور احترام میں قربانی کے ہاؤس سے تعرض جائز نہیں تو انسان سے تعرض کرنا کیسے روا ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ مشرکین جس کام میں اللہ کی تعظیم کریں اس کام میں کافروں کی مزاحمت نہ کرو۔ البتہ بت وغیرہ کی تعظیم میں ان کی مزاحمت اور اہانت کرو۔ مشرکین عرب اپنے آپ کو ملت ابراہیم کا پر وکتے تھے۔ اسی بنا پر وہ حج اور عمرہ کی نیت سے سفر کرتے اور اپنے گمان میں وہ اللہ کی خوشنودی کا قصد کرتے۔ ان کے ہائے میں اللہ سبحانہ فرماتا ہے میں کہ جو لوگ خدا کعبہ کی نیت سے آتے ہیں ان سے تعرض نہ کرو۔ مقصد یہ ہے کہ مسلمان شحاتہ اللہ کے احترام پر مامور ہے بشرطیکہ ان کا نفسیاتی پس منظر خالص خدا پرستانہ ہو۔ کسی مشرک کا ذیادہ تشہیل کی آلودگی سے انہیں ناپاک نہ کر دیا گیا ہو۔ کوئی شخص خواہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو اگر اپنے عقیدہ و محل میں خدائے واحد کی عبادت اور بندگی کا کوئی جز نہ رکھتا ہے تو اس جزو کی حد تک مسلمان اس سے موافقت کریں گے اور ان شحاتہ کا بھی احترام کریں گے جو اس مذہب میں خالص خدا پرستی کی علامت ہوں۔ اس چیز میں ہمارے اور ان کے درمیان نزاع نہیں ہے بلکہ موافقت ہے نزع اس میں جیسی ہے کہ وہ خدا کی بندگی کیوں کرتا ہے بلکہ اس امر میں ہے کہ وہ خدا کی بندگی کے ساتھ دوسری بندگیوں کی آمیزش کیوں کرتا ہے؟ یاد رکھنا چاہیے کہ شحاتہ اللہ کے احترام کا یہ حکم اس وقت دیا گیا تھا جب کہ مسلمانوں اور مشرکین عرب کے درمیان جنگ برپا تھی، مگر پر مشرکین قابعض تھے۔

احرام کھولنے کے بعد شکار کی اجازت

۱۰۔ اور جب احرام کی حالت ختم ہو جائے تو قبیل شکار کی اجازت ہے یعنی حالت احرام میں شکار کی برحالت کی گئی وہ احرام کھولنے کے بعد اتی نہیں رہی۔ احرام بھی من جملہ شکار ملنے ہے اور اس کی پابندیوں میں سے کسی پابندی کو توڑنا اس کی بے حرمتی کرنا ہے اس لیے شکار اللہ کے سلسلے میں اس کا ذکر کر دیا گیا کہ جب تک تم احرام بند ہو شکار کرنا غلط ہے حتیٰ کہ شکار میں سے ایک شکار کی توہین کرنا ہے۔ البتہ جب شرعی قاعدے کے مطابق احرام کی حد ختم ہو جائے تو شکار کرنے کی اجازت ہے۔

یاد رہے کہ اصطلاح میں صیغہ امر وجوب کے معنی میں نہیں بلکہ صرف اجازت کے مفہوم میں ہے۔ البصا اور اُلوسی نے اس کی تصریح کی ہے۔ نسفی اور ابن کثیر کا بھی اسی طرف میلان ہے۔ مولانا اشرف علی نے یہ عجیب نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ محض ایک امر مباح کے لیے صیغہ امر کا لانا یہ بتانے کے لیے ہے کہ جس مباح کے ترک سے اس کے منوع ہونے کا قانون میں شبہ ہونے لگے اس مباح کا کرنا ہی مطلوب ہوتا ہے۔ یہاں سے ان متشددین کی غلطی بھی واضح ہو جاتی ہے جو مباحات کے چھوڑ بیٹھا احرام ہی کی طرح تشدد اور غور رکھتے ہیں۔

دشمنی میں بھی انصاف کا دامن چھوڑو

۱۱۔ اور یاد رکھو ایسا نہ ہو کہ کسی گروہ کی دشمنی جس نے تمہارے لیے مسجد حرام کا راستہ روکا تھا اس بات پر تمہیں ذرا ہمارے کہ تم ان پر زیادتی کرنے لگو۔ پچھلی آیت میں جن شکار کو حق تعالیٰ نے منظم و محترم قرار دیا تھا مسلمانوں میں مشرکین مکہ نے ان سب کی امانت کی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور تقریباً دس ہزار صحابہ ماہ ذیقعدہ محض عمرہ ادا کرنے کے لیے مدینہ طیبہ سے روانہ ہوئے۔ مدینہ کے مقام پر پہنچ کر مشرکین نے اس مذہبی فریضہ کی سبھا آدری سے روک دیا۔ نہ حالت احرام کا خیال کیا نہ کعبہ کی حرمت کا، محترم مہینہ کا نہ ہدی و قلاب کا۔ مسلمان شکار اللہ کی اس توہین اور مذہبی فریضہ سے روک لیے جانے پر ایسی وحشی و ظالم قوم کے مقابلہ میں جس قدر بھی غیظ و غضب

لے افادت شیخ الاسلام نے تفہیم القرآن

اور بغض و عداوت کا اظہار کرتے وہ حق بجانب تھے اور جوشِ انتقام سے براہِ ذرہ ہو کر جو کارروائی کرنا تھے وہ ممکن تھی لیکن اسلام کی محبت و عداوت دونوں بھی تلی ہیں۔ قرآن کریم نے ایسے ہمارے دماغ و دل میں جس کے مقابلہ میں بھی اپنے جذبات کو قابو میں رکھنے کا حکم دیا۔ عموماً آدمی زیادہ محبت یا زیادہ عداوت کے جوش میں عدسے گزر رہا ہوتا ہے اس لیے فرمایا کہ محبت سے سخت دشمنی تمھارے لیے اس کا باعث نہ ہو کہ تم زیادتی کر بیٹھو اور عدل و انصاف کو ہاتھ سے چھوڑ دو۔

چونکہ کفار نے اس وقت مسلمانوں کو زیارتِ کعبہ سے روک دیا تھا اور عرب کے قدیم دستور کے خلاف حج تکسے سے مسلمان محروم کر دیے گئے تھے اس لیے مسلمانوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جن کافر قبیلوں کے رائے اسلامی مقبوضات کے قریب سے گزرتے ہیں، ان کو ہم بھی حج سے روک دیں اور زمانہ حج میں ان کے قافلوں پر چھاپے لادیں مگر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما کر روک دیا۔

آیت کا خیار ہے کہ جس قوم نے تم کو واقعہ حدیبیہ کے وقت مکہ میں داخل ہونے اور عمرہ کرنے سے روک دیا تھا۔ اور تم سخت غم و غصہ کے ساتھ ناکام واپس ہو گئے تھے۔ اب مجھ کو قوت اور قدرت حاصل ہے تو ایسا نہ ہونا چاہیے کہ گزشتہ واقعہ کے غم و غصہ اور بغض کا انتقام اس طرح لیا جائے کہ تم ان کو بیتِ النرا اور مسجد حرام میں داخل ہونے اور حج کرنے سے روکے لگو۔ کیونکہ یہ ظلم ہے اور اسلام ظلم کی اجازت نہیں دیتا۔ ظلم کے بدلہ میں انصاف کرنا اور انصاف پر قائم رہنا اسلام کا شاہکار ہے۔ اگر انہوں نے اپنے زمانہ اقتدار میں اقتدار کے نشہ میں مسلمانوں کو مسجد حرام میں داخل ہونے اور عمرہ کرنے سے جبراً روک دیا تو یہ ظلم تھا، اس کا جواب ہرگز یہ دینا چاہیے کہ اب مسلمان بھی اپنے زمانہ اقتدار میں اسی ظلم کی کاپی کریں۔

اس آیتِ قرآنی کا مطالبہ یہ ہے کہ عدل و انصاف ہیں دوست و دشمن سب یکساں ہیں تمہارا دشمن خواہ کیسا ہی سخت ہو اور اس نے تمہیں کیسی ایذا پہنچائی ہو، اس سے بھی عدل و انصاف کا برتاؤ تمہارا فرض ہے۔

یہ کیسے زبردستی اصول کی تعلیم ہے کہ یگانے تو یگانے ان حق پوش یگانوں سے بھی العدا کا معاملہ کرو جن کی دشمنی کھل کر سامنے آچکی ہو اور تم ان سے اور وہ تم سے میدانِ جنگ میں آمنے سامنے آپہنچے ہوں۔ اس طرح سمجھا دیا کہ جو دشمن نہ ہوں یا مجھ سے تعلقات ہوں ان کے حقوق کی نگہداشت

کس قدر ضروری ہے۔ پھر دشمن کے نفع کو عام نہیں رکھا۔ کیونکہ بعض وقت محض اجنبی ہونے کی وجہ سے ایک قوم کو دشمن سمجھ لیا جاتا ہے بلکہ ان صددا کہ عن المسجد الامام بول کر بتا دیا کہ وہ دشمن جو تمہیں انتہاء درجہ کے دکھ پہنچا چکے ہوں انہیں گھر سے بے گھر کر چکے ہوں اور تمہارے مذہبی فریضہ کی ادائیگی میں عامل ہو چکے ہوں ان سے بھی عدل و انصاف کرو۔

نیک میں سب کے شریک رہو

۴۴۔ تمہارا دستور یہ ہونا چاہیے کہ نیک اور برہیز گاری کی ہر بات میں ایک دوسرے کی مدد کرو، گناہ اور ظلم کی بات میں کسی سے تعاون نہ کرو۔ اگر کوئی شخص بالفرض جوش انتقام میں زیادتی کر بیٹھے تو اس کے روکنے کی تدبیر یہ ہے کہ جماعت اسلام اس کے ظلم و عدوان کی افاعت نہ کرے بلکہ سب مل کر نیک اور برہیز گاری کا مظاہرہ کریں اور اشخاص کی زیادتیوں اور بے اعتدالیوں کو رو دکیں۔

اس آیت میں جو قاعدہ بتایا گیا ہے وہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے سامنے کاموں کے لیے ایک عام دستور العمل ہے۔ جو کوئی نیک کام کرے اس کی مدد کرو۔ اگرچہ مسلمان نہ ہو اور اگرچہ مخالف ہو اور جو کوئی بُرائی کرے اس کی مدد نہ کرو۔ اگرچہ مسلمان ہو، اگرچہ تمہارا ساتھی ہو مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کا شیوہ اختیار نہ کرو کہ اپنی قوم پر سب پر مقدم اور اپنی پارٹی پر بحال اپنی پارٹی اس سے پہلے تھا حدہ اور اصول غیر دین سے معاملات کے بنتے تھے۔ اب اس آیت میں امت کی حیثیت بتائی جا رہی ہے کہ تمہاری حیثیت عام امتوں کی نہیں ہے تمہاری ذمہ داری یہ ہے کہ دنیا میں تم پر تو تقویٰ کے مددگار اور اٹھ دعدوان کے مخالف بن کر آئے ہو اور ایک ایسی اصولی حقیقت ہے جو اس امت کے پرانے نظام اجتماع کی روح ہے اور جس پر مسلمان کی اصلاح و فلاح بلکہ خود اس کی زندگی اور بقا موقوف ہے۔ ہر دانش مند جانتا ہے کہ دنیا کا پورا نظام باہمی تعاون پر قائم ہے۔ قرآن نے اس آیت میں صرت تعاون کی تعلیم نہیں دی بلکہ تعاون علی البر و التقویٰ کی ہدایت کی ہے اور تعاون علی الاثم والعدوان سے منع کیا ہے۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مسلمان بھائی بھی اگر حق کے خلاف چل رہا ہو تو ناسحق اور ظلم پر اس کی بھی مدد

دکرو جگہ اس کی کوشش کرو کرنا حق اور ظلم ہے اس کا ہاتھ روکو، کیونکہ درحقیقت یہی اس کی صحیح امداد ہے تاکہ ظلم و جور سے اس کی دنیا و آخرت تباہ نہ ہو۔

صحیح بخاری میں حضرت انس سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انصر اعداء ظالمًا او مظلومًا یعنی اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم بھی ہر نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ بھائی کی امداد تو ہم سمجھ گئے مگر ظالم کی امداد کا کیا مطلب ہے آپ نے فرمایا کہ اس کو ظلم سے روکو، یہی اس کی مدد ہے۔

دراصل یہ آیت اور پر والی بات ہی کی ایک دوسرے پہلو سے تاکید ہے یعنی جس گروہ کو اللہ نے دنیا میں نیکی اور تقویٰ قائم کرنے کے لیے پیدا کیا ہے۔ اس کے لیے پسندیدہ روش یہ نہیں ہے کہ وہ دوسروں کی زیادتی سے مشغول ہو کر خود اس طرح کی زیادتیاں کرنے لگے، وہ ایسا کرے تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ اس نے گناہ اور زیادتی کے کام میں تعاون کیا اور غمخوار بنے بُرائی کی جویر جو جائی اس پر اس نے بھی چند روٹے رکھ دیے حالانکہ اس کا کام نیکی اور تقویٰ میں تعاون کرنا تھا۔

اللہ کی نافرمانی سے بچو

۴۱۔ اللہ سے ڈرو، اللہ سنگین گرفت والا ہے۔ یعنی حق پرستی، انصاف پسندی اور تمام عمدہ اخلاق کی جڑ خدا کا خوف ہے۔ اور اگر خدا سے ڈر کر نیکی سے تعاون نہ کیا گیا تو تمام عذاب کا اندیشہ ہے۔

لہذا تم کو چاہیے کہ نیکی اور پرہیزگاری میں ایک دوسرے کی مدد کرو تاکہ تم کو اللہ کے فضل اور رضوان سے حصہ ملے اور سخت عذاب سے محفوظ رہو۔ پھر یعنی نیکی سے لوگ خوش ہوتے ہیں اور تقویٰ سے اللہ خوش ہوتا ہے۔ جس نے دونوں باتوں کو اپنے اندر جمع کر لیا اس نے سعادت مکمل کر لی۔ بڑی نیکی فعل خیرات کا نام ہے اور تقویٰ وہ پرہیزگاری ترک منکرات کا نام ہے۔ جس میں یہ دونوں باتیں جمع ہو جائیں اس کی خوش نصیبی کے کیا کہنے، آئیے ایک بار پوری آیت پر مجموعی نظر ڈال لیجئے۔

اور دینی آیت میں حالت احرام میں شکار کی ممانعت فرمائی تھی کہ یہ چیز احرام کے تقدس اور اس کے دوشیزانہ مزاج کے خلاف نیز شاعرِ الہی میں سے ایک شیعوہ کی توہین ہے۔ اب اسی تعلق سے تمام شاعرِ الہی کے احترام کی پہلے بمبیسیت مجموعی تاکید فرمائی۔ پھر چند مخصوص شاعر کا حوالہ دیا۔ پھر شاعر کی ممانعت سے متعلق یہ واضح فرمایا کہ اس کو تعلق صرف حالت احرام سے ہے احرام سے باہر ہر جانے کے بعد یہ ممانعت اٹھ جائے گی۔

پھر اس اشتغالِ انجیز سبب کا ذکر فرمایا جو اس وقت تازہ بہ تازہ موجود تھا۔ اندیشہ تھا کہ مسلمان اس سے مغلوب ہو کر کوئی ایسی بات کر گزریں جو احترامِ شاعر کے منافی ہو۔ قریش نے ان کو بیت اللہ کی زیارت و طواف سے محروم رکھا تھا۔ یہ معاملہ نہایت صبر آزما تھا اور اب جبکہ مسلمانوں کے پاس سیاسی طاقت موجود تھی اس بات کا قوی اندیشہ تھا کہ اس عہد کے احترام میں ان سے کوئی بے اعتدالی صادر ہو جائے۔ اسی صورت کا تقاضا تھا کہ مسلمانوں کو خاص طور پر متنبہ کیا جائے کہ دوسروں کی زیادتیاں بھی ان کے لیے کسی زیادتی کا جواز فراہم نہیں کر سکتیں۔ وہ دنیا میں شاعرِ الہی کا احترام کرنے اور نیکی و تقویٰ کے علمبردار بن کر اٹھیں۔ اس وجہ سے سب تک پہنچے بچاؤ کی ضرورت مجبور ذکر ہے ان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی قدم نیکی اور تقویٰ کے خلاف اٹھائیں۔ اس کے بعد نکتہ کی بات یہ ارشاد فرمائی کہ دوسروں کے غلط رویے سے متاثر ہو کر انہی کی سی روش اختیار کر لینا درحقیقت ان کی بربادی بڑی میں ان کے ساتھ تعاون کرنا ہے اور یہ چیز اہل ایمان کے شایانِ شان نہیں ہے۔ اہل ایمان کے شایانِ شان بات یہ ہے کہ وہ نیکی اور تقویٰ کے کام میں تو نہ کریں۔ دشمن کے ہاتھوں بھی کوئی نیک کام ہو رہا ہو تو اس میں خرقہ ہونے کے بجائے اس کی حوصلہ افزائی کریں۔ آخر میں شدید العقاب کا حوالہ دینے سے مقصود مسلمانوں کو سخت الفاظ میں تنبیہ ہے کہ عہدِ الہی کی حرمت سخت سے سخت حالات میں بھی قائم رکھنی ہے اور نہ یاد رکھو جس خدا نے تم کو اپنے عہد و میثاق سے دنیا کی امامت کی سرفرازی بخشی ہے۔ اس کے ہاں نقص میثاق کی پاداش بھی بڑی سخت ہے۔

اس آیت سے حضرت مولانا اشرف علی کی یہ نکتہ آفرینی قابلِ داد ہے کہ حسن و قبح میں مقدمات کو مقاصد کا حکم دیا جاتا ہے اور مشائخِ اہل تربیت کے ایمان اسی قاعدے پر عمل ہے۔ یہیں سے ان مجلسوں، انجمنوں اور اجتماعات کی زندگی کے شعبوں میں شرکت کا درجہ بھی منہزم

رہا ہے جن کا مقصد شامتِ دین اور نصرتِ دین ہر اور جو انسانی حقوق کی مخالفت کو اپنا نصب العین بنا چکی ہوں اور ان اجتماعی کاموں اور اداروں میں شرکت کی حرمت بھی یہیں سے معلوم ہو رہی ہے جن سے بے دین، بدعمل اور انسانی حقوق کی پامالی کی تائید ہوتی ہو۔

برہنہ تقویٰ اور اثم و عدوان

جیسے نفع تقویٰ و فرائض کی ادائیگی کے لیے آتا ہے ایسے نفع برہنہ حقوق کی پابندی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسی لیے برہنہ اثم اور حقوق آتا ہے۔ برادرِ اسی سے صفت کے معنی آتے ہیں۔
برادرِ الدیسا اس سعادتِ نبیؐ کے کہتے ہیں جو اپنے والدین کا فرمانبردار ہو اور ان کے پورے پورے حقوق ادا کرنے والا ہو۔ یہ مطلب نہیں کہ اس کے معنی میں صرف حقوق ہی داخل ہیں بلکہ فرائض بھی کہ یہ نفع زیادہ حقوق میں استعمال ہوتا ہے اور فرائض میں کم۔ فرائض کی ادائیگی اور محرمات سے بچاؤ کے معنی میں ہر تو اس کی ضد بخود آتی ہے۔

انسان کا دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں اور کمینوں سے ایک گونہ لگاؤ ہے اس لگاؤ کا یہ تقاضا ہے کہ اس کی ترقی و مخالفت میں کوشش کی جائے اور اس کی تباہی سے اس کی مخالفت کی جائے۔ برہنہ تقویٰ کو بنیاد بنا کر تعمیر کی جائے اور اثم و عدوان پر مبنی تخریب سے بچا جائے۔
آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم اس وقت تک اپنی ذمہ داریوں سے حمدہ برآ نہ ہو گے جب تک دنیا میں برہنہ تقویٰ کے معاون اور اثم و عدوان کے مخالف بن کر کھڑے نہ ہو گے۔ یہ آیت قرآنی مکارمِ اخلاق کے لیے رہنما اصول فراہم کرتی ہے۔ اسی لیے ایک ارشادِ نبوت میں برہنہ اخلاق کو بتایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

فاز بن سمان کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، یہ کہ
برہنہ اخلاق کا نام ہے جب کہ اثم وہ ہے جس کی تمنا سے دل میں کشاکش
ہو اور تمہیں یہ پسند نہ ہو کہ لوگ اس پر مطلع ہوں۔

مسند احمد اور مسند دارمی میں حضرت والبعہ کے حوالے سے جو ارشادِ نبوت آیا ہے اس میں
برہنہ اثم کی حقیقت کو اور زیادہ وضاحت سے پیش کیا ہے،

والبعہ کہتے ہیں کہ میں حضور اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔
حضور نے فرمایا کہ والبعہ تو برہنہ اثم کے بارے میں پوچھنے آیا ہے، عرض کی جی ہاں۔

فرمایا کہ تو اپنے دل سے بوجہ بزدل ہے جس پر تیرا جی مطمئن ہو اور تیرا دل لگ جائے
اور اتم وہ ہے کہ جس کی کھٹک تیرے جی میں ہے اگرچہ لوگ سمجھتے تھے ہی
فتویٰ دیں۔

یہ دونوں ارشادات نہایت واضح و آشکارا طور پر کہہ رہے ہیں کہ بڑا سزاوارتہ تعلق لوگوں کے حقوق
وہ ہے، انسانی حقوق جیسے اخلاق سے تعلق رکھتے ہیں ایسے ہی معاملات میں دیانت و امانت
سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی بنا پر ایک ارشاد نہایت میں راست گفتار اور سچے کو بار فرمایا ہے۔
پہنچا پڑ مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے حوالہ سے یہ واقعہ آیا ہے کہ ایک شخص آپؐ کی خدمت
میں حاضر ہوا اور اس نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ جنت کا عمل کیا ہے؟ فرمایا سچ بولنا جب
بندہ سچ بولتا ہے تو بار یعنی نیکو کار ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعود
کے حوالہ سے یہ ارشاد نہایت اس کی توضیح کرتا ہے کہ:

بجانب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگو! راست گزرتی کی عادت
اختیار کرو کیونکہ راست گزرتی بڑا نیکو کاری کی رہنما ہے اور نیکو کاری انسان کو جنت
میں پہنچاتی ہے۔

ان ارشادات کی روشنی میں یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ انسانی حقوق یعنی اخلاق و معاملات
میں حسن کاری کا نام بر ہے۔ اگر اخلاق میں ہو تو اس کا مقابل فحور ہے اور معاملات میں ہو تو
اس کا مقابل اثم ہے اور اگر اقارب میں ہو تو اس کا مقابل حقوق ہے۔ بہر حال جیسے خداوندی
حقوق کی یا سنا کی کا نام تقویٰ ہے ایسے ہی انسانی حقوق کی ادائیگی کا نام بر ہے۔ اسی بنا پر
سفر کی دعائیں دونوں کر مانگا ہے:

اللهم انا نسألك في سفرنا هذا البرة والمقربة۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالْدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أَهْلُ لَغَيْرِ
 اللَّهِ بِهِ، وَالْمُنْفِقَةُ وَالْمُؤَفُّوۃُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالطَّيْعَةُ
 وَمَا أَكَلَ السَّبْعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ۚ وَمَا ذُهِبَ عَلَى النَّصَبِ وَ
 أَنْ تَسْتَفْسِدُوا بِالْأَزْلَامِ ۚ ذَٰلِكُمْ فُسُقٌ ۚ الْيَوْمَ يَسِرُّ
 الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ دِينِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ
 الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتِمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَ
 رَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْصَصَةٍ
 غَيْرِ مُتَجَانِفٍ ۖ لِإِثْمِهِ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٥٧﴾

مسلمانو! تم پر یہ چیزیں حرام کر دی گئی ہیں۔ مردار جانور، خون،
 سور کا گوشت، وہ جانور جو غیر خدا کے نام پر پکارا جائے، گنا گھوٹ
 کر مرابو، وہ جو بلندی سے گر کر مر جائے، وہ جو کسی جانور کے
 سینک مارنے سے مر جائے، وہ جسے درندہ پھاڑ کھا جائے۔^{۱۷}

مگر ہاں وہ حرام نہیں جسے تم اس کے مرنے سے پہلے ذبح کر لو،^{۱۵}
 وہ جانور ہو کسی تھان پر چڑھا کر ذبح کیا جاتے۔ اور یہ بات بھی
 حرام ہے کہ تیروں کے پاسوں سے آپس میں تقسیم کر دو، یہ گناہ
 کی بات ہے۔ مسلمانوں، جن لوگوں نے راہ کفر اختیار کی وہ آج
 تمہارے دین کی طرف سے مایوس ہو چکے ہیں۔ لہذا ان سے
 نہ ڈرو، مجھ سے ڈرو۔ آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا
 دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور تمہارے
 لیے میں نے دین اسلام پسند کر لیا۔ پس دیکھو جو کوئی بھوک
 سے بے بس ہو جاتے یہ نہ ہو کہ دانستہ گناہ کرنا چاہے تو اللہ
 بخشنے والا رحمت رکھنے والا ہے۔^{۲۱}

محرمات کی تفصیل

اس آیت میں ان محرمات کی تفصیل بیان ہو رہی ہے جن کا پہلی آیت میں الاما یتلی علیکم
 کے الفاظ میں اجمالاً ذکر ہوا تھا۔ اس میں پہلے ان چیزوں کا ذکر ہوا جن کی حرمت پہلے ہی بیان ہو چکی

ہے۔ مزید تاکید اور تکمیل بحث کے طور پر ان کا یہاں بھی اعادہ کر دیا گیا۔ اس مقام پر یہ بات خوب ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ کھانے پینے کی چیزوں میں حلال و حرام کی جو تحدید و خیریت کی طرف سے علامہ کی گئی ہیں، ان کی اصل بنیاد ان اشیاء کے طبی فوائد یا نقصانات نہیں بلکہ ان کے اخلاقی فوائد و نقصانات ہیں، جہاں تک مادی اور طبعی امور کا تعلق ہے اللہ تعالیٰ نے ان کو انسان کی اپنی سعی و جستجو اور کاوش و تحقیق پر چھوڑ دیا ہے۔ یہ دریافت کرنا انسان کا اپنا کام ہے کہ مادی اشیاء میں کیا چیزیں اس کے جسم کو غذائے صالحہ بہم پہنچاتی ہیں اور کیا چیزیں تغذیر کے لیے مضر مفید یا نقصان دہ ہیں۔ شریعت ان امور میں اس کی رہنمائی کی ذمہ داری اپنے سر نہیں لیتی۔ اگر یہ کام اس نے اپنے ذمہ لیا ہوتا تو سب سے پہلے شک کیا کہ حرام کیا ہوتا لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن و سنت میں اس کا یہاں دوسرے مفادات و مرکبات کا جو انسان کے لیے مہلک ہیں سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ شریعت غذا کے معاملہ میں جس چیز پر روشنی ڈالتی ہے وہ اصل اس کا یہ پہلو ہے کہ کس غذا کا انسان کے اخلاق پر کیا اثر ہوتا ہے اور کون سی غذائیں طہارت نفس کے لحاظ سے کیسی ہیں اور غذا حاصل کرنے کے طریقوں میں سے کون سے طریقے اعتدال و نظریہ حیثیت سے صحیح یا غلط ہیں۔ چونکہ اس کی تحقیق کرنا انسان کے بس میں نہیں ہے اور اسے دریافت کرنے کے ذرائع انسان کو میسر ہی نہیں ہیں اور اسی بنا پر انسان نے اکثر اُمم میں غلطیاں کی ہیں۔ اس لیے شریعت صرف انہی امور میں اس کی رہنمائی کرتی ہے جن چیزوں کو اس نے حرام حرام کیا ہے۔ انہیں اس وجہ سے حرام کیا ہے کہ یا تو اخلاق پر ان کا بُرا اثر پڑتا ہے یا وہ طہارت کے خلاف ہیں۔ یا ان کا تعلق کسی فاسد عقیدے سے ہے برعکس اس کے جن چیزوں کو اس نے حلال کیا ہے ان کی حلت کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان برائیوں میں سے کوئی برائی اپنے اندر نہیں رکھتیں۔

سوال کیا جاسکتا ہے کہ خدا نے ہم کو ان اشیاء کی حرمت کی وجہ کیوں نہ سمجھاتے مگر ہمیں بصیرت حاصل ہو جاتی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ان وجہ کو سمجھنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے مثلاً اگر خون یا سدر کے گوشت یا مردار کے کھانے سے ہماری اخلاقی صفات میں کیا خرابیاں رونما ہوتی ہیں کسی طرح اور کس قدر ہوتی ہیں۔ اس کی تحقیق ہم کسی طرح نہیں کر سکتے کیونکہ اخلاق کو ناپنے اور نولنے کے ذرائع ہمیں حاصل نہیں ہیں۔ اگر بالفرض ان کے برے اثرات کو بیان بھی کر دیا جائے تو شبہ کرنے والا تقریباً اسی مقام پر ہوتا جس مقام پر وہ اب ہے، کیونکہ وہ اس بیان کو صحت اور عدم صحت کو آخر کس چیز سے ناپتا۔ اس لیے اللہ سبحانہ نے حلال و حرام کی حدود کا انحصار ایمان پر رکھ دیا ہے جو شخص اس باب پر مطمئن ہو جائے کہ کتاب اللہ کی کتاب ہے اور رسول اللہ کا رسول ہے

اور اللہ عظیم و خیر ہے وہ اس کے مقرر کیے ہوئے حدود کی پابندی کرے گا خواہ ان کی مصلحت اس کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے اور جو شخص اس بنیادی عقیدے پر ہی مطمئن نہ ہو، اس کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ جن چیزوں کی خرابیاں انسانی علم کے احاطہ میں آگئی ہیں صرف انہی سے پرہیز کرے اور جن کی خرابیوں کا علمی احاطہ نہیں ہوا ہے ان کے نقصانات کا سختہ مشق بنائے۔

۱۴۔ مسلمان اتم پر یہ چیزیں حرام کر دی گئی ہیں، مردار جالور، اس آیت سے جن چیزوں کا کھانا حرام ہوا، ان میں اول میتر مردار جالور ہے، جو واجب الذبح جالور ذبح کیے بغیر خود اپنی موت سے مرہاتے اس کا خون اور حرارت غریزہ گوشت ہی میں محقق اور جذب ہو کر رہ جاتی ہے جس کی حیثیت اور گندگی سے کئی قسم کے بدنی اور دینی نقصانات لگ جاتے ہیں (ابن کثیر، شاید اسی تفصیل پر متنبہ فرمانے کے لیے میتر کے بعد دم خون کی حرمت مذکور ہوئی) اس کے بعد حیوانات کی ایک خاص ذبح یعنی خنزیر کا ذکر کیا جس کی بے انتہا سببست خوردی اور بے حیائی مشہور عام ہے شاید اسی لیے خرافیت مذہب نے دم خون کی طرح اس کو نجس العین قرار دیا۔ ان تین چیزوں کے ذکر کے بعد جن کی ذات میں مادی گندگی اور خباثت پائی جاتی تھی۔ حرمت کی ایک اور قسم کا ذکر کیا یعنی جوجاں اور اپنی ذات کے اعتبار سے حلال و طیب ہے مگر مالک حقیقی کے سوا کسی اور کی نیاز کے طور پر نامزد کر دیا گیا ہو۔ اس کا کھانا بھی میت کی خباثت اور عقیدے کی گندگی کی بنا پر حرام ہے کسی اذکار کی جان صرف اسی مالک حقیقی و خالق کے حکم اور نام پر ملے جاسکتی ہے جس کے حکم اور ارادے آس پر موت و حیات طاری ہو سکتی ہے۔ باقی متغلقہ وغیرہ غیر مذکور جالور سب میتر۔ حکم میں داخل ہیں جیسا کہ ماذبح علی النصب، ما اهل لغير الله کے ساتھ ملتی ہے جاہلیت میں ان سب چیزوں کے کھانے کی عادت تھی۔ اسی لیے اس قدر تفصیل سے ان کا ذکر کیا۔

میت، آدم، لحم خنزیر اور ما اصل بہ لغير الله کا ذکر دوسری جلد میں ہو چکا ہے۔ متغلقہ اس جالور کو کہتے ہیں جو گلا گھونٹ کر مرہاتے۔ موقوفہ جو چوٹ سے مر جاتے، مثلاً کسی ٹرک کے پیچھے اگر مر گیا۔ سرور جو اوپر سے نیچے گر کر مر جاتے۔ نطیو جو کسی جالور کے سینک سے مر جاتے ماکل السبع جس کو کسی درندے نے چھاڑ دیا ہو۔

مذکورہ بالا پانچوں چیزوں کا ذکر در حقیقت میت کی تفصیل کے طور پر ہوا ہے اور اس تفصیل

سے گویا اس حکم کی تکمیل فرماتی ہے تو مرد اور اس کے پہلے انعام میں بیان ہو چکا ہے۔ اس تفصیل کی ضرورت اس لیے تھی کہ بعض ذہنوں میں یہ شبہ پیدا ہو سکتا تھا کہ ایک مرد اور اس میں جو طبعی موت سے مراد ہو اور اس جانور میں جو کسی بوٹ یا حادثہ کا شکار ہو کر مر گیا ہو کچھ فرق ہونا چاہیے چنانچہ یہ شبہ اس زمانے میں بھی کچھ کمزور یا باقی رہتا ہے بلکہ بہت سے لوگ اسی کو بہانہ بنا کر گردن مرد و مری ہوئی مرغی بھی جائز ہوتا تھے ہیں۔ قرآن کی اس تفصیل نے اس شبہ کو مٹا کر دیا۔

موقوفہ کے بارے میں یہ بات ضرور پیش نظر رہے کہ موقوفہ وہ جانور ہے جو ضرب شدید کے ذریعے ہلاک ہو یا سہوہ غیرہ اور جو تیر کسی شکار کو اس طرح قتل کرے کہ وہ مار کی طرف سے نہ لگے جیسے ہی ضرب سے مر جائے وہ بھی موقوفہ میں ہی داخل ہے۔ حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں بعض اوقات معارض میرے شکار کرتا ہوں اگر شکار اس سے مر جائے تو کیا کھا سکتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر وہ جانور تیر کے عرض کی بوٹ سے مرے تو وہ موقوفہ کے حکم میں داخل ہے اس کو مت کھا اور اگر دھار کی طرف سے لگا ہے اور اس نے زخم کر دیا ہے تو کھا سکتے ہو۔ یہ روایت البصاص نے احکام القرآن میں نقل کی ہے اس میں شرط یہ ہے کہ تیر چھیننے وقت بسم اللہ کہہ کر چھینکا ہو۔

جو شکار بندوق کی گرنی سے ہلاک ہو گیا ہو اس کو بھی فقہائے موقوفہ میں داخل کیا ہے ابو بکر البصاص نے حضرت عبداللہ بن عمر سے نقل کیا ہے کہ فرماتے ہیں المقتولۃ بالہندۃ قلت الموقودۃ یعنی بندوق کے ذریعے جو جانور قتل کیا گیا ہو وہی موقوفہ ہے اس لیے حرام ہے امام اعظم امام شافعی اور امام مالک وغیرہ سب اس پر متفق ہیں۔ (قرطبی)

ذبیح اور ذکاة کی اسلامی اصطلاح

۱۵۔ مگر ہل وہ حرام نہیں ہے جسے تم اس کے منہ سے پہلے ذبیح کر لو۔ اصل ارشاد میں ذکیئہ آیا ہے۔ ذکاة سے ہے جو اصل میں اگ کے جلنے پر بولا جاتا ہے۔ ذکیئۃ الشاة کے سنے میں نے بکری کو ذبیح کیا۔ گویا حواہت غریبی کے اخراج کا نام تذکیر ہے یعنی خون کے نکل جانے کا اس لیے شریعت میں جانور کو ذبیح کر کے مارنے پر بولا گیا ہے۔ لفظ تذکیر لاکر بتا دیا کہ اصل ذبیح خون نکالتا ہے اس لیے بہانے ذبیح کے تذکیر کا لفظ اختیار کیا کہ یہ تذکیر خون میں بہت قسم کی ذہریں ہوتی ہیں۔ اور تذکیر اس جانور کا ہو سکتا ہے جس میں زندگی باقی ہو۔

یعنی کچھ حرارت غریزی موجود ہر اس لیے یہی لفظ زیادہ موزوں تھا۔

مطلب یہ ہے کہ جو جانور مذکور بالا حوادث میں سے کسی حادثہ کا شکار ہو جانے کے باوجود مرا نہ ہو بلکہ کچھ آثار زندگی اس میں پائے جاتے ہوں اس کو اگر ذبح کر لیا جائے تو کھایا جاسکتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حلال جانور کا گوشت صرف ذبح کرنے سے حلال ہوتا ہے، کوئی دوسرا طریقہ اس کو ہلاک کرنے کا صحیح نہیں ہے۔ یہ ذبح اور ذکاۃ اسلام کے اصطلاحی الفاظ ہیں۔ ان سے مراد صلیقہ کا آنا حصہ کاٹ دینا ہے جس سے جسم کا خون اچھی طرح خارج ہو جائے۔ جب تک کہ کھلے یا گلا کھوٹنے یا کسی اور تدبیر سے جانور کو ہلاک کرنے کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ خون کا بیشتر حصہ جسم کے اندر ہی رک جاتا ہے اور وہ جگہ جگہ جم کر گوشت کے ساتھ چمٹ جاتا ہے، برعکس ان کے ذبح کرنے کی صورت میں دماغ کے ساتھ جسم کا تعلق دیر تک قائم رہتا ہے جس کی وجہ سے رگ رگ کا خون کھینچ کر باہر آ جاتا ہے اور اس طرح پورے جسم کا گوشت طن سے صاف ہو جاتا ہے۔ خون کے متعلق اچھی بات گزر چکی ہے کہ وہ حرام ہے لہذا گوشت کے پاک اور حلال ہونے کے لیے ضروری ہے کہ خون اس سے جدا ہو جائے۔ ذبح کا یہ استثنائہ شروع کی چار قسموں سے متعلق نہیں ہے اس پر سلف صالحین کا اتفاق ہے۔ یہ استثنائہ منخندہ اور اس کے بعد سے متعلق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان تمام صورتوں میں اگر جانور زندہ پایا گیا۔ زندگی کی علامتیں محسوس کی گئیں اور اسی حالت میں اس کو اللہ کے نام پر ذبح کر دیا گیا تو وہ حلال ہے۔

سٹانوں پر بھینٹ

۱۶۔ اور وہ جانور جو کسی سٹان پر چڑھا کر ذبح کیا جائے، مقبوضا سا پہلے ہی کے ادب و احترام کا ذکر متا صیفی وہ جانور جو تقریب الی اللہ کی غرض سے خدائے واحد کی سب سے پہلی عبادت کا کی نیاز کے طور پر ذبح کیا جاتا ہے۔ اس کے بالمقابل اس جانور کا بیان فرمایا جسے خدا کے سوا کسی دوسرے کے نام پر یا خاندان خدا کے سوا کسی دوسرے مکان کی تعظیم کے لیے ذبح کیا جائے۔
 (موضع القرآن)، اس دوسری صحت میں بھی فی الحقیقت نیست نذر غیر اللہ ہی کی ہوتی ہے گو ذبح کے وقت زبان سے بسم اللہ اللہ اکبر کہا جائے۔ اس تقریب کے موافق ما احل بہ

لعنہ اللہ اور ما ذبح علی النصب کا فرق واضح ہو گیا۔ (ابن کثیر) لے
امام رابع فرماتے ہیں کہ نصب ان پتھروں کو کہتے ہیں جن کو مشرکین عرب غیر اللہ کی عبادت
کے لیے نصب کرتے تھے اور جانوروں کو لے جا کر وہاں ذبح کرتے تھے الی نصب یوقضون
قرآن میں آیا ہے۔

نصب اور منہم میں فرق یہ ہے کہ نصب ان پتھروں کو کہتے ہیں جو کسی دیوتا یا دیوی کے نام
پر ٹکایا گیا ہو خواہ تصویر ہو یا نہ ہو اور منہم وہ تصویر یا پتھر ہے جس پر کسی دیوتا یا دیوی کی تصویر ہو
خدا و کعبہ کے گرد تین سو ساڑھے پتھر کھڑے کیے جاتے تھے جن کو مشرکین اپنے دیوتاؤں کا ستھان سمجھ
کر ان کے پاس آکر قربانیاں کیا کرتے تھے اور کچھ خون بھی ان پر چھڑک دیتے تھے اور ان پتھروں کو
بدلتے ہی بدلتے تھے۔ ایک پتھر کے سہائے دوسرا اچھا پتھر رکھ دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی
بخس اور حرام قرار دیا اور ان قربانیوں کے کھانے کی ممانعت کی جو ان ستھانوں پر لے جا کر کی جاتیں
کیونکہ یہ صورت بھی فی الواقع نذر حیر اللہ کی ایک خاص صورت ہے اگرچہ ذبح کے وقت زبان سے
بسم اللہ اللہ اکبر کہہ دیا جائے۔ کیونکہ اصل مقصد اس ذبح سے غیر اللہ کی تعظیم اور تقرب ہے
جو شرک ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے بھی حرام قرار دیا کیونکہ حرمت کا دار و مدار مشرکۃ اعتقاد
پر ہے جس کا تصور کبھی کبھار سے جوتہ ہے اور کبھی کردار سے۔ یعنی ایسے مقام پر ذبح کرنے سے جو
غیر اللہ کے نام پر بنے ہوئے ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے ذبح کو کھانا حرام قرار دیا۔ لے

در اصل نصب ستھان اور استھان کو کہتے ہیں۔ عرب میں ایسے استھان بے شمار تھے جہاں
دیویوں، دیوتاؤں، جھوٹوں اور جنوں کی خوشنودی کے لیے قربانیاں کی جاتی تھیں۔ قرآن
نے اس قسم کے ذبح کو حرام قرار دیا۔ قرآن کے الفاظ سے یہ بات صاف لگتی ہے کہ ان کے
اندر حرمت مجدد بارہا تقرب و خوشنودی استھانوں پر ذبح کیے جانے ہی سے پیدا ہو جاتی ہے
اس سے بحث نہیں کران پر نام اللہ لایا گیا ہے یا کسی غیر اللہ کا، اگر غیر اللہ کا نام لینے کے سبب
سے ان کو حرمت لاحق ہوئی تو ان کے علیحدہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اور پھر ماہی
لعنہ اللہ کا ذکر ہو چکا ہے وہ کافی تھا۔ ہمارے نزدیک اسی حکم میں وہ قربانیاں بھی داخل
ہیں جو مزاروں اور قبروں پر پیش کی جاتی ہیں۔ ان میں بھی صاحب مزار اور صاحب قبر کی

غرض خودی مقرر ہو رہی ہے۔ ذریعہ کے وقت نام چاہے اللہ لایا جائے یا صاحب قبر و مزار کا۔ ان کی حرمت میں نام کو نہیں بلکہ مقام کو دخل ہے۔
 فی الواقع نصب سے مراد وہ سب مقامات ہیں جن کو غیر اللہ کی نذر و نیاز چڑھانے کے لیے لوگوں نے مخصوص کر رکھا ہو۔ خواہ وہاں کوئی پتھر یا لکڑی کی صورت ہو یا نہ ہو۔ ہماری زبان میں اس کا ہم معنی لفظ آستانہ یا استھان ہے جو کسی بزرگ یا دیوتا سے یا کسی خاص مشرک یا مفسد و فاسق سے وابستہ ہو رہے۔

استقام بالازلام

۱۶۔ اور یہ بات بھی حرام ہے کہ تبرؤں کے پاسوں سے آپس میں تقسیم کر دیا، یہ گناہ کی بات ہے۔ بعض مفسرین نے ازلام سے تقسیم کے تیز مراد لیے جو زنا و جاہلیت میں لم یجدو غیر کے بانٹنے میں استعمال ہوتے تھے اور وہ ایک صورت تھا اور جو سے کی جتنی جیسے آج کل چھٹی ڈالنے کی رسم ہے لیکن حافظ ابن کثیر وغیرہ محققین کے نزدیک راجح یہی ہے کہ ازلام سے مراد وہ تبر ہیں جن سے مشرکین مکہ کسی اشکال و تردد کے وقت اپنی مرادوں اور کاموں کا فیصلہ کرتے تھے۔ یہ تبر خاد کعبہ میں قریش کے سب سے بڑے بت جہل کے پاس رکھے تھے۔ ان میں سے کسی پر امرائی ربی لکھا تھا، میرے پروردگار نے حکم دیا، کسی پر نہانی مابی تحریر تھا میرے پروردگار نے منع کر دیا۔ اس طرح ہر تبر پر یوں ہی اشکال پچھواتیں لکھ چھوڑی جتلیں۔ جب کسی کام میں تذبذب ہو تو تبر نکال دیکھ لیتے۔ اگر امرائی دیتی والی تبر نکلی آیتو کام شروع کر دیا اور اگر اس کے خلاف نکلا تو ترک کر دیتے۔ علیٰ هذا التیاس گرما بتوں سے، ایک قسم کا مشورہ اور استقامت تھی۔ چونکہ اس رسم کا منہی خالص جہل، شرک اور کلام پرستی اور افراط علی اللہ تھا اس لیے قرآن حکیم نے متعدد مواقع میں نہایت تفصیل و تشدید کے ساتھ اس کی حرمت کو ظاہر فرمادیا۔ اس تقریر کے موافق ازلام کا ذکر نصب کی مناسبت سے ہوا، اور مراد، خنزیر و دیگر نہایت نجیث اور گندی چیزوں کی تحرم کے سلسلے میں منسلک کر کے بتلادیا کہ اس کی معنوی اور اعتقادی نہایت و خفاقت ان چیزوں سے کم نہیں ہے جیسا کہ دوسری آیت میں رہیں

لے تدبر قرآن لے تفہیم القرآن

کے اطلاق سے ظاہر ہوتا ہے۔

اصل میں انتقام کے منہ حصہ قسمت، بقدر معلوم کرنے کے ہیں۔ اذلام جوئے یا خال کے تیروں کو کہتے ہیں۔ عرب میں خال کے تیروں کا بھی رواج تھا جن کے ذریعے سے وہ اپنے خال کے مطابق خال کے فیصلے معلوم کرتے تھے اور جوئے کے تیروں کا بھی رواج تھا جن کے ذریعے سے گزشت یا کسی چیز کے حصے حاصل کرتے تھے۔ علماء نے یہاں پہلی صورت کو ترجیح دی ہے یعنی تیروں کے ذریعے خال وغیرہ نکالتے اور جو حکم نکل آیا اس پر عمل کرتے۔ خود صحیح بخاری کی کتاب التفسیر میں ایک روایت اسی مضمون کی آئی ہے کہ:

انتقام یہ ہے کہ تیروں سے خال گیری کی جائے۔ اگر منافقت نکل آئے تو رک جائے اور اگر حکم ہو تو عمل کرتے اور تیروں پر نشانیاں لگا رکھی گئیں ان سے ہی قسمت معلوم کر لیتے۔

صحابہ تابعین اور اکثر مفسرین سے یہی منقول ہے۔ عبداللہ بن عباس سے حافظ ابن جریر نے نقل کیا کہ متعدد قسمت معلوم کرنے والے تیر ہیں۔ حافظ ابن کثیر نے امام ماہد، ابراہیم نخعی، الحسن البصری اور قتال بن عبید اللہ سے یہی معنی نقل کیے ہیں۔ امام رازی فرماتے ہیں:

تیروں کے ذریعے قسمت معلوم کرنا یہ سب کیروں کے ذریعے خیر و شر کا فیصلہ کیا جاتے۔ یہی جمہور کا مختار ہے۔

امام ماہد نے یہ بات کھول کر بتائی ہے کہ قرعہ اندازی، خال گیری اور وہم پرستی کی یہ شکل اہل عرب ہی میں رائج نہ تھی بلکہ ایران اور روم کی بڑی مذہب تو میں بھی اس میں مبتلا تھیں۔

در اصل انتقام بالاذلام کے ذریعے جس چیز کو حرام قرار دیا گیا اس کی تین بڑی قسمیں دنیا میں پائی جاتی ہیں، اور آیت کا حکم ان تینوں پر عادی ہے۔

۱۔ مشرکانہ خال گیری جس میں کسی دیوبی یا ولوتا سے قسمت کا فیصلہ پوچھا جاتا ہے یا غیب کی خبر دریافت کی جاتی ہے یا دہی نزاعات کا تصفیہ کرایا جاتا ہے۔ مشرکین مکہ نے اس فرض کے لیے کہہ کر اندر ہبل دیوتا کے ست کو مخصوص کر رکھا تھا۔ اس کے استھان میں سات تیر لگے ہوتے تھے۔ جن پر مختلف الفاظ اور فقرے کندہ تھے۔ کسی کام کرنے یا نہ کرنے کا سوال ہو یا گم شدہ چیز کا

لے افادات شیخ الاسلام

پتہ پر چھپا ہوا خون کے مقدار کا فیصلہ مطلوب ہو، غرض کوئی کام بھی ہو اس کے لیے ہبل کے پاس دار کے پاس پہنچ جاتے۔ اس کا اندازہ پیش کرتے اور ہبل سے دیکھا لگتے کہ ہمسائے اس معاملہ کا فیصلہ کر دے۔ پھر پاسداران تیروں کے ذریعے سے خالی نکالتا اور تیرہ بھی خالی میں نکل آتا اس پر لکھے ہوئے لفظ کو ہبل کا فیصلہ سمجھا جاتا تھا۔

۱- توجہ پرستہ خالی گیری، جس میں زندگی کے معاملات کا فیصلہ عقل و فکر سے کرنے کے بجائے کسی دہم خیالی چیز یا کسی اتفاقی شے کے ذریعے سے کیا جاتا ہے یا قیمت کا حال ایسے ذرائع سے معلوم کیا جاتا ہے جن کا وسیلہ علم غیب ہو یا کسی علمی طریق سے ثابت نہیں ہے۔ رمل، نجوم، جھنڈا، مختلف قسم کے شگون اور جھنڈا اور خالی گیری کے بے شمار طریقے اس قسم میں داخل ہیں۔

۲- جوئے کی قسم کے وہ سائے کھیل اور کام جن میں اشیاء کی تقسیم کا مدار حقوق اور خدمات اور عقل فیصلوں پر رکھنے کے بجائے محض کسی اتفاقی ام پر رکھ دیا جائے۔ مثلاً یہ کہ لاشی میں اتفاقی فلاں شخص کا نام نکل آیا ہے۔ لہذا ہزار ہا آدمیوں کی حسیب سے نکلا ہوا روپیہ اس ایک شخص کی حسیب میں چلا جائے۔ یا یہ کہ علمی حیثیت سے تو ایک مہتر کے بہت سے حل صحیح ہیں مگر انعام وہ شخص پائے گا جس کا حل کسی معقول کوشش کی بنا پر نہیں بلکہ محض اتفاق سے اس حل کے مطابق نکل آیا ہو صرف مہتر کے صندوق میں بند ہے۔

ان تینوں قسموں کو جوام قرار دینے کے بعد قرعہ اندازی کی صرف وہ سادہ صورت اسلام میں جائز رکھی گئی ہے جس میں برابر کے دو کاموں یا دو برابر کے حقوق کے درمیان فیصلہ کرنا ہو مثلاً ایک چیز پر دو آدمیوں کا حق ہر حیثیت سے بالکل برابر ہے اور فیصلہ کرنے والے کے لیے ان میں سے کسی کو ترجیح دینے کی کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے اور خود ان دونوں میں سے بھی کوئی اپنا حق خود چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس صورت میں ان کی رضا مندی سے قرعہ اندازی پر فیصلہ کا مدار کیا جاسکتا ہے یا مثلاً دو کام یکساں درست ہیں اور عقلی حیثیت سے آدمی ان دو کے درمیان مذبذب ہو گیا ہے کہ ان میں سے کسی کو اختیار کرے۔ اس صورت میں ضرورت ہو تو قرعہ اندازی کی جاسکتی ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بالعموم ایسے مواقع پر یہ طریقہ اختیار کرتے تھے جبکہ وہ برابر کے مقدار کے درمیان ایک کو ترجیح دینے کی ضرورت پیش آتی اور آپ کو اندیشہ ہوتا تھا کہ اگر آپ خود ایک کو ترجیح دیں گے تو دوسرے کو محال ہو گا بلکہ

آخر میں فرمایا ہے ذاکم فسق یعنی یہ سب اللہ کے مقرر کیے ہوئے دین و ایمان کی خلاف ورزی ہے۔ ذاکم کا اشارہ ممکن ہے، انتقام بالا زام تک محدود ہو لیکن زیادہ قابل پذیرائی یہی ہے کہ ان سب چیزوں کی طرف ہے جن کی کفایت اور پُر پائی چکی ہے۔ رازمی اور قرطبی نے اسکی کوراج بتایا ہے۔ اور ذاکم اشارہ بعید یہاں ان کاموں کے بعد منزلات کو ظاہر کرنے کے لیے آیا ہے۔ یعنی یہ کام بُرائی میں بہت اور پچاسی تمام رکھتے ہیں۔ فسق کا لفظ یہاں عام قانونی معنی میں نہیں ہے بلکہ قرآنی مفہوم میں ہے۔ قرآن میں یہ لفظ مکمل برائی، نافرمانی، سرکشی، کفر و شرک سب کی تعبیر کے لیے آیا ہے۔ ابلیس کے بائے میں ہے فسق من امر ربہ۔ دراصل یہ لفظ یہاں تعمیری کے مقابلے پر آیا ہے۔ پچھلی آیت کو و اتقوا اللہ پر نعم فرمایا تھا اور اس کو ذاکم فسق پر نعم کیا۔ جس طرح حقیقی تقویٰ سے کفر و فسق کی خواہشوں کی طرف ذوق دہانے کی آڑ ایلوں پر بھی احکام الہی کا پورا پورا کنٹرول ہوئے۔ یہی حقیقی فسق ہے کہ احکام الہی کی پابندیوں سے الگ ہو کر انسان میں فحش اور اخلاقی آوارگی نہ جائے، تقویٰ اور فسق کو یہ تصور عام ذہنوں کو بُرا عجیب معلوم ہوگا مگر یہی عجوبہ پرین دراصل دین حق کا خاص وصف ہے جو دوسرے مذاہب سے ممتاز کرتا ہے۔ جانوروں کے حلال و حرام ہونے کے احکام میں فسق کی بعد اس لیے اختیار کی گئی کہ اسلام سے پہلے کھانے پینے میں مذہبی عقائد نہایت درجہ سخت اور تنگ سخت یہ اسلام کی خصوصیت ہے کہ اس نے بیجا قیدی بنادیں اور وہ ہم پرستی کے عنصر سے دین کو پاک کر دیا۔

کفر سے معاشرتی انقطاع

۶۸۔ مسلمانو جن لوگوں نے راہ کفر اختیار کی ہے وہ آج تمہارے دین کی طرف سے مایوس ہو چکے ہیں۔ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جبکہ زندگی کے ہر شعبہ میں اور علوم ہدایت کے برابر کے متعلق کفر و توہم اس طرح ہمارے ہر چکے تھے اور فروغ و جزئیات کا بیان بھی اتنی کافی تفصیل اور جامعیت سے کیا جا چکا تھا کہ پیر و ان اسلام کے لیے قیامت کا قاف زلزلہ الہی کے سوا کوئی قانون قابل التفات نہیں رہا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت سے ہزاروں سے متجاوز خدا پرست، جانناز اور مرفردش ہادیوں اور معلموں کی اس عظیم الشان جماعت تیار ہو چکی تھی جس کو قرآنی تعلیم کا محکمہ منورہ کھلا جاسکتا تھا، مکہ فتح ہو چکا تھا، صحابہ کرام کامل وفاداری کے ساتھ خدا سے عہد و پیمان پورے کر رہے تھے۔ نہایت گندی خدائیں اور

مردار کھانے والی قوم مادی اور روحانی حیيات کے ذائقے سے لذت اندوز ہو رہی تھی۔ شاعر المیہ کا ادب اور احترام قلب میں راسخ ہو چکا تھا۔ غنوں وادبام اور انصاف وازلام کا تادپود بکھر چکا تھا۔ شیعینان جزیرۃ العرب کی جانب سے ہمیشہ کے لیے مایوس کر دیا گیا تھا کہ دوبارہ وہاں اس کی پرستش ہو سکے۔ ان حالات میں ارشاد ہوا الیوم یشی الذین کفوا من دینکھ یعنی آج کفار اس بات سے مایوس ہو گئے کہ تم کو تمہارے دین سے ہٹا کر پھر انصاف وازلام و طیرہ کی طرف سے مایوس یا دین اسلام کو مغلوب کرنے کی توقعات باندھیں یا احکام دینہ میں کسی قسم کی تحریف و تبدیلی کی امید قائم کر سکیں۔ کافروں کو تمہارے دین کی طرف سے مایوسی ہو چکی ہے یعنی تمہارا دین ایک مستقل نظام بن چکا ہے اور خود اپنی حکمانہ طاقت کے ساتھ نافذ و قائم ہے۔ کفار جواب تک اس کے قیام میں مانع نہیں ہیں اب اس طرف سے مایوس ہو چکے ہیں کہ وہ اسے مناسکیں گے اور تمہیں پھر تکمیل جاہلیت کی طرف واپس لے جائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اب تک تو وہ اس طمع خام میں مبتلا ہے کہ وہ دین اسلام کو یا مغلوب کر لیں گے یا کچھ لو اور کچھ دے کے اصول پر کوئی ایسا ہجرت کر لیں گے کہ دونوں کا فائدہ ہو سکے لیکن اب ان کی اس طمع خام کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ اب انہوں نے عملی آنکھوں دیکھ لیا ہے کہ دونوں راہیں ایک دوسرے سے اس طرف الگ الگ ہو گئی ہیں کہ اب ان کا کسی نقطہ اتصال پر جمع ہونا ناممکن ہے۔ یہ بات وحیان میں ہے کہ کھانے پینے کی چیزوں کے اشتراک کو معاشرتی ارتباط میں بڑا دخل ہوتا ہے۔ اگر صورت حال یہ پیدا ہو جائے کہ ایک کے یہاں جو چیزیں حلال و طیب ہوں دوسرے کے یہاں وہ حرام اور نصیحت قرار دے دی جائیں تو اس کے منہ یہ ہونے کہ دونوں میں مکمل معاشرتی انفطاع کا اعلان ہو گیا۔ اب ان دونوں کے مل بیٹنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی ہے۔ قدرتی طور پر اس چیز نے ان کو اسلام اور مسلمانوں سے آخری درجہ میں مایوس کر دیا۔ آخری مایوسی سے بعض مرتبہ آخری جھلجھلاہٹ بھی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن یہ مریض کا آخری ہنسا لاہوتی ہے جس کے بعد آخری ہچکل کے سوا کوئی اور چیز باقی نہیں رہ جاتی۔

میرے سوا کسی سے نہ ڈرو

۱۹۔ لہذا ان سے نہ ڈرو مجھ سے ڈرو۔ یعنی آج تمہیں کامل و مکمل دین مل چکا ہے جس

میں کسی ترمیم کا آئندہ امکان نہیں ہے۔ خدا کا انعام تم پر پورا ہو چکا ہے جس کے بعد تمہاری جانب سے اس کے ضائع کر لینے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ خدا نے ابدی طور پر اسی دین اسلام کو تمہارے لیے پسند کیا ہے اس لیے اب کسی ناسخ کے آنے کا بھی احتمال نہیں ہے جیسے حالات میں تم کو کفار سے خوف کھانے کی ضرورت نہیں ہے وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ہیں۔ البتہ اس ضمن میں جو امور متعلقہ کی ناراضگی سے ہمیشہ ڈرتے رہو جس کے باعث تمہاری ساری سماج و فلاح اور کل سود و زبالت ہے۔ مگر بلا غشوش و غشوش میں اس پر مشغول فرمادیا کہ آئندہ مسلم قوم کو کفار سے اس وقت تک کوئی اندیشہ نہیں جب تک ان میں خشیت الہی اور تقویٰ کی شان موجود ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس دین کے احکام اور اس کی ہدایت پر عمل کرنے میں اب کسی کا فرطان کے غلبہ و تہر اور انداز و مزاحمت کا خطرہ تمہارے لیے باقی نہیں رہا ہے۔ انسانوں کے خوف کی اب کوئی وجہ نہیں رہی ہے۔ اب تمہیں خدا سے ڈرنا چاہیے کہ اس کے احکام کی تعمیل میں اگر کوئی کوتاہی کرے گی تو تمہارے پاس ایسا کوئی عقد نہ ہوگا جس کی بنا پر تمہارے ساتھ کچھ بھی نرمی کی جاتے اب شریعت کی خلاف ورزی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ تم دوسروں کے اثر سے مجبور ہو کر اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ تم خدا کی اطاعت کرنا چاہتے ہو لیکن یہ گویا وعدہ الہی ہے کہ اب تمہاری چیز کفار کا غلبہ نہیں بلکہ احکام شریعت سے تجاوز اور ان سے روگردانی ہے۔ یہی چیز اہل ایمان کو نقصان پہنچا سکتی ہے اور ان کے حق و جود کے لیے خطرہ کا باعث بن سکتی ہے۔ خشیت الہی ہی ایک ایسی چیز ہے جس کی کمی اہل ایمان میں ضعف پیدا کر سکتی ہے۔ مگر اہل کفر کی کوئی خارجی قوت۔ ان سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو۔ مطلب یہ ہے کہ اب ان کے دوبارہ غلبہ کا اندیشہ مت کرو۔ ہاں احکام الہی کی خلاف ورزی اور حدود اللہ کے توڑنے سے بچو اور اس سے ڈرو مگر اگر تم کو کوئی نقصان پہنچے گا تو اس وجہ سے پہنچے گا کہ تم اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کرو گے اور اگر تم اپنے عہد پر مضبوط ہو تو کفر کا خوف مت کرو۔ اس میں دین اسلام کے کمال غلبہ اور اسلامی حکومت کے دنیا میں پھیل جانے کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی دنیا میں تمہارا اس قدر غلبہ ہوگا کہ دنیا کی کوئی طاقت تم کو برباد نہ کر سکے گی، لیکن اگر تم احکام الہی کی پیروی نہ کرو گے تو یہ تمہارا تغافل تمہیں اس مقام تک پہنچا دے گا۔

لے افادت شیخ الاسلام محمد نعیم العزیز

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ کا ذکر جس کا قرآن بار بار ذکر کرتا ہے۔ امام واعظ نے اس خشیت کے معنی یہ بتاتے ہیں کہ اللہ کے خوف سے مراد وہ خوف ہے جس میں تعلیم کی آمیزش ہو۔ یعنی اس کی عزت اور محبت دل میں ہو، ظاہر ہے کہ محبوب چیز کا خوف یہ نہیں ہوتا کہ انسان اس سے بھاگتا ہے بلکہ خوف واقعی یہ ہے کہ کوئی بات درپیدا ہو جاتے کہ انسان اپنے محبوب سے دور ہو جائے یا کوئی امر اس کی ناراضگی کا انسان سے سرزد ہو جائے۔ لہذا خشیت اللہ کے معنی یہی ہیں کہ محدود اللہ کو توڑنے کا خوف ہو۔ اسی لیے قرآن میں خشیت اللہ کی نسبت علماء کی طرف کی ہے کیونکہ وہ محدود الہی کا علم رکھتے ہیں اور صفات الہی سے واقف ہوتے ہیں اور محدود اللہ کو توڑنے کی جرات نہیں کرتے اور اپنے عہد و میثاق پر قائم رہتے ہیں۔

تکمیل دین کا اعلان

۲۰۔ آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا۔ اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور تمہارے لیے میں نے دین اسلام پسند کر لیا۔ یعنی اس کے اخبار و قصص میں پوری سچائی، بیان میں پوری تاثیر اور قوانین و احکام میں پورا توسط و اعتدال موجود ہے جو حقائق کتب سابقہ اور دوسرے ادیان و مذاہب میں محدود و ناقص تھیں۔ ان کی تکمیل و تمہیم اس دین تم سے کر دی گئی ہے۔ قرآن و سنت نے علت و حرمت وغیرہ کے متعلق تنصیحا یا تعلیلاً جو احکام فیہ ان کا اظہار و ایضاح تو ہمیشہ ہوتا ہے مگر لیکن اضافہ و ترمیم کی گنجائش نہیں چھوڑی۔

سب سے بڑا احسان تو یہ ہے کہ اسلام جیسا مکمل اور ابدی قانون اور خاتم الانبیاء جیسا نئی تم کو مرحمت فرمایا۔ مزید برآں اطاعت و استقامت کی توفیق بخشی۔ روحانی غذاؤں اور دنیوی نعمتوں کا دسترخوان تمہارے لیے بچھادیا۔ حفاظت قرآن، غلبہ اسلام اور اصلاح عالم کے سامان مویا کر دیے لہذا اس کامل عالمگیر اور مکمل دین کے بعد اب کسی اور دین کا انتظار کرنا سنا بہت ہے اسلام جو تفویض و حلیم کا مراد ہے اس کے سوا مقبولیت اور سہولت کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے۔

اس آیت الیوم اکملت لکم دینکم کا نازل فرمانا بھی من جملہ نعمات عظیم ایک نعمت ہے۔ اسی لیے بعض یہود نے حضرت عمر سے عرض کیا کہ امیر المؤمنین اگر یہ آیت ہم پر نازل ہوتی تو ہم اس سے یوم نزل کو عید منیاد کرتے۔ حضرت عمر نے فرمایا کہ تجھے معلوم نہیں ہے کہ جس روز

یہ ہم پر نازل کی گئی مسلمانوں کی دو عیدیں جمع ہو گئی تھیں۔ یہ آیت سلسلہ میں حجۃ الوداع کے موقع پر عہد کے روز جمعہ کے دن عصر کے وقت نازل ہوئی جبکہ میدانِ عرفات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی کے گرد چالیس ہزار سے زائد اتقیا و ابرار کا مجمع کثیر تھا۔ اس کے بعد صرف ۸ روز حضور اس دنیا میں جلوہ افروز ہوئے۔

اس آیت میں تکمیلِ دین کا اعلان ہے۔ سورۃ بقرہ کی آیت ۱۲۸ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وفات کی مٹی کو ان کی نسل میں آمنت مسلّم پیدا ہو جاتے، پھر آیت ۱۵۰ دوسری مسجد میں فرمایا تھا کہ خدا چاہتا ہے کہ تم پر اپنی نعمت پوری کرے لہذا نعمتی علیکم یہاں فرمایا کہ آج کے دن خدا نے تمہارا دین کامل کر دیا اور خدا نے تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور آسمانوں پر اپنے تمام مقاصد و خواص کے ساتھ ظہور میں آگئی اور اللہ نے تمہارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کر لیا۔ یہاں تین باتیں ارشاد ہوئی ہیں۔

اول یہ کہ تمہارا دین کامل کر دیا

دوسرے یہ کہ اپنی نعمت تم پر پوری کر دی

تیسرے یہ کہ اسلام کو بطور دین اللہ نے تمہارے لیے پسند کر لیا۔

دین کو کامل کر دینے سے مراد اس کو ایک مستقل نظامِ فکر و عمل اور ایک ایسا مکمل نظامِ تہذیب و تمدن بنا دینا ہے جس میں زندگی کے مجمل مسائل کا جواب اصولاً یا تفصیلاً موجود ہو اور ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کے لیے کسی حال میں اس سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ایک ایسا دین ہے جو ہر جگہ انسان کے ساتھ ہوتا ہے اور جو قدم بھی اٹھانا چاہتا ہے اس کی ہدایت سامنے موجود پاتا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ ایک ایسا مکمل نظام ہے جو انسانی زندگی کے اقتصادی، فکری، اخلاقی اور عملی تمام پہلوؤں کو پوری طرح گھیرے ہوئے ہے۔ کچھ اسی طرح جس طرح ہوا کا کرہ اس زمین کو چاروں طرف سے اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے۔

ہم یہاں اس نظام سے اہم اجزاء کا ایک اجمالی خاکہ پیش کرتے ہیں تاکہ ایک طرف تو اس دعوے کا مکمل ثبوت بھی سامنے آجائے، دوسری طرف یہ بھی معلوم ہو جائے کہ دین سے کیا! لیکن قبل اس کے کہ کمالِ دین کا تعارف کرایا جائے دو تین اصول باتوں کو اچھی طرح ذہن نشین

کر لینا چاہیے۔

اول یہ کہ اس دین کا ہر جز ایک ہی مرکز سے وابستہ ہے ایک ہی مروج ہے جو ان سب کے اندر دوڑ رہی ہے یہ مرکز اور یہ مروج وہی انکار و عقائد ہیں جن کو قرآن ایمانیات کہتا ہے اور ان میں سے بھی خصوصیت کے ساتھ یہ عقیدہ کہ اللہ تعالیٰ ہی ہمارا تنها مبدع و اصل حاکم اور حقیقی قانون ساز ہے دراصل یہی بنیادی وہ جز ہے جس سے بالکل نظری انداز میں اس دنیا کا پورا نظام پائیدگی کیلئے چمکا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس دین کی کار فرمائی ایک ایسے معاشرے کے وجود پر موقوف ہے جو مسلم ہو جسے اللہ اور اس کی صفات پر گہرا یقین ہو جو آخرت پر سچا یقین رکھتا ہو اور جو محمد رسول اللہ کو دل سے اللہ کا نبی اور آخری نبی تسلیم کرتا ہو اس لیے اس دین کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اسے ایک ایسے ہی معاشرے کے ساتھ وابستہ کر کے دیکھا جائے۔ کم سے اسی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔

تیسری بات یہ کہ اس نظام کے مختلف حصے آپس میں مضبوطی کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں جس طرح مشین کے مختلف پرزے باہم جڑے ہوتے ہیں اس لیے نظری طور پر سمجھنے کے لیے تو انہیں الگ الگ قانون میں تقسیم کیا جاسکتا ہے مگر عملی طور پر ان کا علیحدہ علیحدہ وجود قریب قریب ناممکن ہے۔ اپنی کارکردگی کے اعتبار سے یہ سائے اجڑا دراصل ایک وحدت میں ان میں کا کوئی جز اپنا عملی جوہر اسی وقت دکھاسکتا ہے جب یہ پورا دین کل کا کل حرکت میں ہو جیسا کہ دیکھ کر اضافت اسی بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

ان اصولی باتوں کو ذہن نشین کر لینے کے بعد آئیے اب کمال دین کا اجمالی مطالعہ کریں اسلام صرف انفرادی زندگی تک محدود نہیں یعنی یہ اس طرح کا دین نہیں کہ بندے اور خدا کے درمیان کا بس ایک سنجی معاملہ ہو، اگر ایسا ہوتا تو اس کی تعلیمات لازماً انفرادی زندگی کے مسائل تک محدود ہوتیں۔ وہ صرف مسجد کی باتیں کرتا، نماز روزے کا حکم دیتا۔ چند اخلاقیات کی تلقین کر دیتا کچھ معاشرتی بدلتیں مٹے دیتا اور پھر خاموش ہو رہتا۔ مگر قرآن و سنت کا صفحہ صفحہ گواہی دے رہا ہے کہ صورت واقعہ یہ نہیں ہے اسلام کی سند ارشاد عبادت گاہوں اور زندگی کے انفرادی دائروں میں ہی پکھی ہوئی نہیں ہے بلکہ وہ بازاروں، کاروباری اداروں، معاشی میدانوں، تمدن کے دائروں میں، سیاست اور حکومت کے ایوانوں غرض زندگی کے ایک ایک شعبے میں جڑائیں دیتا۔ کچھ باتوں سے روکتا اور کچھ باتوں کا ام کرتا نظر آتا ہے۔ ان میں سے کوئی بات بھی

ایسی نہیں جس کو وہ دین نہ کہتا ہو۔ مثلاً قرآن حکم دیتا ہے کہ زانی کو سو کوڑے مارو، اس کا یہ حکم ہر ایک طور پر ایک راسخ حکم ہے۔ جس کا تعلق پولیس اور عدالت ہے۔ اور اس لیے وہ ہر جہتہ اجتماعی زندگی کا معاملہ ہے لیکن اس آئمہ یا شیت وہ خود دین اللہ کی قرار دیتا ہے۔ ولا تاخذکم بعساکرہا فہ فی دین اللہ۔

اسی طرح قرآن کہتا ہے کہ سال کے چار مہینے حرمت والے ہیں، ان میں جنگ کرنا ہائز نہیں ہے۔ قرآن کی یہ ہدایت واضح طور پر جنگی قوانین سے تعلق رکھتی ہے، اور ہر شخص ہانتا ہے کہ جنگ اجتماعی زندگی کے بالکل آخری مسائل میں سے ہے لیکن قرآن اسے بھی دینِ قہم قرار دیتا ہے ذالک الدین العیم۔

یہ چند مثالیں اس حقیقت کو کھول دینے کے لیے بالکل کافی ہیں کہ اللہ کا ہر فرمان اور اس کے رسول کا ہر ارشاد اسلام کا حصہ اور دین کا جز ہے۔

دین کے کامل کر لینے کا یہاں یہ مطلب نہیں ہے کہ دوسرے تمام دینوں کو جواز آدم تا عیسیٰ علیہم السلام چلے آئے ہوتے ان کو ناقص کہا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ وہ جن لوگوں کی ہدایت کے لیے آئے تھے ان کی ہدایت کا ان کے اندر پورا سامان نہیں تھا۔ ایسا سمجھنا بالکل غلط ہوگا اس کے برخلاف حقیقت واقعہ یہ ہے کہ ان ادیان میں سے جو دین بھی آیا وہ اس قوم، اس زمانے اور اس علاقے کی اصلاح کے لیے بالکل کافی تھا جس کے لیے اسے نازل کرنے والے نے نازل کیا تھا۔ لیکن چونکہ ان میں کا ہر دین صرف ایک قوم کے لیے تھا۔ تمام انسانوں کے لیے نہ تھا۔ صرف ایک محدود علاقے کے لیے تھا پوری دنیا کے لیے نہ تھا صرف ایک خاص زمانے اور محدود مدت کے لیے تھا۔ ہمیشہ کے لیے نہ تھا اس لیے قدرتی طور پر اس میں نہ عالمی معاملات و مسائل کے بارے میں ہدایتیں ہوتی تھیں۔ نہ اس کی ساری تعلیمات کا مزاج بین الانسانی ہوتا تھا نہ وہ دور مستقبل کے مسائل کو سامنے رکھ کر گفتگو کرتا تھا۔ غرض جس طرح اس کی غنابلت کا دائرہ محدود تھا۔ اسی طرح اس کی تعلیمات کا مجموعہ بھی مختصر اور محدود تھا لیکن جب اللہ تعالیٰ کی مشیت اور حکمت کا فیصلہ ہوا کہ اب ایسا نبی رواذ کیا جاسے جو سب کے لیے ہو اور ہمیشہ کے لیے ہو تو اس لیے اعلیٰ کا فطری تقنا تھا کہ اس نبی پر نازل ہونے والے دین کا مزاج، بین الاقوامی ہو اور اس کی تعلیمات ہر زمانے ہر ملک اور ہر طرح کے انسانی مسائل پر عادی ہوں۔ قرآن حکیم کی یہ گراہی قدر آیت اسی فطری تقاضے کی تکمیل کا اعلان کر رہی ہے۔ اس کا منشا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ

کی جو ہدایت آدم علیہ السلام کے زمانے سے آخری شروع ہوئی تھی اور جو نوح انسانی کے ذہن اور قدنی اور تقدس کے ساتھ تفصیل اور دست کار نگاہ اختیار کرتی چلی آ رہی تھی۔ وہ آج ہر پہلو سے کمال کے پے کو پہنچ گئی ہے اور اب ایک مکمل نظام ہے جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ اس میں روحانی نظام، اخلاقی نظام، عائلی نظام، معاشرتی نظام، معاشی نظام، سیاسی نظام اور قانونی نظام کامل اور مکمل ہے۔

اکمالِ دین کے فطری تقاضے

دوسرے دینوں کے مقابلے میں اسلام کی اس امتیازی حیثیت کو نگاہ میں لکھیے اور پھر اس بات پر غور کیجئے کہ اکمالِ دین کے لازمی تقاضے کیا ہو سکتے ہیں۔ کیا یہ کہ اس امتیاز کے باوجود اس جوت کا بھی مرتبہ و مقام ہر پہلو سے ٹھیک دہی ہو گا جو دوسری نبوتوں کا ہے اور کیا اسلام کا حق بھی دیا ہو گا جیسا کہ دوسرے دینوں کا ہے۔ اس سوال کے جواب میں عقل و انصاف اور قرآن و حدیث ہر ایک کا فیصلہ صاف نفی میں ہے۔ ان کے نزدیک اکمالِ دین کے فطری تقاضے لازماً بالکل دوسرے ہوں گے۔

۱۔ اکمالِ دین کا پہلا فطری اور لازمی تقاضا تو یہ ہے کہ دوسرے تمام ادیان منسوخ ہو چکے ہیں اور اب اللہ تعالیٰ کے نزدیک منظور شدہ دین صرف اسلام ہے۔ ضروری ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے اور ہر قوم، ہر ملک اور ہر زمانے کا انسان اسی کی پیروی کرے کیونکہ جب دین ساری دنیا کا دین اور اس کا لائے والا پیغمبر پوری نوح انسانی کا پیغمبر قرار دیا گیا ہے تو اب کسی اور دین اور پیغمبر کا زمانہ باقی نہیں رہ سکتا۔ رسولِ تو اب بھی اس لیے ہے کہ جن لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہے وہ اسے اللہ کا رسول تسلیم کریں اور اس کی غیر مشروط پیروی کریں۔ یہ ایک مسلمہ اصولی حقیقت ہے کہ

ما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ۔

حضرت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں یہ مسلمہ اصول حقیقت محض ہے معنی الفاظ نہ رہ جائے گی۔ کوئی وجہ نہیں کہ یہاں بھی اس اصول کا اسی طرح اطلاق نہ ہو جس طرح کہ دوسرے تمام انبیاء کے سلسلے میں ہوتا ہے۔ اس لیے آپ کا سائے انسانوں کی طرف ہموٹ ہوا اور پھر آخری رسول ہونا اور دین کامل کے کرنا اس بات کا کھلتا تقاضا کرتا ہے کہ ہر انسان اور ہر زمانے کا انسان آپ پر ایمان لائے اور آپ کے لائے ہوئے کامل دین کو اپنا دین مان کر لازماً اسی کی پیروی

کرے اگر کوئی شخص آپ کی نبوت کو نہیں مانتا اور آپ کے لائے ہوئے دین کا مصلحہ اپنی گردن میں نہیں ڈالتا تو یہ آپ کے نبی ہونے پر اس قدر اذیت لگائے کہ ان کے عقیدے بجاوت ہے جس نے آپ کو پروردی دنیا کا پادری اور آخری نبی بنا کر بھیجا ہے۔

اس کے علاوہ جب قرآن کے سوا اب دوسری کوئی ایک کتاب بھی ایسی نہیں رہ گئی ہے جو پروردی طرح محفوظ ہو اور جس کی اصل زبان دنیا کی مردہ زبانوں میں شامل نہ ہو چکی ہو تو دوسری کتابوں اور شریعتوں کی ٹھیکسب پیروی ممکن بھی کیسے ہو سکتی ہے۔ یہ صورت حال تو گویا خود ان کتابوں اور شریعتوں کا اقرار ہی بیان ہے کہ اب جملہ ازمان ختم ہو گیا ہے۔

کمال دین کا دوسرا فطری اور لازمی تقاضا یہ ہے کہ ان کے ذات اگر جامع الکملات ہے تو ضروری ہے کہ جو جامع الکملات کا نمائندہ ہو وہ بھی جامع الکملات ہو۔ کمال علمی کلمہ تک قرآن حکیم ایک جامع کتاب ہے تو قرآن کے نقش کو بھی مجمع ہونا چاہیے۔ تاکہ منور کو مکمل منور اور عمل کو نقش قرآن کہنا جائز ہو۔ بنانا یہ چاہتا ہوں کہ اگر دین کامل ہے تو جزوات کامل دین لے کر آئی ہے ضروری ہے کہ وہ ہم کو علمت کا منور ہو۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کا جملہ دیکھنا ہو اور کمال علمیت کا اہل کی مائش کا اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو چاہیں تو مختصر آئیں سمجھتے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم خواہ خدمت میں ہوں یا جلوت میں، مسجد میں ہوں یا میدان جہاد میں، فنا و نشاۃ میں، معبود ہوں یا فرجوں کی درستی میں، منبر پر ہوں یا گوشہ تنہائی میں۔ ہر وقت اور ہر شخص کو حکم تھا کہ جو کچھ میری حالت اور کیفیت ہو وہ سب منظر عام پر لائی جاتے۔ ازواج مطہرات آپ کے خلوت خانوں کے حالات سنانے اور بتانے میں مصروف رہیں۔ مسجد نبوی میں ایک چوہترہ ان عقیدت مندوں کے لیے تھا جن کے پیسے کو گھر نہ تھے۔ وہ باری باری دن کو جنگل سے ٹکڑیاں کاٹ کر لاتے۔ در اس سے روزی حاصل کرتے اور سارا وقت آپ کے ارشادات سنتے آپ کے حالات دیکھتے تو آپ کی معیت میں گزارنے کے لیے صرف کرتے تھے۔ ان کی تعداد ستر کے قریب تھی، ان ہی میں حضرت ابو ہریرہ ہیں جن سے زیادہ کسی صحابی کی روایات نہیں ہیں۔ یہ ستر بستیاں مستعد ہا سوسوں کی طرح شب و روز ذوق و شوق کے ساتھ آپ کے حالات دیکھتے اور دوسروں سے ان کے بیان کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ دن میں پانچ وقت ہیز میں بیٹھنے والی تمام پادری دس برس تک مستقل آپ کی ایک ایک حرکت و سکران ایک ایک جوش کو دیکھتی رہی۔ غزوات اور لڑائیوں کے موقع پر ہزار ہا صحابہ کو شب و روز آپ کے دیکھنے اور آپ کے

حالات مبارک سے واقف ہونے کا موقع ملتا تھا۔ غزوہ فتح مکہ میں دس ہزار جنوں میں تیس ہزار اور
جہۃ الارواح میں تقریباً ایک لاکھ صحابہ کو آپ کی زیارت کا موقع ملا تھا۔ اور غلوت و جلوت گمراہ برص
اور مسجدِ حلقہ تعلیم اور میدانِ جنگ تک میں جس نے جس حال میں آپ کو دیکھا، اس کی عام اشاعت
کی ذمہ داری اس کو اہانت بلکہ حکم اور تاکید تھی۔ اب آپ کچھ کہتے ہیں کہ آپ کی زندگی کا کون سا پہلو ہر
جو زیرِ پردہ رہا، ہر گاہ اور اس پر بھی ایک شخص تک آپ پر غزوہ گیری ذکر نہ کیا۔ آج بھی آپ کے دشمن
اور مخالف پروردی چھان بین اور تلاش و جستجو کے بعد آپ پر کوئی حرف گیری نہ کر سکے تو اب ایسی
زندگی کو کامل زندگی کہنا زیادہ ہے یا ان زندگیوں کو جن کا بڑا حصہ ہماری نگاہوں سے اوجھل اور پوشیدہ
ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ السلام کی زندگی کا کوئی پہلو تاریک نہیں رہا ہے
اور ناقص، بلکہ آپ کی زندگی ہر پہلو سے اپنے اندر کمال ہی کمال رکھتی ہے۔
باسورۃ سمۃ کی یہ شہادت پیش کرنے کے لائق ہے۔

یہاں پڑے دن کی روشنی ہے جو ہر چیز پر پڑ رہی ہے اور ہر ایک تک وہ
پہنچ سکتی ہے۔ شخصیت کی تاریک گہرائیاں اور حقیقت اور ہماری پہنچ کے خط سے
باہر وہ ہمیشہ رہی گی لیکن ہم محمد کی میراث کی تاریخ کی ہر چیز کو جانتے ہیں۔ ان کی جوانی،
ان کا ظہور، ان کے تعلقات، ان کے عادات، ان کا پہلا تخیل اور تدریجی ترقی ان کی
عظیم الشان وحی کا ثبوت، نبوتِ آنا، اور ان کی اندرونی تاریخ کے لیے اس کے
بعد ان کے مشن کا اعلان کیا جا چکا۔ ہم ایک کتاب قرآن رکھتے ہیں جو ان کی اصلیت
میں اپنے محفوظ ہونے میں اپنے مضامین کی بے حرجی میں بالکل کھتا ہے لیکن اس کی
جوہری صداقت کوئی شخص کبھی سجدہ شک نہ کر سکا۔ اگر کوئی کتاب ہم ایسی
رکھتے ہیں جو اپنے زمانے کے ماسٹر اسپرٹ کا آئینہ ہو تو یہ کتاب ہے جو ان کے
بناوٹ سے پاک غیر مرتب تصانیف والی لیکن پندِ عظیم الشان خیالات سے معمور
ایک دماغ جو اس روحانیت سے برتر جو اس کے اندر بند ہے خدا کے نشہ میں
مست و مرشار لیکن انسانی کمزوریوں کے ساتھ جن سے پاک ہونے کا کبھی انہوں
نے دعویٰ نہیں کیا۔

اور مشہور مودعہ گہن کے الفاظ میں

کسی ابتدائی پیغمبر نے کبھی صداقت کا کوئی ایسا سخت امتحان پاس نہیں

کیا جیسا کہ محمد نے۔ جب کہ آپ نے پہلے پہل اپنے کو یثیث پیغمبر کے ان لوگوں کے سامنے پیش کیا جو اس کی کز و دروں سے یثیثیت ایک انسان ہونے کے واقف تھے وہ لوگ جو اس سے سب سے زیادہ واقف تھے ان کی بیوی، ان کا غلام، ان کا چچا زاد بھائی اور ان کا سب پرانا دوست جس نے جیسا کہ محمد نے طرہ کیا ہے کہ اس کے پیروں میں ایک ہے۔ جس نے دہشت پھیری اور ڈنگھرایا۔ یہی لوگ اس کے سب سے پہلے معتقد ہوئے۔ یہ پیغمبروں کی عام قسمت محمد کے حق میں بالکل الٹ تھی۔

ان شہداء و قریب کا مطلب یہ ہے کہ جو جس قدر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سے باخبر اور واقف تھا۔ اسی قدر زیادہ ان کا عقیدت مند تھا۔ عام پیغمبروں کا یہ اصول رہا ہے کہ پہلے ان کو واقفوں نے مانا ہے، اس کے بعد گھر والوں کی باری آئی ہے مگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ آپ کو سب سے پہلے انہوں نے مانا جو آپ کے اخلاق، عادات اور معاملات سے زیادہ واقف تھے اور ان میں سے ہر ایک نے اپنے ایمان و اعتقاد کا شدید خطرناک امتحان دیا ہے۔ حضرت خدیجہ الکبریٰ تین برس تک آپ کے ساتھ شعب الی طالب میں مصروف رہیں، جس میں بھوک اور فقر و فاقہ سے دوچار ہونا پڑا۔ حضرت ابو بکر صدیق نے اس وقت جب ہر چار طرف دشمن تعاقب میں تھے۔ رات کی تاریکی میں آپ کے ساتھ خطرناک رفاقت کا حق ادا کیا۔ حضرت علی نے اس بستر پر قدم رکھا جو صبح کو مقتل بننے والا تھا۔ حضرت زید غلام خاص وہ تھے جو پتہ پٹنے پر بھی اپنے باپ کے اصرار کے باوجود آپ سے جدا نہ ہوئے۔

گادفری نیگیس، پالوجی فارم میں کہتا ہے :

جیسا کہ اس کو یاد رکھیں تو اچھا ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام نے وہ نشہ آپ کے پیروؤں میں پیدا کر دیا تھا جس کو صلیبی کے ابتدائی پیروؤں میں تلاش کرنا بے سود ہے۔ جب صلیبی کو شولی پرے گئے تو ان کے پیروکار بھاگ گئے۔ ان کا نشہ دینی جاتا رہا اور اپنے معتدا کو موت کے پنجے میں گرفتار چھوڑ کر مل جیے برعکس اس کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرو اپنے مظلوم پیغمبر کے گرو جمع ہوئے اور آپ کے بچاؤ میں اپنی جانیں خطرہ میں ڈال کر کل دشمنوں پر اس کو غالب کر دیا۔

یہ جان نثاری ان میں تھی جو آپ کو ہر طرح اور ہر حیثیت سے ہانتے تھے کیا ایسے شخص کے ساتھ جس کی زندگی اس کے ساتھیوں اور رفیقوں میں کامل نہ ہو اس لائق ہر کشتی ہے کہ اس پر

وہ ہائیں قربان کریں۔

اسی کمال کی بنا پر قرآن نے آپ کی زندگی کو کامل ترین نمونہ بنایا ہے اور اس کی پیروی کر خدا کی محبت کا ذریعہ بنایا ہے۔

ان كنتم تحبون الله فاتبعوا في يحببكم الله

آپ کی اتباع یعنی صحیح الہکامات کی زندگی کی نقل کو خدا کی محبت کا وسیع قرار دیا۔ قرآن کی نگاہ میں آپ کی حیات ایک مسلمان کے لیے کامل نمونہ ہے۔ اسی لیے ضروری ہے کہ اس نمونے کے سائے پہلو سب کے سامنے ہونے چاہئیں اور وہ سب کے سامنے ہیں، اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کی زندگی کے سلسلے کی کوئی سُرکڑی کم نہیں ہے کوئی واقعہ زبرد پروردہ نہیں ہے۔ جو کچھ ہے وہ تاریخ کے صفحات میں آئینہ ہے۔ اور یہی ایک ذریعہ کسی زندگی کے کامل معصوم اور بے گناہ یقین کرنے کا ہے نیز ایسے ہی زندگی جس کے ہر پہلو اس طرح روشن ہوں انسانوں کے لیے نور کا کام لے سکتی ہے۔

دنیا میں اہل، امیر، ہندوستان و چین، مصر و شام اور یونان و روم میں بڑے بڑے تمدن پیدا ہوئے۔ اخلاق کے بڑے بڑے نظریے قائم کیے گئے۔ تہذیب و شائستگی کے بڑے بڑے اصول بنائے گئے، اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، لٹنے چلنے، پہننے اور چھنے، رہنے سمیٹنے، سونے ہانگنے، شادی بیاہ، مرنے بیٹھنے، غم و مسرت، دعوت و ملاقات، مصافحہ و سلام، جنس و طہارت، عبادت و تعزیت، تبریک و تحفیت، دفن و کفن کے رسوم و آداب، شرائط اور ہدایات مرتب ہوئے اور ان سے ان قوموں کی تہذیب و تمدن اور معاشرت کے اصول بنائے گئے۔ یہ اصول صد ہا سال میں بنے۔ پھر بھی بگڑ گئے، صدیوں میں ان کی تعمیر بنی تاہم وہ فنا ہو گئے۔ لیکن اسلام کا یہ تمدن چند برسوں میں بنا اور تعمیر ہوا اور ۱۴ سو برس سے کل روئے زمین کی سینکڑوں مختلف اقوام میں کیسانی کے ساتھ قائم ہے، کیونکہ اس کا ماخذ ایک ہے اور وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے۔ اس زندگی کے آئینے میں صحابہ نے اپنی زندگیوں بھجائی ہیں اور ان کا عکس تابعین نے اتارا اور اس طرح وہ تمام دنیا کے اسلام کا عمل اور رسم بن گئی۔ وہ مقدس زندگی مرکز بنی، قطع تھی، صحابہ نے اس کو غلط اور بعد کی نسلیوں نے اسے دائرہ بنا دیا۔ وہ تمدن اگرچہ آج کل نہیں مگر اس کے نقش قدم آج بھی ہیں اور اسی پر کل مسلمان عمل کر رہے ہیں۔ ایک محمد رسول اللہ کی زندگی تھی جو سائے صحابہ کی زندگی بن گئی اور وہی کبھی دنیا کے اسلام

کی زندگی تھی۔ افریقہ یا ہندوستان کا کوئی قبیلہ آج جب عیسائی ہوتا ہے تو اس کو مذہب اگرچہ انجیل سے ملتا ہے لیکن تمدن و تہذیب اور عملی زندگی کا سبق یورپ کے ساتھ تمدن سے سکھایا جاتا ہے لیکن وحشی سے وحشی قبیلہ جو مسلمان ہوتا ہے اس کو جہاں سے روحانی نظام ملتا ہے، وہیں سے تمدن و تہذیب اور شائستگی کا سبق بھی ملتا ہے۔ مسلمان ہونے کے ساتھ حضورِ مقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی انسانی ضروریات اور حالات کے ساتھ اس کے سامنے آجاتی ہے اور یہ برقی چالکتی، جیتی جاگتی تصویر ہر مسلمان کی زندگی کی ہر حالت اور ہر کیفیت کا آئینہ بن جاتی ہے۔ گویا سیرتِ محمدیؐ دنیا کا آئینہ خازن ہے جس میں دیکھ کر ہر شخص اپنے جسم و روح، ظاہر و باطن، قول و عمل، زبان و دل، آداب و رسوم، طور و طریق کی اصلاح کر سکتا ہے اور اسی لیے مسلمان اپنی شائستگی اور ادب و اخلاق کے لیے محمد رسول اللہؐ سے باہر اوپر کی سیرت سے الگ کوئی چیز نہیں مانگتی۔ اور ناس کو اس کی ضرورت ہے۔ سیرتِ محمدیؐ دنیا کے اسلام کا عالمگیر آئینہ ہے اسی کے مقابلے سے حسن و قبح اور نیکی و بدی کا ناس پر کھلتا ہے۔ اور چونکہ کوئی انسانی کامل زندگی اس استیحاب و استقصاء کے دنیا کے سامنے موجود نہیں ہے اس لیے تمام انسانوں کے لیے بھی ایک کامل نمونہ ہے اور ایسی ہی کامل اور بے پردہ زندگی انسانوں کے لیے قابلِ نمونہ ہو سکتی ہے۔ بہر حال دین کو مکمل کرنے سے مقصود اس کو ایک مستقل نظام و فکر اور ایک ایسا مستقل نظام تہذیب و تمدن بنادینا ہے جس میں زندگی کے جملہ مسائل کا جواب اصولاً یا تعلیلاً موجود ہو اور ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کے لیے کسی حال میں اس باہر جانے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

کمال دین اور ختم نبوت

کمال دین اور ختم نبوت لازم و ملزوم ہیں یعنی جیسے آپ کی نبوت عالمگیر ہے اسی طرح ہمیشہ کے لیے بھی ہے۔ آپ کے ساتھ وحی و رسالت کا سلسلہ اپنی آخری حد کو پہنچ گیا اور قیامت تک اب کوئی رسول نہیں آئے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وکن رسول اللہ و خاتم النبیین خاتم مہر کو کہتے ہیں۔ جب کسی نصاب یا مادہ پر پھر نگاہی جاتی ہے تو اس کے بعد اس میں کوئی

چیز نہیں ڈال جاسکتی یا کسی اور بات کا اضافہ نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ یوں کیسے کہ اس طرح کسی کی بات کا عمل اسکان بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے سارا انبیاء کا خاتم فرمایا جانا اس حقیقت کا نہایت یلغ انداز میں اعلان ہے کہ اب دین کامل پہنچا ہے اور یہ آخری رسول قیامت تک کے لیے ہمارا پیام لے کر آچکا ہے۔ اس کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اس کی اہمیت کو جس علمی انداز میں علامہ اقبال نے اپنی معرکہ انارکتاب تشکیل جدید الہیات میں پیش کیا ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے۔

اس نقطہ خیال سے دیکھا جائے تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم دنیائے قدیم اور دنیائے جدید کے درمیان بطور جد فاصل کھڑے دکھائی دیں گے۔ اگر یہ دیکھا جائے کہ آپ کی وحی کا سرچشمہ کیا ہے تو آپ دنیائے قدیم سے متعلق نظر آئیں گے۔ لیکن اگر اس حقیقت پر نظر کی جائے کہ آپ کی وحی کی روح کیا ہے؛ تو جناب کی ذات گرامی دنیائے جدید سے متعلق نظر آئے گی۔ آپ کی بدولت زندگی نے علم کے ان سرچشموں کا سراغ پالیا جن کی اسے اپنی شاہراہوں کے لیے ضرورت تھی، اسلام کا ظہور استغراقی علم کا ظہور ہے۔ اسلام میں نبوت اپنی تکمیل کو پہنچ گئی اور اس تکمیل سے اس نے خود اپنی فاسحیت کی ضرورت کو بے نقاب دیکھ لیا۔ اس میں یہ لطیف نکتہ پنہاں ہے کہ زندگی کو ہمیشہ عمدہ طفولیت کی حالت میں نہیں دیکھا جاسکتا ہے۔ اسلام نے دینی پیشوائی اور ورانہی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا۔ قرآن حکیم خورد و فکر اور سہارت و مشاہدات پر بار بار زور دیتا ہے اور تاریخ و فطرت دونوں کو علم انسانیت کے ذرائع ٹھہراتا ہے۔ یہ سب اسی مقصد کے گوشے میں جو ختم نبوت کی تہ میں پوشیدہ ہے، پھر عقیدہ ختم نبوت کی ایک بڑی اہمیت یہ بھی ہے کہ اس سے لوگوں کے باطنی واردات کے متعلق ایک آزادانہ اور ناقواز طرز عمل قائم ہوتا ہے اس لیے ختم نبوت کے معنی یہ ہیں کہ اب نوع انسانی کی تاریخ میں کوئی شخص اس امر کا مدعی نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی مافوق الفطرت اختیار کی بنا پر دوسروں کو اپنی طاعت پر مجبور کرے۔

اتمام نعمت کیا ہے؟

اتمام نعمت کا جلد دوم آیت ۱۵۰ میں لانسہ نعتی عیبکم میں وعدہ کیا گیا تھا، یہاں

اس کو پورا کیا جا رہا ہے۔ اقامتِ نعمت سے یہاں مراد یہی ہے کہ اُمت ہر جگہ ہر خوف اور ہر پروا کی غفلت سے محفوظ ہو کر پوری طرح اسلامی تقدن، اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے گی اور ان کو یہ طاقت بھی نصیب ہو جائے گی کہ وہ دیوبندی متعصب امامت کے تقاضے پورے کر سکے۔ کفر کا غلبہ اہل ایمان کے لیے سب سے بڑی مصیبت تھا جسے قرآن فتنہ کہتا ہے۔ اس فتنہ سے خلاصی پا کر جب ان کو دلائل اسلام میں تہذیب کا لایا ہوا علم و عمل بلا کم و کاست نافذ ہو گیا اور اس کے ساتھ ان کو وہ ذرائع بھی مل گئے جن سے وہ اللہ کی زمین پر کفر و فسق کی جگر ریاں و فتویٰ کو ہار کر کیس کیوں تو یہ ان پر اللہ کی نعمت کا اتمام ہوا۔ اس آیت میں جس وعدہ کے پورا ہونے کی بشارت دی جا چکی ہے وہ وعدہ اُمت سے وراثت کی وجہ سے کیا گیا تھا اور سورۃ فتح میں بھی وعدہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے اصالتاً ہوا تھا ویتہ نعمۃ علیہ۔ دوسرے شارحین قرآن نے یہاں اقامتِ نعمت سے نعمتِ ہدایت کی تکمیل مراد لی ہے۔ مولانا دریا بادی فرماتے ہیں کہ اقامتِ نعمت دین کی تکمیل سے ہوا مولانا اصلاحی فرماتے ہیں اقامتِ نعمت سے مراد اس آخری شریعت کا اتمام ہے۔ اور مولانا سو ودی فرماتے ہیں کہ نعمتِ تمام کرنے سے مراد نعمتِ ہدایت کی تکمیل کر دینا ہے۔ لیکن مفتی محمد شفیع نے عام شاہراہ سے ہٹ کر یہ بات اچھی لکھی ہے کہ۔ اقامتِ نعمت سے مراد مسلمانوں کا غلبہ اور دج اور ان کے مخالفین کا مغلوب و مغترب ہونا ہے جس کا ظہور فتحِ مکہ سے موقع پر ہوا۔ یہاں الفاظِ قرآن میں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ دین کے لیے نفع اکمال اور نعمت کے لیے نفع اقامت لگایا ہے، دونوں میں فرق ہے۔ امام رافضی فرماتے ہیں کہ کسی چیز کا اکمال یہ ہے کہ اس چیز سے جو غرض تھی وہ پوری ہو گئی اور اقامت کے معنی یہ ہیں کہ اب دوسری چیز کی ضرورت نہیں۔ اس لیے اکمال کا حاصل یہ ہوا کہ قانونِ الہی اور احکامِ دین کے اس دُنیا میں دواثر کرنے کا جو مقصد تھا وہ آج پورا کر دیا گیا اور اقامتِ نعمت کا مطلب یہ ہے کہ اب مسلمان کسی کا محتاج نہیں ہے۔ ان کو اللہ بھانسنے غلبہ قوت اور اقتدار عطا فرمایا ہے جس کے ذریعے وہ اس دینِ حق کے احکام کو جاری اور نافذ کر سکیں گے۔ یہاں حافظ ابن العیثم نے یہ بات بڑی لطیف لکھی ہے کہ اس آیت میں دین کی نسبت مسلمانوں کی طرف کی گئی ہے اور نعمت کی نسبت خود اپنی طرف کی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ دین کا ظہور اہل ایمان کے افعال و اعمال کے ذریعہ ہوتا ہے اور نعمت کی تکمیل براہِ راست اللہ بھاننا کی جانب سے ہے۔

اسلام اللہ کا منظور کردہ دین ہے

اسلام کو بطور دین اللہ نے پسند کر لیا۔ اصل ارشاد میں رحیمیت لکھ کر اسلام دینا آیا ہے یہاں یہ گمان کرنا کسی طرح صحیح نہ ہو گا کہ اس آیت میں اسلام سے مراد عام مفہوم کا اسلام ہے نہ کہ خصوصی اصطلاحی اسلام، اس لیے اس سے مراد ہر آسمانی مذہب کی پیروی ہو سکتی ہے۔ اس گمان کی بنا پر اس لیے کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اس آیت میں لفظ الاسلام استعمال کیا گیا ہے نہ کہ مطلق اسلام اور جیسا کہ عربی زبان کے اصول کا تقاضا ہے کہ قرآن جب الاسلام بولتا ہے تو اس وقت اس کے سامنے اسلام کا محض نفوی یا عام مفہوم نہیں ہوتا بلکہ اصطلاحی مفہوم ہی ہوتا ہے۔ لیکن اگر اس بات سے اتفاق نہ کیا جائے پھر بھی اوپر کے استدلال پر کوئی اثر نہیں پڑتا حقیقت پھر بھی وہی سب کی جو بیان کی گئی۔ کیونکہ اس صودت میں آیت کا مفہوم بھی ہو گا کہ اللہ کے نزدیک صحیح مقبول طریق بندگی یہ ہے کہ اس کی کامل اطاعت کی جائے۔ اور اپنے آپ کو پوری طرح اس کے حوالہ کر دیا جائے۔ غرض مانیں کیا اس مفہوم دینے کا حاصل اور عملی نتیجہ کچھ اور ہو گا جیتنا نہیں۔ کیونکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عالمی پیغمبر کی حیثیت سے آجائے کے اللہ کی کامل اطاعت کی اور اپنے آپ کو پوری طرح حوالہ کر دینے کی کوئی صورت اس کے سوا باقی نہیں رہ جاتی ہے کہ آپ پر ایمان لایا جائے اور آپ ہی کی پیروی کی جائے۔ کیونکہ قرآن و احکام کے ساتھ یہ اعلان کر چکا ہے کہ یہ رسالت ساری دنیا کے لیے ہے اور ہمیشہ کے لیے ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس رسالت پر ایمان نہیں لاتا یا آپ کو سہار نہیں ماننے کے باوجود آپ ہی کی پیروی کا راستہ اختیار نہیں کرتا تو یہ اللہ کی کامل اطاعت نہیں بلکہ اپنے نفس کی کامل اطاعت ہوگی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مکمل برتری نافذاتی ٹھہرے گی۔

اس بات کا ثبوت کہ اسلام ہی کی پیروی ضروری ہے۔ خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل میں موجود ہے اور ایسا ثبوت موجود ہے جس کے آگے جھک پڑنے سے صرف نا انصافی اور خود پرستی ہی روک سکتی ہے۔ اگر یہ بات بھی قرآن کے نزدیک صحیح ہوتی کہ سائے دین پچھے ہیں اور ہر رسول کی پیروی یکساں طور پر حق ہے تو اس کا بالکل منطقی تقاضا یہ تھا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم یہود و نصاریٰ کو اسلام لانے کی دعوت دیتے، کیونکہ وہ خود صاحب کتاب تھے۔ اگر دعوت دیتے بھی تو کم از کم اسلام لانے کے مطالبے پر امر از تو کسی طرح نہ کرتے۔ اس کے برخلاف

آپ ان سے صرف یہ کہتے کہ قورات و انجیل کی مخلصانہ پیروی کرو۔ میں تم سے صرف یہ پابتا ہوں کہ اپنی نبوت کے تسلیم کرنے اور قرآن کی پیروی کا تم سے کوئی مطالبہ نہیں رکھتا لیکن ساری دنیا جانتی ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ آپ نے انہیں بھی اسی طرح اسلام کی دعوت دی جس طرح عرب کے مشرکوں کو دی تھی اور ان کے لیے بھی اپنی پیروی کو ویسا ہی ضروری قرار دیا جیسا کہ ان کے لیے ضروری قرار دیا تھا۔

یا ایھا الذین اوتوا الکتاب آمنوا بما نزلنا مصداقا لما معکم
 اے وہ لوگو جن کو کتاب دی گئی تھی ایمان لاؤ اس کتاب پر جسے ہم نازل کر رہے
 نہ صرف یہ کہ آپ نے انہیں اسلام لانے کی دعوت دی بلکہ ان میں سے کچھوں نے اسلام
 قبول نہیں کیا انہیں صاف لفظوں میں کفر کا مرتکب اور دوزخی فرمایا حتیٰ کہ بعض مقامات پر تو
 ان کے اس انکار اسلام کو صرف کفر ہی نہیں بلکہ بدترین کفر اور انہیں صرف کافر ہی نہیں
 بلکہ پکا کافر کہا ہے، جیسا کہ اسی پاسے کے آغاز میں پڑھا آئے کہ اہل کتاب کو انکار و صفا
 کہا ہے۔ ان کے جس طرز عمل کی بنا پر یہ کہا گیا ہے وہ صرف یہ تھا کہ وہ جمال دوسرے انبیاء کو انفر
 کے رسول مانتے تھے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ماننے کے لیے کسی طرح تیار
 نہ ہوتے تھے حالانکہ جس طرح اللہ کے رسول وہ تھے اسی طرح آپ بھی تھے۔ پھر یہی چیز
 ہے جسے ایمان و کفر کے درمیان راہ نکالنا کہا گیا ہے۔ کیونکہ دوسرے انبیاء کو مان کر اگر وہ ایمان
 باللہ کے تقاضے پورے کر رہے تھے تو رسالت محمدی کا انکار کر کے اللہ کی معبودیت اور وحدانیت
 کو وہ ٹھکرا بھی رہے تھے۔ پھر یہی رد یہ تھا جس کو اللہ کا اور اس کے رسولوں کا کفر کرنا کہا گیا
 ہے کیونکہ خدا کے کسی رسول کو ماننا اور کسی کو نہ ماننا دراصل نہ خدا کو ماننا ہے نہ کسی رسول کو
 ماننا ہے بلکہ محض اپنی خواہش نفس کو ماننا ہے۔

غرض قرآن حکیم نے اہل کتاب کے انکار اسلام کو بھی ٹھیک وہی حیثیت دی ہے
 جو مشرکوں کے انکار کو دی تھی اور نتائج بھی دونوں کے ایک ہی بتاتے ہیں۔ اس نے
 اہل کتاب کے لیے اس طرح کی کوئی گنجائش نہیں رکھی تھی کہ وہ اسلام کے بہائے اپنے ہی دین
 پر قائم رہ سکتے ہیں خدا اسے بھی قبول نہ فرماتے گا۔

پھر یہ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی ہے بلکہ حضرت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

لو کان مو سى حياً ما وسعنا الا ابتاعی

اگر موسیٰ زندہ ہوتے تو ان کے لیے بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا کہ میری پیروی کریں۔
یہ ارشاد نبوی مسند کو اس حد تک واضح کر دیتا ہے جس کے بعد وضاحت کا کوئی دُجر باقی نہیں رہ
جاتا ہے۔ جس نبی کی حیثیت یہ ہو کہ دوسرے انبیاء اگر اس زمانے میں مسجود ہوتے تو وہ بھی اسی کے
امت اور پیرو بنتے۔ اور ان کی لالی ہوتی شریعتوں کی پیروی کی گنجائش خود ان کے لیے ہوتی نہ رہتی۔
اس کی پیروی کی ضرورت اور ضرورت سے بھلا کوئی عام انسان کیسے متشکیک رہ سکتا ہے اور اس لئے
ہر نئے دین کی موجودگی میں کوئی اور دین اس کے لیے کس طرح قابلِ اتہاج ہو سکتا ہے۔ بہر حال اس
آیت میں اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کر لینے کا مطلب یہ ہے کہ آخرت کی نعمت اسلام ہی پر توفیق
ہے، کیونکہ جب ہر شخص کے لیے اسلام کی پیروی ضروری ہے اور اب کوئی دین اللہ کے حضور پسندیدہ
اور قابلِ قبول نہیں ہے تو اس کے صاف منہ یہ ہیں کہ اسلام ہی شرطِ نعمت ہے۔ واضح بات ہے کہ
اللہ تعالیٰ اپنی جن شریعتوں کو اب خود منسوخ اور ناقابلِ قبول ٹھہرا چکا ہے اس کی پیروی پر وہ اجر
کیسے دے گا۔

وَمَنْ يَتَّبِعْ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ

بانے کے بعد ہی وہ اپنے اس فیصلے کا بھی اعلان کرتا ہے کہ وہ صرف الاِختِصَافِ مِنَ الْخَاصَرِیْنَ
ایسا شخص آخرت میں قطعاً نامزد ہے گا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسی فیصلہ خداوندی کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں :
قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے اس امت میں
سے جس کسی شخص تک مثلاً یہودی یا نصرانی تک میری نبوت کا پیغام پہنچا، اور
اس کے باوجود وہ میرے لئے برے دین پر ایمان لائے بغیر مر گیا وہ دوزخی
ہو گا۔ (صحیح مسلم)

اس ارشاد نبوت میں نام اگرچہ یہود و نصاریٰ کے لیے گئے ہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ
نام صرف مثال کے طور پر لیے گئے ہیں۔ ورنہ اس میں جرات کہی گئی ہے وہ اپنی جگہ بالکل عام ہے
اور ایک کلیہ اور اصول کی حیثیت رکھتی ہے۔ دنیا کا کوئی گروہ، کوئی قوم اور کوئی ملت ایسی نہیں
ہے جس پر اس کا اطلاق نہ ہوتا ہو۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں جو کچھ زمان کر نکال جا رہی ہو بلکہ ایک
ایسی حقیقت ہے جو اس حدیث کے الفاظ احد من هذه الاممہ کو صریح مفہوم ہے۔ ظاہر
ہے کہ هذه الاممہ اس امت سے مراد امتِ اجابت نہیں بلکہ امتِ دعوت ہے۔ یعنی وہ

ہلکا کردہ انسانی جس کی طرف آپ نبی بنا کر روانہ کیے گئے اور یہ معلوم ہو چکا ہے کہ وہ گردہ جس کے لیے آپ نبی بن کر آئے پوری نوبت انسانی پر مشتمل ہے اس لیے یہ حدیث اس حقیقت پر کوئی پرورد نہیں سمجھنے دیتی ہے کہ آپ پر ایمان لانا ہر شخص کے لیے ضروری ہے اور شرطِ نہایت ہے۔ اس فیصلہ کے تحت جس طرح یہود و نصاریٰ آئے ہیں اسی طرح دوسری قومیں اور ملتیں بھی آتی ہیں۔

غرض جہاں تک اس آیت قرآنی کے فیصلہ کا تعلق ہے وہ بالکل دو ٹوک انداز میں اسلام کی پیروی کو سارے انسانوں کے لیے ضروری اور شرطِ نہایت قرار دیتی ہے۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جسے اس کا پیغام پہنچا ہی نہ ہو جیسا کہ ص ۷۷ میں بی بی کی قید کا منشا ہے۔

آیت پر مجموعی نظر

اجزاء کی وضاحت کے بعد آیت کے مجموعی نظام پر بھی ایک منظر ڈال لیجئے۔ اس آیت میں اکمالِ دین، اتمامِ نعمت اور دین کی حیثیت سے اسلام کی پسندیدگی کے انعامات بتائے ہیں۔ اکمالِ دین اور اتمامِ نعمت کے بعد ظاہر ہے کہ اب دین میں کسی ترمیم و اضافہ تصرف کی گنجائش نہیں ہے نہ کسی نبی کی بعثت کی حاجت، البتہ ہر دور میں نئے نئے مسائل کا انکشاف اہل علم و اجتہاد اپنی بصیرت سے کتاب و سنت کے اصول و قواعد کے مطابق و ماتحت کرتے رہیں گے۔

دنیا اب تک مختلف جغرافیائی حصوں اور ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر نہایت دشوار تھا۔ اور اس میں نامرد پیام کی بھی کوئی آسان راہ دستی سرِ علاقہ اپنے جغرافی اور طبعی سرحدوں کے اندر محفوظ تھا۔ دریا، پہاڑ، سمندر وغیرہ جوارہ میں حاکی نسبتے ان کا عبور کرنا محال تھا۔ موٹر لارمی، ریل، ٹیلیفون، ریلوے، ٹیلیوژن وغیرہ خواب و خیال میں بھی دھتے۔ اب کائنات ارضی کی تاریخ میں پہلی بار یہ وقت آ رہا تھا کہ انسانیت کے ٹکڑے ایک دوسرے سے ملیں۔

رسل و رسائل کے ذرائع وسیع ہوں اور جس طرح نظامِ حکومتی میں ہر فرد کے لیے اس کے وجود میں آنے سے پہلے ہی ہوا کا اور روشنی کا اور پانی کا سامانِ حکمتِ الہی موجود رکھتی ہے اسی طرح نظامِ تشریعی میں رحمتِ حق نے چاہا کہ نوبتِ انسانی کی انفرادی و اجتماعی دونوں زندگیوں کی روحانی، اخلاقی، عائلی، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور قانونی تربیت کا انتظام پیشتر سے موجود رہے۔

غلامِ رب ہے کہ اس آیت نے بتا دیا کہ اہل ایمان کے لیے دینِ اسلام ایک بڑی نعمت ہے

اور یہی دین پر حیثیت سے کامل و مکمل ہے، اذ اس کے بعد کوئی تباہی نہ آئے گا اور نہ اس میں کوئی کمی بیشی ہوگی۔
 سب قرآن کی یہ آیت اذل ہوئی تو عام مسلمان اس کو سن کر خوشیاں منائے تھے لیکن حضرت
 ابو بکر پر گریہ طاری تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے روک لیا کہ وہ پوچھیں عرض کیا کہ اس
 آیت سے افتخار معلوم ہوتا ہے کہ اب آپ کا قیام اس دنیا میں بہت کم ہے کیونکہ دین کی تکمیل
 نے رسول کی ضرورت پیدا کر دی۔ حضور اللہ نے اس کی تصدیق فرمائی۔

اضطرار کی شرعی حد

۴۱۔ دیکھو جو کوئی بھوک سے بے بس ہو جائے یہ نہ بھوک دانستہ گناہ کرنا چاہے، تو انہ
 بخشنے والا رحمت رکھنے والا ہے۔ یعنی حلال و حرام کا قانون تو مکمل ہو چکا، اس میں اب کوئی
 تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ البتہ مضطر جو بھوک اور پیاس کی شدت سے بے تاب اور لاچار ہو
 کر وہ اگر حرام چیز کھالے بشرطیکہ مقدار ضرورت سے تجاوز نہ کرے اور لذت مقصود نہ ہو
 غیر باغ و کا عادیہ تو اللہ تعالیٰ اس تناول محرم کو اپنی بخشش اور مہربانی سے صاف فراموشے گا
 گویا وہ چیز تو حرام ہی رہی مگر اسے کھانی کر جان بچانے والا خدا کے نزدیک مجرم نہ رہا۔ یہ بھی
 اتمام نعمت کا ایک شعبہ ہے۔

نمختہ کے معنی بھوک کے ہیں۔ بھوک سے مضطر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی بھوک کی
 ایسی مصیبت میں مبتلا ہو جائے کہ موت یا حرام میں سے کسی ایک کے اختیار کرنے کے سوا کوئی
 اور راہ بظاہر کھلی ہوئی باقی نہ رہے۔ ایسی حالت میں اس کا جواز ہے کہ حرام چیزوں میں سے
 بھی کسی چیز سے فائدہ اٹھا کر جان بچا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ غیر متجانف کی قید اسی مضمون
 کو ظاہر کر رہی ہے جو دوسرے مقام پر غیر باغ و کا عادیہ ظاہر ہوا ہے، یعنی زول سے
 چاہنے والا بنے اور زسدر مت سے آگے نہ بڑھے۔ نمختہ کی قید سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ
 جمال دوسرے غذائی بدل موجود ہوں وہاں صرف اس عذر پر کہ شرعی ذبیحہ کا گوشت میسر نہیں
 آتا جیسا کہ یورپ اور امریکہ کے اکثر ملکوں کا حال ہے ناجائز کو جائز بنا لینے کا حق کسی کو نہیں
 ہے۔ گوشت زندگی کی تھاکے لیے ناگزیر نہیں ہے، دوسری غذاؤں سے نہ صرف زندگی بلکہ

صحت بھی ضایت اعلیٰ امیاء کے ساتھ قائم رکھی جاسکتی ہے غیر متجانف لا فساد کی قید تیار ہی ہے
 کہ رخصت بہر حال رخصت ہے اور حرام بہر حال حرام ہے نہ کوئی حرام چیز شیر یا دودھ بن سکتی ہے
 اور نہ کوئی رخصت ابدی پر دانا ہے اس وجہ سے یہ بات کسی کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ دلی
 اضطراب سے تہوار کرے۔ اگر ان پابندیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے کوئی شخص کسی حرام سے اپنی
 زندگی بچائے گا تو اللہ بخشنے والا ہے۔

حرام کا لینے کے لیے اضطراب کہ وہ حد جس سے حرام کھانا مباح ہو جاتا ہے، علماء میں اختلاف
 ہے۔ امام ابو حلیفہ فرماتے ہیں کہ ہلاکت کا اندیشہ ہو یا یقینی اور ظن غالب کے طور پر عضو کے ہلاک
 ہونے کا اندیشہ ہو، علامہ زرقانی نے امام مالک کا بھی یہی نقطہ نظر نقل کیا ہے۔ البتہ امام نووی نے
 شرح المذہب میں امام شافعی کی ترجمانی اس طرح کی ہے کہ حرام کھانے کے لیے صرف جھوکنا زیادہ
 گناہ کا فی نہیں ہے۔ صرف اتنا اندیشہ کافی ہے کہ اگر جھوک کی حالت میں نہ کھائے گا تو تھوڑا
 سے بکھر جائے گا یا سواری پر سوار نہ ہو سکے گا اور چل نہ سکے گا۔ امام الحرمین کہتے ہیں کہ ان حالات
 کے دو غائب ہونے کے لیے صرف ظن غالب کافی ہے۔ علامہ ابن قدامہ نے معنی میں صرف اندیشہ
 ہلاکت کو اضطراب قرار دیا ہے۔

حرام کھانا واجب کی رخصت

اندیشہ ہلاکت میں کیا حرام کھانا واجب ہے یا صرف اجازت ہے اس موضوع پر علماء قرون
 کا اختلاف ہے۔ احناف کے نزدیک حفظ جان یعنی جان بچالینا اولین فرائض میں سے ہے
 اور ایسے موقع پر غذا نہ کھانا خود کشتی کے مترادف ہے۔ البصا نے لکھا ہے جو شخص مباح
 محتجب رہتا، انکو مرگیا وہ خود اپنا قاتل ہے۔ آیات قرآنی لا تقسوا انفسکم اور لا تعلقوا
 بایککم الی التھکمة اسی کی مقتضی میں کہ جان بچانا واجب ہے۔ یہی امام مالک اور امام شافعی
 کا مذہب راجح ہے۔ حنابلہ نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے۔ صرف شوافع میں سے ابو اسحاق اور
 احناف میں سے امام ابو یوسف کہتے ہیں کہ واجب نہیں ہے۔

یہاں یہ سوال بھی بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ حالت اضطراب میں مضطر کو دو حراموں میں سے
 کون سا حرام کر لینے کی اجازت ہے۔ مردار کھا لینے کی یا کسی کا کھانا چوری کر کے یا غصب کر
 کے یا لوٹ مار کر کے کھا لینے کا؟ ابن قدامہ نے اسی کو ترجیح دی ہے کہ مردار کھائے لیکن چور

غصب یا لوٹ مار نہ کرے اور دھوکہ بھی نہ دے کہ مردار کی حرمت اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور جیروی وغیرہ
حق العباد ہے۔ حق اللہ کے لیے اجازت ملے گی لیکن حق العباد کے لیے اجازت نہیں ہے۔
اسی سے فقہانے اسلامی قانون میں منظرہ مزدوریت استنباط کیا ہے اور قاعدہ لکھا ہے کہ
الظہورات تبیح المحظورات مزدور میں منوعات کو مباح کر دیتی ہیں۔ یہ تفصیل کامل نہیں
اللہ اللہ اس پر تفصیل بحسب پورہ ہریں جلد میں آئے گی۔

يَسْئَلُونَكَ مَاذَا أُحِلَّ لَهُمْ قُلْ أُحِلَّ لَكُمْ الطَّيِّبَاتُ وَمَا عَلَّمْتُمُ
 مِنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِينَ تُعَلِّمُونَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللَّهُ
 فَكُلُوا مِمَّا أَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهِ وَ
 اتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝ الطَّيِّبَاتُ
 الطَّيِّبَاتُ وَطَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَكُمْ وَطَعَامُكُمْ
 حِلٌّ لَهُمْ وَالنَّكَاحُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُعْصَنَاتِ مِنَ
 الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ
 مُحْصَيْنِينَ غَيْرِ مُسْفِهِينَ وَلَا مُتَّخِذِينَ أَخْدَانٍ وَمَنْ يَكْفُرْ
 بِالْإِيمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنْ
 الْخَسِرِينَ ۝

اے پیغمبر لوگ آپ دریافت کرتے ہیں کہ ان کے لیے
 کیا کیا چیزیں حلال ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ عتبی اچھی

اور ستھری چیزیں ہیں سب تمہارے لیے حلال ہیں۔ اور
 شکاری جانور جو تم نے شکار کے لیے سدھائے ہوں اور شکار
 کا طریقہ جیسا کہ اللہ نے تمہیں سکھا دیا ہے تم ان کو کھا سکتے
 ہو تو جو کچھ وہ تمہارے لیے روکے رکھیں تم اسے کھا سکتے ہو
 البتہ اس پر اللہ کا نام لے لیا کرو۔ اور ہر حال میں اللہ کی
 نافرمانی سے بچو یاد رکھو کہ اللہ حساب لینے میں بہت تیز ہے
 آج ساری اچھی چیزیں تمہارے لیے حلال کر دی گئی ہیں
 ان لوگوں کا کھانا جن کو کتاب دی گئی ہے تمہارے لیے حلال
 ہے۔ اور تمہارا کھانا ان کے لیے حلال ہے۔ نیز تمہارے لیے
 مسلمان پاکدامن بیبیاں اور کتابی عورتیں حلال ہیں بشرطیکہ
 ان کے مہر ان کے حوالے کر دیا اور مقصود قید نکاح میں
 لانا ہو، نہ یہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے لگو یا چوری چھپے

آشتیاں کرو۔ اور جو بھی ایمان کی روش پر چلنے سے انکار کرے گا تو اس کا سارا کارنامہ زندگی بیکار ہو جائے گا اور وہ آخرت میں دیوالیہ ہو گا۔

تحلیل و تحریر کا ضابطہ عام

ہر نوک و ٹوک پھل پاندیوں اور پھول کے عادی نہ چکے تھے اس لیے بار بار پوچھتے تھے کہ ہمارے لیے کیا کیا چیزیں حلال ہیں۔ آیت ۴ میں دیا گیا کہ تمام اچھی چیزیں حلال ہیں۔ صرف ان ہی چیزوں سے روک دیا گیا ہے جو اچھی نہیں ہیں۔ پچھلے صحیفوں میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت سے متعلق محمد پیشین گوئیاں آئی ہیں ان میں یہ تصریح بھی موجود ہے کہ حسب آخری نبی آئے گا تو اہل کتاب کو طہارت اور خواتین کے متعلق اللہ کے امر و نہی سے انکار کرے گا اور حلال و حرام کے مروجہ پر ان تمام پابندیوں اور سختیوں سے آزاد کرے گا جو انہوں نے اپنے اوپر یا تو خود عائد کر رکھی ہیں یا ان کی سرکشی کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ان پر عائد کر دی تھی۔ قرآن عزیز نے ان پیشین گوئیوں کا حوالہ سورۃ اعراف میں دیا ہے :

الذین يتبعون الرسول اللہ الامی یجدونہ مکتوباً
منہ فی التورۃ والا انجیل یا مرسم بالمعروف و
بنہا من المنکر و یحل لہم الطیبات و یحرم علیہم
الخبائث و یضع عنہم اصرہم و الا فلول الحق کانت علیہم
جو لوگ اس رسول بھی اسی کی پیروی کریں گے جس کو اپنے ہاں تورات و انجیل میں
لکھا ہوا ہے وہیں نیکی کا حکم دیتا ہے برائی سے روکتا ہے اور ان کے
لیے پاکیزہ چیزوں کو جائز ٹھہراتا ہے اور ناپاک چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے اور
ان سے اس بوجہ اور پابندیوں کو دور کرتا ہے جو ان پر تھیں ۔

یہ انہیں باتوں کا سوال ہے جو حضور الہی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ظہور میں آنے والی تھیں چنانچہ آپ کے ظہور نے ان میں سے ایک ایک بات کی حلفا تصدیق کر دی۔ آپ نے تمام طیب اور پاکیزہ چیزیں جائز کر دیں جن میں کچھ یہود کے میاں حرام تھیں۔ تمام خبیث چیزوں کو حرام قرار دیا اور وہ تمام پابندیوں اور پڑیوں کو ختم کر دیں جو انہوں نے یا تو از خود اپنے اوپر لاگو کر لی تھیں یا ان کی ضد سرکشی کے باعث اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر عائد کی گئی تھیں۔ اس مرحلے پر اگرچہ جو یہ کام مکمل ہو چکا تھا اور یہ بات بالکل واضح ہو چکی تھی کہ اہل کتاب نے جو خبیث چیزیں جائز بنائی ہیں محض اپنی بدعت سے جائز بنائی ہیں اور جو طیب چیزیں ان پر حرام ہیں وہ محض ان کی سرکشی کی مزا کے طور پر حرام ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت کے بعد یہ پابندیاں ختم ہو گئیں تو مسلمانوں کو اجازت دی گئی کہ حرام حلال اور خبیث و طیب کی اس وضاحت کے بعد تمہارے لیے اب فکری جانور بھی جائز ہے اور تم اہل کتاب کا کھانا بھی کھا سکتے ہو۔ اس لیے کہ اب تمہارے لیے کسی خبیث سے آلودہ ہونے کا اندیشہ نہیں ہے اور ساتھ اس بات کا بھی اعلان کر دیا گیا کہ تمہارا کھانا اہل کتاب کے لیے جائز ہے اور اہل کتاب کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے۔ مگر اس حکم کی بھی تصریح کر دی کہ ان کی عورتوں سے نکاح کرنے کی بھی کوئی ممانعت نہیں ہے۔

۲۲۔ اے پیغمبر لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ ان کے لیے کیا کیا چیزیں حلال ہیں۔

آپ ان سے کہہ دیجئے کہ جنہی صاف اچھی اور سہری چیزیں ہیں سب تمہارے لیے حلال ہیں۔ مکمل آیات میں بہت سی حرام چیزوں کی فہرست دی گئی تھی تو قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ حلال چیزیں کیا ہیں اس کا جواب ہے دیکر حلال کا دائرہ تو بہت وسیع ہے۔ چند چیزوں کو چھوڑ کر جن میں کوئی دینی یا دنی نقصان ہے دنیا کی تمام سہری اور پاکیزہ چیزیں حلال ہی ہیں اور چونکہ فکری جانور سے فکری جانور کے متعلق بعض لوگوں نے خصوصیت سے سوال کیا تھا اس لیے آیت کے اگلے حصہ میں اس کو تفصیلاً بتا دیا گیا تھا کہ یہ جواب کا صرف ایک حصہ ہے جو حکم کی ہمیشہ رکھتا ہے۔ قرآن کا یہ بھی ایک انداز ہے کہ وہ کسی سال کا جواب دیتا ہے تو اس کا آغاز بالعموم جامع بات سے کرتا ہے کہ جواب صرف سوال ہی تک محدود نہ ہوتا بلکہ ایک وسیع دائرے میں مسائل کی رہنمائی کرے۔ جواب کے اس انداز میں ایک لطیف ٹکڑا یہ ہے کہ مذہبی طرز خیال کے لوگ

اکثر اس ذہنیت کے خاکار ہوتے ہیں کہ دنیا کی ہر چیز کو حرام سمجھتے ہیں جب تک مراحت کے ساتھ کسی چیز کو حلال قرار دیا جاتے اس ذہنیت کی وجہ سے لوگوں پر قانونیت کا تسلط ہو جاتا ہے وہ زندگی کے ہر شعبہ میں حلال اشیاء اور جائز کاموں کی فرست مانگتے ہیں۔ اور ہر کام اور ہر چیز کو اس خبیث کی نظر سے دیکھتے دیکھتے ہیں کہ کہیں وہ منج تر نہیں ہے۔ یہاں قرآن اسی ذہنیت کی اصلاح کرتا ہے۔ پوچھنے والوں کا مستعد یہ تھا کہ انہیں تمام حلال چیزوں کی فرست بتادی جائے تاکہ ان کے سوا ہر چیز کو وہ حرام سمجھیں۔ جواب میں قرآن نے حرام چیزوں کی تفصیل بتائی اور اس کے بعد یہ عام ہدایت دے کر چھوڑ دیا کہ ساری پاک چیزیں حلال ہیں۔ اس طرح قدیم مذہبی نظریہ بالکل الٹ گیا۔ قدیم نظریہ یہ تھا کہ سب کچھ حرام ہے سبھز اس کے جسے حلال ٹھہرایا جائے۔ قرآن نے اس کے برعکس یہ اصول متروک کیا کہ سب کچھ حلال ہے سبھز اس کے جس کی حرمت کی تصریح کر دی گئی ہے۔ یہ ایک بہت بڑی اصلاح تھی جس نے انسانی زندگی کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے آزاد کر کے دنیا کی دستوں کا دروازہ اس کے لیے کھول دیا۔ پہلے علت کے ایک چھوٹے سے دائرے نے سوا ساری دنیا اس کے لیے حرام تھی۔ اب حرمت کے ایک مختصر سے دائرے کو مستثنیٰ کر کے ساری دنیا اس کے لیے حلال ہو گئی۔ حلال نے لیے پاک اور مستثنیٰ کی قید اس لیے لگائی کہ ناپاک چیزوں کو اس عام اہمیت کی دلیل سے حلال ٹھہرانے کی کوشش نہ کی جاسکے۔ اب دہرہ سوال کہ اشتیاق کے پاک ہونے کا تعین کس طرح ہو گا تو اس کا جواب یہ ہے کہ جو چیزیں اصول شرع میں سے کسی اصل کے تحت ناپاک قرار پائیں یا جن چیزوں سے ذوق سلیم کراہت کرے یا جنہیں مذہب انسان نے بالعموم اپنے فطری احساس نفاذ کے خلاف پایا ہو ان کے سوا سب کچھ پاک ہے۔

سوال جو لیکہ جانوروں کے متعلق ہے اس لیے طبیعت سے مراد وہ جانور ہوں گے جو اولاً تو خود اپنے مزاج اپنی سرشت اور انسان کے لیے اپنی افادیت اور اپنے اثرات کے لحاظ سے اچھے اور پاکیزہ ہوں۔ ثانیاً ان کو اللہ کے نام پر ذبح کر لیا جاتے۔ اس طرح اس سے وہ تمام جانور نکل جاتے ہیں جو اپنے مزاج اور سرشت کے اعتبار سے انسان کے مصالح مزاج سے منافی سمجھے والے نہ ہوں۔ مثلاً خنزیر، گتا، ہندو دھندے اور شکاری پرندے وغیرہ یا مزاج سے

منابہت تو رکھنے والے ہوں لیکن کسی خارجی سبب سے ان کے اندر غمٹ پیدا ہو گیا ہو مثلاً جانور گیا یا طیرانہ کے نام پر یا کسی استخوان پر اس کو ذبح کیا گیا ہو۔ یہ غمٹ میں داخل ہیں۔ قرآن کے اس مجاہد سے یہ رہنمائی ملی ہے کہ شکار کیجئے ہوتے جانوروں میں بھی حلال صرف طہیات ہیں۔ غمٹ اس سے خارج ہیں۔

سد ہاتے ہوتے شکاری جانور کا شکار

۲۳- اور شکاری جانور جو تم نے شکار سے لیے سد ہاتے ہوں اور شکار کا طریقہ جیسا اللہ نے تمہیں سکھایا ہے تم ان کو کھاتے ہو تو جو کچھ وہ تمہارے لیے وہ کے رکھیں تم لے کے کھا لیتے ہو البتہ اس پر اللہ کا نام لے لیا کرو۔ شکاری کتے یا باز وغیرہ سے شکار کیا ہوا جانور ان شرط سے حلال ہے۔

اول یہ کہ شکاری جانور سد ہا ہو

دوسرے یہ کہ شکار پر چھوڑا جائے

تیسرے یہ کہ اس طریقہ سے تعلیم دی گئی ہو جس کو شریعت نے معتبر رکھا ہے یعنی کتے کو سکھایا جائے کہ شکار کو پکڑ کر کھائے نہیں، اور باز کو یہ تعلیم دی جائے کہ جب اس کو بلاؤ تو شکار سے پیچھے جا رہا ہو فرد چلا آئے۔ اگر کتا شکار کو خود کالے لٹکے یا بلانے سے ڈاٹے تو سمجھا جائے گا کہ جب اس کے کہنے میں نہیں ہے تو شکار بھی اس کے لیے نہیں پکڑا ہے بلکہ اپنے لیے پکڑا ہے۔ اسی کو حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ جب اس نے آدمی کی خوشکسی تو گویا آدمی نے ذبح کیا۔

چوتھی شرط یہ ہے کہ چھوڑنے کے وقت اللہ کا نام لیا یعنی بسم اللہ کہہ کر چھوڑو۔ ان چار شرطوں کی تصریح نص قرآنی میں ہو گئی ہے۔

پانچویں شرط جو امام ابوحنیفہ کے نزدیک معتبر ہے کہ شکاری جانور شکار کو زخمی بھی کر دے کہ خون بہنے لگے اس کی طرف نظر جو ارجح اپنے مادہ جرح کے اعتبار سے اشارہ کر رہا ہے۔

ان میں سے اگر ایک شرط بھی مغفود ہوئی تو شکاری جانور کا کھانا ہر اشکار حرام ہے۔ ہاں اگر

ملا نہ ہو اور ذبح کر لیا جائے تو وہ اکل السبع ۷۱ ماذکبتہ کے قاعدہ سے حلال ہو گا بلکہ

جو ارجح جارح کی جمع ہے اس کے معنی ہر شکاری جانور کے ہیں خواہ پندہ ہو یا درندہ

اس کا نام ہی جادو اس لیے ہے کہ وہ شکار کو زخمی کرتا ہے۔ خازن لکھتے ہیں کہ شکاری جادو کو جادو اس لیے کہتے ہیں کہ وہ شکار کو زخمی کرتا ہے۔ ماحلہ من الجوامع کا پرندہ الطیبات سے ہے اور مطلب یہ ہے کہ طیبات حلال ہیں اور ان شکاری جادووں کا شکار حلال ہے جن کو تم نے سد ہوا۔ شکاری جادووں سے مراد کتے، بھیتے، باز، فکڑے اور تمام وہ درندے اور پرندے ملا ہیں جن سے انسان شکار کی خدمت لیتا ہے۔ سد ہاتے ہوتے جادو کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ جس کو شکار کرتا ہے اسے عام دزدوں کی طرح پھاڑ نہیں کھاتا بلکہ اپنے مالک کے لیے پکڑ رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے عام دزدوں کا پھانسا ہوا جادو حرام ہے اور سد ہاتے ہوتے دزدوں کا شکار حلال ہے۔ اس مسئلہ میں فقہاء کا کچھ اختلاف ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ اگر شکاری جادو نے خواہ دندہ جوا پرندہ شکاری سے کچھ کھالیا تو وہ حرام ہو گا۔ کیونکہ اس کا کھالینا یہ معنی رکھتا ہے کہ اس نے شکار کو مالک کے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے پکڑا ہے۔ یہی مسلک امام شافعی کا ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اگر اس نے شکار میں سے کچھ کھالیا تب بھی وہ حرام نہیں ہوتا سنی کہ اگر ایک تھالی معقہ بھی کھالے تو بقیہ دو تھالی حلال ہے اور اس معاملے میں دندے اور پرندے کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ مسلک امام مالک کا ہے۔ تیسرا گروہ کہتا ہے کہ شکاری دندے سے اگر شکاریوں سے کھالیا ہو تو وہ حرام ہو گا لیکن اگر شکاری پرندے سے کھالیا ہو تو حرام نہ ہو گا۔ کیونکہ شکاری دندے کو انسانی جسم کی جاسکتی ہے کہ وہ شکار کو مالک کے لیے پکڑ رکھے اور اس میں سے کچھ نکالتے لیکن تجربے سے ثابت ہے کہ شکاری پرندہ ایسی تعلیم قبول نہیں کرتا۔ یہ مسلک امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کا ہے۔

کتے کو شکار کی ٹریننگ

کلب کتے کو کہتے ہیں اس سے مکیب بنایا ہے جس کے معنی کتے کو شکار کی ٹریننگ لینے کے ہیں۔ مکیب مکیب کی جمع ہے ایک معنی تو کتے کو تعلیم دینے والے کے ہیں اور دوسرے معنی شکار پر چڑھنے والے کے ہیں۔ دونوں میں کوئی منافات نہیں اور اہل سنت نے دونوں کی گنتی میں لکھی ہے۔ چنانچہ علامہ مزیدی نے تاج العروس میں منظور افربی نے لسان العرب اور راغب نے مفردات القرآن میں تصریح کی ہے۔ مکیب کے لفظ سے یہ دھوکہ نہ ہو کہ یہ تعلیم دہریت صرف کتوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ اجماعاً تو یہ لفظ اسی معنی کے لیے استعمال ہوا ہے لیکن پھر اس کا

استعمال شکاری جانوروں کی تربیت کے لیے ہونے لگا خواہ کتا ہر یا شکاری درندوں اور پرندوں میں سے کوئی اور جانور، شکاری پرندے بھی با اختلاف فقہ اسی حکم میں داخل ہیں۔ البصا میں نے تصریح کی ہے۔

اس میں کتوں کی تخصیص نہیں ہے وہ مسمیٰ مراد لینا ضروری ہے۔ فقہاء میں اس موضوع پر کوئی اختلاف نہیں ہے۔

تعلو نہیں ماحکمہ اللہ سے اس تربیت اور ٹریننگ کی نوعیت بتائی جا رہی ہے کہ تم نے اس سلسلہ میں سے ان کو کچھ بتایا ہر جو اللہ نے تم کو بتایا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر تربیت میں ہر ایک کے ذوق اس کی پسند اور ناپسند اور اس کے مقصد تربیت کی جھلک ہوتی ہے اور اس چیز کو جس طرح زیر تربیت انسان اپنا تم ہے اسی طرح ہنسی، جمل، استعداد کی حد تک حیوانات بھی اپناتے ہیں۔ یہ چیز سمجھانے ہوتے جانوروں کو اور دوسرے جانوروں سے بالکل الگ کر دیتی ہے اس درجہ سے ایک عام کتے کے شکار اور ایک مدھتے ہونے کتے کے شکار میں فرق ایک امر فطری ہے بلکہ ایک مسلمان کے تربیت کردہ کتے اور ایک عیسائی کے تربیت کردہ کتے کے میلان اور سلسلہ میں بھی فرق ہر جگہ نکلا۔ مطلب یہ ہے کہ وہ شکاری جانور سمجھاتے ہوئے مدھتے ہوتے ہوں۔ فقہاء نے اسی سے یہ نکتہ اخذ کیا ہے کہ یہ قید صرف مدھتی جانوروں کے لیے نہیں بلکہ گھریلو جانوروں کے لیے بھی ہے چنانچہ گھریلو جانور اگر ٹریننگ پایا ہو اور ہر تو اس کا کیا ہر شکار بھی صلاح نہ ہو گا۔ البتہ جو جانور مدھتی ہر یا گھریلو سمجھایا ہو گا اس کا فعل خود شکاری کا ہو گا۔ اور فقہاء نے تعلیم کا معیار جیسا کہ شیخ الاسلام نے بتایا ہے کتے کے حق میں یہ رکھا ہے کہ سمجھایا ہو گا شکار کچھ کر نہ دے اسے اور باز کے حق میں رکھا ہے کہ مدھتے ہوتے باز کو جب آواز دی جائے تو وہ شکار کا پیچھا چھوڑ کر واپس چلا آئے۔ اس سے جملہ بات معلوم ہوتی کہ شکاری جانور مدھتے ہوتے ہوں یہ بات بھی معلوم ہوتی کہ وہ شکاری جانور مدھتے چھوڑے ہوئے جھپٹیں یہ نہیں کہ از خود شکار پکڑ لائیں اور تمہارے سامنے ڈال دیں۔

ان دو شرطوں کے ساتھ تیسری شرط یہ ہے کہ نوعیت ایسی ہر کہ شکاری کتا شکار مسلمان شکاری کے لیے روکے ذکر لپٹے لیے۔ عمامہ، مسکن، علیہم اسکاں کے معنی روکے اور تھامنے کے ہیں۔ یہی اصل سوال کا جواب ہے کہ اگر مذکورہ بالا شرائط کے مطابق تربیت کیا جانور ہو تو اس کے کیے ہوئے شکاروں میں وہ شکار تمہارے لیے جائز ہو گا جو مدھتے خاص تمہارے

یہ روک رکھے۔ چو لکھیاں یہ بات خصوصیت سے کہی گئی ہے اس لیے میں ان لوگوں کے مذہب کو بظاہر دلیل زیادہ قوی سمجھتا ہوں جو کہتے ہیں کہ شکاری جانور شکار میں سے کچھ کھائے تو وہ شکار جائز نہ ہوگا۔ یہی بات بعض احادیث سے ثابت ہوتی ہے اور علامہ قرطبی نے اس سے مصرعہ میں سے عبد اللہ ابن عباس اور ابو ہریرہ اور تابعین میں سے عکرمہ، قتادہ، ابن جریر اور حاکم اور ائمہ فقہ میں سے سفینی، خافعی، احمد اسحاق، ابو ثور اور ابو حنیفہ اور ان کے شاگردوں کا اتفاق نقل کیا ہے۔ قاضی بیضوی لکھتے ہیں والہیہ مذہب اکثر الفقہاء مال البترہ باز، شکرہ وغیرہ شکاری پرندوں کی تادیر اس حد تک دشوار ہے اس لیے فقہائے انہیں اس قاعدہ سے مستثنیٰ کر دیا۔

شکاری جانور کو شکار پر چھوڑتے وقت بسم اللہ

آخر میں یاد کرنا سیدنا محمد علیہ السلام فرما کر واضح کر دیا کہ شکاری جانور کو شکار پر چھوڑتے وقت بسم اللہ کہہ لیا کرو۔ آیت میں ضمیر مجبور علیہ کے مرجع میں اختلاف ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ شکاری جانور کو چھوڑتے وقت اس پر بسم اللہ پڑھ لیا کرو۔ ان کے خیال میں ضمیر کا مرجع ماحلہ من الجوارح ہے۔ ارشاد و نہوت سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عدی بن حاتم طائی نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میں کتے کے ذریعے شکار کر سکتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر اسے چھوڑتے وقت تم نے اللہ کا نام لیا ہو تو کھادور نہیں اور اگر اس نے شکار میں سے کچھ کھالیا ہو تو نہ کھاؤ کیونکہ اس نے شکار کو دراصل اپنے لیے پکڑ لیا ہے۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ اگر میں شکار پر اپنا کتا چھوڑ دوں اور بعد میں دیکھ کر اود کو کئی کئی ماہ مر جو ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ اس شکار کو نہ کھاؤ اس لیے کہ تم نے خدا کا نام اپنے کتے پر لیا تھا ذکر دوسرے گتے پر۔

اس آیت سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ شکاری جانور کو شکار پر چھوڑتے وقت خدا کا نام لینا ضروری ہے اور یہ بھی شکار کے حلال ہونے کی شرط ہے۔ اس کے بعد اگر زندہ شکار ہے تو پھر خدا کا نام لے کر اسے ذبح کر لینا چاہیے اور اگر زندہ نہ ملے تو اس کے بغیر ہی وہ حلال ہوگا۔ فقہائے حدیث والا ہی سے یہ قاعدہ معلوم کیا ہے کہ ذبح حیوانات کے وقت جو بسم اللہ نہی جاتی ہے اسی کے قاعدہ وہ بسم اللہ ہے جو شکار پر شکاری جانور کے چھوڑتے وقت پڑھی

ہاتے۔ المحاصر نے الحکم القرآن میں اور صاحب درمندان نے اس کی تصریح کی ہے۔

حدود اللہ کی یاد دہانی

۲۲۔ ہر حال میں اللہ کی نافرمانی سے بچو یاد کرو کہ اللہ عزوجل نے بہت تیز ہے یعنی ہر حالت میں خدا سے ڈرتے رہو کہیں طیبات کے استعمال اور شکار و غیرہ سے منع ہونے میں حدود و قیود و ضوابط سے تجاوز نہ ہو جاتے۔ عموماً آدمی دنیاوی لذتوں میں منہمک ہو کر اور شکار و غیرہ کے مشاغل میں غرق ہو کر خداوند آخرت سے غافل ہو جاتا ہے۔ اس لیے تبلیغ کی ضرورت تھی کہ خدا کا مت جبر لو اور یاد کرو کہ سب کا دل کچھ دودھ میں ہے۔ خدا کے انعامات اور نعمتیں شکر گزار ہی کا موازنہ اور کم مزید کے ایک ایک لمحہ کا سبب ہونے والا ہے۔ غشائے ہے کہ ہر معاملہ کی طرح اس معاملہ میں بھی اس کے احکام کی خلاف ورزی کرنے سے بچو۔ خدا موعظ کی نزاکت پر تم تصور میں لائیے خوب مہر کی بجائے ہے۔ ایسے لذیذ گوشت کا جانور شکرہ یا کتا پکڑ کر چاہے خوشی سے بے قرار ہے کہ جلد سے جلد اس کے کباب لگیں اور بجھنے پر تے شکار سے ہی مہر کر لذت حاصل کی جائے۔ اب کون اس موقع پر یاد دلانے کے شرائط صحت و استحکام کو لیتے۔ جانور سدا ہوا ہے یا نہیں اسے چمڑے وقت ہم اللہ کرم کی گنتی یا نہیں۔ بجز تقویٰ الہی کے اور کس میں اس وقت یاد دلانے کی قوت ہے۔ یہی مراقبہ ہر دشواری حکم کی تعمیل کو آسان بنائے گا۔ قرآن حکیم میں احکام جہاں جہاں بھی آئے ہیں ان کے متحمل ہو کر ان کی تعمیل کا فخر و مرد و مل جائے جس سے یاد آخرت یا اللہ کے علم کل کا استحکام ہو جائے ہر شے کو آسان بنائے گا اور ہر شے کو پانی بنا دینے کا اس سے بڑھ کر نسخہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ گریبا آخر میں اس طرح و القرآن فرما کہ اللہ کے مقرر کردہ حدود اور اس کے جہد و پین کے احترام کی یاد دہانی یہاں بھی فرمادی کہ شکار کی حرص و آڑ میں خدا کے حدود و صلت و حرمت کو نہ بھولنا روزِ حساب بہت دیر نہیں ہے۔ یہ یاد دہانی اس پہلو سے ضروری تھی کہ جب شکار معاشی ضرورت ہو تو اس میں بے اعتدالی کے کوئی امکانات ہیں۔

سب اچھی چیزیں حلال ہیں

۲۵۔ آج ساری اچھی چیزیں تمہارے لیے حلال کر دی گئی ہیں۔ یعنی جیسے حق دین کامل

کر دیا گیا ہے۔ دنیا کی تمام پاکیزہ چیزیں بھی تمہارے لیے واقعی طور پر حلال کر دی گئی ہیں جو کسی مفسدہ نہ ہو
گلی بیٹے یہاں یہ بات دوبارہ کہی گئی ہے اور اس سے متفقہ یہ بتانا ہے کہ اگر کتاب کا جو کما تمہارے لیے
حلال کیا جا رہا ہے اس کے لیے بھی بنیادی طور پر طیب ہونا ضروری ہے۔ اس فقرہ میں الیوم کا لفظ خاص
اہمیت رکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب تمہیں غیث و طیب کا پورا امتیاز ہو چکا ہے۔ اس وجہ سے
تمہیں یہ اجازت دی جا رہی ہے۔ اب یہ خطرہ نہیں رہا کہ تم ان کے دسترخوان پر بیٹھ کر کسی حرام
یا مشتبہ میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ لغت میں طیبات صاف ستھری اور خوب چیز کو کہا جاتا ہے اور نجاست
اس کا مقابل ہے گندی اور قابل نفرت چیزوں پر ہوتا ہے۔ اس لیے مطلب یہ ہوا کہ جتنی چیزیں مناف
ستھری، مفید اور پاکیزہ ہیں وہ انسان کے لیے حلال ہیں اور جو گندی، قابل نفرت اور مضر ہیں وہ
حرام ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ الباقی فرماتے ہیں کہ جتنے جانور اسلامی قانون میں حرام کیے گئے
ہیں ان سب پر فرود کیا جائے تو سمٹ کر یہ سب دو اصولوں کے تحت آجاتے ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی
جانور اپنی فطرت و طبیعت کے اعتبار سے غیث ہو۔ دوسرے یہ کہ اس کے ذبح کا طریقہ غلط ہو
جس کے نتیجہ میں وہ ذبح طرار ہو جاتے۔ یہاں سورۃ مائدہ میں نو چیزوں کو حرام قرار دیا ہے، ان میں
خنزیر پہلی قسم میں داخل ہے باقی آٹھ قسم دوم میں ہیں۔ قرآن مزید لے دیکر ہم علیہم الغنایات فرما کر
اجمالی طور پر تمام غیث جانوروں کے حرام ہونے کا حکم دیا اور اسی کی تفصیلات میں سے چند چیزیں
قرآن نے صراحتاً بتا دی ہیں مثلاً لحم خنزیر اور دم مسفوح باقی چیزوں کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ
وسلم نے واضح فرمادیا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی جانور کے غیث ہونے کی ایک علامت
یہ بتائی ہے کہ کسی قوم کو بطور مذاہب کے اس کی شکل میں تبدیلی کر دیا گیا ہو مثلاً قرآن میں سے دجیل
منہم القرۃ والحنانیز یعنی کچھ لوگوں کو خنزیر اور بندر کی صورت میں بطور مذاہب کے مسج کر دیا
گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جانوروں کی یہ دو قسمیں بالطبع نجاست میں داخل ہیں۔ اور بہت سے
جانور ایسے ہیں کہ اخلاص دائر سے ان کا غیث ہونا عام لوگ خودی محسوس کر لیتے ہیں مثلاً دزدے
حین کا کام ہی دوسروں کو زخمی کرنا اور پھاڑنا ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے بھیڑیے
کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا کہ کیا کوئی انسان اس کو کھا سکتا ہے؟ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم

نے بطور ضابطہ قیام ہے کہ مرد و زنہ ہالور جو دانتوں سے چھاڑ کر کھاتا ہے جیسے شیر وغیرہ اور ہر پرندہ جو چلنے پھرنے سے شکار کرتا ہے جیسے باز، شکرہ وغیرہ سب حرام ہیں۔

غلاصہ ہے کہ جن جانوروں کو اسلامی قانون نے حرام قرار دیا ہے ان میں سے ایک قسم تو وہ ہے جس میں ذاتی طور پر نبشہ پایا جاتا ہے۔ دوسری قسم وہ ہے کہ ان کی ذات میں کوئی ختمت نہیں ہے مگر جانوروں کے ذبح کرنے کا جو طریقہ اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے اس طریقہ پر اسی کو ذبح نہیں کیا گیا ہے خواہ سرے سے ذبح ہی کیا گیا ہو جیسے جھٹکایا ذبح تو کیا مگر اس پر اللہ کے نام کے بھانے کسی غیر اللہ کا نام لیا تو یہ ذبح شہتر نہیں ہے۔

یہاں یہ بات بھی دھیان میں رکھنے کی ہے کہ انسان جو کچھ بھی کھاتا اور پیتا ہے وہ سب اللہ کی دی ہوئی نعمتیں ہیں لیکن جانوروں کے سوا کسی چیز کے کھالے پیٹے اور استعمال کرنے پر یہ پابندی نہیں ہے کہ اللہ اکبر یا بسم اللہ کہہ کر ہی یہ حلال ہو گا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ ہر چیز کے کھانے پینے کے وقت بسم اللہ کہنا مستحب ہے مگر یہ مدارِ صحت نہیں ہے برخلاف جانوروں کے کہ ان کے حلال ہونے پر شرط بسم اللہ کہنا ہے اور بلا زادہ جانور جو کہ بسم اللہ کہہ کر چھوڑ دینا جانور کو مردار بنا دیتا ہے۔

دوسرا اس کی یہ ہے کہ جانداروں کی جانیں ایک حیثیت سے سب برابر ہیں اس لیے ایک جاندار کا دوسرے جاندار کو قتل کرنا جائز نہیں ہے۔ اب جن کو جاندار کی جان لینے کی اجازت دی گئی ہے ظاہر ہے کہ یہ ان پر اللہ کا بہت بڑا انعام ہے اس لیے جانور کو ذبح کرتے وقت اس انعام الہی کا استغفار ضروری قرار دیا گیا، برخلاف دوسری اشیاء کے کہ ان کی تخلیق ہی اس لیے ہے کہ انسان ان کو قتل کر کے اپنی ضروریات کی بہم رسانی کرے۔ ان پر بسم اللہ کہنے کا درجہ استغاثی ہے، وجوبی نہیں ہے بلکہ

اہل کتاب کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے

۲۶- اور ان لوگوں کا کھانا جن کو کتاب دی گئی ہے تمہارے لیے حلال ہے۔ یہاں طہام کھانے سے مراد جو بیوہ ہے۔ یعنی کوئی بیوہ یا نصرانی بشرطیکہ اسلام سے مرتد ہو کر یہودی یا نصرانی نہ بنا ہو،

اگر مصلحت ہالور ذبح کرتے وقت غیر افشاء کا نام نہ لے تو اس کا کانا مسلمان کو حلال ہے۔ مرقہ کے الحام جدا لگا کر ہیں۔ اہل کتاب کے کانا مصلحت پہنچنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے اور ان کے درمیان کھانے پینے میں کوئی رکاوٹ اور کوئی چھوٹ چھات نہیں ہے۔ ہم ان کے ساتھ کھا سکتے ہیں اور وہ ہمارے ساتھ لیکن یہ ہم اہانت فیض سے بچتے اس لئے کہ اس کا اعادہ فرمایا گیا ہے کہ تمہارے لیے پاک چیزیں حلال رہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر اہل کتاب پاک دھارے کے ان قوانین کی پابندی نہ کریں جو اسلامی قانون کے نقطہ نظر سے مروجہ ہیں یا اگر ان کے کھانے میں حرام چیزیں شامل ہوں تو اس سے پرہیز کرنا چاہیے مثلاً اگر وہ خدا کا نام لیے بغیر کسی جانور کو ذبح کریں یا اس پر خدا کے سوا کسی اور کا نام لیں تو اسے کھانا ہمارے لیے ہائز نہیں ہے۔ اسی طرح اگر ان کے دسترو خوان پر شراب یا مسکد ہو یا اللہ کوئی چیز حرام ہو تو ہم ان کے ساتھ شریک نہیں ہو سکتے۔ اہل کتاب کے سوا دوسرے غیر مسلموں کا بھی یہی حکم ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ذبح اہل کتاب ہی کا جائز ہے جبکہ انہوں نے اس پر خدا کا نام لیا ہو ہے غیر اہل کتاب تو ان کے ہلاک کیے ہوئے ہالور کو ہم نہیں کھا سکتے۔

آیت کی تشریح میں جو کچھ بعض شارحین قرآن سنگین غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ یہاں چند ضروری باتوں کی طرف اشارہ کر دیا جائے۔ اول یہ کہ اہل کتاب کرن ہیں دوم یہ کہ آیت میں طعام اہل کتاب سے کیا مراد ہے۔ اتفاق آمت کتاب سے مراد وہ آسمانی کتاب ہے جس کا کتاب اللہ ہوتا قرآن سے معلوم ہو چکا ہے جیسے تورات، انجیل، زبور، صنف موسیٰ اور صنف ابراہیم وغیرہ اسی لیے وہ توہینِ قرآن میں سے کسی کتاب پر ایمان رکھتی ہوں اہل کتاب ہیں۔ مشرکین، مجوس، بت پرست، ہندو، بدھ اور سکھ وغیرہ اہل کتاب نہیں ہیں۔

یہاں یہ سوال جلیلہ امتیاز لکھنا ہے کہ یہود نصاریٰ کو اہل کتاب کہنے اور کہنے کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ صحیح طور پر اصلی تورات و انجیل پر ایمان و عمل کے پابند ہوں۔ قرآن کی بے شدہ تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ اہل کتاب ہونے کیلئے صرف اتنی بات کافی ہے کہ وہ کسی آسمانی کتاب کے قائل ہوں اور اس پر عمل کے مدعی ہوں۔ خواہ وہ کتنی گرا بیروں کے شکار ہو چکے ہوں یہ حقیقت ہے کہ قرآن نے جن کو اہل کتاب کا لقب دیا ہے ان کے بارے میں یہ بھی الکشاف کیا ہے کہ وہ آسمانی کتابوں میں تحریف کرتے ہیں بلکہ عزیر کو خدا کا بیٹا اور مسیح کو خدا کا فرزند

قرار دیتے ہیں۔ ان کی طرف مشترکاً نہ اعمال اور افکار کی صحیح نسبت کی ہے لیکن ان حالات و مصنفات کے حامل ہوسلے کے باوجود قرآن نے ان کو اہل کتاب کہا ہے۔ البصاح نے احکام القرآن میں نقل کیا ہے کہ فاروق اعظم کے زمانہ خلافت میں آپ کے کسی گزند نے دریافت کیا کہ یہاں کچھ لوگ ایسے ہیں جو تورات کو مانتے ہیں اور یہود کی طرح یوم السبت کی تعظیم کرتے ہیں مگر قیامت پر ایمان نہیں رکھتے۔ ایسے لوگوں سے کیا معاملہ کیا جاسکتا ہے۔ فاروق اعظم نے جواب دیا کہ ان کو اہل کتاب ہی سمجھا جائے۔

کیا یہودی کے لیے اصلاً یہودی ہونا اور عیسائی کے اصلاً عیسائی ہونا ان کے ذہن کے مسلمان کے لیے حلال ہونے کی شرط ہے؟ یا محض اسماء اور نسل ان کا اہل کتاب ہونا کافی ہے؟ کچھ بزرگوں نے اگرچہ یہی سمجھا ہے کہ یہودی کے لیے اصلاً یہودی ہونا اور عیسائی کے لیے اصلاً عیسائی ہونا ملت کی بنیادی شرط ہے۔ حضرت علی نے بنی نضیب کے نصاریٰ کے بارے میں فتویٰ دیا تھا کہ بنی نضیب کے نصاریٰ کا ذہن دیکھو انہوں نے مذہب نصرانیت میں سے شراب نوشی کے علاوہ کچھ نہیں لیا۔ (منظری)

لیکن عام روایت تبیین کی تحقیق یہی ہے کہ یہی عام نصرانیوں کی طرح ہیں اس لیے انہوں نے بنی نضیب کے عیسائیوں کے ذہن کو بھی حلال قرار دیا۔ چنانچہ القرطبی نے جمہور امت کی طرف نسبت کر کے لکھا ہے کہ

جمہور امت کہتے ہیں کہ نصرانی کا ذہن حلال ہے خواہ بنی نضیب میں سے ہو یا ان کے سوا کسی دوسرے قبیلے سے ہو اسی طرح ہر یہودی کا بھی ذہن حلال ہے۔

(قرطبی ص ۷۸، ج ۶)

ہاں حین عیسائیوں اور یہودیوں کے بارے میں یقینی طور پر یہ بات معلوم ہو جائے کہ وہ حضرت موسیٰ اور عیسیٰ کو نبی ہی نہیں مانتے ہیں وہ اہل کتاب کے حکم میں نہیں۔

آیت میں طعام سے مراد

طعام کے لغوی معنی کھانے کی چیز کے ہیں۔ جس میں از روئے لغت ہر قسم کی کھانے کی چیز داخل ہے لیکن جمہور امت کے نزدیک یہاں طعام سے مراد صرف اہل کتاب کا ذہن ہے کیونکہ گوشت کے سوا دوسری اشیاء خدا نے اہل کتاب اور دوسرے کفار میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کھانے پینے کی خشک چیزیں گھسوں، پھن، چاول اور چیل وغیرہ ہر کافر کے باعث حلال و جائز ہے۔ اس میں کسی کا

کوئی اختلاف نہیں ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اہل کتاب اور دوسرے کفار کے طعام میں جو فرق فرمایا ہو سکتا ہے وہ صرف ان کے ذہن میں ہے اس لیے اس آیت میں با اتفاق است طعام اہل کتاب سے مراد ان کا ذبیحہ ہے۔ یہ مقرر ہونا کے بعد کہ طعام سے مراد ذبیحہ ہے یہ بات سمجھ لینی آسان ہے کہ اہل کتاب کا ذبیحہ تین شرطوں کے ساتھ حلال ہے۔

اول: کہ وہ ذبیحہ ان جانوروں میں سے نہ ہو جو اسلامی قانون میں مسلمانوں کے حرام ہیں جیسے سور کا گوشت وغیرہ۔

دوم: یہ کہ ذبیحہ کے وقت اس پر اللہ کا نام لیا جائے غیر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو۔ ایسا ذبیحہ صحیح پر خدا کا نام نہ لیا جائے یا غیر اللہ کا لیا جائے خود مسلمان کا بھی حلال نہیں ہے چر جب تک کہ یہودی یا عیسائی۔ اجماع اس نے امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد کا یہی مذہب لکھا ہے۔

تیسری شرط یہ ہے کہ وہ اسلام سے متقدم ہو کہ یہودی یا نصرانی نہ بنے ہوں اس لیے کہ مرد کا ذبیحہ حلال نہیں ہے جیسا کہ شیخ الاسلام نے بتایا ہے۔

مسلمان کا کھانا کتنا ہی کچھ لے جائز ہے

۴۷۔ اور تمہارا کھانا ان کے لیے حلال ہے اس مقام پر مسلمان کے کھانے کتنا ہی کے لیے جائز ہونے کا ذکر بطور مجازات اور مکانت کے استطراد فرمادیا۔ یعنی بمعنی احادیث میں جو آیا ہے لایا مکمل طعام الا تفرق تیرا کھانا دکھائے مگر پرہیزگار اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ غیر پرہیزگاروں کے لیے نہ لایا کھانا حرام ہے۔ جب مسلمان کے لیے کافر کئی کے ذبیحہ کی اجازت ہو گئی تو ایک دوسرے کا ذبیحہ اور کھانا دوسروں کے لیے کیوں حرام ہو گا۔ یہ مسلمان رک بے تھے کہ معلوم نہیں کہ ہر ایک جائز بھی ہے یا نہیں کہ ہم کتا بیوں کو اپنے کھانے میں سے کھلا سکیں۔ یہاں تصریح کر دی گئی ہے کہ بے تکلف جائز ہے۔ نسفی اور رازی نے یہ بات کھول کر سمجھائی ہے۔ یہاں یہ مراحت اس لیے بھی ضروری ہے کہ نکاح کا بیان اس کے فوراً بعد آ رہا ہے۔ ذبیحہ تو طریقین سے حلال ہے لیکن نکاح کا قیاس اس پر درست نہیں ہے۔ نکاح مضران کی عورتوں سے مسلمان مرد کا جائز ہے مسلمان عورت کا مصلحت ان کے مرد سے جائز نہیں ہے۔ یہ امام رازی کی لکھتہ آفرینی ہے اور خوب ہے۔

شادی کا مقصد محنت ہے

۲۸۔ نیز تمہارے لیے مسلمان پاک دامن اور کتابی عورتیں حلال ہیں بشرطیکہ ان کے مہر ان کے سولے کروڑ اور مقصود قید نکاح میں لانا ہو۔ پاکدامن کی قید شاید ترغیب کے لیے ہو۔ یعنی ایک مسلمان کو چاہیے کہ نکاح کرتے وقت پہلی نظر عورت کی محنت پر ہو۔ یہ مطلب نہیں کہ پاکدامن کے سوا کسی اور سے نکاح صحیح نہیں ہے۔ اصل ارشاد میں محنت لکھا ہے۔ شامعین قرآن نے اسے پاکدامنی کی محنت کے معنی میں لیا ہے۔ اس کا مصدر احسان ہے۔ یہ حصّہ سے بنا ہے حصّہ کو کہتے ہیں۔ اسی سے حصّان، احسان، محصّان اور محصّین الفاظ بنتے گئے ہیں۔ حصّان قرآن میں نہیں آیا ہے مگر عرب شاعروں نے استعمال کیا ہے۔ اس کے معنی پاکدامن عورت کے ہیں۔ احسان کے معنی حفاظت میں لینے کے ہیں۔ لفظ احسان سے محنت لاکر نکاح کی غرض کی طرف اشارہ کیا ہے کہ شادی کا مقصد یہ ہے کہ عورت کو عصمت و حفاظت میں لایا جائے۔ صرف حیوانی خواہش کو پورا کرنا نکاح کا مقصد نہیں ہے یعنی ایسا نہ ہو کہ صرف لطف اندوزی کا ارادہ ہو اور بس۔ اس لفظ کے ذریعے کلمے لفظوں میں بتایا گیا ہے کہ شادی سے عورتوں کا مقصد یہی ہے کہ وہ محنت و عصمت کی زندگی گزاریں گی۔ اخلاق و کردار بلند رکھیں گی، اور اپنے داعیات فطرت کو اپنے شوہر کے ذریعے پورا کریں گی۔ اور ان میں یہ بھی اشارہ ہے جیسا کہ شیخ الاسلام نے بتایا ہے کہ شادی کرتے وقت اقل نظر عورتوں کی پاکدامنی اور محنت و عصمت پر ہی ہونی ضروری ہے۔ مگر یا قرآن نے بتا دیا کہ شادی کے ذریعے گویا عصمت کو محفوظ رکھا جاتا ہے۔ بہر حال نکاح کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ محنت و عصمت اور ناموس و زہد کی انمول دولت جو انسان کو بخشی گئی ہے۔

کتابی عورت کے نکاح

اس دولت کی حفاظت کا آئینی طریقہ صرف نکاح ہے۔ چونکہ نکاح کا مقصد محنت و عصمت کا تحفظ ہے اس لیے کتابی عورتوں سے شادی کرنے میں بھی احسان یعنی عورتوں کے پاکدامن ہونے کو اولیت دی ہے مگر یاد رہے کہ بتایا یہ جارہا ہے کہ ایک مسلمان کو چاہیے کہ نکاح

کرتے وقت پہلی نظر عورت کی حفت اور پاکدامنی پر رکھے اسی لیے فرمایا کہ
تمہارے لیے کتابی عورتیں حلال ہیں بشرطیکہ ان کے مہران کے حوالہ کر دو اور
مقصود قید نکاح میں رکھنا ہو۔

اہل کتاب کے ایک مخصوص حکم کے ساتھ دوسرے مخصوص حکم بھی بیان فرمادیا یعنی اگر کتابی عورت
سے نکاح کرنا شرعاً جائز ہے۔ بشرطیکہ اسے اجازت نہیں ہے ولا تحکو المشرکات حتی یومن بآیہ
نکاح کی اجازت صرف یہود و نصاریٰ کی عورتوں سے دی گئی ہے اور اس کے ساتھ یہ شرط بھی لگا دی
گئی ہے کہ وہ معصنات ہوں۔ اس حکم کی تفصیلات میں علماء کا اختلاف ہے۔ عبداللہ ابن عباس
کا خیال ہے کہ یہاں اہل کتاب سے مراد وہ اہل کتاب ہیں جو اسلامی حکومت کے شہری ہوں۔ بچے دارا لہرب
اور دارا کفر کے یہود و نصاریٰ تو ان کی عورتوں سے نکاح کرنا درست نہیں ہے۔ احناف اس سے
تعمدًا سا اختلاف کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک یرونی محاکک کے اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح
کرنا حرام تو نہیں مگر مکروہ ضرور ہے۔ برخلاف اس کے سعید بن المسیب اور حسن بصری اس کے
قائل ہیں کہ آیت اپنے حکم میں عام ہے لہذا ذمی اور غیر ذمی میں فرق کرنے کی ضرورت نہیں
پھر معصنات کے مفہوم میں یہاں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ حضرت عمر کے نزدیک اس سے
پاک دامن عصمت ماب عورتیں ہیں اور اس بنا پر وہ اہل کتاب کی آزاد منسل عورتوں کو اس اجازت
سے خارج کرتے ہیں۔ یہی ائمہ حسن، شبلی اور سبکی کی ہے اور ابو حنیفہ نے بھی اسی کو پسند کیا ہے
امام شافعی کی رائے یہ ہے کہ یہاں یہ لفظ لونڈیوں کے مقابلے میں استعمال ہوا ہے یعنی اس سے مراد اہل
کتاب کی وہ عورتیں ہیں جو لونڈیاں نہ ہوں۔

احناف نے جو دارا کفر اور دارا لہرب میں کتابی عورتوں سے نکاح کو مکروہ قرار دیا ہے۔ ان کے
یہاں اس کے بواضع کے لیے دارا اسلام اور اسلامی حکومت کا شہری ہونا شرط ہے۔ یہ بات دلیل کی
بجی تلی ترازو میں اگر رکھی جائے تو بہت وزنی معلوم ہوتی ہے۔ یہ بات انہوں نے غالباً قرآنِ کلام
سے استنباط فرمائی ہے۔ آیت میں الیموم سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اجازت میں وقت کے حالات
کو بھی دخل ہے۔ کہا یہ چاہتا ہوں کہ جب اجازت مل رہی ہے اس وقت کنار کا دبہر ختم ہو گیا
اور مسلمان ایک ناقابل شکست طاقت بن چکے تھے۔ یہ اندیشہ نہیں تھا کہ ان کو کتبیات سے

نکاح کی اجازت دی گئی تو وہ کسی اسباب کثری میں مبتلا ہو کر تہذیب معاشرت اور اعمال و اخلاق میں ان سے متاثر ہوں گے بلکہ توقع تھی کہ مسلمان ان سے نکاح کریں گے تو ان کو متاثر کریں گے اور اس راہ سے ان کتابیات کے عقائد و اعمال میں خوشگوار تبدیلی ہوگی اور عجب نہیں کہ ان میں بہت سی ایمان و اسلام سے شرف ہر جاہلیں۔ نیز یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ کتابی عورتوں سے نکاح کی اجازت ہر حال ایک اجازت ہے اس میں آدمی کے خود اپنے اور اپنے خاندان کے دین و ایمان کے لیے جو خطرہ ہے وہ مخفی نہیں ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر مسلمان مردوں کو تو کتابی عورتوں سے نکاح کی اجازت دی گئی لیکن مسلمان عورتوں کو کسی صورت میں بھی کسی غیر مسلم سے نکاح کی اجازت نہیں ہے خواہ کتابی ہو یا غیر کتابی۔ یہ اس بات کی کملی دلیل ہے کہ یہ اجازت صرف ایک اجازت ہے یہ کوئی مستحسن چیز نہیں ہے۔ اگر ماحول اسلامی تہذیب و معاشرت کا ہو اور مسلمان کسی نیک مصلحت کتابی عورت سے نکاح کرے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے لیکن کا افراد ماحول میں جہاں کفر اور اہل کفر کا غلبہ ہو اس قسم کا چاہے اس آیت کے الفاظ کے خلاف نہ ہو لیکن اس کی روح کے خلاف ضرور ہے۔ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی قدس سرہ العزیز نے یہ بات بڑے پتے کی منگی ہے کہ کسی چیز کے حلال ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس میں فی حد ذاتہ کوئی وجہ تحریم نہیں، لیکن اگر خارجی اثرات و حالات ایسے ہوں کہ اس حلال سے مستفیع ہونے میں بہت سے حرام کار نکاح کرنا پڑے بلکہ کفر میں مبتلا ہونے کا احتمال ہو تو ایسے حلال سے انتہاء کی اجازت ردی ہلتی گی۔ موجودہ زمانے میں یہود و نصاریٰ کے ساتھ کھانا پینا ہے ضرورت احتیاط کرنا ان کی عورتوں کے حال میں پھنسا یہ چیزیں جو خطرناک نتائج پیدا کرتی ہیں وہ مخفی نہیں لہذا بددینی کے اسباب و ذرائع سے بچنا ہی چاہیے۔

مجموعہ صحابہ و تابعین کے نزدیک اگرچہ از روئے قرآن اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح فی نفسہ جائز ہے لیکن ان سے نکاح کرنے پر جو دوسرے مفاسد اور خرابیاں اپنے لیے اپنی اولاد کے لیے بلکہ پوری امت اسلامیہ کے لیے لازمی طور پر پیدا ہوں گے ان کی وجہ سے اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کو بھی مکروہ سمجھتے تھے۔

البحرین نے احکام القرآن میں شیعہ بن سکر کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت حذیفہ بن الیمان جب مدائن پہنچے تو وہاں ایک یہودی عورت سے شادی کر لی۔ حضرت فاروق اعظم کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے حضرت حذیفہ کو خط لکھا کہ اس کو طلاق دے دو۔ حضرت حذیفہ نے جواب میں دریافت کیا کہ کیا یہ شادی حرام ہے۔ فاروق اعظم نے جواب میں تحریر فرمایا

کہ میں حرام نہیں کہتا لیکن ان لوگوں کی عورتوں میں بالعموم عصمت و پاکدامنی نہیں برتی ہے اس لیے مجھے خطرہ ہے کہ کہیں آپ لوگوں کے گھرنے میں اس راہ سے بدکاری ڈاکھوتے۔ اور امام محمد بن الحسن نے کتاب الاثام میں اس واقعہ کو بروایت امام ابوحنیفہ اس طرح نقل کیا ہے کہ دوسری بار فاروق اعظم نے جب حضرت حذیفہ کو خط لکھا تو اس کے الفاظ یہ تھے۔

میں آپ کو قسم دیتا ہوں کہ میرا یہ خط اپنے ہاتھ سے لکھنے سے پہلے ہی اسی کو طلاق کے کڑا ذکر دو۔ مجھے یہ خطرہ ہے کہ کہیں دوسرے مسلمان بھی اقتداء کریں۔ اور اہل ذراہلی کتاب کی عورتوں کو ان کے حسن و جمال کی وجہ سے مسلمان عورتوں پر ترجیح دینے لگے۔ تو مسلمان عورتوں کے لیے اس سے بڑی مصیبت کیا ہوگی۔
(کتاب الاثام ص ۱۵۶)

اس خط کو نقل کر کے امام محمد نے لکھا ہے کہ فقہاء حنفیہ اسی کو اختیار کرتے ہیں کہ وہ اس نکاح کو حرام تو نہیں کہتے لیکن دوسرے مناسد اور خواہوں کی وجہ سے مکروہ سمجھتے ہیں۔ اور شیخ ابن الہمام نے فیخ القدر میں لکھا ہے کہ حذیفہ کے علاوہ ظہر اور کب بن مالک کو بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا کہ انہوں نے اس آیت کی بنا پر اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کر لیا جب فاروق اعظم کو اس کی اطلاع ملی تو سخت ناراض ہوئے اور ان کو حکم دیا کہ طلاق لے دیں۔ (مظہری)
فاروق اعظم کا زمانہ خیبر القرون کا زمانہ ہے جبکہ اس کا کوئی احتمال نہ تھا کہ کوئی یہودی نصرانی عورت کسی مسلمان کی بیوی بن کر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کوئی سازش کر سکے۔ اس وقت تو صرف یہ خطرات سامنے تھے کہ کہیں ان میں بدکاری ہو تو ان کی وجہ سے ہمارے گھرنے لگے ہوں یا ان کے حسن و جمال کی وجہ سے لوگ ان کو ترجیح دینے لگیں جس کا نتیجہ ہو کہ مسلمان عورتیں تکلیف میں پڑ جائیں۔ فاروق اعظم کی دور میں نگاہ ان مناسد کے پیش نظر ان بزرگوں کو طلاق پر مجبور کرتی ہے۔ اگر موجودہ دور کا نقشہ ان کے سامنے ہوتا تو اندازہ کیجئے کہ ان کا فیصلہ کیا ہوتا۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ نفس جواز میں کوئی گفتگو نہیں اور نہ آیت قرآنی کے بعد اس کی کوئی گنجائش ہے۔ البتہ فقہانے مناسد پر نظر کر کے اور مصلحت شرعی کا لحاظ کر کے یہ فتویٰ دیا ہے کہ بلا ضرورت ایسے نکاح سے بچنا چاہیے۔ فیخ ابن الہمام کہتے ہیں کہ کتابی عورت سے نکاح ۲۰ سالہ ہے لیکن اچھا یہ ہے کہ نہ کوئی۔ درمختار میں ہے کہ نکاح ہو سکتا ہے مگر مکروہ ہے۔

اور کنایہ صبر کے ساتھ نکاح کی کراہت تو ہر شبہ سے بالا ہے۔ حضرت علیؑ کا ایک اثر ہے جس میں اپنے کتا پر بیٹھ کر اور طرب سے نکاح پر کراہت ظاہر کی ہے۔ (المبسوط)
مقلد شامی نے فیصلہ کیا ہے کہ نکاح غیر صبر کے ساتھ تو مکروہ تنزیہی ہے لیکن صبر کے ساتھ مکروہ سحری ہے۔

نکاح کا بنیادی مقصد عفاف ہے

آخر میں ارشاد ہوا ہے اور مقصد قید نکاح میں لانا ہو۔ اصل الفاظ میں محضین آیا ہے۔ یعنی قید نکاح میں لانے کو، گویا اس طرط اشارہ ہو گیا کہ نکاح بظاہر قید ہے لیکن یہ قید ان اُزادوں اور دوسری رانیوں سے بہتر ہے جن کی طلب میں انسان غایم تمام سلسلہ ازدواج بھی کر مہم کر دینا چاہتے ہیں نہ گویا اس طرح صحت نکاح کی شرطوں کی طرف اشارہ کر دیا کہ اصل کتا پہلے حودتوں کے ساتھ تم نکاح کر سکتے ہو بشرطیکہ ان کا تہا کر دو اور بغیر قید نکاح سے مقصود ان حودتوں کو فی الواقع بیوی بنانا مقصود ہو۔ یہاں صحت نکاح کی دو بنیادی شرطیں ظاہر ہو گئیں، ایک یہ کہ نکاح دل یعنی جہر کے ساتھ ہو۔ دوسری یہ کہ عورت کو اپنے قبضہ میں رکھنا مقصود ہو، ان دونوں شرطوں کے ساتھ قہر کے لیے کتلی حودتوں سے نکاح جائز ہے۔ اس آیت میں لفظ احسان عفاف اور پاکدامنی کے معنی میں ہے یعنی ایک مرد ایک عورت کو سنجیدہ ارادے کے ساتھ اور زندگی بھر کی رفاقت کے مزم کے ساتھ اپنی حفاظت و حمایت میں لے اور عورت اسی شعور و ارادے کے ساتھ اس کے حصن و حمایت میں داخل ہو۔ اس احسان کے بغیر عورت اور مرد کے تعلق سے وہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا جو اسلامی قانون کے نکاح میں پیش نظر ہے اگر کوئی شخص کسی عورت سے وقتی تعلق پیدا کرتا ہے تو اگر اس کے لیے اس نے نکاح کی رسم بھی پوری کر دی ہے اور اس کو مال بھی لے دیا ہے لیکن روح احسان کے خلاف ہے۔ قرآن نے احسان کی شرط لگا کر نکاح کے بنیادی اور اہم مقصد کو واضح کر دیا ہے کہ اسلامی قانون میں نکاح کا مقصد اخلاق کی حفاظت اور عفاف ہے، اسی لیے وہ ناکو حرم کرتا ہے اور نزع انسانی کی صفوں کو مجبور کرتا ہے کہ اپنے فطری تعلق کو ایک ایسے ضابطہ کا پابند بنادیں جو اخلاق کو کھنٹ اور بے حیائی سے اور تمدن کو فساد

سے محفوظ رکھنے والا ہر ۱۰ اسی لیے یہاں نکاح کو اخصان سے تعبیر کیا ہے جو نکاح کرتا ہے وہ عیسٰی ہے اور جس سے نکاح کیا جاتا ہے وہ محض ہے۔ ۱۰ اس آیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی نظر میں سب سے زیادہ اہمیت اس چیز کی ہے کہ مرد و عورت کے تعلق میں اخصان ہو یعنی اخلاق اور عفت و عصمت کا بول بولایا تحفظ ہو۔ یہ ایسا مقصد ہے جس کے لیے ہر چیز کو قرآن کیا جاسکتا ہے مگر کسی دوسری چیز پر اس کو قربان نہیں کیا جاسکتا۔

نکاح اسلام میں اخلاقی و روحانی ادارہ ہے

۲۹۔ نہ یہ کہ آزاد شوہر والی کرنے لگو یا بچہ کی چھپے آشنائیاں کرو۔ جس طرح پہلے عورت کی پاکدامنی کا ذکر کیا تھا یہاں مرد کو پاک بزا اور عقیف رہنے کی ہدایت فرمادی ہے۔ بعضیات لطیفیں والطیبون للطیبات اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کی نظر میں نکاح کی غرض مگر ہر عصمت کو محفوظ اور مقصد ترویج کو پورا کرنا ہے۔ شوہر والی اور بوس پرستی نہیں ہے بلکہ اصل نکاح اسلام میں کوئی ضمنی اور ثانوی حیثیت کہ چیز ہمیں ہے بلکہ ایک اہم اور زبردست اخلاقی اجتماعی اور روحانی ادارہ ہے۔ اس کے مصالح اور منافع فرد کے خاندان کے معاشرے کے، سب کے لیے شمار ہیں۔ اسکی نکاح کو اردو میں خانہ آبادی کہتے ہیں۔ اُبڑے ہوئے سنان اور ویران گھرنے اسی ذریعے سے آباد ہوتے ہیں۔ مرد و عورت کے اس باہمی تعلق کو اسلام نے صرف اسی صورت میں جائز رکھا ہے کہ زوجین کا اس سے اصل مقصد ایک خاندان کی بنیاد رکھنا ایک مستقل معاشرہ قائم کرنا ہو۔ اپنے کو مذہب و تمدن کہلانے والی قوموں میں نکاح کی اس صورت کے علاوہ مرد و زن کے باہمی تعلق کے لیے دو اور صورتیں بھی مانگے ہیں۔ ایک صورت تو صاف اور کھلی بدکاری کی ہے۔ عورت زنا کے لیے آزاد ہے۔ اس کو باقاعدہ پیشہ بناتے نہ سوسائٹی اسے اس سے روک سکے نہ حکومت، جو مرد جب چاہے اس کے ہاں ہاں کرے ایک خاص کرایہ شے کہ اپنے جسم کا پانی بھائے اور منہ کالا کرے۔ دوسری صورت چوری کی ہے آشنائی کی ہے یعنی عصمت کے معنی ہی مٹ جائیں اور شریف و بیسوا میں کوئی فرق نہ رہے۔ قرآن نے دونوں صورتوں کو لعنت قرار دیا ہے۔ پہلی صورت سفاح ہے اور

دوسری صورت انکاؤغدن ہے۔ ہائز صورت مرد و عورت کے جنسی تعلق کی مرث نکاح بتاتی ہے نکاح چوری جیسے نہیں اعلان کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس میں خدا کا نام درمیان میں لا کر خالق کائنات کا واسطہ ڈال کر مرد و عورت کی راحت و آسائش کا ذریعہ بنایا ہے۔ اور عورت مرد کی خدمت کی ذمہ داریوں کو قبول کر لیتی ہے۔ دونوں پر ایک دوسرے کے حقوق قائم ہوتے ہیں، فرائض عائد ہوتے ہیں، دونوں اپنے کو مستقل بنائے کے لیے عمر کے ہر دور، مال و اقبال کے ہر زمانہ پر خدا کے لیے سعی الامکان تیار کرتے ہیں اور یہ سب کچھ مجلس میں گواہوں کی موجودگی میں ہوتا ہے۔ محضین خیر صالحین کا متخذی اخذان کا قرآن لے از دواچی و ناگلی زندگی کا وہ بلند ترین سیار پیش کر دیا جس میں کوئی مادی تہذیب آج تک نہیں پہنچ سکی ہے۔

ایمان و کفر کا تعابلی مطالعہ

۳۰۔ اور جو بھی ایمان کی روش پر چلنے سے انکار کرے گا اس کا سارا کارنامہ زندگی بے کار ہو کر رہ جائے گا اور وہ آخرت میں دیر الیہ ہو گا۔ جن کتابی عورتوں سے نکاح کی اجازت لی ہے اس کا قاعدہ یہ ہونا چاہیے کہ عورت کی حیثیت عورت کے دل میں گھر کر جائے، نہ یہ کہ کتابیات پر مشغول ہو کر اٹا اپنا متاع ایمان ہی گنوا بیٹھے اور خسر الدنیا والاخرت کا مصلوق ہو کر رہ جائے۔ چونکہ کافر عورت سے نکاح کرنے میں اس فتنہ کا قوی احتمال تھا۔ اس لیے وہ من یکفر بالایمان کہ تہدید نہایت بروقت ہے۔ یہ برا خیال ہے۔ باقی حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اہل کتاب کو کفر سے دو حکم میں مخصوص کیا، یہ فقط دنیا میں ہے اور آخرت میں ہر کافر خراب ہے اگر نیک عمل بھی کرے تو قبول نہیں ہے بلکہ حضرت شاہ صاحب کا مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب کو دنیا کی زندگی میں جو رعایت دی گئی ہے کہ ان کا ذبح حلال ہے اور ان کی عورتوں سے شادی جائز ہے تو اس رعایت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ آخرت میں بھی ان کو کوئی رعایت ملے گی۔ آخرت میں ان میں اور دوسرے کافروں میں کفر کی حد تک کوئی فرق نہیں ہے۔ اس صورت میں کفر بالایمان کے مجرم کے مرتکب اہل کتاب ہوں گے اور حضرت مولانا عثمانی نے جو مطلب بتایا ہے اس کی بنیاد پر کفر بالایمان کے مجرم اہل ایمان ہوں گے۔ مطلب یہ ہے کہ جو شخص اہل کتاب کے ذبح کھانے

اور ان کی عورتوں سے نکاح کرنے کی اہازت ہے فاقہ اٹھاتے وہ اپنے ایمان و اخلاق کی طرف سے ہوشیار رہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ کافر برہمنی کے عشق میں مبتلا ہو کر یا اس کے عقائد و اعمال سے متاثر ہو کر وہ اپنے ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھے یا اخلاق و معاشرت میں ایسی روش پر چل پڑے جو ایمان کے منافی ہو۔ صاحب کشف نے تصریح کی ہے کہ ایمان سے یہاں شریعت ایمان مراد ہیں۔ گویا ایمان مصدر ہے اور معنی میں اسم مفعول کے ہے یعنی مومن ہو وہ باتیں وہ احکام جن پر ایمان کا مطالبہ ہے۔ متغنیات اور ایمانی کلمات معنی میں جو شخص ایمان لانے کے بعد ایمان کے تقاضوں کو نہیں ماننے لگتا اس کا خواہ کیا ہی عمل ہو بے کار ہو کر رہا جاتا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ آدمی خدا اور رسول کو ماننے کا دعویٰ بھی کرے اور ساتھ ہی خدا اور رسول کے احکام کے خلاف بعض اپنی خواہشات کی اتباع میں قانون و شریعت ایکاد کر کے اس پر عمل پیرا بھی ہو۔ یہ وہی ایمان جس کو قرآن نے فوس بعض ذلکمن جمع سے تعبیر کیا ہے۔ کفر و ایمان دونوں کے اس ملغوبہ کی خدا کے ہاں کوئی قیمت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں صرف وہ ایمان معتبر ہے جو نبوت کی شرطوں پر ہو جو لوگ اپنی شرائط پر ایمان لاتے ہیں ان کا ایمان ان دعیان ایمان کے منہ پر جھینک مارا جاتا ہے۔ اور اس قسم کے ایمان کے تحت کیے جوتے ساسے اعمال خدا سے ان بے قیمت ہوں گے۔ مطلب یہ ہے کہ ایمان روح ہے کوئی عمل کیسا ہی خوشنما ہو اگر روح سے خالی ہے تو اس کا شمار نیک میں ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ایمان نام اسی روح عمل کا ہے۔

لَأَتِيَنَّ الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ
وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ
وَأَنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَى أَوْ عَلَى سَفَرٍ
أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِنْكُم مِّنَ الْغَايَةِ أَوْ لَمْ يَمْسَسْهُ الْمَاءُ فَلَمْ يَجِدْ
مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُمْ
مِنْهُ مَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُفْعَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ حَرَجٍ وَلَكِنْ يُرِيدُ
لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ
وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمِمَّا أَقْبَلَهُ الَّذِينَ وَاثَقَكُمْ بِهِ
إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ
بِذَاتِ الصُّدُورِ

اے ایمان والو! جب تم نماز کو اٹھو تو اپنے چہرہ اور اپنے
ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھو لیا کرو اور اپنے سر وں پر مسح

کر لیا کرو^{۲۲} اور اپنے پیروں کو ٹخنوں سمیت (دھولیا کرو)^{۲۳} اور اگر تم حالتِ جنابت میں ہو تو خوب پاک و صاف ہو جاؤ^{۲۴}، اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی استنجا سے آتے یا تم نے عورتوں سے صحبت کی ہو، پھر تمہیں پانی دستیاب نہ ہو تو پاک مٹی سے تمیم کر لو، اس سے اپنے چہرہ اور ہاتھوں کا مسح کر لو، اللہ نہیں چاہتا ہے کہ تمہارے پر کوئی تنگی ڈالے بلکہ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ تمہیں خوب پاک و صاف رکھے، اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دے تاکہ تم اس کے شکر گزار ہو جاؤ^{۲۵} اور اپنے اوپر اللہ کی نعمت یاد کرو اور اس کے اس عہد کو بھی یاد کرو جس کا اس نے تم سے معاہدہ لیا ہے جب کہ تم نے کہا تھا کہ ہم نے سن لیا اور مان لیا^{۲۶} اور اللہ کی نافرمانی سے بچو بے شک اللہ سینوں کے اندر تک کا علم رکھتا ہے^{۲۷}۔

عہد جمودیت اور نماز کی اہمیت

ام دہائی نے یہاں پر خوب نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ آغاز سورت میں اہل ایمان کو حنفیہ پروردگار کے
 کی تحفہ کی تھی۔ ہندو اور خدا کے درمیان دو قسم کے عہد ہیں ایک عہد ربوبیت، دوسرے عہد جمودیت۔ دنیا
 کی ساری مصنفتوں کو اگر کوڑہ میں بند کیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ دوسری قسم کا عہد جمودیت ہے۔ کام دہائی کی
 لذت اور ازدواجی زندگی کی مزے داری۔ قرآن نے سابقہ آیات میں دونوں کے حلال و حرام کے بارے
 میں بتائے۔ اور گویا آخر میں فرمادیا کہ عہد ربوبیت کی میری جانب سے تکمیل ہو چکی ہے۔ اب تمہیں ہندو
 ہونے کی حیثیت میں اس دنیا میں رہتے ہوئے کام دہائی کی لذتوں اور ازدواجی زندگی کی لطافت و لذتوں
 سے محروم رہتے ہوئے عہد جمودیت کو پوری و خدائی سے پرہیز کرنا چاہیے۔ ایمان کے بعد طہارت میں
 سب سے اہم اور درجہ پرہیز نماز کا ہے اور نماز طہارت کے بغیر ہوتی نہیں ہے۔ اس لیے وضو، تیمم اور غسل
 کا ذکر کیا ہے۔ اور سید رشید رضا نے یہ بات بڑی پتے کی مکھی ہے کہ اصل مناسبت یہ ہے کہ پہلے
 کھانے اور شادی کا ذکر تھا۔ کھانے کا خیر برائی و براہ ہے اور شادی کا خیر و جنت ہے۔ بلکہ براہ سے
 وضو واجب ہوتی ہے اور جنابت سے غسل کا وجوب ہوتا ہے، اس لیے یہاں آؤ خداوند غسل کا
 تذکرہ کر دیا ہے اور کھانے والوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اوپر طعام و نكاح کے طہارت و جنابت کا ذکر
 فرما کر ان کی تطہیر فرمائی، اب نماز کی طہارت کا بیان ہو رہا ہے۔ نماز کی طہارت بصورتِ محدث و منبر
 ہے اور بصورتِ جنابت غسل ہے۔ اسی ذیل میں پانی نہ ملنے یا کسی عذر کی سبب میں تیمم کی اجازت
 مرحمت فرما کر اسی امت پر اتمامِ نعمت فرمادیا اور یہ بھی اس موضوع کا تکمیل پہلو ہے۔ توحید و رسالت
 کے اقرار کے بعد اسلام کا دوسرا ستون نماز ہے۔ یہ عملی ارکان میں سرفہرست ہے اور دینی میں اس
 کا جو مقام ہے وہ کسی بھی دوسرے عمل کا نہیں ہے۔ مومن کا ہر کام اللہ کی بندگی کا کام ہوتا ہے مگر نماز
 جیسی بندگی کی شان کسی کام میں نہیں ہوتی ہے، اسی کا باطن ہی نہیں ظاہر بھی سراپا بندگی ہوتا ہے
 نماز ہی ایمان کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ یہاں نماز کو ذکر کر کے اشارہ کیا ہے۔ اگر انسان کے اندر ایمان موجود
 ہو اور اللہ کی جمودیت اور اپنی عبودیت پر اسے یقین ہو تو یہ یقین سب سے پہلے نماز کی شکل
 اختیار کرتا ہے۔ یہ بات اسی آیت میں نماز کے ذکر سے معلوم نہیں ہوتی بلکہ قریب قریب ہر ان
 آیت قرآنی میں دکھائی دیتی ہے جس میں دین کے بنیادی اعمال بیان کیے گئے ہیں۔ اس انداز بیان
 سے قرآن اپنے مخاطبوں کے جملہ دماغ میں یہ بات اتارنا چاہتا ہے کہ دل میں اگر ایمان نہ آئے تو پہلے

ہر تو اس سے عمل کا جو پہلا نیکلے مادہ ناز کا پہلا ہوگا۔ حضرت فیض الاسلام نے اس موقع پر یہ بات خوب فرمائی ہے۔

اُمت محمدیہ پر جو عظیم الشان احسانات کیے گئے ان کا بیان سن کر ایک شریف اور متین شمس مومن کا دل شکر گزاری اور انعام و فاداری کے جذبات سے لبریز ہو جلتے گا اور فطری طور پر اس کی یہ خواہش ہوگی کہ اس منعم حقیقی کی بارگاہ رفیع میں دست بستہ کھڑے ہو کر جبین نیاز خم کرے اور اپنی خاموش منت پذیر ی اور انتہائی معبودیت کا ثبوت دے اس لیے ارشاد ہوا کہ جب ہمارے دیار میں حاضر ہو گا۔ وہ بوسنی ناز کے لیے انصورت پاک و صاف ہو کر آؤ۔ جن لٹائڈ ونیری اور مرغبات طبعی و انتہائی و صحت پہلی آیت میں اجازت دی گئی تھی یعنی طبعیات اور صفات و یک حد تک انسان کو ملتی صفات سے دو بہیمیت سے نزدیک کرنے والی چیزیں ہیں اور ان کی احداث و موجودات و ضرورتیں، ان ہی کے استعمال سے لازمی نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ لہذا ضروریات انسانی سے یکسو ہو کر جب ہماری طرف آنے کا قصد کر دو۔ پہلے بہیمیت کے آثار اور اعلیٰ و شرب و غیرہ کے پیدا کیے ہوئے مکدرات سے پاک ہو جاؤ۔ یہ پاکی و ضرورت غسل سے حاصل ہوتی ہے و صرف یہ کہ وضو کرنے سے بندہ مومن کا بدن پاک ہو جاتا ہے بلکہ جب وضو یا قاعدہ کیا جائے تو پانی کے قطرات کے ساتھ گناہ بھی جھڑ جاتے ہیں۔

۱۲۔ اے اہل ایمان جہنم ناز کر اٹھو۔ یعنی سو کر اٹھو یا دُنیا کے مشاغل چھوڑ کر ناز کے لیے اٹھ کھڑے ہو تو پہلے وضو کر لو، لیکن وضو کرنا اس وقت ضروری ہے جبکہ پہلے سے با وضو نہ ہو۔ آیت کے آخر میں ان احکام کی جو عرض و غایت بتائی گئی ہے یعنی دِلکن میری بیعت کر کے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ با تہ منہ و غیرہ دعوئے کا وجوب اسی لیے ہے کہ حق تعالیٰ تم کو پاک کر کے اپنے دربار میں جگہ دے اگر یہ پاکی پہلے سے حاصل ہے اور کوئی ناقص پیش نہیں آیا تو پاک کر پاکی کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اس کو ضروری قرار دینے سے اُمت حرج میں پڑتی ہے جس کی نفی ما میری اللہ لعل علیک من حرج میں کی گئی۔ ہاں مزید نظافت و نرا نیت اور نشاط حاصل کرنے کے لیے اگر تازہ وضو کر لیا جائے تو مستحب ہے۔ شاید اسی لیے اذاعتہ الی الصلوات میں سلیح کلام ایسی رکھی گئی ہے جس سے ہر مرتبہ ناز کی طرف جانے کے وقت تازہ وضو کی فریب ہوتی ہے۔

اصل ارشاد میں اذا اقتصد آیا ہے اور اس کے بعد الی الصلوة ہے۔ قائم کے بعد جب الی آتا ہے تو اس کے معنی قصد کرنے کے آتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ جب تم نماز کا قصد کرو۔ اسی بار پڑھاؤ۔ قرآن نے اس کی تشریح اذا اردتم سے کی ہے یعنی جب تم ارادہ کرو، شاید اس تشریح سے ان بزرگوں کے پیش نظر یہ ہے کہ اس کے عموم میں بیٹھ کر نماز پڑھنے والا بھی داخل ہوجاتے۔ ارشاد کا عموم بتا رہا ہے کہ یہ طہارت ہر نماز کے لیے ضروری ہے چنانچہ داؤد و ظاہری کا یہی مذہب ہے لیکن مسلمانوں کی حالت عامہ کو اس سے اتفاق نہیں ہے، وہ دیکھو کہ اسی پر ضروری کہتے ہیں جس کے وضو نہ ہو، اس لیے بالاتفاق یہاں اتنا فقرہ مخدوف مانا گیا ہے کہ حالت وضو میں نہ ہو یعنی محدث ہو۔ اسی لیے وضو پر وضو ضروری نہیں ہے۔ الجصاص نے لکھا ہے کہ اس موضوع پر فقہاء میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ مگر تازہ وضو کی بہت بڑی فضیلت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خلفائے راشدین کا عام تعامل بھی یہی تھا۔ اس تشریح کی اصل اس شخص پر ضرور اللہ علیہ وسلم کی سنت اور صحابہ کا عمل ہی ہے۔ چنانچہ مسند احمد، مسلم اور اصحاب سنن نے حضرت براء کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ

حضرت انور صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کے لیے وضو کرتے تھے لیکن قیام کے روز آپ نے ایک ہی وضو سے ساری نمازیں پڑھیں۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ یا رسول اللہ آج ایک ایسی بات دیجئے میں جو کبھی نہ دیکھی تھی یعنی یہ کہ آپ نے ایک ہی وضو سے نمازیں ادا کی ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے بالارادہ ایسا کیا ہے۔

یہی ہی امام بخاری اور اصحاب سنن نے حضرت عمرؓ و عامر الانصاری کے حوالے سے بتایا ہے کہ میں نے انس بن مالک سے سنا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کے لیے وضو فرماتے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ تبار طرز عمل کیا ہوتا تھا، فرمایا کہ ہم تو ایک ہی وضو سے اس وقت تک نمازیں پڑھتے رہتے تھے جب تک وضو ٹوٹے۔

اسی سنت علیہ کی بنا پر عثمانؓ نے اجماعاً یہ قید لگائی ہے کہ جب نماز کے لیے اٹھو اور اٹھا رہا وضو نہ ہو، امام نووی نے قاضی عیاض سے اس پر اہل فتویٰ کا اجماع نقل کیا ہے۔

فانا کے لیے وضو کی فرضیت

۳۰۲۔ تو اپنے چہروں اور اپنے ہاتھوں کو کھینچو سمیت دھو لیا کرو اور اپنے سر وں کا مسح کر لو، یعنی تیرا ہتھ سر پر پھیر لو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مدۃ العمر میں مقدار نامیہ سے

کم کا معنی ثابت نہیں ہوتا۔ مقدار نامیہ پر تھاتی سر کے قریب ہے، حنفیہ اس قدر مع کرنے کو فرض کہتے ہیں۔

یہاں وضو کے تین فرض بتائے ہیں، منہ کا دھونا، ہاتھوں کا کنیوں سمیت دھونا اور سر کا مسح کرنا۔ ان میں پہلا فرض منہ کا دھونا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت عملی سے معلوم ہوتا ہے کہ منہ دھونے میں کلی کرنا اور پاک صاف کرنا بھی شامل ہے بغیر اس کے منہ کے غسل کی تکلیف نہیں ہوتی ہے۔ فقہانے دونوں معنی مضمضہ کلی کرنا اور استنشاق پاک صاف کرنا کو سنت قرار دیا ہے لیکن امام احمد، امام اسحق، امام ابو حنیفہ اور ابن النذر اس کے وجوب کے قائل ہیں۔ اور اس کے وجوب ہونے پر ان کا موقف یہ ہے کہ منہ اور ناک چہرے میں داخل ہیں۔ نیز احادیث میں اس کا حکم اور التزام ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ کلی کرنا اور ناک صاف کرنا ایک امر منہ میں ہے اور بس، بالکل ایسے ہی جیسے وضو شروع کرنے سے پہلے ہاتھ دھو لینے کا وجوب وضو میں داخل ہیں تاکہ من ہاتھوں سے آلودی وضو کرنا سے دور رکھنے کے لیے پاک ہو جائیں۔

دوسرا فرض وضو میں ہاتھوں کا کنیوں سمیت دھونا ہے یہ بات کہ کنیوں کا وضو میں دھونا فرض ہے یا سنت، جمہور کی رائے میں فرض ہے۔ علامہ شوکانی نیل الاوطار میں رقمطراز ہیں۔

علامہ اس پر اتفاق ہے کہ کنیوں کا دھونا فرض ہے اور اس موضوع پر امام ذہبی

اور ابو بکر بن داؤد اسی رائے کو چھوڑ کر کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اس اختلاف کا سرچشمہ یہ ہے کہ لفظ قرآنی الی المرافق میں لفظ الی کے معنی کیا ہیں؟ اگرچہ کچھ لوگوں نے اسے مع کے معنی میں لے کر بتایا ہے کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ کنیوں سمیت ہاتھوں کو دھو، لیکن متعین الی کو انتہائے غایت کے معنی میں ہی بتاتے ہیں۔ ابن جریر نے بھی لکھا ہے کہ عربی زبان میں ہر غایت جو الی کے ذریعے محدود ہو۔ اس میں دونوں احتمال ہیں کہ غایت حد میں داخل ہو یا خارج ہو اور دوسرے علماء لغت نے اس کے لیے ایک ضابطہ لکھا ہے کہ الی کا اہد اگر الی کے قابل کی جنس سے ہوگا تو غایت حد میں داخل ہوگی اور اگر جنس سے نہ ہوگا تو غایت خارج ہوگی۔ اس فیصلہ کا تعلق سباق سے ہے جہاں سباق کہہ رہا ہو وہاں غایت داخل ہوگی اس لیے یہاں سباق بتا رہا ہے کہ چونکہ مرافق یدین کی جنس ہے اس لیے اس کا دھونا فرض ہے۔

اور شہد القوام الصیام الی الیل میں پورے رات صوم کی جنس سے نہیں ہے اس لیے خاص ہے۔ غیر اس معاملہ میں ملے کا اختلاف ہو سکتا ہے لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وضو میں مرفق دھرتے تھے۔ آپ سے چھوڑنا کبھی ثابت نہیں ہے اس لیے درجہ فرضیت کہنیوں کا دھوا ہی ہے اس میں درجہ استحباب ہو سکتا ہے تو کہنیوں سے آگے دھونا ہے جبکہ حضرت ابوہریرہ کا محل صیغہ مسلم میں آتا ہے کہ

آپ نے وضو فرمایا چہرہ دھویا اور اس کو خوب دھویا، ہاتھ دھرتے تو ہاتھوں تک دھرتے، سر کا مسح کیا اور پاؤں دھرتے تو پندلیوں تک دھرتے۔

اگرچہ علماء نے اسے حضرت ابوہریرہ کا اجتہاد قرار دیا ہے۔ چنانچہ ابن القیم فرماتے ہیں کہ یہ حضرت ابوہریرہ کا اجتہاد ہے درجہ تنہور اور اسے ایسا کر ثابت نہیں ہے۔ بہر حال جیسا کہ عذر آؤسی نے ابن ہریرہ سے نقل کیا ہے کہ کہنیوں بہت دونوں ہاتھوں سے دھونے کی فرضیت پر چاروں مذہب کا اتفاق ہے۔

وضو میں تیرہ مرتبہ مسح ہے۔ اصل ارشاد یہ ہے: مسحوا بیدکم مسحاً مستطاباً جیسے ہاتھ پر پیرا مسح میں سر کے مسح لگانا نہیں صاحب ہدایت لکھتے ہیں: المسح الاستطاب فترسہ کی ساخت کہہ رہی ہے کہ مسطح ہاتھ لگنا۔ مراد نہیں بلکہ جیسے ہاتھ لگنا۔ مراد ہے کیونکہ مسحت میں خود مستحی ہے اور یہاں بار کے ساتھ اس کا دوبارہ تعدیہ اسی منہویت کی خاطر ہے۔ اس موضوع پر علماء کا اختلاف ہے کہ مسح میں کم سے کم درجہ کیا ہے جس کے کرنے سے قرآن کا مسح کا مطالبہ پورا ہو سکتا ہے۔ امام شافعی نوٹ کرتے ہیں کہ اگر سر پر ایک انگلی بھی لگا دی تو قرآن کا مسح لہ پورا ہو جائے گا۔ امام نووی، امام اوزاعی اور امام لیث بن سعد کہتے ہیں کہ کچھ سر مسح کافی ہے۔ امام مالک اور حنابلہ کی رائے ہے کہ سارے سر کا مسح فرض ہے۔ امام ابوحنیفہ سر کے جو محتال حصہ کے مسح کو فرض کہتے ہیں۔ وہ آیت قرآنی کو یہاں مسح میں محمل قرار دیتے ہیں اور عمل تبرت کو قرآن کے اجمال کا ہمین بتاتے ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت سفیر ابن شعبہ کا بیان ہے کہ:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پیشانی، عمامہ اور خنجر پر مسح کیا۔ یہی سنت رسول قرآن کے لیے ہمیں ہے۔ یہ گفتگو مقدار فرض میں ہے درجہ مسح مننون طریقہ وہی ہے جو امام بخاری، مسلم اور اصحاب سنن نے عبد اللہ بن زید کے حوالے سے بتایا ہے کہ

حضرت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سر کا اپنے دونوں ہاتھوں سے مسح فرماتے پہلے
دونوں ہاتھوں کو آگے سے پیچھے کی طرف لے جاتے پھر دونوں کو پیچھے سے آگے کی
طرف لاتے۔ یعنی آغاز مسح کا سر کے ابتدائی حصے سے کرتے اور گدی تک لے
جاتے پھر دونوں ہاتھوں کو پٹا کر دیں لاتے جہاں سے آغاز کیا تھا۔

وہ مسح کی فرضیت کا درجہ تھا اور یہ مسح کا سنون طریقہ ہے، چونکہ کان بھی سر کا حصہ
ہیں اس لیے سر کے سنون مسح میں کانوں کا اندرونی و بیرونی حصہ بھی شامل ہے جیسا کہ آپ آگے
چل کر وضو کے سنون طریقہ میں پڑھیں گے۔

وضو میں پیروں کا دھونا

۳۰۳۔ اور اپنے پیروں کو سنون سمیت دھویا کرو۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن
قدس سرہ العزیز نے ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ اور پاؤں سنون تک۔ مترجم محقق نے پاؤں کے
بعد لفظ کو بٹا کر نہایت لطیف اشارہ فرمادیا کہ اگر جبکہ کا عطف منسولات پر ہے یعنی جس
طرح منہ ہاتھ دھونے کا حکم ہے پاؤں بھی سنون تک دھونے چاہئیں۔ سر کی طرح مسح کا بھی نہیں
ہے۔ چنانچہ اہل سنت والجماعت کا اس پر اتفاق ہے اور احادیث کثیرہ سے یہی ثابت ہے
کہ اگر پاؤں میں موزے نہ ہوں تو دھونا فرض ہے ہاں موزوں پر ان شرائط کے ساتھ جو کتب
فقہ میں مذکور ہیں مقیم ایک دن رات اور مسافر تین دن رات تک مسح کر سکتا ہے بلکہ مطلب
یہ ہے کہ اس کا عطف ایہ حکم پر ہے۔ اس وجہ سے یہ ان اعضاء کے تحت داخل ہے جن کے لیے
دھونے کا حکم ہے۔ وضو میں ترقیب فطری بھی ہے اور شرعی بھی۔ کچھ لوگوں نے اس کو برزخ
کے ساتھ بزرگ کر اسے مسح بنا دیا ہے لیکن یہ قول متواتر قرات اور متواتر سنت کے بھی خلاف
ہے اور عربیت کے بھی۔ اگر پاؤں کا مسح ہوتا تو اس کے ساتھ الی الکعبین نہ ہوتا جیسا کہ برزخ
جہاں مسح کا حکم دیا ہے واسموا بوجھکھ وایکھ من، میں لفظ الی المرافق بشا دہ
ہے اور وضو میں ہاتھ دھونے کے لیے الی المرافق کی قید لگا دی ہے کیونکہ مسح میں اس قسم کی
پابندی ایک بالکل غیر مفید بات تھی۔

اختلافِ قرآنہ کی تحقیق

تفصیل اس کی یہ ہے کہ اس لفظ دار جملکہ الی التبعین میں ایک قرآنہ میں ارجل منصوب ہے۔ یہ نافع، ابن عامر، حفص، اسحاق اور یعقوب کی قرآنہ ہے اور دوسری قرأت میں ارجل مجرور ہے اور یہ قرأت ابن کثیر، حمزہ، ابو عمرو اور عاصم کی ہے۔ پہلی قرأت کی بنا پر دار جملکہ کا عطف ایضاً مجرور ہے۔ اور ترجمہ یوں ہے، اور اپنے پیروں کو سٹخنوں تک وصول کیا کرو۔ اس قرأت سے وضو میں پیروں کے دھونے کی فرضیت ثابت ہوتی ہے۔ یہی اہل سنت والجماعت کا مذہب ہے۔ دوسری قرآنہ یعنی بکسر اللام کی وجہ سے دار جملکہ کا عطف بظاہر لفظ جڑ سکھ پر ہے اور ترجمہ اس طرح ہے کہ سروں اور پیروں پر مسح کر لیا کرو۔ اس قرأت سے وضو میں مسح رھیلین کی فرضیت ہوتی ہے یہ اہل تشیع میں امامیہ کا مذہب ہے۔

اہل السنہ کا موقف یہ ہے کہ یہ دونوں قرأتیں متواتر ہیں۔ لیکن یہ پتہ لینا کہ ان میں مراد خداوندی کیا ہے تو اس اجمال اور اشتباہ کو دور کرنے کے لیے ہمیں نبوت کی سنت اور صحابہ کے تعامل کو پیش منظر رکھنا ہو گا۔ احادیث متواترہ صحیحہ اور صریحہ یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو جو تعلیم دی۔ اس میں پیروں کے دھونے کا حکم دیا۔ اور یہ بھی فرمایا کہ هذا وضو ولا یقبل اللہ الصلاۃ الا بہ۔ یعنی اس طرک کے وضو کے بغیر نماز قبول نہیں کرتا۔ پھر آپ نے مدت العمر کبھی بھی مسح رھیلین پر عمل نہیں کیا نہ سفر میں نہ حضر میں بلکہ جن کو پاؤں کے دھونے میں کوتاہی کرتے دیکھا تو بار بار اعلان فرمایا دین لا یعقاب من الناس ان ایشروا کے لیے ہلاکت ہے اور عذاب ہے۔ جسے جن کو پانی نہیں لگا ہے۔ چنانچہ یہ حدیث حضرت عبداللہ ابن عمر کے حوالے سے آئی ہے کہ

ایک سفر میں حضور اقدس ہم سے پیچھے رہ گئے، آپ ہم سے اٹے جبکہ ہم نماز جمعہ کے لیے وضو کر رہے تھے اور اپنے پیروں کو پلو کچھ رہے تھے۔ آپ نے بار بار بلند فرمایا دین لا یعقاب من الناس۔

اگرچہ اس حدیث کے مطلب میں دو زون جانب سے کھینچا جاتا ہے۔ غسل کے مدعی کہتے ہیں کہ یہ تہدید پاؤں نہ دھونے پر ہے جبکہ مسح کے قائل دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ تہدید مسح پر ہے۔ اور تو اور علامہ شوکانی نے نیل الاوطار میں خود امام بخاری کا بھی یہی

میلان بتایا ہے کہ

حضور کی تدبیر مسیح میں کوتاہی پر تھی پاؤں کو دھونے میں کوتاہی پر نہ تھی۔
لیکن دوسری روایات سے اسی کی تائید ہوتی ہے کہ تنبیہ پاؤں خشک نہ ہونے پر ہے۔ چنانچہ
ماہر عقلا نے مسلم کے حوالہ سے جو روایت نقل کی ہے اس میں یہ تصریح ہے واعقابہم
یعنی تلوح لہ یسما المادان کے شخصوں میں وہ پسید جگہ چمک رہی تھی جہاں پانی نہ لگا
تھا اور اس سے زیادہ صاف اور واضح وہ روایت ہے جو حضرت ابو ہریرہ کے حوالہ سے مسلم
میں آئی ہے کہ

آپ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس نے اپنا ٹخنہ نہیں دھویا تھا۔ آپ نے

اس موقع پر فرمایا کہ ویللا عقاب من النار۔

عمر بن غلبہ کی ایک طویل حدیث میں ہے کہ حضور انور نے وضو کی تعلیم کرتے ہوئے فرمایا
پھر قدموں کو دھو جیسا کہ اللہ نے ان کے دھونے کا حکم فرمایا ہے اور امام ابن جریر اور امام بیہقی
نے سنن کبریٰ میں حضرت علی سے نقل کیا ہے کہ۔

اغسلوا القلا مین الی الکعبین کہ امرتہ

قدموں کو ٹخنوں تک دھو دھو جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے۔

مشہور محقق ابن امیر الحاج نے شرح سمر الاصول میں لکھا ہے کہ تیس صحابہ سے زیادہ
نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی وضو کو روایت کیا ہے اور سب اس پر متفق ہیں کہ آپ ٹخنہ
میں پیروں کو دھویا ہے۔ سفر اود حضرت سردی اور گرمی کسی حالت میں بھی پیروں پر مسح نہیں
فرمایا۔ بعد ازاں محقق ابن امیر الحاج نے انہیں سے زیادہ صحابہ کی روایتوں کو نام نامی مع خرک
روایت اور حوالہ کتاب بیان کیا ہے۔ ہم یہاں ان کا مفصل بیان نقل نہیں کر سکتے لیکن ناظرین کی
ضیافت طبع کے لیے ان صحابہ کے نام پیش کرتے ہیں۔

حضرت عثمان ابن عفان، حضرت علی ابن ابی طالب، اصحاب سنن حضرت
عائشہ صدیقہ سنن ثنائی، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت مغیرہ ابن شعبہ، حضرت
عبداللہ بن زید، اصحاب ستہ، ابو مالک الاشجری، مسند احمد، حضرت ابو ہریرہ، مسند احمد، حضرت
ابو امامہ، مسند احمد، حضرت بلال بن عازب، حضرت ابو بکر (نزار)، حضرت داک بن جرج، ترمذی،
نسیب بن مالک ابن حبان، حضرت انس بن مالک، دارقطنی، حضرت ابو ایوب انصاری، حضرت

ابو کمال طبرانی، حضرت عبداللہ بن انیس طبرانی، حضرت محمد بن سعد کرب، ابو داؤد، حضرت کعب بن محمد، ابی ابی داؤد، حضرت عبداللہ بن ابی داؤد، ابو یعلیٰ، حضرت عمر بن الخطاب، عبد بن حمید، حضرت عبداللہ بن عمر، ابن ماجہ، حضرت ابی ابن کعب، ابن ماجہ، حضرت معاویہ، ابو داؤد، حضرت محمد بن حبل، طبرانی، حضرت ابو رافع، طبرانی، حضرت جابر بن عبداللہ، طبرانی، حضرت قیس بن غزالیہ، الانصاری، طبرانی، حضرت ابو الدرداء، طبرانی، حضرت ام سلمہ، طبرانی، حضرت حماد، ترمذی، حضرت زید بن ثابت، دارقطنی، حضرت عبداللہ بن عمر، ابو داؤد،

بتانا، یہ چاہتا ہوں کہ احادیث متواترہ سے یہ امر ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وضو میں پیروں کو دھوتے تھے اور عمدہ صابن سے لے کر اس وقت تک آمت کا یہی عمل ہے۔ اور پوری نسبت کا یہ عمل خود ایک بہت بڑی طاقتور دلیل ہے جس کے بعد کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ جتنی کہ یہ دلیل عمل بہ نسبت دلیل قول کے زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔
ہاں یہ ہے کہ اگر ضرورت حال یہی ہے تو پھر قرأت جو کہ اسے میں شارحین قرآن کو تو کیا ہے؟ شارحین قرآن نے اس کے متعدد جوابات دیے ہیں۔

لفظ مسح غسل خفیف کے معنی میں ہے

اس آیت میں اگر ہم کاعطف تو براہِ سکم پر ہے لیکن مسح سے مراد غسل خفیف ہے۔ کیونکہ عربی زبان میں لفظ مسح کا اطلاق غسل خفیف پر ہوتا ہے۔ جیسا کہ امام قرطبی نے ابو زید انس سے نقل کیا ہے کہ اہل عرب جب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں نے نماز کے لیے وضو کیا تو بولتے ہیں تمسحت للصلۃ نیز جب کہنا ہوتا ہے کہ وضو کے لیے پانی لاؤ تو بولتے ہیں حات ما اتسح بہ للصلۃ وہ چیز لاؤ جس سے میں وضو کر لوں۔ امام ابو حاتم کہتے ہیں کہ وضو کر کے کے غفلت سے بغیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وضو کرنے والا محض پانی بہا لینے سے خوش نہیں ہوتا جب تک کہ اپنے اعضا کو پونچھ نہ لے۔ یہ محاذات کہہ رہے ہیں کہ مسح کا اطلاق غسل خفیف پر بھی ہوتا ہے اس لیے اس آیت میں سر کے مسح سے سر پر تر لمحتہ پھیرنا اور مسح وعلین سے غسل خفیف مراد ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ اللہ سبحانہ نے پیروں کے مسح میں الی الکعبین کی قید لگائی ہے۔ اگر سر اور پیروں کے مسح کی نوعیت یکساں ہوتی تو یہ قید نہ ہوتی جیسے سر کو بلا قیدیں مقدار بیان کیا گیا ہے اسی طرح پیروں میں بھی کوئی مقدار و مقدار نہ ہوتی۔

میں کعبین کی قید اور مرکا ذکر بلا قید صاف طور پر بربان حال کہ رہا ہے کہ با حقوں اور پیروں کا حکم ایک ہے اور مرکا حکم اس سے مختلف ہے۔ یہاں شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ منہاج السنہ میں بڑی پتے کی بات لکھتے کہ عربی زبان میں لفظ جمع بمنزلہ جنس ہے اس کے نیچے اس کی دونوں ہیں ایک اسالہ دوسرے اصابع، و سالہ کے معنی بھانا اور اصابع کے معنی لگنا ہیں۔ اصل لغت کے اعتبار سے لفظ مس دو نون معنی میں آتا ہے جیسے لفظ ذومی الارحام لغت کے اعتبار سے اصحاب الغرائض اور عصبات دو نون معنی میں آتا ہے مگر چونکہ عرفہ میں ذومی الغرض اور عصبات خاص قسم کے دار ثلثوں کو کہتے ہیں اس لیے لوگوں کی سوچ یہ ہو گئی کہ لفظ ذومی الارحام، ذومی الغرض اور عصبات دو نون ذومی الارحام کی قسم ہیں۔ عرف میں چونکہ عصبات ایک خاص نام سے پکائے جانے لگے اس لیے لوگ یہ سمجھنے لگے کہ لفظ ذومی الارحام عصبات کا قسم اور مقابل ہے۔ جیسے لفظ حیوان اصل لغت کے لحاظ سے انسان کو بھی شامل ہے مگر عرف میں غیر انسان کے لیے حیوان بولا جاتا ہے ٹھیک اسی طرح لفظ مس اصل لغت کے اعتبار سے عرفی مسیح یعنی اصابع اور غسل یعنی سالہ دونوں کو شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں واسو کے تحت دو چیزوں کو ذکر کیا۔ ایک روسم یعنی سروں کا جس میں مسی سے اصابع فی معنی مراد ہیں۔ دوسرا ذی جہنم اس میں مسیح سے قبل یعنی سالہ مراد ہے یہاں یہ سوال ہے عدا ہیست رکتابہ کہ قرآن میں ذومعنی لفظ کیوں استعمال ہوا ہے۔ اور دون کا پتر نہیں لیکن غلام زخمشہ نے اس موقع پر جوابات بتائی ہے وہ سنا چاہتا ہوں پاؤں تین عضا مفسولہ میں ہے جو کہ پانی بہا کر دھوئے جاتے ہیں اس لیے اس میں احتمال تھا کہ کہیں اس طرف کا ارتکاب نہ ہو جاتے جس کی قرآن میں مانعت ہے اس لیے مفسولہ کا مسوح پر عطف کر دیا۔ اور اشارہ کر دیا کہ پانی کے استعمال میں میانہ روی اختیار کرنی چاہیے اور ممکن ہے کہ کوئی گناہ کر بیٹھے کہ پاؤں کا مسیح ہونا چاہیے اسی گناہ کو ختم کرنے کے لیے الی کعبین کی قید لگا دی ہے۔

ار جلمک جوار کی وجہ مجرور ہے

بے شک ار جلمک میں جر کی قرأت آئی ہے اور اس کا عطف لفظ روسم پر ہے لیکن معنی اس کا عطف وجو حکم دایم پر ہے اور پاؤں عضا مفسولہ کے ساتھ وجوب غسل میں شریک ہے اور قرأت جر میں ار جلمک جوار کی وجہ مجرور ہے۔ یعنی روسم کے پڑوس اور قرب ہونے کی وجہ مجرور ہے در زنی الواقع اس کا پیوند وجو حکم دایم سے ہے۔

رہا متعلقہ کا مفعول نہیں ہے کیونکہ تیر گلے میں ڈالنے کی چیز نہیں۔ اصل بات یوں ہے کہ منقلاً سینا و حاملہ سہما یعنی تلوار گلے میں ڈالے ہوئے اور نیزہ ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے۔ لیکن چونکہ حاملہ اور متعلقہ معنی کے لحاظ سے قریب قریب تھے اس لیے حاملہ کو حذف کر دیا اور حاملہ کے مفعول کا عطف متعلقہ کے مفعول پر کر دیا۔ صاحب انتہات لکھتے ہیں کہ شاید آپ کے ذہن میں یہ غلط فہمی ہو کہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ ایسا ایسا بازا، اختصاراً اور کلام کو مرکب بنانے کے لیے کیا جاتا جیسے ہی اس آیت میں کیا گیا ہے اصل بات اس طرح تھی داسو برو سکم داخلوا اور جبکہ چونکہ غسل اور مسح دونوں معنی کے اعتبار سے قریب قریب تھے اس لیے داخلوا کو حذف کر کے اس کے مفعول اور جبکہ کا عطف برو سکم پر کر دیا۔

امام شافعی کی رائے

امام شافعی فرماتے ہیں کہ دونوں قراتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ برزات میں ایک جہاد حالت کا حکم بیان کیا گیا ہے۔ قرات جبر جس سے مسح قدیم معلوم ہوتا ہے یہ حکم اس حالت میں ہے کہ جب قدمیں پر غصینا ہوں یعنی جس حالت میں موزے پہنے ہوئے ہو تو مسح رجليں کرے اور اگر پیروں میں موزے نہ ہوں تو ایسی حالت میں غسل قدمیں فرض ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ دو قراتیں دو حالتوں پر محمول ہیں۔ اس لیے کہ عقلاً یہ ناممکن ہے کہ وقت واحد اور حالت واحد میں عضو واحد کا غسل بھی فرض ہو اور مسح بھی فرض ہو۔ معلوم ہوا کہ ان دو قراتوں میں دو مختلف التوں کا حکم بیان کیا گیا ہے۔ علامہ بحر العلوم نے شرح مسلم القنوت میں لکھا ہے کہ غفر اللہ لہم بزدی نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ اور یہ توجیہ نہایت لطیف ہے اور فرماتے ہیں کہ قرات جبر میں الی الکعبین کا لفظ مسح کی غایت نہیں اس لیے کہ مسح تو ظاہر غصین پر کافی ہے۔ لیکن ایک مسح کرنا بالاجماع مزدی نہیں ہے بلکہ یہ مختلف کی غایت ہے کہ جو سیاق کلام سے معلوم ہو رہی ہے اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ پیروں پر مسح کر لیا کرو بشرطیکہ تم شکنوں تک موزے پہنے ہوئے ہو اور اگر موزہ شکنوں سے نیچے ہو تو پھر موزوں پر مسح درست نہ ہوگا مطلب یہ ہے کہ پیر کھلے ہوں تو ان کو دھو لینا چاہیے اور اگر پیروں پر موزے ہوں تو مسح کر لینا چاہیے۔

مسح علی الخنثین تاریخ کی روشنی میں

پرو نکو آیت قرآنی ضمن مسح علی الخنثین کی طرف بھی اشارہ کر رہی ہے اس لیے ضروری ہے کہ تاریخ فقہ کی روشنی میں اس کا حکم بھی معلوم کر لیا جائے۔

مسح علی الخنثین کے موضوع پر متعدد احادیث آئی ہیں جن کی صحت پر محدثین کا اتفاق ہے۔ شرع مسلم میں امام نووی رقمطراز ہیں کہ مسح علی الخنثین کو روایت کرنے والے ان مکتبہ صحابہ ہیں۔ امام حسن بصری فرماتے ہیں کہ مجھ سے ستر صحابہ کرام نے بیان کیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسح علی الخنثین کرتے تھے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں رقمطراز ہیں کہ حفاظ محدثین نے تصریح کی ہے کہ مسح علی الخنثین تاریخ و روایت میں متواتر ہے۔ کچھ لوگوں نے یہ تک تصدو بتائی ہے۔ ابن المنذر نے عبد اللہ ابن المبارک سے نقل کیا ہے کہ مسح علی الخنثین کے موضوع پر صحابہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ بات صاف طور پر تاریخ میں بتائی گئی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مادہ کی یہ آیت نازل ہوئے کے بعد مسح الخنثین کیا۔ چنانچہ امام احمد، امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد اور امام ترمذی نے جریر کی یہ حدیث لکھی ہے کہ

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے استنفا فرمایا۔ پھر وضو کیا اور پھر خنثین پر مسح کیا۔ پوچھنے والے نے جریر سے دریافت کیا کہ تم بھی ایسا ہی کرتے ہو انہوں نے جواباً کہا کیوں نہیں، ہاں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وضو میں مسح علی الخنثین کرتے دیکھا ہے۔

امام ابوداؤد کہتے ہیں کہ جب جریر سے یہ دریافت کیا گیا کہ کیا یہ بات نزولِ مادہ سے پہلے کی ہے یا بعد کی تو انہوں نے کہا کہ میں تو مسلمان ہی نزولِ مادہ کے بعد ہوا۔ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ان لوگوں کے خلاف چیلنج ہے جو کہتے ہیں کہ مسح علی الخنثین نزولِ مادہ سے پہلے تھا بعد میں منسوخ ہو گیا۔ واقعہ یہی ہے کہ تاریخ و روایت میں مسح علی الخنثین متواتر روایات سے ثابت ہے۔

مسح علی الخنثین فقہ کی روشنی میں

فقہاء مذاہب کی حد تک اہل السنۃ قاطبۃ اس پر متفق ہیں کہ مسح علی الخنثین جائز ہے

حافظ ابن عبد البر رقمطراز ہیں کہ مجھے مسیح علی الخفین کے موضوع پر امام مالک کو چھوڑ کر فقہائے سلف میں سے کسی کا انکار اور مخالفت معلوم نہیں ہے۔ علامہ ابن رشد نے درجۃ الجہد میں لکھا ہے کہ مسیح کے موضوع پر تین راہیں ہیں ایک یہ مطلقاً جائز ہے، یہی جمہور کا مسلک ہے، دوسرے یہ کہ سفر میں جائز ہے، تیسرے یہ کہ مطلقاً ناجائز ہے۔ علامہ شوکانی نیل الاوطار میں رقمطراز ہیں کہ مسیح علی الخفین کا سنت ہونا اس کا متواتر ہونا اور امام مالک کو چھوڑ کر سلف کا اس پر متفق ہونا محققہ دلیل نہیں ہے۔ صرف شیعہ میں سے امامیہ اور خوارج کہتے ہیں کہ مسیح علی الخفین جائز نہیں ہے۔ استدلال آیت و منہ سے کرتے ہیں اور تعلیم و منہ سے موقوفہ پر حضور کے اس ارشاد سے کہ ائیس رجلیہ اپنے پاؤں و صورت۔ اور آیت ماندہ سے مسیح علی الخفین کو منسوخ بتاتے ہیں۔ علامہ شوکانی نے ان کے دلائل کا بمسوط جواب دیا ہے اور بتایا ہے کہ اس آیت کے ذریعے مسیح علی الخفین کو منسوخ کیا نہایت بڑی جرات ہے۔ آیت قرآنی میں عموم ہے، عادیث خفین اس کی مخصص ہیں اس لیے نسخ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ اصول میں یہ مسئلہ خدہ ہے کہ عام کی بطلان خاص پر مطلق دیکھ جاتی ہے یہ کہنا کہ بعد میں نازل والا عموم نسخ ہوتا ہے۔ اس وقت تک مفسر مدعا نہیں جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ آیت قرآنی بعد میں نازل ہوئی ہے اور اس کے نزول کے بعد مسیح ثابت نہیں ہے۔ جبریہ کی سابقہ روایت اس معاملہ میں حرف آخر ہے اور یہ کہنا کہ حضرت جبریل حضرت علی سے الگ ہو گئے تھے غلط، بلاشبہ وہ حضرت علی کے ساتھ ہی رہے۔ معاویہ کے پاس کسی وجہ سے رک نہ در گئے تھے اس لیے ان اعداء بائدہ کی بنا پر ایسے جلیل القدر صحابی کی جاہر کلامی کچھ مناسب اقدام نہیں ہے۔ حافظ عسقلانی نے تصریح کی ہے کہ آیت ماندہ غزوہ مہربین میں نازل ہوئی حدیث میفرہ کا تعلق غزوہ تبوک سے ہے اور تبوک بالاتفاق بعد میں ہے۔

مسیح علی الخفین کی شرط

خفین پر مسیح کے جواز کی اہم ترین اور بنیادی شرط یہ ہے کہ ان کو بارہ منہ پھینا جائے حضرت میفرہ کی جو حدیث صحیحین میں آئی ہے اس میں تصریح ہے کہ

میں ایک رات حضور النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھا، و منہ سے لیے

پانی پیش کیا۔ آپ نے چہرہ اور دونوں ہاتھ دھوئے اور سر کا مسح کیا۔ میں

نے چاہا کہ پیروں سے منہ کے نکال دوں آپ نے فرمایا کہ میفرہ ان کو پہننے

ہے میں نے با وضو پینے تھے پھر آپ نے ان پر مسح کر لیا۔

اور امام حمید ہی نے اپنے مسند میں جو حضرت میفرہ سے روایت کی ہے اس میں ہے کہ ہم نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ کیا کوئی شخص غنیں پر مسح کر سکتا ہے آپ نے فرمایا اگر کوئی نہیں ضرور کر سکتا ہے بشرطیکہ با وضو پینے ہوں۔

امام احمد ابن حنبلہ، ترمذی اور نسائی نے مشہور صحابی حضرت صفوان بن محرز کے حوالے سے بتایا ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا کہ ہم غنیں پر اس وقت مسح کریں جب ان کو با وضو چوک رہیں، سفر میں تین دن رات اور حضر میں ایک دن رات، اور جنابت کے سوا کسی حالت میں نہ اتاریں۔

جمہور علماء نے مسح کے جواز کے لیے ان ارشادات نبوت کی وجہ سے یہ شرط لگائی ہے کہ اگر موزے وضو کر کے پہنے جائیں تو ان پر مسح کرنا جائز ہے۔ داؤد ظاہری کو چھوڑ کر سب کا اس پر اتفاق ہے

غنیں میں مقام مسح

مسح موزوں کے بالائی حصے کا کیا جاتا ہے نچلے حصہ کا مسح نہیں ہے۔ ابو داؤد اور دارقطنی نے حضرت علی کا یہ ارشاد نقل کیا ہے اور حافظ عسقلانی نے بطور الحرام اور التخصیص میں اس کی سند کو حسن کہا ہے۔

دین میں اگر ملنے کی گنجائش ہو تو موزوں کا مسح نچلے حصہ کا ہونا چاہیے تھا کہ بالائی حصہ کا۔ میں نے خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو موزوں کے بالائی حصے کا مسح کرتے دیکھا ہے۔

مسند احمد، ابو داؤد اور ترمذی میں حضرت میفرہ ابن شعبہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ موزوں کے بالائی حصہ کا مسح کرتے تھے۔

اس لیے جمہور علماء کی رائے یہی ہے کہ موزوں میں مسح کے لیے بالائی حصہ کا مسح کافی ہے اور یہی مشروع ہے۔ اگرچہ کچھ یہ بھی کہتے ہیں کہ بالائی اور زیریں دونوں حصوں کا مسح ضروری ہے اور اس سلسلے میں وہ ابو داؤد و ترمذی اور دارقطنی کی حضرت میفرہ کی وہ روایت پیش کرتے ہیں

جن میں موزوں کے بالائی اور زیری حصے کے مسح کرنے کی تصریح ہے لیکن محققین کے یہاں مغرب کی یہ حدیث روایتی نقطہ نظر سے ثابت نہیں ہے۔ حافظ ابو زرعہ اور امام بخاری اسے صحیح نہیں مانتے ہیں، اس لیے موزوں کے بالائی حصہ کا مسح ہی مشروع ہے۔

موزوں کے مسح کی مدت -

اس سے پہلے مسنون بن عباس کے حوالہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی روشناس پکے ہو کر حالتِ سفر میں مدتِ مسح تین دن رات اور حالتِ حضر میں ایک دن رات سنہ ۱۱ھ امام احمد، مسلم، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے شرح بن ہانی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ:

میں نے حضرت عائشہ سے مسح علی الخفین کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ حضرت علی سے دریافت کرو وہ اس بارے میں مجھ سے زیادہ عالم ہیں کیونکہ وہ حضور کے ساتھ سفر میں ہوتے تھے۔ میں نے حضرت علی سے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: "تین دن رات اور تین دن رات اور تین دن رات"۔

امام احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن حبان نے حضرت خزیمہ ابن ثابت کے حوالہ سے بیان کیا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے مدتِ مسح کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ مسافر کے لیے تین دن رات اور مقیم کے لیے ایک دن رات مدتِ مسح ہے۔

اس لیے جمہور علماء و سلف کا یہی فیصلہ ہے کہ مدتِ مسح مسافر کے لیے تین دن رات اور مسافر کے لیے ایک دن رات ہے۔

اعمال و صنوکا مسنون پیمانہ

قرآن کی اس آیت میں و صلوٰۃ کے چار فرض بتائے گئے ہیں، اذل منہ و صونا، دوسرے کتب میں صیغہ بابت و صونا، تیسرے سر کا مسح اور چوتھے پاؤں کا دھونا، قرآن پاک اللہ کی کتاب ہے اور یہ علمِ نبوت ہے۔ اللہ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف علم سے نہیں بلکہ علمِ عمل کے دونوں کاموں سے نوازا ہے۔ بحیثیتِ ایک رہبر کے منبر پر تدریس صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات ہو کہ

در حقیقت قرآن پاک کی عملی تفسیر ہے۔ جو حکم آپ پر اتارا گیا۔ آپ نے خود کہے اس کو کیا۔ وضو، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، صدقہ، خیرات، ہمدان، ایثار و قربانی، غرم، استقلال، جبر و شکر ان کے علاوہ اور حسن عمل، حسن خلاق کی باتیں جس قدر قرآن نے بتائیں ان کے لیے سب سے پہلے آپ نے اپنا ہی نمونہ پیش کیا۔ جو کچھ قرآن میں غشا بر الہی تھا وہ سب مجسم ہو کر آپ کی زندگی میں نظر آیا اور اس طرح کمال علم اور کمال عمل کا آپ کو اللہ نے نمونہ بنا دیا۔ اور اسی کی پیروی کا نام اسلام ہے۔ نماز کی طرح وضو کے اعمال کی بھی آپ نے تفصیل بتائی ہے مثلاً وضو کے آغاز میں نیت، بسم اللہ کہنا، دائیں جانب سے آغاز کرنا، مسواک کرنا، پہلے بچے کرنا، ترتیب سے کرنا، آغاز میں پہنچوں تک بات و جزا ہر عضو کو تین بار دھونا، کل کرنا، ناک میں پانی دینا، پورے سر کا مسح کرنا، کانوں کا مسح کرنا، وضو کے بعد دُعا پڑھنا وغیرہ وہ اعمال ہیں جن کے ذریعے نبرت نے نماز کی طرح وضو کی تکمیل فرمائی ہے امام ابو حنیفہ کے نزدیک وضو میں یہ سب اعمال سنت ہیں۔ فرض صرف وہ چار ہیں جن کی قرآن نے، تنہائی ہے اور جن اعمال کی نبرت نے، رہنمائی کی ہے وہ سب سنت ہیں۔

امام احمد، بخاری و مسلم نے حضرت عثمان بن عفان کے سوا کہ جو دنوں کا مسنون طریقہ بتایا ہے یہ ہے کہ :

حضرت عثمان نے وضو کے لیے پانی طلب فرمایا، آپ نے تین بار اولیٰ باقرہ دھوئے پھر آپ نے تین بار کل ک، تین بار ناک کو پانی سے صاف کیا، پھر تین بار چہرہ دھویا پھر اپنے دو دونوں ہاتھوں کو کہنیوں تک تین بار دھویا۔ پھر سر کا مسح کیا۔ پھر آپ نے تین بار پاؤں دھوئے، پھر فرمایا کہ میں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح وضو کرتے دیکھا ہے۔ حضور نے وضو کے بعد فرمایا تھا جو شخص میرے وضو کی طرح وضو کرے گا، پھر دو رکعت نماز پڑھے گا جس میں اپنے جی سے کوئی بات دنیا کی نہ کرے گا اللہ اس کے گناہ بخش دے گا۔

اس کردار میں تمام سنتوں کا استیعاب نہیں باقی سنتیں دوسری احادیث سے معلوم ہوتی ہیں

مثلاً :

وضو میں نیت کرنا

ماک، شافعی، احمد، یث بن سعد اور اسحاق بن راہویہ وضو میں نیت کو شرط اور

فرض کا رد جو جیتے ہیں۔ اہل خاص نے امام ابوحنیفہ کا مذہب یہ بتایا ہے کہ ہر طہارت جو پانی سے درج ذیل آتی ہو وہ کسی نیت کی محتاج نہیں ہے۔ یہی ابو یوسف، امام محمد اور امام شافعی کا مذہب ہے امام اوزاعی بھی یہی کہتے دیکھتے ہیں۔ چنانچہ المجتہد میں علامہ ابن رشد نے امام مالک، شافعی اور امام احمد کا مذہب یہ بتایا ہے کہ وضو میں نیت شرط ہے۔ ان بزرگوں کا استدلال اس ارشاد نبوت سے ہے جو حضرت عمر کے حوالہ سے حدیث کی متعدد کتابوں میں آیا ہے۔

سائے اعمال معتبر نیت سے ہیں اور ہر آدمی کے لیے وہ بھی کچھ ہے جس کی اس نے نیت کی ہے۔ وہ شخص جس کو ہجرت اللہ و رسول کی طرف ہو اس کی ہجرت اللہ و رسول کی طرف ہے اور جس کی ہجرت دنیا کی طرف ہو یا نکاح کی خاطر عورت کی طرف ہو اس کی ہجرت اسی کی طرف ہوگی۔

امام ابوحنیفہ کو اس ارشاد نبوت کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں مگر وہ یہ فرماتے ہیں کہ اس کا تعلق مقاصد سے ہے وسائل سے نہیں۔ وضو عبادات میں مقاصد سے نہیں بلکہ وسائل سے تعلق رکھتی ہے یعنی وضو وسیلہ عبادت ہے اسی بنا پر وضو کی نذر نہیں مانی جاسکتی ہے کیونکہ مندرجہ کے لیے مقاصد میں سے ہونا ضروری ہے اور پھر اس ارشاد کی حیثیت اُحاد کی ہے اور اُحاد میں تصدیق نہیں کا نفی ہوئی ہے اور کسی چیز کے فرض ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی پشت پر دلیل کی قطعیت ہو اور معلوم ہے کہ قرآن اس باب میں خاموش ہے قرآن نے صرف چار ہی فرض وضو میں بتائے ہیں۔ فرض کی حیثیت کسی کو بھی ان چار کے علاوہ دینا یہ قرآن پر اضافہ ہے۔ ارشاد نبوت سے ہم واجب، سنت اور استحباب کو ثابت کر سکتے ہیں مگر فرض کے لیے قرآن کا منطوق ناگزیر ہے۔

وضو کے آغاز میں بسم اللہ کہنا

اس موضوع پر مختلف ارشادات نبوت آئے۔ اگرچہ روایت اعتبار سے ان کا کچھ مقام زیادہ بلند نہیں مگر علمائے نے ان ارشادات کے مجموعہ سے بسم اللہ کی سنت بتائی ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رقمطراز ہیں کہ تاریخی لحاظ سے اگرچہ ان کی منفرد کچھ زیادہ اہمیت نہیں مگر ان کی مجموعی حیثیت بتاتی ہے کہ اس کی کچھ اصل ضرور ہے۔ کچھ بزرگوں نے اگرچہ اسے واجب کہا ہے۔ اختلاف میں شیخ ابن الہمام نے بسم اللہ کہنے کو واجب قرار دیا ہے لیکن اکثر علمائے نے سنت ہی بتایا ہے

وضو کے آغاز میں بسم اللہ کے علاوہ ذکر کا کوئی پیمانہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں۔ ایسے وضو کے دوران مختلف اعضا کو دھونے کی وجہ سے ذکر کا کوئی پیمانہ حضور سے ثابت نہیں۔ مجالس الابرار میں علامہ رحمہ اللہ اور زائد العاد میں حافظ ابن القیم نے اس کی تصریح کی ہے بلکہ یہاں تک لکھا ہے کہ

ذکر کا ہر پیمانہ بسم اللہ کے علاوہ اور اذکار وضو کی ہر حدیث موضوع ہے حضور اور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موضوع پر نہ کچھ فرمایا ہے اور نہ اُمت کو تعلیم دی ہے۔

ہاں وضو کے اختتام پر ذکر کا یہ پیمانہ حضور اور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔
اشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ واشھدان
محمد عبیدہ ورسولہ اللھم اجعلنی من التوابین
واجعلنی من المتطہرین

مسند احمد، بخاری اور مسلم میں حضرت عمر بن الخطاب کے سوال سے یہ ارشاد آیا ہے کہ:
جو شخص تم میں سے وضو کرے گا اور پوری کوئے گا اور پھر یہ کہے گا کہ
اشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ واشھدان
محمد عبیدہ ورسولہ تو اس کے لیے جنت کے اٹھ سو روز کے
کئے برے گے جس میں سے چاہے داخل ہو جائے۔

اور باقی حصہ یعنی اللھم اجعلنی من التوابین واجعلنی من المتطہرین ترمذی کی روایت میں آتا ہے۔ اور امام نسائی نے عمل الیوم واللیلہ میں اس کے بعد یہ اضافہ بھی لکھا ہے
مبھاک اللھم ومحمد اشھد ان لا الہ الا انت
استغفرک و اتوب الیک

اگرچہ یہ غایر ضعیف ہے لیکن موقوفہ امام نسائی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

وضو میں مسواک

علماء نے وضو میں مسواک کو بھی بہت اہمیت دی ہے۔ اگرچہ اس میں اختلاف ہے کہ مسواک وضو کی سنت ہے یا غائبا۔ امام احمد اس کو نماز کی سنت بتاتے ہیں جبکہ امام ابو حنیفہ اسے

دوسری سنت کہتے ہیں۔ بعض بزرگوں نے اسے واجب قرار دیا ہے۔ منہ احمد بخاری، مسلم اور سنن ابویہ میں حضرت ابو ہریرہ کے حوالے سے ارشاد نبوت آیا ہے، اگر میں اپنی اُمت پر شفقت محسوس نہ کرتا تو ان کو ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا۔

اور امام بخاری نے تعلیقات میں لکھا ہے کہ میں ان کو ہر وضو کے وقت مسواک کا حکم دیتا۔ منہ احمد اور نسائی میں حضرت عائشہ کے حوالے سے یہ ارشاد بھی آیا ہے کہ مسواک منکر کوصات کرنے وال ہے اور انکار راضی کوئے کا ذریعہ ہے۔ صحاح اور سنن میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل کا یہ پیمانہ بھی آیا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نیند سے بیدار ہونے کے وقت دن ہر یارات اور گھر میں داخل ہونے کے وقت مسواک کرتے تھے

بہر حال مسواک کرنا سنت ہے اور مسعودی و انون کو آلائش سے صاف کرنا ہے اور یہ مقصد بھی فریضے سے حاصل ہو بدئے جائز ہے لیکن مسواک ہر نماز افضل ہے اس کی فضیلت میں کبھی غلامی دور آیا نہیں ہوئی ہے

حدث اکبر یعنی غسل جنابت

۳۰۴ - اگر تم حالت جنابت میں ہو تو خوب پاک ہو۔ یعنی جنابت سے پاک ہونے میں صرف اعضا باہر کو دھونا کافی نہیں ہے۔ سطح بدن کے جس حصے تک پانی بدولت تضرر کے پہنچ سکتا ہو وہاں تک پہنچنا ضروری ہے اسی لیے حنفیہ غسل جنابت میں مضمضہ ادا استنشاق کو بھی ضروری کہتے ہیں۔ دوسری ضروری نہیں سنت ہے بلکہ

سورۃ فاس میں غسل جنابت کا ذکر آداب زندگی کے سلسلے میں تھا۔ یہاں اس کا ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ نماز کے لیے تمہیدی فعل ہے۔ نماز کے لیے طہارت ضروری ہے۔ حدث صغر سے اور حدث اکبر سے بھی۔ مطلب یہ ہے کہ جب تم نماز کی تیاری کرو اور تم حالت جنابت میں ہو تو خوب پاک ہو جاؤ۔ یعنی اس طرح غسل کرو کہ جہاں جہاں تک پانی پہنچا ممکن ہو وہاں پانی

پہنچاؤ۔ اصل ارشاد میں خاطر دا آیا ہے۔ یہ طہارت سے مبالغہ ہے، طہارت کے معنی پاک ہونا اور اظہار کے معنی خوب پاک ہونا ہے۔ غالباً اسی انداز بیان سے امام اعظم ابو حنیفہ نے غسل جنابت میں مضمضہ کلی کرنا اور استنشاق ناک میں پانی دینا کو فرض بتایا۔ یہ دونوں وضو میں سنت ہیں کیونکہ وضو میں صرف پھرو دھونے کا حکم ہے اور یہاں غسل میں خوب پاک ہونے کا حکم ہے اور ظاہر ہے کہ دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ وضو میں اگرچہ صرف ظاہری پھرو کا دھو لینا کافی ہے کیونکہ دگر مواجہت سے نکلا ہے، غسل میں خوب پاک ہونے کا حکم ہے کیونکہ خاطر دا میں منہ کی مبالغہ ہے مطلب یہ ہے کہ جسم کے دھونے میں اتنا مبالغہ کرو کہ ایک بال بھی باقی نہ رہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہر بال کے نیچے جنابت ہے۔ اور اس کی وجہ حکیم الامت خاں دلی اللہ نے ترجمہ اہلنا میں یہ بتائی ہے کہ جنابت کی حالت میں انسان کا نڈال رول غرق لذت ہوتا ہے اس لیے ازالہ جنابت کے لیے روئیں کا دھونا فرض کیا گیا ہے۔ بخلاف وضو کے جس کا سبب حدیث صغریٰ ہے یعنی پیشاب اور باخاں وغیرہ۔ ان میں جنابت جیسی نہ لذت بخوتی ہے اور نہ غفلت۔

جنابت کی دو صورتیں

جنابت کے معنی ناپاکی کے ہیں اس کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ منی خارج ہو جاتے خواہ بکالت بیداری ہو یا سوتے ہوئے، اور دوسرے یہ کہ مرد و عورت کی محامعت خواہ اس میں انزال ہو یا نہ ہو پہلی حالت کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جس یلغ انداز میں پیش فرمایا اس کا ذکر صحیح مسلم میں بحوالہ ابو سعید خدری اس طرح کیا ہے کہ انا اللہ من اللہ یعنی غسل واجب ہوتا ہے پانی کے نکلنے سے خواہ اس کا سبب کچھ ہو۔ اور دوسری حالت کے لیے آپ کا یہ ارشاد ہے کہ اذلتق اللہان وجب الغسل، عورتوں کو محبت سے غسل واجب ہوتا ہے اور مسلم میں تصریح ہے دان بعد ینزل خواہ انزال نہ ہو۔ جمہور کا یہی مذہب ہے اور ظاہر قرآن کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جنابت خواہ مباشرت سے لاحق ہوئی ہو یا خواب میں مادہ منویہ خارج ہونے کی وجہ سے۔ دونوں صورتوں میں غسل واجب ہے۔ اس حالت میں غسل کے بغیر نماز پڑھنا، قرآن پڑھنا اور قرآن کو ہاتھ لگانا سب ناجائز ہے۔ بہر حال جمہور کا مذہب یہی ہے کہ دونوں حالتوں میں غسل واجب ہے۔

آیت میں نماز کی یہ شرط بتائی گئی ہے کہ جنابت سے پاک ہو۔ بغیر غسل کے نماز پڑھنی جائز نہیں ہے کیونکہ جنابت کا کسل اور انقباض اس انشراح صدر اور حضور قلب کے منافی ہے

جو نماز کے لیے مطلوب ہے جنابت کے لیے طہارت غسل ہے۔

اس آیت میں غسل کا حکم ہے لیکن غسل کے طریقہ سے بحث نہیں کی گئی ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ سبحانہ نے قرآن کا مبین بنایا ہے اس لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل کا طریقہ بتایا ہے۔ حضور انور کی ازواج مطہرات کے ذریعے آپ کے غسل کا جو طریقہ نقل ہو کر ہم تک پہنچا ہے یہ ہے۔ صحیح بخاری میں ہے:

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جب غسل جنابت فرماتے پہلے ہاتھ دھوئے پھر وضو فرماتے پھر تین بار سر پر پانی ڈالتے، پھر اپنے بدن مبارک کو دھوتے۔

اس کی مزید توضیح بخاری میں اس طرح آئی ہے:-

حضرت میمون کہتی ہیں کہ میں نے آپ کے غسل کے لیے پانی رکھا۔ آپ نے پہلے اپنے دونوں ہاتھ دھوئے پھر استنجا کیا، پھر زمین پر ہاتھ مارا اور مٹی سے ہاتھ صاف کیے ان کو دھویا، پھر فرارے کیے اور ناک میں پانی دیا، چہرہ دھویا، سر پر پانی ڈالا، پھر آپ نے پیر دھوئے۔

سنن ابوداؤد میں حضرت علی کے حوالہ سے ہے:

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو غسل جنابت میں ایک بال برابر چھوڑتا ہے وہ غسل نہیں کرتا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غسل جنابت میں خوب صفائی کرنا ضروری ہے۔

پانی نہ ہو تو تیمم کافی ہے

۳۰۵۔ اور اگر تم بیمار ہو یا حالت سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی استنجا سے آئے یا تم نے عورتوں سے صحبت کی ہو پھر تمہیں پانی دستیاب نہ ہو تو پاک مٹی سے تیمم کر لو اس طرح کہ اس سے اپنے چہرہ اور ہاتھوں کو مسح کر لو۔ یعنی بیماری کی وجہ سے پانی کا استعمال مضر ہو یا سفر میں پانی بقدر کفایت نہ ملے یا مثلاً کوئی قصہ حاجت کر کے آئے اور وضو کی ضرورت ہے یا جنابت کی وجہ سے غسل ناگزیر ہے مگر پانی کے حاصل کرنے میں یا استعمال کرنے پر کسی وجہ سے قادر نہ ہو، تو ان صورتوں میں وضو یا غسل کی جگہ تیمم کرے۔ وضو اور غسل دونوں سے تیمم میں کوئی فرق

منہی ہے مگر تیمم کی مشروعیت سے جو فرض ہے وہ برصورت یکساں طور پر حاصل ہوتی ہے۔ تیمم کے ارادہ
مائل اور اس آیت کے فوائد پانچویں پائے کے تیسرے درجہ میں مفصل گزر چکے ہیں حضرت اشیعہ
نے لامستہ المسامک اور ترجمہ کیا ہے کہ پاس گئے ہوں عورتوں کے وہ عداوت کے اعتبار سے
حالت جنابت ہی پر دلالت کرتا ہے۔ یہ ترجمہ ابن عباس اور ابو موسیٰ اشعری کی تفسیر کے موافق ہے
جسے ابن مسعود نے بھی سکوناً تسلیم کیا ہے کافی الجہادی، نیز حضرت شیخ الہند نے قیسوا کے ترجمہ میں
قصہ کرد کہہ کر اشارہ فرمادیا کہ اصل لغت کے اعتبار سے تیمم کے معنی میں قصد معتبر ہے اور اس لغوی
معنی کی نہایت کا خیال رکھتے ہوئے تیمم شرعی میں بھی قصد معنی نیت کو مختار نے ضروری قرار دیا ہے۔ یہ
تیمم کے لغوی و شرعی معنی میں صیغہ کا لغوی تحقیق، تیمم کا سنوں طریق، تیمم میں مسح کے اعضاء و طہروم
جلد و ہضم میں سورہ ناس کے لوٹ نمبر ۴۰ میں تفصیل بحث کر چکے ہیں۔ یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ فلسفہ
تجدد و ماد میں پانی نہ ملنے کا مطلب پانی کے استعمال پر قادر نہ ہونا ہے خواہ یہ سبب بیماری کے
خواہ یہ سبب غاصل کے یا کسی اور سبب سے ہو۔ امام راجع نے لکھا ہے کہ پانی پر قدرت دہر
سردی لگ جانے کا اندیشہ بیماری بڑھ جانے کا خوف، پانی لانے میں بہت زیادہ دشواریاں، یا ساری چیزیں
پانی نہ ملنے کے حکم میں ہیں۔ حدیث میں تصریح ہے کہ عمر و بن العاص نے پانی ہوتے ہوئے بھی
تیمم کر لیا۔ اس لیے کہ پانی سے انہیں سردی لگ جانے کا اندیشہ تھا اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ
و سلم نے اس کی اجازت دی۔ حنفیہ کے یہاں سردی کے عذر پر بھانے غسل کے تیمم کر لینا بالکل جائز
ہے۔ اخصاص نے لکھا ہے کہ امام ابو حنیفہ اور امام محمد کا فتویٰ یہ ہے کہ جس کو پانی سے سردی لگتی ہو اسے
غسل کی جگہ تیمم کر لینا جائز ہے۔ تیمم کے ساتھ غار باجماعت میں شرکت کی بھی حدیث میں اجازت ہے
قرطبی نے بخاری کے حوالہ سے لکھا ہے:

ایک شخص کو حضور نے غار کی جماعت سے الگ بیٹھے دیکھا۔ آپ نے دریافت

کیا کہ غار میں کیوں نہیں ملے، بولے کہ میں حالت جنابت میں ہوں اور پانی نہیں
ہے، فرمایا کہ تیمم کر لو، یہی کافی ہے۔

فقہائے یہاں تک بات کھول دی ہے کہ پانی ملتا ہے لیکن بہت گراں قیمت پر ملتا ہے
یا موجود تو ہے لیکن اتنی کم مقدار ہے کہ پینے کے لیے مزید کچھ لے گا تو لیے موقع پر پانی کا ہونا،

اس کے نہ ہونے کے برابر ہے اور تیمم بالکل درست ہے۔ چنانچہ المصاحم نے یہ بات کھول کر سمجھائی ہے اس لیے فلسفہ تجدد و اماد کا مطلب یہ ہے کہ تم پانی کے استعمال پر قادر نہ ہو خواہ اس وجہ سے کہ پانی نایاب ہے یا اس لیے کہ ایک میل دور ہے یا اس لیے کہ اس کے استعمال سے بیمار ہو جائے گا یا بیاس کا اندیشہ لاحق ہو جائے گا۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ پانی نہ ملنے کی صورت میں مسافر کے لیے جواز تیمم کی شرط یہ ہے کہ وہ پانی تلاش کرے۔ مانتھیں سے مانگے، اگر بیابان میں ہو تو دور تک نظر دوڑائے، اگر دریاں میں ٹیبلہ یا دیوار ہو اس کے پار جائے کیونکہ قرآن نے فلسفہ تجدد و اماد فرمایا ہے کہ نہ پانے کا صلیقہ دہی ہو سکتا ہے جو مطلب اور جستجو کرے۔ امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ بروہ شخص جس کی ملک میں پانی نہ ہو وہ فلسفہ تجدد و اماد کا مصداق ہے۔ اگر پانی پاس موجود نہیں ہے، کسی سے مانگنا شرط نہیں ہے پتہ کی بات یہ ہے کہ قرآن نے بیمار اور مسافر کو تیمم کی رخصت دی ہے۔ بیمار کو اس لیے کہ پانی تو موجود ہے مگر نقصان دیتا ہے اور مسافر کو اس لیے کہ پانی کا حاصل کرنا دشوار ہے اور اس ندرت کو بھی رخصت دی ہے جسے پانی دستیاب نہ ہو خواہ اسے وضو کی حاجت برائے غسل کی، ان سب مسئلوں میں تیمم جائز ہے۔ ظاہر قرآن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ بیمار ہونا، مسافر ہونا اور حدث اصغر یا اکبر کے بعد پانی نہ ملنا جواز تیمم کے رسات ہیں۔ بیمار کے پاس اور سفر کے پاس پانی ہونا تیمم ہی مانع نہیں ہے۔ کیونکہ بیمار کو پانی نقصان دیتا ہے اور مسافر کو سفر میں پانی کی ضرورت ہے تو اصل لہ تجدد و اماد بیمار اور مسافر کی قید نہیں بلکہ صحت مند آدمی جو حدث اصغر یا اکبر میں مبتلا ہو اس کی قید ہے۔ یعنی اگر تندرست انسان ہے وضو ہو یا جنمی ہو اور اسے پانی دستیاب نہ ہو تو اسے تیمم کی اجازت ہے۔

وضو کے لواقص

آیت اذ جاء احد منکم من الغائط او لامستم النساء سے بطور کنایہ یہ بات سمجھ میں آرہی ہے کہ قضائے حاجت سے خواہ پیشاب ہو یا پاخانہ وضو ٹوٹ جاتا ہے یعنی ان دونوں راہوں سے جو کچھ مقدار طہیرت سے نکلتا ہے اس سے طہارت ختم ہو جاتی ہے اور یہ بات بھی سمجھ میں آرہی ہے کہ یہ دونوں ناپاک ہیں۔ اور ان دونوں راہوں سے غیر متاد طہرت پر جو کچھ نکلتا ہے وہ بھی نہایت ہے اور ناقص وضو ہے جیسے مذی ددی وغیرہ، اور اس سے مجبور کے نزدیک طہارت ختم ہو جاتی ہے حتیٰ کہ اگر ریح بھی خارج ہو تو اس سے بھی وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ منہ احمد و ترمذی

اور ترمذی و ابوالحسن ماجہ میں بحوالہ ابوہریرہ حدیث آتی ہے۔

وضو نہیں مگر آواز سے یا کُوسے

امام بیہقی نے اس کی صحت کا لوہا مانا ہے اور شیخین نے ابوہریرہ کی حدیث تو جہیں مگر اس مضمون پر مشتمل عبدالعزیز بن زید سے روایت کیا ہے۔

البتہ اس امر میں حکماء کا اختلاف ہے کہ انسانی بدن سے جو چیزیں ان دھاروں کے علاوہ دوسری جگہوں سے نکلتی ہیں، مثلاً بدن سے خون نکل آیا، ناک سے نکسیر آگئی، یہ بھی طہارت ختم کرتی ہے یا نہیں۔ قرآن کی یہ آیت اس موضوع پر خاموش ہے۔ امام شافعی خون کو ناقض وضو نہیں بتاتے، امام احمد حنبل سے خون کو ناقض وضو نہیں بتاتے، لیکن امام ابوحنیفہ خون کو ناقض وضو کہتے ہیں بشرطیکہ ناپاک ہو اور خون کے ناپاک ہونے کا معیار بہنا ہے، اگر بہنا نہیں تو ناپاک نہیں ہے۔

خون کی تہ کے باسے میں بھی یہی اختلاف ہے۔ امام شافعی خون کو ناقض وضو نہیں کہتے

جبکہ امام ابوحنیفہ تہ کو ناقض وضو کہتے ہیں، ہاں اگر تہ منکولی ہے تو اس کو ناقض نہیں کہتے اور غیر منکولی یعنی مزہ بھر کر ہو تو اسے ناقض کہتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ خون اور تہ وغیرہ کو ان دونوں دھاروں سے نکلی ہوئی نہاست پر قیاس کرتے ہیں کیونکہ وہاں طہارت کے وجوب کی علت صرف نہاست ہے۔

سونا بھی وضو کو توڑ دیتا ہے

سونے کے ناقض ہونے میں حکماء کا اچھا خاصا اختلاف ہے۔ شافعیین حدیث

نے ائمہ مذاہب بتاتے ہیں۔ اذلی یہ کہ سونے سے وضو نہیں ٹوٹتا ہے یہ شیعہ امامیہ کی رائے

ہے اور یہ کہ سطلق سونا ناقض وضو ہے۔ یہ حسن بصری شوافع میں سے مزیٰنی اور محدثین میں سے

اسحاق ابن راہویہ اور ابن المنذر کا خیال ہے، تیسرے یہ کہ زیادہ سونا وضو کو توڑ دیتا ہے۔ یہ امام

زہری ربیعہ امام اور امام احمد کی رائے ہے، چوتھے یہ کہ چٹ لیٹ کر یا کراٹ سے یا کسی چیز

کے سہلے سے سوتے تو وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ اور داؤد ظاہری کی رائے ہے

پانچویں یہ کہ غازی میں سونا وضو کو توڑتا ہے۔ پھر دن کی غازی میں نہیں، یہ زید بن علی کہتے ہیں، چھٹے

یہ کہ حالت رکوع و سجود میں سونے سے وضو ٹوٹتا ہے، باقی کسی حالت میں سونے سے وضو نہیں

ٹوٹتا ہے، ساتویں یہ کہ صرف حالت سجود میں سونے سے وضو ٹوٹتا ہے۔ یہ دونوں ائمہ امام

احمد سے منقول ہیں۔ آٹھویں یہ کہ سونا حدیث نہیں بلکہ احتمال حدیث کے حکم میں ہے اگر کوئی

زمین پر سرین کے سہائے بیٹر کر سوتا ہے اسی کا وضو ٹوٹتا ہے ورنہ نہیں۔ اس موضوع پر احادیث مختلف آئی ہیں اور سب سے جو موقف اختیار کیا ہے وہ روایات کے سہائے ہی اختیار کیا ہے۔ بلکہ البتہ اس بات پر امام نووی نے علماء کا اتفاق لکھا ہے کہ جنوں اور بے ہوشی اور وہ تمام حالتیں جن میں نفل حقل ہر جاتے، ناقض وضو ہیں۔

کیا عورت کو ہاتھ لگانا ناقض وضو ہے ؟

آیت کے اس حصے اور مستند علماء سے حضرت امام شافعی نے یہ بات بھی ہے کہ ہوت کو ہاتھ لگانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، یہی عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمر اور زہری کا مذہب ہے لیکن امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ عورت کو ہاتھ لگانے سے وضو نہیں ٹوٹتا ہے۔ حضرت علی، حضرت عبداللہ بن عباس، عطاء بن ابی رباح، طاؤس یثربی بھی یہی کہتے ہیں۔ اس اختلاف کا سرچشمہ یہ ہے کہ اس آیت قرآنی میں لفظ حائضہ کون سے معنے میں استعمال ہوا ہے۔ لغت میں اس کے معنے چھونے اور ہاتھ لگانے کے ہیں جب کہ کئی زبان میں یہ مباشرت کے لیے استعارہ ہے اس امر میں اختلاف ہے کہ یہاں کئی معنے مراد ہیں یا لغوی۔ حائضہ شہادت نامی ہوتی فرماتے ہیں کہ حضرت علی، حضرت عائشہ، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت ابو موسیٰ اشعری کہتے ہیں کہ کئی معنے مراد ہیں یعنی مباشرت اور اسی کو امام ابوحنیفہ، امام سفیان ثوری نے اپنا یا ہے برخلاف اس کے حضرت عبداللہ ابن مسعود حضرت عمر فاروق اور حضرت عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ یہ ہے کہ آیت میں حائضہ اپنے لغوی معنے میں ہے اسی لئے کہ امام شافعی اور امام شافعی نے اپنا یا ہے۔ ہمدانی کہتے ہیں ذوق تشریع سے قریب تر یہی ہے کہ آیت قرآنی میں حائضہ کئی معنے میں ہے۔ اگر چھونے کے معنے میں ہو تو خود اعمال نبوت کے لیے تو یہاں تلاش کرنی پڑے گی مثلاً مسلم اور ترمذی میں حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ

انہوں نے حضور کے قدم مبارک پر ہاتھ رکھا جب کہ آپ مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے۔

اور حدیث کی سند و کتابوں میں ہے کہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم رات کو نماز پڑھتے۔ میں آپ کے سامنے لیٹی ہوتی ہوتی جب آپ سجدہ کا ارادہ کرتے تو میرے ٹوہ کر لیتے۔

یہاں سید شید رضا کی یہ بات بہت اچھی ہے کہ اگر عورت کو ہاتھ لگانے سے وضو ٹوٹنے کا مسئلہ سمجھتا تو قرآن کریم کے ساتھ اس کی نقل ہوتی۔ اور ایک جہلیں بلکہ متعدد راہروں سے یہ بات روایت و حدیث کے دفتر میں ہوتی۔

کیا شرمگاہ کو ہاتھ لگانے سے وضو ٹوٹتا ہے؟

اس موضوع پر فقہاء میں اختلاف ہے۔ امام شافعی، امام احمد، امام مالک اور امام اسحاق کا مذہب یہی ہے کہ ہاتھ لگانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے خواہ مرد کی پیشاب گاہ ہو یا عورت کی، صحابہ میں حضرت حمزہؓ ان کے صاحبزادے عبداللہؓ، ابوہریرہؓ، امین عباسؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، عائشہؓ اور تابعین میں عطاءؓ، زہریؓ اور سید بن المسیبؓ کا یہی مسلک ہے۔ اس کے برعکس امام ابو حنیفہؓ اور امام سفیانؓ ثوریؓ فرماتے ہیں کہ اس سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ صحابہ میں حضرت علیؓ، حضرت عبداللہؓ بن مسعودؓ، حضرت عمارؓ بن یاسرؓ اور تابعین میں انسؓ البصریؓ اور دیگر کا یہی مسلک ہے اور اس اختلاف کی بنیاد دو اصلوں پر موضوع پر حضورؐ تاحس صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل شدہ علی سربراہ کا اختلاف ہے جو کہتے ہیں کہ وضو ٹوٹ جاتا ہے وہ حضرت کی سیرۃ کے حوالے سے آیا ہوا یہ ارشاد نبوتؐ پیش کرتے ہیں کہ جس شخص نے اپنی پیشاب گاہ کو ہاتھ لگایا وہ بغیر وضو نماز نہ پڑھے۔ یہ ارشاد نبوتؐ سنہاری اور مسلم کے علاوہ حدیث کی دوسری کتابوں میں آئی ہے اور جن علماء نے وضو نہ ٹوٹنے کا فیصلہ فرمایا ہے ان کا موقف یہ ہے کہ مسند احمد اور سنن ارباب میں یہ ارشاد نبوتؐ حضرت طلحہؓ بن علیؓ کے حوالے سے آیا ہے کہ حضورؐ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ کیا یا رسول اللہؐ کوئی شخص اگر اپنی پیشاب گاہ کو ہاتھ لگاتا ہے اس کے وضو سے، آپؐ نے فرمایا کہ وہ بھی تیرے جسم کا ایک حصہ ہے۔

اس ارشاد نبوتؐ کی صحت کا لوازم سب مانتے ہیں۔ حافظ ابن حزمؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک یہ حدیث زیادہ طاقتور ہے۔ امام علیؓ ابن المہدیؒ فرماتے ہیں کہ اس میں سیرۃ کے مقابلہ میں زیادہ خوبصورتی ہے۔ پہلی حدیث جس سے ان بزرگوں نے استدلال کیا ہے جو وضو ٹوٹنے کے قائل ہیں اس کی صحت میں علماء حدیث کو کافی تردد ہے۔

نزدیک شراعت کا مقصد

۳۰۶۔ اللہ نہیں چاہتا ہے کہ تمہارے اوپر کوئی سنگ کی ڈالے بلکہ وہ تو چاہتا ہے کہ تمہیں

خوب پاک کر لے، اسی لیے جو احداث کثیر الوقوع تھے۔ ان میں سارے جسم کا وضو ضروری نہ رکھا صرف وہ اعضا جن کو اکثر بلاد متقدمہ کے بہتے پائے عموماً کھلا رکھتے ہیں مضائقہ نہیں سمجھتے ہیں، ان کا وضو اور مسح کا ضروری بتلایا تاکہ کوئی تنگی اور دقت نہ ہو، ہاں حدیث اکبر معنی جنابت جو احیاناً پیش آجاتی ہے اور اس حالت میں نفس کو ملکہ قی خصال کی طرف رجحان کے لیے کسی غیر معمولی تنبیہ کی ضرورت ہے اس کے ازالہ کے لیے تمام بدن کا وضو فرض کیا۔ پھر مرض اور سفر وغیرہ حالات میں کس قدر آسانی فرمادی۔ اول تو پانی کی جگہ مٹی کو مطہر بنا دیا۔ پھر اعضائے وضو میں سے نصف کی تخفیف اس طرح کر دی کہ جہاں پہلے ہی سے تخفیف تھی یعنی سر کا مسح اسے بالکل اڑا دیا۔ اور پاؤں کو شاید اس لیے نظر انداز کر دیا کہ وہ عموماً مٹی میں یا مٹی کے قریب بہتے ہیں۔ اور تمام اعضا بدن کے مقابلہ و گرد و غبار کا زیادہ شائبہ نہیں، لہذا ان پر مٹی کا ہاتھ پیرنا بے کار تھا۔ اب صرف وضو ضرورہ گئے مسند اہل حقان ہی کر لے سے وضو اور غسل دونوں کا تیمم ہو جاتا ہے بلکہ یہ وضو اور غسل کے حکم کی حکمت بیان ہو رہی ہے کہ اگر کچھ لوگوں نے پابندیوں کو سخت محسوس کیا ہو تو ان پر ان کی افادیت واضح ہو جاتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ غیر عادی طبائع پر غسل اور وضو کی یہ پابندی بڑی شاق ہوتی ہے لیکن اللہ سبحانہ نے یہ پابندی بندوں کو مشقت میں ڈالنے کے لیے قائم نہیں کی ہے۔ اگر شدت مقصود ہوتی تو بیماری اور سفر وغیرہ کی حالت میں تیمم کی اجازت ہی نہ ہوتی بلکہ یہ بندوں کی پاکیزگی کی خاطر عائد کی گئی ہے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ طائفتے مشابہت حاصل کر کے خدا کا قرب حاصل کرنے کے اہل ہو سکیں۔ اصلاً تو پاکیزگی باطن کی مطلوب ہے، اور نماز باطن ہی کی پاکیزگی کے لیے فرض کی گئی ہے لیکن ظاہر اور باطن میں گہرا رشتہ ہے۔ ظاہر کا اثر باطن ہے باطن کا اثر ظاہر پر پڑتا ہے اس وجہ سے اسلام نے نماز کے لیے وضو کا حکم دیا ہے اور ناپاکی کی حالت ہو تو غسل کا۔

اس آیت میں اسلامی قانون کی حکمت پر روشنی ڈال گئی ہے اگرچہ یہ آیت طہارت کے مسائل بیان کرنے کے بعد ایک اٹھے ہوئے سوال کے جواب میں آئی ہے۔ سوال ہوا تھا کہ طہارت کے ان احکام وضو اہل کا فائدہ کیا ہے۔ قرآن نے بتایا کہ یہ احکام و تواریخ جو تمہارے لیے بیان ہو رہے ہیں۔ ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ تمہارے اندر ہر نوع کی پاکیزگی رونمائی ہو،

یعنی روحانی طہارت کے ساتھ جسمانی طہارت بھی تمہارے اندر موجود ہو۔ اسی آیت میں اللہ سبحانہ نے دو باتیں ارشاد فرمائی ہیں ایک یہ کہ اللہ تم پر کوئی تنگی نہیں چاہتا ہے، دوسرے یہ کہ اللہ تمہارے جسم کی پاکیزگی چاہتا ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ پہلی بات میں ایک بڑی اصل اور ضابطہ کلی کو جان لیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ شرائع اللہ میں مشقت اور توبہ نہیں۔ اگرچہ جہاں اصلاً قرآن آیت کا تعلق احکام طہارت سے ہے لیکن غننا اور تہا اس کی حیثیت تمام قوانین اسلامی کے لیے ایک ضابطہ اور کلیہ کی ہے کیونکہ قرآن نے پہلے دین کے بارے میں یہی بات فرمائی ہے ما جعل علیکم فی الدین من حرج یہ آیت سورہ حج کے آخر میں ہے جہاں پہلے اُمت کی مخصوص ذمہ داری کا ذکر کیا ہے کہ :

و جاهدوا فی اللہ حق جہاداً ۛ هو اجتہادکم

اس معنی میں ذمہ داری کے ذکر کے بعد یہ فرمایا کہ اللہ نے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ دین کی خاطر خوب محنت کرنا، جان کھپانا جیسے حزام امور کی بھراؤ دی دین میں تنگی نہیں ہے۔ تنگی نام ہے نقصان کے زیادہ ہونے کا جیسے خود کٹھن کرنا، جان بچانے کے لیے ہتھکڑیاں پہن کر دین سے بچنا، بیمار کو پانی استعمال کرنے کا۔ بیماری میں روزہ رکھنے کا حکم، عطار نے اس آیت سے ایک سے زیادہ اصول و ضوابط کا استخراج کیا ہے اور پھر ان پر فروع و جزئیات کی پوری قانونی عمارت قائم کی ہے۔ عبادات میں بھی معاملات میں بھی

معنوی اور ظاہری طہارت

آخر میں فرمائیے ہیں کہ لیکن مزید لیٹھ کہ جگہ اللہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک و صاف بنائے کیونکہ وہ خود پاک ہے پاک ہی پسند کرتا ہے، یعنی معنوی اور ظاہری ہر اعتبار سے، طہارت کا لفظ صاف سے قلب اور جسمانی پاکیزگی دونوں کے لیے عام ہے۔ قرآن میں کہیں جسمانی پاکیزگی کے لیے کہیں لہنی صاف کرنے کے لیے اور کہیں دونوں کے لیے آیا ہے۔ جسمانی پاکیزگی کے لیے سورہ مدثر میں آیا ہے و نیابت فطہم اور سورہ بقرہ میں ہے فلا تقربوا حتی لیطہروا اور آیت کو ختم ان الفاظ پر کیا ہے ان اللہ یحب المتوکلین و یحب المتطہرین اس میں دونوں طہارتوں کی گنجائش ہے یعنی اللہ ان سے محبت کرتا ہے جو میل، اندگی اور سہاست سے پاک و صاف ہوتے ہیں اور جو واضح اور منکرات سے بے دروغ ہوتے ہیں۔ اور صرف حدیث باطنی اور صفات

قلب کے موضوع پر سورۃ مائدہ کی یہ آیت ہے اذ لکٹ الذین لہ یرد اللہ ان یرحمہم قلوبہم
اگر قرآن کے استعمالات پر غور کیا جائے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ہمیشہ منظرِ آیت میں دونوں معنی
کی گنجائش ہے۔ وضو اور غسل کے بعد طہارت کا لفظ اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ طہارت
جسم کی پاکیزگی کے معنی میں ہے اور سیاقِ قرآنی اور طہارت کے بعد اقامِ نعمت کا ذکر اس بات
کا قرینہ ہے کہ طہارت معنائے قلب اور باطنی پاکیزگی کے معنی میں ہے۔

شاریینِ قرآن نے طہارت کے فوائد اور اس کی حکمتوں پر خوب سیر حاصل بحث کی ہے
اور عرفائے اسیما العلوم میں امام غزالی نے المیزان الکبریٰ میں امام شرفی نے اور محمد باقر
میں شاہ ولی اللہ نے خوب دادِ تحقیق دی ہے۔ تفصیل کے لیے معالم القرآن کے صفحات متحمل نہیں
اور اختصار مفید مدعا نہیں۔

روحانی اور جسمانی طہارت

۴۰۷۔ اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دے تاکہ تم اس کے شکر گزار ہو جاؤ۔ پچھلے رکوع میں
جو نعمائے عظیمہ بیان ہوئی تھیں ان کو سن کر بندے کے دل میں جوشِ اشکار اس منہم ضیعی کہ مندی کے
لیے فوراً کھڑا ہو جاتے اسے بتلادیا کہ ہماری طرف آؤ تو کس طریقے سے پاک ہو کر آؤ۔ یہ بتلانا
خود ایک نعمت ہوئی۔ اور بدن کی سطح ظاہر پر پانی ڈالنے یا مٹی لگانے سے اندرونِ پاکی طالعِ دنیا
یہ دوسری نعمت ہوئی۔ بندہ ابھی پچھلی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کر سکا تھا قصد ہی کر رہا تھا کہ
جدید انعامات فائز ہوتے، اس لیے ارشاد ہوا کہ لعکم تشکرون یعنی ان پہلی نعمتوں کو یاد کرنے
سے پہلے ان جدید نعمتوں کا جو احکام وضو وغیرہ کے ضمن میں مبذول ہو رہی شکر ادا کرنا چاہیے، تشکر
لعکم تشکرون ہی سے حضرت بلالؓ نے تحیۃ الرضو کا سرِ ارفع لگایا ہو۔ اس درمیانی نعمت
کے تشکر پر متوجہ کرنے کے بعد اگلی آیت میں ان سابق نعمتوں اور احساناتِ عظیمہ کو بھرپور اجماعاً
یاد دہاتے ہیں جن کی شکر گزاری کے لیے بندہ اپنے مولیٰ کے حضور کھڑا ہونا چاہتا تھا چنانچہ
فرماتے ہیں واذکروا نعمۃ اللہ علیکم

گویا اشارہ کر دیا کہ جس طرح پاکیزگی نفس ایک نعمت ہے۔ اسی طرح جسم کی پاکیزگی بھی ایک

نعمت ہے۔ انسان پر اللہ کی نعمت اسی وقت مکمل ہو سکتی ہے جبکہ نفس و جسم دونوں کی پاکیزگی کے لیے پوری ہدایت ملے گی جیسے کہ اللہ کی نعمت انسان روح و جسم دونوں کا نام ہے۔ دونوں کی تکمیل سے ہی انسانیت درجہ کمال حاصل کر سکتی ہے۔ غرض اگر روح کی طہارت اور نفس کا تزکیہ کرتے ہیں تو خود اور جسم کی صفائی اور طہارت کا کام کرتے ہیں۔ اور جسم کی صفائی میں بہت سے صرف طہارت ہی کی ہدایت نہیں فرمائی بلکہ طہارت کے ساتھ نفاست اور نفاست کی بھی ہدایت کی ہے اور قرآن نے مسجد کا نام لے کر ہدایت کی ہے کہ غزوہ اندرونِ نجد کے بعد کلا مسجد یعنی مسجد میں بیٹھ کر صبح کر آؤ۔ ظاہر ہے کہ پاک صاف اور رہنا ٹھنڈا شخص ہی اس لائق ہے کہ مجلسی زندگی لکھتے۔ قرآن نے یہاں اتمامِ نعمت کے کرم صاف اشارہ کر دیا کہ جو لوگ باطن کو صاف رکھتے ہیں مگر ظاہر کی پروا نہیں کرتے یا جو ظاہر کی ٹیپ ٹاپ پر زور دیتے ہیں مگر باطن کی صفائی سے یکسر غافل ہوتے ہیں، قرآن کی نگاہ میں دونوں ناپسند ہیں، قرآن کا مطالبہ دونوں کو یکساں کرنے کا ہے۔

نیز لیتے نعتِ عید کے ہیں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ نماز کے باب میں وضو اور تیمم کے ان احکام کے بعد اللہ کی نعمت تم پر تمام کر دی گئی ہے۔ جب کہ یہود کے ہاں طہارت کے مسئلے میں بڑی سخت قیدیں اور پابندیاں تھیں۔ اذلی تو ان کی شریعت میں احکام سخت ہی تھے، پھر ان پر مزید اضافہ ان کے فقہاء کے تشددات نے کر دیا تھا۔ تیمم کا ان کے ہاں تصور بھی نہ تھا اور یہ بات تو ان کے ہاں انتہائی بددینی کی متنی کہ کوئی شخص حدث و جنابت کی حالت میں خواہ کیسی ہی معذوری و مجبوری ہو، صرف تیمم کر کے نماز پڑھ لے۔ یہود کے یہ تشددات بھی من جملہ ان افعال کے تھے جو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے دور ہونے والے تھے چنانچہ تیمم کی اجازت نے طہارت کے باب میں اللہ کی نعمت کا اتمام فرمادیا اور اس اتمامِ نعمت سے اس اتمت کو جو سہولتیں اور برکتیں حاصل ہوئی ہیں ان پر ہر آنِ شکر و واجب ہے۔

اتمامِ نعمت کو تیمم کے ذکر میں لاکر یہ بھی بتا دیا ہے کہ اسلام میں دی ہوئی قانونی چیزوں سے تنگ دل نہ ہونا اور نفس کا ان پر شبہ کرنا جیسا کہ عمل میں غلو رکھنے والے کرتے رہتے ہیں۔ یہ مزاحمتِ حق ہے۔

اُمت کو ذمہ داریوں کی یاد دہانی

۳۰۸۔ اور اپنے اوپر اللہ کی نعمت یاد کرو اور اس کے اس حمد کو بھی یاد کرو جس کا اس نے تم سے حمد لیا ہے جبکہ تم نے کہا تھا کہ ہم نے سن لیا اور مان لیا۔ غالباً یہ وہ جہل ہے جو البقرہ کے آخر میں مومنین کی زبان سے نکل فرمایا تھا قالوا سمعنا واطعنا غفلة انفسنا ہتاد الیہ المصیر، جب صیبرا کرام رضی اللہ عنہم حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کو تھے اس وقت بھی یہ اقرار کرتے تھے کہ ہم اپنی اشتغاف کے مطابق آپ کی ہر بات کو سنیں گے اور مانیں گے خواہ ہمارے فساد اور طبیعت کے موافق یا خلاف ہو یہ تو عام عہد تھا، اس کے بعد بعض ارکان اسلام یا مابینہ علیہم السلام کے متعلق خصوصیت سے بھی عہد لیا جاتا تھا۔ گویا اس سورت کے شروع میں اذکر بالصفود فرمایا تھا درمیان میں بہت سے احسانات کا ذکر کر کے جن کو سن کر ایسا جتنے عہد کی ترقیب ہوئی ہے پھر وہی اصل سبق یاد دلایا گیا ہے یعنی

اس آیت میں دو باتیں تشریح طلب ہیں، ایک اللہ کی نعمت، دوسرے اللہ کا میثاق، نعمت یہ ہے کہ زندگی کی شاہراہ مستقیم تھا جسے لیے روشن کردی اور دُنیا کی ہدایت و رہنمائی کے لیے ہدایت کے منصب پر تہیں سرفراز کر دیا۔ اسی کو قرآن نے سورہ فاتحہ میں صراط الذین انعمت علیہم فرمایا ہے مطلب یہ ہے کہ ہم نے کامل شریعت نازل کر کے اور پروردگار کی امامت عطا کر کے جو ہم پر فضل و انعام فرمایا ہے اور تم کو ہر عزت و سرفرازی عطا کی ہے۔ یہود کی طرح سے اسے بھول نہ جاؤ بلکہ اس کو ہمیشہ یاد رکھنا۔ یاد رکھنا اپنے حقیقی معنی میں ہے یعنی ظہر آؤ باطن ہر پہلو سے اس کا حق ادا کرنا، اس کے بعد اس ذمہ داری کی نوعیت ظہر فرمادی کہ یہ تھا جسے اور تمہارے رب کے درمیان ایک مضبوط میثاق کی حیثیت رکھتی ہے جو خدا نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے تم سے لیا ہے اور تم نے پیغمبر کے سامنے سمعنا واطعنا کہہ کر اس میثاق کی ذمہ داری اٹھالی ہے۔ خدا نے تمہارے لیے دُنیا و آخرت کی کامیابیوں کے جو وعدے فرماتے ہیں وہ اسی میثاق پر منحصر ہیں۔ وہ ذمہ داری کیلئے ہے جس کا اُمت کو میثاق کے ذریعے ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔ دراصل حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ پروردگار کے لیے اور قیامت تک کے لیے نبی تھے۔ لیکن ان

مالِیکہ وراثت کے سلسلہ جاری رہنے کی عملی شکل اللہ تعالیٰ نے یہ متعین کی تھی کہ وہ آپ کے بعد حق کی شہادت دے سکے اور پھر یہ کہ وہ اپنے بعد کی نسل کو اس کام کے لیے تیار کرے اور یہ سلسلہ آخر تک نہ روک دیا جائے۔ اس طرح حقیقتِ دائمی یہ قرار پاتی ہے کہ آپ کی بعثت اہل عرب کی طرف تو ہر دستہ متقی مگر باقی دنیا کی طرف اس اُمتِ مسلمہ کے توسط سے متقی بنے آپ تیار کر گئے تھے اور جو نسل بعد نسل تیار ہوتی رہے گی، اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لے جانے کے بعد اب قیامت تک یہ اس اُمت کی ذمہ داری ہے کہ دنیا کے سلسلے حق کی شہادت دیتی رہے۔

كذالك جعلناكم اُمة وسطا لتكونوا شهداء على الناس

اور اسی طرح جیتے ہوئے جس طرح کہ اگر نبی موجود ہو تا تو دیتا، مختصر یہ کہ یہ اُمت اپنے وجود میں اپنے پیغمبر کی قائم مقام ہے اور بحیثیتِ اُمت اس کی زندگی کا مشن یہی ہے کہ فرضِ شہادت اُنہما دے کر اپنی ذمہ داری پوری کرے۔

اُمتِ مسلمہ کی یہ ذمہ داری کوئی معمولی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ اتنی ہی اور ہر گز ذمہ داری ہے کہ وہی اس کے وجود کا کل مقصد بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ ہم نے تمہیں ایک بہترین اُمت بنایا ہے اگر تم باقی سائے انسانوں کے لیے دینِ حق کے گواہ بنو۔ اس اُمت کی حیثیت صرف طور سے یہی متصور کرنا ہے۔ اُمت کی ذمہ داری کا یہی وہ میثاق ہے جس کو عہدِ اول کے مسلمانوں نے سفا و اطفا کر کے قبول کیا۔ یہی سب سے طاعت کا وہ میثاق ہے جو حضورِ خود صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں سے لیتے رہے۔ قرطبی نے حضرت عبداللہ ابن عباس کی طرف نسبت کر کے لکھا ہے:

هو العهد والميثاق الذي جرى بينهم مع النبي صلعم على السبع

والطاعة في المشط والمكن

وہ عہد اور میثاق جو حضور سے صحابہ نے کیا کہ ہم آپ کی نیکیں گے اور آپ کی طاعت کریں گے ہمیں گوارا ہو یا ناگوار۔

امام رازی نے تفسیر کبیر میں حافظ ابن کثیر نے تفسیر میں امام لغوی نے عالم میں اسی کو راجع قرار دیا ہے۔

یہ کہنا کہ اس میثاق سے عالمِ ارواح کا وہ عہد ہے جو مسکے بنی آدم سے اقربا و ربوبیت کے بارے میں لیا گیا تھا درست نہیں ہے کیونکہ یہاں خطاب عام نوعِ بشری سے نہیں بلکہ اہل ایمان سے ہے اس لیے آسان اور بے تکلف تفسیر یہی ہے کہ وہ عہد مراد لیا جائے

جس کی اُمت پر ذمہ داری ڈالی گئی ہے وہ شہادت علی الان کے سوا کچھ نہیں ہے۔

اسلامی تصور تقویٰ کا آئینہ

۲۰۹۔ اور اللہ کی ازادانی سے پہلے ملک انہ سبوز ملک کے اندک عالم رکھتا ہے۔ ایک شریف اور عیاد آدمی کی گردن اپنے حسنِ عظم کے سامنے جھک جاتی ہے، مردت و شرافت اور آئندہ دولت کی توقع اسی کو متفق ہے کہ بندہ اس منہم حقیقی کا بالکل تابع و تابع بن جاتے خصوصاً صاحبِ کربان سے اطاعت و وفاداری کا پختہ وعدہ و اقرار بھی کیا ہو۔ لیکن ہے کہ حق تعالیٰ کی کہ انتہا مہربانیاں دیکھ کر بندہ مغربہ برہستے، اس کی نعمتوں کی قدر اور اپنے قول و قرار کی کوئی پروا نہ کرے اس لیے فرمایا اللہ تعالیٰ اللہ یعنی خدا سے ہمیشہ ڈرتے ہو، وہ ایک لمحہ میں تم سے سب نعمتیں چھین سکتا ہے۔ اور نا شکری اور بے عہدی کی نرا میں بہت سخت پکڑ سکتا ہے۔ بہر حال، اللہ شرافت اور خوف ہر چیز کا قاضی ہے کہ ہم اس کی غلصہ اطاعت اور وفاداری میں پوری استعداد دکھائیں گے وہ عیسٰیہ ذات الصدد سچے ہم جو کچھ کریں گے وہ ہماری اخلاص و لائق یا کاری یا قلبی نیاز مندی کو خوب جانتا ہے فقط زبان سے نعمت و اطاعت کہنے یا شکوہ گزاری کے رسمی دعوہ ہی غلط ہے ہم اس کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔

اصلی تقویٰ یہ ہے کہ نفس کی خواہشوں کی طرف ذوق نہ لگے کی ازاد میں پر بھی احکامِ الہی کا پورا کنٹرول ہو۔ تقویٰ کا یہ تصور شاید عام ذہنوں کو کچھ عجیب۔ محرم ہو مگر یہی الجو بہ بن دین حق کا وہ خاص وصف ہے جو اس کی ہر موقعتہ پر تلقین کرتی ہے۔ تو ان جو بار بار اور ہر موقعتہ پر تقویٰ کی یاد دیتا ہے اور نوبت ہو اس کی ہر موقعتہ پر تلقین کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کے پیش نظر کچھ امتوں کی تاریخ تھی، تحریفِ ارباب کے تجربے تھے۔ نفس کشی اور بیابیت کے تجربے تھے۔ قرآن کو معلوم تھا کہ اللہ کے دین کو صرف نفس کے بھاری بی ملامت نہیں کرتے تھے ہیں بلکہ انہوں کا غور و تشدد اس کو تھی ہمیشہ اور نیا مزاج دیتے تھے ہیں اور جس چیز میں بے راہ روی سب زیادہ راہ باقی رہی وہ بھی اُمت کی ذمہ داری ہے۔ شہادتِ حق ناس کے فریضہ کو لوگوں نے دین میں خالص چیز گھڑ لیا اور اس معلوم یقین کے ساتھ محمدیہ عزت، گوشہ نشینی، خلوتِ خدا کو

پسند ہے، پھر یہ طرز فکر آگے بڑھا اور تنہائی اور اجتماعی زندگی سے گریز پائی دینداری کا کمال بن گئی اور اس کے نتیجہ میں ذوق داری کا وہ کام چھوڑ بیٹھے۔ یہ وہ پس منظر ہے جس کی موجودگی میں قرآن نے ضرورتی سمجھا کہ اہل ایمان کو اچھی طرح متسلحہ کر دے اور ان خطرات سے اسلام کے مستقبل کو اچھی طرح محفوظ رکھے۔ کاپرولر اور سامان کرہاتے جو ہمیشہ سے دین خداوندی کو پیش آتے رہے اور اسے بدل کر کچھ سے کچھ مانتے رہے ہیں اور اس غرض سے شہادت علی الناس کی ذوق داری کے فریضہ کو خاص طور پر کھیل اور تماشہ بننے سے روک دے اس لیے قرآن نے، بات اچھی طرح لوگوں کے ذہن نشین کرادی کہ اللہ تعالیٰ نے امت کی ذوق داری کا جو میدان مقرر کیا ہے محض اسے برقرار رکھا جائے۔ گویا انقراب اللہ فرما کر تعیل احکام میں اعلان ہوا کہ اسے پر زور دیا گیا ہے۔ سید رشید رضا لکھتے ہیں کہ،

جو کچھ ہم نے کہنے کو کہا ہے اور جس چیز سے ہم نے روکا ہے اس کی خلاف ورزی کر کے حمد شکنی نہ کرو اور نبوت خدا کی جانب سے دین کے نام پر جو کچھ لے کر آئی ہے اس میں اضافہ نہ کرو اور نہ کمی کرو اور اس کے یاد رکھنے میں کوئی کوتاہی نہ کرو۔ اس میں کسی قسم کی تحریف نہ کرو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو تمہارا حال بھی ان سے ہرگز مختلف نہ ہوگا جن سے اللہ نے حمد لیا تھا یعنی اہل کتاب اور وہ اسے فراموش کر بیٹھے تھے تحریف کے سوا کچھ ہو گئے اور پھر اپنی ملاتے سے دین میں اضافہ اور کمی کرتے رہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ
وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاَنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۖ اعْدِلُوا
هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝
وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ
وَأَجْرٌ عَظِيمٌ ۝ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا
أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْحَرِيمِ ۝ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا
نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ هُمْ قَوْمٌ أَن يَبْسُطُوا إِلَيْكُمْ
أَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ وَعَلَىٰ
اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ۝

اے اہل ایمان! تم اللہ کی خاطر مضبوطی سے کھڑے ہونے والے
اور انصاف کی شہادت دینے والے ہو جاؤ۔ اور دیکھو کہ
کسی گروہ کی دشمنی تمہیں بے انصافی پر نہ ابھارے،

ہر حال میں انصاف کرو کہ یہی مقوی سے لگتی ہوتی بات ہے۔ اور اللہ کی نافرمانی سے بچ کر رہو جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے۔ جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے اللہ کا ان سے وعدہ ہے کہ ان کے لیے مغفرت ہوگی، اور بہت ہی بڑا اجر ہوگا لیکن جن لوگوں نے ہماری آیات کا انکار کیا اور ان کی تکذیب کی تو وہ دوزخی ہیں۔ اے ایمان والو! اپنے اوپر اللہ کا وہ انعام یاد کرو کہ جب ایک گروہ نے پورا پورا ارادہ کر لیا تھا کہ تم پر ہاتھ بڑھاتے تو اللہ نے ان کے ہاتھوں کو روک دیا تھا، اللہ کی نافرمانی سے بچو اللہ ہی پر اہل ایمان کو بھروسہ کرنا چاہیے۔

میشاق کی اجتماعی ذمہ داری

پہلی آیت میں میشاق کی انفرادی ذمہ داری بتائی گئی تھی۔ اب اس آیت میں میشاق کی اجتماعی ذمہ داری واضح کی گئی ہے کہ مسلمانوں پر بحیثیت امت مسلمہ ذمہ داری ہے کہ

وہ اس حق و عدل کے معجز نہیں جو آخری نبوت علم و عمل کی صورت میں لائی ہے خود اپنے انداز
کو قائم کریں اور اسی کی دنیا کے سامنے شہادت دیں۔ شہادت حق کے دو پہلو ہیں قول
شہادت اور عمل شہادت۔

قولی شہادت یہ ہے کہ اسلام کے بنیادی عقائد سے لے کر اس کے تفصیلی احکام تک
غیر مسلموں کے سامنے محزوں ترین الفاظ اور عبارت میں پیش کیا جاسکے ایمان تک کر دین ان کے
پسے کھلی کتاب بن جاسکے اور ان کے لیے اپنے دین کا پورا اور اسلام کی صداقت پالینے میں کی متوال
رکاوٹ نہ رہے۔

عملی شہادت یہ ہے کہ اسلام کی جو تصویر الفاظ میں پیش کی جاسکے وہ پیش کرنے والے کی اپنی
زندگی میں بھی دیکھ لی جاسکے۔ امت کے افراد اپنی انفرادی حیثیتوں میں اور پوری امت اپنی اجتماعی
حیثیت میں سب کے سب اسلام کے عملی ترجمان ہوں۔ انہیں توحید، آخرت اور رسالت وغیرہ
عقائد پر گراہیقین برادر یہ یقین ان کی ایک ایک ادا سے ٹپک رہا ہو۔ ان کے اخلاق وہ
ہوں جن کی اسلام نے تخلیق کی ہے۔ ان کے معاملات ان ہی خطوط پر اسٹھام پائیں جو نبوت
کے علم و عمل نے متعین کر دیے ہیں۔ ان کی معاشرت، ان کی معیشت اور ان کی سیاست فرض ان
کی زندگی کا پورا نظام، اور اس نظام کا ایک ایک شعبہ اس نقشے کے مطابق تعمیر ہو جو اللہ و رسول
نے بنا کر دیے ہیں۔ ہر دنیا اپنی انھوں نے کہ اسلام کیا ہے وہ کس قسم کے معاشرہ اور کس قسم کا شیٹ
دورہ میں لانا چاہتا ہے۔

عملی شہادت کا ترجمہ قولی شہادت سے مقدم تر بھی ہے اور اہم تر بھی ایک تو اس لیے کہ
جب تک کوئی شخص یا گروہ خود ہی کسی دین کی پیروی نہ کر رہا ہو اسے کسی طرح زیب نہیں آتا کہ
وہ دوسروں کو اس کی پیروی کی دعوت دے۔ دوسرے اس لیے کہ لوگوں کی بہت بڑی اکثریت
ناید سر میں سے ۱۹ ویں صدی کی زیادہ بڑی اکثریت اصلاً عملی دلائل ہی کی زبان سمجھتی ہے عقلی دلائل
تک اس کی رسائی بہت کم ہوتی ہے۔

یہ ہے قوانین لہذا کا پورا مفہوم۔ امت مسلمہ کی عملی کوششیں اس معیار کے جس حد تک
قریب ہوں گی اسی حد تک وہ قوانین لہذا کے فرض میں کامیاب اور قرآن کے مطالبہ کو پورا
کرے گی۔

۴۴۔ لے اہل ایمان تم اللہ کی خاطر منہ ۱ سے کھڑے ہونے والے اور انصاف کی شہادت

لیجئے ورنہ ہر جادو۔ اس سے پہلی آیت مومنین کو حق تعالیٰ کے احسانات اور اپنا عہد و پیمان یاد کرنے کا حکم دیتا تھا۔ یہاں بتلادیا کہ صرف زبان سے یاد کرنا نہیں بلکہ عملی دنگ میں ان سے اس کا ثبوت مطلوب ہے۔ اس آیت میں اسی پر تمبیہ کی گئی ہے کہ اگر تم نے خدا کے لیے بے شمار احسانات اور اپنے عہد و قرار کو بھلا نہیں دیا تو لازم ہے کہ اس ضمنِ ستیتی کے حقوق ادا کرنے اور اپنے عہد کو سچا کر دکانے کے لیے ہر وقت کمر بستہ رہو اور جب کوئی حکم اپنے اُفتلے دلِ نعمت کی طرف سے ملے فوراً تعمیل حکم کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔ اور خدا کے حقوق کے ساتھ مخلوق کے حقوق ادا کرنے میں بھی پوری جہد و جہد اور اہتمام کرو۔ چنانچہ قوانینِ شرع میں حقوق اللہ کی اور شہداء کا بالتقط میں حقوق العباد کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اسی قسم کی ایک آیت پانچویں پارے کے آخر میں گزر چکی ہے صرف اس قدر فرق ہے کہ وہاں بالتقط کو شرع پر مقدم کیا ہے۔ شاید اس لیے کہ وہاں دوسرے حقوق العباد کا ذکر چلا آیا تھا اور یہاں پہلے سے حقوق اللہ کا ذکر ہو رہا ہے اس لحاظ سے وہاں بالتقط اور یہاں شہداء کی تعلیم برتی ہے۔ نیز یہاں طاق میں مبنویں دشمن سے معاملہ کرنے کا ذکر ہے جس کے ساتھ بالتقط کو یاد دلانے کی ضرورت ہے اور سورہ نساء کے طاق میں محبوب چیزوں کا ذکر ہے اس لیے یہاں سب سے پہلے محبوب اللہ کو یاد دلایا گیا ہے۔ ایک وجہ تو یہی ہے جو شیخ الاسلام نے پیش فرمائی ہے لیکن ابویحیٰ اندلسی نے اپنی تفسیر البحر المحیط میں ایک اور لطیف وجہ بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ سورہ نساء اور سورہ مائدہ میں یہ تعبیری فرق کیوں ہوا ہے کہ نساء میں کہ نساء امین بالتقط شہداء اللہ فرمایا اور مائدہ میں کہ نساء امین اللہ شہداء بالتقط فرمایا یعنی ایک جگہ بالتقط کو قوانین کا اور شرع کو شہداء کا متعلق بنا کر پیش فرمایا اور دوسری جگہ اللہ کو قوانین کا اور بالتقط کو شہداء کا متعلق بنا کر لایا گیا۔ دیکھتے ہیں کہ انسان دو چیز سے جادو انصاف سے ہشتا ہے غلبہ محبت اور غلبہ عداوت سورہ نساء میں دوتے سخن محبت کی طرف ہے اور سورہ مائدہ میں دوتے سخن عداوت کی طرف ہے۔ اگرچہ دونوں عنوان ایک ہی انجام تک پہنچتے ہیں کیونکہ جو شخص انصاف کا علم بردار ہو گا وہ اللہ ہی کے لیے کھڑا ہو گا اور جو اللہ کے لیے کھڑا ہے وہ ضرور انصاف کرے گا لیکن دراصل یہاں قوانین کے ساتھ شرع لگا کر میثاق کی اجتماعی ذمہ داری کو یاد دلایا گیا ہے۔

پہلے یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ اللہ کے لیے کھڑا ہونا کیا ہے، اللہ کے لیے کھڑے ہونے کا یہ مطلب ہے کہ نبوت جو علم و عمل خدا کی جانب سے لے کر آئی ہے اسے پوری دنیا میں رائج کرنے کے لیے قولاً و فعلاً معلم اور ذمہ دار ہو جاؤ۔ اس کے لیے یہاں صرف یہی نہیں فرمایا قوموا للہ جیسا کہ البقرہ میں آچکا ہے نہ یہ فرمایا کہ کوذوالقلمین للہ بلکہ قیام سے مبالغہ کا صیغہ لے کر آئے اور فرمایا کوذوالقلمین للہ، دوسری تعبیرات کو چھوڑ کر یہ انداز بیان اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ مخاطبوں کے ذہن میں یہ بات آجائے کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے اور جس بات کا مطالبہ کیا جا رہا ہے وہ صرف یہ نہیں ہے کہ اللہ کا کام کرو بلکہ یہ کہا جا رہا ہے کہ جس دین کو اللہ کی جانب سے نبوت علم و عمل کی صورت میں لے کر آئی ہے اس کے لیے بہت زیادہ محنت کرنے والے ہو جاؤ اور یہ کام وقتی طور پر نہیں بلکہ دائمی طور پر کرو گویا اس فقرے میں دو مطالبے ہیں، ایک یہ کہ یہ کام خوب کیا جائے اور بہت زیادہ کیا جائے یہ بات قوام کو مبالغہ کا صیغہ لاکر بتاتی ہے، دوسرے یہ کہ یہ کام جنگی طور پر نہ ہو بلکہ ہمیشہ کیا جائے یہ بات قوامین کو کڑا کی خبر بنا کر بتاتی ہے مطلب یہ ہے کہ نبوت کے علم و عمل کو اپنانا اور قبول کرنا ہی تمہاری ذمہ داری نہیں بلکہ تمہارا فرض یہ ہے کہ تم دنیا کے سامنے آقا قیام قیامت اس کے علمبردار اور اس کے داعی بن کر ہر اسکی تبلیغ مسنویت کی خاطر کرونا قوامین لکن تبصر اختیار کی ہے۔ یعنی زندگی کی ساری شاخوں میں نبوت کے علم و عمل کے علمبردار ہو جاؤ اس میں جماعتی حیثیت سے خوب محنت کرو اور جانیں کھپاؤ اور یہ کام اس طرح انہام دو کہ یہ تمہارا قومی نشان بن جائے گویا نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل کو اپنے قیام کے لیے جس سماج کی ضرورت ہے مومن کی حیثیت سے تمہارا مقام یہ ہے کہ تم وہ سہارا بنو امت کی اسی اجتماعی ذمہ داری کو قرآن نے دوسرے موقع پر ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

جاهدوا فی اللہ حق جہادہ

اللہ کی خاطر خوب محنت کرو جیسا کہ اس کی خاطر محنت کرنے کا حق ہے اور پھر اس کی وجہ یہ بتاتی ہے

هو اجتباکم وما جعل علیکم فی الدین من حرج ملة
ایکم ابراہیم ہر سہ ماہہ المسلمین من قبل و فی هذا
لیکون الرسول شہدا علیکم و کونوا شہدا

معلم الناس (ج ۱۸)

اس نے تمہیں منتخب کیا ہے اور تمہارے لیے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی ہے اپنے باپ ابراہیم کے راستہ کی پیروی کرو، اسی نے پہلے ہی تمہارا نام مسلم رکھا ہے اور اسی لیے رکھا ہے تاکہ رسول تمہارے لیے دین حق کی گواہی دینے والا ہو اور تم دوسرے تمام لوگوں کے سامنے دین حق کی گواہی دینے والے ہو۔

اس آیت میں اُمت مسلمہ کی مخصوص حیثیت اور اس کی مخصوص ذمہ داری دونوں بیزل کو پوری طرح اجاگر کر دیا ہے۔ اس میں اُمت کے لیے اجتہاد کا نفاذ استعمال ہوا ہے۔ اس کے معنی ہیں بہتر شے کا انتخاب۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اس اُمت کو اس کام کے لیے منتخب کیا ہے۔ یہ نفاذ قرآن مجید میں عام طور پر انبیاء کے لیے استعمال ہوا ہے، انھوں نے اپنے کریم نفاذ جو عموماً منصب نبوت و رسالت کی خاطر کیے جانے والے انتخاب کے لیے بولا گیا ہوئے اگر ایک اُمت کے لیے بولا گیا ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ یہ اس اُمت کے پیغمبر اکرام کے ذمہ دار ہونے کی مکمل دلیل ہے اس کے بعد جو سماج المسلمین من قبل بنا رہا ہے کہ اس اُمت کو اُمت مسلمہ کے نام سے آج نہیں بلکہ مدتوں پہلے نوازا گیا ہے۔ یہ اس اُمت کے تمنا اور غیر معمولی اُمت ہونے کی دوسری دلیل ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی بشارت آپ کی تشریف آوری سے ہزاروں سال پہلے ہی دی جا چکی تھی۔ ٹھیک اسی طرح کا معاملہ آپ کی اُمت کا بھی ہے ابھی اس کے وجود میں آنے کے لیے شب و روز کی ہزاروں لاکھوں گردشیں باقی تھیں مگر اس کے نام کا اور اس کے کام کا اور اس کے اوصاف کا اعلان پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اس اُمت کو یہ نام اور مقام عطا صرف اس لیے ہوا ہے کہ اس کا کام بھی اسی نام کے شایان شان انھم دینا ہے۔ بہر حال اس آیت میں یہ حقیقت ساری دنیا کو سمجھا دی گئی ہے کہ اس اُمت کا کام دنیا میں قواموں و مذہبوں کو رہنا ہے۔

اصل تو اس اُمت کے وجود کی غرض و غایت دین حق کی اپنی زندگی میں اور پھر پوری دنیا میں برتری اور اس کا بول بالا ہے۔ شہادت، جہاد، دعوت اور قیام اللہ اسی منزل تک پہنچنے کی راہیں ہیں۔ قرآن میاں اس کا چہرہ پیش کر رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ مسلمانوں! تمہیں اجتماعی حیثیت سے اس ذمہ داری کو پورا کرنا پڑیگا، اور اس کے بعد فرمایا کہ

صرف دنیا نہیں کرتی دنیا میں دین حق کا رول بالا کرنے والے بن کر رہ رہ چکے اس کے ساتھ یہ بھی نزدیکی ہے کہ قلم دنیا میں عدل و انصاف کے گراہ ہو جاؤ۔ یہ نہیں فرمایا کہ انصاف کرو بکڑیا کہیں ہنگامہ دنیا میں عدل و انصاف کو نبھانے کے لئے کھڑا ہونا ہے۔ تمہیں اس بات پر کمر بستہ ہونا چاہیے کہ قلم میں اور عدل و انصاف قائم ہو۔

عدل و انصاف کا گراہی دینے والے ہو جاؤ شہد اربالغہ کا ایک مطلب تو یہی ہے کہ سچی گواہی دو جس کا عام فارعین قرآن کی رائے ہے لیکن اس موقع پر صرف یہی بات نہیں کہی جا رہی ہے بلکہ یہ بتایا جا رہا ہے کہ دنیا میں اس عدل و انصاف کے علمبردار بن کر رہو جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی جانب سے لئے کرائے ہیں اور اس قانونی نظام کا قائم کردہ جو اسلام کے نام پر نبوت لے کر آئی ہے۔ قانون کی طاقت ناقابل شکست ہے کہ جسے بھی قانون سے بالاتر نہیں ہوتا، زامیر و فزیر اور خواص و عوام کا یہاں کوئی امتیاز نہیں ہے۔ اوسپنے سے اوسپنا شخص حتیٰ کہ سربراہ مملکت بھی قانون کا اسی طرح محکوم ہے جس طرح ایک بے کس اور بے بس شہری۔ اگر کسی معاملہ میں خود سربراہ مملکت مدعی یا مدعا علیہ ہو تو عدالت میں اسے بھی اسی طرح اور اسی حیثیت میں حاضر ہونا ہوگا جس طرح اور جس حیثیت سے دوسرے لوگ حاضر ہوتے ہیں، اسی طرح اگر قانون کسی مقدمے میں اسے مجرم قرار دیتا ہے تو اسے بھی سزا لازماً بمقتنی پڑے گی۔ قرآن کے یہ الفاظ شہد اربالغہ قانون کی بالادستی کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے ہیں۔

راہ عدل کی سب سے بڑی رکاوٹ

۴۱۔ کسی گروہ کی دشمنی تمہیں بے انصافی پر زور دے۔ عدل کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کے ساتھ بغیر افراط و تفریط کے وہ معاملہ کرنا جس کا وہ واقعی مستحق ہے۔ عدل و انصاف کی ترازو ایسی صحیح اور برابر ہونی چاہیے کہ حقیت سے حقیت اور شدید سے شدید عداوت بھی اس کے دونوں پولوں میں سے کسی پلے کر دھجکا سکے۔

اس فقرے میں عدل کی راہ کے سب سے بڑے فتنے سے انکار کیا گیا ہے کہ کسی قوم کی دشمنی

۱۱۔ اس کا غلط سے غلط رویہ بھی تمہیں اس حق و عدل سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو۔ شیطان نے راہ عدل سے ہٹانے میں سب سے زیادہ جس حربے سے کام لیا ہے وہ یہی ایک دوسرے کے ساتھ دشمنی کا حربہ ہے یہود نے یمن بنی سماعیل اور مسلمانوں کی دشمنی میں اس عہد و پیمان کو خاک میں ملا دیا۔ جس کے دو گواہ ۱۱۔ زبیر اور بنائے گئے تھے۔ اس وجہ سے مسلمانوں سے یہ عہد لیا گیا کہ وہ شیطان کے اس فتنے سے بچ کر رہیں۔ دوستوں اور دشمنوں دونوں کے لیے ان کے پاس ایک ہی باٹ ہوا ایک ہی ترازو ہو۔

عدل کا مقصد یہ ہے کہ قانون کی بنا پر جو حقوق افراد کو حاصل ہیں ان کی حفاظت کی جائے اور انہیں ظلم و جور سے محفوظ رکھا جائے خواہ بیکانے ہوں یا بیگانے۔ دوستی اور دشمنی عدل کی راہ میں رکاوٹ نہ ہو۔

مسند امام احمد میں بحوالہ جابر بن عبد اللہ یہ واقعہ آیا ہے کہ جب غلبہ یہ مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں کے شہریوں کے زمینوں پر قبضہ کیا اور ان سے معاہدے کر لیا۔ اٹل شدہ معاہدہ کے مطابق حضرت عبد اللہ بن رواحہ کو دہلیا لیا گیا کہ یہ مجھ کو بخش دے اور کیا۔ عبد اللہ نے سادی پیداوار کو اندازے سے تقسیم کر دیا کہ یہ سرکاری ہے اور یہ ہائی کرنے والوں کی، زمینوں پر کام کرنے والے یہودی تھے۔ انہوں نے عبد اللہ کو کچھ رشتہ کیے کا ارادہ کیا تاکہ بنائی میں ان کی رعایت ہو جائے۔ حضرت عبد اللہ بن رواحہ نے فرمایا کہ اے یہودیو! سنو میں تمہارا مخالف ہوں، تم بیویوں کے قاتل ہو اور اللہ پر بے ہمدانی اڑاتے ہو۔ لیکن اس کے باوجود میری تم سے دشمنی مجھے جاوے انصاف عدل سے نہیں ہٹا سکتی۔ میں نے میں ہزار دست کا اندازہ لگایا ہے چاہتے ہو تمہارے لئے درمیرا ہے، انہوں نے کہا اسی عدل و انصاف پر تو پوری کائنات قائم ہے ہم لیتے ہیں بس۔

عدل میں تقویٰ کی ضمانت ہے

۴۲۔ ہر حال میں انصاف کر دو کہ یہی تقویٰ سے لگتی ہوئی بات ہے۔ جو چیز شرعاً مسمک یا کسی وجہ میں مضربیں۔ ان سے بچاؤ کرتے رہنے سے ایک خاص نورانی کیفیت آدمی کے دل میں راسخ ہو جاتی ہے اس کو نام تقویٰ ہے۔ تفصیل تقویٰ کے اسباب قریب اور بعید بہت

ہے ہیں۔ تمام اعمال حسد اور خصالِ خیر کو اس کے اسباب و معدلات میں شمار کیا جاسکتا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ عدل و قسط یعنی دوست و دشمن کے ساتھ یکساں انصاف کرنا اور حق کے معاملہ میں جذباتِ محبت و عداوت سے قطعاً مغلوب نہ ہونا۔ یہ خصلت حصولِ تقویٰ کچھ موثر ترین اور قریب ترین اسباب میں سے ہے اسی لیے حوا اقرب للفقویٰ فرمایا یعنی یہ عدلِ حق کا حکم دیا گیا تقویٰ سے نزدیک تر ہے کہ اس کی مزاوت کے بعد تقویٰ کی کیفیت بہت جلد حاصل ہر حالت میں ہے۔

پہلے حکم دیا تھا کہ کسی قوم کی دشمنی کی وجہ سے بے انصافی نہ کرو۔ اب حکم ہو رہا ہے کہ عدل کرو عدل میں اور تقویٰ میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ نفست میں عدل نام ہے کسی بوجہ کو دو برابر حصول میں اس طرح تقسیم کر لینے کا کہ ان دو میں سے کسی میں زبرد برابر کی یا بیشی نہ ہو اور اسی سے اس میں یہ مضمون پیدا ہوتا ہے کہ جرات ہم کہیں یا جو کام ہم کریں اس میں سچائی کی میزان کسی طرف جھکے نہ پڑے اور وہی بات کہی جائے اور وہی کام کیا جائے جو سچائی کی کسوٹی پر پورا اترے۔ علامہ نیرومی مصباح فرماتے ہیں،

عدل کے معنی میں معاملات میں میانہ روی سے کام لینے کے یہ جوہر کے

خلاف ہے عدل فی امور عدلا اور عدل علی القوم عدلا باب ضرب سے آتا ہے۔

علامہ ابن الاثیر نے نمایاں ہیں عدل بالفتح عدل بالکسر کر مثل کے اور عدلی کر مثیل کا مراد قرار دیا ہے۔ یہاں عدل کا مطلب یہ ہے کہ جماعتی حیثیت سے تمہارا دامن بے انصافی سے آزاد نہ ہو۔ جس قوم اور جماعت سے تمہاری دشمنی ہو اس سے معاملات میں اور اداۓ حقوق میں وقت کی سطعیں سیاسی تقاضے اور ملکی مفادات تمہیں عدل و انصاف کی شاہراہ مستقیم سے نہ ہٹائیں قرآن نے انفرادی سے لے کر اجتماعی زندگی تک اور گفتار سے لے کر کردار، اخلاق اور روحانی عالمی، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور قانونی زندگی کے ہر پہلو میں عدل کو قائم کرنے کی تلقین کی ہے عدل کا حکم قرآن میں جیسا صرف انفرادی زندگی تک محدود نہیں اسی طرح وہ عدل کو صرف یگانوں تک محدود رکھنا نہیں چاہتا بلکہ اس آیت میں کھول کر منفی اور مثبت اہواز میں بتایا

گیا ہے کہ ہر انصاف و برائی پھر فرمایا کہ انصاف کرو اور پھر اس میں اور زور پیدا کیا کہ عدل ہی تقویٰ کی ضمانت ہے یعنی تقویٰ جو تمام اسلامی زندگی کی روح اور اہل ایمان کے ہر قول و فعل کے لیے کوئی ہے اس سے قریب ترین عمل یہ ہے کہ بیگانوں کی ساری عداوت کے باوجود ان کے ساتھ کر لی معاملہ عدل و حق سے ہٹ کر نہ کیا جائے اس سے عدل کے ساتھ اسلام کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں تقویٰ کا مقام بھی معلوم ہو گا کہ تمام نیکیاں فی الواقع اسی غیر سے وابستہ ہیں۔ اس کا واضح اور صاف مطلب یہ ہے کہ عدل و انصاف اہل ایمان میں خدا ترسی کی صفت اور تقویٰ کا جوہر پیدا کرتا ہے۔ یعنی اللہ کی ناراضگی سے بچنے کے اس گھرے احساس کو بیدار کرتا ہے جو آدمی کو ہر جملے کام پر اجماع و تلامد و ہر برے کام سے روکتا ہے یا یوں کہیے کہ وہ ایک خاص قلبی کیفیت ہے جس سے ایک خاص عملی رویہ وجود میں آتا ہے۔ یہ عملی رویہ اللہ کی طاعت اور رضا جوئی کا رویہ ہوتا ہے۔ اس خاص کیفیت سے جو دل بہرہ ور ہوتا ہے وہ ہر وقت یہ دیکھتا ہے کہ میرا خدا مجھ سے ناراض نہ ہونے پائے۔ میں کوئی ایسی حرکت نہ کروں جس کو وہ پسند نہیں کرتا اور کسی ایسے کام سے کرنے سے روک نہ جاؤں جسے وہ پسند کرتا ہے۔

اللہ کی ناراضگی سے بچنے کی اور اس کی خوشنودی حاصل کر لینے کی یہ خواہش اور کوشش سرچے و محاسبہ پوری ہوتی ہے؟ کوئی شک نہیں کہ یہ خواہش اور یہ کوشش اسی وقت پوری ہو سکتی ہے جب کہ انسان اپنے آپ کو قابو میں رکھے اور اپنے نفس کو من مانی کرنے سے روکے ہے گویا تقویٰ کا مقام پالینے کا واحد راستہ یہ ہے کہ انسان ہر معاملے میں اپنے نفس کو نگاہ نگاہت خواہ اس کی اپنی ذات ہو اس کے رشتہ دار ہوں، امیر ہوں، غریب ہوں، یگانے ہوں، بیگانے ہوں، دوست ہوں یا دشمن ہوں کسی جگہ اپنی خواہشوں کو آزاد نہ چھوڑے، اسی کا نام عدالت یعنی افراط و تفریط سے ہٹ کر راہ اعتدال اختیار کر لیا ہے۔ اللہ اکبر دنیا کا کون سا قانون ہے جس نے اپنے باغیوں اور معاندوں کے حقوق گناہی رعایت رکھی ہے جتنی اسلام کا قانون نے۔ قرطبی نے کیا اچھی بات حکمی ہے کہ کافر کا کفر اسے اس سے محروم نہیں کرتا کہ اس کے حق میں عدل کیا جائے یا اس کے شہری و انسانی حقوق ادا کیے جائیں اور جب کافر کے ہاں سے قرآن نامیہ مطالبہ ہے کہ شہری زندگی میں اس کے انسانی حقوق ادا کیے جائیں تو اس سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ فاسق اور بدعتی کے ہاں میں قرآن کیا چاہتا ہے؟ یعنی جب منکول باغیوں، سرکشوں کے ساتھ عدل و احسان ہے تو مسلمان فاسقوں اور بدکاروں کے ساتھ

وہ جو بکتا مکتدہ ہو گا۔ علامہ محمد عسکری اور امام رازی نے اس آیت سے یہی بات سمجھی ہے حضرت تھوری
قدس اللہ سرہ العزیز نے چیمپاں یہ لطیف نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ معاملات میں طبیعت پر عمل نہ کرنا ایک
مجاہدہ ہے اور یہاں اسی کی تعلیم ہو رہی ہے۔

عدالتِ تقویٰ کا لازمی ذریعہ ہے

۴۳۔ اور اللہ کی نافرمانی سے بچ کر رہو جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے۔ یعنی
ایسا عدل و انصاف جسے کوئی دوستی اور دشمنی نہ روک سکے اور جس کے اختیار کرنے سے آدمی کو
مستحق بننا سہل ہو جائے۔ اس کے حصول کا واحد ذریعہ خدا کا ڈر اور اس کی شانِ انتقام کا خوف
ہے اور یہ خوف ان اللہ خبیروں کا تعلق ان کے منعموں کو بار بار مراقبہ کرنے سے حاصل ہوتا ہے
جب کسی مومن کے دل میں یہ یقین مستحضر ہو گا کہ ہماری کوئی چھپی یا کھلی حرکت حق تعالیٰ سے پوشیدہ
نہیں ہے تو اس کا قلب خشیتِ الہی سے لرزنے لگے گا جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ تمام معاملات
میں عدل و انصاف کا راستہ اختیار کرے گا۔ اور احکامِ الہیہ کے انتقال کے لیے غلامانِ باریاں
ہیں۔ پھر اس نتیجہ پر قرہ وہ ملے گا جسے آگے آیت میں بیان فرمایا ہے **وعدا اللہ الذین استخوان**
اللہ کی اس ہمرہی اور ہمدانی کا استحضار ہی تقویٰ کی ہر منزل اور ہر مرحلہ کو آسان بنا دیتا ہے
اسی لیے قرآن عزیز میں جہاں تقویٰ کا ذکر اسی کے آس پاس اللہ تعالیٰ کی ہمدانی اور ہمرہی کے اوصاف
سمی بیان کیے گئے ہیں۔

عدل و انصاف کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ وہ انسان کے اندر تقویٰ کی صفت مطلوبہ
پیدا کرنے کے لیے ناگزیر ہے یعنی بات صرف اتنی نہیں ہے کہ عدل و انصاف تقویٰ پیدا
کرتا ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ اس کے بغیر صحیح تقویٰ پیدا ہو ہی نہیں سکتا، بلاشبہ ایسی بہت سی
جزئی ہیں جو تقویٰ کو نشوونما دیتی ہیں مگر عدل و انصاف اس سلسلے میں جو کام کرتا ہے
وہ اس کا حصہ ہے دوسرا کوئی عمل اس کا نعم البدل نہیں ہو سکتا۔ یہ حقیقت ہمیں مذکورہ
بالآیت کے الفاظ حوا قرب للتعوی کے بعد والاعتوا اللہ کے اندر سے دکھائی دیتی ہے
اس آیت کا فائدہ اگر صرف یہ بتانا ہو تا کہ عدل و انصاف کا اہل ایمان کو اس لیے حکم دیا گیا ہے کہ

ان میں تقویٰ کی صفت پیدا ہر سکے تو اس اضافہ کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ بعد اس لیے کیا گیا ہے کہ حصول تقویٰ کے واسطے میں عدالت کی ناگزیر ضرورت کا اظہار ہو جائے۔ لوگوں کو عدل و انصاف کی فضیلت اور اس کی غرض و فائیت کے ساتھ یہ بھی معلوم ہو جائے کہ تقویٰ کے مقام مطلوب تک پہنچنے کے لیے عدل و انصاف بہر حال ضروری ہے کوئی بھی دوسری چیز اس سلسلے میں وہ کام نہیں کر سکتی ہے جیسے یہ عدل و انصاف انجام دے سکتا ہے۔

عدل و انصاف بعض اقبالیات اسلام کے اصل مزاج کا سب سے بڑا شاعر ہے اور دین کا جو تصور قرآن کریم پیش کیا ہے اس کے امتیازی خدوخال عدل و انصاف کے آنیے میں سب سے زیادہ واضح شکل میں دکھائی دیتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ عدل و انصاف انسان کو صرف عمل کا متقی نہیں بناتا بلکہ گفتار اور فکر و نظر کا بھی متقی بناتا ہے وہ انسان کو صرف تقویٰ نہیں دیتا بلکہ تقویٰ کا جامع اور مانع مفہوم بھی دیتا ہے اور زبان سے دیکھاری کے ایک انقلابی تصور کا اعلان کرتا ہے۔ اسی معنی کے اعتبار سے عدل و انصاف اور روزے میں گہری مشابہت ہے قرآن روزے کے واسطے میں بھی بتاتا ہے کہ لعلکم لتتقون اس کے ذریعے تمہارے اندر تقویٰ کی صفت پیدا ہوگی اور یہی بات بلند تر پیرائے میں زور دے کر عدل و انصاف کے متعلق ذاتی ہے۔ ہوا اقرب للتعوی۔ گویا عدل و انصاف صرف تقویٰ ہی پیدا نہیں کرتا بلکہ اس کو یہ ایسی حقیقت بھی سمجھاتا ہے جو عام طور سے بہت کم سمجھی جاتی ہے کہ جو تقویٰ کا لفظ سنتے ہی نبی کریم کے اندر عموماً کچھ اس طرح کا تصور پھرنے لگتا ہے کہ انسان اپنے نفس کے مطالبات ٹھکرنے میں زیادہ سے زیادہ اگے بڑھتا جائے لیکن صواباً تقویٰ کی تعبیر کہہ رہی ہے کہ تقویٰ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو سرکش نہ ہونے اور اسے گفتار، کردار اور فکر و نظر میں آزادگی سے روک کر نبوت کے علم و عمل کا تابع بنائے اور بس۔

تقویٰ کا منشا نفس کشی نہیں ہے

عدل و انصاف اور روزہ جو تقویٰ پیدا کرتے ہیں اس کا منشا نفس کشی نہیں بلکہ ضبط نفس ہے اور ضبط نفس میں ضبط رائے اور ضبط ذوق بھی داخل ہے یعنی جس طرح اپنے نفس کو احکام الہی کے تابع رکھا جائے اسی طرح احکام الہی کی پیروی کرنے میں اپنے ذوق و رجحان اور اپنی رائے کو بھی کسی طرح کی آزادی نہ دی جائے۔ حقیقتی تقویٰ کا اصل مقام صرف اتنی بات سے حاصل

نہیں ہوتا ہے کہ نفس کو احکامِ خدا اور رسول کی مخالفت سے باز رکھا جاتے بلکہ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ان احکام کی بجا آوری اور ضلّے الٰہی کی طلب میں اپنی نلتے اپنے رحمان اور اپنے ذوق کو اس وقت بھی کچھ ہونے کا حق نہ دیا جائے جبکہ وہ بظاہر خدا پرستی کے حق میں جاتے نظر آتے ہوں۔ انسان کو خدا کی بندگی انقیاد و بارہر حالت میں ٹھیک اس طرح کرنی چاہیے جس کی اوپر سے ہدایت ملی ہو وہ عدل و انصاف میں جس طرح اپنے نفس کی اپنے اقربا کی بہی قوم کی اپنے ملک کی اپنے ممالک کی ان خواہشوں کو دیوار پر سے مارے جو اسے نبوت کے علم و عمل کی بجا آوری سے روک رہی ہوں۔ اسی طرح ان احکام کی بجا آوری کی شکلیں اور حدیں مقرر کرنے میں بھی اپنے ہی کی بات نہ سنے۔ ہر حال تقویٰ کا مشا نفس کشی نہیں بلکہ ضبط نفس ہے۔ اگر تقویٰ نفس کشی کا مطالبہ کرتا تو روزے کے بائے میں احادیث میں بھی کھانے اور اس میں تاخیر کرنے اور افطار میں جلدی کرنے کا ہرگز حکم نہ ہوتا۔ یہ احادیث ذوق سے کہہ رہی ہیں کہ جس تقویٰ کو روزے کا مقصد قرار دیا گیا ہے اس کا مشا نفس کشی نہیں بلکہ ضبط نفس ہے۔

اجتماعی ذمہ داری کو پورا کرنے کے نتائج

۴۴۔ جو لوگ ایمان لاتے اور نیک کام کیے اللہ تعالیٰ سے وعدہ ہے کہ ان کے لیے مغفرت ہوگی اور بہت بڑا اجر ہوگا لیکن جن گزروں نے ہماری آیات کا انکار کیا اور ان کی تکذیب کی تو وہ دوزخی ہیں یعنی نہ صرف یہ کہ ان کو تباہی ہوگی بلکہ ان کی جو بیعتیں تھیں وہ جاتی ہیں بلکہ عظیم الشان اجر و ثواب بھی عطا کریں گے اور جنہوں نے قرآن حکیم کے ان اوصاف و صریح حقائق کو جھٹلایا یا ان ثنائت کی تکذیب کی جو سچائی کی طرف رہنمائی کرنے والے ہیں ان کے لیے دوزخ ہے۔ یہ گویا مذکورہ بالا مشق پر عمل کرنے اور نہ کرنے کا نتیجہ بیان فرمایا ہے کہ جو لوگ اس مشق پر قائم رہیں گے ان کے لیے مغفرت اور اجر عظیم ہے اور جو اس کو توڑیں گے ان کے لیے دوزخ ہے۔ اس سے صاف طور پر دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

اول یہ کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہم پر اس مشق کی ذمہ داری ڈالی ہے اسی طرح اپنے اوپر اس کے جواب میں عمل کی ذمہ داری لی ہے اس کا اظہار وعدہ اللہ کے الفاظ سے ہو رہا ہے اللہ تعالیٰ

کی برکتی ہندہ نوازی ہے کہ اپنی ہی پیدا کی ہوئی اور اپنی ہی پروردہ مخلوق کے ساتھ ایک معاملہ میں شریک ہو اور جواب میں اپنی ذات پر بھی ایک عہد کی ذمہ داری اٹھائے انسان کو انٹر سٹارڈ نے یہ وہ شرف بخشا ہے جس میں مخلوقات میں کوئی اس کا سیم نہیں ہے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ قرآن نے امت مسلمہ کے بھی دنیوی اور اخروی فلاح کا وعدہ کیا ہے اور دنیا یہ ہے کہ اگر میناقی پر قائم ہے تو قہر کے لیے مغفرت اور اجر عظیم ہے اور وعدہ بزرگ سے ملے گی۔ مکتے کے تاریک ماحول میں بھی اور مدینے کے پراثر شب و دریں میں بھی انہیں بھی خطاب کر کے کہا گیا جو اسلام لا چکے تھے اور انہیں بھی جو اسلام نہیں لاتے تھے۔ ایمان و عمل صالح کرنے کے نتیجے میں یہ وعدے کس طرح پورے ہوتے اس سے دنیا و اوقاف نہیں ہے وہ جانتی ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کو وہ سب کچھ دیا جو دنیا میں کسی قوم کو مطلوب ہو سکتا ہے یہاں بات سمجھ لینی چاہیے کہ جس طرح سچا ایمان اور چھٹا عمل آخرت کی فلاح کے لیے ضروری ہے اسی طرح دنیا کی فلاح کے لیے بھی ضروری ہے۔ یعنی دنیوی برکتوں کے دو دروازے اس وقت کھولے جاتے ہیں جب وہ ایمان و عمل صالح کی شرط پوری کر دیں۔ دنیا میں جس نبی کی امت سے بھی فلاح دنیا کا وعدہ کیا گیا تھا وہ ایمان و عمل صالح کی شرط کے ساتھ ہی کیا گیا تھا۔ خود مسلمانوں کو جب کنز پر علیہ کی بشارت دی گئی تو انہیں اعلیٰ الصلوات کی قید کے ساتھ دی گئی۔ غرض جہاں انٹر سٹارڈ

کا ایک عمومی وعدہ ہے کہ وہ اپنے دین کے ماننے والوں کو دنیوی فلاح سے نوازتا ہے وہیں اس کا یہ ایک عمومی ضابطہ بھی ہے کہ یہ ایمان و عمل صالح کی لازمی شرط کے ساتھ مشروط ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان و عمل صالح کے بغیر صرف آخرت ہی نہیں دنیا کی فلاح بھی ہمتہ نہیں آتی۔ دین کے بغیر صحیح معنوں میں دنیا بھی جہیں مل سکتی۔ یہ ضابطہ افراد بھول یا جماعت سب کے لیے ہے کوئی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ افراد کو بھی اپنی انفرادی زندگی کی دنیوی فلاح، مثلاً امن و سکون، عزت و محبوبیت اور عز و ربات زندگی وغیرہ اسی وقت ملے گی جب اپنی حد تک ایسے خدا شناس اور آخرت پسند ہوں جیسا کہ ایک مسلمان کو ہونا چاہیے۔

اسی طرح امت کو بھی اپنی اجتماعی زندگی کی فلاح، آزادی، دولت مندی، سر بلندی، اقتدار اور بین الاقوامی احترام وغیرہ، اسی وقت میسر آ سکتا ہے جب وہ اپنی اجتماعی حیثیت میں فی الواقع امت ہو، یعنی ایک طرف تو اس کی ترکیب ایسے افراد سے ہوئی ہو جو ایمان کے سچے اور عمل صالح کے پکے ہوں۔ دوسری اس میں وہ مضبوط اجتماعی تنظیم ہو جس کے بغیر

کوئی جماعت جماعت نہیں برتی اور جس کی اشود و سکرل کی جانب سے اسے انتہائی تاکید کی گئی ہے۔

مخالفوں کی سازشوں کی پروا نہ کرو

۴۵۔ ایمان والو اپنے آپ کو اللہ کا وہ انعام یاد کرو کہ جب ایک گروہ۔ نہ پڑا پھر اڑا کر لیا کہ تم پر ہاتھ بڑھائے تو انہی نے ان کے ہاتھوں کو روک دیا تھا، اللہ کی نافرمانی سے بچو اللہ ہی پر اہل ایمان کو بھروسہ کرنا چاہیے۔ عمومی احسان یا دولت لانے کے بعد بعض خصوصی یا دولت میں۔ یعنی قریش مکہ اور ان کے پٹھوؤں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو صدمہ پہنچانے اور اسلام کو مٹانے کے لیے کسی قدر ہاتھ پاؤں ماسے، مگر حق تعالیٰ کے فضل و کرم نے ان کا کوئی داؤ نہ چلنے دیا، اس احسان عظیم کا یہ اثر ہونا چاہیے کہ مسلمان غلبہ اور اقتدار حاصل کر لینے کے باوجود اپنے دشمنوں کو ہر قسم کے ظلم اور زیادتی سے محفوظ رکھیں اور جوش انتقام میں عدل و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں یہاں تک چھلی آیات میں اس کی تاکید کی گئی ہے ممکن ہے کہ کسی کو یہ شبہ ہو کہ ایسے معاند دشمنوں کے حق میں اس قدر رواداری کی تعلیم کہیں اصول سیاست کے خلاف تو نہ ہوگی کیونکہ دینا نرم ہوتا دیکھ کر مسلمانوں کے خلاف شریروں اور بد باطنوں کی جرات بڑھ جائے گا تو یہ اندیشہ ہے۔ اس کا ازالہ اللہ تعالیٰ و علی اللہ فلیتوکل المؤمنون سے فرمایا، یعنی مومن کی سب سے بڑی سیاست تو مل علی اللہ و تعالیٰ ہے۔ خدا سے ڈرنے کا مطلب یہ ہے کہ ظاہر و باطن میں اس سے اپنا معاملہ صاف رکھو اور جو عہد و قرار کیے ہیں ان میں پوری وفاداری دکھاتے رہو پھر کبھی اللہ کسی سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔

ادھر والی رت میں اہل ایمان سے ہر حالت میں حق و عدل پر قائم رہنے اور اس کو نہانے اور اس کی شہادت لینے کا جو عہد لیا ہے اس میں یہ اشارہ موجود ہے کہ اب ہمیں مخالفوں کی مخالفت کی پروا نہیں کرنی ہے۔ اگر تم میثاق پہنچے ہو اور تمہاری وفاداریاں میثاق کے مطابق نہ تھیں تو تم سے قائم رہیں تو اللہ سبحانہ کی مدد و نصرت ہر قدم پر تمہارے ساتھ ہوگی، اور تمہارے دشمن تمہارا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے۔ یہاں اسی بات کی تائید میں واقعی شہادت پیش کی جا رہی ہے کہ دیکھ لو ایک قوم نے اس راہ میں تمہاری مزاحمت کی کوشش کی۔ اصل ارشاد

ان یسلوا الیکم ایہ یحکم سے بسطید علی کا وراثت میں پکڑنے مارنے اور حملہ کرنے کو کہتے ہیں اور وہی یہاں مراد ہیں۔ ایسا کہنے والوں یعنی حملہ آوروں کو قرآن نے قوم کہا ہے اذہم قوم یہ کہوں گے ہیں۔ اشارہ اگر اسلام کی ابتدائی تاریخ کی طرف سمجھا جائے تو سب سے بڑے دشمن قریش کہتے تھے اور اب تفسیر کا ایک گروہ اسی کی طرف مائل ہے۔ شیخ الاسلام کا بھی یہی رجحان اسی طرف سے۔ اور اگر اشارہ مابعد کی طرف ہو تو اس وقت مدینے میں سب سے زیادہ قوت مخالفین میں یہود کی تھی۔ شامیین قرآن کی ایک جماعت کا یہاں اسی طرف سے۔ بہر حال کچھ ہر قریش ہوں یا یہودی، افراد ہوں یا فرد جتنا ہے۔ یہ کہ کلف ایہ کہیم کہ اللہ نے ان کے ہاتھ باندھ دیے۔ مطلب یہ ہے کہ دشمنوں نے حملہ کر کے تمہارا قطع کرنا چاہا تھا لیکن اللہ نے ان کے حملوں کو ناکام رکھا اور ان کے منصوبے خاک میں ملا دیے۔ اسی طرح اگر تم اپنے رب کے عہد و پیمان اور میثاق پر قائم رہو اور میثاق کے مطابق تمہاری وفاداریاں اسلام سے رہیں تو اللہ سبحانہ ہر اس قوم کے مقابلے میں تمہاری مدد فرمائے گا جو تمہارے مقابلے میں سر اٹھائے گی۔ ضرورت میں اس بات کی ہے کہ تم اپنے اندر تقویٰ کی روح پیدا کرو۔ غلبہ و کامیابی کی مسرت کو یاد دلا کر یہاں تقویٰ کی تلقین سے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ غلبہ و کامیابی میں تقویٰ کو بڑا دخل ہے۔ قناعت، بے طمع، بے نفسی، بندہ، رومی، صداقت، شجاعت، ایثار، ضبط و حدود، فرض سیرت و ذکر اور کی ساری انفرادی و اجتماعی خوبیاں اس ایک غلط تقویٰ میں سمٹی ہوئی ہے۔

آخر میں ارشاد ہوا ہے علی اللہ فلیست کل المؤمنون اہل ایمان کو صرف اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے ہٹے دست و بازو اور اپنی ہمت و تدبیر پر اعتماد نہ ہو۔ اس موقع پر توکل کی تعلیم اس لیے دی گئی ہے کہ کامیابی و کامرانی کے بعد بڑا گھمنہ اپنی قوت و بازو اور اپنی عقل و فرائیگی پر ہوتا ہے قرآن حکیم انسان کو پست و بستی اور غفلت کی تعلیم نہیں دیتا اسے برابر ہر گز عمل رکھنا چاہتا ہے لیکن ساتھ ہی اس کا بھی روادار نہیں ہے کہ انسان خود پسندی اور خود ہستی کی بیماری کا شکار ہو جائے اس لیے وہ بار بار اس کی تعلیم دیتا ہے کہ نظر اسباب سے ہٹ کر سبب الاسباب پر دھنی چاہیے۔ اسی نے پہلے بھی گھڑے ہوتے کالم بناتے تھے اور اب مجھ وہ ہی بناتے گا۔ توکل نام ہے کسی کام کو پورے ارادے، عزم اور تدبیر کے ساتھ انجام دینے اور اس کے نتائج کیلئے اپنی کوشش و محنت پر نہیں بلکہ اللہ پر بھروسہ کرنے کا۔ اگر تدبیر اور کوشش نہ کرنے کا نام توکل ہو تو قرآن میں تلاش رزق کا حکم نہ ہو اور جنگ کی خاطر سامان جنگ فراہم کرنا اور استطاعت کے مطابق تیاری کرنے کی ہدایت نہ ہوتی۔ اس موضوع پر حافظ ابن تیمیہ نے عجیب و غریب بحث فرمائی ہے

دعا توکل میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اپنے معاملات میں اگر انشہ پر توکل ہو گا تو اللہ سے ملے گا۔ عالم شہادت میں اسباب کی پابجائی اور عالم غیب میں اللہ پر جبر و سدا و اعتماد اور اس کے سامنے گریز و زک کرنا قرآن کی تعلیم ہے۔ ان دونوں میں یعنی عالم غیب میں دعا و توکل اور عالم شہادت میں اسباب کی پابجائی اور تدبیرِ حق نے ہم اہلِ ہنگی پیدا فرمائی ہے نہ تو اسباب سے چٹ کر مادی ہو کر کچھ کی بات کی ہے اور نہ اسباب سے بیگا زور کر کے دنیا بنایا ہے۔ اسلام کا راستہ دونوں میں مضامیت کا ہے اور مضامیت زندگی کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ غزوہ مبدان دونوں میں ہم اہلِ ہنگی کی بہترین مثال ہے ایک منجناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کے منوابط اختیار کر کے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا عالم شہادت میں اسباب کی حد تک میدانِ جنگ میں بہترین جگہ کا انتخاب، فوج کی صف بندی، صفوں کی ترتیب، اسلحہ کے استعمال کی ترکیب، تیرکب چلاتے جا میں، تلواریں نکال جاتے پھرو اور ڈھیلیوں سے غیر پر کس وقت حملہ کیا جاتے۔ یہ عالم شہادت میں اسباب کی پابجائی ہے دوسری طرف عالم غیب میں اللہ پر توکل و اعتماد کا عالم یہ تھا کہ دعا میں اس قدر انہماک تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :

میں بدر کے روز ایک لڑائی لڑا، پھر آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سجدے میں گرے سجدے یا حی یا قیوم فرماتے ہیں، میں واپس میدانِ

جنگ میں اور لڑا، پھر گیا تو میں نے حضور کو سجدے ہی میں پایا۔ (فتح الباری)

بہر حال مادی زندگی میں کامیابی کے لیے دونوں تدبیریں ہیں ایک اسباب کے تحت عقلی تدبیر اور دوسرے اسباب پر قابو پاتے ہوئے روحانی تدبیر اور روحانی تدبیر ہی کا نام توکل ہے یعنی پیدائش کی راہوں اور اپنی طاقتوں پر نہیں بلکہ خود پیدا کرنے والے اور اسباب کے خالق پر اعتماد کیا جائے اور اس سے گھٹنا اس پر توکل کے منافی نہیں بلکہ اس کا تقاضا ہے۔ توکل بھی اسباب میں سے جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت کا ایک سبب ہے۔ جمہور علماء کے خیال کے مطابق توکل سے دو کچھ ملتا ہے جو دوسرے اسباب کی پابجائی سے نہیں ملتا۔ اللہ سبحانہ کا ارشاد ہے من یشوکل علی اللہ فهو حسبہ جو بھی اللہ پر توکل کرتا ہے اللہ اس کو کافی ہے۔

وَلَقَدْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَءِيلَ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيبًا وَقَالَ اللَّهُ إِنِّي مَعَكُمْ لَئِنْ أَقَمْتُمُ الصَّلَاةَ وَآتَيْتُمُ الزَّكَاةَ وَآمَنْتُمْ بِرُسُلِي وَعَزَّرْتُمْ هُوهُمْ وَأَقْرَضْتُمُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَلَأُدْخِلَنَّكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ ۝

اور بلاشبہ یقیناً اللہ نے بنی اسرائیل سے بھی عہدِ اطاعت لیا تھا۔ اور ان میں بارہ سردار مقرر کیے تھے۔ اللہ نے فرمایا تھا دیکھو میں تمہارے ساتھ ہوں۔ بشرطیکہ تم نے نماز کو قائم رکھا اور زکوٰۃ کی ادائیگی کی اور میرے رسولوں پر ایمان لائے، اور ان کی مدد کی، اور اللہ کو قرضِ حسنہ دیتے رہے، میں ضرور تم سے تمہاری برائیاں دُور کر دوں گا اور تمہیں ضرور باغات میں داخل کر دوں گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی

پھر اس کے بعد تم میں سے جو بھی راہ کفر اپنائے گا وہ بلاشبہ شاہرہ مستقیم سے ہٹ جائے گا۔^{۵۰}

سعادت و شقاوت کا معیار

یہاں سے سلسلہ بیان بنی اسرائیل کے واقعات کی طرف متوجہ ہو گیا ہے تاکہ ان کے حالات سے اہل ایمان عبرت پکڑیں یعنی یہود و نصاریٰ سے جو حمد ایمان و طاعت لیا گیا تھا اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور یہاں اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس دوش پر چلنے سے روکا جائے جس پر ان کے پیش رو اہل کتاب چلتے رہے تھے چنانچہ انہیں بتایا جا رہا ہے کہ جس طرح آج تم سے حمد لیا گیا ہے اسی طرح کل یہی عہد بنی اسرائیل اور حضرت عیسیٰ کی امت سے بھی لیا جا چکا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جس طرح وہ اپنے عہد کو توڑ کر گزریوں میں مبتلا ہو گئے تھے اسی طرح تم بھی مبتلا ہو جاؤ۔ بتا دیا یہاں کہ ان آیات کا اساسی اور بنیادی مقصد مسلمانوں کو متنبہ کرنا ہے کہ اب تم سے جو بہ لیا جا رہا ہے یہ بھی اسی نوعیت کا ہے۔ اگر تم نے بھی اس عہد کے ساتھ وہی معاملہ کیا جو یہود و نصاریٰ نے کیا تو تمہارے سامنے بھی وہی نتیجہ آئے گا جو ان کے سامنے آیا، انہوں نے اطاعت کی جگہ شقاوت کی راہ اختیار کی ایسا نہ ہو کہ تم بھی ایمان و عمل کا عہد فراموش کر بیٹھو، پہلے یہود کا ذکر کیا ہے اس کے بعد نصاریٰ کا، اور اس داستان کو بیان کر کے اجمالاً یہ بتا دیا کہ پیش نظر ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ان دونوں کی جانب سے اللہ کا رسول نہ ماننے کے بعد عالت ہے اور یہ بھی مقصد ہے کہ یہود و نصاریٰ کو ان کی غلطیوں پر متنبہ کیا جائے اور انہیں دین حق کی طرف دعوت دی جائے۔

۴۶۔ اور اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد طاعت لیا تھا۔ یعنی کچھ امت محمدیہ ہی کی خصوصیت نہیں ہے پہلی امتوں سے عہد لیے جا چکے ہیں بلکہ یہ بنی اسرائیل کی تاریخ سے شہادت پیش کی گئی ہے کہ دیکھو اس عہد قوم نے جب نافرمانی کی کیسے دبا ل میں مبتلا ہوئی۔ بتا دیا ہے کہ جیسے کائنات کا

عام قانون یہ ہے کہ ہر حالت کوئی نہ کوئی اثر رکھتی ہے اور ہر چیز کا کوئی نہ کوئی خاصہ ہے لیکن جنہیں کربیاں کوئی چیز اپنا وجود رکھتی ہو اور آثار و نتائج کی گرفت سے بالا ہو جیسے اللہ سبحانہ نے اجسام میں خواص و نتائج رکھے ہوں، اسی طرح اعمال میں بھی خواص و نتائج ہیں اور جیسے جسم انسانی کے قدرتی انفعالات ہیں، اسی طرح رعب انسانی کے لیے بھی انفعالات ہیں۔ جسمانی مؤثرات جسم پر مرتب ہوتے ہیں اور معنوی مؤثرات سے رعب انسانی متاثر ہوتی ہے۔ اعمال کے یہی قدرتی خواص و نتائج ہیں جنہیں سعادت و شقاوت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اچھے اعمال کا نتیجہ سعادت ہے اور بُرے اعمال کا نتیجہ شقاوت ہے۔ سعادت و شقاوت کے اس نقشہ میں نسب اور نسبتیں بے کار ہیں پچھلی آیت میں صحابہ کرام کو مخاطب کر کے کہا کہ اللہ نے تم سے ایمان و طاعت کا جو عہد لیا ہے اسے یاد کرو۔ دین کامل ظہور میں آچکا ہے اب تمہارا فرض ہے کہ ذکرِ نعمت سے غافل نہ ہو اور طاعت حق میں اخلاص و استقامت کا مظاہرہ کرو۔ اس سلسلے میں بنی اسرائیل سے عبرت پکڑو اللہ نے ان سے ایمان و طاعت کا عہد لیا تھا لیکن انہوں نے عہدِ وحی و شقاوت کی راہ اختیار کی۔ سعادت و شقاوت کو ایمان و سب کے لیے ایک ہے۔

بنی اسرائیل کا سیاسی نظام

۴۶ - اور ہم نے ان میں بارہ سردار مقرر کیے۔ بنی اسرائیل کے بارہ قبائل میں سے بارہ سردار حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جن لیے تھے جن کے نام مفسرین نے قہات سے نقل کیے ہیں۔ ان کا فرض یہ تھا کہ وہ اپنی قوم پر عہد پورا کرنے کی تاکید اور ان کے احوال کی نگرانی رکھیں۔ محبوب اتفاق یہ ہے کہ ہجرت قبل جب انصار نے یلۃ العقبہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی تو ان میں سے بھی بارہ ہی نقیب نامزد ہوئے۔ ان ہی بارہ آدمیوں نے اپنی قوم کی طرف سے حضور کے دست مبارک پر بیعت کی تھی۔ جابر بن سمرة کی مدشا میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امت کے متعلق جو بارہ غلامان کی پیشین گوئی فرمائی تھی ان کا عدد بھی عقبائے بنی اسرائیل کے مطابق ہے اور مفسرین نے تورات سے نقل کیا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام سے حق تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تیری ذریت سے بارہ سردار پیدا کروں گا، غالباً یہ وہی بارہ ہیں جن کا ذکر حضرت جابر بن سمرة کی حدیث میں ہے۔ یہ نقیب کے معنی کھوج لگانے والا، معاملات کی ٹوہ میں پھنسنے والا ہے۔ نقیب عن نشی

سے بنا ہے اس کے نفع کھوج لگانے کے ہیں۔ اصل میں دیوار کی پٹھن کو کہتے ہیں۔ کلڑی میں سردار کو بھی نقب کہتے ہیں۔ یہ ہیں سے یہ قوم اور قبیلہ کے سردار، زعم، نگران، ذوقدار کے معنے میں بولا جانے لگا ہے۔ کیونکہ سردار زعم کا اصلی کام لوگوں کے حالات کی نگرانی اور ان کی محافظت ہی ہوتا ہے۔ بنی اسرائیل کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے خربت کی پابندی اور اس کی حفاظت لینے کے بعد بنی اسرائیل کے ہر قبیلہ پر ایک ایک نقیب اس مقصد کی خاطر مقرر کیا کہ وہ لوگوں کی نگرانی کریں کہ قانونِ الہی کی حدود و قیود کی پابندی کرتے ہیں یا نہیں اور ان میں کوئی چیز ایسی داخل نہ ہونے پائے جو ان کے اندر سے رد گرداں کرے۔ بنی اسرائیل چونکہ بارہ قبیلے تھے اس لیے نقیب بھی بارہ مقرر ہوئے۔ ان کا تعلق حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق کیا تھا۔ ۱۲ سرداروں کا یہ قرآنی عدد تورات کے بیان کے بالکل مطابق ہے۔ تورات میں ہے کہ مصر سے نکلنے کے دو مرتبے برس خدا نے موسیٰ کو کتاب کر کے فرمایا:

”بنی اسرائیل کی ساری جماعت کا ان کے فرقوں کے مطابق اور ان کے آبائی خاندانوں کے اہم شامی کے ساتھ ہر ایک مرد سے سرگن کر حساب کر۔۔۔ اور ہر فرقہ سے ایک ایک آدمی پر ایک جو اپنے آبائی خاندان کا سردار ہے تہلے ساتھ ہو۔“ (گنتی)

اس کے بعد ان سرداروں کے نام درج ہیں اور تعداد میں بارہ ہیں، اسی طرح تورات میں دوسری جگہ کنعان پر فوج کشی سے ذرا پہلے کے موقع پر ہے۔

خداوند نے موسیٰ کو خطاب کر کے فرمایا کہ تو لوگوں کو بھیج تاکہ کنعان کی زمین جو میں بنی اسرائیل کو دیتا ہوں جا سوسی کریں، ایک ایک مرد اس کے آبائی فرقہ میں سے جو اس میں سردار ہے بھیج دے چنانچہ موسیٰ نے خداوند کے ارشاد کے مطابق دشتِ فاران میں ان کو بھیج دیا وہ سب لوگ سردار تھے۔

یہاں بھی سرداروں کی تعداد ۱۲ درج ہے۔

اگرچہ تورات میں بارہ سرداروں کا ذکر موجود ہے مگر ان کی حیثیت جو یہاں قرآن نے لفظ نقیب استعمال کر کے بتائی ہے تورات کے بیان سے ظاہر نہیں ہوتی، تورات ان کو صرف رئیسوں اور سرداروں کی حیثیت سے پیش کرتی ہے اور قرآن ان کی حیثیت سیاسی و اخلاقی نگرانِ کار کی مقرر کرتا ہے۔

یہاں علامہ رباعی تفسیر میں بنی اسرائیل کے نقباء کے نام بتا کر لکھا ہے کہ حضرت مسیح کے نقباء

تعداد بھی بارہ ہے جن کو تورات میں کہتے ہیں اور انصار میں سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے نقباء کی تعداد بھی بارہ ہے جنہوں نے لیلۃ القدر میں حضور کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ بارہ نقیب و قبیلہ خزرج اور ۳۱۰ میں سے تھے۔ تورات میں بنی اسرائیل کے نقباء کی روانگی دوم تہہ بتائی گئی ہے۔ پہلی بار جب حضرت موسیٰ سرزمین سینا میں تھے اس کی تفصیل تورات میں فعل اول میں ہے اور دوسری روانگی ان بارہ نقیبوں کی کنعان میں جاسوسی کے لیے ہے اس کی تفصیل تورات میں ۳۱ فصل میں ہے۔ اسرائیلی نقباء میں سے یوشع بن نون اور کالب بن فتنہ کے علاوہ کسی نے حضرت موسیٰ سے وفاداری نہیں کی، جب کہ یہاں نقباء میں سے صرف یہودا نامی نے حضرت جیسی سے بے وفائی کی۔ لیکن حضور انور نے جن بارہ انصار کو یہ کہہ کر نقیب بنایا تھا اخراج الیٰ مسکد اشفا عشرہ نقبیا ان میں سے ہر ایک نے جبریل خدا کی توفیق سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے وفاداری کی اور آج تک تاریخ ان کے کارناموں کے گیت گار ہی ہے۔

النکاح و معیت اور اس کا مقام

۴۸۔ اور اللہ نے فرمایا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ یا تو یہ خطاب بارہ سرداروں کو ہے یعنی تم اپنا فرض ادا کرو، میری حمایت اور امداد تمہارے ساتھ ہے یا سب بنی اسرائیل کو کہ میں تمہارے ساتھ ہوں یعنی کسی وقت تم مجھے اپنے سے ڈرو نہ سمجھو جو کچھ بھی معاملہ تم سر یا علاقہ کر دے وہ ہر جگہ اور ہر وقت میں دیکھ رہا ہوں اور سن رہا ہوں۔ اس لیے جو کچھ کہو خبردار ہو کہ کہہ دے یہ ایک جامع تعبیر ہے اللہ کی تائید و نصرت کے وعدے کی۔ اس میں دو باتوں کی طرف اشارہ ہے ایک یہ کہ اگر تم میثاق پر قائم رہے تو میری امداد تمہارے ساتھ ہے گی اور تم ہر قدم پر اس کا مشاہدہ کرو گے۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ ہر وقت اور ہر جگہ تمہارے ساتھ ہے اور اس میثاق کی نگرانی فرما رہا ہے۔ تمہارا کوئی غم دارا وہ اور فکر خیال یا سرک و عمل اس کے علم سے باہر نہیں ہے۔ وہ تمہاری غلطیوں کے رازوں کو بھی دیکھتا اور سناتا ہے وہ تمہارے دلوں کے ارادوں اور نیتوں سے بھی واقف ہے۔

میت الہی کا تصور ایک مومن کے لیے کس قدر ہمت آفرین و شوق افزا ہے۔ اس تصور کے بعد دل میں کس قدر قوت آتی ہے اور اطمینان کی کیسی نعمت ملتی ہے۔ اس کے بعد شکست کا کوئی

امکان بھی اس کے بعد ذہن کے سامنے نہیں آسکتا۔ آج محض وزیراعظم اگر شہریوں کے ایک معمولی فرد سے کہہ دے کہ گھبراہٹ ہم تمہارے ساتھ رہیں گے تو اسے کس قدر قوت و استقامت حاصل ہو جائے، چر جائے کہ یہاں خالق کائنات مالک الملک، حاکم علی الاطلاق اپنی سمیت کا یقین دلا رہا ہے۔ لیکن وہ اطمینان کا درجہ اس کے بعد کیا ہو سکتا ہے۔ یہ ایک پہلو ہے، اب دوسرے پہلو سے دیکھئے۔ کوئی گناہ اس استحضار سمیت الہی کے بعد بندہ سے ممکن ہے! جہاں کوئی اپنے سے ذرا بڑا اگر نگرانی کے لیے پاس موجود رہتا ہے جب تو اس کی مروت، لحاظ یا دباؤ سے ہم اپنے اوپر قابو رکھتے ہیں اور کوئی نغز یا معصیت سرزد نہیں ہونے دیتے چر جائے کہ ہم میں، ہمدان، ہمدردان، مالک و مولیٰ کی سمیت کا استحضار سوچئے کیا کوئی معصیت اس کے بعد ہو سکتی ہے۔ غرض ترغیب و ترہیب کے جس گوشے سے بھی غور کیا جائے سمیت الہی کا راقبہ بہترین اور موثر ترین ہے۔ محققین نے یہاں یہ بات کھول کر دکھا دی ہے کہ خدا کی سمیت سے یہاں معاذ اللہ سمیت جسمانی نہیں جیسی مخلوق و مخلوق کے درمیان ہوتی ہے بلکہ اعطایہ علم، قدرت، مومنہ و نصرت کے لحاظ سے ہے رازی نے لکھا ہے۔

میں علم قدرت کے لحاظ سے تمہارے ساتھ ہوں تمہاری آواز کو اور تمہارے کردار کو دیکھ رہا ہوں، تمہارے دلوں کی گہرائیوں کو جانتا ہوں اور تمہارے اعمال پر بدلہ دینے پر پوری پوری قدرت رکھتا ہوں۔

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں :

میری سمیت میری حفاظت میری نگرانی اور میری نصرت کے ذریعے ہے۔

فقہ جمال الدین قاسمی لکھتے ہیں کہ اللہ کی سمیت علم قدرت اور نصرت کے ذریعے ہوتی ہے اور سید رشید رضا فرماتے ہیں :

میں مومنہ و نصرت کے ذریعے تمہارے ساتھ ہوں گا جب تک تم میثاق کے نگران بن کر رہو گے۔

بہر حال خدا کی سمیت اور اس کے ساتھ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اپنے علم و قدرت اپنی نصرت اور مدد کے ذریعے بندوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

میثاق کی دفعات میں اولین نماز

۴۹۔ بشرطیکہ تم نے نماز کو قائم رکھا اور زکوٰۃ کی ادائیگی کی اور میرے رسولوں پر ایمان لائے۔

یہ مشاق کہ دفعت کی تفصیل ہے۔ ان دفعت میں سب سے پہلی دفعہ اقامتِ صلاۃ ہے جس طرح اُمتِ مسلمہ کے میثاق میں بنیادی دفعہ اقامتِ صلاۃ ہے اسی طرح بنی اسرائیل کے میثاق میں بھی اس کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ حکمتِ دین کے پہلو سے دین میں اس کا جو مقام ہے وہ کسی بھی دوسرے عمل کا نہیں ہے۔ مومن کا ہر کام اللہ کی بندگی کا کام ہوتا ہے مگر نماز جیسی بندگی کی شان کسی کام میں نہیں ہوتی۔ اس کا بلن یہ نہیں ظاہر بھی سہا پہا بندگی ہوتا ہے۔ نماز کی ہیئتوں کو دیکھتے ہیں اور اس کی دعاؤں، تسبیحوں اور قراتوں پر غور کیجئے۔ عاجزی اور سرفکندگی کے اظہار کی کوئی ممکن صورت نہیں جو نماز کے ظاہر اور اس کے باطن میں موجود نہ ہو۔ یہ سینے پر ماتہ باندھے اور آنکھیں جھکائے ادب سے کھڑا ہونا، یہ کر کا خم کرنا، یہ زہن پر چٹائی کا ڈال دینا، یہ زبان پر اللہ کی حمد کے، تسبیح کے، تحمید کے کلمات کا مسلسل جاری رہنا اور یہ دل کا اللہ کی نصیحت اور عظمت اور محبت سے معمور رہنا۔ آخر بندگی کی کون سی ادا ہے جس سے یہ نماز خالی ہے۔ قرآن و سنت کا مطالعہ فرمائیے تو نماز کی ہیئتوں اور فضیلتوں سے ان کے صفحات بھرے نظر آئیں گے۔ نماز ہی ایمان کا سب سے پہلا مظہر ہے۔ اگر انسان میں ایمان موجود ہو اور اللہ کی عبودیت اور اپنی عبودیت پر اسے یقین ہو تو یہ یقین سب سے پہلے نماز کی شکل اختیار کرتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ نماز ایمان کا سب سے پہلا مظہر ہے بلکہ وہ ایمان کا لازمی مظہر ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ دل میں ایمان ہو مگر سر میں رکوع اور سجدے کی ٹرپ نہ ہو۔ ایمان دل کی ایک کیفیت کا نام ہے۔ یہی کیفیت ہے جو خارج میں نماز کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس لیے جہاں ایمان ہو وہاں نماز ضرور ہوگی۔ ٹھیک اسی طرح کہ جہاں سودج نکلا ہو وہاں روشنی اور گرمی ضرور ہوتی ہے۔ میثاق میں اسے وہ اڈا لاکر پیش کرنا اس بات کی غمازی کر رہا ہے کہ نماز پوری شریعت اور پورے قانون کے جذبہ اتباع کا سرچشمہ بھی ہے اور اس کی محافظ بھی۔ وہ اگر ادا ہوگی تو شریعت کے باقی احکام بھی ادا ہو سکیں گے اور اگر اس کا حق ادا نہ ہو تو باقی شریعت بھی غفلت کی نذر ہو جانے سے بچنے سے گی۔ یوں سمجھئے کہ شریعت کے سارے احکام کے اندر نماز کی حیثیت وہی ہے جو انسانی جسم میں دل کی ہوتی ہے۔ دل میں اگر حرکت اور گرمی اور زندگی موجود ہو تو جسم کے دوسرے تمام حصوں تک بھی خون کی روانی قائم رہتی ہے اور وہ زندہ رہتے ہیں لیکن جس وقت یہ دل اپنی حرکت اور زندگی کھو دیتا ہے اس وقت دوسرے اعضا بھی سرد اور بے جان ہو کر رہ جاتے ہیں۔ نماز کی اس حیثیت کے بارے میں قرآن نے کئی جگہ اشارے کیے ہیں۔

میثاق کی دوسری دفعہ زکوٰۃ

میثاق کی دوسری دفعہ یہ ہے کہ اگر تم نے زکوٰۃ کی ایک لگی۔ قرآن میں دوسرے مقامات پر بھی

اور اس آیت میں بھی زکوٰۃ کا مقام نماز کے مقام سے ایک ہی درجہ نیچے دکھایا گیا ہے۔ قرآن کا مندرجہ تو آپ کو معلوم ہو گا کہ قرآن میں بکثرت مقامات پر ایمان کے بعد صرف دو اعمال مبالغہ کا ذکر آیا ہے ایک نماز کا دوسرے زکوٰۃ کا۔ جب ایک میاری مومن کا تصور سامنے لانا ہوتا ہے تو وہ عموماً ظلم کے انفاذ فرماتا ہے۔

ان الذين آمنوا وعملوا الصالحات واقاموا الصلوة واؤتوا الزکوٰۃ

حالانکہ نماز اور زکوٰۃ کے ساتھ ساتھ ایسے بہت سے اچھے اعمال اور اخلاق اور بھی ہیں جن کا وجود میاری مومن بننے کے لیے ضروری ہے۔ پھر قرآن حکیم ایسا انداز بیان کیوں اختیار فرمایا ہے اور میاری مومن کو تسلیم کا تصور دینے کے لیے اکثر ایمان کے بعد صرف نماز اور زکوٰۃ ہی کے نام لے کر خاموش کیوں ہو جاتا ہے، دوسری نیکیوں کا بھی ذکر نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ گشتِ گویا نماز اس نے بلاوجہ اختیار نہیں کیا ہے۔ غور کیجئے تو اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں نماز اور زکوٰۃ ہی دو عمل دین کی اصلی بنیادیں ہیں جس نے دونوں فرائض کو اچھی طرح ادریا اس نے گویا پوسے دین پر عمل کرنے کی پختی ضمانت اور عملی شہادت فراہم کر دی اور اب اس سے اس بات کا واقعی کوئی اندیشہ باقی نہیں رہا کہ دوسرے احکام شریعت سے بے نیازی کا برتاؤ کر جائے گا۔ ایسا بے بنیاد ہے، اس بات کا جواب آپ کو ایک طرف دین کی اور دوسری طرف نماز اور زکوٰۃ کی حیثیتوں کا موازنہ پر نظر ڈالتے ہی مل جائے گا۔ احکام دین کی اصولی تقسیم کیجئے تو ان کی دو ہی قسمیں ہو سکیں گی۔ سب قسم ان احکام کی ہو گی جن کا تعلق اللہ کے حقوق سے ہے۔ دوسری قسم ان احکام کی ہو گی جن کا تعلق بندوں کے حقوق سے ہے۔ اس طرح دین کی پیروی دو اصل اس بات کا نام ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے حقوق اور اس کے بندوں کے حقوق دونوں سے عہدہ برا ہو جائے۔ نماز کی اور زکوٰۃ کی حیثیت قرآن و سنت میں بیان ہو چکی ہے ان دونوں سے صاف عیاں ہے کہ نماز حقوق اللہ اور زکوٰۃ حقوق العباد کا مغز اور جوہر ہے۔ اگر ایک شخص نے مسجد میں نماز کا حق ادا کر دیا تو ممکن نہیں وہی مسجد سے باہر شر کے حقوق بھول جائے گا۔ اس سے تو یہ حقوق اسی طرح ادا ہوتے رہیں گے جس طرح چنے سے پالی ابنا رہتا ہے، اسی طرح جس نے زکوٰۃ کا حق ادا کر دیا اس سے یہ ممکن نہیں کہ وہ بندگانِ خدا کے حقوق بامال کرتا ہے گا۔ جو شخص اپنے بھائیوں اور پردیسیوں پر اپنی گاڑی کا حق خود اپنی خوشی سے صرف کرے گا اور صرف ان کو اپنا احسان مند بنانے کے بہانے اٹھائے گا انہی کا شکر گزار ہو گا وہ تو ان کا ایک ایک حق ادا کر کے چین پاسکے گا۔

میشاق کی تیسری دفعہ ایمان بالرسول

یہ میشاق کی تیسری دفعہ ہے کہ اللہ کے رسولوں پر ایمان لانا ہے۔ یعنی ان رسولوں پر ایمان لانا ہے جن کو میں موسیٰ علیہ السلام کے بعد روانہ کروں گا جیسے داؤد، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم، ایمان والی دفعہ کو نماز اور زکوٰۃ کے بعد ذکر کرنے کی وجہ یہی ہے کہ ان سے آنے والے پیغمبروں کے بارے میں ایمان لانے کا حمد لیا گیا تھا اور اس وقت لیا گیا تھا جبکہ وہ حضرت موسیٰ پر ایمان لایا چکے تھے یوں تو حضرت موسیٰ کے بعد آنے والے تمام انبیاء کی طرف اشارہ ہے لیکن اس میں اشارہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے جن کا ذکر تورات میں نمایاں علامات کے ساتھ ہوا ہے۔ بالخصوص اس میشاق میں یہ بات تورات میں واضح اور صاف الفاظ میں بتاتی ہے اور یہ حضرت موسیٰ پر آنے والی آخری وحی ہے۔

یہ وہ برکت ہے جو موسیٰ مرد خدا نے اپنے مرنے سے پہلے بنی اسرائیل کو بخشی اور اس نے کہا کہ خداوند سینا سے آیا اور سب سے ان پر طلوع ہوا اور فانیان کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا اور اس کے دلہنے یا تہ میں ایک آتشیں خریبت ہو گی۔ (استشمام ۲۰) اس کی مزید تفصیل انشا اللہ سورہ اعراف جلد نہم میں آئے گی۔

اللہ کے رسولوں کی مدد

۵۰۔ میشاق کی چوتھی دفعہ یہ ہے کہ تم اللہ کے رسولوں کی مدد کرنا۔ اصل ارشاد میں عنایت تو ہم کے الفاظ آئے ہیں۔ تعزیر اس مدد کو کہتے ہیں جس میں تعظیم کی آمیزش ہو۔ خدا کے سوا قانون میں دوسری سزاؤں کو بھی تعزیر کہتے ہیں کیونکہ یہ تادیب ہے اور تادیب بھی ایک قسم کی مدد ہے کیونکہ ان کے ذریعے انسان کو نقصان رسائی سے بچایا جاتا ہے۔ اسی لیے ایک ارشاد میں ظالم کو ظلم سے روک دینے کے لیے نصرت کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ ارشاد ہے انصاف اخلاص ظالما و مظلوما اپنے بھائی کی مدد کرو ظالم ہو یا مظلوم۔ دریافت کیا گیا کہ مظلوم کی مدد کریں مگر ظالم کی مدد کیا ہے؟ فرمایا کہ اس کے ظلم سے اس کو باز رکھو۔ یہاں رسولوں کی تعزیر کا ماحرین قرآن نے مطلب یہ بتایا ہے کہ دشمنوں کے مقابلہ میں ان کی مدد کرو (قرطبی) ان سے ان کے دشمنوں کو ہٹاؤ۔ (امدادک) مطلب یہ ہے کہ نبوت جو دعوت لے کر آئے اور جو مشن پیش کرے اس کام میں اس کا ہاتھ نہ لگاؤ۔

اس سے تعاون کرو، اس کی راہ سے رکاوٹوں کو دور کرو۔ اگر اس کا دشمنوں سے مقابلہ ہو تو اس کی مدد کرو۔ رسولوں پر ایمان کی دفعہ سے اس تعزیر یعنی رسولوں کی مدد کرنے کا اتنا گہرا تعلق ہے کہ اسے ایمان کی موت و حیات کا پیمانہ بنا دیا گیا ہے۔ ایسے ایمان کی کوئی قیمت نہیں ہے جس میں رسولوں کی مدد کرنے کا کوئی ہندم اور کوئی تقاضا نہ ہو۔ شیخ الاسلام فرماتے ہیں کہ جو رسول حضرت موسیٰ کے بعد آئیں گے ان سب کی تصدیق کرو گے اور دلی تعظیم سے پیش آؤ گے اور دشمنانِ حق کے مقابلہ پر ان کا ساتھ دو گے۔

اللہ کو قرض حسن

۵۱۔ میثاق کی پانچویں دفعہ یہ ہے کہ اللہ کو قرض حسنہ دینا۔ پچھلے زکوٰۃ کا ذکر کیا، اب یہاں قرض حسنہ کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ خالص قرآن کی اصطلاح ہے۔ اس سے مراد وہ رقم ہے جو دین کی برتری کے لیے خرچ کی جائے۔ زکوٰۃ کا ادا کرنا ہر ایک کے لیے اخلاقی نہیں بلکہ قانونی طور پر ضروری ہے۔ اس دفعہ کا مقصد ہے کہ دین کی برتری اور رفاد عام کے سارے اجتماعی کاموں کے لیے انفرادی ذمہ داری کے ساتھ اجتماعی ذمہ داری یہ ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی مالی ذمہ داریاں ہیں جن سے وقت کے ملی تعاون اور مطالبات کو پورا کیا جاتے، فرق اتنا ہے کہ زکوٰۃ ایک قانونی ذمہ داری ہے اور قرض حسنہ اسی مالی ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے اور اگے بڑھنے کی رضا کارانہ کوشش ہے تاکہ جماعتی مقاصد کے پورا ہونے کی زیادہ سے زیادہ توقع ہو سکے۔ اگے بڑھنے کی اس کوشش کو اگرچہ لوگوں کی اپنی مرضی پر رکھا گیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہاں ان کی مرضی ہی سب کچھ ہے اور اب اسے قانون کسی حال میں بھی اپنا پابند نہیں بنا سکتا۔ قانون اب بھی مطالعہ کر سکتا ہے۔ ایت میں اسی طرف رہنمائی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مال کی حتمی زکوٰۃ ادا کر لینے کے بعد بھی ایک مسلمان دین کے مالی مطالبات سے سبکدوش نہیں ہو جاتا اور اب بھی اس کی دولت میں حق باقی رہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر لوگوں کے اخلاقی احساسات معاشرے کی جھوک اور ناداروں پر قابو نہ پائے ہوں یا دین کی حفاظت اور نصرت کا فرض ادا کرنے سے قاصر ہوں تو ایسی حالت میں قرض حسنہ یقیناً اخلاقی سے قانونی بن جائے گا اور اس دفعہ کی مدد سے اسلامی حکومت اس بات کی مجاز ہوگی بلکہ شاید یہ ذمہ داری بھی اس کی ہوگی کہ وہ غریب و نادار شہریوں کی ضرورتوں اور دین کے مفاد کی خاطر مال داروں پر بڑی بار ڈالے۔

فقہاء کی اصطلاحی زبان میں جس چیز کو فرض عین اور فرض کنایہ کہا جاتا ہے اسی کو ہم نے قاضی اور اخلاقی ذمہ داری سے تعبیر کیا ہے۔ زکوٰۃ ان کے یہاں فرض عین ہے تو من ضمن فرض کنایہ۔ فرض کنایہ کے معنی یہ ہیں کہ امانت کے پُختہ افراد یا جماعت کے ان مطالبات کو پورا کر دیا تو سب مسلمان فرض سے سبکدوش ہو گئے اور اگر کسی نے بھی نہ کیا تو سب گنہگار ہوں گے۔ شیخ الاسلام فرماتے ہیں:

خدا کو فرض دینے سے مراد اس کے دین اور اس کے پیغمبروں کی حمایت میں مال خرچ کرنا ہے جس طرح روپیہ قرض دینے والا اس اُمید پر دیتا ہے کہ اس کا روپیہ واپس مل جائے گا اور قرض لینے والا اس کے ادا کرنے کو اپنے ذمہ لازم کر لیتا ہے۔ اسی طرح خدا ہی کی دی ہوئی جو چیز یہاں اس کے راستہ میں خرچ کی جائے گی، وہ ہرگز گم یا کم نہیں ہوگی۔ حق تعالیٰ نے کسی مجبوری سے نہیں محض اپنے فضل و رحمت سے اپنے ذمہ لازم کر لیا ہے کہ وہ چیز تم کو عظیم اثنان نفع کی صورت میں واپس کر دے۔ اور فرض من حن سے مراد یہ ہے کہ اخلاص سے دو اور اپنے محبوب و مرغوب اور پاک و صاف مال میں سے دو۔

نیکیاں برائیوں کو ملیا میٹ کر دیتی ہیں

۵۲۔ میں مزد تم سے تمہاری برائیاں دور کر دوں گا اور تمہیں ضرور باغات میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی۔ یعنی نیکیاں جب زیادہ ہوں تو وہ برائیوں کو دبا لیتی ہیں جب آدمی خدا کے عہد کو پورا کرنے کی کوشش میں لگا ہے تو حق تعالیٰ اس کی کمزوریوں کو دور کر کے اپنی خوشنودی اور قرب کے مکان میں جگہ دیتا ہے۔

یہ جو ہے میثاق پر پابجالی اور وفاداری کا مطلب یہ ہے کہ میثاق کی ان پانچ دفعات پر اگر تم نے عمل کیا اور اس طرح تم جہائے وفادار بن کر رہے تو میں ان حسنت کے ذریعے تمہاری برائیاں مٹا دیتا کروں گا جن کے وجہ تمہارے دامنوں پر ماضی میں پڑ چکے ہیں۔ برائیاں مٹا دیتا کرنے کے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ رام راست کو اختیار کرنے اور اللہ کی ہدایت کے مطابق فکر و عمل

کے صحیح طریقے پر چلنے کا لازمی نتیجہ ہو گا کہ انسان کا نفس بہت سی برائیوں سے اور اس کا طرزِ زندگی بہت سی خرابیوں سے پاک ہوتا جائے گا۔ دوسرے یہ کہ اس اصلاح کے باوجود اگر کوئی شخص بحیثیت مجرّمی کمال کے مرتکب کو نہ پہنچ سکے اور کچھ نہ کچھ برائیاں اس کے اندر باقی رہ جائیں تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان پر مہربانہ و مہربانہ سے ان کو اس کے حساب سے موقوف کرے گا کیونکہ جس نے اسلامی ہدایت اور دنیاوی اصلاح قبول کر لی ہو۔ اس کی جزئی اور ضمنی برائیاں کا حساب لینے میں اللہ تعالیٰ سخت گیر نہیں ہے۔

آخر میں فرمایا ہے کہ میں تمہیں ضرور باغات میں داخل کروں گا۔ جنّات کا بولِ قرآن میں آخرت کی پرہیزگار زندگی کے لیے کنایہ ہے۔ یہودیوں کے یہاں بھی جنت اور آخرت کی پرہیزگار زندگی کا تصور تھا یہاں تک کہ لاکھ فرمایا ہے کہ اس ميثاق سے وفا داری کا لازمی اور ناگزیر نتیجہ عالمِ آخرت میں پرہیزگار زندگی ہے۔

گُفر شاہِ مستقیم سے جھٹک جانا ہے

۵۳۔ پھر اس کے بعد تم میں سے جو بھی راہِ گُفر اپنائے گا وہ بلاشبہ سیدھی راہ سے ہٹ جائے گا یعنی ایسے صاف اور سیدھے عہد و پیمان کے بعد بھی جو شخص خدا کا وفا دار ثابت نہ ہوا اور غدر و خیانت پر کمر بستہ ہو گیا تو سمجھ لو کہ اس نے کامیابی اور سبّات کا سیدھا راستہ گم کر دیا۔ نہیں کھا جاسکتا کہ وہ پاکت کے کس گوشے میں جا کر رہے گا۔ بنی اسرائیل سے جن باتوں کے عہد لینے کا یہاں ذکر ہے وہ یہ ہیں، غارِ زکوة، چیمبروں پر ایمان لانا، ان کی جان و مال سے مدد کرنا۔ ان میں سے پہلی جانی عبادت ہے دوسری مالی تیسری قلبی و زبانی، چوتھی فی الحقیقت تیسری ان کی اخلاقی تکمیل ہے۔ گریا ان چیزوں کو ذکر کر کے اشارہ کر دیا کہ جان و مال اور قلب و قالب ہر چیز سے خدا کی طاعت اور وفا شری کا اظہار کرو۔ لیکن بنی اسرائیل نے جن جن چیزوں پر ایک ایک عہد کی خلاف ورزی کی، کسی قول و قرار پر قائم نہ رہے۔ ان عہد شکنیوں کا نتیجہ ہوا اس اگلی آیت میں بیان فرماتے ہیں

اصل ارشاد میں سوارِ اسبیل آیا ہے۔ اس لفظ کی معنویت سمجھنے کے لیے پہلے یہ ذہنی نشین کر لینا چاہیے کہ انسان بھائے خود اپنی ذات میں ایک عالمِ اصغر ہے جس کے اندر بے شمار مختلف قوتیں اور قابلیتیں ہیں، خواہشیں ہیں، خدمات اور رجحانات ہیں۔ نفس اور جسم کے مختلف مطالبے

ہیں۔ روح اور طبیعت کے مختلف تقاضے ہیں، پھر ان افراد کے ملنے سے جو اجتماعی زندگی بنتی ہے وہ بھی
 بحد و حساب بچیدہ تعلقات سے مرکب ہوتی ہے اور تمدن و تہذیب کے نشوونما کے ساتھ ساتھ
 اس کی پیچیدگیاں بڑھتی جاتی ہیں پھر دنیا میں جو سامان زندگی انسان کے چاروں طرف پھیلا ہوا
 ہے اس سے کام لینے اور اس کو انسانی تمدن میں استعمال کرنے کا سوال بھی انفرادی اور اجتماعی حیثیت
 سے بکثرت شاخ و شاخ مسائل پیدا کرتا ہے۔ انسان اپنی کمزوری کی وجہ سے اس پورے عرصہ
 حیات پر ایک وقت ایک متوازن منظر نہیں ڈال سکتا۔ اس بنا پر انسان اپنے لیے خود زندگی کا
 کوئی ایسا راستہ بھی نہیں بنا سکتا جس میں اس کی ساری قوتوں کے ساتھ انصاف ہو۔ اس کی تمام خواہشوں
 کا ٹھیکہ ایک ہی ادا ہو جائے، اس کے سارے جذبات و رجحانات میں توازن قائم ہے۔ اس کے
 سب اندرونی و بیرونی تقاضے متناسب کے ساتھ پورے ہوں۔ اس کی اجتماعی زندگی تمام مسائل کی مناسب
 رعایت ملحوظ ہو اور ان سب کا ایک ہموار اور متناسب حل نکل آئے۔ اور مادی دنیا کو بھی شخص اور
 تمدنی زندگی میں بدل و انصاف اور حق شناسی کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔ جب انسان خود اپنا رہنما
 اور اپنا شاد رخ بناتا ہے تو حقیقت کے مختلف پہلوؤں میں سے کوئی ایک پہلو زندگی کی نہ درگاہ
 میں سے کوئی ایک ضرورت، حل طلب مسئلوں میں سے کوئی ایک اس کے دماغ میں اس طرح مستطاب
 جاتے ہیں کہ دوسرے پہلوؤں اور ضرورتوں اور مسئلوں کے ساتھ وہ بالارادہ یا باارادہ بے انصافی کرنے
 لگتا ہے اور اس کی اس رشتے کے زبردستی نافذ کرنے کا نتیجہ ہوتا ہے کہ زندگی کا توازن بگڑ جاتا ہے
 اور اس کی وجہ سے وہ مسائل جن کے ساتھ بے انصافی ہوتی ہے بغاوت شروع کر دیتے ہیں۔ اس
 طرح انسانی زندگی کو کبھی سدا چلنا نصیب نہیں ہوتا۔ ہمیشہ وہ بچکوسے ہی کھاتے رہتی ہے تمام
 وہ رشتے جو انسان کے اپنے خود ساختہ و پرداختہ ہیں خط منحنی کی صورت میں ہیں۔ ان بہت سی غلط
 راہوں میں ایک ایسی راہ جو بالکل سیدھی ہو، جس میں انسان کی تمام قوتوں اور خواہشوں کے اس کے
 تمام جذبات و رجحانات کے ساتھ اس کی روح اور جسم کے تمام مطالبوں اور تقاضوں کے ساتھ اور
 اس کی زندگی کے تمام مسائل کے ساتھ پورا انصاف کیا گیا ہو، انسانی زندگی کے صحیح ارتقاء اور اس
 کی کامیابی کے لیے نہایت ضروری ہے۔ انسانی فطرت اسی راہ کی طالب ہے لیکن انسان خود اس
 شاہ راہ کو معلوم کرنے پر قادر نہیں ہے اس کی طرف صرف اللہ سبحانہ ہی رہنمائی کر سکتا ہے اور
 اللہ نے اپنے رسول اسی لیے روانہ کیے ہیں کہ انسانوں کو یہ راہ راست بتائیں۔
 قرآن نہایت کی پیش کردہ اسی راہ کو سواہ السبیل اور صراط مستقیم کہتا ہے۔ یہ شاہ راہ و نہیب کی

زندگی سے لے کر آخرت کی دوسری زندگی تک بے شمار ٹیسٹس راستوں کے درمیان سے گزر کر سیدھی پہنچ جاتی ہے جو اس پر چلا وہ یہاں راست اور آخرت میں کامیاب اور بامراد ہے اور جس نے اسے گم کر دیا وہ یہاں غلط ہیں غلط رو اور غلط کام ہے اور آخرت میں لامحالہ لے جہنم میں جاتا ہے ۔

موجودہ زمانے میں بعض نادان فلسفیوں نے یہ دیکھ کر کہ انسانی زندگی بے مقصد ہے ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف دھکے کھاتی چل جا رہی ہے ۔ یہ فقیر نکال لیا کہ جدل عمل انسانی زندگی کے ارتقاء کا فطری طریق ہے وہ اپنی حماقت سے یہ سمجھ بیٹھے کہ انسان کے ارتقاء کا راستہ یہی ہے کہ پہلے ایک انتہا پسندانہ دعویٰ لے ایک رخ پر بہا لے جاتے ، پھر اس کے جواب میں دوسرا دوسرا انتہا پسندانہ دعویٰ لے دوسری انتہا کی طرف کھینچنے اور پھر دونوں کے امتزاج سے ارتقاء حیات کا راستہ بنے حالانکہ دراصل یہ ارتقاء نہیں ہے بلکہ بد نصیبی کے دھکے ہیں جو انسانی زندگی کے صحیح ارتقاء میں بار بار مانع ہو رہے ہیں ۔ ہر انتہا پسندانہ دعویٰ زندگی کو اس کے کسی ایک پہلو کی طرف موڑتا ہے اور اسے کھینچنے لیے جاتا ہے یہاں تک کہ جب وہ سوار السبیل سے بہت دور جا پڑتی ہے تو خود زندگی ہی کی بعض دوسری حقیقتیں جن کے ساتھ بے انصافی ہو رہی تھی اس کے خلاف بغاوت شروع کر دیتی ہیں اور بغاوت ایک جہاں کی شکل اختیار کر کے اسے مخالف سمت میں کھینچنا شروع کر دیتی ہے ۔ جس قدر سوار السبیل نزدیک آتی ہے ۔ ان متضاد دعوؤں کے درمیان مصالحت ہونے لگتی ہے اور ان کے امتزاج سے وہ چیزیں وجود میں آتی ہیں جو انسانی زندگی میں نافع ہیں لیکن جب وہاں سوار السبیل کے نشانات دکھائے والی روشنی نہیں ہوتی ہے اور اس پر ثابت قدم نہ کھنکھنے والا ایمان ، تو وہ جہاں دعویٰ زندگی کو اس کے مقام پر نہیں مٹھنے دیتا بلکہ اپنے دوسرے لے دوسری جانب انتہا تک کھینچنا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ پھر زندگی کی کچھ دوسری حقیقتوں کی نفی شروع ہو جاتی ہے اور نتیجہ میں ایک دوسری بغاوت اٹھ کھڑی ہوتی ہے اگر ان کم نظر فلسفیوں تک قرآن کی روشنی پہنچ گئی ہوتی اور انہوں نے سوار السبیل کو دیکھ لیا ہوتا تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ انسان کے ارتقاء کا صحیح راستہ یہی سوار السبیل ہے نہ کہ خط منحنی پر ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف دھکے مارتے پھرنا بلکہ



فِيهِ أَتَقْضِيهِمْ مِّمَّا قَالَهُمْ لَعْنَهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قَسِيَةً
يُخْرِفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ وَنَسُوا حَظًّا مِمَّا ذُكِّرُوا بِهِ
وَلَا تَرَالِ تَظْلِمُ عَلَى خَائِنَةٍ مِنْهُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ فَأَعْفُ
عَنْهُمْ وَاصْفَحْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْعَاصِينَ وَمِنَ الَّذِينَ
قَالُوا إِنَّا نَصْرَى أَخَذْنَا مِمَّا قَالَهُمْ فَنَسُوا حَظًّا مِمَّا ذُكِّرُوا
بِهِ فَأَعْرَبْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ وَ
سَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللَّهُ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ

لہذا ان کی عہد شکنی کی وجہ سے ہم نے ان کو ملعون بنا دیا اور ان
کے دلوں میں سختی ڈال دی۔ وہ کلام کو اپنے موقع و محل سے
ہٹاتے ہیں، اور جس چیز کے ذریعے ان کی یاد دہانی کی گئی تھی اس
کا ایک حصہ وہ بھلا بیٹھے ہیں، اور تم ہمیشہ ان کی کسی نہ کسی
نیرانت سے آگاہ ہوتے رہو گے لیکن تھوڑے سے ان میں سے

ایسے نہیں ہیں، ان کو معاف کر دو اور ان سے درگزر کرو، اللہ
 حسن کار لوگوں کو پسند کرتا ہے۔ اور جو لوگ اپنے تئیں نصاریٰ ہونے
 کا دعویٰ کرتے ہیں ان سے بھی ہم نے عہد لیا تھا، وہ بھی اس
 چیز کا ایک حصہ فراموش کر بیٹھے جو ان کو یاد کرائی گئی تھی،
 لہذا ہم نے قیامت تک کے لیے ان کے درمیان عداوت
 اور بغض کی آگ بھڑکادی اور اللہ ان کے کرتوتوں سے عذرا
 اُن کو آگاہ کرے گا۔"

میشاق سے گریز پائی اور غدار سی

پہلی آیت میں بنی اسرائیل سے جو میثاق لیا تھا اس کی تاریخ بیان کی تھی اب اسی میثاق کے بارے
 میں ان کے کردار کی تاریخ بیان ہو رہی ہے۔ اور یہودیوں کے ساتھ عیسائیوں کی تاریخ سے بھی دو ذیل
 پہلو زیر بحث آتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ سے جو عہد لیا گیا تھا اس کا ذکر فرمایا
 ہے اور اس عہد کو توڑ کر دو جن نتائج سے دوچار ہوئے بالاجمال ان کی طرف بھی اشارہ ہے
 مقصود مسلمانوں کو متنبہ کرنا ہے کہ اب تم سے جو عہد لیا جا رہا ہے یہ بھی اسی نوعیت کا ہے اگر
 تم نے بھی اس عہد کے ساتھ وہی معاملہ کیا جو یہود و نصاریٰ نے کیا تو تمہیں بھی ان نتائج کو بھگتنے
 کے لیے تیار رہنا چاہیے جو ان کو پیش آئے۔ یاد رکھو کہ نقص عہد کی یہ تاریخ مسلمانوں کو نقص
 ماننے کی ایک سرگزشت کی حیثیت سے نہیں سنائی جا رہی ہے بلکہ اس لیے سنائی جا رہی ہے کہ

مسلمان اس سے سبق لیں اور یاد رکھیں کہ اگر انہوں نے اپنے میثاق کے ساتھ وہی معاملہ کیا جو یہود و نصاریٰ نے کیا تو ان کا بھی وہی سحر ہو گا جو یہود و نصاریٰ کا ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ اعمال کے نتائج زمانوں، مکانات اور قوموں کے بدلنے سے مختلف نہیں ہوتے، ہر جگہ ہر زمانے اور ہر قوم میں یکساں ہوتے ہیں۔ سعادت و شقاوت کا پیمانہ ایک ہے۔ اچھے اعمال کا نتیجہ سعادت ہے اور بُرے اعمال کا نتیجہ شقاوت۔ سعادت و شقاوت کے اس نقشہ میں نسب اور نسبتیں بیکار ہیں زمانوں اور مکانات کے اختلاف اس پر اثر انداز نہیں ہوتے ہیں۔

۵۴۔ لہذا ان کی عہد شکنی کی وجہ سے ہم نے ان کو ملعون بنادیا اور ان کے دلوں میں سختی ڈال دی، معن کے سننے پر اور اہلاد کے ہیں یعنی عہد شکنی اور غداری کی وجہ سے ہم نے اپنی رحمت سے ان کو دور چھینک دیا ہے اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا جہاں نقصہم میثاقہم کے لفظ سے ظاہر فرمادیا کہ ان کے ملعون ہونے کا سبب عہد شکنی اور غداری ہے جو خود انہی کا فعل ہے۔ اسباب کا سبب پر مرتب کرنا چونکہ خدا ہی کا کام تھا اس لحاظ سے جعلنا قلوبہم قاسیاء کی نسبت اس کی طرف کی گئی ہے۔

اس فقرے میں میثاق سے غداری کا نتیجہ بتایا گیا ہے کہ اللہ نے ان پر لعنت ڈال دی اور ان کے دلوں میں سختی پیدا ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ کسی قوم کے ساتھ معاہدہ کر کے اس کو جس دے کی عزت و سرفرازی بخشتا ہے۔ معاہدہ توڑ دینے کی صورت میں وہ اس کو اسی دے کی ذلت کے ساتھ دھتکار بھی دیتا ہے۔ اس دھتکار کے لیے جامع تعبیر لعنت ہے یعنی کسی کو راندہ درگاہ قرار دینا۔ راندہ درگاہ قرار دینے کا پہلا اثر جو اس قوم پر پڑتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے اندر سے خدا کی خشیت جو دل کی زندگی کی ضامن ہے ختم ہو جاتی ہے اور دل پتھر ہو کر زبردانیت کی روئیدگی کے لیے بالکل بے ہوش ہو جاتا ہے۔ یہ حالت پیدا تو ہوتی ہے عہد شکن قوم کے اپنے عمل کے نتیجہ کے طور پر لیکن چونکہ واقع ہوتی ہے، اللہ کی مقررہ سنت کے مطابق، اس وجہ سے اس کو منسوب اللہ تعالیٰ اپنی طرف فرماتا ہے۔

قرآن میں دوسری جگہ جہاں بنی اسرائیل کی تاریخ حیات کا چہرہ بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ مال و دولت کا حصول، حق اور باطل میں التباس، کتمان حق دین کا کاروبار، شخصی مستریت سے

بے پروائی، غلامی سے آزادی کے بعد سرکشی، گوسالہ پرستی، گستاخی اور بے ادبی، ظلم کاری اور مصیبت پر اصرار و غفلت کا فساد اور اخلاق کا بگاڑ، قتل، انبیاء اللہ کی آیات کا کفر، حمد و پیمان کے بعد اس سے روگردانی، غداری اور عہد شکنی، حیلہ سازی، قمع اور کثرت سوال اور نبوت کی شان میں گستاخیاں ان کے مزاجوں میں اسی قسوت قلبی کے مظاہر ہیں۔ قسوت عربی زبان میں ہر چیز کی سختی کو کہتے ہیں۔ سخت پتھر کو ہر قاسیہ اور ایسی زمین کو جس میں پیداوار کی صلاحیت نہ ہو اور من قاسیہ کہتے ہیں۔ قسوت یہ ہے کہ قبول کرنے اور نصیحت سے اثر پذیر ہی کی اس میں کوئی صلاحیت نہ ہو۔ قرآن نے ایک موقع پر ان کی قلبی قسوت کے لیے بیخ شبیہ پیش کی ہے

قست قلوبکم من بعد ذلك فنعی کا الجمارۃ او اشد قسوة

اس کے باوجود تمہارے دل سخت ہو گئے وہ پتھروں کی طرح ہیں بلکہ اس سے بھی سخت یعنی یہودیوں کی اخلاقی حالت اتنی گر گئی ہے یا اس وجہ سے آگئی ہے کہ حضرت پذیر ہی اور نبیہ کی استعداد ان میں ایک قلم معدوم ہو گئی، ان کی اسی حالت کا نام قرآن نے قسوت رکھا ہے۔ امام غزالی اور امام کسائی نے قاسیہ کو قسیتہ پڑھا ہے یعنی فیصلہ کے وزن پر صفت مشبہ کا صیغہ۔ یہ قاسیہ سے لحاظ سے زیادہ بیخ ہے۔ یہودیوں کی اس قسوت کا انجیل میں بار بار ذکر آیا ہے۔ اس نے ان کی سخت دلی کے سبب غمگین ہو کر اور چاروں طرف ان پر غصہ سے نظر کر کے اس آدمی سے کہا۔ (مرقس ۳-۵) ان کی بے اعتقاد ہی اور سخت دلی پر ملامت کی (مرقس ۱۶-۱۲) تو اپنی سختی اور غیر آتب دل کے مطابق اس قہر کے دن کے لیے اپنے واسطے غضب کا رہا ہے (رومیوں ۲-۵)

کلام الہی میں تحریف

۵۵۔ وہ کلام کو اپنے موقعہ و محل سے ہٹاتے ہیں یعنی خدا کے کلام میں تحریف کرتے ہیں،

بعضی اس کے الفاظ میں، کبھی تلاوت میں تحریف کی یہ سب اقسام قرآن و حدیث میں مذکور گئی ہیں جس کا قدسے اعتراف آج کل بعض یورپین عیسائیوں کو بھی کرنا پڑا ہے یہ عذاب بواسطہ فراتے ہیں کہ یہ فقرہ اشیا ف بانی ہے اور اس کے ذریعے ان کے دلوں کی قسوت کے مرتبے کی نشاندہی ہو رہی ہے۔ ایسا مقام جس میں انسان دل کی سختی کی وجہ سے اللہ کے کلام کا منہ

بگڑنے پر دلیر ہوتا ہے، قسادت کو انہی مرنے پر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ قسادت عمدہ شکن قوم میں ایسی بات پیدا کر دیتی ہے کہ وہ میثاق الہی کی خلاف ورزی پر بس نہیں کرتی بلکہ وہ اس معاہدے کو اپنی خواہش کے مطابق بنانے کے لیے اس کے الفاظ و کلمات میں تحریف بھی کرتی ہے۔ یہ تحریف یہودیوں نے کن کن فنکلوں میں کی اس کی تفصیل انشا اللہ اسی باب سے میں آ رہی ہے۔ یہاں تو صرف یہودی علماء کی یہ قسادت بتائی ہے کہ کتاب اللہ کی اطاعت کرنے کی بجائے کتاب اللہ کو اپنی خواہشوں اور رایوں کے مطابق کام میں لاتے تھے یا تو کسی آیت کا مطلب اس طرح ٹھہراتے تھے کہ بات کچھ سے کچھ ہر جاتی یا کتاب اللہ کی آیتیں ساتے ہوئے اپنی طرف سے کچھ گھٹا اور بڑھاتے کہ اصلی مطلب ظاہر نہ ہو اور جو بات بنائی جاتے ہیں کسی دوسری طرح بن جاتے۔ تحریف حرف سے بنا ہے اس کے معنی کسی چیز کو لہجہ یا جگہ سے ہٹانے کے آتے ہیں یعنی کسی کو ایک طرف کر دینا کیونکہ حرف لغت میں جانب اور طرف کے آتے ہیں۔ اس میں نقلی اور منہوی دونوں قسم کی تحریضیں آگئیں ہیں۔ یہودی علماء کی طرح خود بھی دمی نقلی کے قائل نہیں اور اپنے صحیفوں بلکہ خود تو رات تک کی غنوغیت کے مدح نہیں ہیں۔ ان کا سارا کام یہودیوں کی طرح بکھاتے اصل متن کے ترجمہ کے زور پر چل رہا ہے اور ترجمہ ہنتر سے ہنتر ہی ہو پھر بھی اصل سے جتنا دور ہوتا جائے گا۔ ہر عقل مند جانتا ہے اس کا مقصد کیا ہے؟

تورات کے متعلق قرآن کا تاریخی انکشاف

۵۶۔ اور جس چیز کے ذریعے ان کو یاد دلائی گئی تھی اس کا ایک حصہ وہ جھٹلاٹھے۔ یعنی چاہیے تو یہ تھا کہ ان قیمتی نصیحتوں سے فائدہ اٹھاتے جو مثلاً نبی آخر الزمان کی آمد اور دوسرے محبت دین کے متعلق ان کی کتابوں میں موجود تھیں مگر اپنی غفلتوں اور شرارتوں میں پس کر یہ سب بھول گئے بلکہ نصیحتوں کا وہ منہ دمی حصہ ہی گم کر دیا اور اب یہی جو نصیحتیں اور مفید باتیں خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ان کو یاد دلائی جاتی ہیں ان کا کوئی اثر قبول نہیں کرتے۔ حافظ ابن رجب حنبلی نے لکھا ہے کہ نفع عہد کی وجہ سے ان میں دو باتیں آئیں۔ لغویت اور قسادت قلب ان دونوں کا نتیجہ یہ دو چیزیں ہوئیں۔ تحریف کلام اللہ اور عدم انتفاع بالذکر یعنی لعنت کے انہی کے ان کا مدافع مسدود ہو گیا جس کی نہایت بے باکی اور بد عقلی سے کتب رسالہ کی تحریف پر آمادہ ہو گئے وہ سری طرف جب عمدہ شکن کی نحوست سے دل سخت ہو گئے تو

قبول حتیٰ اور نصیحت سے متاثر ہونے کی صلاحیت نہ رہی اور اس طرح علمی اور عملی دونوں قسم کی قوتیں ضائع ہو گئیں۔

اصل میں نسواً حفاظاً مذاہب و ادیان، ارشاد ہوا ہے اس کی تشریح شارحین قرآن نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق کی ہے۔ ہمارے خیال میں ما ذکر دواہ سے تورات مراد ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہودی تورات کا ایک حصہ مجملاتی ہے۔ دراصل تورات حضرت موسیٰ کے زمانے میں مرتب نہیں ہوئی بلکہ ان کی وفات کے اتنے دنوں کے بعد اس کی ترتیب عمل میں آئی جبکہ کسی کو یہ علم بھی نہ رہا تھا کہ ان کی قبر کہاں ہے؟ اس کے مرتبین کا نام بھی معلوم نہیں ہے کہ وہ کون اور کن صفات کے لوگ تھے۔ استنباط باب ۲۲ کے آخر میں ہے کہ

پھر آج تک کسی آدمی کو اس کی قبر معلوم نہیں ہے۔

اسی طرح یہ الفاظ بھی اسی ہیں ہیں۔

اور اس وقت سے اب تک کوئی نبی موسیٰ کی مانند جس سے خداوند نے رو برو

باتیں کیں نہیں پیدا ہوا۔

ظاہر ہے کہ جو کتاب اپنے لانے والے کی وفات کے طویل عرصہ کے بعد مرتب ہوئی کہ لوگ اس کی قبر بھی بھول گئے۔ اس کی تعلیمات کو محفوظ رکھنا ان کے لیے کس طرح ممکن تھا۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ تورات کی بہت سی باتیں وہ بھول گئے پھر جو باتیں مرتب بھی ہوئیں وہ بھی اصل الفاظ میں محفوظ نہیں رہیں بلکہ ان کے پاس اصل تورات کے بجائے صرف اس کے ترجمے رہ گئے اور یہ ترجمے بدلتے بدلتے اصل سے اتنے مختلف ہو گئے کہ یہ تمیز کرنا ناممکن ہو گیا کہ اس میں اصل کتنی بات ہے اور کتنی جا معین اور مترجمین کی حاشیہ آرائی ہے اسی طرح تورات کا ایک بڑا حصہ اس کے حاملین نے ضائع کر دیا۔ عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ کتاب الہی کو فراموش کر بیٹھے، اور یہی بات امام مہار نے فرمائی ہے مطلب دونوں بزرگوں کا یہ ہے کہ اصل کتاب کا کچھ حصہ فراموش کر بیٹھے، کچھ علمائے نسیان کو ترکِ عمل کے معنی میں لیا ہے۔ معنی دونوں ہیں ایک یہ کہ کتاب کا کچھ حصہ انہوں نے طاق نسیان بنا دیا دوسرے یہ کہ انہوں نے تورات کے کچھ حصہ پر عمل کرنا چھوڑ دیا پہلے معنی حقیقی ہیں اور دوسرے مہازی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اصل حقیقت ہے نہ کہ ہماز، مہازی

میں اسی وقت لیے جاسکتے ہیں جبکہ حقیقی معنی میں کوئی مانع ہو۔ یہاں کوئی مانع نہیں بلکہ دوسرے موقع پر اسی منہم کے لیے اوستا نصیباً من الکتاب کی تفسیر معنی حقیقی کی مراد ہے۔ غالباً جن بزرگوں نے یہاں مجازی معنی لیے ہیں وہ اس بات کو ممکن تصور نہیں کرتے کہ تورات کا کوئی حصہ ضائع ہو چکا ہے۔ ان کا گمان ہے کہ تورات بھی متواتر ہے لیکن ایسا سمجھنا ٹھیک نہیں ہے کیونکہ تورات کا تواتر وایتی اور تاریخی طور پر ثابت نہیں ہے۔ امر واقعہ یہی ہے کہ جب لہل بابل نے ہیکل کو لاگ لگائی اور شہر کو برباد کیا اور شہریوں کو مارا اور قید کیا تو یہودیوں کے ہاتھوں سے کتاب تورات ضائع ہو گئی۔ و بعد کے بعد جب وہ آزادی کی نعمت سے بھرپور ہوئے تو انہوں نے دوبارہ کچھ تورات کو اپنی یادداشتوں سے مرتب کیا لیکن یہ ساری تورات نہ تھی، بلاشبہ تورات کا حصہ وقت کی اس دستبرد سے طاق نسیان ہو کر رہ گیا۔ یہ نبوت محمدیہ کا اعجازی شاہکار ہے کہ جس چیز کی نشاندہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے۔ آپ نے اس کا اعلان ہم اصدیاں پہلے دوسوا احفاما ذکر واجب اور اوستا نصیباً من الکتاب کہہ کر قرآن میں کر دیا اور بتا دیا کہ یہوولے کتاب الہی کا ایک حصہ فراموش کر دیا اور آل عمران اور نسا میں پہلے گزر چکا ہے کہ اوستا نصیباً من الکتاب یعنی یہودی... تورات کا ایک حصہ فراموش کر بیٹھے ہیں۔

کچھ شارحین قرآن کی رائے میں فراموش کردہ حصہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بائیس میں بشارات ہیں لیکن ہم اے خیال میں یہ درست نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو قرآن یہودی علماء کے بائیس میں یوں نہ کہنا کہ یسر فہم نہ کما یسر فہم ابناد ہم علانکہ یہ ثابت شدہ حقیقت اور امر واقعہ ہے بلکہ ایمان لانے والوں نے اس پر قسم کھاتی ہے۔

یہاں اور آل عمران اور نسا میں ایک ہی بات بتائی گئی ہے کہ بیت المقدس کی تباہی کے بعد سے لے کر آج تک یہودیوں کی تورات کا ایک حصہ مفقود ہے اور جو کچھ موجود ہے وہ بھی ترجمہ در ترجمہ ہو کر ہم تک پہنچا ہے اور اس میں بھی ان کے تصرفات، تحریفات، اضافات ہیں۔

یہودیوں کی زندگی سرِ پانچیاں ہے

۵۔ اور ہم ہمیشہ ان کی کسی نہ کسی خفایت سے نگاہ ہوتے رہو گے لیکن حضور سے ان میں ایسے نہیں ہیں۔ یعنی ان کی دغا بازی اور خیانت کا سلسلہ آج تک چل رہا ہے اور آئندہ بھی چلتا رہے گا، اسی لیے ہمیشہ ان کی کسی نہ کسی دغا بازی اور کمزور فریب پر آپ مطلع ہوتے رہتے ہیں

لیکن ان میں تھوڑے سے ایسے نہیں جیسے عبداللہ بن سلام وغیرہ جو اسلام میں داخل ہو چکے ہیں۔ یہاں لفظ خائن سے مراد خیانت ہے۔ حضرت قتادہ سے قرطبی نے یہی معنی نقل کیے ہیں۔ ابی عرب کبھی مصدر کو میضہ فاعل سے تعبیر کر دیتے ہیں جیسے قاتل بول کر قاتلہ اور غاصہ بول کر غاصہ اور لائہ بول کر لائمات مراد لیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم ان یہودیوں کی نیت نئی خیانتوں سے جب تک آپ کے ساتھ مطلع ہوتے رہو گے۔ یہودیوں کی پوری تاریخ ہر پہلو سے خیانت کا شاہکار ہے قرآن نے یہاں اور متعدد مقامات پر یہود کی خیانت کی داستان سنائی ہے۔ دنیوی معاملات اور دینی احوال دونوں میں ان کی خیانت کو طشت ازخام کیا ہے خالص دنیوی معاملہ میں قرآن نے ان کی خیانت پر بھی اجتماعی زندگی کا چہرہ پیش کرتے ہوئے بتایا ہے منہم من ان تامنہ بدینار کا یہودہ ایبہ اور جب دنیوی معاملہ میں ان کی امانت کا یہ حال ہے تو قیاس کیا جاسکتا ہے کہ دینی معاملے میں کتاب کی حفاظت اور نبوت کے بائے میں پیشین گوئیوں کی مخالفت میں وہ کیوں کر قابل اعتبار ہو سکتے ہیں۔ یہودیوں کی خیانت پر بنی زندگی کا کچھ چہرہ جلد سوم نوٹ نمبر ۱۳۹-۱۴۰-۱۴۱ میں پیش کیا جا چکا اور بتایا جا چکا ہے کہ دین کی زندگی میں امانت و دیانت کی بڑی قدر و منزلت ہے کیونکہ زندگی میں جو اخلاقی جوہر مرکزی حیثیت رکھتا ہے وہ دیانتداری اور امانت ہے اور اس سے مقصود یہ ہے کہ انسان اپنے کاروبار میں دیانتدار ہو اور جس کسی پر جتنا ہو اس کی پوری دیانت سے رتی رتی لے۔ قرآن میں امانت کا دائرہ صرف روپے پیسے، جائداد اور مالی اشیاء تک محدود نہیں بلکہ برائی، قانونی اور اخلاقی امانت تک وسیع ہے۔ کسی کا کوئی مجید آپ کو معلوم ہے تو اس کو چھپا، امانت ہے۔ کسی مجلس میں آپ ہوں، اور کچھ باتیں دوسروں کے متعلق دلوں سن لیں تو ان کو اسی مجلس تک محدود رکھنا امانت ہے۔ اگر کسی جگہ ملازم ہے تو اس کو ملازمت کے شرائط کے مطابق اپنی ذمہ داری کو انجام دینا امانت ہے۔ ہر حال خیانت ہر حال میں خیانت ہے اور دیانت ہر حال میں دیانت ہے۔

مدینہ کے ارد گرد یہود کے تین قبائل موجود تھے۔ بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ۔ حضور انور نے مدینہ میں قدم رکن فرماتے ہی ان کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھایا۔ جنگ نہ کرنے پر ادرکسی سے جنگ ہونے کی صورت میں مسلمانوں کے خلاف مدد نہ کرنے پر معاہدہ کیا لیکن انہوں نے

معاہدہ سے بے پروا ہو کر اس کی ایک ایک دفعہ کو توڑنا اور سیاسی طور پر خیانت کی۔ قرآن یہاں ان کی اسی خیانت سے تبریز زندگی کا حوالہ دے رہا ہے۔

عفو و درگزر حسن کاری ہے

۵۸۔ ان کو معاف کر دو، ان سے درگزر کرو، اللہ حسن کار لوگوں کو پسند کرتا ہے۔ یعنی جب ان کی عادتِ تدبیر ہی یہ ہے تو ایسے لوگوں سے ہر چیز پر الجھنا اور ان کی ہر خیانت کا پردہ چاک کرنا ضروری نہیں ہے۔ ان کو چھوڑیے اور درگزر کیجئے اور ان کی بُرائی کا بدلہ عفو و احسان سے دیجئے، شاید اسی سے کچھ متاثر ہوں۔ قتادہ وغیرہ نے کہا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے قاتلوا الذین ھم یؤمنون باللہ وکمالیوم الآخر سے مگر اس کی کچھ حاجت نہیں ہے۔ قتال کے حکم سے یہ لازم نہیں آتا کہ کسی وقت اور کسی موقع پر بھی ایسی قوم کے مقابلہ میں عفو و درگزر اور تالیفِ قلب سے کام نہ لیا جائے بلکہ اس آیت کی تشریح میں شارحین قرآن نے جن مطلب کو ترجیح دی ہے وہ تو آپ شیخ الاسلام کی زبانی سن چکے ہیں لیکن دوسرے علما نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں کن لوگوں سے عفو و درگزر ہو رہا ہے۔ ان متوڑوں سے جن کو عام خیانت پیشہ میوڑوں سے الّا قیلا کے ذریعے مستثنیٰ کیا گیا ہے یا ان سب جن کے بارے میں خیانت پیشہ ہونے کا اظہار ہوا ہے۔ مشور معتزلی فکر ابو مسلم مصنفی کی رائے یہ ہے کہ یہ حکم ان متوڑوں کے بارے میں ہے جن میں خیانت نہیں ہے اور مطلب یہ ہے کہ ان کی گزشتہ بے راہ رویوں اور خیانتوں کو معاف کر دیجئے اور ان کے غلط کار لوگوں کو نظر انداز کر دیجئے اور ان سے اس احسان کا معاملہ کیجئے جو اللہ پسند کرتا ہے لیکن ایسے عام شارحین قرآن نے پسند نہیں کیا بلکہ آیت میں سب خیانت پیشہ میوڑوں سے عفو و درگزر کے حکم کو ترجیح دی ہے اور مطلب یہ بتایا کہ اگر یہ اپنی حرکات سے توبہ کر لیں اور برائیاں شہری بن کر رہنا قبول کر لیں تو ان سب کو معاف کر دیجئے۔ ان دونوں تشریحات کی روشنی میں یہ آیت قرآنی محکم ہے منسوخ نہیں ہے۔

بہر حال اس آیت میں قرآن نے عفو و درگزر کا حکم دیا ہے اور عفو و درگزر کو حسن کاری قرار دیا ہے۔ نکتہ سنجوں نے یہیں سے یہ بات بھی نکال لی ہے کہ جب کافروں اور کافر بھی وہ جو

خاتن ہیں ان سے قرآنِ معنود درگزر کی ہدایت کر رہا ہے اور اسے حسنِ عمل اور حسنِ کاری قرار دے رہا ہے تو پھر خاتن کے ساتھ معنود درگزر کے معاملہ کی فضیلت کے کیا کہنے ہیں۔ قاضی بیضاوی رقمطراز ہیں۔ اس میں اشارہ ہے کہ خاتن کا ذکر معاف کرنا حسنِ کاری ہے اور اگر کا فخر خاتن نہ ہو تو اس کو بدرجہ اولیٰ معاف کیا جائے۔

اور اس میں ہمارے لیے بڑی عبرت ہے کہ اللہ سبحانہ جب خاتن کا ذکر کے لیے معافی کو پسند کرتا ہے تو خاتن مسلمان تو اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اسے معاف کیا جائے۔

عیسائی نصاریٰ ہونے کے مدعی ہیں

۵۹۔ اور جو لوگ اپنے تئیں نصاریٰ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں ان سے عہد لیا۔ نصاریٰ کا ماضی تو نصر ہے جس کے معنی مدد کرنے کے ہیں اور یا ناصر سے ہے جو ملک شام میں ایک بستی کا نام ہے جہاں حضرت مسیح علیہ السلام رہے تھے اسی لیے ان کو مسیح نامی کہتے ہیں۔ جو لوگ اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں وہ گویا اس بات کے مدعی تھے کہ ہم خدا کے چنے دیں اور یہ عبرتوں کے حامی ہیں اور حضرت مسیح نامی کے متبع ہیں۔ اس زبانی دعویٰ اور یعنی تفاخر کے باوجود دین کے معاملہ میں جو ردیہ تھا وہ کنگے آ رہا ہے۔

یہود کے نقص عہد کے بعد اب یہ نصاریٰ کے نقص کا ذکر ہو رہا ہے اور تہید ہی اس انداز سے اٹھائی ہے جس سے بقول علامہ جمال الدین قاسمی یہ مترشح ہو رہا ہے کہ نصاریٰ ہونے کے مدعی تھیں انصار اللہ کا مصلحت نہیں بلکہ اس سے کوسوں دور ہیں یا یہ کہ یہ بخساری قرآن کے نزدیک نصاریٰ نہیں بلکہ صرف نصاریٰ ہونے کے مدعی ہیں۔ یا بقول علامہ ابوالسود یہ تعبیر ان کے قول و فعل میں تضاد ظاہر کرنے کے لیے اختیار کی ہے۔ علامہ ناصر صاحب انتصاف نے یہاں یہ عجیب نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ خاص طور پر اس موقع پر یہ تعبیر یہ بنانے کے لیے اختیار کی گئی ہے کہ یہ مدعیانِ نصرت دعویٰ نصرت کے باوجود اس کے دین کی نصرت میں بالکل ناکام رہے۔ ان کا قول ان کے کردار کے ہرگز نہ مطابق نہیں ہے

نصاری سے میثاق

۶۰۔ ان سے بھی ہم نے عہد لیا تھا وہ بھی اس چیز کا ایک حصہ فراموش کر بیٹھے جو ان کو یاد کرائی گئی تھی۔ یعنی یہود کی طرح نصاریٰ سے بھی عہد لیا گیا لیکن یہ بھی عہد شکنی اور بیوفائی ہیں اپنے پیشرووں سے کچھ کم نہیں ہیں۔ انہوں نے بھی ان بیش بہا نصایح سے جن پر نہات و فلاح ابدی کا مدار تھا کوئی فائدہ نہ اٹھایا بلکہ بائبل نصیحتوں کا وہ حصہ باقی ہی نہ چھوڑا جو حقیقتہً مذہب کا مغز تھا بلکہ

پہلے یہودیوں کے ہاں سے میں فرمایا تھا کہ انہیں جو کچھ نصیحت کی گئی تھی وہ اس کا ایک حصہ بھلا بیٹھے اب نصاریٰ کے متعلق بھی انکشاف فرمایا ہے کہ نصاریٰ بھی اپنی کتاب کا بیشتر حصہ فراموش کر چکے ہیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ میثاقی جن کتابوں کو انجیل کہتے ہیں وہ انجیل نہیں بلکہ حضرت مسیح کی ایک جمل اور مختصر سی تاریخ ہے۔ مختصر اس لیے کہ رہا ہوں کہ یوحنا نے اپنی انجیل کے آخر میں کلمے غفلتوں میں اقرار کیا ہے۔

اور بھی بہت سے کام ہیں جو مسیح نے کیے اگر وہ جدا جدا لکھے جاتے تو میں بھٹتا ہوں کہ جو کتابیں لکھی جائیں ان کے لیے دنیا میں گنجائش نہ ہوتی۔

(یوحنا ۲۱-۲۵)

ذخیرۃ الالباب کے مصنف نے بھی بتایا ہے کہ انجیل مسیح کی زندگی کے ذریعے اعمال کو بیان کرتی ہے اور نہ ان کے سارے ارشادات کو جیسا کہ یوحنا نے تصریح کی ہے۔

فی الواقع انجیل تو وہ مقدس کتاب ہے جس کی وحی حضرت مسیح علیہ السلام کو آئی اور جس میں زندگی کے لیے ہدایات اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے ہاں سے میں بشارات تھیں۔ اسی انجیل کا ان چاروں مورخین کے یہاں ذکر ہوتا ہے۔ چنانچہ متی کلمے غفلتوں میں کہتا ہے کہ میں تم سے پہلے کہتا ہوں کہ تمام دنیا میں جہاں کہیں اس خوشخبری یعنی انجیل کی منادی کی جائے گی یہ بھی جو اس نے کیا اس کی یادگاہی میں کیا جائے گا۔ (متی ۲۶-۱۳)

لے افادات شیخ اہ سلام

ان تاریکوں کو نابھیل صرف اس لیے کہہ دیا گیا ہے کہ ان کا موضوع بحث انجیل مسیح ہے اور کچھ آیتیں ان میں انجیل کی ہیں۔ اسی لیے رقت نے اپنی انجیل کا آغاز اس طرح کیا ہے :

انجیل مسیح کا آغاز وہ اور بعد ازیں حضرت مسیح سے نقل کیا ہے کہ

لوگو! تو بہ کرو اور انجیل پر ایمان لاؤ، لہذا وہ انجیل جس پر ایمان لانے کا لوگوں کو حکم دیا جا رہا ہے ان چاروں تاریکوں میں سے ایک بھی نہیں ہے۔

عبدالاول میں حضرت مسیح کی طرف مشرب کر کے ایک نہیں بلکہ ستر سے زیادہ نابھیل منعتہ شہود پر آتی ہیں کینسم کے کچھ مورخین کہتے ہیں کہ ان میں سے ۲۵ جھوٹی تھیں۔ اگرچہ ذخیرۃ الالباب کے مصنف نے یہ کہہ کر نابھیل کی کثرت کے الزام سے غلو خلاصی کرنی چاہی ہے کہ ایک ہی انجیل کو مختلف ناموں سے موسوم کر دیا گیا ہے اور آخر میں ۷۰ سے بہت کم صرف ۲۰ کا اعتراف کیا ہے اور ان میں سے میں بڑا یا کی انجیل کو بھی شمار کیا ہے مگر سچ یہ ہے کہ وہ جواب نہ دے سکا۔

انجیل میں تحریف کا آغاز

قرن اول ہی انجیل میں تحریف شروع ہو گئی تھی۔ چنانچہ پولس نے اپنے اس خط میں جو رابل غلاطیہ کو لکھا ہے اقرار کیا ہے :

مجھے حیرت ہے کہ تم اتنی جلدی مسیح کی انجیل سے دوسری انجیل کی طرف پلٹ رہے ہو حالانکہ اس کے سوا کوئی انجیل نہیں ہے۔ ہاں کچھ لوگ ہوں گے جو تمہیں انجیل مسیح سے ہٹائیں گے اور انجیل مسیح کو تبدیل کرنا چاہیں گے۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح کی ایک ہی انجیل تھی۔ اور پولس ہی نے اس خط میں جو اس نے رابل کو فیثوس کے نام لکھا ہے تصریح کی ہے کہ

یہ لوگ جو انجیل مسیح میں تحریف کر رہے تھے جھوٹے مکار پاپائی فرستائے ہیں۔ انہوں نے مسیح کے فرستادوں کا جیس لپیٹا ہوا ہے۔

کتاب اعمال کی پندرہویں فصل میں اس موضوع کی زیادہ وضاحت پیش کی گئی ہے کہ یہودی صیاحیوں میں وہ چیزیں پھیلاتے تھے اور ان چیزوں کی تعلیم دیتے جو حضرت مسیح کے فرستادوں کی تعلیمات کے علاوہ کچھ اور بھی۔

اور حضرت مولانا رحمت اللہ کیرازی قدس سرہ نے اخبارِ اَلْمَلِی میں ۱۰۰ شواہد سے کتبِ متعدّدہ میں تحریف کا ہونا ثابت کیا ہے۔ ہم یہاں مولانا موصوف کی کتاب ازالۃ الشکوک سے ایک اقتباس نقل کرتے ہیں تاکہ ناظرین اندازہ کر سکیں کہ اس موضوع میں یہ سچوں کی بلے بسی کا کیا حال ہے۔

جب تحریف کی گفتگو میں درسِ سالوں اور اُصولِ بابِ پانچویں نامہ اولِ یوحنا کا پیش کیا گیا اس پر ان کو اور پادری فریج صاحب کو جو ان کے شریک تھے ان دروسوں میں اور اسی طرح اور کسی جگہ انجیل کے اندر وہ تحریف لائی پڑھی جس کے ہم جگہ غلط ہیں اور صاف اقرار کیا کہ اُنھوں نے جگہ انجیل مقدس کے اندر ایتوں کی تحریف ہوئی ہے اور چالیس ہزار چھوٹی چھوٹی غلطیاں اور تحریضیں ہوتی ہیں، مگر بڑے حصہ کے بعد قائل ہوئے کہ تحقیق سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے دس میں نہیں بلکہ چار پانچ ایتوں میں تحریف ہوئی ہے اور چالیس ہزار کی نہیں بلکہ تیس ہزار کی۔ اس پر میں نے ان سے کہی بار بار یہ خطوط دریافت کیا کہ آپ ان چار پانچ ایتوں کو کھول کر بتائیں کہ فلسفے معیض یا فلاں نامہ مشاہدات کے فلانی آیت ہے کہ بعد اس کے کچھ عرض کروں۔ اس کے جواب میں کبھی کچھ عذر کیا اور کبھی وعدہ اور جب ان سے اُمید ٹوٹی تو ان کے شریک کی خدمت میں ۲۳ ذی الحجہ ۱۲۸۵ھ کو ایک خط روانہ کیا۔

بہر حال انہوں نے بھی تفصیل سے پہلو تہی کی۔ مگر اتنا غنیمت ہے کہ اپنے یہاں کے اختلاف کے عذر میں صاف اقرار کر گئے کہ انجیل کے اندر چار پانچ ایتیں یقیناً تحریف کی راہ سے گھسی گئی ہیں اور یوں ملکہ کہ ۔۔۔ تحریفوں کے عدد کا جو ہلکے بیان میں اختلاف ہوا ہے سو اس کی حقیقتِ حال یہ ہے کہ عددِ کلان کے باب میں مصمّمین کا اتفاق کسی صورت میں نہیں ہے۔ چار پانچ ایتوں کے حق میں حرج یقین برآ کر یا سہو یا عمدۃً راہِ تحریف تین کی درمیان میں آئیں۔ اگر سائے امور سے قطع نظر لیں اور فقط ان کے ارشاد ہی پر اکتفا کریں تو بھی ناظرین بالانصاف کو تین باتیں ہاتھ لگتی ہیں۔

پہلی یہ کہ اہل کتاب کا حال یہ ہے کہ باوجودیکہ چار پانچ ایتیں انجیل میں یقیناً مخوف ہیں۔ پھر بھی ان تحریف شدہ ایتوں کو اپنے سب ترجموں میں نقل کرتے چلے آتے ہیں۔ ان کی دیانت سے کب بعید ہے کہ اور مواضع میں بھی ان کے

تحریر یقینی ہو کر جو کہ اس کا اقرار ان کے مقصد کے خلاف ہے اس لیے ان کو چھپاتے ہیں بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کو کلام الہی بتاتے ہیں۔ دیکھو ساتویں اٹھویں باب بچم نامہ آدل برحق میں کسی تبلیغی یا سنے تحریر کے تشکیک کو ثابت کرنے کے لیے اتنی حمایت اپنی طرف سے بڑھادی — جو آسمان پر گواہی دیتے ہیں باپ اور کلام اود روح القدس اور یہ تینوں ایک ہیں ادمین ہیں جو زمین پر — اور اصل میں اتنی عبادت حق — تین ہیں جو گواہی دیتے ہیں روح پانی اور لہو۔ الخ اور ان جناب نے اور میزان الحق کے مولف نے جو ان کے شریک تھے مجمع عام میں اقرار کیا تھا کہ اس جگہ ہم بھی تحریر ملتے ہیں، باوجود اس کے وافع البہتان والانتیگت کے ثابت کرنے کو اٹھویں فصل میں ص ۱۲۳ پر یوں لکھتا ہے کہ —

فی الحقیقت ماہیت الہی میں یہ تین باب بیٹا کلمہ اور روح القدس موجود ہیں جیسا کہ یوحنا کے پہلے خط باب بچم آیت ۱۴ میں ہے کہ تین ہیں جو گواہی دیتے ہیں آسمان میں، باب بیٹا اور روح القدس یہ تینوں ایک ہیں۔

بہر حال انجیل میں تحریر کی داستان بڑی طویل ہے۔ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے اس کے تابوت میں آخری کیل مٹونک دی ہے اور اظہار الحق میں تحریر لفظی اور معنوی کے لیے بے شمار تالیفات پیش کیے ہیں۔

اناجیل اربعہ کی تاریخی حیثیت

تحریر انجیل کے سلسلے میں سر پہے یہ بات بھی دلچسپی سے غالی نہیں ہے کہ جن چار انجیلوں کو کثیر نے جو متنی مدد و اعتماد کا سرٹیفکیٹ دیا ہے۔ خدا ان کی تاریخی حیثیت مشکوک ہے۔ ان میں اختلاف ہے کہ ان کے لکھنے والے کون ہیں۔ یہ کب لکھی گئی ہیں اور کس زبان میں لکھی گئی ہیں اور ان کے اصلی نسخے کیسے للبتہ ہو گئے؟

آئیے کچھ خیالات اور آراء آپ بھی سن لیجئے۔ مرشد الطالبین الی الکتاب القدس انجیل کے مصنف کا انکشاف ہے کہ

عام یسویوں کے اعتماد کے مطابق متی کی انجیل لوقا، مرقس اور یوحنا سے پہلے لکھی گئی ہے۔ مرقس اور لوقا نے اور دوسرے کی بلایادی سے پہلے انجیل قلم بند کی۔

لیکن یہ بات یقین سے نہیں کہی جاسکتی کہ حضرت مسیح کے روانہ ہونے کے بعد یہ کام

انہوں نے کون سے سال میں کیا کیونکہ ہم اس معاملہ میں نصِ الہی سے خالی ہاتھ ہیں۔

ہو نہ کہ ان کے خیال کے مطابق سب سے پہلے مٹی نے ایبیل تکھی ہے اس لیے مٹی کی ایبیل کے بارے

میں پہلے ان کے خیالات کا ہمیں مطالعہ کرنا چاہیے۔ ذخیرۃ الالباب کا مصنف یہ دعویٰ کرنے کے

باوجود کہ مٹی نے ایبیل سائنہ میں لکھی ہے یہ بتانے سے قاصر ہے کہ کون سی زبان میں لکھی ہے عبرانی

یا سپر کلدانی پھر یہ بھی بتانا ہے کہ اسی ایبیل کا پھر ترجمہ یونانی زبان میں ہوا ہے اور ترجمہ ہی نے اصل

متن کی جگہ سے لے متن غائب ہو گیا اور ترجمہ کو لکھنے والوں کی ہاتھ کی صفائی نے اس قدر مسخ کر دیا

کہ کچھ سے کچھ ہو کر رہ گیا۔ ذخیرۃ الالباب ہی کے مصنف نے یہ بھی لکھا ہے کہ مٹی نے یہ ایبیل اور شلیم

میں لکھی ہے لیکن یہ حضرت مسیح کی زندگی کی سوانح نہیں ہے بلکہ ایک جعلی روایت ہے۔ ڈاکٹر پوسٹ

نے "قاموس کتاب مقدس" میں کھلے لفظوں میں اقرار کیا ہے کہ مٹی نے ایبیل یونانی زبان میں لکھی ہے

ان نامک ٹوٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان بیچاروں کو فی الواقع یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ مٹی کی ایبیل

کس زبان میں لکھی گئی ہے۔ متعدد مین میسی غلام کا خیال ہے کہ یہ ایبیل مٹی نے لکھی ہی نہیں ہے۔

ایبیل مرقس کا بھی کچھ یہی حال ہے۔ صاحب ذخیرہ نے مرقس کا جو چہرہ لکھا ہے۔ اس سے

معلوم ہوتا ہے کہ مرقس پطرس کا منہ بولا بیٹا اور شاگرد تھا اور ان کی ایبیل کچھ مٹی کی ایبیل کے

اقتباسات اور کچھ پطرس کے مواظظ پر مشتمل ہے اور کچھ پرورشٹ مٹی کی ایبیل میں سولہویں

فصل کی بارہ آیات کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

ڈاکٹر پوسٹ کا یہ انکشاف بڑا عجیب ہے کہ مرقس یوحنا ہی کا لقب ہے اور یہودا اور شلیم

میں پیدا ہوا۔ پولس اور برنابا کے ساتھ تبلیغی سفر میں جا رہا لیکن برج نامی مقام پر ان سے جدا ہو گیا۔

اور کہتے ہیں کہ وہی برنابا اور پولس کے باہمی تنازعہ کا باعث بنا۔ بعد ازیں پولس کے ساتھ رویر کا

سفر کیا ان کی ایبیل کی زبان یونانی تھی۔ لیکن ڈاکٹر موصوف یہ نہیں بتا سیکے کہ یہ ایبیل کب لکھی گئی

ہے ہاں یہ بانوس کی ایک روایت کے سماع سے یہ ضرور لکھا ہے کہ مرقس کی ایبیل پطرس اور پولس

کی وفات کے بعد وجود میں آئی ہے۔

ایبیل لوتا۔ یہ ایبیل بھی روایتی اور تاریخی حیثیت سے خود اپنوں میں اتنی مضبوط اور طاقتور

نہیں ہے۔ لوتا کے بارے میں صاحب ذخیرہ نے تو یہی بتایا ہے کہ انکا لکھ کا باشندہ تھا لیکن

ایبیل کے شارحین کہتے ہیں کہ افریقی ہے۔ اور یہ بھی بتانے والے کہتے ہیں کہ بت پرست تھا

ادھر حق قبول کر لیا تھا۔ پولس کا شاگرد اور اس کا معاون تھا۔ صاحب ذخیرہ ہی نے یہ بھی لکھا ہے کہ کئی اور مرقس نے اپنی اناجیل میں حضرت مسیح کی سیرت سے متعلق کچھ احوال منظر انداز کر دیے تھے۔ بعد میں کچھ لوگوں نے اس کا ترجمہ کیا تو تینس اور تریس کر کے اس کا چہرہ بگاڑ کر رکھ دیا۔ لوگوں کا یہی کردار لوہا کے انجیل لکھنے کا باعث ہوا۔

انجیل یوحنا، خود یوحنا کے ہاتھ میں ہے حد اختلاف ہے کہ کون ہے۔ ابن زبیری کا شاگرد ہے یا پولس کا، صاحب ذخیرہ فرماتے ہیں کہ یوحنا نے انجیل صرف اس لیے لکھی ہے کہ حضرت مسیح کی الہیت ثابت کرے اور اناجیل مثلاًذ کی کمی پوری کرے اور اس کی زبان یرانی متھی اور یوحنا نے یہ کام لوگوں کے بہت زیادہ اصرار کے بعد کیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر لوگ اصرار نہ کرتے تو یوحنا انجیل نہ لکھتا۔ یہ انجیل تناقضات اور تضاد کا پلندہ ہے۔

ان چاروں انجیلوں کا یہ تاریخی اور واقعاتی پس منظر بتا رہا ہے کہ مسیحی دنیا اپنی دینی دستاویز کی حد تک روایت، اسناد متعل اور منقطع سے محروم ہے۔ قرآن کے اس انکشاف کی کہ وہ نسوا حفاظا ماذکر و لا بسا کیسی واقعاتی تفسیر ہے۔ جو بات آج ہم علم و تحقیق سے معلوم کر رہے ہیں وہ ہی بات نبوت محمدیؐ نے زبان وحی سے آج سے چودہ سال پہلے بتا دی ہے۔

اور یہ بھی مزے دار بات ہے اور نبوت محمدیہ کا یہ عجیب اہماج ہے کہ ساری تحریفات، سوائے تصرفات کے باوجود آج بھی انجیل میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی بشارات موجود ہیں چنانچہ حضرت یحییٰ کے سلسلے میں ہے :

جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن اور لاوی پر پھٹنے کو اس کے پاس آئے کہ تو کون ہے ؟ تو اس نے انکار نہ کیا بلکہ اقرار کر لیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں۔ انہوں نے اس سے پوچھا کہ پھر تو کون ہے کیا تو ایلیاہ ہے ؟ اس نے کہا میں ایلیاہ نہیں ہوں، کیا تو وہ نبی ہے اس نے جواب دیا کہ نہیں۔ پس انہوں نے کہا کہ پھر ہے تو کون ؟

(یوحنا ۱۹-۲۲)

انہوں نے سوال کیا کہ اگر تو نہ مسیح ہے نہ ایلیاہ نہ وہ نبی تو پھر بیستہ کیوں دیتا ہے

(یوحنا باب ۱-۲۵)

ایک حوالہ اور ملاحظہ فرمائیے۔ حضرت مسیح دنیائے رخصت ہونے سے پہلے اپنے شاگردوں کو تسلی دیتے ہیں کہ

اگر تم مجھ سے محبت رکھتے ہو تو میرے حکموں پر عمل کرو گے تو میں آپ درخواست کروں گا کہ وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ایک تمہارے ساتھ رہے۔

(یوحنا ۱۴-۱۶)

مددگار کے لفظ اُنڈا انجیل میں وکیل یا فیض بطور نسخہ کے درج ہے۔ اب آپ ہی سوچئے کہ یہ ایک ساتھ ہونے والا مددگار یا فیض اور وکیل بجز نبی خاتم النبیین کے اور کون ہو سکتا ہے۔ اسی کی تاکید ایک بار پھر حضرت مسیح کی زبان سے ملاحظہ ہو۔

میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ ہوں گا تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا لیکن اگر میں جاؤں گا تو تمہارے پاس بھیج دوں گا وہ اگر دنیا کو گناہ اور راستبازی اور عدالت کے بارے میں تصور دار ٹھہرائے گا۔

(یوحنا ۱۶-۱۷)

اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ نبی اگر پرانی شریعتیں منسوخ کر دے گا اور نیا قانون، نئی شریعت چلائے گا۔

بہر حال جو کچھ وہ نہیں بھولے اس کچھ میں سے حضور انور کی ذات گرامی کے بارے میں یہ بشارات ہیں ان ہی بشارات کے سلسلے قرآن حضور انور کو ان کے لیے جانی پہچانی شخصیت قرار دیتا ہے۔

الذین یعرفونہ کما یعرفون ابنہ حسد

ہیسا یہوں کا باہم بغض و عناد

۶۱۔ لہذا ہم نے قیامت تک کے لیے ان کے درمیان عداوت اور بغض کی آگ بھڑکادی اور اللہ اُن کے کرتوتوں سے عنقریب ان کو آگاہ کرے گا۔ یعنی باہم نصاریٰ میں یا یہود و نصاریٰ دونوں میں عداوتیں اور جھگڑے ہمیشہ کے لیے قائم ہو گئے۔ آسمانی سبق کو ضائع کرنے اور جھٹلا دینے کا جو تجربہ ہونا چاہیے تھا وہ ہوا یعنی جب وحی الہی کی اصلی روشنی ان کے پاس نہ رہی تو اوہام و اہوار کے اندھیروں میں ایک دوسرے سے الجھنے لگے۔ مذہب تو نہ رہا مگر مذہب کے نام پر جھگڑے نہ کئے جیسوں فرقت پیدا ہو کر اندھیرے میں ایک دوسرے سے ٹکرائے گئے۔ یہی فرقہ وارانہ تصادم آخر کار آپس کی شدید ترین عداوت و بغض پر منتهی ہوا۔ کوئی شبہ نہیں کہ آج مسلمانوں میں بھی یہی تفرق اور تشدد اور مذہبی تصادم موجود ہے لیکن چونکہ ہمارے پاس وحی الہی اور قانونِ سماوی بحکم اللہ

ہم کو کماست منظور ہے اس لیے اختلافات کی موجودگی میں بھی مسلمانوں کی بہت بڑی جماعت برابر کو حق و صداقت پر قائم رہی اور قائم رہے گی۔ اس کے برخلاف یہود و نصاریٰ کے اختلاف مثلاً پر دستکٹ اور روس کی متحرک و غیرہ فرقوں کی باہم آدیزش میں کوئی ایک فریق بھی آج شاہراہ حق و صداقت پر قائم ہے اور نہ قیامت تک قائم ہو سکتا ہے کیونکہ وہ وحی الہی کی روشنی کو جس کے بغیر کوئی انسان خدا تعالیٰ اور اس کے قوانین کی صحیح معرفت حاصل نہیں کر سکتا۔ اپنی بے اعتدالیوں اور غلط کاریوں سے ضائع کر چکے ہیں۔ اب جب تک وہ اس معرفت بائبل کے امن سے وابستہ رہیں گے۔ محال ہے کہ قیامت تک ان کو مانہ اور محض بے اصول اختلافات اور فرقہ وارانہ بغض و عناد کی غفلت سے نکل کر حق کا راستہ دیکھ سکیں اور نہجیاتِ ابدی کی شاہراہ پر چل سکیں۔ بالی جو لوگ آج نفس مذہب خصوصاً مسیحیت کا مذاق اڑاتے ہیں اور جنہوں نے غلط سمجھت یا مروجہ بائبل کو محض چند سیاسی مزدوروں کے لیے رکھ دیا ہے۔ اس آیت میں ان نصاریٰ کا ذکر نہیں ہے۔ اگر مان لیا جائے کہ وہ بھی آیت کے تحت میں داخل ہیں تو ان کی باہمی عداوتیں اور ایک دوسرے کے خلاف ریشہ دوانیاں اور علانیہ محابرات بھی باخبر صہلہ پر پوشیدہ نہیں ہیں۔

قیامت تک کا نظریہ ایسا ہے جیسے ہمارے محاورات میں کہہ دیتے ہیں کہ فلاں شخص قیامت تک بھی فلاں حرکت سے باز نہ آئے گا۔ اس کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ وہ شخص قیامت تک زندہ رہے گا اور یہ حرکت کرتا رہے گا۔ مراد یہ ہے کہ اگر قیامت تک بھی زندہ رہے تو اس بات کو نہ چھوڑے گا اسی طرح میاں الی ایوم الہیامہ کا لفظ آنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہود و نصاریٰ کا وجود قیامت تک رہے گا جیسا کہ ہمارے زمانے کے بعض مبطلین اپنی تفسیر میں لکھ دیا ہے۔ آخر میں ارشاد ہے کہ اللہ ان کے کرتوتوں سے ضرور ان کو خبردار کرے گا یعنی آخرت میں پوری طرح اور دنیا میں بھی بعض واقعات کے ذریعے ان کو اپنی کرتوت کا نتیجہ معلوم ہو جائے گا بلکہ

یہ نتیجہ بیان ہوا ہے کتاب الہی میں تحریف اور اس کے ایک حصہ کو ضائع کر دینے کا ثبوت کی تیز زہندی، اللہ کے میثاق اور اس کی کتاب ہی سے ہوتا ہے۔ اگر اسی میں فساد و اختلال پیدا ہو جائے تو پھر ملت کو فساد و اختلال اور خون خرابے سے کیا بچر بچا سکتی ہے۔ یہ صورت حال عہدِ نیکوئی کا قہراً نتیجہ بھی ہے اور اس بھرم کی منزا بھی۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔

نصاروی کے لیے اس سے نکالت کی واحد شکل یہ تھی کہ قرآن کی رہنمائی میں ان تائیدیوں سے نکل کر ہدایت کی روشنی اور امن و سلامتی کی شاہراہ پر آجائے لیکن ان کے تعصب نے ان کو یہ سیدھی راہ اختیار نہ کرنے دی۔ اب نہ کوئی کتاب آئی ہے اور نہ کوئی رسول۔ اس وجہ سے اس جنگ و جدل سے نکلنے کا اب ان کے لیے قیامت تک کوئی امکان باقی نہیں رہا۔

یہ ملحوظ ہے کہ نقص جہد کی تاریخ مسلمانوں کو محض ماضی کی ایک مرکز شست کی حیثیت سے نہیں ملتی جا رہی ہے بلکہ اس لیے ملتی جا رہی ہے کہ مسلمان اس سے سبق لیں اور یاد رکھیں کہ اگر انہوں نے بھی اپنے میثاق کے ساتھ وہی معاملہ کیا جو یہود و نصاریٰ نے کیا تو ان کا بھی وہی مشربرگہ جو یہود و نصاریٰ کا ہوا۔

ثُمَّ أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يَتْلُو لَكُمْ كُتُبَنَا إِنَّا كُنَّا نَعْلَمُ
 الْمُخْفُونَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَعْفُو عَنْ كَثِيرٍ قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ
 نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ اللَّهُ يَهْدِي مَن يَشَاءُ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ بِرَحْمَتِهِ
 سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ وَ
 يَهْدِيهِمْ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿٥٠﴾

اے اہل کتاب ہمارا رسول تمہارے پاس آچکا ہے، تورات و انجیل
 کی بہت سی باتیں جن کو تم چھپاتے تھے وہ تم سے صاف صاف
 بیان کرتا ہے اور بہت سی باتوں سے درگزر کر جاتا ہے۔
 بلاشبہ اللہ کی طرف سے تمہارے پاس روشنی آپہنچا ہے اور
 ایسی کتاب آپہنچی جو روشن اور واضح ہے۔ اللہ اس کے
 ذریعے ان لوگوں پر جو خدا کی خوشنودی کے پیروکار ہوں،
 سلامتی کی راہیں کھولتا ہے اور ان کو تانبہ کیوں سے نکال کر

روشنی میں لاتا ہے اور ان کو سیدھی راہ پر لگا دیتا ہے۔

اہل کتاب کے لیے علم و بصیرت کی روشنی

دورِ زہ کا تہ ہے کہ انسان کی ایک سائنس کا لوجی یہ ہے کہ کسی سلسلہ حیات کے متعلق اگر یہ معلوم ہو جائے کہ فرضی اور خیالی ہے یا مشتبہ ہے تو خواہ وہ کسی قدر موثر انداز میں کیوں نہ ہو طبیعتیں اس سے دیر پا اور گہرا اثر نہیں لیتی ہیں، اس لیے ایک کامل سیرت کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس کے تمام اہم اجزاء کی تاریکی پر یقین ہو، یہی سبب ہے کہ تاریخی افسانوں سے جو اثر طبیعتوں میں پیدا ہوتا ہے وہ خیالی افسانوں سے نہیں ہوتا۔ دوسرا سبب تاریخی سیرت کے ضروری ہونے کے لیے ضروری ہے کہ آپ اس سیرت کا مکمل کائنات معنی دلچسپی یا فرمت کے گمناموں کی مشغولی کے لیے نہیں پیش کرتے بلکہ اس غرض سے پیش کرتے ہیں کہ آپ اپنی زندگی اس نمونہ پر ڈھالیں اور اس کی پیروی اور تقلید کریں، لیکن وہ زندگی اگر تاریخی اور واقعی طور پر ثابت نہیں تو آپ کیوں کریں اس کے قابلِ عمل ہونے پر زور دے سکتے ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ یہ فرضی اور میتا لوجیکل قصے ہیں جن پر کوئی انسان اپنی عملی زندگی کی بنیاد نہیں رکھ سکتا اس لیے پورا اثر ہونے اور لائقِ تقلید ہونے کے لیے سب سے پہلے ضروری یہ ہے کہ اس کامل انسان کی سیرت، دعوت، تاریخی اور واقعاتی اعتبار سے بالکل واضح اور صاف ہو۔ تاریخی اور خفائی نہ ہو۔

ہر ملک، ہر قوم میں ہر زمانے میں کہنے لاکہ انسان خدا کا پیغام لے کر آتے ہیں مگر آج ان میں سے کتنوں کے نام ہم جانتے ہیں اور جتنوں کے نام ہم جانتے بھی ہیں ان کا حال کیا جانتے ہیں۔ سب تاریخی میں ہیں۔ دنیا کی تمام قوموں کو چھوڑ کر صرف اہل کتاب کو دیکھئے۔ ان میں سینکڑوں پیغمبر آئے لیکن نام کے سوا تاریخی نے ان کا کچھ اور حال نہ جانا۔ حضرت اسحاق، حضرت ابراہیم، حضرت یعقوب، حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ کے حالات اور سیرتوں کے ایک ایک حصہ کے علاوہ کیا ہم کو کوئی کچھ بتا سکتا ہے۔ ان کی سیرتوں کے ضروری اجزاء تاریخی کی گہرائیوں سے بہر حال تاریخی میں ہیں۔ اب ان کی مقدس زندگیوں کے ادھو سے ادھیر مربوط حصے کیا ایک کامل انسانی زندگی کی تقلید اور پیروی کا سامان کر سکتے ہیں۔ یہودیوں کے جن اسفار میں ان کے حالات درج ہیں وہ ان میں سے ہر ایک کی

نسبت متعین کو مختلف شکوک ہیں اور اگر ان شکوک سے ہم قطع نظر بھی کر لیں تو ان کے اندر ان ہندگوں کی تصویریں کس درجہ اوصوری ہیں۔

حضرت مولیٰ علیہ السلام ہم کو تورات سے معلوم ہوتا ہے مگر وہ خود تورات جو لوح موجود ہے۔ اہل تحقیق کے بیان کے مطابق جیسا کہ خود مصنفین اس سیکلویڈ یا برٹالیکا تسلیم کرتے ہیں۔ حضرت موسیٰ کے صد ہا سال بعد عالم وجود میں آئی ہے۔ اس پر اب جرمن سکالرنے پتہ لگایا ہے کہ موجودہ تورات میں پہلو پہلو ہر واقعہ کے متعلق دو مختلف صورتوں اور روایتوں کا سلسلہ موجود ہے جو باہم تضاد ہے یہی وجہ ہے کہ تورات کے سوانح و واقعات میں ہر بر قدم پر تضاد بیانی سے سابقہ پڑتا ہے۔

حضرت عیسیٰ کے حالات انجیلوں میں درج ہیں مگر ان بہت سی انجیلوں میں سے آج عیسائی دنیا کا بڑا معتدّف چار انجیلوں کو تسلیم کرتا ہے باقی انجیل غیر مستند ہیں۔ ان چار انجیلوں میں سے ایک مکمل کے لکھنے والے کبھی خود حضرت عیسیٰ کو نہیں دیکھا۔ انہوں نے کس سے سن کر یہ مجموعہ لکھا۔ یہ بھی معلوم نہیں بلکہ اب تو یہ بھی مشکوک سمجھا جاتا ہے کہ جن چار آدمیوں کی طرف ان کی نسبت کی جاتی ہے وہ درست بھی ہے یا نہیں۔ تاریکوں کے اسی بھوم میں قرآن کی یہ آیت کہہ رہی ہے کہ واقعی لحاظ سے اہل کتاب روشنی کا مینار تھا ہے پاس اب اچکا ہے یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صرف کیا نہیں بلکہ اپنے ساتھ کتاب مبین لایا ہے۔ اب اس روشنی اور واضح کتاب کے بعد تمہارے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہا۔ یہ اللہ کی جانب سے انجامِ حجت ہے۔

اللہ کا رسول یہودی کی چھ چوریاں کھولتا ہے

۶۲۔ مسلمان کتاب ہمارا رسول تمہارے پاس اچکا ہے۔ تورات و انجیل کی بہت سی باتیں جن کو تم چھپاتے تھے وہ تم سے صاف صاف بیان کرتا ہے اور بہت سی باتوں سے وہ نہ کر جاتا ہے۔ یہ یہودی نصاریٰ کو خطاب ہے کہ وہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم جن کی آمد کی بشارت تمہاری کتابوں میں اس قدر تحریف ہونے پر بھی کو جو ہیں تشریف لے آئے جن کے منہ میں خدائے اپنا کلام ڈالا ہے اور جنہوں نے ان حقائق کی تکمیل کی جو حضرت مسیح ناقام چھوڑ گئے تھے۔ تورات و انجیل کی جن باتوں کو تم چھپاتے تھے اور بدل کر بیان کرتے تھے ان میں سے سب ضروری باتیں اس نبی آخر الزماں نے ظاہر کر دی ہیں اور جن باتوں کی چندال ضرورت نہ تھی ان سے درگزر کیا۔

تحریف خواہ تبدیلی الفاظ کی زحمت کی ہو یا تبدیلی معنی کی زحمت کی، اس کا اصل مقصد حقیقت پر پردہ ڈالنا اور خلق کی آنکھوں میں خاک ڈالنا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے قرآن نے اس کے لیے جامع لفظ اغیار کا استعمال کیا ہے جس کے تحت ان کی لفظی و معنوی تحریفیں بھی آگئیں اور ان کی قابلوں کی وہ آیتیں بھی جن کو اہل کتاب کے علماء اس اندیشے سے عام لوگوں سے چھپاتے تھے کہ ان کے خلاف شریعت اقدام کی پردہ درسی نہ ہو یا ان کی بنا پر آخری بعثت کے اب میں ان پر کوئی حجت قائم ہو سکے۔ فرمایا یہ رسول تمہاری بہت سی تحریفات بے نقاب کر رہا ہے اور ایسی بھی بہت سی ہیں جن کو منظر افکار کر رہا ہے اس لیے کہ مقصود اصل حقیقت کو ظاہر کرنا اور شریعت الہی کی تجدید و تکمیل ہے۔ دو کہ تمہاری ہدایات۔ مطلب یہ ہے کہ یہ پیغمبر تمہاری بعض چوریوں اور خیانتیں کھول دیتا ہے جن کا کھولنا دین حق کے قائم کرنے کے لیے ناگزیر ہے اور بعض سے چشم پوشی اختیار کرتا ہے جن کے کھولنے کی کوئی مستحقی ضرورت نہیں ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ پیغمبر آئی ہوئے کے باوجود تورات و انجیل کے اصل مضامین کو تمہاری اخفائی کار سازوں کے باوجود وحی الہی سے معلوم کر کے ظاہر کر دیتا ہے اور یہ بھلائے خود ایک شہادت ہے۔ آپ کے پیغمبر از علم کی اور ساتھ ہی پیغمبر اخلاق کا حال یہ ہے کہ ان مضامین کو نظر انداز کر دیتا ہے جن کے افشاء سے بجز مجرموں کی تیغ سے اور کوئی شرعی غرض وابستہ نہیں زحمتی اور رازی نے یہی مطلب بتایا ہے۔

اسلام کی شان کمال

۶۳۔ بشارت اللہ کی طرف سے تمہارے پاس روشنی آچکی ہے اور ایسا کتاب آپ کی جو روشنی اور افواج ہے۔ شاید نور سے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور کتاب میں سے قرآن یکم مراد ہے۔ یعنی یہود و نصاریٰ جو وحی الہی کی روشنی کو ضائع کر کے ابھار اور آزار کی تائیدیں اور باہمی خلاف و شقاق کی دایروں میں پڑے دھکے کھا رہے ہیں۔ جس سے نکلنے کا محال موجود قیامت تک امکان نہیں ہے۔ ان سے کہہ دو کہ خدا کی سب سے بڑی روشنی آگئی اگر سنہات ابدی کے صبح راستہ پر چلنا چاہتے ہو تو اس روشنی میں حق تعالیٰ کی رضا کے پیچھے چل پڑو۔ سلامتی کی راہیں کھلی پاؤ گے اور اندھیرے سے نکل کر آجائے میں بے کھٹکے چل سکو گے اور جس کی رضا کے تابع ہو کر چل رہے ہو اسی کی دستگیری سے مراط مستقیم کو بے تکلف طے کر لو گے۔

اگرچہ کچھ نثارِ حسینِ قرآن نے نورِ ادر کتاب ہمیں میں عطفِ تفسیری مان کر دلوں سے قرآنِ مراد لیا ہے مگر جماعے خیال میں حضرت قتادہ اور زہاج کی بات از روئے بلاغت زیادہ وزنی ہے کہ یہاں نور سے مراد حضور کی ذاتِ گرامی اور کتاب سے مراد قرآنِ حکیم ہے۔ پر لکھ آپ کی زندگی کا ایک ایک عمل قرآن کی ہدایات کا پرتو اور فکس تھا اس لیے یقیناً آپ کی زندگی پوری انسانیت کے لیے روشنی کا سامان ہے قرآن اگر آفتاب ہے تو حضور انور کی ساری زندگی اسی آفتاب کی روشنی ہے۔

اگرچہ دنیا میں انبیاء بہت گزرتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے وقت میں اپنی اپنی قوموں کے سامنے اس زمانہ کے حالات کے مطابق اخلاقِ عالیہ اور صنائعِ کاملہ کا ایک لایک ہندو تپن مجزاد نمود پیش کیا۔ کسی نے صبر کسی نے ایثار کسی نے زہدِ مطلق ہر ایک نے دنیا میں انسان کی ہر چیز زندگی کے راستہ میں ایک ایک پیغامِ قائم کر دیا ہے جس سے ملاحِ مستقیم کا پتہ لگ سکے مگر ضرورت تھی ایک نور کی جو اس مرسے سے لے کر اس مرسے تک پوری راہ کو اپنی تعلیمات اور عملی مثالوں سے روشنی کر دے گویا ہمارے ہاتھوں میں اپنی عملی اور عملی زندگی کا پورا اٹکا ایک شے ہے جس کو لے کر اسی کی تعلیم و ہدایت کے مطابق ہر سارے بے خطر منزلِ مقصود کا پتہ ملے۔ اسی نور کو قرآن نے دوسرے موعظہ ہر سراجِ منیر کہا ہے۔ گویا آپ کی ذاتِ گرامی دنیا میں خدا کی تعلیم و ہدایت کے لیے خود ہر حقِ نور اور چراغ ہے یعنی آپ کی ذات اور آپ کی زندگی راستہ کی روشنی ہے جو راہ کی تاریکیوں کو کافور کر رہی ہے۔ آپ کی تعلیم جو کہ عالمگیر حق اور قیامت تک زندہ رہنے والی تھی اس لیے آپ کی ذات پاک کو نورِ سراجِ منیر نام کر دیا گیا ہے۔ یہ معنی دھوئی نہیں ہے بلکہ یہ وہ واقعہ ہے جس کی بنیاد، دلائل اور شواہد پورے قائم ہے۔

کسی زندگی کے انسانوں کے لیے نور ہونے کے لیے جو بنیادی اور اہم شرطیں ہیں وہ سب آپ میں موجود ہیں۔ یعنی تاریکی، جامعیت، کمالیت اور علمیت۔

حضور کے نور ہونے کی پہلی وجہ

تاریکی سے مقصود یہ ہے کہ ایک کامل شخصیت کے جو سوانح اور حالات پیش کیے جائیں وہ تاریک اور ولایت کے لحاظ سے مستند ہوں۔ ان کی حیثیت قصوں اور کہانیوں کی نہ ہو۔ روزمرہ کا تجربہ ہے کہ انسان کی ایک سائیکالوجی یہ ہے کہ کسی سلسلہ حیات کے متعلق اگر یہ معلوم ہو جائے کہ یہ فرضی اور خیالی ہے یا مشتبہ ہے تو خواہ وہ کس قدر موثر انداز میں ہر طبیعتیں اس سے دیر پا اور

گہرا اثر نہیں لیتی ہیں۔ اس لیے ایک کامل سیرت کے فائدہ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس کے تمام اہم اجزاء کی تاریکیٹ پر یقین ہو۔

دوسرا سبب تاریکیٹ سیرت کے فائدہ ہونے کا یہ ہے کہ آپ اس سیرت کا کامل نقشہ محض دہیسی یا با وضاحت کے مضمونوں کی مشغولیت کے لیے نہیں پیش کرتے بلکہ اس غرض سے پیش کرتے ہیں کہ ہم اپنی فہمگی اس فائدہ پر ڈھالیں اور اس کی پیروی کریں اس لیے کسی شخصیت کے فائدہ ہونے کے لیے سب سے پہلے یہ ضرور ہو کہ اس کی پیروی زندگی تاریکیٹ اور روایتی معیار پر پوری ہو۔ ہم تمام انبیاء کرام کا احترام کرتے ہیں اور ان کے پیغمبر ہونے کا یقین رکھتے ہیں لیکن دوام، بنا، ختم نبوت اور آخری کامل سیرت ہونے کی حیثیت سے خود راہ وصل اللہ علیہ وسلم کو جو خاص شرف و امتیاز حاصل ہے وہ دوسرے انبیاء کو ان کے لیے مرحمت نہیں ہوا کہ ان کو دائمی، آخری و پیغمبر نہیں بنایا گیا۔ ان کی زندگیوں کا مقصد ایک خاص قوم کو ایک مقربہ وقت تک فائدہ دینا تھا اس لیے اس زمانہ کے بعد تبدیلی وہ دنیا سے ناپید ہو گئیں۔

ساتھی قوم میں سیکٹر دل پیغمبر آئے لیکن نام کے سوا تاریکیٹ نے ان کا اور کچھ حال نہ مانا۔ حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت ہمد، حضرت صالح، حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، حضرت زکریا، حضرت یحییٰ کے حالات اور سیرتوں کے ایک ایک حصے کے علاوہ کیا ہم کو کوئی کچھ بتا سکتا ہے۔ ان کی سیرتوں کے ضروری اجزاء تاریکیٹ کی کڑیوں سے بہر حال گم ہیں۔ اب ان کی مقدس زندگیوں کے ادھر سے اور نام بوط صحت کیا ایک کامل انسانی زندگی کی تقلید اور پیروی کا سامان بن سکتے ہیں۔ قرآن عزیز کو چھوڑ کر یہودیوں کے جن اسفار میں ان کے حالات درج ہیں ان میں سے ہر ایک کی نسبت محققین کو مختلف مشکوک ہیں۔ اگر ان مشکوک سے ہم قطع نظر ہی کر لیں تو ان کے انداز ان زندگیوں کی تصویر پر کسی درجہ اوصاف ہیں۔

حضرت موسیٰ کا حال ہم کو تواریخ سے معلوم ہوتا ہے مگر وہ خود تواریخ جو توحید ہے اہل یقین کے بیان کے مطابق جیسا کہ خود مصنفین دائرۃ المعارف برطانیہ تسلیم کرتے ہیں۔ حضرت موسیٰ کے بعد سال بعد وجود میں آئے، اس پر اب جرمن سکالرز نے پتہ لگایا ہے کہ موجودہ تواریخ میں پہلو، پہلو ہر واقعہ کے متعلق دو مختلف صورتوں اور روایتوں کا سلسلہ ہے جو باہم کہیں کہیں متضاد ہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ تواریخ کے سوانح و واقعات میں ہر قدم پر ہم کو تضاد بیان سے سابقہ پڑتا ہے اس نظر سے کہ پوری تفصیل برطانوی دائرۃ المعارف کے آئی بیکل ڈائیکل میں موجود ہے۔ اب ایسی صورت میں حضرت موسیٰ بلکہ آدم سے کہ حضرت موسیٰ کے واقعات کی تاریکیٹ حیثیت کیا رہ جاتی ہے۔

حضرت عیسیٰ کے حالات اناجیل میں درج ہیں مگر ان بہت سی انجیلوں میں سے ابھی میسائی دنیا کا بڑا حصہ صرف چار انجیلوں کو مانتا ہے باقی انجیل طفولیت انجیل برناباس وغیرہ نامستند ہیں جن پر وہ انجیلوں میں سے ایک انجیل کے کچھ والے کبھی حضرت عیسیٰ کو خود نہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے کسی سے سن کر حالات کا یہ مجموعہ لکھا۔ یہ بھی معلوم نہیں بلکہ اب تو یہ بھی مشکوک ہے کہ جن چار آدمیوں کی طرف ان کی نسبت کی جاتی ہے۔ وہ صحیح بھی ہے یہ بھی واضح طور پر ثابت نہیں ہے کہ وہ کن زبانوں میں اور کن زبانوں میں لکھی گئیں۔ سترہ سے لے کر بعد کے مختلف سالوں تک مختلف مفسرین اناجیل ان کی تصنیف کا زمانہ بتاتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ کی پیدائش، روانگی اور تثلیث کی تعلیم دیکھ کر اب بعض امیکی ناطدین کا فیصلہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کا وجود محض فرضی ہے۔ اس بیان سے میسائی روایتوں کے ذریعہ سے حضرت عیسیٰ کی زندگی کی تاریخی حیثیت کتنی کمزور معلوم ہوتی ہے۔

حضور کے نور ہونے کی دوسری وجہ

کسی شخصی سیرت کے نور بننے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے معیض حیات کے تمام حصے منظر عام پر ہوں۔ کوئی واقعہ بردہ راز اور ناقصیت کی تاریکی میں نہ ہو۔ بلکہ اس کے تمام سوانح اور حالات زندگی روز روشن کی طرح دنیا کے سامنے ہوں تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس کی سیرت کہاں تک انسانی سوسائٹی کے لیے ایک ایسی نئی زندگی کی صلاحیت رکھتی ہے۔

اس میاں پر اگر شاعرین ادیان اور بائیبل مذاہب کے سوانح اور سیرتوں پر نظر ڈالو تو معلوم ہو گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کوئی ایسی ہی اس میاں پر لہری نہیں اترتی۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ خاتم الانبیاء ہو کر دنیا میں تشریف لائے تھے۔

انبیاء سابقین میں سب سے مشہور زندگی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہے، موجد تورات کے مستند باخبر مستند ہونے کی بحث سے قطع نظر کر کے ہم اس کے بیانات کو بالکل صحیح تسلیم کیے لیتے ہیں۔ تاہم تورات کی پانچوں کتابوں سے ہم کو حضرت موسیٰ کی زندگی کے کس قدر اجماع ملتا ہے۔ جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ پیدا ہو کر فرعون کے گھر پرورش پاتے ہیں۔ جو ان کے مظالم کے خلاف بنی اسرائیل کی ایک دو توتوں پر مدد کرتے ہیں۔ پھر مصر سے مدین آتے ہیں۔ یہاں شادی ہوتی ہے اور ایک عرصہ تک یہاں زندگی بسر کر کے مصر واپس جاتے ہیں۔ وہاں میں نبوت سے سرفراز ہوتے ہیں۔ فرعون کے پاس پہنچتے ہیں، معجزات دکھاتے ہیں اور بنی اسرائیل کو

مصر کو لے جانے کی رخصت چاہتے ہیں، رخصت نہیں ملتی۔ بالآخر غفلت میں اپنی قوم کو لے کر نکل جاتے ہیں۔ خدا کے حکم سے سمندر میں ان کو راہ مل جاتی ہے۔ فرعون غرق ہو جاتا ہے اور وہ اپنی قوم کو لے کر عرب اور شام میں داخل ہوتے ہیں۔ کافر باشندوں سے لڑائیاں پیش آتی ہیں۔ اسی حالت میں جب وہ بہت بوڑھے ہو جاتے ہیں تو ایک پہاڑی پر ان کی وفات ہو جاتی ہے۔ ترنات استشار کے اختتامی فقرے میں ہے۔

سو خداوند کا بندہ موسیٰ خداوند کے حکم کے موافق مواب کی سرزمین میں مر گیا۔
اس نے اسے مواب کی ایک وادی میں بیت فغور کے مقابل گاڑا۔ پھر آج کے دن تک
کوئی اس کی قبر کو نہیں جانتا اور موسیٰ اپنے مرنے کے وقت ۱۲۰ برس کا تھا اور اب
تک موسیٰ کے مانند بنی اسرائیل میں کوئی نبی نہیں پیدا ہوا۔

حضرت موسیٰ نے ایک سو بیس برس عمر پائی مگر حور کرور کہ ایک سو بیس برس کی عمر کے طویل
زمانے کی دست کو بھرنے کے لیے ہم کو حضرت موسیٰ کے کیا واقعات معلوم ہیں۔ اور ان کے
سوانح کے ضروری اجزاء ہمارے ہاتھ میں کیا ہیں۔ پیدائش، جوانی میں ہجرت، شادی اور بڑھوت کے
واقعات معلوم ہیں۔ پھر چند لڑائیوں کے بعد بڑھاپے میں ۱۲۰ برس کی عمر میں ان کی وفات کی خبر ہے
اور بس۔ ان واقعات کو حوالے دیجئے یہ تو شخصی حالات ہیں جو ہر شخص کی زندگی میں الگ الگ پیش
آتے ہیں۔ انسان کو اپنی سوانحی کے عملی نمونہ کے لیے جن اجزاء کی ضرورت ہے وہ اخلاق و عادات
اور زندگی گانی کے طور پر لیتے ہیں اور یہی اجزاء حضرت موسیٰ کی ترجمان سوانح عمری سے گم ہیں۔ ورنہ
عام جہزی حالات یعنی اشخاص کے نام و نسب، مقامات کے پتے، مردم شماریاں اور قانونی اقوال بہت
کچھ قوت میں مذکور ہیں۔ مگر یہ معلومات خواہ جغرافیہ، نسب ناموں اور قانون دانی کے لیے کسی قدر
ضروری کیوں نہ ہوں مگر عملی حیثیت سے بالکل بے کار اور اجزائے سوانح کی کابلیت سے محروم ہیں۔
اسلام سے قرب الہمد پیغمبر حضرت عیسیٰ ہیں جن کے پیرو آج یورپ میں مردم شماری کے مطابق
تمام دوسرے مذاہب کے پیروؤں سے زیادہ ہیں۔ مگر یہ سن کر آپ کو حیرت ہوگی کہ اسی مذہب کے
پیغمبر کی زندگی کے اجزاء تمام دوسرے مذاہب کے بانیوں اور پیغمبروں کے سوانح سے سب کم معلوم
ہیں۔ آج عیسائی یورپ کے تاریخی ذوق کا یہ حال ہے کہ وہ بائبل، اسیریا، عرب، دشنام، مصر و افریقہ،
ہندوستان و ترکستان کے ہزار ہا برس کے واقعات کتابوں اور نقیوں کو پڑھ کر اور کندھروں اور پھاڑوں
اور زمین کے طبقوں کو کھود کر منظر عام پر لا رہا ہے اور دنیا کی تاریخ کے گم شدہ اوراق ازمیر و ترتیب

ہے۔ رہا ہے مگر اس کا سہیلی بھروسہ جس چیز کو زندہ نہیں کر سکتا وہ خود حضرت عیسیٰ کی زندگی کے دفن واقعہ ہیں۔ پروفیسر انبان نے کیا ذکر کیا مگر حضرت عیسیٰ کی زندگی ۳۲ برس کی تھی۔ مروجہ اہلبیوں کی روایتیں اذلاً قریباً معتبر ہیں اور جو کچھ ہیں وہ صرف ان کے آخری تین سالوں کی زندگی پر مشتمل ہیں۔ ہم کو ان کی تاریخ زندگی کے صرف یہ تحفے معلوم ہیں کہ وہ پیدا ہوئے اور میدان کشی کے بعد مصر لائے گئے۔ ترکیب میں ایک دو سو سو دھکائے، اس کے بعد وہ غائب ہو جاتے ہیں اور پھر یکایک تیس برس کی عمر میں پتھر پڑتے ہیں اور پھاڑوں اور دیواروں کے کناروں پر لٹے ہوئے نظر آتے ہیں چند شاگرد پیدا ہوتے ہیں۔ یہودیوں سے چند مناظرے ہوتے ہیں۔ یہودی ان کو پکڑ دیتے ہیں اوری گورنر کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوتا ہے اور پھانسی پڑھائی ہے۔ تیسویں دن ان کی قبر ان کی لاش سے خالی نظر آتی ہے۔ تیس برس اور کم از کم پچیس برس کا زمانہ کہاں گزرا اور کیوں گزرنا۔ دنیا اس سے ناواقف ہے اور سچے گی ان تین آخری برسوں کے واقعات میں بھی کیا ہے؟ ملاحظہ چند مجرے اور پھر سولی۔

حضور کے نور ہونے کی تیسری وجہ

کسی شخصیت کے نور ہونے کے لیے تیسری ضروری شرط حاجت ہے۔ حاجت سے مقصود یہ ہے کہ مختلف طبقات انسانی کو اپنی ہدایت اور روشنی کے لیے جن نوروں کی ضرورت ہوتی ہے یا ہر فرد انسان کو اپنے مختلف تعلقات و روابط اور فرائض و واجبات کو ادا کرنے کے لیے جن مثالوں اور نمونوں کی حاجت ہوتی ہے وہ سب اس آئینہ کی زندگی کے آئینے میں موجود ہوں۔ اس نقطہ نظر سے ہم دیکھتے تو معلوم ہوگا کہ سوائے خاتم الانبیاء علیہ السلام کے کوئی دوسری شخصیت اس معیار پر پوری نہیں اترتی۔ دین کیسے؟ خدا اور بندوں اور باہم بندوں کے جو فرائض و واجبات ہیں۔ ان کو تسلیم کرنا ادا کرنا، دوسرے غفلتوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی کہاؤں کا نام دین ہے، اس لیے ہر دین کے پیروؤں کا فرض ہے کہ وہ اپنے اپنے پیغمبروں اور انبیوں کی بیوقوفی میں ان حقوق و فرائض اور واجبات کی تفصیلات تلاش کریں اور ان کے مطابق اپنی زندگی کو اس قالب میں ڈھالنے کی کوشش کریں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں حیثیتوں سے جب آپ تفصیلات دھونڈیں گے تو وہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا آپ کو کہیں نہیں ملیں گی۔ مذہب دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن میں خدا کو تو تسلیم ہی نہیں کیا گیا ہے جیسے دھرم اور

چس کے متعلق کہا جاتا ہے اس لیے ان مذاہب میں خدا اور اس کی ذات و صفات اور دیگر حقوق الہی کا پتر ہی نہیں ادا اس لیے ان کے بانیوں میں محبت الہی، غلو، توحید پرستی وغیرہ کی تلاش ہی بیکار ہے۔ دوسرے وہ مذاہب ہیں جنہوں نے خدا کو کسی نہ کسی رنگ میں تسلیم کیا ہے۔ ان مذاہب کے انبیاء اور بانیوں کی زندگیوں میں بھی خدا طلبی کے واقعات منعقد ہیں۔ اللہ سبحانہ کے بارے میں جیسے عقائد رکھ کر ادا ان کے کیلئے تھے اور ان عقائد پر ان کو کس حد تک عملاً یقین تھا اس کی تفصیل سے ان کی زندگیاں بالکل خالی ہیں۔ پوری تواریث پرچہ حاد، خدا کی توحید اور اس کے احکام اور قربانی کے شرائط کے علاوہ تواریث کی پانچ کتابوں میں کوئی ایسا فقرہ نہیں ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ حضرت موسیٰ کے تعلقات قلبی اور طاعت و عبادت اور خدا پر توکل و یقین، خدا کے صفات کا مدد الہیہ کی جلوہ گری ان کے قلب اقدس میں کہاں تک تھی۔ حالانکہ اگر موسیٰ مذہب ہمیشہ کے لیے اور آخری مذہب کے طور پر آیا ہوتا تو اس کے پیروؤں کا فرض تھا کہ وہ ان واقعات کو قید تحریر میں لائے۔ مگر اللہ سبحانہ کی مصلحت یہ نہ تھی اس لیے ان سے یہ کام نہ ہو سکا۔

حضرت عیسیٰ کی زندگی کا امینہ انجیل ہے۔ انجیل میں ایک مسئلہ کے علاوہ کہ خدا حضرت عیسیٰ کا باپ تھا ہم کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس دنیاوی زندگی میں اس مقدس باپ اور بیٹے میں کیا تعلقات تھے۔ بیٹے کے اقرار سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ باپ کو بیٹے سے بڑی محبت تھی مگر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ بیٹے کو باپ سے کس قدر محبت تھی۔ وہ کہاں تک اپنے باپ کی اطاعت کرتا تھا۔ وہ اس کے آگے کبھی شب دروز میں جھکتا بھی تھا، اور آج کی روٹی کے علاوہ کوئی اہل پذیر بھی کبھی اس سے مانگے ہیں۔ مگر فحاشی کی رات سے پہلے کوئی ایک رات بھی اس پر ایسی گزری کہ وہ باپ کے حضور میں دعا مانگ رہا ہو۔ پھر ایسی سیرت سے ہم روحانی حیثیت سے کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟ اگر حضرت عیسیٰ کی سیرت میں خدا اور بندے کے تعلقات واضح ہوتے تو سارے تین سو برس کے بعد پہلے عیسائی بادشاہ کو مسیح میں تین سو عیسائی عکاسی مجلس اس کے لیٹے کے لیے فراہم کر دینی پڑتی اور وہ اب تک ایک ناقابل فہم راز نہ بنے ہوتے۔ اب حقوق عباد کو لیٹے تو اس سے بھی حضرت خاتم النبیین کے سوا تمام دیگر انبیاء اور بانیان مذاہب کی سیرتیں خالی ہیں۔

حضرت موسیٰ کی زندگی کا ایک ہی پہلو منہایت واضح ہے اور وہ جنگ اور سپہ سالاری کا پہلو ہے، ورنہ اس کے علاوہ ان کی سیرت کی پیروی کرنے والوں کے لیے دنیوی

حقوق و واجبات فرائض اور فرائضوں کا کوئی فرد موجود نہیں ہے۔ میان بیوی باپ بیٹے بھائی بہن، دوست و احباب کے متعلق ان کا کیا طرز عمل تھا۔ صلح کے فرائض میں ان کا کیا دستور تھا۔ اپنے والد دولت کو کن منید کاموں میں انہوں نے لگایا۔ بیماروں، یتیموں، مسکینوں اور غریبوں کے ساتھ ان کا برتاؤ کیا تھا اور ان کے مٹنے والے ان امور میں ان کی زندگی کی مثالوں سے کیوں کر فائدہ اٹھائی، حضرت موسیٰ بیوی نکھتے تھے، بچے نکھتے تھے، بھائی نکھتے تھے، دوسرے اعزہ اور متعلقین نکھتے تھے اور بھانا اچھا ہے کہ ان کا پیغمبر طرز عمل بلاشبہ ہر حرف گیری سے پاک ہو گا مگر ان کی موجودہ سیرت کی کتابوں میں ہم کو اب البواب نہیں ملے جو ہمارے لیے قابلِ تقلید اور نمونہ ہوں۔

حضرت عیسیٰ کی ماں حنین اور انجیل کے بیان کے مطابق ان کے بھائی بہن بھی تھے مگر ان کی زندگی کے واقعات ان عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ ان کا تعلق، طرز عمل، سلوک اور برتاؤ نہیں ظاہر کرتے۔ حالانکہ دنیا ہمیشہ انہی تعلقات سے آباد رہی ہے اور رہے گی۔ مذہب کا بڑا حصہ انہی کی متعلقہ فرائضوں کے ادا کرنے کا نام ہے۔ علاوہ ازیں حضرت عیسیٰ نے مملکت کی زندگی بسر کی اس لیے ان کی سیرت تمام ممالک فرائض کی مثالوں سے خالی ہے۔ وہ تباہی یعنی بیوی بہنوں والے تھے اس لیے میان بیوی کے لیے حضرت عیسیٰ کی زندگی میں تقلید کا کوئی سامان نہیں ہے اور چونکہ دنیا کی بیشتر آبادی متاثرانہ زندگی رکھتی ہے اس لیے اس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا کے بیشتر حصہ آبادی کے لیے ان کی سیرت نمونہ نہیں بن سکتی، جس نے گھرا، اہل و عیال، مال و دولت، صلح و جنگ، دشمن اور دشمن کے تعلقات سے کبھی واسطہ نہ رکھا ہو وہ اس دنیا کے لیے جو ان کی تعلقات سے محروم کیوں کر مثال ہو سکتا ہے۔ اگر آج دنیا یہ زندگی اختیار کرے تو کل وہ سنسان قبرستان بن جاتے، تمام قریاں و فتنہ رک جائیں اور یوں تو شاید ایک منٹ بھی زندہ نہ رہے۔

حضور اقدس کے نور ہونے کی چوتھی وجہ

زندگی کے نور ہونے کا سب سے آخری سیار علیت ہے۔ علیت سے مقصود یہ ہے کہ شارع دین اور بانی مذہب جن تعلیم کو پیش کر رہا ہے خود اس کا ذاتی عمل اس کی مثال اور نمونہ ہو اور خود اس کے عمل نے اس کی تعلیم کو عملی یعنی قابل عمل ثابت کیا ہو۔

خوش کن سے خوش کن فلسفہ، دلچسپ سے دلچسپ نظریہ اور خوش آئند سے خوش آئند اقوال ہر شخص ہر وقت پیش کر سکتا ہے لیکن جو چیز ہر شخص ہر وقت پیش نہیں کر سکتا وہ عمل ہے۔

انسانی سیرت کے بہتر اور کامل ہونے کی دلیل اس کے نیک اور معصوم اقوال، خیالات اور اخلاقی نفسانیت
نظر سے نہیں بلکہ اس کے اعمال اور کارنامے ہیں۔ اگر یہ معیار قائم نہ کیا جلتے تو اچھے اور بُرے کی
تیز آنکھ جلتے اور دنیا صرف بات بنانے والوں کا مسکن رہ جاتے۔ بتائیے کہ آج لاکھوں بانیان
مناہب میں سے کس کی زندگی کو آپ اس ترازو پر تول سکتے ہیں؟ یہ نصیحتیں پڑھیے۔

تو اپنے خداوند خدا کو اپنی ساری ممان و مال سے پیار کر تو دشمن کو پیار کر، جو تیرے دہشتے گال
پر تپش رہے تو اس کے سامنے اپنا بیاں گال کر دے۔ جو تجھ کو ایک میل بیگاڑے جلتے تو اس کے
سامنے دو میل جا۔ جو تیرا کوٹ لٹکے تو اس کو کرتا بھی دے دے۔ تو اپنے تمام مال و اسباب کو خدا کی راہ
میں دے دے، تو اپنے بھائی کو ستر بار معاف کر۔ آسمان کی بادشاہت میں دو لقمہ کا داخل ہونا مشکل ہے
یہ اور اسی قسم کی نصیحتیں نہایت دل خوش کن ہیں مگر عمل سے ان کی تصدیق چھو تو وہ سیرت
کا ٹکڑا نہیں بلکہ معصومانہ شیریں بیانی کا شاہکار ہیں، جس نے اپنے دشمن پر قابو نہ پایا ہو وہ عفو
کی عملی مثال کیسے پیش کر سکتا ہے، جس کے پاس خود کچھ نہ ہو وہ غریبوں اور مسکینوں اور یتیموں کی
مدد کیوں کر کر سکتا ہے۔ جو عزیز و اقارب، بیوی بچے نہ رکھتا ہو وہ ان ہی تعلقات سے دنیا کے
لیے فائدہ کیوں کر بن سکتا ہے۔ جس نے بیماروں کی تیمارداری اور عیادت نہ کی ہو وہ اس کا وعظ کیوں
کر کر سکتا ہے جس کو خود دو مردوں کے معاف کرنے کا موقع نہ ملا ہو اس کی زندگی ہم میں سے
غضب ناک اور عصہ والوں کے لیے اسوہ کیوں کر بنے گی۔

نیکیاں دو قسم کی ہوتی ہیں ایک سلبی اور ایک ایجابی مثلاً آپ پہاڑ کے ایک غار میں جا کر
عرصہ کے لیے بیٹھ گئے تو صرف یہ کہنا صحیح ہوگا کہ بدلیوں اور برائیوں سے آپ نے پرہیز کیا۔ یعنی آپ
نے کوئی کام ایسا نہیں کیا جو آپ کے لیے قابلِ اعتراض ہو مگر یہ تو سلبی تعریف ہوتی۔ ایجابی پہلو آپ
کا کیا ہے، کیا اپنے غریبوں کی مدد کی، محتاجوں کو کھانا کھلایا، کمزوروں کی حمایت کی، ظالموں کے مقابلے
میں حق گوئی سے کام لیا، مگر توں کو سنبھالا، مگر اہل کو راستہ دکھایا۔ معنوی و کرم، سخا، ممان، نازی،
حق گوئی، رحم، حق کی نصرت کے لیے جوش، جدوجہد، مہم جوئی، اولیٰ فیض، ذوقِ دلیوں کی بجا آوری
غرض تمام وہ اخلاق جن کا تعلق عمل سے ہے۔ صرف سلبی فعل اور عدمِ عمل سے نیکیاں نہیں
بن جائیں گی۔ نیکیاں صرف سلبی پہلو ہی نہیں رکھتیں۔ زیادہ تر ایجابی اور عملی پہلو پر ان کا مدار ہوتا
ہے۔ اس تقریر سے ظاہر ہوگا کہ جس زندگی کا عملی حصہ سامنے نہ ہو اس کو نہ نور، کا خطاب نہیں
دیا جاسکتا نہ انسان زندگی کی مختلف شاخوں میں اس سے کہیں کر روشنی حاصل کئے گا۔ ہمیں تو

میل و جنگ، غزو و دولت، ازدواج و بقرہ، تعلقات خداوندی، تعلقات عباد، حاکمیت و مکر مین، سکون و غضب، جہوت و خلوت غرض زندگی کے ہر پہلو کے متعلق عملی مثال چاہیے۔ دنیا کا مینتر بلکہ تمام تر حصہ ان ہی مشکلات اور تعلقات میں الجھا ہوا ہے۔ اس لیے انسانیت کو ان ہی مشکلات کے حل کرنے امداد ان ہی تعلقات کو بوجہ امن انجام لینے کے لیے عملی مثالوں کی ضرورت ہے۔ اس معیار پر بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کوئی دوسری زندگی پروری نہیں اترتی۔ ہر حال کہنا چاہتا ہوں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اس آیت میں قرآن اس لیے کہا گیا ہے کہ آپ کی زندگی سے نقشہ میں جاری باتیں پائی جاتی ہیں، تائید کینت، جامعیت، کاملیت اور عملیت اور دوسرے انبیاء کی زندگیوں ان خصوصیات سے خالی تھیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی سیرتیں جو ان کے بعد عام انسانوں تک پہنچیں یا آج موجود ہیں وہ ان خصوصیات سے خالی ہیں اسی لیے آپ کی نورانیت کو بتانے کے لیے قرآن نے خاص طور پر اہل کتاب کو مخاطب کیا ہے۔ اور ایسا ہونا مصلحتِ الہی کے مطابق تھا، تاکہ یہ ثابت ہو سکے کہ وہ انبیاء محدود زمانہ اور متعین قوموں کے لیے تھے اس لیے ان کی سیرتوں کو دوسری قوموں اور آئندہ تک محفوظ رکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام دنیا کی قوموں کے لیے اور قیامت تک کے لیے نمونہ بن کر بھیجے گئے تھے اس لیے آپ کی زندگی کو ہر حیثیت سے مکمل جامع، دائمی اور ہمیشہ رہنے کی ضرورت تھی اور یہی نور ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ آپ کی ذات علم و عمل کا مجموعہ ہے۔ آپ کا عمل نور ہے اور آپ کا علم کتاب میں ہے۔ آپ کا علم انسان کو اگر ذہنی تاریکیوں سے نکالتا ہے تو آپ کی سیرت زندگی کے لیے عمل کی صیح شاہراہ جنین کرتی ہے۔ اس وجہ سے آپ کی سیرت نور ہے اور آپ کا علم کتاب میں ہے اہل کتاب کو اللہ سبحانہ نے جو روشنی عطا فرمائی تھی اس کو خارج کر کے وہ تاریکیوں میں گھر گئے تھے اصل حقیقت گم تھی اور شاہراہ ناپید ہے۔

نبوت کے علم و عمل کا مقصد

۶۴۔ اللہ اس کے ذریعے ان لوگوں پر جو خدا کی خوشنودی کے پروکار ہوں سلامتی کی راہیں سکھاتا ہے اور ان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے اور ان کو سیدھی راہ پر لگاتا ہے۔

سلامتی کی راہوں سے مراد غلط معنی، غلط اندیشی اور غلط کاری سے بچنا اور اس کے نتائج سے محفوظ رہنا ہے جو شخص نبوت کے لئے جہتے علم و عمل سے مدد شنی حاصل کر رہا ہے اسے محروم و محروم کے برابر معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کس طرح ان غلطیوں سے محفوظ ہے۔ یہ گویا نبوت کے علم و عمل کا مستند ثابت کیا گیا ہے کہ نبوت کا علم و عمل اس لیے آیا ہے کہ اگر تم سے اسے اپنا یا تو یہ تم کو اس میں و سلامتی کی راہ پر لگاتے گا اور تار یکے تک نکال کر روشنی میں، کی روشی اور ضلالت کی وادیوں سے نکال کر اللہ کی طرف مستقیم پر چلائے گا۔ بشرطیکہ تم خدا کی خوشنودی کے طالب ہو اور اپنے تعقیبات کی پٹیاں اپنی آنکھوں سے کھول کر اس روشنی کو دیکھو اور اس کی قدر کرو۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جن میں رہتا الہی کی جستجو نہ ہو بلکہ وہ اپنی خواہشات کے پرستار بنے رہیں اس کے لیے توفیق کا دواوازہ نہیں کھلتا۔

باذنہ کے لفظ سے اسی قانون کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی یہ سادت خدا کے اذن سے حاصل ہوتی ہے اور یہ اذن ان کے لیے ہو رہا ہے جن کے اندر رضا کے الہی کی جستجو ہو رہی ہو لانا اشرف علی درجے ہیں کہ اصل مقصود طلبِ رضا ہے دخولِ جنت اس کے تابع ہے۔ اس آیت نے یہ بات کھول دی ہے کہ ہر قسم کی سلامتی کی راہیں کھلنے کی بنیادی شرط نبوت کے علم و عمل سے وابستگی ہے فکری بھی اور عملی بھی۔ مطلب یہ ہے کہ نبوت کے علم و عمل پر ایمان اطاعت کے بغیر صرف آخرت ہی میں جنت نہیں دنیا میں بھی سلامتی کی راہیں انہیں کھلتی ہیں۔ یہ ضابطہ افراد ہر جن یا جماعت سب کے لیے ہے کوئی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ افراد کو بھی اپنی انفرادی زندگیوں کی دینی فلاح خدا امن و سکون، عزت و محبوبیت اور ضروریاتِ زندگی وغیرہ اسی وقت ملے گی جب وہ اپنی حد تک ایسے خدا شناس، آخرت پسند اور رضا کے الہی کے طالب ہوں جیسا کہ ایک مسلمان کو ہونا چاہیے نبی کریم صلی اللہ علیہ السلام نے اسی حقیقت کی وضاحت کی تھی جب آپ نے یہ فرمایا تھا:

جس نے اپنی کل کی فکر ایک ہی فکر، اپنی آخرت کی فکر، کو اپنا لیا، اللہ تعالیٰ اس کی دنیا کا انتظام کر دینے کے لیے کافی ہے۔ اور جس کے ذہن کو بے شمار افکار، دنیا کے افکار و معاملات، نے منتشر کر رکھا ہو، اللہ کو اس کی کوئی پروا نہیں کہ وہ اس دنیا کی کس گھاٹی میں ہلاک ہو رہتا ہے۔

(مشکوٰۃ بحوالہ ابن ماجہ)

ایک اور ارشاد نبوی پوری مراجعت کے ساتھ کہتا ہے کہ ،
جو شخص آخرت کو اپنا مقصود بنا لیتا ہے ، اللہ تعالیٰ اس کے معاملات کو
درست کر دیتا ہے اور اس کے دل کو غنی بنا دیتا ہے (اصول تالیف فرما رہا ہے کہ اس کے
محفوظ کھڑی ہوتی ہے ۔

اسی طرح اُمت کو بھی اپنی اجتماعی زندگی کی فلاح اور اس میں سلامتی کی راہیں اسی وقت بتا
اُسکتی ہیں جب وہ اپنی اجتماعی حیثیت میں فی الواقع رمضان المبارک کی طالب ہو۔ یعنی ایک طرف
تو اس کی ترکیب ایسے افراد سے ہو جو نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل سے وابستہ ہوں۔ دوسری طرف
اس میں وہ مضبوط اجتماعی تنظیم ہو جس کے بغیر کوئی جماعت جماعت نہیں ہو سکتی ہے ۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ
 قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ أَنْ يُهْلِكَ
 الْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَآمَنَهُ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا
 اللَّهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا يَخْلُقُ مَا
 يَشَاءُ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ وَقَالَتِ الْيَهُودُ
 وَالنَّصَارَى نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ
 بِذُنُوبِكُمْ بَلْ أَنْتُمْ بَشَرٌ مِمَّنْ خَلَقَ يَغْفِرُ لِمَنْ
 يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ
 وَمَا بَيْنَهُمَا وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا
 يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلَى فَتْرَةٍ مِنَ الرُّسُلِ أَنْ تَقُولُوا مَا جَاءَنَا
 مِنْ بَشِيرٍ وَلَا نَذِيرٍ فَقَدْ جَاءَكُمْ بَشِيرٌ وَنَذِيرٌ
 وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ



بلاشبہ ان لوگوں نے کفر کیا جنہوں نے کہا کہ اللہ مریم کا بیٹا مسیح
 ہے۔ تم ان لوگوں سے کہہ دو اگر خدا مسیح ابن مریم کو اور اس

کی مال کو اور روئے زمین پر جتنے انسان ہیں سب کو ہلاک کر دینا چاہیے
 تو کون ہے جو اس کی پادشاہی میں دخل دینے کی جرأت کرے۔
 آسمان و زمین کی اور جو کچھ ان میں ہے سب کی سلطانی اللہ ہی
 کے لیے ہے جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور ہر چیز پر قدرت
 رکھنے والا ہے۔ اور یہودی اور عیسائی کہتے ہیں کہ ہم خدا کے بیٹے
 اور اس کے پیارے ہیں۔ آپ فرمائیے کہ بتاؤ پھر اللہ تم کو
 تمہارے گناہوں کی پاداش میں عذاب کیوں دیتا رہا ہے، بلکہ
 واقعہ یہ ہے کہ اس کے پیدا کیے ہوئے انسانوں میں سے تم بھی انسان
 ہو۔ اللہ جسے چاہتا ہے بخش دے جسے چاہے عذاب دے، آسمانوں
 کی زمین کی اور اس سب کی جو ان کے درمیان ہیں مالکی و سلطانی
 صرف اسی کے لیے ہے اور سب کو بالآخر اسی کی طرف لوٹنا
 ہے۔ اے اہل کتاب ایسی حالت میں کہ رسولوں کا ظہور مدتوں

سے بند تھا ہمارا رسول تمہارے پاس آیا وہ تمہارے سامنے احکام
کسول کبریٰ بیان کر رہا ہے تاکہ تم یہ نہ کہو کہ ہماری طرف کوئی رسول
نہیں بھیجا گیا نہ بشارت دینے والا اور نہ ڈرانے والا تو اب دیکھو
بشارت دینے والا اور متنبہ کرنے والا تمہارے پاس آگیا ہے
اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔^{۴۲}

توحید کے متعلق غلط فہمیاں

اللہ سبحانہ کو، اللہ کی صفات کو، خدا اور بندوں کے باہمی تعلق کو واضح کرنے کے لیے خیالی یا مادی تشبیہیں
اور تمثیلیں مذاہب میں خوش اعتمادی کی پیداوار ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اصل خدا تو جتنا بڑا اور اس کی
جگہ پر تشبیہیں اور تمثیلیں رہ جتنیں اللہ سبحانہ کو اپنے بندوں کے ساتھ جو لطف و کرم اور محبت و پیار ہے
اس کو تشبیہ و تمثیل کے رنگ میں ادا کر کے مجسم کر دیا گیا۔ اربعین قومن میں چونکہ عورت محبت کی دہی
ہے اس لیے خدا اور بندے کے تعلق کو ماں اور بیٹے کے تعلق سے ادا کیا گیا اور اس لیے خدا ماما کی
شکل میں آگیا۔ بعض دوسرے ہندو فرقوں میں اس بے کیف محبت کو زن و شوہر یا بیوی کے
انصاف میں ظاہر کیا گیا۔ سدا ساگ فقیروں نے ساڑھی اور چوڑی پہن کر اسی حقیقت کو نمایاں کیا ہے
رومیوں اور لڑائیوں میں بھی عورت ہی کی شکل میں خدا ظاہر ہوا ہے۔ سامی قوموں میں عورت کا برہما
ذکر تہذیب کے خلاف ہے اس لیے خاندان کی اصل بنیاد باپ کو قرار دیا گیا ہے۔ اس طرح بائبل
اسیریا اور شام کے کھنڈروں میں خدام کی صورت میں جلوہ نما ہوا ہے۔ بنی اسرائیل کے
ابتدائی تخیل میں خدا باپ اور تمام فرشتے اور انسان اس کی اولاد قرار دیے گئے ہیں۔ بعد کو خدا
کی اولاد صرف بنی اسرائیل قرار پاتی ہے۔ بنی اسرائیل کے کچھ صحیفوں میں عورت و مرد کا تخیل بھی

خدا اور بنی اسرائیل کے درمیان نظر آتا ہے یہاں تک کہ بنی اسرائیل اور یروشلم یسوی فرض کیے جاتے ہیں اور خدا شرمہ بنتا ہے۔ عیسائیوں میں باپ اور بیٹے کی تمثیل نے اصلیت اور حقیقت کی جگہ لے لی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے لیے مسیح کی حقیقت ایک معجزہ بن کر رہ گئی ہے ان کے علماء غلط فہمی اور فاسد فہم کی مدد سے حل کرنے کی جتنی کوشش کی اتنے ہی زیادہ اُبلتے گئے۔ ان میں سے جس کے ذہن پر ان رب شخصیت کے جزو انسانی نے غلبہ کیا اس نے مسیح کو ابن اللہ ہونے اور تین مستقل خداؤں میں سے ایک رہنے پر زور دیا اور جس کے ذہن پر جزو الوہیت کا اثر زیادہ غالب ہوا اس نے مسیح کو اللہ تعالیٰ کا جسمانی ظہور قرار دے کر عین اللہ بنا دیا اور اللہ ہونے کی حیثیت سے ہی مسیح کی عبادت کی یہ بھی عیسائیوں کے نقص عمدہ کی ایک مثال ہے کہ انہوں نے تمام عہد و میثاق کی جو بھر ہے یعنی تو خدا کی پرکھنا مار دیا ہے اور اللہ سبحانہ کی جگہ مسیح ابن مریم کو خدا بنا بیٹھے۔ قرآن اس آیت میں اس غلط فہمی اور تشکیلی طریقہ کو ایک قلم موقوف کر رہا ہے اور اس کے استعمال کو کفر قرار دے رہا ہے۔

۶۵۔ بلاشبہ ان لوگوں نے کفر کیا جنہوں نے کہا کہ اللہ مریم کا بیٹا مسیح ہے۔ یعنی مسیح کے علاوہ خدا کوئی اور چیز نہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ عقیدہ نصاریٰ میں سے فرقہ بیسویہ کا ہے جن کے نزدیک مسیح کے قالب میں خدا حلول کیے ہوئے ہے معاذ اللہ یا یوں کہا جائے کہ جب نصاریٰ حضرت مسیح کی نسبت الوہیت کے قائل ہیں اور ساتھ ہی توحید کا بھی زبان سے اقرار کرتے ہیں یعنی خدا ایک ہی ہے تو ان دونوں دعویٰ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک مسیح کے سوا کوئی خدا نہ ہو، مہر حال کوئی موت لی جاتے اس عقیدے کے کفر صریح ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے یہ قاضی بیضادی اور امام رازی کی رائے میں یہ عیسائیوں کے عقیدہ حلول و استداد کا لازم ہے۔ کیونکہ موجودہ مسیحیت جس کا پانی پال ہے اصلاً تو حلول و استداد کے اعتماد پر مبنی ہے۔ یہی پال کے نزدیک مسیح کی شکل میں خدا ہی نے ظہور کیا ہے لیکن بعض اعتراضات سے بچنے کے لیے اس کو اس نے اس چستان کی شکل میں پیش کیا ہے جس کو تثلیث کہتے ہیں۔ گو یا حلول اس عقیدے کی روح ہے اور تثلیث اس کی تعبیر۔ قرآن نے کہیں اس گمراہی کی روح کو واضح کیا ہے کہیں اس کی معروف تعبیر اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پال کا اصل مقصود مسیح کو خدا ثابت کرنا تھا اس کے لیے اس نے حضرت مسیح کی خارق عادت و ولادت اور ان کے کلمہ اللہ اور روح اللہ ہونے سے مواد فراہم کیا لیکن

انجیلوں میں چونکہ باپ اور روح القدس کا بھی ذکر تھا۔ اس وجہ سے اسے یہ محنت کرنی پڑی کہ الہیت کے مسئلہ کا حل کرنے کے لیے کوئی ایسی تعبیر اختیار کرے کہ ان سب کے لیے اس میں کوئی نہ کوئی جگہ نکل آئے۔ لیکن یہ ساما گورکھ دھند اتو بس چند بال کی کمال ادھیڑنے والوں کے ذہن میں یا چند ہیستان قسم کی کتابوں کے اندر بند رہتا ہے۔ عام ذہن تو غلامہ پسند کرتا ہے وہ ان موٹنگائیوں میں کہاں پڑتا ہے چنانچہ غلام نے اس مسئلے افسانے میں سے صرف اتنی چیز لپٹنے ذہن میں راسخ کر لی کہ مسیح خدا ہیں۔ عقیدہ امتحانیا بیس برکتھو کاک پرولٹسٹٹ وغیرہ سب مشہور و مقبول فرقوں میں مشترک ہے اس میں یہ الفاظ مراحمہ موجود ہیں۔

باپ بیٹے اور روح القدس کی الہیت ایک ہی ہے جلال برابر عظمت ازلی برابر عیسا باپ ہے ویسا ہی بیٹا۔ باپ غیر مخلوق بیٹا غیر مخلوق۔ باپ غیر مدود بیٹا غیر مدود۔ باپ ازلی بیٹا ازلی۔ یونہی باپ قادر مطلق بیٹا قادر مطلق۔ ویسا ہی باپ خدا بیٹا خدا۔

الشہرستانی نے الملل والنحل میں عیسائی فرقوں کے تذکرے میں لکھا ہے کہ ان میں سے یعقوبیہ بھی ہیں۔ ان کا عقیدہ آقا نیم خلاۃ کلا ہے لیکن آقا خدا ہے کہ گروشت اور خون کا لبادہ پہن کر بصورت مسیح الہ ابن گیا ہے ان کے پاسے میں قرآن نے لقد کف الذین قاتلوا میں خبر دی ہے لہذا کچھ کی رائے ہے کہ مسیح ہی اللہ ہے اور کچھ کہتے ہیں کہ لاہوت ناموس کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ امام مادودی نے اعلام النبوة میں لکھا ہے کہ عیسائیوں کے تین فرقوں میں سے نظریہ کا عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰ اللہ ہیں۔

اللہ کی قدرت کا ملہ اور اختیار ناطق

۶۶۔ تم ان لوگوں سے کہہ دو "اگر خدا مسیح ابن مریم کو اور اس کی ماں کو اور دوتے زمین پر جتنے انسان ہیں سب کو ہلاک کر دینا چاہے تو کون ہے جو اس کی پاؤں شاہی میں دخل لینے کی جرات کرے۔ یعنی اگر فرض کرو خدا نے قادر و قہار یہ چاہے کہ حضرت مسیح اور مریم اور اگلے پچھلے سب دوتے زمین پر بسنے والوں کو اکٹھا کر کے ایک دم میں ہلاک کر دے تو تم ہی بتاؤ کہ اس کا ہاتھ کون پکڑ سکتا ہے۔ یعنی ازلی وابد کے سائے انسان بھی اگر فرض کرو وجمع کر دیے جاتیں اور خدا ایک ان میں سب کو ہلاک کرنا چاہے تو سب کی اجتماعی قوت بھی خدا کے ارادے و تھوڑی

دیکھ کے یہ مٹری نہیں کر سکتی کیونکہ مخلوقات کی قدرت جو عطائی اور محدود ہے خدا کی ذاتی اور لامحدود قدرت کے مقابلہ میں عدم محض ہے، جن کا اعتراف خود وہ لوگ بھی کرتے ہیں جن کے رویہ پر خطاب کیا جا رہا ہے بلکہ خود مسیح بن مریم بھی جن کو یہ لوگ خدا بتاتے ہیں اس کے معترف ہیں چنانچہ مرقس کی انجیل میں حضرت مسیح کا یہ مقولہ موجود ہے۔

اے آپ ہر چیز زہری قدرت کے تحت میں ہے تو مجھ سے یہ موت کا پالہ ٹھانے اس طرح نہیں جو میں چاہتا ہوں بلکہ اس طرح جیسے تیرا ارادہ ہے۔

پس جب حضرت مسیح جن کو تم خدا کہتے ہو اور ان کی والدہ ماجدہ مریم صدیقہ جو تمہارے زعم میں خدا کی ماں ہوئیں وہ دونوں معنی تمام من فی الارض کے ساتھ مل کر خدا کی نشیت و ارادے کے سامنے عاجز و خستہ تو خود سوچ لو کہ ان کی بیان کی کسی اور مخلوق کی نسبت خدا کی کا دعویٰ کرنا کس قدر گستاخی اور شوخ چٹخی ہوگی۔ اُبت کی اس تقریر میں ہم نے ہلاک کو موت کے معنی میں لیا ہے مگر جمیعاً کے لفظ کی معنوی سی وضاحت کر دی جو مدلول لفظ جمیعاً کا ہم نے بیان کیا ہے وہ انگریز کی تصریحات کے عین مطابق ہے۔ اس کے سوا یہ بھی ممکن ہے کہ آیت میں ہلاک کے معنی موت کے زلیے جاتیں جیسا کہ راجب نے لکھا ہے کبھی ہلاک کے معنی کسی چیز کا مطلقاً نیست و نابود ہو جانا ہوتے ہیں مثلاً کلی شیئ ہالک الا وجہاً یعنی خدا کی ذات کے سوا ہر چیز ناپید ہونے والی ہے۔ اس معنی پر آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر خدا تعالیٰ قدر حضرت مسیح، ان کی والدہ ماجدہ تمام من فی الارض کو قطعاً نیست و نابود اور بالکل فنا کر ڈالنے کا ارادہ کرے تو کون ہے جو اس کے ارادے کو روک سکے گا۔

دوست سلطان ہرچہ خواہد آل کند

عالیٰ را در شے ویران کند

حضرت شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی جگہ نبیوں کے حق میں ایسی بات فرماتے ہیں تاکہ ان کی اُمت بندگان کی حد سے زیادہ نہ چڑھائے و لانی اس لائق کا ہے کہ جس کو ان کے مرتبہ عالی اور وجاہت حمد اللہ کا خیال کرتے ہوئے ایسا خطاب کیا جاتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کے ارادے میں کوئی چیز بھی رکاوٹ نہیں ہو سکتی ہے جیسے حضرت

ابراہیم نے اسی اختیارِ باطن اور قدرتِ کاملہ کی طرف اشارہ کیا ہے لاسْتَخْفَنَ لَكَ دُمَامُ مَلَكٍ
لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ۔ میں آپ کے لیے خدا سے مغفرت مانگوں گا لیکن میں آپ کے معاملہ
میں خدا کے کسی فیصلہ میں کوئی دخل نہیں رکھتا۔ اس آیت میں حضرت مسیح کو اللہ مسمود بنالے پرائے ہوئے
کے ۲۲ سے اظہارِ غضب ہے۔ مقصد یہ ہے کہ نادانوں پر کس قسم کی باتیں کرتے ہو، کیا مسیح کی ان کی
والہ اور کیا یہ ساری مخلوق، خدا سب سے بے نیاز اور مستغنی ہے، سب کو دہرہ داسی نے بھٹا ہے
اور اگر وہ ان سب کو فنا کر دینا چاہے تو کون ہے جو اس کا ہاتھ پکڑ سکے، آسمان و زمین اور جو
کچھ ان کے درمیان ہے سب خدا ہی کی ملکیت ہے۔ کوئی نہیں ہے جو اس میں اس کا شریک
ہو، وہ جو چاہے، جس طرح چاہے اور جتنی مقدار میں چاہے پیدا کرتا اور پیدا کر سکتا ہے، کسی
کا بن باپ کے پیدا ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہو جاتا کہ وہ خدا بن گیا یا خدائی میں شریک ہو گیا۔

کائنات میں سلطانِ اللہ کی ہے

۶۶۔ آسمان و زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب کی سلطانِ اللہ کے لیے ہے جو کچھ چاہتا ہے
پیدا کرتا اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے جو چاہے جس طرح چاہے مثلاً حضرت مسیح کو بغیر باپ
کے، حضرت حوا کو بغیر ماں کے اور حضرت آدم کو بغیر ماں اور باپ کے پیدا کر دیا اسے سب کچھ قدرت
ہے کسی کا زور اس کے سامنے نہیں چلتا۔

اس فقرے میں میں ایک لطیف اشارہ ہے اس طرف کہ محض مسیح کی اعجازی پیدائش اور ان
کے اخلاقی کمالات اور محسوس سہولت کو دیکھ کر جو لوگ اس دھوکہ میں پڑ گئے کہ مسیح ہی خدا ہے وہ حقیقت
نہایت نادان ہیں۔ مسیح تو اللہ کے بے شمار سماتِ تخلیق میں سے محض ایک نمونہ ہے جسے دیکھ کر ان
ضعیف البصر لوگوں کی نگاہیں چونہ صیا گئیں۔ اگر ان لوگوں کی نگاہ کچھ وسیع ہوتی تو انہیں نظر آتا کہ
اللہ نے اپنی تخلیق کے اس سے زیادہ حیرت انگیز نمونے پیش کیے ہیں اور اس کی قدرت کسی حد
کے اندر محدود نہیں ہے۔ یہ بڑی بددلتی ہے کہ مخلوق کے کمالات کو دیکھ کر اسی پر خالق ہونے
کا گمان کر لیا جائے۔ دانشمندانہ ہیں جو صاحبِ کمال کو دیکھ کر خالقِ کمال کی عظیم شانِ قدرت کے نشانات
دیکھتے ہیں اور ان سے ایمان کا ثور حاصل کرتے ہیں۔

لے افاداتِ شیخ الاسلام لے تفہیم القرآن

اہل کتاب کی نجات یا فتنہ ہونے کا غرور

۴۶۔ اور یہودی اور عیسائی کہتے ہیں کہ ہم خدا کے دیئے اور اس کے پیار سے ہیں۔ شاید بچنے کو بیٹے
یعنی اولاد اس لیے کہتے ہیں کہ ان کی بائبل میں خدا نے اسرائیل یعقوب علیہ السلام کی نسبت پہلوٹا بیٹا اور
اپنے کُٹس کا باپ کہا ہے۔ اور نصاریٰ حضرت مسیح علیہ السلام کو ابن اللہ مانتے ہیں تو اسرائیل کی اولاد
اور حضرت مسیح کی اُمت ہونے کی وجہ سے غالباً ابن اللہ کا لفظ اپنی نسبت استعمال کیا ہو گا اور یہی
ممکن ہے کہ یہاں کہنے سے مراد یہ ہو کہ ہم خدا کے خواص اور محبوب ہونے کی وجہ سے گویا اولاد ہی جیسے
ہیں۔ اس صورت میں ابن اللہ کا حاصل وہی ہو جائے گا جو لفظ احبار کا ہے۔ یہ مطلب یہ ہے کہ چونکہ
ہم خدا کے بیٹے اور پیارے ہیں اس لیے ہم عام نوع انسانی سے افضل و اشرف ہیں اور ہم جو کچھ چاہیں
کریں ہم اس لیے نجات ہی نجات ہے۔ اہل کتاب کا یہی زعم باطل تھا جس نے ان کو عبد اللہ کی ذریعہ
سے سب سے زیادہ بے پرواہ بنادیا تھا۔ انہوں نے گمان کیا کہ وہ خدا کے محبوبوں اور برگزیدوں کی اولاد
ہیں اس لیے عمل و اطاعت کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہیں۔ جنت ان کا پیدائشی حق ہے۔ دوزخ
میں اول تو وہ ڈالے نہیں جائیں گے اور اگر ڈالے بھی گئے تو بس یونہی چند دنوں کے لیے۔ اسی
لفظ کے اصل بانی تو یہود ہوتے ہیں لیکن آخر نصاریٰ ان کو جنت کا واحد اجارہ دار کہیں بنے بیٹے حضرت
مسیح نے یہودی تصور کی سختی اور تہماتی کی جگہ رحمت و شفقت کا تصور پیدا کرنے کے لیے خدا کا باپ
کے لفظ سے تعبیر کیا تھا اور اس بات پر زور دیا۔ مگر شریعت کے ظہور و رسوم کچھ سود مند نہیں
اگر دل میں نیکی اور محبت نہ ہو۔ عیسائیوں نے اس بات کو کچھ سے کچھ بنالیا اور کہنے لگے کہ نجات کے
لیے صرف یہی کافی ہے کہ کفارہ مسیح پر ایمان لے آئے اور سمجھ لے کہ خدا ہمارا باپ ہے۔ وہ کبھی اپنے
بیٹوں پر آسمان کی پادشاہت کا دروازہ بند نہیں کرے گا۔

آیت قرآنی میں سخن ہم سے مراد افراد نہیں بلکہ قوم ملت مجموعہ افراد مراد ہے۔ یعنی یہود
من حیث القوم اور نصاریٰ یکمیت ملت مراد ہیں۔ جو جودہ بائبل میں اس قسم کے حوالے موجود ہیں:
”خداوند نے یوں فرمایا ہے کہ اسرائیل میرا بیٹا بلکہ میرا پہلوٹا ہے۔“

(نور مج ۴ - ۶۴)

تم خداوند اپنے خدا کے فرزند ہو۔ (استثناسم - ۱)
جب اسرائیل لڑکھائی نے اس کو عزیز رکھا اور بیٹے کو مصر ملایا۔

(یروسیع ۱۱ - ۱)

جتنوں نے اسے قبول کیا، اس نے انہیں خدا کے فرزند بننے کا حق بخشا۔

(یوحنا - ۱ - ۱۲)

جتنے خدا کی روح کی ہدایت سے ملتے ہیں وہی خدا کے بیٹے ہیں۔

(رومیوں ۸ - ۱۴)

یہاں ابنا اللہ سے حقیقی صلیبی بیٹے مراد نہیں اور نہ یہ ان کے لازمی معنی ہیں۔ اس کے لیے عربی میں لفظ ولد بھی ہے۔ ابن کا اطلاق ہمازی سزبورے لڑکوں پر بھی ہوتا ہے اور عربی زبان میں ای کا ہمازی استعمال بہت زیادہ ہے۔ ابن عرب، ابن السبیل، ابن اللیل، ابن العلم، ابن یوم، وغیرہ اہل لغت نے لکھا ہے کہ اب، ابن، بنت یہ تین لفظ ایسے ہیں کہ بڑی کثرت سے چیزیں ان کی طرف منسوب ہیں، ازہری لغوی اور ابن العربی نے ایسے ناموں کی ایک طویل فہرست دی ہے جو عربی میں کسی کے ابن کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ مثلاً ابن الطین حضرت آدم کے لیے ابن اللیل چور کے لیے ابن القول بالقرنی کے لیے۔ بہر حال ان کے اس دعویٰ کا مطلب یہی ہے کہ ہم خاصانِ خدا ہیں سے ہیں۔ ہمارا اور عام لوگوں کا مقابلہ کیا۔ یعنی سب کے اوپری ذات والے اور خاص معرین حق میں ہیں۔ یہ ٹھیک درہی ذہنیت ہے جو ہندوستان کے برہمنوں میں پائی جاتی ہے کہ اپنے کو چندر بستی اور سورج بستی کہلاتے ہیں اور بڑے درد کی بات ہے کہ مسلمانوں کے اندر بھی پھر زاوگی، مشائخ زاوگی، مخدوم زاوگی کے گمنڈاں کچھ بہت زیادہ مختلف نہیں۔ اناللہ والی اللہ المستحسنى۔

یہودیوں کی تردید خود ان کی تاریخ سے

۶۹۔ آپ فرمائیے کہ بتا دھیرا تمہیں تمہارے گناہوں کی پاداش میں عذاب کیوں دیا دیا ہے۔ چونکہ کسی مخلوق کا حقیقہ ابن اللہ ہونا بالکل محال اور بدیہی البطلان ہے اور خدا کا محبوب بن جانا ممکن ہے عجب ہم دیکھو خدا قرآن میں ہے اس لیے اس جملہ میں اول محبوبیت پیار سے ہونے کے دعویٰ کا رد کیا گیا۔ یعنی جو قوم علانیہ بغاوتوں اور شدید ترین گناہوں کی بدولت یہاں بھی کئی طرح کی رسوائیوں اور عذاب میں گرفتار ہو چکی ہے۔ اور آخرت میں بھی جس دواہم کی سزا کا

عقلاً و نقلاً استحقاق رکھتی ہے۔ کیا ایسی باغی و عاصی قوم کی نسبت ایک لمحہ کے لیے بھی کرتی ذی شہرہ و خیال کر سکتا ہے کہ وہ خدا کی محبوب اور پیاری ہوگی خدا سے کسی کا نسبی رشتہ نہیں۔ اس کا پیارا اور اس کی محبت صرف اطاعت اور حسن عمل سے حاصل ہوتا ہے۔ ایسے کٹر مجرموں کو جو سخت سے سخت نازل کے مستحق اور موردِ بن بچے ہیں خیر مانا چاہیے کہ وہ بخیر ابتداء اللہ واحبہا کا دعویٰ کریں۔ حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کو باوجودیکہ ان کا صلی بیٹا تھا خدا نے فرمایا اِنَّہٗ یٰ اٰیِس مِّنْ اٰہِلِکَ اسْتَ عَمِلْ خَیْرًا مَّا لَیْکَ

در اصل یہ ان کے اس زعمِ باطل کی تمہید خود ان کی تاریخ سے کی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر خدا کے محبوب اور چہیتے ہونے کے سبب سے تم خدا کے مواخذے اور عذاب سے بری ہو تو تمہاری یہ مجربیت اور تمہارا یہ چہیتا پن اس دنیا میں تمہارے کچھ کام کیوں نہ آیا۔ یہاں تو تمہاری پوری تاریخ اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ جب تم نے خدا سے سرکشی کی ہے۔ اس نے تمہیں نہایت عبرت انگیز سزائیں بھی دی ہیں۔ ایسی عبرت انگیز کہ دنیا کی کسی قوم کی تاریخ میں ایسی سزاؤں کی مثال نہیں مل سکتی۔ پوری قوم کی غلامی، پوری قوم کی صحراوردی، پوری قوم کی جلا وطنی، متعدد بار پوری قوم کا قتل عام اور بیت المقدس کی عبرت انگیز تباہی، یہ سب واقعات خود تواریخ میں موجود ہیں۔ اگر ابراہیم و اسحاق کی اولاد ہونے کی وجہ سے تمہیں خدا کی جانب سے کوئی برأت نامہ حاصل ہے تو اس برأت نامہ نے تمہیں عذاب سے کیوں نہیں بچایا۔ بد اعمالی پر دینی سزاؤں کا ترتیب تو ایک کمال حقیقت ہے جس سے ان کو یاد آئے، انکار نہ تھا اور ان دینی سزاؤں سے عہدِ قسطن کے صحیفے بھرے پڑے ہیں۔ حضرت تھانوی کا یہ ارشاد یہاں بالکل بر عمل ہے کہ یہ برأت صراحتاً ان لوگوں کے خلاف جہلجہلی ہے جو اللہ کے ساتھ ایسے قرب کا دعویٰ کرتے ہیں جس میں معصیت پر بھی مواخذہ اور گرفت نہ ہو۔

قانون کی بالا دستی

۱۰۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس کے پیدا کیے ہوئے انسانوں میں سے تم بھی انسان ہی ہو۔ بشر اصل نعمت میں کمال کی اوپر کی سطح کو کہتے ہیں۔ متوہی سی مناسبت سے آدمی کو بشر کہنے لگے۔

لے افادست شیخ الاسلام

ثابت اس نکتہ کے یہاں اختیار کرنے میں یہ نکتہ ہو کہ تم کو خدا کا بیٹا اور پیارا تو رکنا نہ شریف اور مت زانی
میں نہیں کیا جاسکتا صرف بشر اور فیکل و صورت کے لحاظ سے خدا کے پیدا کیے ہوئے ایک معمولی
اُدھی کہلاتے جاسکتے ہو جن کی پیدائش بھی اسی ستارہ طریقہ سے ہوتی ہے جس طرح عام انسانوں کی ہوتی
ہے پھر جملہ انبیاء کا وہم کہاں راہ پاسکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں دین کا جو قانون سب کے لیے ہے
وہی تمہارے لیے بھی ہے جس طرح خدا کی ساری مخلوق ہے اسی طرح تم بھی اس کی مخلوق ہو اور جس
طرح سب کو خدا سے نسبت ایمان و عمل صالح کے توسط سے حاصل ہوتی ہے اسی طرح تمہیں بھی
اگر خدا سے نسبت حاصل ہوگی تو ایمان و عمل صالح ہی کے ذریعے حاصل ہوگی اور میں۔ اس آیت نے
یہ بات کھل دی ہے کہ نسب اور نسبت کے رشتے بے کار ہوتے ہیں۔ اگر ایمان و عمل کی نسبت
سے حدود و شرط نہ ہو تو قانون یہی ہے اور سب کے لیے ہے اور قانون کی طاقت ناقابل شکست ہے۔
کوئی بھی قانون سے بالاتر نہیں ہے۔ ایر و غریب اور خاص و عام کا یہاں کوئی امتیاز نہیں ہے
اوپر سے اور سچا شخص حتیٰ کہ نبی زادہ بھی قانون کا اسی طرح محکوم ہے جس طرح ایک عام آدمی
دنیا کی زندگی میں بھی یہی قانون ہے اور آخرت میں سب کا بھی یہی ضابطہ ہے۔ حضور انور صلی اللہ
علیہ وسلم کے یہ الفاظ قانون کی بالادستی کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے کہ ”اگر محمد کی بیٹی فاطمہ
بھی چردی کرتی تو خدا کی قسم میں اس کے بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔“

جرم و سزا اللہ ہی کے اختیار میں ہے

۱۔ اللہ جسے چاہتا ہے بخش دے جسے چاہے عذاب دے۔ انسانوں کی زمین کی اور اس
سب کی جہان کے درمیان میں مالکی و سلطانی صرف اسی کے لیے ہے اور سب کو بالآخر اسی کی
طرف لوٹنا ہے کیونکہ وہی جانتا ہے کہ کون بخشش کے لائق ہے اور کسے سزا دی جائے
جسے وہ اپنی رحمت و حکمت سے معاف کرنا چاہے یا عدل و انصاف سے سزا دینا چاہے اس
میں کون مزاحم ہو سکتا ہے نہ کسی مجرم کے لیے یہ گنجائش ہے کہ اس کے قلم و آسمان زمین سے
باہر نکل جائے اور نہ یہ کہ مرنے کے بعد دوسری زندگی میں کہیں اور بھاگ جائے۔
مطلب یہ ہے کہ مغفرت اور عذاب اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ وہ جن کو مغفرت کا مستحق

پائے گا ان کی مغفرت فرمائے گا جن کو سزا کا مستحق پائے گا ان کو سزا دے گا۔ اگر کسی نے بڑوں سے خاندانی نسبت یا ان کی مہربان شفاعتوں پر مجروحہ کہہ کے خدا کے عہد کو توڑ دیا ہے تو اس کو خدا کا عذاب سے بچانے والا کوئی بھی نہ ہوگا۔ کائنات کی سلطانی بلا شرکت غیر اللہ کی ہے اس میں کسی کی حصہ داری ہے اور نہ خدا کے سوا ہمیشی کے لیے کوئی اور عدالت ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی نے اس موقع پر یہ بات چنے کی لکھی ہے کہ یہ دعویٰ مذکورہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسا ہماری زمانہ کے جاہل پیرزادوں کا آفتاب یا اتصال سلسلہ کی بنا پر گمراہ ہے کہ حق تعالیٰ کو ہماری ساتھ ایک گردناتی خصوصیت اور نسبت ہے جو ماضی و غیر سے قطع نہیں ہوتی اور ہم کیسے ہی ہوں مگر اس آفتاب یا اتصال کے زور سے ضرور جنت میں جا لیں گے۔

یہود و نصاریٰ کو قرآن کی تنبیہ

۷۲۔ اسے اہل کتاب ایسی حالت میں تھا کہ اسے پاس رسول آیا جبکہ رسولوں کا ظہور مذہبوں سے مندرجہ تھا، وہ تمہارے سامنے احکام کھول کر بیان کر رہا ہے تاکہ تم یہ نہ کہو کہ ہماری طرف کوئی رسول نہیں آیا نہ بشارت دینے والا اور نہ ڈرنے والا تو اب دیکھو۔ . . . شدت دینے والا اور تنبیہ کرنے والا تمہارے پاس آگیا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ یعنی ہماری احکام و شرائع نہایت وضاحت کے ساتھ کھول کر بیان کرتا ہے۔ اس رکوع کے شروع میں بنی اسرائیل یہود و نصاریٰ کی مختلف قسم کی شرارتوں اور محامقوں کو بیان فرما کر یہ بتلایا تھا کہ اب ہمارا رسول تمہارے پاس آچکا ہے جو تمہاری غلط کاریوں کو واضح کرتا ہے اور تم کو غفلت سے نکال کر زور کی طرف لے جانا چاہتا ہے اس کے بعد اس پر تنبیہ فرمایا کہ اب زور ہدایت کی طرف جانا دو چیزوں پر موقوف ہے ایک یہ کہ حق تعالیٰ کی صحیح معرفت حاصل کرو اور مغفرت و خالق کے متعلق غلط عقیدے مت چھوڑو لعد کفر الذین قالوا سے یہاں تک اسی جڑ کو بیان فرمایا۔ دوسری چیز یہ ہے کہ نبی الانبیاء پر ایمان لاؤ جو تمام انبیاء سابقین کے کلمات کے جامع اور شرائع الہیہ کے سب سے بڑے اور آخری شارح ہیں اس جڑ کا بیان اس آیت میں کیا گیا ہے۔ حضرت یسوع کے بعد تقریباً چھ سو برس سے انبیاء کی آمد کا سلسلہ منقطع تھا۔ ساری دنیا آلا ماشہ اللہ جمل و غفلت اور اہل علم و ادب کی تاریکیوں میں ڈھکی ہوئی تھی۔ ہدایت کے چراغ گل ہو چکے تھے، ظلم و عدوان فساد و لحد کی گستاخاں تمام آفاق پر چھائی ہوئی تھی اس وقت سائے جہاں کی اصلاح کے لیے اللہ نے سب سے بڑے ہادی اور زہیر و بشیر کو روانہ

کیا جو جاہلوں کو فلاح دینے کے واسطے بولتے۔ غفلوں کو اپنے اذکار و تحریف سے بیدار کرے اور پست ہمتوں کو بشارتیں سن کر اہل کمال کے اس طرح ساری مخلوق پر خدا کی رحمت تمام ہو گئی کر لی مانے۔ زمانے بلے

اس آیت گرامی میں یہ باتیں بتائی گئی۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کا زمانہ، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام اہل کتاب کو تنبیہ کہ خدا کی رحمت پروری ہو چکی۔

حضور اقدس کی تشریف آوری کے بارے میں اہل کتاب کو مخاطب کر کے فرمایا کہ قد جہاد کدہ رسولنا ہمارا وہ رسول جس کی بشارتیں تمہاری کتابوں میں موجود ہیں، عقیدہ جس کا تمہیں شدید انتظار ہے وہ تمہارے پاس آچکا ہے۔ یعنی جن کے بارے میں تمہیں اللہ نے حضرت موسیٰ کی رسالت سے بتایا تھا کہ اللہ سبحانہ تمہارے بھائیوں بنی اسماعیل میں سے ضرور ایک نبی روانہ کرے گا اور جن کے بارے میں حضرت عیسیٰ نے فرمایا تھا کہ میرے بعد وہ فارقیط ضرور آئے گا جو تمہیں ہر چیز کی تعلیم دے گا۔ بشارتیں تمہاری کتابوں میں ساری تحریفات کے باوجود موجود ہیں یہ وہ نبی کامل ہے جس کے بارے میں تمہارے آباد و اجداد نے حضرت یحییٰ سے دریافت کیا تھا۔ انجیل میں ہے کہ یہودیوں نے کاہنوں کو حضرت یحییٰ سے یہ دریافت کرنے کے لیے روانہ کیا کہ کیا آپ ہی مسیح ہیں؟ انہوں نے جواب دیا نہیں پھر پوچھا کہ کیا آپ ایلیا ہیں؟ فرمایا کہ نہیں پھر سوال کیا کہ کیا آپ وہ نبی ہیں فرمایا نہیں۔

آیت میں رسول کے لیے آنے کی تعبیر بتا رہی ہے کہ مخاطبوں کو جس کا انتظار تھا وہ آگیا ہے اور جو نیک انتظار اہل کتاب کو تھا اس لیے مخاطب ان کو بھی کیا گیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے وہ رسول جن کی آمد آمد تم اہل کتاب مدت سے سن رہے تھے وہ آگئے۔

زمانہ فترت

دوسری بات کہ حضور انور کی تشریف آوری کا زمانہ کیا ہے قرآن میں اس کے لیے علی فترۃ من المرسلین کی تعبیر اختیار کی ہے فترۃ کے لغوی معنی کام کے رک جانے اور بند ہونے کے ہیں اسی سے اردو میں فترت بولا جاتا ہے۔ اصطلاح میں دونوں توں کے درمیان عرصہ کو

کہتے ہیں، حضرت عیسیٰ السلام اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا درمیان وقفہ کم و بیش چھ سو سال کا ہے حضور کا سال ولادت سنہ ۶۰۰ ہے اور سال بعثت سنہ ۶۱۰۔ مطلب یہ ہے کہ آپ اس دور میں آئے ہیں جبکہ دنیا میں سلسلہ وحی کو بند ہوتے چھ صدیاں گزر گئی تھیں۔ اس وقت کو یا میں نیکی و سعادت کا جغرافیہ کیا تھا۔ علامہ جمال الدین قاسمی نے محاسن التاویل میں مفتی محمد عابد مصری کے حوالہ سے نقل کیا ہے لیکن زیادہ خوبصورت اور کامل نقشر وہ ہے جس کی حضرت شاہد لاٹہ رحمہ اللہ علیہ (م ۱۶۶۹ھ) نے اپنی جلیل القدر تصنیف، حجتہ اللہ البالغہ، میں ماقبل اسلام کی اس صورت حال کی پروردی تصویر کھینچی ہے۔ وہ فرماتے ہیں،

صدیوں سے آزادانہ حکومت کرتے کرتے اور دنیا کی لذتوں میں منہمک رہنے آخرت کو کبیر جھول جانے اور شیطان کے پوسے اثر میں آجانے کی وجہ سے ایرانیوں اور یونانیوں نے زندگی کی آسانیاں اور سامانِ آسائش میں بڑی ترشگانی اور نازک خیالی پیدا کر لی تھی، اور اس میں ہر قسم کی ترقی اور نفاست میں ایک دوسرے سے سبقت سے جانے اور فخر کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ دنیا کے مختلف گوشوں سے ان مرکزوں میں بڑے بڑے اہل ہنر اور اہل کمال جمع ہو گئے تھے۔ جو اس سامانِ آسائش و راحت میں نزاکتیں پیدا کرتے تھے، اور نئی نئی تراش و تراش نکالتے تھے، لان پر عمل فرما کر شروع ہو جاتا تھا اور اس میں برابر اصلے اور بد میں ہوتی رہتی تھیں اور ان باتوں پر فخر کیا جاتا تھا، زندگی کا میاں اتنا بلند ہو گیا تھا کہ اسلام میں سے کسی کا ایک ٹاکہ وہ ہم سے کم کا ٹپکا بانڈھنا اور تاج پہننا سخت میووب تھا، اگر کسی کے پاس عالی شان محل، فوارہ، حمام، باغات، خوش خوراک اور تیار ہانوار، خوش رو جوان اور غلام نہ ہوتے، کھانے میں تکلفات اور لباس پر لوٹاک میں تجمل نہ ہوتا تو ہم چشموں میں اس کی کوئی عزت نہ ہوتی۔ اس کی تفصیل بہت طویل ہے، اپنے ملک کے بادشاہوں کا جو حال دیکھتے اور جانتے ہو اس سے قیاس کر سکتے ہو، یہ تمام تکلفات ان کی زندگی اور معاشرت کا جزو بن گئے تھے اور ان کے دلوں میں اس طرح پرچ گئے تھے کہ کسی طرح نکل نہیں سکتے تھے۔ اس کی وجہ سے ایک ایسا لاعلاج مرض پیدا ہو گیا تھا جو ان کی پوری شہری زندگی اور ان کے پورے نظامِ تمدن میں سرایت کر گیا تھا پھر ایک مصیبت عظمیٰ تھی جس سے عام و خاص اور امیر و غریب میں سے کوئی

محفوظ نہیں رہا تھا ہر شہری یہ ہے پر تکلف اور امیرانہ زندگی ایسی مستط ہر گز تھی جس نے اسی کو زندگی سے عاجز کر دیا تھا اور اس کے سر پر علم و افکار کا ایک پہاڑ ہر وقت رکھا رہتا تھا، بات یہ تھی کہ یہ تکلفات، بیش تر اقلیں صرف کیے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے تھے اور یہ رقیق اور سبے پایاں دولت کاشت کاروں، تاجروں اور دوسرے پیش دروں پر حصول ادنیٰ ٹیکس بڑھانے اور ان پر تنگی کیے بغیر دستیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ اگرچہ ان مطالبات کے اٹا کرنے سے انکار کرتے تو ان سے جنگ کی جاتی اور ان کو سزائیں دی جاتیں اور اگر وہ تعمیل کرتے تو ان کو گدے اور سیلوں کی طرح بنالیتے جن سے آب پاشی اور کاشت کاری میں کام لیا جاتا اور صرف خدمت کرنے کے لیے ان کو پالا جاتا ہے اور محنت و مشقت سے ان کو کسی وقت چھٹی نہیں ملتی۔ اس پر مشقت اور حیوانی زندگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو کسی وقت سراسر اٹھانے اور سادات و اخروی کا خیال بھی کرنے کا موقع اور مہلت نہیں ملتی تھی، بسا اوقات پورے پورے ملک میں ایک فرو بستر بھی ایسا نہ ملتا جس کو اپنے دین کی فکر اور بہتیت ہو سکتی۔

خلاصہ یہ کہ اس ساتویں صدی عیسوی میں روئے زمین پر کوئی قوم ایسی نظر نہیں آتی تھی جو مزاج کے اعتبار سے صالح کہی جاسکے، اور نہ ایسی کوئی سوسائٹی تھی جو شرافت اور اخلاق کی اعلیٰ قدروں کی حامل ہو، نہ ایسی کوئی حکومت تھی جس کی بنیاد عدل و انصاف اور رحم پر ہو اور نہ ایسی قیادت تھی جو علم و حکمت اپنے ساتھ رکھتی ہو اور نہ کوئی ایسا صحیح دین تھا جو انبیاء کرام کی طرف صحیح نسبت رکھتا ہو اور ان کی تعلیمات و خصوصیات کا حامل ہو۔ اس گھسٹا ٹوپ اندھیرے میں کہیں کہیں عبادت گاہوں اور خانقاہوں میں اگر کبھی کبھی کچھ روشنی نظر آ جاتی تھی تو اس کی حیثیت ایسی ہی تھی جیسے برسات کی اندھیری رات میں جھگنو چمکتا ہے۔ صحیح علم اور صحیح عمل اتنا نایاب تھا اور خدا کا سیدھا راستہ بتلانے والے اس قدر نال خال خال پائے جاتے تھے کہ ایران کے بلذہمت اور بے چین طبیعت نوجوان سلمان فارسی کو جو اپنے قومی و نسل مذہب و جمہوریت سے غیر مطمئن و بالوس ہو چکا تھا اور حق و صداقت کا جوا تھا۔ ایران سے لے کر شام کی آخری حدود تک اپنے طویل سفر میں صرف چار آدمی ایسے مل سکے جن سے اس کی روح کو سکون اور قلب کو اطمینان حاصل ہوا اور جو تین غیر دل کے بتلائے ہوئے راستہ پر قائم تھے۔

اسی مانگ پر بے راہ رومی تاریکی کا نقشہ قرآن نے یہاں علی فترۃ من الرسل کے مختصر لفظوں میں

جس طرح کہینا ہے اس سے بہتر ممکن نہیں ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام

آپ کے مقام کو ظاہر کرنے کے لیے اس آیت میں آپ کے تین وصف بیان کیے ہیں۔ ایک تمہیں اللہ کے شانت دوسرے انذار۔ یہاں رسول کو بطور منصب پیش کیا ہے اور ان تین اوصاف کو بطور مقام ظاہر کیا ہے۔ منصب نام ہے عہدے کا اور مقام کہتے ہیں کام کی ذمہ داری کر۔ یہاں پیغمبر کی اولین ذمہ داری یہ بتائی گئی ہے کہ وہ بیان کرتا ہے کیا بیان کرتا ہے اس کو غور و جست کی خاطر حذف کر دیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ پیغمبر وہ سب کچھ بیان کرتا ہے جس کی تمہیں ضرورت ہے عقائد، اعمال، اخلاق اور آداب اور احوال سب کچھ بیان کرتا ہے۔ گویا بین لکھنے کے ذریعے نبوت کے دنیا میں آنے کی غرض بتائی گئی ہے کہ نبوت تمہارے سامنے اللہ کی بندگی اور پرستش کے وہ سارے ضوابط اور قوانین بیان کرے جن کی نہیں ضرورت ہے۔ رسول دین و شریعت کے نام لوگوں کے سامنے جو کچھ بیان کرتا ہے وہ سب اللہ کی جانب سے ہوتا ہے۔ کوئی بات بھی آپ کے اپنے جی کی نہیں ہوتی ہے۔ نبی کے بیان کے اللہ کی جانب سے ہونے کا مطلب ذرا وسیع ہے اس کی دو صورتیں ہیں۔

ایک یہ کہ اللہ بھانہ اپنے احکام متین لفظوں میں خود بڑا راست یا فرشتہ کے ذریعے سے نبی کو بتائے اور نبی لوگوں کے سامنے بیان کرے۔

دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے نبی کو جو احکام ملتے گئے ہیں ان ہی کو سامنے دیکھ کر نبی اجتماع دیکھے اور اللہ کی مرضیات کی ترجمانی کرتے ہوئے ان سے مزید احکام نکال کر بیان کرے۔

گویا پہلی قسم کی تعلیمات کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونا اصلاً اور براہ راست ہونا ہے اور دوسری قسم کی تعلیمات کا اللہ کی طرف سے ہونا نبی کے اجتماع کے ذریعے ہوتا ہے۔ دونوں صورتوں میں نبی کا بیان ہوتا ہے۔

اہل کتاب کو تنبیہ

اس میں ان تصور لوں ما جادنا فرما کہ اہل کتاب کو تنبیہ کی گئی ہے کہ اپنی کتاب کی جہیزوں کو تم نے چھپایا یا ضائع کر دیا ان سب کو واضح اور خدا کی صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرتا ہوا ہمارا رسول تمہاری طرف آیا ہے۔ اب تمہارے پاس اپنی گراہی پر جے پہنچنے کے لیے یہ غدر بھی باقی

نہیں رہا کچھ پہلے رسول کی بعثت پر ایک زمانہ گزر گیا اور تم ایک نذیر و بشیر کے محتاج تھے۔ تمہارے اس عذر کو ختم کرنے کے لیے ہم نے نذیر و بشیر روانہ کیا۔ اب اس تمام جہت کے بعد بھی تم نے اپنی روش تبدیل تو نہ کی کہ جسے میں ہستی نہ سمجھتا وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ یہ ملحوظ ہے کہ اہل کتاب کا یہ عذر کوئی قابلِ لحاظ عذر نہیں تھا لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اس کا بھی لحاظ فرمایا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ان پر آخری جہت پوری کر دی۔

یہ آیت اس نگرانی کے خلاف کھلا چیلنج ہے کہ تمہارے مذاہب سچے ہیں۔ سبھی خدا تک پہنچنے والے ہیں۔ ایک یہودی حضرت موسیٰ کی شریعت پر عمل کرتا ہوا ایک عیسائی حضرت کو مانتا ہوا اسکاٹ یافتہ ہے چاہے وہ حضور انور کو نبی نہ مانے۔ قرآن کی اس آیت نے اہل کتاب کو مخاطب کر کے بتایا ہے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کو ماننے کے باوجود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ماننا اور ان کی پیروی کرنا شرطِ سبکات ہے۔ اگر یہ بات قرآن کے نزدیک صحیح ہوتی کہ یہودی اور عیسائی سب سچے ہیں تو اس کا بالکل منطقی نتیجہ یہ تھا کہ قرآن یہود و نصاریٰ کو حضور اقدس پر ایمان لانے کی دعوت دیتا بلکہ قرآن ان سے یہ کہتا کہ تورات و انجیل کی مصلحت پیروری کیوں ساری دنیا جانتی ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ قرآن نے انہیں بھی اسی طرح اسلام کی دعوت دی جس طرح عہد کے مشرکوں کو دی تھی اور ان کے لیے بھی نبوت محمدیہ کی پیروی کو ویسا ہی ضروری قرار دیا ہے جیسا کہ دوسروں کے لیے قرار دیا تھا۔

مذہب یہ کہ قرآن نے نبوت محمدیہ کو ماننے کی دعوت دی بلکہ ان میں سے جنہوں نے نبوت محمدیہ کو قبول نہیں کیا انہیں صاف صاف غفلتوں میں گھر کا ترکب اور دوزخی قرار دیا۔ غرض قرآن عزیز اہل کتاب کے انکارِ اسلام کو بھی ٹھیک وہی حیثیت دیتا ہے جو مشرکوں کے انکار کو دیتا ہے۔ اور نتائج بھی دونوں کے ایک ہی بنتے ہیں۔ قرآن نے اہل کتاب کے لیے ایسی کوئی گنجائش نہیں رکھی کہ وہ اسلام کے بجاتے اپنے ہی دین پر قائم رہ سکتے ہیں۔ اس آیت کی دھمکی پر حضور فرماتے: آخر میں اس دھمکی کو پُر زور بنانے کے لیے فرمایا واللہ علی کل شیء قدير یعنی تم اگر اس پیغمبر کی بات نہ مانو گے تو خدا کی قدرت ہے کہ کوئی دوسری قوم کھڑی کر دے جو اس کے پیغام کو پوری طرح قبول کرے گی اور پیغمبر کا ساتھ دے گی خدا کا کام کچھ تم پر موقوف نہیں ہے بلکہ

بلکہ اس موقع پر یہ فقرہ نہایت لطیف و لطیف ہے اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ جو خدا بشارت لینے والے اور ڈرانے والے سمجھنے پر قادر ہے اسی نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس خدمت پر مامور کیا ہے اور وہ ایسا کرنے پر قادر ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے اس بشیر و نذیر کی بات نہ مانی تو یاد رکھو اللہ قادر و توانا ہے، ہر سزا جو وہ تمہیں دینا چاہے بلا مزاحمت لے سکتا ہے بلکہ

وَرَدَّ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ يَقُومُوا ذُكْرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ ذُجِعَا
فِيكُمْ أَنَّهُمْ وَجَعَلَكُمْ مُلُوكًا وَأَتَاكُمْ تَالَمُ يُوتِ أَحَدًا آمِنَ
الْعَالَمِينَ يَقُومُوا ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِي كَتَبَ اللَّهُ
لَكُمْ وَلَا تَزِدُّوا عَلَى آذَانِكُمْ فَتَنْقَلِبُوا خَاسِرِينَ قَالُوا يَمُوتُ
إِنْ فِيهَا قَوْمٌ مُجَنَّبِينَ وَإِنَّا لَنَنْدُخُلُهَا حَتَّى يُخْرِجَ إِيَّاهَا فَإِنْ
يَخْرِجُوا مِنْهَا فَإِنَّا دَاخِلُونَ قَالَ رَجُلَيْنِ مِنَ الَّذِينَ يَخَافُونَ
أَنَعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوا عَلَيْهِمَا الْبَابَ فَإِذَا دَخَلْتُمُوهُ فَإِنَّكُمْ
غَالِبُونَ ذُنُوبُ اللَّهِ فَتَوَكَّلُوا إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ قَالُوا
يَمُوتُ إِنَّا لَنَنْدُخُلُهَا أَبَدًا إِنَّا دَاخِلُونَ فَذَهَبَ أَنْتَ وَرَبُّكَ
فَقَاتِلَا إِنَّا هُنَا قَاعِدُونَ قَالَ رَبِّ إِنِّي لَا أَمْلِكُ إِلَّا نَفْسِي
وَإِخِي فَأَفْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ قَالَ فَإِنَّهَا
مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ رُبْعِينَ سَنَةً يَتِيهُونَ فِي الْأَرْضِ فَلَا
تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ

اور اس واقعہ کو دھیان میں لاؤ جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا لوگو اللہ کا اپنے اوپر یہ احسان یاد کرو کہ اُس نے تم میں انبیاء بناتے اور تمہیں بادشاہ بنایا اور تمہیں وہ کچھ دیا تھا جو دنیا میں کسی کو نہیں دیا۔^۲ لوگو! مقدس سرزمین میں جسے اللہ نے تمہارے لیے مقرر فرمایا ہے داخل ہو جاؤ اور اُلٹے پیچھے نہ بیٹو کہ نقصان اٹھاؤ گے۔^۳ لوگوں نے اس کے جواب میں کہا اے موسیٰ اس سرزمین میں ایسے لوگ رہتے ہیں جو بڑے ہی زبردست ہیں۔ جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں ہم اس سرزمین میں قدم نہیں رکھیں گے۔ ہاں اگر وہ وہاں سے نکل جائیں تو پھر ہم ضرور داخل ہو جائیں گے۔ اس پر ان ڈیڑھ والوں میں سے ان دو آدمیوں نے کہا جن کو خدا نے انعام سے نوازا تھا کہ ہمت کر کے شہر کے دروازے میں داخل ہو جاؤ، جب تم داخل ہو جاؤ گے تو غلبہ تمہارے لیے ہوگا اگر ایمان والے ہو تو اللہ ہی پر توکل کرو۔^۴ وہ بولے اے

موسیٰ جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں ہم کبھی اس میں داخل ہونے والے نہیں تم خود جاؤ اور تمہارا رب ہی تمہارے ساتھ ہو اور دونوں ان سے جنگ کرو ہم تو یہاں بیٹھے رہیں گے۔ حضرت موسیٰ نے کہا خدا یا مجھے اپنے اور اپنے بھائی کے سوا کسی پر اختیار نہیں ہے لہذا تو ہم میں اور ان نافرمانوں میں فیصلہ کر دے۔ اللہ کا حکم ہوا کہ اب چالیس برس تک وہ سرزمین ان پر حرام کر دی گئی ہے یہ اسی بیابان میں سرگرداں رہیں گے لہذا اے موسیٰ تو ان نافرمانوں پر غمزدہ نہ ہو۔⁴⁹

اسرائیلی تاریخ کے ایک واقعہ سے استشہاد

یہود کے ابتدائی تاریخ کے ایک واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے ایک طرف تو یہ حقیقت روشنی میں آتی ہے کہ یہ قوم ابتداء ہی سے خدا کے عہد اور اس کے حقوق و فرائض کے معاملہ میں نہایت بودی اور لگھی رہی ہے۔ دوسری طرف یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اللہ نے ابتداء ہی سے اس کی بدعہدیت اور نالائقیوں پر اس کو سزا بھی ہمیشہ عجز تک دی ہے۔ اودان آیات میں بتایا گیا ہے کہ جب ایک قوم حرمہ تک غلامی کی حالت میں رہتی ہے تو اس میں بلند مقاصد کے لیے جدوجہد کی استعداد باقی نہیں رہتی وہ غلامی کا امن پسند کرتی ہے اگرچہ ذلت و نامرادی کے ساتھ ہو اور مقاصد کی جدوجہد

سے جی چرانے لگتی ہے اگرچہ اس کا ذخیرہ کمرانی و قابل ہو۔ یہی حال بنی اسرائیل کا تھا۔ متناصد امور کے لیے ان میں عزم و ہمت نہ تھی۔ بزدلی اور بے طاقتی نے ان کے قدم بکڑیے تھے۔ واقعہ کی تفصیلات بائبل کی کتاب گنتی استثنائے اوریشوع میں ملیں گی۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ حضرت موسیٰ نے دشت فانی سے بنی اسرائیل کے بارہ سرداروں کو فلسطین کا دورہ کرانے کے لیے روانہ کیا تاکہ وہاں کے حالات معلوم کر کے آئیں۔ یہ لوگ چالیس دن دورہ کر کے وہاں سے واپس آئے اور انہوں نے قوم کے مجمع عام میں بیان کیا کہ واقعی وہاں دھلہ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں لیکن جو لوگ وہاں بسے ہوتے ہیں وہ بڑے زوردار ہیں ہم اس لائق نہیں ہیں کہ ان لوگوں پر حملہ کریں۔ وہاں جتنے آدمی ہم نے دیکھے وہ سب بڑے قد دار ہیں۔ اور ہم نے وہاں بنی حناتی کو بھی دیکھا جو جبار ہیں اور جباروں کی لسل سے ہیں اور ہم تو اپنی ہی نگاہ میں ایسے تھے جیسے ٹڈی ہرتے ہیں اور ایسے ہی ان کی نگاہ میں تھے۔ یہ بیان سن کر سامع مجمع بیچ اٹھا کر لے کا شہم مصری میں مر جاتے یا کاش اس بیابان میں ہی مرتے۔ خداوند کیوں ہم کو اس ملک میں لے جا کر تلوار سے قتل کرنا چاہتا ہے۔ پھر تو ہماری بیویاں اور بال بچے لوٹ کا مال ٹھہریں گے۔ کیا ہم اسے لیے بہتر نہ ہو گا کہ ہم مصر کو واپس چلے جائیں۔ پھر وہ آپس میں کہنے لگے آؤ ہم کسی کو اپنا سردار بالیں اور مصر کو لوٹ چلیں۔ اس پر ان بارہ سرداروں میں سے جو فلسطین کے دورے پر گئے تھے دو سردار یوشع اور کالب اٹھے اور انہوں نے اس بزدلی پر قوم کو کلامت کی۔ کالب نے کہا جلد ہم ایک دم جا کر اس ملک پر قبضہ کر لیں کیونکہ ہم اس قابل ہیں کہ اس پر تصرف کریں۔ پھر دونوں نے ایک زبان ہو کر کہا کہ اگر خدا ہم سے راضی ہے تو وہ ہم کو اس ملک میں پہنچائے گا فقط اتنا ہو کہ تم خداوند سے دعاؤں ذکر و اور اس ملک کے لوگوں سے ڈرو اور ہمارے ساتھ خداوند ہے سو ان کا خوف نہ کرو مگر قوم نے اس کا جواب یہ دیا کہ انہیں سنگسار کر دو، آخر کار اللہ نے فیصلہ فرمایا کہ اچھا اب یوشع اور کالب کے سوا اس قوم کے بالغ مردوں میں سے کوئی بھی اس زمین میں داخل نہ ہونے پائے گا۔ یہ لوگ چالیس برس تک بے خانان پھرتے رہیں گے یہاں تک کہ جب ان میں سے بیس برس سے بڑے عمر کی عمر کے سب مرد مر جائیں گے اور نئی نسل جوان ہو کر اٹھے گی تب ان کو فلسطین فتح کرنے کا موقع ملے گا چنانچہ اس خداوندی فیصلہ کے مطابق بنی اسرائیل کو دشت فانی سے شرق اردن تک پہنچتے پہنچتے پورے ۴۰ سال لگ گئے۔ اس دوران میں وہ سب مر گئے جو جوانی کی عمر میں مصر سے نکلے تھے شرق اردن کی فتح کے بعد حضرت موسیٰ کا وصال ہو گیا۔ اس کے بعد حضرت یوشع نے فلسطین فتح کیا۔

۳۷۔ اور اس واقعہ کو یاد کر دو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا لوگو! اللہ کا اپنے اوپر احسان

یاد کرو کہ اس نے تم میں انبیاء بنائے اور تمہیں بادشاہ بنایا اور تمہیں وہ کچھ دیا جو دنیا میں کسی کو نہیں دیا۔ یعنی تمہارے ہذا علیٰ حضرت ابراہیم سے لے کر آج تک۔ اتنے نبی تم میں پیدا کیے۔ مثلاً حضرت اسماعیل، حضرت اسماعق، حضرت یعقوب، حضرت یوسف، اور حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہم السلام پھر ان کے بعد بھی یہ سلسلہ مدت دراز تک قائم رہا۔ یہ تو نبوت کا انعام ہوا اور بادشاہی کا انعام یہ کہ فرعونوں کی ذلیل ترین غلامی سے آزادی، لاکر ان کے اموال و املاک پر قابض کیا اور اس سے پہلے تم ہی میں سے حضرت یوسف علیہ السلام کو مصر کے خزان اور سلطنت پر کیا تسلط عطا فرمایا۔ پھر مستقبل میں بھی حضرت سلیمان وغیرہ نبی اور بادشاہ پیدا کیے گویا دین اور دنیا دونوں کی اعلیٰ نعمتوں سے تم کو سرفراز کیا۔ کیونکہ دینی مناصب میں سب سے بڑا منصب نبوت اور ذریعہ اقبال کی آخری حد آزادی اور بادشاہت ہے۔ یہ دونوں چیزیں مرحمت کی گئیں۔ اسی پر بس نہیں بلکہ اللہ نے تمہیں وہ کچھ دیا جو کسی کو نہیں دیا تھا یعنی اس وقت جب موسیٰ علیہ السلام کو خطاب فرما رہے تھے بنی اسرائیل پر تمام دنیا کے لوگوں کی بارہ اللہ کی نوازشیں ہوتیں اور اگر احداً من العالمین کو عموماً یہ عمل کیا جاتے تو اس لیے صحیح نہیں ہے کہ امت محمدیہ کی نسبت خود قرآن حکیم میں تصریح ہے کہ تدریجاً امتہ اخر جہت للناس اور کذا لعل جہنما کہ امتہ و سلطانا لکن انما اشہد ان علی الناس۔

یہ آیت بتا رہی ہے کہ حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کے سامنے تقریر کی۔ تقریریں دو اہم اور بنیادی باتیں ارشاد فرمائیں ایک یہ کہ تم پر اللہ کا انعام ہوا ہے اور دوسرے یہ کہ بے مثال ہوا ہے اور تمہیں وہ کچھ عطا ہوا ہے جو کسی کو نہیں ہوا ہے۔ یہ تقریر کس موقع پر ہوئی اور کب ہوئی؟ سوال کا جواب یہ ہے کہ اس تقریر کا وہ زمانہ صحیح بنی اسرائیل مصر لوں کی غلامی و محکومیت سے آزاد ہو کر جزیرہ نمابینا میں آزادی سے نقل و حرکت کر رہے ہیں۔ حضرت موسیٰ کی اس تقریر کا زمانہ تازہ ترین تاریخی اور اثری تحقیق کے مطابق مصر سے خروج بنی اسرائیل کا زمانہ ۱۲۵۰ قبل مسیح کا ہے اور فلسطین پر فوج کشی کا زمانہ ۱۲۵۰ قبل مسیح کا۔ اس لحاظ سے حضرت موسیٰ کی اس تقریر کا زمانہ اسی درمیانی مدت کا ہے۔ یہ تقریر حضرت موسیٰ نے دشت فاران میں اس موقع پر فرمائی جب بنی اسرائیل کو فلسطین پر حملہ کے لیے اجارا ہے۔ کورات کی کتاب گنتی باب ۱۳، ۱۴ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر سے نکلنے کے بعد تمام منازل سفر طے کرتے کرتے جب حضرت موسیٰ دشت فاران میں پہنچے۔

فلسطین کا علاقہ قریب آیا۔ آپ نے ۱۲ سڑکوں کی ایک پارٹی کو علاقہ کے حالات دریافت کرنے کے لیے روانہ کیا۔ یہ پارٹی اپنی ہم سے فارغ ہو کر جب واپس آئی تو اس نے علاقے کی اندھیری و شادابی سے متعلق تو نہایت خوشی انگیز رپورٹ دی لیکن ملک پر قابض باشندوں کے قد و قامت اور ان کی زور و آوری سے متعلق اس نے جو بیان دیا وہ بنی اسرائیل کے لیے نہایت موصد شکن ثابت ہوا۔ یہی موقوفہ ہے جب حضرت موسیٰ نے تقریر فرمائی اور فرمایا کہ لوگو! اللہ کا اپنے اوپر انعام یاد کرو کہ اس نے کسی کیسی نعمتوں سے تمہیں نوازا ہے اس بے تم میں نبی پیدا کیے اور تمہیں بادشاہ بنایا۔

انبیاء کا مشن اور اقتدار

نبوت اور حکومت کو جمع کر کے نعمت کہا گیا ہے یعنی التزم پر احسان عظیم یہ ہے کہ نبوت اور بادشاہت دونوں تمہارے لیے جمع فرمادی ہیں۔ اس ارشاد میں ان لوگوں کے لیے بہت بڑی عبرت ہے جو کہتے ہیں کہ دین سے سیاست کا رشتہ زیادہ سے زیادہ ثانوی درجہ کا ہے۔ دین میں سیاست کو کوئی بنیادی اہمیت حاصل نہیں ہے نہ حکومت دین کے لیے کچھ ناگزیر ہے۔ ناگزیر ہر ناتو دُور رہا وہ اس کے لیے مطلوب بھی نہیں ہے نہ اس کے لیے کہ کشش کرنا دین کے پیروں کی کوئی دینی ذمہ داری ہے۔

ابرواقع یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام جس مشن پر مامور ہوتے تھے وہ آخری عملی شکل کے لحاظ سے ایک دینی حکومت کا قیام ہی ہوتا تھا کیونکہ اقتدار حکومت کے بغیر جس طرح آج اسلام اسلام نہیں رہ جاتا اور دین خدا پر پورا عمل نہیں ہو سکتا اسی طرح کسی بھی نبی کے زمانے میں نہیں ہو سکتا تھا اس لیے ہر دور کے دینی خداوندی کی نظر اس بات پر لازمًا ہونی چاہیے کہ معاشرے کا اقتدار اس کے اپنے ہاتھ میں آئے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان انبیاء میں سے بہتوں کے ساتھ حالات نے سازگار کر دی کہ ہر دور اس لیے ان کی دعوتی جدوجہد کے نتائج اس حد کمال کو نہ پہنچ پاتے ہوں لیکن ظاہر ہے کہ کسی دعوت کا اس حد کمال تک نہ پہنچنا اور بات ہے اور اس چیز کا حد کمال نہ ہونا بالکل دوسری بات ہے۔ نبوت کی دعوت کی جو تاریخ ہمارے سامنے ہے اس میں اس بات کا تذکرہ تو ضرور ملتا ہے کہ ان میں سے اکثر سیاسی نظام قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے مگر اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ وہ ایسا ہی چاہتے تھے۔ بلاشبہ ہر نبی کی دعوت کا اساسی کلمہ لا الہ الا اللہ ہی تھا۔ لا احکم الا اللہ نہ تھا مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ لا الہ الا اللہ کے مفہوم میں لا احکم الا اللہ بھی

شامل ہے اور اہمیت کا ایک بڑا حاکمیت بھی ہے۔ یعنی یہ بات کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، معنی بھی رکھتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی حاکم نہیں۔ اگر کو صرف حاکم سمجھا ضرور غلط بات ہے مگر اس سے زیادہ غلط بات یہ ہے کہ اللہ کے اصل مفہوم میں حاکمیت کا تصور بھی نہ مانا جاتے۔ اسی طرح یہ بھی بالکل صحیح ہے کہ کسی نبی نے اپنی دعوت ان لفظوں میں ہرگز نہ دی تھی کہ لوگو! اللہ کی حکومت قائم کرو، کیونکہ اس کے سوا تمہارا حاکم کوئی نہیں بلکہ ہر نبی کے الفاظ یہی تھے کہ اعبدا للہ ما لکھ من الٰہ غیرہ، مگر کون کہہ سکتا ہے کہ ان الفاظ کے مفہوم میں ان لفظوں کا مفہوم بھی اپنی پوری اہمیت کے ساتھ شامل نہیں ہے کیونکہ یہ بات اسی وقت کہی جاسکتی ہے جب کہ عبادت کا مفہوم پرستش تک محدود ہو لیکن جب امر واقعہ یہ ہے کہ عبادت کے مفہوم میں پرستش اور بندگی دونوں موجود ہیں تو ان احکام دین کی پیردی کو عبادت سے کسی طرح خاص کر قرار نہیں دیا جاسکتا ہے جو زندگی کے مختلف قسموں سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کی آخری کڑی سیاست اور حکومت کے احکام ہوتے ہیں۔ اور جب ان احکام کی پیردی بھی عبادت ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ انبیاء کی جو اصل دعوت تھی اس کے عین مفہوم ہی میں سیاسی احکام کی پیردی کا تصور بھی لازماً موجود تھا۔

بہر حال اس آیت میں نبوت اور حکومت کو اپنا انعام بتایا گیا ہے اور حضرت موسیٰ نے اپنی تقریر کا آغاز ان دو نعمتوں کے ذکر سے کیا ہے۔

ایک تفسیری نکتہ

ذکرِ نبوت اور حکومت دونوں کا ایک ہی مگر اندازِ بیان اور تعبیر اس انوکھے طرز کی ہے کہ دونوں میں جوہری فرق بتا دیا گیا ہے۔ نبوت کے لیے تعبیر یہ اختیار فرمائی کہ جعل فیکم انبیاء تم میں انبیاء بنائے لیکن حکومت و اقتدار کے لیے انداز یہ اختیار کیا کہ جعلکم ملوکاً تم کو بادشاہ بنا دیا۔ یہ تم میں اور تم کے انداز سے یہ بات خود بخود سمجھ میں آرہی ہے کہ نبوت ایک مرتبہ اختصا ہے صرف وہ نبی ہوتا ہے جسے اللہ سبحانہ اس منصب پر فائز فرماتا ہے۔ اس میں دوسرا کوئی شریک نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس حکومت ایک منصب اشتراکی اور اجتماعی ہے جس میں بادشاہ کے ساتھ اس کی پوری قوم شریک ہوتی ہے اگر کسی حکومت میں قوم شریک نہ ہو تو وہ استبداد و مطلق العنانی ہے۔

ایک اہم سوال اور اس کا جواب

اس تقریر میں حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کو جن دو نعمتوں کی یاد دلانی کرائی ہے ان کا تعلق اس وقت بنی اسرائیل کے ماضی سے ہے یا مستقبل سے۔ ہماری رائے میں یہ مستقبل کے بارے میں وعدہ ہے اور حضرت موسیٰ بنی اسرائیل سے کہہ رہے ہیں کہ اللہ کے ان وعدوں کو دھیان میں رکھ کر ہمت کرو۔ اللہ کے جو وعدے مستقبل سے متعلق ہوتے ہیں بسا اوقات ان کو ماضی کے صیغوں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ وعدوں کی قطعیت کے اظہار کا ایک بیغِ امانہ ہے۔ قرآن میں یہ امانہ بیان بہت زیادہ اختیار کیا گیا ہے گویا یہ وعدے محض وعدے نہیں بلکہ واقعات ہیں جو واقع ہو چکے ہیں۔ حضرت موسیٰ سے پہلے آخر چہ بنی اسرائیل میں بعض انبیاء۔ مبعوث ہو چکے تھے لیکن نبوت کا غیر منقطع سلسلہ آپ کے بعد شروع ہوا جو حضرت مسیح کی بعثت تک جاری رہا ہے۔ بادشاہوں کے سلسلے کا تعلق تمام تر حضرت موسیٰ کے بعد ہی کے دور سے ہے۔ اس سے پہلے خاندان کے بزرگوں کو ایک قسم کی سیادت ضرور حاصل رہی ہے لیکن اسے بادشاہی نہیں کہہ سکتے۔ تورات میں بھی اسے بادشاہت سے تعبیر نہیں کیا گیا ہے۔ جن شامین قرآن کی نظر اس نکتہ پر نہ تھی انہوں نے لفظ مملوک کی تویل کی اور بتایا کہ مملوک ملک کی جمع ہے اور ملک وہ ہے جو آزاد، خود مختار اور صاحبِ حیثیت برہادر ہے۔ یہاں بات ماضی کی نہیں بلکہ مستقبل کی ہو رہی ہے۔

آخری فقرہ دانتاکم مالم یوت احداً من العالمین کی شست بھی اپنی جگہ بالکل درست ہو جاتی ہے اور مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تمہیں وہ کچھ دیا جو کسی کو نہیں دیا۔ یعنی نبوت اور بادشاہت دونوں تم میں جمع ہو گئیں۔ جن لوگوں نے اس کا پیوند ماضی سے جوڑا ان کو اس فقرے کے مطلب متعین کرنے میں گوناگوں پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ کسی نے کہا کہ اس سے مراد وہ منصب امامت و شہادت حق ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو مامور فرمایا تھا۔ کسی نے بتایا کہ اس سے توحید کی نعمت مراد ہے کوئی بولایا اشارہ ہے بنی اسرائیل کی اس عظمت گزشتہ کی طرف جو حضرت موسیٰ سے پہلے ان کو کسی زلمے میں حاصل تھی کسی نے یہ نکتہ آخری کی کہ تمہارے لیے کمند کو چھاڑ دیا اور تمہارے سامنے دشمن کو دریا مجرور کر دیا۔ پھر ایت کی یہ تشریح کرنے کے بعد یہ دشواری سامنے آگئی کہ اگر بنی اسرائیل کو یہ مقام دے دیا جائے تو پھر اُمتِ تمہری کے لیے کون سا تمنا باقی رہے گا حالانکہ پورا کیس ہی سرے سے غلط ہے یہاں

مقابلہ تو اس دود کی قوموں اور نسلوں سے ہو رہا ہے نہ کہ امت سے۔ بنے شک بنی اسرائیل اپنے زمانہ کی قوموں اور نسلوں میں یہ ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ امت محمدیہ کسی نسل یا قوم کا نام نہیں ہے۔

جہاد کے لیے حضرت موسیٰ کی تقریر

۴۴۔ لوگو! مقدس سرزمین میں جسے اللہ نے تمہارے لیے مقرر فرما دیا ہے، داخل ہو جاؤ اور اللہ کے پیچھے نہ پلٹ کر نقصان اٹھاؤ گے۔ خدا نے بیشتر حضرت ابراہیم سے وعدہ فرمایا تھا کہ تیری اولاد کو یہ ملک دوں گا وہ وعدہ ضرور پورا ہونا ہے۔ خوش قسمت ہوں گے وہ لوگ جن کے ہاتھوں پر ہوا ہو اور جہاد کی سبیل بذولہست ہمتی نہ کھاؤ کہ اس سے دوبارہ غلامی کی طرف پلٹ جاؤ گے۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس تقریر کا حوالہ ہے جو انہوں نے دشت فاران میں اس موقع پر فرمائی جب بنی اسرائیل کو فلسطین پر حملہ کے لیے اجازت ہے۔ تورات کی کتاب گنتی باب ۱۲: ۱۳ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر سے نکلنے کے بعد تمام منازل سفر طے کرتے ہوئے جب حضرت موسیٰ دشت فاران میں پہنچے اور فلسطین کا علاقہ قریب آیا تو چونکہ یہی علاقہ منزل مقصود تھا۔ اس وجہ سے اپنے بارہ سرداروں کی ایک پارٹی علاقے کے حالات دریافت کرنے کے لیے بھیجی۔ یہ پارٹی اپنی مہم سے فارغ ہو کر جب واپس آئی تو اس نے علاقہ کی زرخیزی و شادابی سے متعلق تو نہایت شوق انگیز رپورٹ دی لیکن ملک پر قابض باشندوں کے قد وقامت اور ان کی زور آوری سے متعلق اس نے جو بیان دیا وہ بنی اسرائیل کے لیے نہایت حوصلہ شکن ثابت ہوا۔ چنانچہ یہ بیان سننے ہی انہوں نے وادیاں شروع کر دیا اور جس ملک پر قبضہ کرنے کی انگلیں لیے ہوئے یہاں تک پہنچے تھے اس پر قبضہ کرنا تو رکنا پھر مصر پلٹ جانے کی باتیں کرنے لگے اور یہ بات انہیں یاد ہی نہیں رہی کہ خدا نے ان کو اس ملک کی میراث دینے کا قسم کے ساتھ وعدہ کیا ہوا ہے۔ یہی موقع ہے جب حضرت موسیٰ نے یہ تقریر فرمائی ہے۔ قرآن نے اگرچہ تقریر کا صرف خلاصہ دیا ہے اس لیے مقصود بالاجمال واقعہ کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ تاہم وہ سائے پہلو اس میں موجود ہیں جو اس موقع پر حوصلے کو بحال کرنے اور ہمت کو صقلی کے انجام بد سے آگاہ کرنے کے لیے ضروری تھے۔

آیت میں ارض مقدس سے مراد کنعان اور فلسطین کا علاقہ ہے۔ اس کو مقدس کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہی علاقہ ہے جہاں حضرت ابراہیم، حضرت یعقوب، حضرت اسحاق نے اللہ کے دین کی دعوت کا کام کیا۔ یہ علاقہ اگرچہ بعد میں کافروں اور بت پرستوں کے قبضے میں آگیا تھا لیکن توحید اور خدا پرستی کی اذان پر کھڑے پہلے اسی علاقے میں گونجی تھی۔ اس وجہ سے اس کو ارض مقدس سے تعبیر کیا۔ مصر سے نکلنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اسی علاقے کو بنی اسرائیل کی میراث قرار دیا اور تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قسم کھا کر ان سے وعدہ کیا کہ میں نے یہ علاقہ تم کو دیا۔ تورات میں ان وعدوں کی صراحت موجود ہے۔ مثلاً استثنائیں ہیں کہ

دیکھو میں نے یہ زمین جو تمہارے آگے ہے تمہیں عہدیت کی، داخل ہوا اور اس سرزمین کو جس کی بات خداوند نے تمہارے باپ دادا اور ابراہام اور اسحاق اور یعقوب سے قسم کی کہ تم کو اور تمہارے بعد تمہاری نسل کو دوں گا میراث میں لو۔ ۸-۱۔
تو اس زمین میں جس کی بابت خداوند نے تیرے باپ دادا اور ابراہام، اسحاق اور یعقوب سے قسم کھا کر کہا کہ اسے میں تمہیں دوں گا سکونت کرے۔ ۳۰-۲۱۔
مضطرب ہو جاؤ اور دلاور ہو جاؤ، خوف نہ کھاؤ اور ان سے مت ڈرو کیونکہ خداوند تیرا خدا وہی ہے جو تیرے ساتھ جاتا ہے وہ تجھے غافل نہ ہوگا اور تجھ کو نہ چھوڑے گا۔ ۶-۳۱۔

اس بنا پر مکتب اللہ کلم کا مطلب یہ ہے کہ جس سرزمین کا تمہارے لیے اللہ نے حضرت ابراہیم سے وعدہ فرمایا ہے وہ تمہارے لیے علم الہی میں مقدس ہو چکی ہے ذرا سی ہمت اور کوشش کرو تو بھی مل سکتی ہے۔

آخر میں فرمایا کہ اٹھو پیچھے نہ چلو کہ نقصان اٹھاؤ گے۔ اس کے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ توجہ عدل و ہدایت کی دعوت میں لے کر آیا ہوں اس سے ہٹ کر بت پرستی اور ملک میں شر و فساد اختیار نہ کرو کہ اس کا نتیجہ تمہارے حق میں نقصان کے سوا کچھ نہیں ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ جہاد کے موقع پر نامردی اور بزدلی کا مظاہرہ نہ کرو، اس میں مستحکم رہنا ضروری ہے۔ جب ایک قوم عرصہ تک غلامی کی حالت میں رہتی ہے تو اس میں بلند مقاصد کے لیے جہاد و جدوجہد کی استعداد باقی نہیں رہتی۔ وہ غلامی کا امن پسند کرنے لگتی ہے۔ اگرچہ ذلت و نامردی کے ساتھ ہوا اور مقاصد کی راہ میں جدوجہد سے جی چرلے لگتی ہے اگرچہ اس کا نتیجہ کامرانی و اقبال ہو۔

خسارہ بھی دو قسم کا ہے ایک دنیوی اور دوسرا اخروی۔ دنیوی خسارہ یہ ہے کہ ارضی متمدن سے محروم ہو جاؤ گے اور اخروی خسارہ یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں محنت کرنے کے اجر و ثواب سے محروم ہو جاؤ گے۔ یہاں دونوں کا احتمال ہے۔

جہاد سے گریز نہ پائی

۷۵۔ لوگوں نے اس کے جواب میں کہا کہ اے موسیٰ اس سرزمین میں ایسے لوگ رہتے ہیں جو بڑے ہی زبردست ہیں جب وہ لوگ وہاں موجود ہیں۔ ہم اس سرزمین میں قدم نہیں رکھیں گے ہاں اگر وہ وہاں سے نکل جائیں تو پھر ہم ضرور داخل ہو جائیں گے۔ زبردست یعنی بہت قوی ہیکل تنہا اور اور پر عیب ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہم میں ان سے مقابلہ کی ہمت نہیں ہے۔ ہاں بدون ہاتھ پاؤں ہلاتے پک پکائی کھالیں گے۔ اب مجھ سے کے زور سے ان کو نکال دیں بٹے

یہ حضرت موسیٰ کی اس تقریر کا جو پہلے گزر چکا ہے بنی اسرائیل کی طرف سے جواب ہے کہ جب اس ملک پر ایسے عظیم اور قد آور لوگ قابض ہیں تو ہم ان کی غارتوں کا لقمہ بننے کے لیے تیار نہیں ہیں، البتہ اگر قدرت کے کسی ایسے معجزے کے ذریعے سے جیسے تم اب تک ہمیں دکھاتے ہوئے ہو یہ لوگ اس علاقے سے نکل جائیں تو پھر ہم اس علاقہ پر قابض ہونے کے لیے تیار ہیں۔ جن کو یہاں جبار کہا ہے یہ عمالقہ کی قوم تھی جو ایک بڑی زوردار اور جنگ آزما قوم تھی۔ بنی اسرائیل کی یہ برائی حریف، تورات اور تاریخ اسرائیل اس کی خون ریز یوں کی داستان سے الٹی پڑی ہے

تورات میں اس قوم کا چہرہ بنی اسرائیل کی زبانی یہ بتایا ہے کہ ہمیں زور نہیں ہے کہ ہم ان لوگوں پر چڑھیں کیونکہ وہ ہم سے زیادہ زوردار ہیں۔ گنتی ۱۳، ۳۲۔

یہ زمین جس کی جاسوسی میں ہم گئے تھے کوک زمین ہے جو اپنے بے والوں کو نگل جاتی ہے اور سب لوگ جنہیں ہم نے وہاں دیکھا بڑے قد آور ہیں اور ہم نے وہاں جباروں کو ہاں بنی عناق کو جو جباروں کی نسل میں ہیں دیکھا۔ اور ہم اپنی منظر دہ میں ان کے سامنے ایسے تھے جیسے ٹڈے اور ایسے ہی ہم ان کی نظروں میں تھے۔

(گنتی ۱۳-۳۳)

لے افادت شیخ الاسلام

جبار کا غلط ٹیسے ڈیل ڈول ڈول کئے ٹھلے پر بھی ہوتا ہے اور یہاں یہی مراد ہے۔ یہودی روایات میں خرافات کی حد تک ان کے قد و قامت کی دوازی کا ذکر کیا ہے۔ عربی میں مغلطہ جبارہ ایسے بے تنے لکے کمزور کے درخت کو کہتے ہیں جس پر آسانی سے آدمی کا ہاتھ پہنچ سکے۔ لہذا ان کے لئے لہائی طاقت اور بڑائی کے بتاتے ہیں۔ انہری کہتے ہیں کہ جبار طویل عظیم اور قوی کہتے ہیں۔

ایمانی قوت کا فیصلہ

۷۶۔ اس پر ان دسے دالوں میں سے ان دوازیوں نے کہا جن کو خدا نے انعام سے نوازا تھا کہ ہمت کر کے شہر کے دروازے میں داخل ہو جاؤ۔ جب تم داخل ہو جاؤ گے تو غلبہ تمہارے یہ ہو گا اگر ایمان لے ہو تو اللہ پر توکل کرو۔ وہ دو شخص حضرت یوشع بن نون اور کالب بن یونا تھے جو خدا سے ڈرتے تھے۔ اسی لیے عمالقہ وغیرہ کا ان کا کچھ ڈر نہ رہا۔

ہر کہ تو سیدانہ حق و تقویٰ گزید

ترسدا زوے جن دانس دہر کہ دید

ان دونوں نے کہا تھا کہ ہمت کر کے شہر کے پھاٹک تک تو چلو پھر خدا تم کو غالب کر دے گا خدا اسی کی مدد کرتا ہے جو خود بھی اپنی مدد کرے اور یہ بھی بتایا کہ اللہ پر توکل کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسباب مشروعہ کو ترک کرنا توکل نہیں۔ توکل یہ ہے کہ کسی نیک مقصد کے لیے انتہائی کوشش کرے۔ پھر اس کے مشرور و منتج ہونے کے لیے خدا پر بھروسہ رکھے۔ اپنی کوشش پر نازاں اور مغرور نہ ہو۔ باقی اسباب مشروعہ کو چھوڑ کر خالی امیدیں باندھتے رہنا توکل نہیں تعطل ہے بلکہ اس آیت میں جملہ باتیں تشریح طلب ہیں۔ اول یہ کہ رجلان سے کرن مراد ہیں دوم یہ کہ یخانون کا مفعول کیا ہے تیسرے یہ کہ ان کی اس تقریر کا پس منظر کیا ہے ؟

اس پر سارے شارحین قرآن کا اتفاق ہے کہ رجلان سے مراد یوشع بن نون اور کالب بن یوشع ہیں۔ تورات کا بیان بھی یہی ہے اور اسی کی پیروی میں مفسرین کا بھی یہی فیصلہ ہے الذین یخافون میں عام شارحین قرآن نے اللہ کو محذوف مان کر مطلب یہ بتایا ہے کہ یہ دو شخص جو اللہ سے ڈرتے تھے۔ انہوں نے کہا، لیکن یہ بات میرے دل کو نہیں لگتی ہے کیونکہ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ

صرف یہی خدا سے ڈسنے والے نہ تھے بلکہ ان کے ساتھ خدا سے ڈسنے والی ایک جماعت تھی، اگر صورت حال یہی ہے اور نہ ہونے کی وجہ کیلئے جب قرآن نے الذین یخافون چھوڑ کر الذین یخافون کی تعبیر اختیار کی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ڈسنے والے سارے بنی اسرائیل تھے لیکن یخافون کے معنوں میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ خدا سے ڈسنے والے، دوسرے یہ کہ دشمن سے ڈسنے والے۔ میری رائے میں دوسری بات زیادہ درنی ہے اور مطلب یہ ہے کہ یہ سب لوگ جن کو دشمن کی قوت کا اندیشہ نہ تھا تھا ان میں سے ان دونوں اپنی ایمانی قوت کا مظاہرہ کیا جن پر اللہ کا انعام ہر سہ اور باوجود خوف کے انہوں نے اعلانِ حق کیا اور جرأت دکھائی۔ یہ حقیقت ہے کہ جب پوری قوم اس طرح بہت بار میٹھے جس طرح بنی اسرائیل بار میٹھے تو ہمارے ہمارے آدمی کے اعصاب بھی جواب دے جاتے ہیں۔ بڑا ہی باخفا اور صداقت شعار ہے وہ شخص جو ایسے نازک موقع پر بھی اپنی وفاداری اور صداقت شعاری نباہ سکتا ہے۔ یوشع اور کالب کے کردار کا بھی پہلو ہے جس کے سبب عہدِ ميثاق کی اس سورت میں قرآن نے ان کا ذکر کر کے ان کو زندہ جاوید بنادیا تاکہ جو لوگ خدا کی راہ پر چلنے کا دکر ہیں وہ ان کے مثالی کردار سے یہ سبق لیں کہ جب سب سوجائیں تو جاکنے والے کس طرح جاگتے ہیں اور جب سب مر جاتے تو زندہ ہونے والے کس طرح زندہ ہوتے ہیں۔ قرآن نے یہاں ہزاروں کے اندر کے ہمارے اور مردوں کے اندر کے زندوں کو اس لیے نمایاں کیا ہے کہ ہمارے اندر ہمارے اور زندوں کے اندر زندہ تو بہت نظر آجائیں گے لیکن وہ ہستیاں بہت کیا ہیں جو مردوں کو زندگی بخشی ہیں۔ اگرچہ اسی راہ میں نہیں خود اپنی زندگیاں سے ہاتھ دھونے پڑ جائیں۔

ان دونوں مردانِ حق کی تقریر یہ ہے کہ ادخلوا علیہم الباب فاذا دخلتموہ فانکسہ غالبو ذلہ انہوں نے اعلان کیا کہ شہر کے چھاٹک سے ان پر چڑھائی کرو جب تم قدم اٹھاؤ گے تم ہی غالب رہو گے۔ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ بندہ جب اپنا فرض ادا کرنے کے لیے میں کے اپنے پاس جو طاقت و قوت موجود ہے اس کو میدان میں جھڑکتے ہیں تب اللہ اُن کو مدد سے نوازتا ہے گھروں میں میٹھ جانے والوں کی وہ مدد نہیں کرتا۔ قرأت میں ان کی تقریر ان الفاظ میں ہے :

اور ان کا بیٹا یثرو اور یثرو کا بیٹا کالب جو اس ملک کا حال دریافت کرنے والوں میں سے تھے اپنے اپنے کپڑے پہنا کر بنی اسرائیل کی ساری جماعت سے کہنے لگے کہ وہ ملک جس کا حال دریافت کرنے کو ہم اس میں سے گزرتے نہایت اچھا ملک ہے اگر خدا ہم سے راضی ہے تو وہ ہم کو اس ملک میں پہنچائے گا اور وہی ملک جس

میں دو دھ اور شہد بہنا ہے ہم کو دے گا فقط اتنا ہر کو تم خداوند سے بغاوت ذکر و اذ
 ناس ملک کے لوگوں سے ڈرو، وہ تو ہماری خوراک ہیں ان کی پناہ ان کے سر سے حالت
 رہی ہے اور ہمارے ساتھ خداوند ہے سوان کا خوف ذکر و تب ساری جماعت
 بول اٹھی کہ ان کو شکسا کر دو۔ (گنتی باب ۳، ۱۰، ۱۱، ۱۲)

نبوتِ محمد قبلے میں بنی اسرائیل کا مرد

۱۔ وہ بولے اے موسیٰ جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں ہم کبھی اسی میں داخل نہ ہوں گے
 تم خود جاؤ اور تمہارا رب بھی تمہارے ساتھ ہو اور دونوں ان سے جنگ کرو ہم تو یہاں بیٹھے رہیں گے
 یہ اس قوم کا قول ہے جو بنی اسرائیل کا دعویٰ رکھتی تھی۔ مگر یہ غنا خاندانوں کی
 کے ستر قردو طغیان سے کچھ بھی مستبعد نہیں تھے یہ کہنے والے عام بنی اسرائیل تھے۔ توریت میں اس
 موقع کی منظر کشی یوں کی گئی ہے۔ تب ساری جماعت چلا کر رولی اور لوگ اس رات بھر لڑا کیے،
 پھر سامنے بنی اسرائیل موسیٰ و ہارون پر کر کر کھڑے اور ساری جماعت نے انہیں کہا کہ اے کاہن ہم
 مصر میں رہ جاتے اور کاش ہم اسی بیابان میں فنا ہو جاتے، خداوند کس لیے ہمیں اس سرزمین میں
 لایا کہ تموار سے مرجائیں اور ہماری جوروں اور بچے پکڑے جائیں۔ (گنتی ۱۳-۱۴) تب ساری
 جماعت نے چالاکران پر یعنی یروش اور کالب پر چھراؤ کر دیا۔ (گنتی ۱۴، ۱۵)

ظاہر ہے کہ جن کی بزدلی کا یہ عالم ہو ان کے لیے حضرت موسیٰ اور یروش و کالب کی یہ یقین محفل
 کہ خدا ہمارے ساتھ ہے تم ان سے نہ ڈرو بالکل بے سود تھی، انہوں نے یقیناً اس کے جواب میں یہی
 کیا ہوگا کہ خدا اگر تمہارے ساتھ ہے تو تم اور ہمارا خدا جاکر لڑو، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔
 اس آیت میں جہاد کے مقابلے میں فقط قہود لاکر بنا دیا ہے کہ جہاد کے معنی اگر محنت اور کوشش
 کے ہیں تو قہود کے بیٹھنا یا بیٹھ کر ہنا ہیں جس سے مقصود سستی، تغافل اور ترکِ فرض ہے۔ قرآن
 میں یہ لفظ ان معنی میں کئی جگہ بولا گیا ہے۔ اسی کے قریب قریب جہاد کے اصطلاحی معنی میں آیا
 یعنی حتیٰ کی جنگ اور اس کی اشاعت اور حفاظت کے لیے ہر قسم کی جدوجہد، قربانی اور شہادت گوارا
 کرنا اور ان تمام جہانی و مالی اور دماغی قوتوں کو جو اللہ تعالیٰ نے دی ہیں اس راہ میں صرف کرنا یہاں

تک کہ اس کے لیے اپنے اپنے عزیز و اقارب کی اہل و عیال کی خاندان و قوم کی جان تک کو قربان کر دیتا۔ اور حق کے مخالفوں اور دشمنوں کی قوت کو توڑنا، ان کی تدبیروں کو راہِ نیگاں کرنا، ان کے حملوں کو روکنا اور اس کے لیے جنگ کے میدان میں اگر ان سے لڑنا پڑے تو اس کے لیے پوری طرح تیار رہنا بھی جہاد ہے، اسی کے مقابلے میں غلط فہم وہ آیا ہے اس کے منہ بیٹھنا اور کچھ نہ کہنا جس۔ اس تعالٰی سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ جہاد کی حقیقت بیٹھنے، کستی کرنے اور آرام ڈھونڈھنے کے سراسر خلاف ہے جب ایک قوم عرصہ دراز تک خلائی کی شوگر ہو جاتی ہے تو اس میں بلند مقاصد کی خاطر جہاد کی استعداد باقی نہیں رہتی۔ یہی حال بنی اسرائیل کا تھا۔ مقاصدِ امور کے لیے ان میں عزم و ہمت نہ تھی۔ بزدلی اور بے طاقتی کے قدم پکڑ لیے تھے۔ جب حضرت موسیٰ نے انہیں حکم دیا کہ سرزمینِ کنعان میں داخل ہو جاؤ جو تمہاری موعودہ سرزمین ہے تو کہنے لگے وہاں بڑے طاقتور لوگ رہتے ہیں ان کے مقابلے کی ہم میں طاقت نہیں ہے جب تک وہ وہاں سے نہ نکل جائیں ہم قدام نہ اٹھائیں گے۔

حضرت موسیٰ کی دُعا

۷۵۔ حضرت موسیٰ نے کہا خدا یا مجھے اپنے اور اپنے بھائی کے سوا کسی پر اختیار نہیں ہے لہذا تو ہم میں اور ان نافرمانوں میں بڑائی کر دے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سخت دلگیر ہو کر یہ دُعا فرمائی جو کہ تمام قوم کی مدد مل چکی اور بزدلانہ عصیان کو مٹا دیا۔ اسی لیے دُعا میں بھی اپنے اور ہارون علیہ السلام کے سوا کہ وہ نبی معصوم تھے اور کسی کا ذکر نہیں کیا۔ یوشع اور کالب بھی دونوں کے ساتھ تھے آگے بڑھے۔

حضرت موسیٰ کو بنی اسرائیل سے مذکورہ بالا جواب سن کر کسی غیر کی توقع نہ رہی اس لیے حضرت موسیٰ نے نہایت رنج و غم میں اپنے مولیٰ سے درخواست کی کہ میرے رب میرا اپنی ذات اور اپنے بھائی کی جان کے سوا کسی پر کوئی بس نہیں ہے اب تو مجھے اور ان بکر داروں کے درمیان فیصلہ کر دے۔ اتنی طویل محنت اور اتنے عظیم مجرا نہ کارناموں کے بعد بھی ان کی بے یقینی کا یہ عالم ہے کہ ایک شخص بھی ہماری آواز پر لبیک کہنے کے لیے تیار نہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں اب تو بس اب ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ بھی فرمائیے۔ ایک طرف ہم دو بھائی بے بس اور بے اختیار ہیں، اور

دوسری طرف یہ جم غفیر ہے ہر طرح گستاخ و نافران۔ یہ دُعا خلا ہو ہے کہ حضرت موسیٰ نے اپنی ناکادہ قوم کی سرکشی و بغاوت اور اپنی بے بسی پر وہی طرح محسوس کرنے کے بعد کہ۔ اس میں ان لوگوں کے لیے تسکین کا بڑا سامان ہے جو اصلاح کی خاطر محنت کرتے ہیں لیکن ناسمجھ سے ہمدوش نہیں ہوتے۔ قوم جب کمرٹا اور نافرانی کے لیے تل جاتے تو انبیاء تک کی محنتیں بے نتیجہ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ پھر کسی دلی بزرگ، عظام کی سعی و اصلاح اگر کامیوں سے دوچار ہو جاتے تو دل شکستہ کیوں ہوں۔ اللہ نے حضرت موسیٰ کی دُعا کو شرف قبول عطا فرمایا۔

بنی اسرائیل کو صحراگردی کی سزا

۷۹۔ اللہ کا حکم ہوا کہ اب چالیس برس تک وہ سرزمین ان پر سوارم کر دی گئی۔ یہ اسی بیابان میں سرگرداں رہیں گے لہذا لے موسیٰ تو ان نافرمانوں پر غمزدہ نہ ہو۔ یعنی فیصلہ کی دُعا، حسی اور ظاہری طور پر تو قبول نہ برتی۔ ہاں معنی فیصلہ ہو گیا کہ وہ سب تو عذابِ الہی میں گرفتار ہو کر سیران و گردن پھرتے تھے اور حضرت موسیٰ و حضرت ہارون پیغمبرِ اطمینان اور پورے قلبی کھون کے ساتھ اپنے منصب ارشاد و اصلاح پر قائم رہے جیسے کسی سبتی میں عام و باجھیل پڑے اور ہزاروں بیماروں کے مجمع میں دوچار دندہ رست اور قوی القلب ہوں جو ان کے محلجے۔ پادہ سدری اور تفقداحوال میں مشغول ہوں۔

بنی اسرائیل اور اُمتِ محمدیہ

حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ یہ سب قصہ اہل کتاب کو سنایا اس پر کہ تم پیغمبرِ آخر الزماں کی رفاقت ذکر دگے جیسے تمہارے اجداد نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رفاقت چھوڑ دی تھی اور جہاد سے جان چرا بیٹھے تھے تو یہ نعمت اور ان کو نصیب ہو گی چنانچہ نصیب ہوئی ایک لمحہ کے لیے اس سائے رکوع کو سامنے رکھ کر اُمتِ محمدیہ کے احوال پر غور کیجئے۔ ان پر خدا کے وہ انعامات ہوتے جو نہ پہلے کسی اُمت پر ہوتے نہ آئندہ ہوں گے۔ ان کے لیے خاتم الانبیاء سید المرسل صلی اللہ علیہ وسلم کو ابدی شریعت دے کر رفا دیا۔ ان میں وہ علماء اور ائمہ پیدا کیے جو باوجود غیر نبی ہونے کے انبیاء کے وظائف کو منایتِ خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔ ایسے ایسے خلفاء نبی علیہ السلام کے بعد اُمت کے قائد بنے جنہوں نے سائے جہان کو اخلاق اور اُصولِ سیاست وغیرہ کی ہدایت کی۔

اس اُمت کو بھی جہاد کا حکم ہوا۔ حمانہ کے مقابلے میں نہیں روئے زمین کے تمام جہادین کے مقابل میں۔ محض سرزمینِ شام فتح کرنے کے لیے نہیں بلکہ مشرق و مغرب میں کلمۃ اللہ بلند کرنے اور فتنہ کی جڑ اکھاڑنے کے لیے بنی اسرائیل سے خدا نے ارضِ مقدس کا وعدہ کیا تھا لیکن اس اُمت سے یہ وعدہ فرمایا:

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ
كَأَسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ
لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا

اگر بنی اسرائیل کو موسیٰ علیہ السلام نے پیٹھ پھرنے سے منع کیا تھا تو اس اُمت کو بھی خدا نے اس طرح خطاب کیا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ الَّذِينَ كَفَرُوا تَرَاهُمْ فَلا تَقُولُوا
هُمُ الْإِلَهِ بَار

انہام یہ ہوا کہ حضرت موسیٰ کے رفقاء تو حمانہ سے ڈر کر یہاں تک کہ گزرتے کہ اذھب انت و ربک فتاتلا انا اھلھنا قاعدون لیکن اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہا کہ خدا کی قسم اگر آپ سمندر کی موجوں میں گھس جائے گا حکم دیں گے تو ہم اسی میں کود پڑیں گے اور ایک شخص بھی ہم میں سے علیحدہ نہ ہو گا۔ امید ہے کہ خدا آپ کو ہماری طرف سے وہ چیز دکھائے گا جس سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی، ہم اپنے پیغمبر کے ساتھ ہو کر اس کے رہنے باقیں آگے اور پیچھے ہر طرف سے جہاد کریں گے۔ خدا کے فضل سے ہم وہ نہیں ہیں جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہہ دیا تھا اذھب انت و ربک فتاتلا انا اھلھنا قاعدون اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ جتنی مدت بنی اسرائیل فتوحات سے محروم ہو کر وادی تیر میں بھٹکتے رہے اس سے کم مدت میں محمد رسول اللہ کے اصحاب نے مشرق و مغرب میں ہدایت و ارشاد کا جھنڈا لگا کر دیا، رضی اللہ عنہم و رضوا ذالک لمن خشی ربہ الخ

حضرت موسیٰ کی درخواست کے مطابق اللہ سبحانہ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ سرزمینِ مقدس کو چالیس سال کے لیے ان پر حرام کر دیا اور فرمایا کہ مدت اسی محسوس اگر دی میں گزار دیں گے۔ تو رات میں اس کا ذکر اس طرح ہوا ہے:-

اور خداوند نے موسیٰ اور ہارون سے کہا، میں کب تک اس خبیث گروہ کی جو میری شکایت کرتا رہتا ہے برداشت کروں۔ بنی اسرائیل جو میرے خلاف شکایتیں کرتے رہتے ہیں۔ میں نے وہ سب شکایتیں سُن لی ہیں سو تم ان سے کہہ دو، خداوند کہتا ہے مجھے اپنی حیات کی قسم ہے کہ جیسے تم نے میرے سینے کہا ہے میں تم سے ضرور دیباہی کروں گا۔ تمہاری لاشیں اسی یہاں میں پڑی رہیں گی اور تمہاری ساری تعداد میں سے یعنی بیس برس سے بڑے کر اس سے اوپر اوپر کی عمر کے تم سب جھٹے گئے لگے اور مجھ پر شکایت کرتے رہے ان میں سے کوئی اس ملک میں جس کی بابت میں نے قسم کھائی تھی کہ تم کو وہاں بساؤں گا جانے نہ پاتے گا سوائے نصرت کے کلب ادولن کے پوشع کے۔ اور تمہارے بال بچے جن کی بابت تم نے یہ کہا کہ وہ تلوٹ کا مال ٹھہریں گے ان کو میں وہاں پہنچاؤں گا اور جس ملک کو تم نے حقیر جانا وہ اس کی نصرت کو پہنچا نہیں گئے اور تمہارا یہ حال ہو گا کہ تمہاری لاشیں اس بیابان میں پڑی رہیں گی اور تمہارے لڑکے بڑے چالیس برس تک بیابان میں پھرتے اور تمہاری زنا کاریوں کو پھل پاتے رہیں گے۔ گنتی باب ۱۴، ۲۵، ۳۴۔

ان دنوں کے شمار کے مطابق جن میں تم اس سرزمین میں جا سکی کرتے ہے جو چالیس دن ہیں دن تیچھے ایک سال ہو گا سو تم چالیس برس تک اپنے گناہ کو اٹھاتے رہو گے۔ تب تم میری عہد شکنی کو جان لو گے۔ میں نے جو خداوند ہوں کہا ہے کہ میں سائے خبیث گروہ سے جو میری مخالفت پر جمع ہیں ایسا ہی کروں گا اس دشت میں وہ بڑا دہوں گے اور یہیں ہلاک ہوں گے۔

محرمۃ علیہم کا مطلب یہ ہے کہ تکوینی طور پر اب یہ ممکن ہی نہ ہو گا کہ ہم سال سے قبل اس ارض مقدس میں داخل ہو سکیں اور جو نعمت انہیں تھوڑی سی جدوجہد کے بعد فی الفور مل رہی تھی اب اس کے لیے انہیں چالیس سال انتظار کرنا ہو گا۔ اس میں مصیبت یہ تھی کہ چالیس سال کے اندر پچھلے نسل ختم ہو جائے تھی جسے مصر کی غلامانہ زندگی نے لکھا کر دیا ہے اور ایک نئی نسل پیدا ہو جاتے گی جس نے بیابان کی آواز آد آد ہو کر انہیں نشوونما پائی ہو گی اور غلامانہ ذہنیت کی سمیت سے محفوظ ہو گی چنانچہ جب چالیس سال گزر گئے اور ایک نئی نسل ظہور میں آگئی تو وہ ٹرعی اور موعودہ سرزمین پر قابض ہو گئی۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ ابْنِ آدَمَ بِالْحَقِّ إِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتَقَبَّلَ مِنْ
 أَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْآخَرِ قَالَ لَأَقْتُلَنَّكَ قَالَ
 إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ ۖ لَئِنْ بَسَطْتَ إِلَيَّ يَدَكَ
 لَتَفْقَأَنِي مَآثِرًا بِاسِطٍ يَدَايَ إِلَيْكَ لَأَقْتُلَنَّكَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ
 رَبَّ الْعَالَمِينَ ۖ إِنِّي أُرِيدُ أَنْ تَبْوَآءَا بِإِثْمِي وَإِثْمِكَ فَتَكُونَ
 مِنْ أَصْحَابِ النَّارِ وَذَلِكَ جَزَاءُ الظَّالِمِينَ ۖ فَطَوَّعَتْ لَهُ
 نَفْسُهُ قَتْلَ أَخِيهِ فَقَتَلَهُ فَأَصْبَحَ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۖ فَبَعَثَ
 اللَّهُ غُرَابًا يَبْحَثُ فِي الْأَرْضِ لِيُرِيَهُ كَيْفَ يُوَارِي سُوَّةَ لَخْمِهِ
 قَالَ يُوَهِّبُنِي آعْجَزْتُ أَنْ أَكُونَ مِثْلَ هَذَا الْغُرَابِ فَأُوَارِي سُوَّةَ
 أَخِي فَأَصْبَحَ مِنَ النَّادِمِينَ ۖ

انجیل

اور اے پیغمبر ان لوگوں کو آدم کے دو بیٹوں کا حال سبائی کے
 ساتھ سناؤ۔ جب ان دونوں نے قبولیت کے لیے قربانی

پیش کی تو ان میں سے ایک کی قبول کر لی گئی اور دوسرے کی قربانی قبول نہیں کی گئی، اس پر اس نے یعنی جس کی قربانی قبول نہ ہوئی متقی کہا کہ میں یقیناً تجھے مار ڈالوں گا جس کی قربانی قبول ہو گئی تھی اس نے کہا کہ اللہ صرف متقی لوگوں کی قربانی قبول کرتا ہے۔ اگر تو مجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ اٹھائے گا تو اس پر بھی میں تجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ نہ اٹھاؤں گا، میں اللہ سے ڈرتا ہوں جو ساری کائنات کا مالک ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تو میرا اور اپنا دونوں کا گناہ سمیٹ لے اور پھر دہشتیوں میں سے ہو جائے کہ ظلم کرنے والوں کا یہی بدلہ ہے۔ بہر حال اس کے نفس نے اس کو اپنے بھائی کے قتل پر آمادہ کر دیا اس نے اسے مار ڈالا۔ بس وہ تباہ کاروں میں سے ہو گیا۔ اس کے بعد خدا نے ایک کو اردو نہ کیا اور وہ زمین کریدنے لگا تاکہ اسے دکھائے

کہ اپنے بھائی کی لاش کیوں کر زمین میں چھپاتے۔ یہ دیکھ کر وہ
 بول اٹھا افسوس مجھ سے اس کو تے کی طرح بھی نہ ہو سکا کہ اپنے
 بھائی کی لاش چھپا دیتا اس کے بعد وہ اپنے کیے پر پشیمان ہو گیا۔

حسد کے لیے واقعاتی تمثیل

دو تے زمین کی امامت اور قیادت کے لیے اللہ نے اُمت محمدیہ کو قبول فرمایا اور اہل کتاب کو
 رد کر دیا۔ بنی اسرائیل کی یہ شقاوت کہ وہ اُمت محمدیہ سے حسد میں بالکل بے لگام ہو گئے تھے۔ اور
 انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کو قتل کرنے کے لیے سازش کی تھی۔ یہاں اس
 واقعہ کے ذکر کرنے سے مقصد یہودیوں کی اس سازش پر لطیف طریقہ سے علامت کرنا ہے۔ دونوں
 واقعات میں مماثلت بالکل واضح ہے۔ یہ بات کہ اللہ سبحانہ نے اُمت محمدیہ کو قبولیت کا درجہ عطا
 فرمایا اور ان پر اپنے اہل کتاب کو رد کر دیا مگر اس بنیاد پر تھی کہ ان کی امتیاز متفقانہ سیرت تھی اور دوسری
 طرف فسق و فجور تھا لیکن سبھائے اس کے کہ وہ لوگ جن کو روک گیا تھا اپنے مردود ہونے کی وجہ پر غور کرتے
 اور اس قصور کی تلافی کرنے پر مائل ہوتے جس کی وجہ سے وہ منصب امامت سے ہٹائے گئے تھے ان
 پر ٹھیک اسی جاہلیت کا دورہ پڑا جس میں آدم کا وہ غلط کار بیٹا مبتلا ہوا تھا اور اسی کی طرح وہ حسد
 کی آگ میں جل کر قتل کی سازشیں کرنے لگے۔ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ حسد کرنے کے سبھائے قیادت کے
 منصب قائم رہنے کے لیے مقدم چیز یہ ہے کہ آدمی کے اندر خدا کا خوف ایسا ہو جو سخت سے سخت
 آزمائش میں بھی اس کے قدم راہ حق پر استوار رکھے۔ اور پھر یہ کہ امامت کے منصب سے ہٹنے کا
 باعث وہ فاسد جذبات ہیں جو شیطان کی انگلیخت سے پیدا ہوتے ہیں اور بالآخر وہ انسان کو ایسے
 جرائم پر آمادہ کر دیتے ہیں جو عہد الہی کے بالکل منافی ہوتے ہیں جس طرح اللہ کے نیک بندے پر وہاں
 محمد رسول اللہ عام فساد اخلاق و کردار کے باوجود متفقانہ سیرت اور اخلاق پر استوار ہے۔ انہوں
 نے اپنے جانوں کی پرواہ نہ کی اسی طرح اللہ کے نیک بندے بائبل نے اپنے بھائی قابیل کے

ظہر۔ تعدی کے مقابلہ میں اپنے آپ کو حق و عدل کی حفاظت پر استوار رکھا اور قابیل کی دشمنی اس کو حق و عدل سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکی یہاں تک کہ اسی حق و عدل کی حفاظت میں اس نے اپنی جان قربان کر دی۔ یہاں بھی دو بھائیوں کی اولاد ہے۔ ایک طرف بنی اسماعیل ہیں، دوسری طرف اولاد اسحاق ہے۔ بنی اسماعیل اُمت محمدیہ ہے اور اولاد اسحاق اہل کتاب ہیں۔ ہجر محمدیہ عدل و حق کی طہارت ہے اور اس کی حفاظت میں اپنی جانوں کی بازی لگا رہی ہے اور اولاد اسحاق چڑھ رہی ہے اور ان کو ختم کرنے کی سازشیں کر رہی ہے۔ قرآن واقعہ کے رنگ میں اہل کتاب کو ملامت کے ساتھ اُمت محمدیہ کو سمجھا رہا ہے کہ تم دنیا میں حق و عدل کے قائم کرنے آئے ہو اور اس کی تاریخ نہایت قدیم ہے اس راہ کا سب سے پہلا شہید آدم کا بیٹا ہابیل ہے جس نے اپنے عمل سے بعد کی نسلوں کے لیے یہ زندہ ہادیہ مثال قائم کی کہ حق پر ڈٹے رہنا باطل پر زندہ نہ ہونے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ یا ایہا الذین آمنوا کدبنوا فتوا میں للہ شہدا بالعدل اور بس اہل کتاب کے حد کی پروا نہ کرو۔ ان کے پاس قابیل کی وراثت ہے تم حق پر ڈٹے رہو کہ تم ہابیل کے کردار کے وارث ہو۔

۸۰۔ اور اے پیغمبران لوگوں کو آدم کے دو بیٹوں کا حال بھائی کے ساتھ سنا دو۔ یعنی آدم کے دو صلیبی بیٹے خدیل و ہابیل کا قصہ ان کو سنا دو، کیونکہ اس قصہ میں ایک بھائی کے دوسرے بھائی کی مقبولیت اور تقویٰ پر عمل کرنے اور اسی فیصلہ میں اس کو ناحق خون کرنے کے حواقب بیان کیے ہیں۔ پچھلے رکوع میں یہ بتایا تھا کہ بنی اسرائیل کو جب یہ حکم دیا گیا کہ ظالموں اور مہاروں سے قتال کرو تو خوفزدہ ہو کر ہٹ گئے۔ اب ہابیل و قابیل کا قصہ سنا اس کی تہدید ہے کہ مستحق اور مقبول بندوں کا قتل جو شدید ترین جرائم میں سے ہے اور جس سے ان لوگوں کو بے انتہا تہدید و تشدد کے ساتھ منع کیا گیا تھا۔ اس کے لیے یہ طعن ہمیشہ کیسے مستعد اور تیار نظر آتے ہیں۔ پہلے کتنوں غیور کو قتل کیا اور آج بھی خدا کے سب سے پیغمبر کے خلاف ارزاہ بننے و حد کیسے کیسے منصوبے لگائے جیتے ہیں۔ گویا ظالموں اور شریروں کے مقابلے سے جان چرانا اور بے گناہ معصوم بندوں کے خلاف قتل و اسر کی سازشیں کرنا یہ اس قوم کا شیوہ رہا ہے اور اس پر بخن اجنا للہ واحملوا کا دعویٰ بھی رکھتے ہیں۔ اس تقریر کے موافق قابیل و ہابیل کا قصہ۔ پھر اس پر من اجل ذالک کتب علی بنی اسرائیل کہ یہ سب تہدید ہوگی۔ اس معصوم کی جو اس قصہ اور تصریح کے ختم پر فرمایا ولعد جادتمہم راصلنا بالینات شہد ان کشیدوا منہم

بعد ذلك في الارض لسرفون انا جزاء الذين يحاربون الله
ورسوله الخ لے

اس آیت میں چند ضروری باتیں تشریح طلب ہیں۔ اول یہ کہ عیسیم کی ضمیر مرجع رب کی کتاب ہیں جن کا ذکر پہلے سے ہوا ہے اگرچہ نفس واقعہ حکمت و مصلحت نے اس لحاظ سے عام ہے۔ جیسے یہود کے لیے بہت آموز ہے ایسے ہی مسلمانوں کے لیے بھی ہے لیکن واقعہ کی زد میں براہ راست یہودیوں کی کو کہ یہود نے اس آیت کے معاملہ میں بالکل وہی طرز عمل اختیار کیا تھا۔ تاہم بائبل کے معاملہ میں اختیار کیا تھا جس طرح بائبل کی خدا سے مقبولیت سے قابل میں مسد کی آگ بھڑک رہی تھی، اسی طرح یہود نے جب اس آیت پر برائی نواز نہیں دیکھیں تو حسد کے جنون میں ایسے بے لگام ہوتے کہ بد بختی اور شقاوت کی آخری حدیں چھاندر گئے۔

دوم یہ کہ قرآن نے جن کو ابھی آدم کہا ہے ان کا نام کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن نے ان کا نام نہیں بتایا ہے۔ شارحین قرآن نے تو رات کی مدد سے آدم کے ان دونوں بیٹوں کے بائبل اور تان بتاتے ہیں۔ اہل عرب ان کو بائبل اور قابل کہتے تھے۔ قرآن نے ان کے واقعہ کے لیے نیا کی تعبیر اختیار کی ہے۔ نیا کسی اہم حادثے اور واقعہ کی خبر کو کہتے ہیں۔ چونکہ یہ واقعہ اس آسمان کے نیچے عدل و ظلم و فساد اور عداوت و دشمنی، خدا و خونی اور تقدی کی کشمکش کا تاریخی انسانی میں پیدا واقعہ ہے اس لیے اس کو نیا سے تعبیر کیا ہے لیکن چونکہ واقعہ میں تاریخ کی غلط کردوٹوں نے ہاتھ کی صفائی بھی دکھائی تھی۔ اس لیے واقعہ کے آغاز ہی میں بالحق کی قید لگا دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن جو کچھ بیان کر رہا ہے وہ واقعہ اور حقیقت ہے اور قرآن سے باہر معنی داستان سرائی کے لیے جو کچھ بیان کیا جاتا ہے وہ واقعہ اور حقیقت نہیں ہے۔ ہم یہاں اسی واقعہ کو تو رات سے نقل کرتے ہیں اس کو پڑھیے اور پھر قرآن کے بیان سے مقابلہ کر کے دیکھتے تو اس سے آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا کہ بالحق کی قید لگانے کا مقصد کیا ہے۔

اور آدم اپنی بیوی حوا کے پاس گیا اور وہ حاملہ ہوئی اور اس کے قاتن پیدا ہوا،
تب اس نے کہا کہ مجھے خداوند سے ایک مرد ملا پھر قاتن کا بھائی بائبل پیدا ہوا اور
بائبل ہمیشہ بیکریوں کا چرواہا تھا اور قاتن کسان تھا۔ چند روز کے بعد یوں ہوا کہ

قائمن اپنے کعبہ کے چل کا ہریہ خداوند کے واسطے لایا اور بابل بھی اپنی بھیڑ بکریوں کے کچھ پہلو مٹے بچوں کا اور کچھ ان کی جڑی کا ہریہ لایا اور خداوند نے بابل اور اس کے ہریہ کو منظور کر لیا پھر قائمن اور اس کے ہریہ کو منظور کیا۔ اس لیے قائمن نہایت غضبناک ہوا اور تیرا منہ کیں بجھا ہوا ہے اگر تو بھلا لے تو کیا تو مقبول نہ ہو گا۔ اور اگر تو بھلا کرے تو گنہ دار نہ رہے پر دیکھا بیٹھا ہے اور تیرا مشاقتی ہے پھر تو اس پر غالب آ اور قائمن نے اپنے بھائی بابل کو کچھ کہا اور جب وہ دونوں کعبہ میں تھے۔ تو یوں ہوا کہ قائمن نے اپنے بھائی بابل پر حملہ کیا اور اسے قتل کر ڈالا تب خداوند نے قائمن سے کہا کہ تیرا بھائی بابل کہاں ہے اس نے کہا مجھے معلوم نہیں۔ کیا میں اپنے بھائی کا محافظ ہوں۔ پھر اس نے کہا تو نے یہ کیا کیا تیرے بھائی کا خون زمین سے ٹھکڑا پکڑا ہے اور اب تو زمین کی طرف سے لعنتی برا جس نے اپنا منہ پیاز کر تیرے ہاتھ سے تیرے بھائی کا خون لے جب تو زمین کو جوئے کا ثواب وہ تجھے اپنی پیداوار نہ لے گی اور زمین پر تو غار خراب اور آوارہ ہو گا۔ (کتاب پیدائش باب ۲-۱-۱۲)

بتایا یہ چاہتا ہوں کہ بالحق کی قید لگا کر قرآن نے بتا دیا کہ جو کچھ میں بتا رہا ہوں وہ واقعہ اور حقیقت ہے جس میں کوئی اقباس اشتباہ نہیں۔ جو ٹھٹھ اور دہم کا کوئی تعلق نہیں زیادتی اور کمی کوئی نہیں ہے

تاریخی روایات میں احتیاط

اس طرح بالحق کی قید لگا کر موجدین کے لیے ایک اہم اصولی حقیقت کو فراہم کر دیا کہ روایات تاریخ کی نقل میں بہت بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ صرف یہیں نہیں بلکہ قرآن نے ایک سے زیادہ مواقع پر اس اصول کی نشاندہی کی ہے مثلاً ان هذا هو القصص الحق، نحن نعتمد علیہ بناہم بالحق۔ اس قسم کے مواقع میں قرآن کا بالحق کی قید لگانا یہ بتانے کے لیے ہے کہ نقل واقعات اور تاریخی روایات میں صداقت و واقعیت کا دامن کسی حال میں نہ چھوڑنا چاہیے تاریخ کی بے سند اور غیر واقعی روایات کی بنا پر دنیا میں جو مفاسد اور خرابیاں برپا ہو گئی ہیں وہ محتاج بیان نہیں مذہب کا واقعی چہرہ بگاڑنے والی چیز اضافی روایات ہیں۔ یہودی اس میدان میں سب سے آگے ہیں۔ اس کے نتیجے میں مذہب، نبوت اور خدا کی کتاب بامعینیت سے بیکار ہو کر رہ جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حقائق اور واقعات چھوڑ کر مذہب نام ہی عذاب و

غائب کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ سو مگر یہ کہ ان دونوں یعنی ہابیل وقابیل کا واقعہ تو وہی ہے جو آپ قرآن میں آگے پڑھیں گے لیکن شارحین قرآن نے دونوں کی اس قربانی کے پیش کرنے کا پس منظر بھی بتانے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ حافظ محمد الدین ابن کثیر رقمطراز ہیں،

دنیا نے انسانی میں اضافہ کے لیے حضرت آدم کا یہ دستور تھا کہ تھوڑے سے توام (بچڑواں) پیدا ہونے والے لڑکے اور لڑکی کا عقد دوسرے پیٹ سے پیدا ہونے والے توام بچوں کے ساتھ کر دیا کرتے تھے۔ اسی دستور کے مطابق قابیل اور ہابیل کی شادی کا معاملہ تھا۔ قابیل عمر میں بڑا تھا اور اس کی ہمیشہ ہابیل کی ہمیشہ سے زیادہ خوبصورت تھی۔ قابیل کو یہ انتہائی ناگوار تھا کہ دستور کے مطابق ہابیل کی ہمیشہ سے اس کی شادی ہو اور ہابیل کی اس کی ہمیشہ سے۔ معاملہ کو ختم کرنے کے لیے حضرت آدم نے یہ فیصلہ فرمایا کہ دونوں اپنی اپنی قربانی خدا تعالیٰ کی جناب میں پیش کریں، جس کی قربانی منظور ہو جلتے ہو ہی اپنے ارادے کے پورا کر لینے کا مستحق ہے۔

واقعہ کا یہ پس منظر سدی نے ایک سے زیادہ صحابہ کرام مثلاً عبداللہ بن مسعود، عبداللہ ابن عباس کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ سدی کے علاوہ ہمارے پاس اس واقعہ کے علم کا کوئی ذریعہ نہیں ہے خود سدی کا ارباب تحقیق کے یہاں کیا مقام ہے اس میں اہل علم کے خیالات اگرچہ مختلف ہیں کچھ کہ ان کو حمایت حاصل ہے لیکن کچھ کی رائے میں ان پر تشیع کا الزام ہے اور سوجانی ان کو کذاب کہتے ہیں۔ اگر ان کی صداقت کا لوہا مان بھی لیا جائے تو پھر بھی آدم کے بیٹوں کا یہ واقعہ اپنی جہت و موافقت کے لیے کسی پس منظر کا محتاج نہیں ہے۔

ہابیل وقابیل کی قربانی

۸۱۔ جب ان دونوں نے قبولیت کے لیے قربانی پیش کی تو ان دونوں میں سے ایک کی قبول کر لی گئی اور دوسرے کی قبول نہیں کی گئی۔ یعنی آدم علیہ السلام دستور کے موافق جو لڑکی ہابیل کے نکاح میں دینا چاہتے تھے قابیل اس کا المیگاہ ہوا۔ آخر حضرت آدم کے اشارے سے دونوں نے خدا کے لیے کچھ نیاز کی کہ جس کی نیاز قبول ہو جائے لڑکی اسی کو مے دی جائے۔ آدم علیہ السلام کو غالباً یہ یقین تھا کہ ہابیل کی ہی نیاز قبول ہوگی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ آتش آسمانی ظاہر ہوئی۔ اور ہابیل کی نیاز کو کھا گئی اور یہی علامت اس وقت عند اللہ قبول کی تھی بلکہ جمال الدین قاسمی

نے لکھا ہے کہ ہابیل کی نذر مخلصانہ تھی اس نے اپنے گلے کی بہترین بھیڑ پیش کر دی تھی وہ قبول ہو گئی۔
 بڑے بھائی قابیل نے اپنے کھیت کی پیداوار کا ناقص حصہ پیش کیا وہ قبول نہ ہوا۔ قبولِ نیاز کا اس
 وقت علامت یہ تھی کہ آسمان سے آگ اگر نذر قبول کر لیتی تھی تو رات میں اس کے اشائے آتے ہیں۔
 قربان کا لفظ صدقہ اور قربانی دونوں کے لیے آتا ہے جو چیز بھی اللہ کے حضور بقصد قربان الہی
 پیش کی جائے وہ قربان ہے یہودیوں میں کئی قسم کی قربانیں تھیں۔

۱۔ وہ قربان جن کو کتا ہوں کی معافی کے لیے نذر آتش کیا جاتے۔ ۲۔ وہ نذرانے جو آتے نذرین
 اور قربان پر مشتمل ہوں، ۳۔ پیداوار کا تروتازہ پھل۔ عیسائیوں میں قربان وہ شرباب اور روٹی ہے
 جسے کاہن مقدس بنا لے۔ اصل میں عربی لفظ قربان مصدر ہے ہر وہ چیز جس کے ذریعے بطور نیاز
 اللہ کا قرب حاصل کیا جاتے قربان ہے۔ یہاں قرآن نے یہ وضاحت نہیں کی ہے کہ ہابیل اور قابیل
 کو قبولیت اور عدم قبولیت کا پتہ کیسے چلا کیونکہ یہ وضاحت قرآن کے پیش نظر مقصد کے لحاظ سے
 غیر ضروری تھی لیکن اسرائیلی روایات کہتی ہیں کہ قبولِ نیاز کی اس وقت علامت یہ تھی کہ آتش آسمانی
 اگر لگا جاتی اور تورات کے مذکورہ بالا بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی خبر خداوند نے دی تھی۔

مدار قبولیت صرف تقویٰ ہے

۸۲۔ اس پر اس نے یہی جس کی قربانی قبول نہ ہوئی تھی کہا کہ میں یقیناً تجھے قتل کر دوں گا اور
 جس کی قربانی قبول ہو گئی تھی اس نے کہا کہ اللہ صرف متقی لوگوں کی قربانی قبول کرتا ہے۔ قابیل
 دیکھ کر آتشِ حسد میں جلنے لگا اور بھاتے اس کے کہ مقبولیت کے وسائل تلاش کرنا غلط و غضب
 میں اپنے حقیقی بھائی کو قتل کی دھمکیاں دینے لگا۔ اس پر بھی ہابیل نے شرافت و متانت کو ہاتھ
 سے نہیں جانے دیا بلکہ کہا کہ اگر تیری قربانی قبول نہیں ہوئی تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ خدا کے
 یہاں کسی کی زبردستی نہیں چلتی تقویٰ چلتا ہے۔ گریہ میری نیاز ہو قبول کر لی گئی اس کا سبب تقویٰ ہے
 تو بھی اگر تقویٰ اختیار کرے تو اللہ کو تجھ سے کوئی ضد نہیں ہے۔

ہابیل نے اسی اصول بات کہی جس میں قابیل کی مجددی اور خیر خواہی بھی تھی کہ اللہ کا دستور
 یہ ہے کہ پرہیزگار اور متقی کا عمل قبول کرتا ہے۔ اگر تم تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کرتے تو تمہاری

قربانی بھی قبول ہو جاتی۔ تم نے ایسا نہیں کیا تو قربانی قبول نہ ہوئی اس میں میرا کیا تصور ہے۔
 امام دہلوی فرماتے ہیں کہ تقویٰ میں تین باتوں کا ہرنا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ قبولِ طاعت میں
 خشیتِ الہی کا استحضار ہو، دوسرے یہ کہ کوشش اس کی کرے کہ طاعت سے رضائے الہی کے سوا
 کچھ اور مقصود نہ ہو، تیسرے یہ کہ غیر اللہ کی شرکت و آمیزش ڈرانہ ہو۔ محققین کا اس پر اتفاق ہے
 کہ تقویٰ سے یہاں مراد شرک سے بچنا ہے۔ لہذا جو شرک سے محفوظ ہو اور توحید پر قائم ہو تو جن
 اعمال میں اس نے صدقِ بیت سے کام لیا وہ مقبول ہوں گے اور جو شرک و مصیبت دونوں
 سے بچ کر رہا وہ قبولِ درجہ دونوں کا حقدار ہے۔ اس فقرے کو علماء برحق نے عبادت گزاروں
 اور اللہ کے دین کا کام کرنے والوں کے لیے بہت بڑا تازیانہ قرار دیا ہے۔ اسی لیے حضرت عبداللہ
 بن عامر کے بائے میں لکھا ہے کہ وہ اپنی وفات کے وقت روہے تھے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ
 آپ تو عمر بھر اعمالِ صالحہ اور عبادت میں مشغول رہے پھر روہنے کی کیا وجہ؟ فرمایا تم یہ کہتے ہو
 اور میرے کانوں میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گونج رہا ہے اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ الْمُتَّقِينَ مجھے کچھ معلوم
 نہیں کہ میری عبادت قبول بھی ہوگی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ اگر مجھے یہ یقین
 ہو جاتے کہ میرا کوئی عمل اللہ تعالیٰ قبول فرمایا تو یہ وہ نعمت ہے کہ ساری زمین کا سونا بن کر اپنے
 قبضہ میں آجاتے تو بھی اس کے مقابلہ میں کچھ نہ سمجھوں۔ ایسے ہی حضرت ابوالدرداء فرماتے ہیں کہ
 اگر یہ بات یقینی طور پر ملے ہو جاتے کہ میری ایک نماز اللہ تعالیٰ کے نزدیک قبول ہوگئی تو میرے
 لیے وہ ساری دنیا اور اس کی نعمتوں سے زیادہ ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ایک شخص کو
 خط میں یہ نصائح لکھیں کہ:

میں تجھے تقویٰ کی تاکید کرتا ہوں جس کے بغیر کوئی عمل قبول نہیں ہوتا۔ اور اہل
 تقویٰ کے سوا کسی پر رحم نہیں کیا جاتا اور اس کے بغیر کسی چیز پر ثواب نہیں ملتا۔
 اس بات کا غلط کہنے والے تو بہت ہیں مگر عمل کرنے والے بہت کم ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ، فرماتے ہیں کہ تقویٰ کے ساتھ کوئی چھوٹا سا عمل بھی چھوٹا نہیں ہے
 اور جو عمل مقبول ہو جاتے وہ چھوٹا کیسے کہا جاسکتا ہے۔

بائبل کا عظیم کردار

۸۳۔ اگر تو مجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ اٹھائے گا تو اس پر مجھ میں کچھ قتل کرنے کے لیے ہاتھ نہ اٹھاؤں گا میں اللہ سے ڈرتا ہوں جو ساری کائنات کا مالک ہے۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ:

اگر کوئی ناحق کسی کو مارنے لگے اس کو رخصت ہے کہ ظالم کو مارے اور اگر مہر کرے تو شہادت کا درجہ ہے۔

اور یہ حکم اپنے مسلمان بھائی کے مقابلے میں ہے ورنہ جہاں انتقام و مدافعت میں شرم و محنت اور ضرورت ہو وہاں ہاتھ پیر کو توڑ کر بیٹھنا جائز نہیں ہے مثلاً کافروں اور اعیانوں سے قتال کرنا، والذین اذا اصابتهم البغي هم يستعرون۔ آخر میں فرمایا کہ انی اخاف للہ مطلب یہ ہے کہ میں تجھ سے ڈر کر نہیں بلکہ اللہ سے ڈر کر یہ چاہتا ہوں کہ جہاں تک شرعاً گنجائش ہے بھائی کے خون سے ہاتھ رنگیں نہ کروں۔ ایوب سختیانی فرماتے ہیں کہ اکتب محمدیہ میں سے پہلا شخص جس نے اس آیت پر عمل کر کے دکھایا۔ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ہیں جنہوں نے اپنا گھلا کٹوا دیا لیکن اپنی رضا سے کسی مسلمان کی انگلی نہ کٹنے دی بلکہ

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر تو مجھے قتل کرنے کے لیے آئے گا تو میں ہاتھ باندھ کر تیرے سامنے قتل ہونے کے لیے بیٹھ جاؤں گا اور مدافعت نہ کروں گا۔ یہ ہے کہ تو میرے قتل کے درپے ہوتا ہے تو میں تیرے قتل کے درپے نہ ہوں گا تو میرے قتل کی تدبیریں کرنا چاہیے تو مجھے اختیار ہے لیکن میں یہ جاننے کے بعد بھی کہ میرے قتل کی تیاریاں کر رہا ہے یہ کوشش نہ کروں گا کہ میں پہلے ہی تجھے مار دوں۔ جہاں یہ بات سمجھ لیں چلیے کہ کسی شخص کا اپنے آپ کو خود قاتل کے آگے پیش کر دینا اور ظالمانہ حملہ کی مدافعت نہ کرنا کوئی بیک نہیں ہے۔ البتہ نیکی یہ ہے کہ اگر کوئی شخص میرے قتل کے لیے ہو اور میں جاننا ہوں کہ وہ میری گھات میں لگا ہوا ہے تب بھی میں اس کے قتل کی فکر نہ کروں اور اسی بات کو ترجیح دوں کہ ظالمانہ اقدام اس کی طرف سے ہو نہ کہ میری طرف سے ہو۔ یہی مطلب تھا اس بات کا جو آدم علیہ السلام کے اس نیک بیٹے نے کہی ہے

لے افادات شیخ الاسلام لے تفہیم القرآن

یہ بات یہاں ذہن میں رکھنی چاہیے کہ یہ میدان جنگ میں نہایت کی صورت نہیں ہے بلکہ بھائی کا بھائی سے معاملہ ہے۔ ایک بھائی دوسرے بھائی کو قتل کی دھمکی دے رہا ہے۔ اس صورت میں صحیح فرمان دینا یہی ہے کہ آدمی بڑھانتے ہوئے بھی کہ اس کا کوئی بھائی قتل کے ڈپے ہے اس کے قتل کے لیے پہل دیکھے لیکن پہل دیکھنے کا مطلب یہ نہیں کہ اپنا بچاؤ بھی نہ کرے۔ بلکہ پہل کرنے کی نئی کی ہے بچاؤ کی نئی نہیں کی۔ اپنی جان یا اپنے مال کی حفاظت خوف خدا کے منافی نہیں ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ اگر شخص مجھ سے میرا مال چھیننا چاہتا ہے تو میں اس کے ساتھ کیا معاملہ کروں۔ ارشاد ہوا کہ اس کو خدا کا خوف دلاؤ۔ اس نے کہا اگر وہ خدا کا خوف نہ مانے ارشاد ہوا کہ اپنے گرو پیش کے مسلمانوں سے اس کے مقابلے کے لیے مدد چاہو۔ ربائی نے کہا کہ اگر میرے اوپر دگر دے ایسے لوگ نہ ہوں ارشاد ہوا کہ پھر حکومت سے مدد چاہو۔ سائل نے کہا کہ اگر حکومت کے ذریعہ بھی دودھوں، ارشاد ہوا کہ اپنے مال کی حفاظت کے لیے لڑنا نہ کو اپنے مال کو بچاؤ یا شہید ہو جاؤ۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر تم جیسا کہ دھمکی دے رہے ہو میرے قتل کے لیے اقدام کرنا چاہتے ہو تو میں یہ فرض کر کے کہ تم میرے قتل کے ڈپے ہو تمہارے قتل میں پہل کرنے والا نہیں ہوں میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں۔

یہاں مسند احمد، ابوداؤد، ترمذی کی وہ حدیث قابل تفتید ہے جس میں سعد بن ابی وقاص نے دربار نبوت میں عرض کی کہ یا رسول اللہ! آپ اس معاملہ میں کیا فرماتے ہیں کہ اگر ایک شخص میرے گھر میں گھس آئے اور مجھے قتل کرنے کے لیے دست دراز کی کرے تو میں کیا کروں؟ فرمایا کہ ابن آدم، بلیل لا کر دار پیش کر اور آپ نے یہ آیت گزشتہ تلاوت کی۔

بارگاہ پہل کرنے والے پر ہے

۸۴۲۔ میں چاہتا ہوں کہ تو میرا دواؤں کا گناہ بیٹھے اور پھر درخیزوں میں سے ہو جائے کہ ظلم کرنے والوں کا یہی بدلہ ہے۔ یعنی میرے قتل کا گناہ بھی اپنے دوسرے گناہوں کے ساتھ حاصل کرے۔ ابن جریر نے مفسرین کا اجماع نقل کیا ہے کہ بائیس کے معنی یہی ہیں۔ باقی جنہوں نے یہ بھی

ہے کہ قیامت میں مظلوم کے گناہ ظالم پر ڈالے جائیں گے وہ مضمون بھی ایک معیشت سے صحیح ہے مگر متعین کے نزدیک وہ اس آیت کی تفسیر نہیں ہے۔ اب بائبل کے کلام کا حاصل یہ ہوا کہ اگر تو نے بھی شان لی ہے کہ میرے قتل کا دیاں اپنے سر لٹے تو میں نے بھی ارادہ کر لیا ہے کہ کوئی مدافعت اپنی جانب سے نہ کروں حتیٰ کہ ترک عزیمت کا خوف بھی مجھ پر آئے اور تیرے عمر کے گناہ تجھ پر ثابت رہیں اور میرے خون کا گناہ تیرے سر چڑھے اور مظلومیت کی وجہ سے میرے گناہ اتاریں۔

عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن مسعود، حسن اذہناہ سے یہی تفسیر منقول ہے۔ اور امام ابن جریر طبری اور حافظ ابن کثیر نے اسی کو اپنا لیا ہے اور جلالین میں حافظ سیوطی نے بھی اسی کو ترجیح دی۔ اس کے علاوہ شارحین قرآن نے اس کے دوسرے مطالب بھی بتاتے ہیں مثلاً صاحب التعلیقات سے القاسمی نقل کرتے ہیں۔

میں تمہارے قتل میں پہل اس لیے نہیں کرتا کہ میں کوئی بارگناہ اپنے سر لینا نہیں چاہتا۔ اگر تم اس جرم کے لیے پہل کرنا چاہتے ہو تو کرو اگر تم مجھے قتل کر دو گے تو میرے قتل کا بارگناہ بھی تمہارے سر ہوگا اور میری طرف سے مدافعت کے نتیجے میں اگر تمہیں کوئی نقصان پہنچ گیا تو اس کا گناہ تمہارے ہی سر ہوگا اس لیے کہ اس کا سبب میں نہیں بلکہ تم ہی بنو گے۔

صاحب معالم امام بغوی فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ اگر تو میرے قتل سے باز آیا تو قیامت کے روز تیری گردن پر تیرے گناہ کا بھی بوجھ ہوگا اور میرے گناہوں کا بوجھ بھی تجھ پر ڈالا جائے گا کیونکہ روز قیامت مظلوم مقتول کے گناہ قاتل پر ڈالے جائیں گے۔ اس طرح دونوں کا بوجھ تجھے اٹھانا پڑے گا اس لیے کہ اللہ کے یہاں قاتل کی سزا یہ ہے کہ اس کے ذمہ اس کا گناہ بھی لکھا جائے اور اس کے مقتول کا بھی اور اس کو دوسری سزا دی جاتے۔ یہ امام مجاہد کا قول ہے۔

اس آیت میں اس اصولِ عدل کی طرف اشارہ ہے جو ایک حدیث میں فعلی الابدی مالمسود یعدت المظلوم کے الفاظ سے بیان ہوا ہے۔ یعنی اگر مظلوم نے کوئی زیادتی نہیں کی ہوگی تو جو کچھ اسے اپنی عزت کی حفاظت کے لیے کرنا پڑا ہے اس کا بارگناہ پہل کرنے کے لیے پر ہے باقی اور اللہ میں تعالیٰ حاکمیت کا ہے۔

قتلِ ہرمین کا انجام تباہ کاری ہے

۸۵۔ ہرمین اس کے نفس نے اس کو اپنے بھائی کے قتل کرنے پر آمادہ کر دیا اس نے اُسے مار ڈالا یہ وہ تباہ کاروں میں سے ہو گیا۔ شاید ابتداء میں کچھ جھگڑا ہو گیا۔ شدہ شدہ نفس امارہ نے خیال پختہ کر دیا اور یہی کیفیت عموماً معاصی کی ابتداء میں ہوتی ہے اور اس کے نتیجہ میں وہ تباہ کاروں میں سے ہو گیا۔ دیکھو یہ شران تو یہ کہ ایسا نیک بھائی جو قوتِ بازو بنتا ہاتھ سے کھریا اور خود پاگل ہو کر مرا۔ حدیث میں ہے کہ ظلم اور قطع رحم دو گناہ ایسے ہیں جن کی سزا آخرت سے پہلے دُنیا میں بھی ملتی ہے اور آخرت میں خسرانِ حق یہ کہ ظلم و قطع رحم قتلِ عداوت بدامنی کا دروازہ دُنیا میں کھول دینے سے ان سب گناہوں کی سزا کا سختی ہوا اور آئندہ بھی جتنے اس نوعیت کے گناہ دُنیا میں کیے جائیں گے سب میں پانی ہرنے کی وجہ سے اس کی شرکت رہی جیسا کہ حدیث میں مصرع ہے۔

شیخ الاسلام نے بھی حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے وہ امام بخاری نے اپنی میصح میں بحوالہ عبداللہ بن مسعود بھی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

دُنیا میں ظلم جو بھی مارا جاتا ہے اس میں آدم کے بیٹے کا حصہ ہوتا ہے کہ نہ خنک دُنیا میں پہلے مظلومانہ قتل کا موجب دہی ہے۔

قرآن نے قاتل کی اندرونی کشمکش کے اظہار کے لیے طرحت کی تعبیر اختیار کی ہے۔ یہ باب تفصیل ہے اور باب تفصیل اپنے ماوسے کے لیے دو زائد چیزیں ظاہر کرتا ہے ایک تدریجی اور دوسرے حکمران۔ مطلب یہ ہے کہ قاتل کو اس کا حسد دیر تک بار بار قتل پر آمادہ کرتا رہا۔ اور قابل اس معاملہ میں کر دینے کر دینے کی کشمکش سے دوچار رہا۔ بالآخر اس کے حسد نے اس کو اس ہولناک جرم پر آمادہ کر دیا۔ ابتداء ہرمین کو یہی جھگڑا پیش آتی ہے لیکن جب وہ مجرمانہ احساسات و جذبات کی پردہ پوشی کرتا رہتا ہے تو اس کا ضمیر بالکل مردہ ہو جاتا ہے اور وہ جرم کے لیے دلیرانہ قدم اٹھا دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بائبل کی اس سرفراز تقریر سے قابلِ ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔ اس کے نفس نے اس کام پر رفتہ رفتہ دلیر و مستعد بنا دیا اور اسے اس کی نظر میں خوشگوار اور پسندیدہ بنا دیا۔ یہ حال ہر بدی اور معصیت کا ہے۔ ابتداء ہر فطرتِ سلیم اس سے رکھتی ہے، اچھپاتی ہے لیکن نفس رفتہ رفتہ

اس كى جانب مائى اور اس ٲر گر زبده ٲوتا جاتا هے اور اس كى طرف سے هجبهك هٲٲى جاتى هے يهاا
تكم كز انسان لے بے دضر ك كز كز تا هے ۔

زمين ميں مړے كو دفن كرنے كى تعليم

۸۶۔ اس كے بعد خدا نے ايك كو اواز كيا اور وه زمين كريدنے لكها تاكه اسے وكائے ك لٲنے بهائى
كى لاش كيونكر زمين ميں چھپائے۔ يه ديكه كز وه بول اٹا كه افسوس هجر ٲر كه مير اس كوے كى طرف هى
زهر سكا كه لٲنے بهائى كى لاش چھپا ديتا اس كے بد وه ٲهكتا نے لكها۔ ٲرنكه اس سے ٲٲلے كوئى انسان
مرا نہ تھا اس ليے قتل كے بعد اس كى سمجھ ميں نہ آيا كه لاش كو كيا كرے۔ آخر ايك كوئے كو ديكا كه
زمين كريد رٲا هے يا دوسرے مړے كو مٲى ٲشاكز زمين ميں چھپا رٲا هے اسے ديكه كه كچھ عقل آئى
كه ميں هجر اپنے بهائى كى لاش دفن كر دوں اور افسوس بهى ٲر كه ميں عقل وفهم اور بهائى كى مدد وكى
ميں اس جانور سے گيا كز را ٲوا۔ شايد اسى ليے حق تعالى نے ايك ادنى جانور كے ذريعے سے لے ٲٲٲه
فرمائى كز وه اپنى وحشت و حماقت ٲر كچھ شر لٲے۔ جانوروں ميں كوے كى يه خصوصيت هے كه لٲنے
بهائى كى لاش كو ككلا چھوٹنے ٲر بهت شور مچاتا هے يه

اس طرف ايك كوئے كے ذريعے آدم كے اس غلط كار بيٹے كو اس كى بهالت و نادانى ٲر متنب
كيا اور جب ايك مرتبه اس كو لٲنے نفس كى طرف توج كرنے كا موقع مل گيا تو اس كى ندامت صرف
اسى بات تكم محدود نہ رٲى كه وه لاش چھپانے كى تدبير لكها نے ميں كوئے سے ٲچھے كيوں وه كيا بلكه
اس كو يه بهى احساس هوئے لكها كه اس نے لٲنے بهائى كو قتل كر كے كتنى بڑى بهالت كا ثبوت ديا
هے بعد كا فقره خارج من الناميين اسى مطلب ٲر دلالت كر تا هے ليكن ٲهكتا نا وه مانع هے جس كے سامنكه
سے ممدت ٲر انكار اور فخر و تدارك هى ٲر۔ اس موقع ٲر اس كا ٲهكتا ناحق تعالى كى نافرمانى ٲر نهى
بلكه اپنى بدعالى ٲر تھا جو قتل كے بعد لے لاحق هوئى۔ دراصل قاتل اب بركال حسرت و ندامت يه كسر
رٲا هے كه مجھے تو اس مردار خواہ جانور كے برابر بهى شور نهى هے۔ تووات ميں بائيل كى تدفين كا كوئى
ذكر نهى۔ البتہ شارعيں تووات نے ايك ٲرنده كا ذكر كيا هے كه اس كے عمل تدفين كو ديكه كه آدم و
حواء ميں بائيل كا لاش دفن كيا ليكن ٲرنده كا نام كو انهيں فاخر آيا هے۔ قرآن نے كھول كر تهايا هے

لیکن وہ کہوں کی کمالی قرآن میں نہیں ہے۔ قرآن میں صرف ایک کوسے کا ذکر ہے۔ علامہ مکیبی فرماتے ہیں کہ قرآن میں اختصار ہے لیکن اگر قرآن ہی کے بیان پر اکتفا کر لیا جاتے اور یوں کہا جائے کہ قابیل قتل کے بعد ایران تھا کہ اس نعل کو کیا کرے۔ ابھی تک قتل آدمِ مرت سے دو چار نہ ہوئی تھی۔ بیکایک اس نے دیکھا کہ ایک کوسے نے زمین کرید کرید کر گڑھا کھودا، قرآن میں یہی بات بتانے کے لیے صحت مضارع کا صیغہ آیا ہے۔ قابیل کو تغیب ہوا کہ مجھے بھی اپنے بھائی کے لیے اسی طرح گڑھا کھودنا چاہیے قابیل نے یہ دیکھا تو اپنی ناکارہ زندگی پر بے حد افسوس کیا اور کہنے لگا کہ میں اس حیران سے بھی گیا گزرا ہوں کہ اپنے اس بھرم کو بھی چھپانے کی اہلیت نہیں رکھتا ندامت سے سر جھکا لیا اور پھر اسی طرح اپنے بھائی کو سپرد خاک کر دیا۔

دشن کے شمال حصے میں جبل قاسیون پر ایک زیارت گاہ بنی ہوئی ہے جو قتلِ بابل کے نام سے مشہور ہے اور اس کے متعلق حافظ ابن عساکر نے احمد بن کثیر کے تذکرے میں ایک خواب بھی نقل کیا ہے لیکن خواب کے سچے ہونے کے باوجود بھی اس سے کوئی شرعی یا تاریخی حکم ثابت نہیں ہو سکتا۔

مِنْ أَجْلِ ذَلِكَ كَتَبْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَءِيلَ أَنَّهُ مَن قَتَلَ نَفْسًا
 بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا
 وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا وَلَقَدْ جَاءَتْهُمْ
 رُسُلُنَا بِالْبَيِّنَاتِ ثُمَّ إِنَّ كَثِيرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذَلِكَ فِي الْأَرْضِ
 لَكُسْرٌ فَوْنَ ۖ

اسی بنا پر ہم نے بنی اسرائیل کے لیے یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جس کسی
 نے انسان کو خون کئے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا
 کسی اور وجہ سے قتل کیا اُس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر
 دیا اور جس نے کسی کی زندگی بچالی تو گویا اس نے تمام انسانوں
 کو زندگی دے دی۔ اور بلاشبہ ان کے پاس ہمارے رسول
 پے درپے کھلی کھلی ہدایات لے کر آئے لیکن اس پر بھی اُن
 میں اکثر ملک میں زیادتیاں کرنے والے ہیں۔

قانون قصاص کی حکمت و عظمت

آدم کے ادنیٰ بیٹوں کا تادیب کی واقعہ بیان کیا گیا ہے اس سے کتنی ہی باتیں سمجھ میں آتی ہیں اولاً یہ کہ قتل پر کوئی خدا ترس آمادہ نہیں ہوتا ہے یہ ان لوگوں کا کام ہے جن کے دلوں میں خدا کا خوف نہیں ہوتا۔ ثانیاً یہ کہ اس کی عمومی وجہ بغض و حسد ہوتی ہے۔ ثالثاً یہ کہ قاتل خدا کے احکام کا باغی ہوتا ہے اور سخت گناہگار۔ رابعاً یہ کہ قاتل دین و دنیا دونوں لحاظ سے خسارے میں رہتا ہے۔ پنجم یہ کہ مجتہد معلوم ہوا کہ حق سبحانہ نے قرآن میں تفصیل سے یہ واقعہ اس لیے بیان کیا ہے تاکہ لوگ اس کی قیامت کو محسوس کریں اور اس گناہ سے ہمیشہ اپنے آپ کو ڈر رکھنے کی کوشش کریں۔ یہ گمراہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں قتل کی تاریخ بیان کی ہے تاکہ لوگوں کو اس سے عبرت ہو اور سجدگی سے اس کے نشیب و فراز پر غور کر سکیں یہاں قرآن نے واضح کیا ہے کہ قتل ناحق سب سے بڑا گناہ ہے اس سے بڑھ کر کوئی اور جرم نہیں ہے کیونکہ یہ چیز روتے زمین کا امن و امان تباہ کرتی ہے اور انسان کو سکون قلب چھین لیتی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ بیخ تبصر جو ہر سکتی ہے قرآن نے اسے اختیار کیا ہے تاکہ قتل کی شاعت اچھی طرح ذہن نشین ہو جاتے۔ آدم کے دونوں بیٹوں کا واقعہ بیان کرنے کے بعد فرمایا ہے من اجل ذالک کتبنا علی بنی اسرائیل امن دامن کو برقرار رکھنے کی جو بیخ تبصر اللہ تعالیٰ نے یہاں اختیار فرمائی ہے اس سے بڑھ کر دوسرا پیرایہ بیان ممکن نہیں ہے۔ ایک شخص کا قاتل پوری کائنات انسانی کا قاتل ہے اس کے مختلف معنی بیان کیے گئے ہیں کی تفصیل آپ ابھی پڑھیں گے۔ یہاں مجھے امام ابن جریر کی یہ بات بہت پسند آتی ہے کہ:

اس کرم میں حقارت کی عظمت اور وحید کی شدت مراد ہے اور بتانا ہے کہ ایک انسان کا ناحق خون اللہ تعالیٰ کے غضب اور عذاب کو اسی طرح حرکت میں لے آتا ہے جس طرح تمام انسانوں کا قتل۔

فشار ہے کہ گناہ گاروں میں بدترین گناہ قاتل ہے۔ صحابہ کرام نے اس مسئلہ کو خوب سمجھا تھا۔ حضرت ابو ہریرہ کا بیان ہے کہ جن دنوں بائیسوں نے حضرت عثمان کو اپنے محاصرے میں لے لیا تھا میں کسی طرح حضرت عثمان کی خدمت میں پہنچ گیا اور درخواست کی کہ حضرت میں امداد کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ حضرت ابو ہریرہ کا بیان ہے کہ میری باتیں سن کر آپ نے فرمایا

کیا تجھے یہ بات پسند ہے کہ تو پوری انسانیت اور ساتھ میرا قاتل بن ہلے، حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ حضرت یہ تو مجھے ہرگز پسند نہیں۔ میرا جواب سن کر حضرت عثمان نے فرمایا کہ، سن لو اگر تم نے ایک شخص کو قتل کیا تو مجھ کو کرم پوری انسانیت کے قاتل ہو۔

حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ میں یہ سن کر واپس آگیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ حضرت عثمان نے خود حام شہادت نوش کر لیا مگر ظوار اٹھانے کی اجازت نہ دی۔ یہ سنی عملی تفسیر اس آیت کی اور یہ مقام تھا حضرت عثمان کی نظر میں امن و امان کا جس کا ہم اسے اس دور میں تصور بھی نہ کھینچ سکتے ہیں۔

اس آیت میں دراصل قانون قصاص کی حکمت بیان ہو رہی ہے کہ ایک کا قاتل سب کا قاتل اور ایک کا بھالے والا سب کا بھالنے والا ہے۔

۷۔ اسی بنا پر ہم نے بنی اسرائیل کے لیے یہ حکم لکھ دیا تھا یعنی ناحق قتل و خون ریزی میں جو دنیوی اور اخروی نقصانات ہیں اور جو بد نتائج اس پر مرتب ہوتے ہیں سچی سچی کافری بھی اس حرکت کے بعد بسا اوقات پہچانتا اور کف، انسوس ملتا ہے۔ اسی سبب سے بنی اسرائیل کو ہم نے یہ ہدایت کی تھی یہ امام رازی فرماتے ہیں کہ ذلک سے اشارہ قصہ قتل ہابیل کی جانب نہیں بلکہ ان مقاصد کی جانب ہے جو قتل ناحق سے پیدا ہوتے ہیں۔ السید رشید رضا لکھتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ اس نجوم اور اس فعل کی وجہ سے جو غلظ و عددان کی صمدت میں دو بھائیوں میں رونما ہوا ہم نے بنی اسرائیل کو یہ ہدایت دی تھی۔ اور دوسرے شامعین لکھتے ہیں کہ چونکہ بنی اسرائیل کے اندر انہی صفات کے آثار پائے جاتے تھے جن کا اظہار آدم کے اس بیٹے نے کیا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو قتل نفس سے باز رہنے کی سخت تاکید کی تھی اور اپنے فرمان میں یہ الفاظ لکھ دیے تھے۔ انسوس ہے کہ آج جو بائبل پائی جاتی ہے وہ فرمان خداوندی کے الفاظ سے خالی ہے۔

ہابیل کی صدا میں تمام نوع انسانی کی راست بازی اور نیک عملی بول رہی تھی، اور قابیل کے عمل میں تمام ظالم انسانوں کی شقاوت کا ہاتھ تھا۔ اب انسان کے سامنے دو راہیں کھل گئیں، نیک و راستی کبھی انسان کے خون سے ہاتھ نہیں رنگے گی ظالم کا ہاتھ ہمیشہ رنگین رہے گا۔ قرآن کہتا ہے کہ اسی بنا پر خدا نے بنی اسرائیل کے لیے یہ حکم لکھ دیا۔

یہ سوال کہ اگر صورت حال یہی ہے تو پھر بنی اسرائیل کی تخصیص کیوں ہے؟ اس وجہ کا تقاضا

تو یہ ہے کہ یوں کہا جاتا کہ تھا علی الناس، ہم نے پوری انسانیت کو یہ ہدایت دی ہے۔ شرمین دُن نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہاں بنی اسرائیل کی شخصیں اس لیے گئی تھیں کہ وہ قاتل کی طرح حضورِ نور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے حسد رکھتے تھے اور یہ حسد ان کو قتل کی سازشوں پر ابھار رہا تھا ان کے اسی کردار پر تعریفیں کئے لیے بنی اسرائیل کا ذکر جو ہے۔ درزیہ واقعہ تو بنی اسرائیل سے بہت پہلے کا ہے۔ اور معلوم ہے کہ جان کے بدلے جان کا قانون ہر وقت میں ابتداء سے موجود رہا ہے۔ حضرت نوح اور حضرت ابراہیم کی قتل میں بھی یہ قانون موجود تھا جیسا کہ تورات کی کتاب پیدائش کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے۔ دراصل یہاں ضابطہ فوجداری کی تاریخ بتانی مقصود نہیں ہے بلکہ واضح کرنا ہے کہ بنی اسرائیل اللہ کے میثاق کے معاملہ میں اتنے دلیور اور بے باک ہیں کہ یہ اپنے کے باوجود کہ ایک قاتل سب کا قاتل ہے برابر اللہ کی زمین میں فساد کیے جاتے ہیں۔ اس پت من اجل ذلک کا اشارہ شر و فساد کی اس ذہنیت کی طرف ہے جس کا قاتل ہے جس کا قاتل ہے اللہ کا اور جس کا مظاہرہ ان یہودیوں کی جانب سے ہوتا رہتا ہے اور ہر رہا ہے جو قاتل کی سنتِ بد کی پیروی کر رہے ہیں یعنی کیدہ جذبات اور شیطانی تحریکات کے تحت اللہ کے بندوں کا خون بچھا رہا ہے۔

انسانی جان کی حفاظت

۸۸۔ کہ جس نے انسان کو خون کے بدلے با زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی کی زندگی بچالی تو گویا اس نے تمام انسانوں کو زندگی دی۔ ملک میں فساد کرنے کی بہت سی صورتیں ہیں مثلاً اہل حق کو دین حق سے روکے یا پیغمبروں کی ہانت کرے یا علیاد بالذہم تہرہ کر لے جو سے دوسروں کو تہہ ہونے کی ترغیب دے و جس علی ذلک اور زندہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اول روئے زمین پر بڑا کندی ہی ہوا کہ قاتل نے قاتل کو قتل کیا اس کے بعد رسم پڑ گئی اسی سبب سے تورات میں اس طرح دیا کہ ایک کرنا جیسے سب کو مارا، یعنی ایک کے ناحق خون کرنے سے دوسرے بھی اس جرم پر دلیور ہو۔ تم ہیں۔ تو اس حیثیت سے جو شخص ایک کو قتل کرے یا امنی کی جڑ قائم کرنا ہے گویا وہ سب انسانوں کے لیے قتل اور عام ہدامی کا دروازہ کھول رہا ہے اور جو کسی ایک کو زندہ کرنا یعنی کہ ظالم قاتل کے ہاتھ سے بچاتا ہے گویا وہ اپنے عمل سے سارے انسانوں کے بچانے اور ناموں کرنے کی دعوت دے رہا ہے جسے

مطلب یہ ہے کہ دنیا میں نوع انسانی کی زندگی کا بقا منحصر اس چیز پر ہے کہ ہر انسان کے دل میں دوسرے انسانوں کی جان کا احترام موجود ہو اور ہر ایک دوسرے کی زندگی کے بقا و تحفظ میں مددگار بننے کا جذبہ رکھتا ہو۔ جو شخص ناحق کسی کی جان لیتا ہے وہ صرف ایک ہی فرد پر ظلم نہیں کرتا بلکہ یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ اس کا دل حیات انسانی کے احترام اور ہمدردی نوع کے جذبے سے خالی ہے۔ لہذا وہ پوری انسانیت کا دشمن ہے کیونکہ اس کے اندر وہ صفت پائی جاتی ہے جو اگر تمام افراد انسانی میں پائی جاتے تو پوری نوع کا خاتمہ ہو جاتے اس کے برعکس جو شخص انسان کی زندگی کے قیام میں مدد کرتا ہے وہ درحقیقت انسانیت کا حامی ہے کیونکہ اس میں وہ صفت پائی جاتی ہے جس پر انسانیت کے بقا کا انحصار ہے بلکہ

دنیا میں سب زیادہ طولِ حیات اور لائقِ اہمیت انسانی جان ہے۔ غریب ہو، امیر ہو، بادشاہ ہو یا فقیر، بچہ ہو یا جوان، مرد ہو یا عورت، شہر کا رہنے والا ہو یا دیہاتی، تعلیم یافتہ ہو یا جاہل۔ پھر وہ لپکتے خاندان کا چشم و چراغ ہو یا محتاج دست نگر گھرنے کا، مسلم ہو یا غیر مسلم، تندرست ہو یا بیمار و ناکام، ہر ایک کو ایک وفادار شہری کی حیثیت سے حق حاصل ہے کہ ملک میں آزادی کا ساتھ دے۔ اسودہ زندگی بسر کرے اپنے خیال و عقیدے میں اس کو آزادی ہو، کوئی پابندی نہ ہو اور ہر خطہ و اندیشہ اس کا دل مطمئن ہو۔ قرآن نے دو صورتوں کے علاوہ کسی صورت میں قتلِ انسانی کی اجازت نہیں دی ہے۔ ایک یہ کہ جان کا بدلہ لیتا ہو، دوسرے یہ کہ ملک میں جنگا و فساد کیا ہو۔ ان دو صورتوں کے علاوہ انسانی کو مارنا قرآن کے نقطہ نظر سے پوری انسانیت کے قتل کے مترادف ہے۔ قرآن نے افساد فی الارض اور سفاک دم کو ہم پلہ بنایا ہے کسی جان کو مارنا خواہ کسی طرح ہو اور خواہ کسی وجہ سے ہو، قرآن نے سب پر قدغن قائم کر دی ہے۔ مشرکین کو فقر و فاقہ کو حیلہ بنا کر قتلِ ناحق کا خون اپنے سر لیتے تھے۔ قرآن میں مشرکین کی اس قبیح رسم کا ذکر آٹھویں پارے میں آ رہا ہے۔ تنگدستی کے اندیشہ سے بچوں کو مار ڈالنا اور رنگ و عار کے خیال سے بچوں کو قتل کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ قرآن نے ان کو سختی کے ساتھ بچوں کے قتل سے روکا اور فقر و فاقہ کے دساویں کر کے کہہ کر دور کیا کہ عین نرنہ قسم دیا کہ

اس آیت میں قرآن نے قتل و خون دینے کی کڑی تردید و ترغیب کے ذریعے بند کرنے کی

کوشش کی ہے اور لوگوں کے دلوں میں خونِ ناحق کی بُرائی بٹھائی اور اس کی ممانعت کی حکمت بتائی اور ان مفاسد پر روشنی ڈالی جو خونِ ناحق پیدا ہوتے ہیں ساتھ ہی امن و امان سے جو اس کا گراں درشتہ ہے لے جا کر کیا تاکہ انسانِ گنہگار سے اپنے آپ کو بچائے۔ علماء نے تصریح کی ہے چنانچہ محدث ابن جریر نے حسن بصری سے نقل کیا ہے کہ :

یہ آیت قرآنی ہمارے لیے رہنما اصول ہے جیسا کہ بنی اسرائیل کے لیے تھی۔ ان کے خونِ ہمارے خونوں سے زیادہ محترم نہیں ہیں۔

امام شافعی نے المواقعات میں یہ قاعدہ لکھا کہ گزشتہ اُمّتوں کے جو قوانین و احکام قرآن میں ذکر ہوئے ہیں وہ سب سچ ہیں اور اُستِ اسلام بھی اس کی مخاطب ہے جب تک قرآن ہی سے استثنا معلوم نہ ہو۔

سب سے بڑا گناہ

اس آیت میں، حتیٰ ایک شخص کے قتل کو پوری انسانیت کا گناہ بتایا ہے۔ اسی بنا پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے سب سے بڑا گناہ قرار دیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود کا بیان ہے کہ ایک بار میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا اے اللہ نبی اعظم ہذا اللہ خدا کے یہاں سب سے بڑا گناہ کون سا ہے، فرمایا کہ تو خدا کا کسی کو ہمسرد و شریک بنائے۔ اُن کا بیان ہے کہ میں نے پھر پوچھا کہ خود اسی شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ کون سا ہے، آپ نے فرمایا کہ پھر یہ کہ تو اپنے بچہ کو روزی کھانے کے اندیشے سے مارے۔

امام نووی صحیح مسلم کی شرح میں فرماتے ہیں کہ :

سب سے بڑا گناہ شرک ہے جو ظاہر اور بے غبار ہے اور پھر قتلِ ناحق ہے جو اسی کے قریب قریب ہے اسی لیے ہمارے اصحاب کہتے ہیں کہ شرک کے بعد اگر کوئی گناہ قتلِ ناحق ہے۔ امام شافعی نے بھی اس کی مراحت کی ہے۔

ایک بار حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، سات تباہ کن چیزوں سے بچو۔ آپ پہلی فرمایا کہ وہ کیا ہیں۔ آپ نے فرمایا اللہ کا شریک بنانا اور اس شخص کو قتل کرنا جس کو قتل کرنا اللہ نے حرام کیا ہو۔ ہاں حتیٰ شرعی کے ساتھ۔ (مسلم)

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف انداز میں قتل و خون ریزی کی شامت ذہن نشین کرنے کی سعی فرمائی ہے۔ ایک بار آپ نے خونِ ناحق کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا۔

مومن جب تک ناحق خون ریزی میں مبتلا نہیں ہوتا اپنے دین کے بائے میں کشادگی میں رہتا ہے۔ (بخاری)

کتنا موثر انداز بیان ہے کہ آدمی پڑھنے کے ساتھ ہی یہ دُعا کرتا ہے کہ خدا یا مجھے اس گناہ سے بچائے قتل و خون ریزی بند کرنے کی جو کوشش اسلام نے کی ہے وہ اپنی آپ مثال ہے اور اس سلسلے میں جو موثر سے موثر انداز بیان ہو سکتا ہے وہ سب اس نے اختیار کیے ہیں۔ ایک مرتبہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ،

مومن اس وقت تک ہمیشہ نیکوں میں تیز رو اور نیکو کار رہتا ہے جب تک ناحق خون ریزی نہیں کرتا مگر جب وہ اس گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے تو پھر وہ سست پڑھتا ہے۔ (مشکوٰۃ)

حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ ان تباہ کن کاموں میں سے جن میں انسان اپنے آپ کو ڈال کر بچا نہیں سکتا اور اس کی ہلاکت ضروری ہے۔ یہ بھی ہے کہ کوئی ناحق خون بہاتے جس کی کوئی شرعی وجہ نہ ہو۔

اشارۃ قتل کا گناہ

قتل کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ انسان اپنا ہاتھ خون آلود نہ کرے مگر اپنے اثر و رسوخ اور جہاد و اقتدار سے کام لے کر کسی دوسرے کو اس میں استعمال کرے اور اس کے ذریعے کسی بے گناہ کو قتل کرے اسلام اس صورت کو بھی برداشت نہیں کرتا اور اصل مجرم صاحب اثر و رسوخ ہی کو گردانا ہے حدیث میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے قاتل اور آمر کے بائے میں پوچھا گیا۔ آپ نے فرمایا۔

اگے ستر حصوں میں تقسیم کی گئی ہے ان میں سے ۶۹ حصے اس کے لیے ہوں گے جو قتل کا حکم دینا ہے اور ایک حصہ اس قاتل کے لیے ہے جو دوسرے کے کہنے سے قتل کرے۔ (جمع الفوائد عن احمد)

حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن قاتل و مقتول باہم اللہ میں پیش ہوں گے مقتول عرض کرے گا کہ لے موئی قاتل ہے پوچھتے کہ اس نے مجھے کس تصور پر قتل کیا۔ قاتل آمر کی طرف

اشارہ کر کے جواب دے گا پھر دروکار اس نے مجھے حکم دیا تھا۔ اس جواب کے بعد قاتل دُور دونوں کے ہاتھ پکڑے جائیں گے اور دونوں کو ایک ساتھ جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔ (جمع الفوائد)

ہتھیاروں پر پابندی اور اس کی وجہ

قتل تو بہر حال قتل ہے۔ اسلام بھی پسند نہیں کرتا کہ آدمی ایسی ہیئت اختیار کرے جس سے کسی کو کوئی زخم پہنچنے کا احتمال ہو یا کسی کے دل میں اس کی طرف سے شبہ بھی پیدا ہو۔ حضور انور کا ارشاد ہے:

جو ہم پر ہتھیار اٹھائے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ (بخاری)

حافظ ابن جریر تحریر فرماتے ہیں:

ہتھیار اٹھانے سے مراد یہ ہے کہ ان سے جنگ کی جائے تاکہ ان کو خوف نہ کیا جائے لہذا وہ شخص اس وعید میں داخل نہ ہوگا جو مسلمانوں کی حفاظت کے لیے ایسا کرے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ننگی تلوار لے کر چلنے سے منع فرمایا ہے کہ کہیں ایسا دیکھ کر کسی کو دھوکہ سے کوئی غراش آجائے یا کوئی کمزور دل اپنے قلب کی کمزوری کی وجہ سے ننگی تلوار دیکھ کر خطرہ محسوس کرنے لگے۔ ارشاد ہے:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ننگی تلوار دینے سے منع فرمایا ہے۔

قتل و خون ریزی کی برائی ذہن نشین کرنے اور دنیا سے فتنہ و فساد مٹانے کے لیے آپ نے فرمایا ہے:

دروغ کے سات دروازے ہیں ان میں سے ایک دروازہ الی مہرین کے لیے

ہے جو میری امت پر تلوار چلائے۔ (مشکوٰۃ)

کوئی دیکھ پیرایہ بیان باقی نہیں چھوڑا گیا ہے جس سے امت کا ذہن اس سلسلے میں بے لوث راست متاثر ہو سکتا ہو۔ مختلف انداز سے کوشش کی گئی ہے کہ انسان قتل و خون ریزی کے نقصان کو سمجھ کر اس سے بیزاری کا اعلان کرے اور فتنہ و فساد سے دامن بچا کر سکے۔ ایک موقع پر حضور انور نے فرمایا کہ:

جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی طرف ہتھیار سے اشارہ کرتا ہے اس پر

فرشتے نعمت کرتے ہیں تا آنکہ وہ لمبے رکھ نہ لے اگرچہ اس کا سنبھالنا کیوں نہ ہو۔ (مشکوٰۃ)
شاہ عبدالحق محدث دہلوی اشعثہ العلماء میں فرماتے ہیں۔

اس حدیث میں انسانے سے مقصود ہنسی اور مذاق کے طور پر اشارہ کرتا ہے
کیونکہ سچ بچ پنج قصہ دارا لے کے مٹنے یہاں بن نہیں سکتے اور ہنسی و مذاق پر نعمت
ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کام سے شدت سے روکا جا رہا ہے۔

ہمزبہ بیان ہر موقع پر ایسا اختیار کیا گیا ہے کہ انسانی ذہن میں انسانی خون اور امن و امان کی تعداد
قیمت مضبوطی سے جم جائے اور اس سلسلے میں مزید چرن و چرا کی گنجائش باقی نہ رہے۔ انسانی جان کی یہ حفاظت
اسلام کے سوا اور کہاں مل سکتی ہے۔ موجودہ دور میں امن و سلامتی کا تصور بھی مشکل ہے۔ یہ اسلام
ہی کو فخر حاصل ہے کہ اس نے پوری قوت کے ساتھ انسانی احترام کی برتری کا اعلان کیا اور ساری کائنات
انسان کا تابع اور خدمت گزار قرار دیا۔

خون کی اہمیت اسلام میں

انسانی زندگی میں انسانی خون کی عظمت اور قدر و قیمت کا مزید اندازہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے
اس ارشاد سے لگائیے جو عبد اللہ بن عمر کے حوالے سے صحیح بخاری کی کتاب الویات میں آیا ہے:
قیامت میں جس مسک کا سب سے پہلے فیصلہ کیا جائے گا وہ خون کا کیس ہوگا۔

اہم نودی فرماتے ہیں کہ اس ارشاد نبوت میں خون کی اہمیت کا بیان ہے۔ اور حافظ ابن حجر
لکھتے ہیں کہ:

قیامت میں پہلا فیصلہ خون کا ہوگا۔ یعنی ان مقدمات کا فیصلہ سنایا جائے گا
جو قتل سے متعلق ہوں گے۔ اس حدیث میں مسک قتل کی اہمیت کا اظہار ہے اس
لیے کہ آغازِ عیشہ اہم معاملہ سے ہوتا ہے۔

یہاں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کا تعلق من قتل نفساً بغير نفس سے ہے۔ یعنی باقی تو ذریعہ
کرنا۔ اسے قرآن بھی بغیر نفس سے تعبیر کرتا ہے اور کبھی اسی کو الّا بالحق کہہ کر ظاہر کرتا ہے مقصد
یہ ہے کہ جواز قتل کی اس وقت اجازت ہے جب جان کے بدلے میں جان لینا ہو۔ اور اس وقت
اجازت ہے جب ملک میں فساد کر رہا ہو۔ زمین سے مراد وہ ملک یا علاقہ ہے جس میں امن و نظام
قائم کرنے کی ذمہ داری اسلام نے لے رکھی ہو۔

زمین میں فساد کی ممانعت

قرآن میں ایک سے زیادہ مقامات پر فساد کی مذمت اور اس کی ہلاکت خیز بن بیان کی گئی ہیں ہر زمانے میں اس مملکت خجاست کی فسادگری کی گتھ ہے جو انسانی امن و سکون کے لیے شدید طور پر مضر و مہلک ہے۔ فساد کا لفظ جب مطلق استعمال ہوتا ہے اُس وقت یہ تمام معاشرتی و اخلاقی اور فکری برائیاں پر مشتمل ہوتا ہے۔ حافظ ابن تیمیہ کتاب الایمان میں لکھتے ہیں۔

مصلح کا لفظ جب مطلق استعمال ہو تو تمام امور بخیر و شامی ہوتا ہے اور ایسے

ہی لفظ فساد تمام برائیوں کو اپنے اندر یکٹ لیتا ہے۔

یہ کون نہیں جانتا کہ کسی ملک اور قوم میں اطمینان و سکون کی دولت فردائی کے ساتھ اس وقت تک نہیں پائی جاسکتی جب تک ان اسباب کا سرے سے قطع قمع نہ کیا جاتے جو انسانی چین اور سکون و اطمینان کے لیے زہرِ لاپل کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان تمام لوگوں کا پوری قوت سے سر نہ کھل دیا جائے جو انسانی راست و عافیت پر شب خون مارنے کے عادی مجرم ہیں۔ پناہِ اسلام نے ان تمام اسبابِ مخرکات کی سختی کے ساتھ نگرانی کی ہے جو انسانی آبادی میں شر و ہنگامہ، دنگ و فساد اور فتنہ پوری کے ممد و معاون بنتے ہیں۔ اسلام سرسبز رحمت و رافیت ہونے کی وجہ سے ایک لمحہ کے لیے اپنے معاشرے میں ایسی چیزیں گوارا نہیں کرتا جو ملک کے امن و امان اور غرض عافیت پر بھکی بن گزرتی ہیں۔ اور نہ افراد انسانی پر ترس کھاتا ہے جو قوم اور ملک کی خوشگوار زندگی سے کھیلنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں زندہ اپنوں کی پرواہ کرتا ہے اور نہ غیروں کی نہ مسلم کی نہ غیر مسلم کی۔ نہ دارالاسلام میں بسنے والوں کی نہ دارالحرب میں بسنے والوں کی اس کی عدالت میں مجرم خواہ کوئی ہو اس کو سزا ضرور ملتی ہے۔ وہی افراد جن کی حرمت و عزت کے لیے اس کی پوری مشینری حرکت کرتی رہتی ہے۔ جب ان ہی کے دامنِ جرم سے داغ و دار ہو جاتے ہیں تو جرم کے اقرار یا اس کے ثابت ہو جانے کے بعد اسلام کی نگاہِ لطف و کرم میں کسی دم کے مستحق نہیں ہوتے ہیں۔

یہ امر وقہر ہے کہ زمین میں فساد اور قانونِ امن و امان کی خلاف ورزی انتہائی ہلاکت خیز ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن میں فساد کی بے انتہا مذمت کی گئی ہے اور مسندین سے بیزاری کا اعلان کیا ہے یہ فساد خواہ کفر و شرک کے راستے سے آئے یا جماعتی نظم میں خلل انداز سے آئے۔ یہ شخصی مظالم کا

غیر ہوا اجتماعی بگاڑ کا یہ بُرائی جس روپ میں آئے ہر حال میں بُرائی ہے۔ فساد کے موضوع پر قرآن میں جو آیات ہیں ان کا مطالعہ فرمائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ قرآن پاک نے فتنہ و فساد کے استیصال کے لیے کیا کیا انداز اختیار کیا ہے۔

ملک میں فساد کی صرف تین ہی صورتیں نہیں ہیں بلکہ تین سے زیادہ ہیں جیسا کہ شیخ الاسلام نے بتایا ہے۔ صرف قرآن ہی کا اس منظر سے مطالعہ کیا جائے تو نوکری و اقتصاد، معاشرتی و اخلاقی، معاشی و اقتصادی، سیاسی و اجتماعی فسادات کی ایک طویل فہرست مرتب ہو سکتی ہے۔ فسادات پر اسلام میں دو طرح کی سزائیں ہیں حدود اور تعزیرات۔

جن جرائم اور فسادات کی سزائیں قرآن و سنت میں صراحتاً مذکور ہیں وہ حدود و کفالتی ہیں۔ اور جن جرائم کی سزاؤں کو اسلام نے عدالت کے حوالہ دیدار اختیار تیزی پر چھوڑ دیا ہے ان کو تعزیرات کہتے ہیں۔

حضرت حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ۔ اللہ سبحانہ جن نافرمانیوں اور قانون شکنی پر حد مقرر کی ہے ایسی نافرمانیاں ہیں جن میں گناہ گوں مختلف مناسبات میں ان جرائم کی وجہ سے زمین میں فتنہ و فساد کی گرم بازاری ہوتی ہے اور انسانوں کے سکون و اطمینان پر ڈاکہ زنی بھی۔

ایک قاتل سب کا قاتل ہے

آخر میں دو باتیں ارشاد ہوتی ہیں ایک یہ کہ ایک کا قاتل پوری انسانیت کا قاتل ہے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ ایک کا قاتل اور سب کا قاتل قانون کی نظر میں برابر ہوگا۔ قانون عدالت، ضابطہ کی نظر میں دونوں کی مساوات کا یہاں ذکر نہیں ہے۔ مقصود قاتل کی فطرت پر روشنی ڈالنا ہے۔ جو ظالم و فاجر ایک شخص کی بھی جان بلا وجہ اور بے قصورے ڈالنے میں نہیں چپکا تا اس کی جرات اور خباثت نفس سے یہ بعید نہیں ہے کہ وہ سارے انسانوں کو تریخ کر دے۔ یہ بات قرآن میں لفظ کاغذ پر غور کرنے سے سمجھ میں آرہی ہے۔ اصل چیز تو قاتل کی نظر میں قانون و شریعت کی بے وقار اور اس کی خلاف ورزی پر اس کی دلیری ہے۔ قرطبی نے صحیح لکھا ہے ایک کے قتل کو حلال ہونے والا سب کے قتل کو حلال سمجھتا ہے۔ اور امام رازی کی یہ نکتہ آفرینی خوب ہے کہ ایک کے قاتل کو سب کے قاتلوں سے تشبیہ سے مقصود قتل کی شامت اور بُرائی میں مبالغہ اور اس جرم کی سنگینی کو ظاہر کرنے کے لیے ہے۔ اور قاضی بیضاوی کا یہ کہنا بھی بالکل بہا ہے چونکہ ایک کا قاتل خون کے تقدس

کو تباہ کر کے لوگوں کے لیے قتل کی شاہراہ بناتا ہے اور لوگوں کو اس کے حمل کے ذریعے دلیری ہوتی ہے اس لیے ایک کا قاتل سب کا قاتل ہوتا ہے۔ قرآن کی اس بیخ تعبیر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی نظر میں ساری انسانی برادری کی حیثیت اکائی کی ہے۔ یہاں تک کہ جان و سب کی جان ہے یہاں ہر ایک کا خون قابل احترام ہے۔

قانون کی ذمہ داریاں ہر فرد پر ہیں

اس آیت کے اشارات کی مدد سے معاشرے کے ہر فرد کی جو قانونی ذمہ داریاں معلوم ہوتی ہیں وہ بھی سن لیجئے۔

اول یہ کہ قرآن کی یہ تعبیر کہہ رہی ہے کہ ہر حادثہ قتل پوری قوم میں ایک ٹپل پیدا کرے جب تک اس کا قصاص نہ لیا جائے گا۔ ہر شخص یہ محسوس کرے کہ وہ اس مستحفظ سے محروم ہو گیا ہے جو اب تک اسے حاصل تھا۔ قانون ہی سب کا محافظ ہوتا ہے اگر قانون کی حمایت منہدم ہو گئی تو صرف مقتول ہی قتل نہیں ہوا بلکہ ہر شخص قتل کی زد میں ہے۔

دوم یہ کہ قاتل کا کھوج لگانا صرف مقتول کے وارثوں کی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ پوری جماعت کی ذمہ داری ہے کیونکہ قاتل نے صرف مقتول ہی کو قتل نہیں کیا بلکہ سب کو قتل کیا ہے۔

سوم یہ کہ اگر کوئی شخص کسی کو خطرے میں ڈالے تو اس کو برا یا جھگڑا سمجھ کر نظر انداز کرنا اس کے لیے جائز نہیں ہے بلکہ اس کی مخالفت و حمایت تباہ و تاراج اور اس پر واجب ہے کیونکہ جو شخص کسی مظلوم کی حمایت و نصرت میں قدم اٹھاتا ہے وہ صرف مظلوم ہی کی حمایت میں سینہ سپر نہیں ہوتا بلکہ تمام مخلوق کی حمایت میں سینہ سپر ہوتا ہے۔

چہارم یہ کہ اگر شخص کسی قتل کو چھپاتا ہے یا قاتل کے حق میں جھوٹی گواہی دیتا ہے یا قاتل کا ضامن بنتا ہے یا قاتل کو پناہ دیتا ہے یا قاتل کی دانستہ و کالت کرتا ہے یا دانستہ اس کو مجرم سے بری کرتا ہے وہ گویا خود اپنے اور اپنے باپ بھائی بیٹے کے قاتل کے لیے یہ سب کچھ کرتا ہے کیونکہ ایک کا قاتل سب کا قاتل ہے۔

پنجم یہ کہ کسی مقتول کے معاد میں مقتول کے وارثوں یا حکام کی مدد کرنا یہی درحقیقت مقتول کی مدد کرنا ہے۔ اسی لیے قرآن میں قصاص کو زندگی فرمایا ہے۔

قانون اور اس کی یاد دہانی

۸۹۔ اور بلاشبہ ان کے پاس جمائے رسول پے پیسے کھلی کھلی ہدایات سے کھڑے لیکن اس پر بھی ان میں اکثر ملک میں زیادتیوں کرنے والے ہیں۔ ترجمہ میں بدعات سے حضرت شیخ الہند نے کھلے ہوئے حکم مراد لیے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ بدعات سے وہ کھلے کھلے نشان مراد لیے جائیں۔ جن سے کسی پیغمبر کے من عند اللہ ہونے کی تصدیق ہوتی ہو۔ بنی اسرائیل کی اکثریت ایسے کھلے نشان دیکھ کر اور ایسے کھلے احکام سن کر بھی اپنے ظلم و طغیان اور دست درازوں سے باز نہ آئے۔ انبیاء معصومین کو قتل اور آپس میں ناحق خون کرنا ان کا ہمیشہ سے دیر و رہا ہے اور آج بھی معاذ اللہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل یا ایذا رسانی اور مسلمانوں کی تذلیل کے لیے ہر قسم کی ناپاک سازشیں کرتے رہتے ہیں اور اتنا نہیں سمجھتے کہ جب تورات کے حکم کے مطابق کینہہ اتفق کسی آدمی کا ناحق مار ڈالنا آنا بڑا جرم ہے مگر گویا اس کا قاتل تمام دنیا کے انسانوں کا قاتل ہے تو دنیا کے سب سے زیادہ کامل و اکمل انسان اور سب سے زیادہ مقبول و مقدس جماعت کے قتل و ایذا رسانی کے پیچھے ہذا اور ان سے لڑائی اور مقابلہ کے لیے کربا نہ خدا کے نزدیک کتنی ہماری بھڑم ہے۔ خدا کے سفرائے لڑائی تو درحقیقت خدا ہی سے لڑائی ہے شاید اسی لیے اگلی آیت میں ان لوگوں کی ذمہ داری اور اخروی سزا کا ذکر کیا گیا ہے جو خدا اور پیغمبر سے لڑائی کرتے ہیں یا دنیا میں طرح طرح کے فساد پھیلا کر سر فرنی لڑائی کے مصداق بنتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ نے ان کو یہ قانون بتائیے ہی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اتمام محنت کے لیے برابر ان کے اندر خدا کے رسول بھی اتنے سبب جو نہایت واضح احکام و ہدایات اور نہایت بلیغ تعلیمات کے ذریعے سے ان کو آگاہ کرتے ہیں کہ اللہ کے عہد و میثاق کی ذمہ داریوں سے غافل نہ ہو جائیں لیکن اس سلسلے اہتمام کے باوجود یہ لوگ خدا کی زمین میں نگاہ مختلف قسم کی زیادتیوں کرتے رہے ہیں۔ آخر میں ان کثیرا منهم بعد ذلالت فی الارض لہر خون کہہ کر نہایت بلیغ اشارہ فرمادیا کہ مسند تو سب ہی تھے لیکن ان کی اکثریت صرف فساد ہی نہیں کرتی تھی بلکہ فساد میں حدود سے تجاوز کر چک تھی اور ہر طرف بھی ان کی زندگی میں پرچ بس گیا تھا۔ پچھنے بسنے کی طرف جملہ اسمیہ لاکر اشارہ

کیا ہے۔ فساد نام ہے عدل و اعتدال سے نکل جانے کا اور اسراف کہتے ہیں چھوٹ اور بے لگام ہونے کو مطلب یہ ہے کہ وہ ملک میں صرف ہمانہ اعتدال ہی سے نکلے ہوئے نہ تھے بلکہ ان کی اکثریت اس فساد میں چھوٹ اور بے لگام ہو چکی تھی اور ان کی پوری زندگی اسی پر عمل رہی تھی۔ اللہ نے جو قانون تیار کیا ہے اس میں اگر ان فراموشیوں کے ذریعے غلط اندازی کر دی جاسے تو قانون کا اجتماعی، معاشرتی اور سیاسی نظام برباد ہو کر رہ جاتا ہے۔ پھر نہ تو نظام تنکھنی کے ساتھ اس کے نظام سیاسی کی ہمہ تنگی رہتی ہے اور نہ اس کے نظام اجتماعی و سیاسی میں کوئی ربط قائم رہتا ہے۔ اسی صورت کو یہاں اسراف سے تعبیر فرمایا ہے۔

مدینہ کے یہود اور ان کا اسراف

اس اصول حقیقت کے ساتھ اس تاریخی حقیقت کو یاد رکھنا چاہیے جس کا تجربہ ان آیات کے نزول کے زمانے میں مسلمانوں کو نگاتا یہودیوں کی طرف سے ہو رہا تھا۔ یہود کے متعدد قبائل مثلاً بنو نضیر، بنو قریظہ اور بنو قینقاع مدینہ کے سوالیہ آباد تھے۔ انہوں نے یوں تو مسلمانوں کے ساتھ ان د صلح اور باہمی حمایت و مدافعت کے معاہدے کر رکھے تھے لیکن ایک دن بھی انہوں نے معاہدوں کا احترام نہیں کیا بلکہ ہمیشہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے اور مدینہ سے ان کے قدم اکھاڑنے کی سازشیں کرتے رہے۔ قریش نے مسلمانوں پر جتنے حملے کیے سب میں درپردہ یہودی شریک تھے۔ انصار و مہاجرین کے درمیان چھوٹ ڈالنے کی بھی انہوں نے بار بار کوشش کی۔ صحابہ بلکہ خود حضور اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی بھی انہوں نے بار بار تدبیریں کیں۔ اگرچہ ان کی یہ چالیں اکثر و بیشتر ناکام رہیں لیکن متعدد نہایت اذہمناک واقعات بھی پیش آئے۔ حور تول اور بکری کے اغوا اور قتل میں بھی یہ نہایت شاطر اور سنگدل تھے۔ مسلمانوں کو ہر وقت یہود کی طرف سے اپنی ہمان اور عزت کے معاملہ کشمکش کا دہتا تھا مد یہ ہے کہ جن مسلمانوں کو وہ کسی قبیضے کے ملے کر لے کر کسی محلے پر گھنٹہ گھر کرنے کے لیے جلاتے تھے ان کے بھی چاک کرنے کی سازش پہلے سے تیار کر لیتے تھے۔ اس آیت میں اس صورتحال کی طرف اشارہ ہے۔ اور حافظ ابن جریر نے یہاں یہ نکتہ آخری خوب فرمایا ہے کہ بنی اسرائیل صرف قانون کی خلاف ورزی کا ارتکاب کر کے مضد ہی نہ تھے بلکہ اپنی پوری قانونی اسکی کی بغاوت پر قائم کر کے انبیاء کی پوزیشن اور ان کے مقابل بن گئے تھے اور یہی ان کا اسراف تھا۔

إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ
فَسَادًا أَن يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِّنْ
خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ذَلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ
فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ١١٢ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِن قَبْلِ أَن
تَقْدُرَ رُدُّوهُمْ فَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ١١٣

بلاشبہ ان لوگوں کی سزا جو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے
ہیں اور ملک میں خرابی پھیلانے کے لیے دوڑتے پھرتے ہیں
یہی ہے کہ قتل کر دیے جائیں یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف جہتوں
سے کاٹ دیے جائیں یا انہیں جلا وطن کر دیا جائے، یہ ان کے
لیے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بھی ان کے لیے عذاب
عظیم ہے۔ مگر ہاں جو لوگ ان میں سے قبل اس کے کہ تم ان
پر قابو پاؤ تو بر کر لیں تو جان لو کہ اللہ بخشنے والا رحمت رکھنے والا ہے۔

قانون اور نظم کے لیے خطرہ

پچھلی ریسرچ تو ان میں یہ بات پڑھنے کے بعد ملک کے نظم و نسق کو ہمالی کرنا اور امن و سلام کو تہہ کو تہہ بہت بڑا سنگین جرم ہے قادی کا ذہن اس کا منتظر ہوتا ہے کہ یہ معلوم کرے کہ اس سنگین جرم کی سزا کیا ہے؟ اس جرم کی سنگینی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی سزا بھی سنگین ہو قرآن فہم میں اسی اُٹھتے ہوئے سوال کا جواب اس نیت میں ملے رہا ہے کہ کوئی شخص یا گروہ جرات و جسارت، دُشمنائی اور بے باکی کے ساتھ اس نظامِ حق و عدل کو درہم برہم کرنے کی کوشش کرے جو اسلام نے قائم کیا ہے اس طرح کی کوشش اگر بیرونی دشمنوں کی طرف سے ہو تو اس کے مقابلے کے لیے جنگ و جدوجہد کے احکام تفصیل کے ساتھ آگے بیان ہوتے ہیں۔ یہاں بیرونی دشمنوں کے بجائے اسلامی حکومت کے اندرونی دشمنوں کی سرکوبی کے لیے تعزیرات کا ضابطہ بیان ہو رہا ہے جو اسلامی حکومت کے شہری ہوتے ہوئے عام اس سے کہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم اس کے قانون اور نظم کو چیلنج کریں۔ قانون کی خلاف ورزی کی ایک صورت تو یہ ہے کہ کسی شخص سے کوئی جرم صادر ہو جائے۔ اس صورت میں اس کے ساتھ شریعت کے عام ضابطہ حدود و تعزیرات کے تحت کارروائی کی جائے گی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص یا گروہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لے، اپنے شر و فساد سے علاقے کے امن و امان اور نظم و نسق کو درہم برہم کر دے لوگ اس کے ہاتھوں اپنی جان و مال، عزت و آبرو کی طرف سے ہر وقت خطرے میں مبتلا رہیں۔ قتل، دہشت، زہری، آتش زنی، لوٹ مار، اغوا، اختہاب، اور اس نوع کے سنگین جرائم اسلامی حکومت کے لیے لا۔ اینڈ آؤٹ کا مسئلہ پیدا کر دیں ایسے حالات سے نمٹنے کے لیے عام ضابطہ حدود و تعزیرات کے بجائے اسلامی حکومت جو اقدامات کرے ان کی تفصیل ان آیات میں بیان کی گئی ہے۔ اسلامی نظام جب کسی ملک میں قائم ہو جائے تو اس کو خراب کرنے کی سعی کرنا قطع نظر اس سے کہ وہ چھوٹے چھوٹے جہان پر ہو یا بڑے جہان پر قتل و غارتگری اور زہری و دہشت کی حد تک ہو یا بڑے پیمانے پر پُر امن زندگی کو تباہ کرنے کی کوشش کرے اس کی سزا یہاں بتائی گئی ہے۔

۹۰۔ بلاشبہ ان لوگوں کی سزا اجر العزاد اس کے رسول سے جنگ کھینچتے ہیں اور ملک میں خرابی پھیلاتے پھرتے ہیں یہی ہے بدامنی کرنے سے اکثر مفسرین نے اس جگہ زہری اور دہشتی مراد لی ہے مگر الفاظ کو محسوس بہ رکھا جاتے تو مضمون زیادہ وسیع ہو جاتا ہے۔ آیت کی جو شان نزول

احادیث صحیحہ میں بیان کی گئی ہے وہ بھی اسی کو متغنی ہے کہ الفاظ کو ان کے عموم پر رکھا جائے۔ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنا یا زمین میں فساد و بدمعاشی پھیلانا یہ دو لفظ ایسے ہیں جن میں کفار کے حملے، ارتداد کا فتنہ، رہزنی اور ڈکیتی، ناحق قتل و نہیب بھرمنا سازشیں اور مغرورانہ پروپیگنڈے سب داخل ہو سکتے ہیں اور ان میں سے ہر مجرم ایسا ہے جس کا ارتکاب کرنے والا ان چار سزاؤں میں سے جو آگے مذکور ہیں کسی نہ کسی سزا کا ضرور مستحق ٹھہرتا ہے۔

جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں وہ ہی اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں۔ ملک میں فساد پھیلانے کی فسادت کی سنگینی بتانے کے لیے یہ تعبیر اختیار کی گئی ہے اسی لیے محققین کے نزدیک دونوں فقرہوں کے درمیان حرف واد تفسیری ہے۔ اس لیے آیت میں دو سر فقرہ بمعون فی الاہننا فساد پہلے فقرے یحادون اللہ ورسولہ کی تشریح و تفسیر ہے اور اس کی مراد بتا رہا ہے۔ یہاں اس سے مراد ڈاکو اور رہزن ہیں۔ علامہ آلوسی رقمطراز ہیں کہ اکثر مفسرین اور سائے نقباء کے نزدیک آیت میں ڈاکو اور رہزن مراد ہیں۔ ابن کثیر فرماتے ہیں صحیح یہ ہے کہ یہ آیت اپنے علوم کے لحاظ سے مسلم اور غیر مسلم دونوں کے لیے ہے جو بھی ان صفات کا حامل ہو۔ امام رازی بھی حافظ ابن کثیر کے ہموا ہیں۔ الجصاص نے ایک قول یہ بھی لکھا ہے کہ آیت کا معنی صرف مسلمان ڈاکو ہیں۔ مسلمان تو غیر مسلمان ہیں اسلامی مملکت غیر مسلم شہریوں کے جان و مال دونوں اللہ و رسول کے تحفظ سے محفوظ دامن میں ہوتے ہیں۔ اگر کوئی ان پر حملہ کرنا ہے تو وہ بلاشبہ فساد فی الارض کا مرتکب ہوتا ہے اور یہی اللہ و رسول سے محارب ہے۔ گویا اس طرح اس آیت قرآنی میں ان فسادیلوں کو محارب قرار دیا گیا ہے جو لوگوں کی راحت و صیغے اور فتنہ و فساد کے شعلے بھڑکاتے ہیں۔ اس کا حاصل یہ ہوا کہ بندگان خدا کا امن و امان جو لوگ غارت کرتے ہیں وہ دراصل اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں۔ سائے انسان اللہ کی "عیال" ہیں جس کی خبر خود رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے ان میں جو عیال اللہ، کو فساد کے افریت پہنچاتے اللہ کے ساتھ اس کے محارب ہونے میں شبہ ہی کیا ہو سکتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے ان فتنوں سے منع فرمایا ہے اور اس کی نجات بیان کی ہے۔ اس کے باوجود لوگ فتنہ پروازی کرتے ہوئے نہیں شرماتے۔ ان کو باغی کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے۔

فتنہ و فساد کے مختلف عنوان ہوتے ہیں۔ کبھی آدمی صرف ہنگامہ اٹھاتی کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص بے انتہا پریشانی سے دوچار ہوتا ہے۔ کبھی یہ منظم سازش کے ذریعے ہوتا ہے خواہ یہ روش مار کرنے والوں کی چاہت ہو یا رہنروں کی پھر وہ اسلامی مملکت کے باطنی ہوں یا انسانی امن و سلامتی کے دشمن ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی کو کبھی پسند نہیں کرتا اور نہ کسی کو عدالت تک پہنچنے پر مصافحہ کرتا ہے خواہ وہ کوئی بھی ہو، امیر ہو یا فقیر، بادشاہ ہو یا گدا، وزیر ہو یا چہرہ اسی، مسلم ہو یا غیر مسلم، مجرم ثابت ہو جائے یا اقرار کے بعد ہر ایک کی قرار واقعی سزا ہوتی ہے۔ ایسی روش در نظر آتی ہے!

مہاراجہ خدا در سول وہ ہے جس کا خون اس لڑائی سے پہلے محفوظ ہوا وہ مسلمان اور اسلامی مملکت کا غیر مسلم شہری ہے۔

اس فتنہ و فساد کی گرم بازاری جس عنوان سے بھی کوئی کرے اور جہاں بھی کرے اسلام کی نگاہ میں وہ مجرم ہے۔ بدایۃ المجتہد میں ہے۔

مہاراجہ یہ ہے کہ ہتھیار سونٹے یا رہنری کرے۔ اگر یہ صراطِ آبادی سے باہر ہو تو اس پر سب کا اتفاق ہے کہ یہ رہنری اور بدامنی ہے اور اگر آبادی کے اندر ہو تو اس میں اختلاف ہے البتہ امام مالک فرماتے ہیں کہ آبادی کے اندر اور باہر دونوں برابر ہیں۔

اور فقہائے تصریح کر دی ہے کہ اس کا مصداق صرف وہ جماعت یا فرد ہے جو مسلح ہو کر عوام پر ڈاکہ ڈالے اور اسلامی حکومت کے قانون کو بزدل باز و توڑنا چاہے خام انفرادی جرائم کرنے والے چور گروہ کٹ اس میں داخل نہیں ہیں۔

مہاراجہ کی سزا

۹۱۔ یہاں جے کہ قتل کر دیے جائیں یا سولی پر چڑھائے جائیں یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف جہتوں سے کاٹ دیے جائیں یا انہیں جلا وطن کر دیا جائے یا ان کے لیے سوائے دنیا میں اور آخرت میں ان کے لیے عذاب عظیم ہے۔

یہ مجرم پر دو تہی ہیں ایک اللہ تعالیٰ کا دوسرا انسانوں کا۔ اللہ تعالیٰ اس لیے کہ اس نے اس کے قانون کی خلاف ورزی کی ہے اور اس کی حدود کو توڑا۔ اور انسانوں کا اس لیے کہ اس نے

انسان کے جان یا مال اور یا دونوں کو اذیت پہنچائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حق کا تقاضا ہے کہ اس پر خیر ہی مدد قائم ہو اور انسانی حقوق کا مطالبہ ہے کہ اس سے بدلہ لیا جائے۔ زخم و قتل کا بھی اور مال و دولت کا بھی چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس اس آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ:

جب کوئی دہزنی کرے اور بڑا منی پھیلاتے تو دیکھا جائے گا کہ اس نے قتل کا

اد تکاب بھی کیا ہے اور مال بھی لیا ہے تو اس کا دایاں ہاتھ اور بائیں پاؤں کاٹا جائے گا

پھر قتل کیا جائے گا اور چھانسی پر پڑھایا جائے گا۔ اور اگر اس نے صرف قتل کیا ہے

اور مال نہیں لیا ہے تو اسے قتل کیا جائے گا۔ اور اگر صرف مال پھیلایا ہے اور قتل نہیں

کیا تو اس کا دایاں ہاتھ اور بائیں پیڑ کاٹا جائے گا اور اگر یہ صورت پیش آئی کہ اس نے نہ

قتل کیا اور نہ مال لوٹا تو صرف قید کر دیا جائے گا۔ (احکام القرآن)

خلاصہ یہ ہے کہ صاحبِ قوت فسادوں کی چار صورتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ وہ کسی سے ازراہ فساد لڑی

اور دوسرے، لڑائیں اور اس کا مال بھی چھین لیں تو اس صورت میں ان کا دایاں ہاتھ اور بائیں پیڑ کاٹا جائے گا۔

پھر ان کو قتل کیا جائے چھانسی پر لٹکایا جائے گا تاکہ ان کے سزا پر دوسری قوم اور سائے ملک کے لیے سامانِ

عبرت ہو۔

دوسری صورت یہ ہے کہ فسادوں اور ڈاکوؤں نے کسی مسلم یا ذاتی سے لڑائی کی اور اسے قتل کر ڈالا۔

مگر مال نہ لیا تو ایسے فسادوں کی سزا یہ ہے کہ ان کو قتل کر ڈالیں۔

تیسری صورت یہ ہے کہ مال لوٹ لیا مگر قتل نہیں کیا تو اس صورت میں ان کا دایاں ہاتھ کاٹ دیا جائے

اور بائیں پیڑ بھی۔

چوتھی صورت یہ ہے کہ لڑا، اور فساد تو کیا مگر نہ مال گیا اور نہ جانی نقصان ہوا اس صورت میں

ان کی سزا جلا وطنی ہے۔

مفسدین کو سزا لینے کے مسئلہ میں تو اتفاق ہے لیکن اگر تفصیل میں باہم اختلاف ہے اور فساد

اختلاف یہ ہے کہ سزا کے بیان میں حرف او آیا ہے۔ عربی زبان میں یہ لفظ دو معنی دیتا ہے بخیر اور

تخریب۔ سعید بن المسیب، عطاء بن ابی رباح، داؤد الحسن البصری، صفحاک، ابراہیم نخعی، مجاہد اور

انہم مالک اس کو تخریب کے لیے بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عدالت کو اختیار ہے کہ رہزنوں کی قوت و

شکوت اور جرائم کی شدت و خفت کے پیشِ نظر یہ چاروں سزائیں اسے یا ان میں سے کوئی ایک دے اور

امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور امام احمد اسے تخریب کے لیے بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ رہزنوں کے لیے

دہزنی کے مختلف حالات پر مختلف سزائیں مقرر ہیں۔ جس کی تفصیل آپ سن چکے ہیں۔ لیکن اب محض اس نے امام ابوحنیفہ کی طرف نسبت کر کے اس صورت میں جب کہ دہزنوں نے قتل اور لوٹ دوڑوں کا ارتکاب کیا ہو یہ بھی لکھا ہے کہ :

اگر دہزنی اور بدامنی پھیلانے والے قتل کا بھی ارتکاب کریں اور مال بھی لوٹ لیں تو اس صورت میں امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ عدالت کا یہ طرح کے اختیارات ہیں ان میں سے جو کسی صورت بھی ملے مناسب معلوم ہو عمل میں لائے، دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹ کر عمل کر ڈالے یا دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹ کر پھانسی دے یا صرف پھانسی پر چڑھا کر یا صرف قتل کر دے اور ہاتھ پیر کاٹے۔ (احکام القرآن)

قرآن کے الفاظ بھی اس کے کوید ہیں کہ حالات کی نوعیت اور بدامنی و قانون شکنی کے موجودہ اور مروج اثرات کے لحاظ سے عدالت ان میں سے جو بھی اقدام کرے کر سکتی ہے۔ عربی زبان میں ادا کا استعمال اسی مفہوم کو ظاہر کرتا ہے اس لیے مجھے ان لوگوں کی بات درست معلوم ہوتی ہے جو عدالت کو اختیار دیتے ہیں کہ قیام امن و قانون اور استیصال فتنہ کے نقطہ نظر سے ان میں سے جو بھی صورت اس کو مفید اور مؤثر معلوم ہو اسے اختیار کر سکتی ہے۔

مختصر یہ ہے کہ ان فساد پر موم ازار اور دہزنوں کو ہر حال میں سزائے کی تفصیل میں اختلاف ہے سزا دینے میں نہیں۔ اس میں سب کا اتفاق ہے اور ہونا بھی چاہیے کہ دہزنی کے شرعی زندگی کا امن و سلام خواہ کرتے ہیں بلاشبہ یہ کام اپنے مفاسد کے اعتبار سے چوری سے بڑھ کر ہے۔ صاحب الہدایہ رقمطراز ہیں۔

یہ بڑا فتنہ اس لیے ہے کہ اس کا نقصان عام شہریوں کو پہنچتا ہے اس طرح کہ راستہ کا امن و امان ختم ہو جاتا ہے اور دہزنی مشروع ہو جاتی ہے اور اس لیے بھی کہ اس کی سزا بہت سخت ہے اس میں ہاتھ پاؤں مختلف جانب سے کاٹے جاتے ہیں اور قتل و صلب کی سزا دی جاتی ہے۔

مخاربہ کی شرطیں

مخاربہ اور دہزنی کے لیے یہ شرط ہے کہ ان فسادوں کے پاس اتنی قوت اور ایسا دبدبہ ہو کہ مسافر اور دوسرے لوگ بن پر حملہ آور ہوتے ہیں متاعبلہ کی تاب و طاقت نہ رکھتے ہوں خواہ یہ حملہ آور

معد میں ہتھیار استعمال کریں یا کوئی دوسرا آلہ خواہ دن میں ہو یا رات میں۔ اسی طرح آبادی میں ہو یا آبادی سے باہر پھر یہ معد اور ایک ہوا بہت ہوں ہر حال میں یہ رہزن ہیں اور ان کی سزا آیت بالا کے مطابق ہوگی اور مختار میں ہے :

رہزنی جو بھی کرے سزا کبریٰ ہے اگرچہ رات میں آبادی کے اندر ہو اور اسی پر فتویٰ ہے۔

علامہ ابن عابدین اشامی لکھتے ہیں :

فصل من کے ساتھ تبیر اس لیے کیا ہے کہ رہزنی کا جماعت کی صورت میں ہونا شرط نہیں ہے بلکہ اگر ایک شخص بھی یہ کام کرے گا جس کے پاس طاقت و قوت ہو تو اس پر بھی یہی حکم ہوگا۔

پھر یہ فساد کرنے والے اور امن و امان کے دشمن مرد ہوں یا عورتیں، غلام ہوں یا آزاد سب کو سزا ہوگی کسی کو معاف نہ کیا جائے گا۔

رات میں اگر یہ ڈرائیں اور لوٹ مار کریں تو اس وقت ہتھیار کی شرط نہیں ہے البتہ دن میں اس کا ردوائی کے لیے ہتھیار کا ہونا ضروری ہے۔ علامہ شامی لکھتے ہیں :

رات میں آبادی کے اندر کا مطلب یہ ہے کہ وہ مسلح ہوں یا نہ ہوں، دونوں حالتوں میں ڈاکو کا حکم لکھتے ہیں۔ اور ایسا ہی وہ دن میں بھی رہزن کا حکم لکھتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ وہ مسلح ہوں امام ابو یوسف نے بھی روایت سے جس پر شائع لے فتویٰ دیا ہے تاکہ مفیدین کا شر دُور ہو سکے۔

جلا وطنی کا مفہوم

نفی کے معنی میں جلا وطن کر دینا۔ مگر جلا وطنی ایسی ہو کہ فساد یا اپنی سزا بھی پالیں اور دوسرے لوگ اس کی اذیت رسانی سے محفوظ بھی ہو جائیں۔ اگر ایک شہر سے دوسرے شہر میں جلا وطن کر دیا گیا تو کچھ دزل ممکن ہے کہ اجنبیت کی وجہ سے کچھ نہ کرے لیکن کچھ دنوں کے بعد پھر بدوی و حسانی سے وہ شب خون ماسے عداوت کوئی سزا نہیں ہے کیونکہ نہ پہلا۔ اس کی اذیت کو کشیوں سے محفوظ ہوئی اور نہ اس پر پابندی عائد ہوئی ہے۔ دوسری صورت یہ ممکن ہے کہ ملک بدر کر دیا جائے لیکن یہ اس لیے درست نہیں ہے کہ وہ دارالحرب کا رخ کرے گا اور دار کفر میں لیے

طور پر ان جرائم کا ارتکاب کن ہاتھوں سے ہوا ہے بلکہ ان کی ذمہ داری کون ہے؟ اگر وہ کافر ہو تو شرک بجا جلتے اور اسی کیفیت سے اس کے ساتھ معاملہ کیا جائے گا اس لیے کہ ہر جرم کے ارتکاب میں سب کے مجموعی اثر نے کام لیا ہے۔ صاحب الہدایہ رقمطراز ہیں۔

ان ڈاکوؤں میں سے ارتکاب جرم خواہ ایک نے کیا ہو مگر مد تمام پر جاری ہوگی یہی امام مالک اور امام احمد کی رائے ہے کیونکہ یہ رہبر کی نرا ہے یہ قصاص نہیں ہے بلکہ مد ہے اس میں سادات معتبرہ ہوگی لہذا تمام ہی مجرم کو قصاص برابر ہوں گے۔

جب سائے کے سائے اس گروپ میں شریک ہیں تو نفع امد کے مطابق سب ہی مجرم ہیں یہ تو ہوتا ہی ہے کہ کوئی قتل کرتا ہے کوئی دوسرا کام جماعت میں تقسیم کار ہوتا ہے۔ مد مختار میں ہے، اگر جماعت میں سے کسی سے بھی مال چھینے، قتل کرنے اور ڈالنے کا مظاہرہ ہو جاتے تو سب پر احکام مذکورہ جاری ہوں گے۔

حافظ ابن تیمیہ نے تصریح کی ہے کہ اگر وہ سینکڑوں کی تعداد میں ہوں گے پھر بھی سب کے سب قتل کیے جاتے گے کیونکہ خلفاء راشدین سے یہی ثابت ہے۔

هذا هو المأثور عن الخلفاء الراشدين

(السیاسة الشرعیہ)

حکمل اور حرمیت دونوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المال سے اونٹوں کو ہٹا لے جانے اور ان کے چرواہوں کو قتل کرنے کی پاداش میں جو ہجرت انجینئرز ادا تھی، امام بخاری نے اس کو اسی آیت کے تحت درج کیا ہے۔ بنو نضیر، بنو قریظہ، بنو قینقاع کے مرتد جو معاملہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا وہ بھی اسی حکم الہی کے تحت کیا۔ سیدنا ابو بکر نے بالغین زکوٰۃ کی جو سرکوبی کی وہ بھی ہمارے نزدیک اسی حکم کے تحت ہوئی۔ حضرت عمر نے یہود کو جو عرب سے آخری بار نکالا وہ بھی اسی حکم خداوندی کی تعمیل تھی۔

حافظ ابن تیمیہ نے حضرت فاروق اعظم کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ اپنے رہبروں کی جماعت کے اس شخص کو بھی قتل کر ڈالا جو اس کی جگہ بیٹھ کر راہ گیروں کو دیکھا کرتا تھا کہ کون شخص کدھر سے آ رہا ہے اور اوپر ڈاکو لوٹ مار میں مشغول تھے۔

حد اور قصاص میں فرق

ایک صورت یہ ہے کہ قتل کیا لیکن مال نہیں چھینا تو اس صورت میں یہ مجرم مد میں قتل کیا جائے گا

ذکر قصاص میں۔ حدود قصاص میں فرق یہ ہے کہ قصاص دل متزل مساف کر سکتا ہے لیکن حد کو کوئی بھی مساف نہیں کر سکتا۔ لہذا اس کے قتل کو ذکوئی مساف کر سکتا ہے اور نہ روک سکتا ہے کیونکہ یہ خاص اللہ کا حق ہے۔ جب مجرم کا قاتل اس بنیاد پر ہو کہ اس نے اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کی ہے اور قانون شکنی کا مرتکب بنا ہے لہذا اس حد میں ان شرائط کی رعایت نہ ہوگی جو قصاص کے سلسلے میں بیان کیے گئے ہیں بلکہ عا رب ہونے کی حیثیت سے اسے قتل کیا جائے گا اور اس کے اعوان واعداء کو بھی قتل کا ہرنا کا کافی ہے یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ کس پرزے مارا ہے۔ عداوت شامی لکھتے ہیں :

عدم شرط کا خلاصہ یہ ہے کہ قاتل اور معین مددگار سب قتل کیے جائیں گے خواہ قوار سے مارا ہو یا پتھر اور لاشی سے۔

ہرنسوں کی نماز جنازہ نہیں ہے

آخر میں فرمایا ہے ذالک لہم خفی فی الدنیا زیر ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے یہ اس شبہ کا ازالہ ہے جو مذکورہ بالا نسلوں سے متعلق ان لوگوں کے ذہن میں پیدا ہو سکتا ہے جو اللہ و رسول کی جلیفی کرنے کے جرم کی سنگینی کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے بنایا ہے کہ دنیا میں ان کی یہ رسوائی دوسروں کے لیے عبرت و بصیرت کا ذریعہ ہوگی اور اس کے اثر سے ان لوگوں کے اندر بھی قانون کا ڈر اور احترام ہوگا جو یہ صلاحیت نہیں رکھتے کہ مجر و قانون کی افادیت و عظمت کی بنا پر اس کا احترام کریں۔

یہیں سے فقہانے یہ بات بھی لکھی ہے کہ اس امن و امان کے دشمن کو نہ قتل دیا جائے اور نہ اس کی خانہ جنازہ پڑھی جائے البتہ دفن کر دیا جائے گا۔ در مختار کے باب الجنائز میں ہے :

نماز جنازہ چار شخصوں کے علاوہ اور تمام مسلمانوں کی فرض ہے۔ ان چار میں باغی اور ڈاکو بھی ہیں ان کو غسل نہ دیا جائے گا اور نہ ان کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔

ایسا برتاؤ اس وجہ سے کیا گیا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے قانون کی خلاف ورزی کی اور امن و راحت جیسی قیمتی دولت برباد کرنے کی سعی کی اس لیے یہ اس سزا کا مستحق قرار پایا کہ اس کی توہین و تذلیل ہر پہلو سے ہو تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ جو لوگ خدا و رسول کے مقابلہ میں جرات و جسارت کا اظہار کریں اور بغاوت کا اعلان کریں وہ مستحق ہیں کہ دنیا میں رسوا ہوں۔

حقوق اللہ و حقوق العباد

یہ یاد رہے کہ اگر حق اللہ اور حق العبد دونوں جمع ہو جائیں مثلاً شریکوں نے مال چھین لیا اور اسے زخمی بھی کر دیا تو اس صورت میں حق اللہ پر عمل کرتے ہوئے حق العبد کو نظر انداز کر دیا جائے گا کیونکہ جب حد جاری ہو چکی تو قسمت نفس ختم ہو سکتی ہے۔ حد اور قصاص دونوں جمع نہیں ہو سکتے۔

گرفتاری سے پہلے توہم

۹۲۔ مگر ماں جو لوگ ان ہیں سے قبل اس کے کہ تم ان پر قابو پاؤ تو یہ کہیں تو جان لو کہ اللہ بخشنے والا رحمت رکھنے والا ہے۔ یعنی مذکورہ بالا سرائیں جو حدود اور حق اللہ کے طور پر نہیں وہ گرفتاری سے قبل توہم کرنے سے معاف ہو جاتی ہیں۔ حقوق العباد معاف نہ ہوں گے۔ مثلاً اگر کسی کا مال لیا گیا تو ضمان دینا ہوگا قتل کیا گیا تو قصاص لیا جائے گا ماں ان چیزوں میں سے معاف کرنے کا حق صاحب مال اور ولی مقتول کو ہے۔ اس حد کے سوا باقی حدود مثلاً حد زنا، حد عجز، حد برہنہ اور حد قذف توہم سے مطلقاً معاف نہیں ہوتی ہے بلکہ

مطلب یہ ہے کہ یہ خاص اختیارات صرف ان کے خلاف استعمال کیے جاسکتے ہیں جو حکومت کے حالات پر قابو پانے سے پہلے تک اپنی بنیاد پر قائم رہے ہوں اور حکومت نے اپنی طاقت سے ان کو منسوب و مقہور کیا جو جو لوگ حکومت کے اکیشن سے پہلے ہی قہراً نہیں ان کے خلاف ان کے پہلے رویہ کی بنا پر کوئی اکیشن نہ لیا جائے گا۔

مولانا تھانوی فرماتے ہیں کہ اگر آپ جو سزا مذکور ہوئی وہ حد اور حق اللہ کے طور پر ہے جو کہ بندہ کے معاف کرنے سے معاف نہیں ہوتی۔ قصاص اور حق العبد کے طور پر نہیں کہ بندہ کے معاف کرنے سے معاف ہو جاتا ہے لہذا جب گرفتاری سے پہلے ان لوگوں کا تائب ہونا ثابت ہو جاتے تو حد ساقط ہو جاتی ہے۔ البتہ حق العبد باقی ہے گا۔ اگر کسی نے مال لیا ہوگا تو اس کا ضمان دینا پڑے گا اور قتل کیا ہوگا تو اس کا قصاص لیا جائے گا لیکن اس میں قصاص و ضمان معاف کرنے کا حق صاحب مال اور ولی مقتول کو ہوگا۔

اُپ نے دیکھ لیا ہے کہ یہاں حق اللہ تو محاف ہو گیا لیکن حق العبد مہرین سے چٹا رہا۔ اللہ تعالیٰ نے ظاہر حال پر رحم فرمایا لیکن حقوق العباد سے بری قرار نہیں دیا۔ ابو بکر الجصاص فرماتے ہیں۔
 سبب وہ حد نہ تھا قطع ہو جاتے گی جو قرآن کی آیت میں مذکور ہے تو انسانی حقوق واجب ہو جائیں گے جیسے مثل کرنا، زخمی کرنا، مال کا تاننا اور جب حد واجب ہوگی تو انسانی حقوق ختم ہو جائیں گے۔ مالِ حق ہو یا مالِ باطل۔

قانون کی سختی اور سنگینی

مگر ہے کہ اسلامی سزاؤں کی اس سختی پر کچھ وہ لوگ جیسے بیچیں ہوں جو اللہ و رسول کو چیلنج کرنے کے جرم کی سنگینی کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے۔ اس کائنات میں حقیقی عزت اللہ اور رسول کے لیے ہے۔ اللہ عزوجل اور اس سے جو لوگ اللہ اور اس سے رسول کے مقابلے کی جسارت کرتے ہیں وہ اسی سنگینی سزا کے مستحق ہیں۔ ساری قیاسی اور عقلی بحثوں کو چھوڑ کر صرف علمی اور تجربی حیثیت سے دیکھ لیا جلتے کہ جن ملکوں میں اپنے ہاں قانون کو نرم سے نرم کر کے سزائیں ہلکی کر دی ہیں ان کے ہاں جرائم اور بد امنی کا کیا حال ہے؟ اور ان قوموں میں زندگی کا دھچکا کیا ہے جہاں اب تک اسلامی تعزیرات و حدود کا نفاذ ہے۔ امریکہ برطانیہ فرانس اور دوسرے ممالک۔ کو دیکھاؤ جرائم کے لحاظ سے۔ جرموں ڈاکو، قتل و غارت کے لحاظ سے کیا ہے اور نجد و حماز اور کویت کا کیسے بدنام ٹورٹل فری کسٹ، کشت و خون میں عرب کے بد وقتے لیکن اب روز روشن میں ان کو مذهب دنیا کے ڈاکوؤں سے کیا نسبت ہے۔ یہ خوش اعتمادی نہیں بلکہ واقعات ہیں۔ عقلی بات بھی یہی ہے کہ معاشرتی معیشت اور معاشرت کا جو بہترین نظام اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اور فرد و اجتماع دونوں کے لیے فراخ خاطر ہی اور آسائش و سہولت کے جتنے مواقع بہم پہنچائے ان کے بعد بھی جو ظالم اللہ کی ان غفلتوں کی شدید ناشکری کر کے امن عامہ پر ڈاکے ڈالتا ہے اور اللہ کے بندوں کی جان و مال بھجور لینا چاہتا ہے ایسا بنیشت الفطرت ایسی سخت سزا کا مستحق ہے۔

موجودہ زمانے میں جرم اور مجرمین کے لیے فلسفہ کے نام سے جو جہد و راز اور حمد لاز نظریات پیدا ہو گئے ہیں یہ انہی کا نتیجہ ہے کہ انسان بظاہر تنہا بھی ترقی کرتا جاتا ہے دنیا اتنی جہنم خیز جا رہی ہے۔ اسلام اس قسم کے جہل نظریات کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا اس کا قانون برائی نظریات پر نہیں مگر ان کی فطرت پر مبنی ہے۔

حدود زنا جرم میں کوافر نہیں

قانونی نقطہ نظر سے یہ سوال ہے حد و میت رکھتا ہے کہ اسلام میں حدود کی حیثیت کیا ہے کیا ان کا مقصد جرائم پیشہ لوگوں کے جرائم پر پردہ ڈالنا ہے یا ان کی حیثیت معاشرے کو جرائم سے محفوظ رکھنا ہے۔ اگر ان کی حیثیت پہلی ہے تو پھر یہ کوافر ہیں اور اس کا مطلب یہ ہے کہ جس فرد کو یہاں اپنے جرم کے نتیجہ میں قرآنی سزا مل چکی ہے وہ پاک و صاف ہو گیا ہے اور آخرت میں اس سے کوئی ہازہرس نہ ہوگی یعنی یہ سزا اس کے سائے گناہوں کے لیے پرٹے کا کام ملے گی۔ اگرچہ اسلامی قانون کے بعض مدارس کا میلان بھی ہے لیکن ہمیں یہاں قرآن کی یہ آیت ان لوگوں کی مودید بن کر نظر آتی ہے۔ جو کہتے ہیں کہ حدود کی حیثیت زنا جرم کی ہے یعنی ان کی حدود سے معاشرے کو برائیوں سے روکا جاتا ہے اس آیت میں دوسری سزا بیان کر دینے کے بعد بتایا گیا ہے ولهم في الآخرة عذاب عظيم۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری سزا تکفیر سیئات کا کام نہیں کرتی ہے۔ لیکن کہنے والے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ محارمین کی خصوصیت ہے کہ ان کو دنیا و آخرت میں سزا ملے گی اور ان کی سزا ان کے گناہوں کا کفارہ نہیں جو قی تو اہر مجرم مسلمان بھی کیوں نہ ہوں۔ ایسی طی نے ابن الغریس کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ آیت بتاتی ہے کہ محارمین کی سزا ان کے لیے کفارہ نہیں ہوتی ہے جبکہ دوسری حدود کفارہ جو جاتی ہیں۔ عارف شخانی نے المیزان میں شیخ الاسلام زکریا سے منسوب ہے، کہ محارمین کے سوا دنیا و آخرت میں عذاب کسی کے لیے نہیں ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَهَ الْوَسِيدِ وَ
 جَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوَ
 أَنَّ لَهُمْ مَلَكًا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِثْلَهُ مَعَهُ لَيَفْتَدُوا بِهِ
 مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيَمَةِ مَا تُقْتَلُ مِنْهُمْ وَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝
 يُرِيدُونَ أَنْ يُخْرِجُوكَ مِنَ النَّارِ وَمَاهُمْ بِخُرُجِينَ مِنْهَا وَلَهُمْ
 عَذَابٌ مُّقِيمٌ ۝

اے پیروان دعوت ایمانی اللہ کی نافرمانی سے بچو اور اس تک پہنچنے
 کا ذریعہ تلاش کرو اور اس کی راہ میں جدوجہد کرو کہ تم کامیابی سے
 ہمدوش ہو جاؤ۔^{۹۲} بلاشبہ جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے
 اگر ان کے قبضہ میں روئے زمین کی ساری دولت آجائے او
 اتنا ہی اور بھی پھر یہ سب کچھ روز قیامت عذاب سے بچنے
 کے لیے فدیہ دے دیں جب بھی ان سے قبول نہ کیا جائے

گا، ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔^{۹۴} وہ چاہیں گے کہ دوزخ سے نکل بھاگیں لیکن اس سے باہر نہ آسکیں گے ان کے لیے دائمی عذاب ہے۔^{۹۵}

اسلام کی سب سے بڑی ذمہ داری

پہلی آیت میں تعزیری قوانین بتائی گئی تھیں اس آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ تعزیری قوانین انسان کی حیات خارجی اور باطنی زندگی کی اصلاح نہیں کرتے۔ انسانی زندگی کے کسی شعبہ کو صرف تعزیرات سے درست نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ خود انسان کہ نفس بھلائی کی طرف مائل اور اعلیٰ اخلاقی اصولوں کی طرف سے متوجہ نہ ہو جائے۔ تعزیری قوانین بیکار ہیں جب تک کہ افراد اور نظام دونوں کی اصلاح ساتھ ساتھ نہ ہو۔ وہ نظام کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا جو محض تعزیری قوانین کی مدد سے تمدن کے جملہ مسائل و مشکلات کا حل دریافت کرنا چاہتا ہو۔ اسلام کا مقصد انسان کی تکمیل ذات اور تسخیر نفس ہے اور تعزیری قوانین اس مقصد کی تکمیل کا ایک ذریعہ ہیں۔ وہ خارجی زندگی اور اخلاقی زندگی کے مختلف شعبوں کے لیے بھی اپنا ایک اصلاحی نظام رکھتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ افراد کی تکمیل ذات اور ان کی شخصیتوں کے نشوونما کا مناسب انتظام کرے کیونکہ نظامات درست نہیں ہو سکتے جب تک کہ افراد درست نہ ہو جائیں۔ زندگی میں تعزیری قوانین ان وقت تک بیکار ہوں گے جب تک پاکستانی شخصیت اور عہدہ سیرت کے نشوونما کا سامان نہ ہو۔ بہتر سے بہتر تعزیری دھچکا بھی برے نتائج پیدا کر سکتا ہے اگر اس نظام کو چلانے والے افراد نیک نیت، ایماندار، مجاہد، قرب الہی کے متلاشی زندگی میں چھونک چھانک کر قدم رکھنے والے نہ ہوں یا یکمشتیت مجموعی ان اخلاقی صفات سے عاری ہوں جن کے بغیر اسلامی نظام کا قیام غیر ممکن ہے۔

اسلام اپنے آنے والوں سے صرف خدا کی ذات و صفات کے اقرار کا مطالبہ نہیں کرتا ہے بلکہ انہیں دنیا کی اجتماعی اصلاح و فلاح کا ذمہ دار قرار دیتا ہے اور ان سے تقاضا کرتا ہے کہ اپنی اپنی ذمہ داریاں

حمد برآہ ہونے کے لیے ہیئت اجتماعی میں وہ تبدیلیاں عمل میں لائیں جن سے یہ ثابت ہو جائے کہ وہ اپنے اقرار میں سچے ہیں۔ اسلام صرف طرز فکر نہیں بلکہ خصوصیت کے ساتھ وہ ایک راہ عمل ہے جس کے مطابق انسان اپنے گرد و پیش اور اپنے اجتماعی ماحول کو بدلتا ہے۔ تبدیلی کی اسی کوشش کا نام جہاد ہے اور جہاد اسلامی زندگی کا اصل الماحول اور ایمان و عمل کا حقیقی جوہر ہے۔ اگر فریضہ جہاد کو اسلامی زندگی سے خارج کر دیا جاتے تو پھر اسلام بھی کائنات کا ایک بلہ جان فلسفہ جاتا ہے اسی لیے قرآن نے اہل ایمان کو حکم دیا ہے کہ زندگی کی ہر شاخ میں خدا کی نافرمانی سے بچو اور اطاعت و اعمال صالحہ اور اخلاق حسنہ کے ذریعے اللہ کا قرب تلاش کرو اور اس کے ساتھ راہِ خدا میں خوب محنت کرو، چاہیں کپاؤ اوقات لگادو، اموال خرچ کرو اگر تم نے یہ کام کر لیے تو نفع یقینی ہے۔

۹۳۔ اے ہیردانِ دعوتِ ایمانی! اللہ کی نافرمانی سے بچو اور اس تک پہنچنے کا ذریعہ تلاش کرو اور اس کی راہ میں ہمد و جہد کرو تا کہ تم کامیابی سے ہمدوش ہو جاؤ۔ ویدک تفسیر ابن عباس، مجاہد ابوالحسن دغیرم اکبر سلف نے قرب سے کی ہے تو سید دعوٰی مٹھنے کے منہ پر لگی ہے اس کا قرب و وصول تلاش کرو، قتادہ نے کہا اے تفتہا ایسا بالطاعة والعمل بایر ضیاع یعنی خدا کی رضا حاصل کرو، اس کی فراہم داری اور پسندیدہ عمل کے ذریعے سے ایک شاعر کہتا ہے :

اذا غفلوا اشون عذنا لو صلتا

وعلوا التصافی بیننا والو سائل

اس میں بھی منہ قرب و اتصال کے مراد ہیں اور وہ جو حدیث میں آیا ہے کہ وسیلۂ جنت میں ایک اعلیٰ منزل ہے جو دنیا میں سے کسی ایک بندے کو ملے گی۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم اذان کے بعد میرے بلے خدا سے وہی مقام طلب کیا کرو تو اس مقام کا نام بھی وسیلہ اسی بلے رکھا گیا ہے کہ جنت کی تمام منزلوں میں وہ سب سے زیادہ عرشِ رحمان کے قریب ہے اور حق تعالیٰ کے مقاماتِ قرب میں سب سے بلند واقع ہو رہے۔ بہر حال پہلے فرمایا کہ ڈسٹے رہو اللہ سے لیکن یہ ڈر ایسا نہیں جیسے آدمی سانپ اور بچھو سے ڈرتا ہے اور شیر بھڑیے سے ڈر کر بھاگتا ہے اس بات سے ڈرنا کہ کہیں اس کی خوشنودی اور رحمت سے دور نہ جا پڑو۔ اسی لیے افعوا اللہ کے بعد وابتغوا الیہ الوسیلۃ فرمایا یعنی اس کی ناخوشی اور بعد و بھر سے ڈر کر قرب و وصول حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ ظاہر ہے کسی چیز سے ہم قریب اسی وقت ہو سکتے ہیں جب کہ درمیانی راستہ قطع کر لیں جس پر چل کر اس کے پاس پہنچ سکتے ہیں اسی کو فرمایا و اجعلہ فی سبیلہ۔

جہاد کو اس کی راہ میں یعنی اس پر پہنچنے کی پوری پوری کوشش کرو۔ لعلکھ تفلون تاکہ تم اس کی نزدیکی حاصل کر سکو۔ میں کامیاب ہو سکو پہلے رکوع کے آخر میں ان لوگوں کی دُعا ہو اور خودی منزل بیان کی حتیٰ بخود اور رسول سے جنگ کرنے اور ملک میں بد امنی اور فساد پھیلاتے ہیں۔ اسی رکوع میں سفاروں کو ان منزلوں سے ڈک کر بتلایا گیا کہ جب شقی اور بد بخت لوگ خدا اور رسول سے جنگ کریں تو تم خدا اور رسول کی طرف ہرگز جہاد کرو۔ وہ اگر زمین میں فساد پھیلاتے ہیں تو تم اپنی کوشش اور حسنِ عمل سے امن و سکون قائم کرنے کی فکر کرو۔

ہماری بات میں یہاں چونکہ اہل ایمان مخاطب ہیں اس لیے اتنا کہ معنی صرف دُسنے کے نہیں بلکہ خدا کی نافرمانی سے دامن بچانے کے ہیں۔ حافظ ابن کثیر نے بھی اسی کو اپنا ہی ہے۔ فرماتے ہیں کہ تقویٰ جب طاعت کے ساتھ آتا ہے تو اس سے مراد محرمات سے بچنا اور منہیات کو چھوڑنا ہوتا ہے۔ علامہ آلوسی نے بھی روح المعانی میں یہی لکھا ہے۔

الشرع اہل ایمان کو اپنے اعمال میں تقویٰ بن کر رہنے کا حکم دیا ہے

حضرت عمرؓ نے ابی بن کعب سے پوچھا تھا کہ تقویٰ کی حقیقت کیا ہے انہوں نے کہا کہ اس کا معنی طریقتاً ذاتی شوقِ باطن کسی ایسے راستہ میں نہیں چلے جس میں کانٹے ہوں فرمایا ہاں بلا ہرل ہو کہ فاعلمت اس حالت میں تم نے کیا کیا، فرمایا شہادت و اجتماعت میں نے کوشش کی کہ دامنِ عیسٰی کو نکل جاؤں کہا فذلک العتویٰ بس یہی تقویٰ ہے۔

اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جہاں چہرہ چہرہ پر خدا کی نافرمانیوں کے کانٹے پکھے ہوں ان سے بچنا اور ہٹ جانا ہی تقویٰ ہے۔ گویا تقویٰ نام ہے محرمات و منہیات اور روائے سے دامن کو بچا کر رکھنا، اس آیت میں فلاح اور کامیابی کی راہ یہ بتائی گئی ہے کہ ایمان رکھتے ہوئے اگر

۱۔ تمہارا دامن ایمان روائے سے پاک ہو،

۲۔ فضائلِ اعمال و اخلاق کی متاع تمہارے دامن میں ہو۔

اور ان دونوں کو رکھتے ہوئے اللہ کی راہ میں تمہاری محنتیں اور کوششیں لگ رہی ہوں تو پھر دین و دنیا میں فلاح و کامیابی کی تمہیں اُمید رکھنی چاہیے اور اگر یہ نہیں تو پھر نبیِ امیر اہل کی طرح اس خوش فہمی میں نہ رہنا چاہیے کہ ہمارے پاس کبھی شرافت ہے اور ہم بہتر زمانے میں کر

اندریں راہ فلاں بن فلاں پرچیزے نیست

ان چاروں میں ترقیب طبعی ہے پہلے فخر صحیح یعنی ایمان پھر زکاۃ سے پہنا، پھر لصال کی کاٹھن (فرم کرنا) اور ان کے ساتھ محنت اور تنگ و دو کرنا، کامیابی کی ساری عمارت ان ہی چاروں سے بنتی ہے۔
 "واجتنبوا الیہا الوسیلۃ فی افعال صالحو، اخلاق حسنہ اور احوال صادقہ فراہم کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔"

وسیلہ کے لغوی معنی

اہم راسب امنانی لکھتے ہیں کہ وسیلہ نام ہے رغبت اور چاہت کے ساتھ کسی چیز کی طرف پہنچنے کا، اگر رغبت کے بغیر پہنچتا ہے تو پھر وسیلہ نہیں بلکہ وصیلہ ہے۔ یہ منظر قربت کی طرح ہے، اور لغت کی مشہور کتاب لسان العرب میں ہے کہ وسیلہ مرتبہ درجہ اور قربت کا نام ہے، مثل فلاں الی اللہ وسیلہ کے معنی ہیں ایسا عمل کیا جس سے اللہ کا قرب حاصل ہو گیا۔ عقیدہ شاعر کہتا ہے:

امری الناس کلہم مدون ما قدرا امرہم ؟

ہی کل ذمی ساری الی اللہ حاصل،

شارحین قرآن نے بھی وسیلہ کے یہی معنی بتائے ہیں۔ حافظ ابن جریر لکھتے ہیں کہ وسیلہ معنی قربت ہے۔ قرطبی فرماتے ہیں الوسیلۃ القربۃ۔ مفسرین قرآن میں ابو ذر، الحسن، مجاہد، قتادہ، عطاء بن ابی رباح، ابن زید اور عبد اللہ ابن کثیر نے بھی یہی معنی بتائے ہیں۔ اللہ سے قربت کا بہترین ذریعہ احکام الہی کی تعمیل اور اعمال صالحہ ہیں۔ عبد اللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ اس فقرے کا مطلب یہ ہے کہ اعمال صالحہ کے ذریعے درجات میں اللہ کا قرب تلاش کرو اور اعمال صالحہ، اخلاق حسنہ کی فراہمی کا طریقہ صرف ایک ہے کہ نبوت کی راہ سے آئے ہوئے علم و عمل سے زندگی میں بھرپور وابستگی ہو۔ بھر حال وسیلہ کے معنی قربت کے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ زندگی میں نبوت کے راستے پرستے علم و عمل کے مطابق اعمال صالحہ کے ذریعے اللہ کا قرب تلاش کرو اور فضائل پیدا کرو، الغرض وسیلہ کے معنی قربت کے ہیں اور فقرے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کا قرب تلاش کرو، وسیلہ کے معنی ذریعہ کے جنہیں ہیں جیسا کہ ہم اردو میں بولتے ہیں کہ فلاں کے وسیلے سے مجھے کامیابی ہو گئی۔ لوگوں نے قرآن میں عربی کے وسیلہ کو اردو کا وسیلہ سمجھ کر اس کی سنتے انداز میں تشریح کی ہے اور اس آیت گرامی کو بزرگوں سے استعانت اور استغاثہ کا سہارا بنالیا ہے۔ آیت قرآنی کا منطوق تو اپنی

جگہ بے جگہ ہے لیکن خود وسیلہ بننے ذریعہ کا اسلام میں کیا مقام ہے۔ وسیلہ بننے ذریعہ کے میں مطلب ہیں ایک یہ کہ کسی مخلوق سے مانگے اور دعا و طلب گاری کے لیے اس کے سامنے ہاتھ پھیلائے یہ بالاجماع حرام ہے اور اس موضوع پر امت میں دو راہیں نہیں ہوتی ہیں۔

دوسرے یہ کہ کسی شخص سے دعا کی درخواست کرنا، یہ ایسے شخص کے حق میں جائز ہے جس سے دعا کی درخواست ممکن ہو، میت میں یہ امکان چوتھ کسی دلیل سے ثابت نہیں ہے اس لیے میت سے یہ دعا تو تسلیم جائز نہیں ہے۔ صحابہ کرام حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کی درخواست کرتے تھے۔ تیسرے یہ کہ اللہ سے دعا کرنا کہلے اللہ اس مقبول بندے کے طفیل میرا کام کرے۔ چہرے کے نزدیک یہ جائز ہے لیکن حافظ ابن تیمیہ نے ناجائز کہتے ہیں اور اس موضوع پر قاعدہ جلیلتہ فی التوسل والوسیلہ کے نام سے ایک رسالہ بھی لکھا ہے لیکن اقسام، استغاثہ، استغاثہ اور توسل میں کوئی فرق نہیں کیا۔ جو لوگ جائز کہتے ہیں ان کا موقف یہ ہے کہ توسل میں کسی مخلوق سے کچھ نہیں مانگا جاتا اور نہ مخلوق سے مدد لی جاتی ہے صرف اتنا کہا جاتا ہے کہ لے اللہ ہماری دعا نکالے ایک بندے کے طفیل قبول فرمائے اور یہ بھی یاد رہے کہ اختلاف صرف جواز میں ہے درجہ دعا میں اس انداز کے سنون اور سبب ہونے کا کوئی مدعی نہیں ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی کاہل کہنا بالکل بجا ہے کہ جواز میں کوئی نقل اور عقلی خرابی نہیں ہے۔ البتہ عوام کو دینی مصلحت اور انتظام شریعت کے لیے منع کیا جاتے تو ہم بھی حافظ ابن تیمیہ کے ساتھ ہیں لیکن گفتگو کا موضوع مسئلہ کی تحقیق ہے اور وہ جواز ہے

اچھا معلوم ہوتا ہے کہ مشہور محدث علامہ قاضی محمد بن علی اشوکانی کے رسالہ الدر المنید سے اس مسئلہ کی تحقیق نقل کر دیں، انہوں نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے وہ اچھا بھی ہے مستدل بھی ہے اور خالص علمی رنگ میں ہے۔ ان کے ایک دوست نے ان سے اس موضوع پر سوال کیا ہے اور انہوں نے اس کا جواب دیا ہے۔ اگرچہ جواب استعانت، استغاثہ، تشفع اور توسل کے ابھارت پر مشتمل ہے لیکن ہم ان کی توسل سے مشعل لئے نقل کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

توسل کسی بندے کا اپنے پروردگار سے کوئی چیز طلب کر لے کیلئے کسی دوسرے بندے کو بطور وسیلہ استعمال کرنا، اس کے بارے میں شیخ عزالدین ابن عبدالسلام کی رائے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سوائے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کسی سے توسل کرنا جائز نہیں ہے بشرطیکہ وہ حدیث جواز پر دلالت کرتی ہے صحیح مان ل جائے اور غالباً ان کا مقصد وہ حدیث ہے جو سنائی

نے اپنی سنن میں اور ترمذی نے اپنی جامع میں بیان کی ہے اور اسے درست قرار دیا ہے اور ابن ماجہ وغیرہ نے بھی اسے روایت کیا ہے کہ

ایک نابینا حضور انور کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میری بینائی جاتی رہی ہے میرے لیے اللہ سے دعا کیجئے، حضور نے اس سے فرمایا کہ وضو کر دو رکعت نماز پڑھ اور کہہ

اللهم انی اسئلتک واتوجه الیک بنبیل محمد الی
استشفع بھفی مد بصری اللهم شفیع النبی فی

اے اللہ میں آپ سے سوال کرتا ہوں اور آپ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں آپ کے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اور اے محمد میں آپ کی شفاعت چاہتا ہوں اپنی بینائی کے لئے اللہ تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو میرے حق میں میرا شفیع بنا لے۔

اور اس کے بعد اسی نابینا سے حضور نے فرمایا کہ اگر تیری کوئی حاجت ہو تو اسی طرح کر لے اللہ تعالیٰ نے اس کی بینائی ٹوٹا دی۔

اور توسل کے بارے میں دو روایتیں ہیں۔

اول توسل وہی ہے جس کا ذکر حضرت عمر بن الخطاب سے صحیح بخاری میں ہے کہ اے پڑدگار! بارش نہ ہونے کے وقت ہم تیرے رسول کو تیری بارگاہ میں بارش کی دعا کے لیے لاتے تھے اور تو ہم پر باران رحمت نازل فرماتا تھا اب چونکہ وہ ہم میں نہیں ہیں اس لیے ان کے چچا عباس کو لاتے ہیں تو گویا حضرت عمر کا توسل بارش کے لیے دعا کرنا تھا یعنی اللہ کی بارگاہ میں حضرت عباس وسیلہ تھے یعنی حضرت عباس ان سب کے ساتھ مل کر دعا کرتے تھے اور حضرت عمر بھی ان کی میت میں دعا کرتے تھے۔ یعنی دعا میں صرف شرکت ہی توسل تھی اور بس۔

دوسرے توسل یہ ہے کہ آپ کی زندگی میں اور آپ کی وفات کے بعد بھی اور آپ کی موجودگی میں اور آپ کی عدم موجودگی میں یکساں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے توسل ہو سکتا ہے اور یہ امر مخفی نہیں کہ حضور انور کی زندگی میں آپ سے توسل اور آپ کے بعد کسی دوسرے سے توسل صحابہ کے اجماع سکوتی سے ثابت ہے کیونکہ حضرت عمر نے جب حضرت عباس سے توسل کیا تو کسی نے آپ کو نہیں ٹوکا۔

میرے نزدیک شیخ عزالدین بن عبدالسلام کی رائے کو آپ کے سوا کسی دوسرے سے توسل ہاں نہیں ہے صیح نہیں ہے اور اس کے وجہ ہیں۔

۱۔ صاحب کا اجماع جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے شیخ کی رائے کے خلاف ہے

۲۔ اللہ کی بارگاہ میں اہل فضل و علم سے توسل کرنا فی الحقیقت ان کے اعمال صالحہ اور عزائے فضل کا توسل ہے کہ ہر بزرگ اعمال ہی کے باعث بزرگ ہوتا ہے لہذا جب کہنے والا کہتا ہے کہ اے اللہ میں فلاں عالم کو تیری بارگاہ میں وسید بنانا ہوں تو وہ باعتبار اس کے علم کے ہوتا ہے۔ مصمیمین اور دوسرے کتب حدیث میں وارد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غار کے تین پہاڑ گزینوں کا ذکر فرمایا ان کے غار کے منہ پر پتھر لگایا تھا تو ان میں سے ہر ایک نے اپنے سب بٹے عمل سے توسل کیا تو خدا نے ذوالجلال نے اسے قبول فرمایا اور پتھر کو غار کے منہ سے ہٹا دیا۔ لہذا اگر شیخ عزالدین بن عبدالسلام یا ان کے متبعین مشدوین کا خیال صیح اور اعمال صالحہ کا توسل شرک یا ناجائز ہو تو ان کی دعا کیوں قبول ہوتی اور وہ پتھر کیوں ہٹتا۔ اور حضور انور واقعہ بیان فرمانے کے بعد اس کا انکار کیوں نہ فرماتے۔

اللہ کی بارگاہ میں انبیاء و صلحا کا توسل پر مگرین اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن حکیم میں۔ انصبد ہم لا یستقر دونا الی اللہ نہ لشی۔ ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں۔

اور فلا تدعوا مع اللہ اھداً اللہ کے ساتھ کسی کو نہ پکارو۔

اور لا دعوت الحق ولا الذین یدعون حقیقی پکار تو اللہ کے لیے ہے اور جن کو وہ اللہ کے من دونہ لا یتجسم نہ ہم بشی سوا پکارتے ہیں وہ ان کی کسی چیز کو قبول نہیں کرسکتے لیکن یہ اعتراضات اس قسم کے توسل پر وارد ہی نہیں ہوتے بلکہ وہ ایسے محل نزاع میں دلیل بن سکتے ہیں جو یہاں موجود نہیں کیونکہ پہلی آیت مانعہ ہم بتا رہی ہے کہ وہ حصول تقرب کے لیے ان کی عبادت کرتے تھے اور معلوم ہے کہ عالم کے ساتھ توسل کرنے والا اس کی عبادت نہیں کرتا بلکہ یہ جانتا ہے کہ اسے فقط علم کی وجہ سے قربت حاصل ہے اسی لیے وہ اس سے توسل کرتا ہے اور اسی طرح فلا تدعوا مع اللہ اھداً میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کی ممانعت فرمائی ہے کہ اس کے ساتھ کسی کو پکارا جائے مثلاً یا اللہ اور یا فلاں اور عالم کے ساتھ توسل کرنے والا سوائے اللہ کے اور کسی کو نہیں پکارتا بلکہ اس سے توسل صرف اس لیے کرتا ہے کہ وہ صاحب عمل صالح ہے گویا عامل کی ذات ہے نہیں بلکہ اس کے عمل صالح سے توسل کیا جاتا ہے جیسا کہ غار میں گرنے

وہ تین آدمیوں نے کیا ۔

اور ایسے ہی اللہ سبحانہ کا یہ ارشاد والذین یدعون من دونه بتارہا ہے کہ یہ کفار ان کو پکارتے تھے جو ان کا جواب نہیں دے سکتے تھے اور اپنے پروردگار کو نہیں پکارتے جو ان کا جواب دے سکتا ہے اور معلوم ہے کہ بزرگ اور عالم سے توسل کرنے والا سوائے اللہ کے کسی کو نہیں پکارتا ، زود غیر اللہ کو پکارتا ہے اور زغیر اللہ سے دعا کرتا ہے ۔

اس تقریر سے ماقین توسل کی اور تمام دلیلیں بھی بیکار ہو جاتی ہیں مثلاً ان کا استدلال مندرجہ ذیل آیت سے

یوم لا تملک نفس لنفس شیئاً والا من عند اللہ ۔

یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ یوم الدین کو امر اللہ تعالیٰ کے لیے مفروضہ ہو جلتے گا اور اس کے سوا کسی معاملے میں کسی کو کوئی قدرت نہیں اور انبیاء میں سے کسی نبی یا علما میں سے کسی عالم کے ساتھ توسل کرنے والا بھی یہ اعتقاد نہیں رکھتا کہ اس کا وسیلہ اللہ تعالیٰ کا امر یا یوم الدین میں شریک ہے کیونکہ جو شخص ایسا عقیدہ رکھے چاہے وہ انبیاء کے ہائے میں بھی دوسرے انھیں کے ہائے میں تو وہ نہایت سخت فاش گمراہی میں مبتلا ہے ۔

اسی طرح ان کا استدلال منع توسل کے ہائے میں لیس لاک من الامر اور قل لا املک نفسی نقلاً و مضار سے بھی درست نہیں ہے کیونکہ یہ آیتیں یہ بتاتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو امر الہی میں کوئی دخل نہیں ہے لیکن ان سے آنحضرت سے توسل کرنے یا آپ کے سوا انبیاء اور اولیاء سے توسل کی ممانعت ثابت نہیں ہوتی ہے بلکہ

توسل کا انکار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا انکار ہے اور شفاعت کا انکار قرآن کا انکار ہے کیونکہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مقام محمود یعنی شفاعت عظمیٰ کے اعزاز سے مشرف فرمایا ہے اور لوگوں کو یہ ہدایت کی ہے کہ آپ کے لیے اللہ تعالیٰ اس مشرف عظیم کی درخواست کریں اور اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا ہے کہ مقام محمود کی درخواست

لے یہاں تک ترجمہ ہم نے الدر النضید فی اخلاص کلمۃ التوحید کے اس ترجمہ سے نقل کیا ہے جو مشہور و محدث عالم مولانا محمد علی اعظمی کے مکتب سداگر حرم ممبئی نے کیا ہے اور جو ابھار سے ۱۳۲۵ء میں جمعیت تبلیغ حقہ مہاراشٹر نے شائع کیا ہے اس سے آگے وہ ترجمہ ہے جو العدل ۲۹ جون ۱۹۳۵ء میں شائع کیا ہے ۔

کیا کرو آپ کو دیا جائے گا اور امت کے حق میں آپ کی سفارش منظور کی جائے گی، ہاں شاعت کا حق اللہ سبحانہ کی اجازت سے ہر گاہ پھر غاص اس کو جس کے لیے اللہ منظور فرمائیں۔

اسی طرح منکرین کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو کہ انی فی غنی عنک من اللہ شیتا میں تمہیں اللہ سے ہرگز نہیں بچا سکتا، پیش کرنا درست نہیں۔ اس لیے کہ یہ جواز تو سل کے خلاف نہیں ہے کیونکہ اس کا تو صرف یہ مطلب ہے کہ جب کسی کو اللہ نفع یا نقصان پہنچانا چاہے تو میں اس کے خلاف نہیں کر سکتا اور یہ بات ہر مسلمان جانتا ہے۔ اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ تو سل ناجائز ہے کیونکہ تو سل کا یہ عقیدہ نہیں ہوتا کہ وسیلہ امر اللہ میں دلیل ہے بلکہ اس کا تو مطلب ہوتا ہے کہ اختیار کل صرف اللہ کو حاصل ہے اور میں اسی سے درخواست کرتا ہوں۔ ہاں پہلے ایسے شخص کے حمل کو پیش کرتا ہوں جو اللہ کے ہاں مقبول ہے اور میں تاکہ وہ اجابت دعا کا سبب یعنی وسیرہن جائے بلکہ بہر حال اس پر تو جملہ اکابر علماء و محدثین اور فقہاء کرام کا اتفاق ہے کہ دعا میں تو سل باہمالیہ صالحہ درست ہے جس کے استدلال میں صحیحین کی دو روایت شاہد ہے جس میں تین آدمیوں کا ذکر ہے جو کسی پہاڑ کے غار میں پھنس گئے تھے اور اعمال صالحہ کا تو سل کر کے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا مانگی اور اس مصیبت سے رہائی پائی۔ یہ تو امر متفق ہے ہاں اس میں بعض حضرات کا اختلاف ہے کہ تو سل کسی کی ذات کے ساتھ کرنا درست ہے یا نہیں۔ جمہور علماء محدثین اور فقہاء اس کے جواز کے قائل ہیں چنانچہ اگر کوئی شخص اپنی دعا میں یوں کہے کہ اے اللہ! میری دعا یا اسطر یا البعد قرآن مجید فلاں میرا یہ کام کرے تو ایسا کرنے میں کوئی خرابی نہیں یہ جائز اور مباح ہے۔ دعا کا اصل قاعدہ تو یہ ہے کہ سب سے پہلے دعا کرنے والا اللہ کی حمد و ثنا کرے اس کے بعد درود شریف پڑھے پھر دعا مانگے، جیسا کہ احادیث میں مراد کے ساتھ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔ یہ درود شریف کا پڑھنا بھی ایک قسم کا تو سل ہے۔

جواز تو سل کے دلائل

اب ہم یہاں اس موضوع پر قرآن و حدیث اور بزرگان دین کے کچھ اقوال ذکر کرتے ہیں تاکہ مسئلہ حقیقت بالکل واضح ہو جائے۔

قرآن میں ہے

كَذَٰلِكَ حَقًّا عَلَيْنَا نَجْحِي الْمُوْمِنِيْنَ اِسى طرح ہم پر حق ہے کہ ہم ایمان والوں کو بھائیں، اس آیت کی تشریح میں حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں
یہ اس بات پر ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کریمہ پر لازم کر لیا ہے
قرآن میں دوسری آیت ہے ۔

وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُوْمِنِيْنَ

حق ہے ہم پر ایمان والوں کی مدد کرنا ۔

حافظ ابن کثیر نے اس آیت کے تحت مشہور محدث ابن ابی حاتم کے حوالہ سے حضرت ابو الدرداء کی روایت نقل کی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ

میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ فرماتے تھے کہ جو مسلمان اپنے مسلمان بھائی کی عزت و ناموس کی طرف سے دفاع کرے گا تو اللہ تعالیٰ پر حق ہے کہ قیامت کے روز اس سے جہنم کی آگ بجائے، پھر آپ نے یہی آیت قرآنی تلاوت فرمائی ۔

حضرت معاذ بن جس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے ایک گدے پر سوار تھا، میرے اور آپ کے درمیان صرف پالان کے پچھلے حصہ کا فاصلہ تھا، آپ نے فرمایا: معاذ ہانتے ہو کہ اللہ کا بندوں پر کیا حق ہے اور بندوں کا اللہ پر کیا حق ہے معاذ نے جواب دیا کہ اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ حضور نے فرمایا کہ اللہ کا حق بندوں پر یہ ہے کہ بندے اس کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں اور بندوں کا حق اللہ پر یہ ہے کہ جب وہ شریک نہ کریں تو اللہ ان کو بخش دے ۔ (بخاری و مسلم)

مسند احمد اور ترمذی میں حضرت ثوبان کا بیان ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، جو مسلمان صبح و شام یمن بارہ صلیت باللہ رباً و بالا سلام دینا و بمحمد نبیاً لکھے گا تو اللہ پر حق ہے کہ ایسے شخص کو قیامت کے دن راضی کرے۔ ترمذی میں حضرت معاذ بن جبل کا بیان ہے کہ حضور کا ارشاد ہے: جس نے رمضان کے روزے رکھے، نماز ادا کی، بیت اللہ کا حج کیا، معاذ

کہتے ہیں کہ مجھے یاد نہیں کہ حضور نے زکوٰۃ کا ذکر کیا یا نہیں تو اللہ تعالیٰ پر حق ہے کہ اس بندے کو بخش دے خواہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت کسے یا اپنے ملک میں رہے۔

حافظ ابن تیمیہ نے قاعدہ جلیلہ فی التوسل والوسیلہ میں امام اعظم ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کی طرف نسبت کر کے لکھا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ کوئی شخص کسی مخلوق کے حوالے سے اللہ سے نہ مانگے اور یوں نہ کہے کہ اے اللہ میں آپ سے سبکی اختیار سوال کرتا ہوں۔ ایسی عبارت فقہ کی ہر کتاب میں موجود ہے۔ دراصل فقہاء کی یہ تعبیر علی الاطلاق نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ فقہاء معتزلہ کے عقیدے کی تردید کرتے ہیں کیونکہ معتزلہ کا عقیدہ ہے کہ جو چیز بندے کے لیے اصلج ہو وہ اللہ پر حق ہے اگان کی تردید کے لیے فقہاء نے یہ تعبیر اختیار کی ہے لیکن وہ حق جو اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و اختیار سے اپنے ذمہ لے لیا ہے اس کی تردید نہیں احادیث بالا میں اسی حق کا ذکر ہے یعنی حق انفضل و بکرم لاسحق الوجوب۔ توسل میں یہی حق دُعا مانگنے والا استعمال کرتا ہے ظاہر ہے کہ فقہاء کے پیش نظر باطل فرستے مجسم اور معتزلہ کا عقیدہ ہے۔ اس کی تردید منظور ہے نہ کہ مطلقاً عدم جواز، در زمان مذکورہ بالا حدیثوں کا کوئی مصداق ہی باقی نہ رہے گا۔

جمہور ائمہ اہل لغز میں حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں :

اور دُعا کے آداب میں یہ ہے کہ دُعا مانگنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرے اور پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ توسل کرے تاکہ دُعا مستجاب ہو۔

مولانا مدنی کی قیمتی تحقیق

حضرت مولانا حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہ العزیز نے سبکی۔ توسل کی نہایت ہی قیمتی تحقیق فرمائی ہے، فرماتے ہیں :

حقیقت یہ ہے کہ لفظ حق متعدد معنوں میں آتا ہے۔

واجب عقلی، واجب شرعی، مستحق ثبات، مشابہ الواجب، موجود، احترام اور مہتمم باشان۔ عربی زبان میں لفظ حق مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ شرح حدیث عینی قادری اور عثمانی وغیرہ اور قاموس، لسان العرب، مجمع البهار وغیرہ علماء لغت فرماتے ہیں کہ واجب عقلی کے معنی میں سلف میں اختلاف ہوا۔ معتزلہ چونکہ عدل اور اصلح کو اللہ تعالیٰ پر حفظاً واجب قرار دیتے ہیں اس لیے اہل توحید کی مغفرت کو اللہ تعالیٰ پر واجب کہتے ہیں اور یہ حق بندوں کا اس پر لازم بالظہر

العقلی قرار دیتے ہیں اور اہل السنۃ والجماعت کسی فعل کو اللہ تعالیٰ پر عطا اور ذاتاً واجب نہیں کہتے اس لیے یہ دعا کرنا اللہم انی اسئلت بحق الانبیاء والمرسلین اہل اعتزال کے موافق ہر گناہ اہل السنۃ والجماعت کے خلاف ہو گا۔ قرآن تابعین اور تبع تابعین میں معتزلہ کا بہت زور و شور تھا اس لیے فقہانے سد اللہ ربیعہ منع فرادیا تھا اب جبکہ ان کے عقائد معدوم ہو گئے تو اشتباہ ہی معدوم ہو گیا تو اس منظر کے استعمال میں پہلے صفحے کے ارادہ کرنے کا احتمال ہی نہیں بلکہ دوسرے معانی ہی لیے جاتے ہیں اس لیے اس میں کوئی حرج نہ ہو گا۔ شرح نقایہ جلد ثانی کتاب اگر اہل ہر ہے۔

حضرت ملا علی قاری فرماتے ہیں کہا گیا ہے کہ دعا میں بجن فلاں کہنا ناجائز ہے خواہ نبی ہو یا ولی، اور ایسے ہی بجنی البیت الحرام یا بجنی الشعر الحرام کہنا ناجائز ہے کیونکہ مخلوق کا خالق پر کوئی حق نہیں ہے لیکن اس کا مطلب یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ بے شک ان کا حق وجوباً نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ان کا حق بتایا ہے یا حق سے مراد حرمت ہے تو پھر یہ وسیلہ کے باب سے ہو گا اور آداب دعا میں توسل بتایا گیا ہے جیسا کہ المحسن المصیین میں ہے۔

علامہ ابن عابدین الشافعی رحمہ اللہ میں رقمطراز ہیں۔
اس مسئلہ میں امام ابو یوسف نے جواز کا موقف اختیار کیا ہے اور فتاویٰ متافضلہ میں ہے کہ اس موضوع پر ایسے آثار آئے ہیں جن سے جواز معلوم ہوتا ہے اور یہ کہنا کہ مخلوق کا خالق پر کوئی حق نہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ جو باری حق اللہ تعالیٰ پر کسی کا نہیں لیکن اس نے اپنے فضل سے ان کا حق اپنے ذمہ لیا ہے اور یا حق سے مراد حرمت ہے اور یہ باب وسیلہ سے ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ دعا میں بجن فلاں یا بحرمت فلاں کہنا نہ صرف جائز ہے بلکہ وارد اور مستحسن ہے۔ یہ بات دھیان میں رہے کہ دعا میں انبیاء کا توسل صرف جائز ہے اور ساری گفتگو جواز ہی کے ارد گرد گھوم رہی ہے ورنہ توسل کے وجوب، سنت اور استحباب کا کوئی قائل نہیں ہے۔ اسی بنا پر فاروق عظیم نے حضرت عباس کی دعا کا توسل اختیار کیا تھا۔ کیونکہ زندہ کا دعائی توسل ایک سنن بیماں تھا۔ اس پیمانہ کو چھوڑ کر محض جائز کو اختیار نہیں کیا یعنی بے شک یہ جائز تھا کہ حضرت عمرؓ

دعا کر لیتے کہ اے اللہ بحمت النبی باذن رحمت نازل فرمائے مگر آپ نے افضل صورت کو اختیار کیا۔ بڑا
یہ ایک ضمنی بحث تھی ورنہ آیت قرآنی کے منطوق سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ کچھ سیلی برقی
خط فہمیوں کی وجہ سے یہاں چند اشارات لکھ دیے گئے ورنہ واجباً اللہ اللہ اللہ اللہ اللہ
صرف یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کا قرب تلاش کرو اور اس قریب کا ذیلہ ایمان و اعمال صالحہ ہیں اور ایمان و عمل
میں برابر اہمیت نبوت کا لیا ہوا علم و عمل ہے اور نبوت کے علم و عمل کا موضوع ذاتِ پیغمبر ہے اس
طرح ذاتِ نبوت بھی وسیلہ ہے اور ذاتِ نبوت تک پہنچنے کی جس قدر راہیں ہیں وہ سب وسائل
ہیں۔ صحابہ کرام، تابعین عظام، مجتہدین، محدثین، صوفیائے کرام، مفسرین قرآن حتیٰ کہ علومِ الہیہ اور
عالیہ کے مؤلفین و شارحین اشارۃً وسیلہ کے منہوم ہیں داخل ہیں۔ جن بزرگوں کے مشائخ طریقت
کو وسیلہ کہا ہے اسی معنی کے اعتبار سے کہا ہے مثلاً مولانا اسماعیل شہید فرماتے ہیں کہ

مرشد بلاشبہ راہِ خدا کا وسیلہ ہے قرآن میں ہے واجباً اللہ اللہ اللہ اللہ
آیت میں فلاح کے لیے چار چیزیں مقرر فرمائی ہیں۔ ایک ایمان، دوسرا تقویٰ، تیسرا طلبِ
وسیلہ اور چوتھے اللہ کی راہ میں جہاد، اہل سلوک اس آیت سے اشارہ سمجھتے
ہوئے سرشد کو وسیلہ گردانتے ہیں۔

اور ایسی ہی بات شاہ ولی اللہ کے والد محترم شاہ عبدالرحیم سے بھی منقول ہے۔ بہر حال یہ
اس آیت کا منہوم تو ہو سکتا ہے مگر اس کا منطوق وہی ہے جو عرض کر دیا گیا۔

جہاد اور اس کی قسمیں

چوتھی بات جو اس آیت میں کہی گئی ہے وہ وجہاً اللہ فی سبیلہ یعنی اللہ کے راستہ میں جہاد
کر دو۔ یہ دنیا غیر و شر کا مسکن ہے یہاں بھلائی کی بھی طاقتیں ہیں اور برائی کی بھی، اور دونوں کو
لپٹے لپٹے طور پر کام کرنے کے لیے پوری آزادی ملی جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ دونوں آپس
میں ٹکراتی رہتی ہیں اور باہم ایک دوسرے کو زیر کرنے کے لیے برابر زور لگاتی رہتی ہیں اس
لیے یہ ایک فطری سبب ہے کہ اسلام کی راہ بھی روکی جائے اور نہ صرف یہ کہ اس کی دعوت
کو قبول نہ کیا جائے بلکہ سرے سے اس دعوت کو برداشت ہی دیکھا جائے اس لیے قدرتی طور پر
سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان رکاوٹوں کے باوجود اہل ایمان کا رویہ کیا ہو۔ قرآن اس سوال کے جواب
میں ہدایت دیتا ہے کہ رکاوٹ خواہ کوئی ہو اسے ہٹانے کی کوشش کی جائے مسلسل کی جائے اور

آخری حد تک کی جاتے۔ اسی کوشش کو قرآن و سنت کی زبان میں جہاد کہتے ہیں۔ جہاد کے لفظی معنی ہیں کہ کسی کام کے لیے اپنی اپنی کوششیں صرف کی جائیں اور مقصد تک پہنچنے کے لیے اپنی ساری طاقت پھوڑ دی جاتے، اس لیے راہِ خدا میں جہاد کرنے کا مفہوم یہ ہوا کہ صرف اللہ کی رضا کی خاطر اس کے دین کی پیروی اور شہادت کا حق ادا کر لینے کے لیے وہ سب کچھ کر ڈالے جو بس میں ہو۔

ظاہرات ہے کہ کسی مقصد کی خاطر جہاد و جہد کی جاتی ہے اس کا حالات سے گہرا تعلق ہوتا ہے جیسے حالات بدلتے ہیں انہی کی مناسبت سے جہاد و جہد کی شکلیں بھی اختیار کی جاتی ہیں۔ یہ موقع پرستی نہیں ہے بلکہ عین اصول پسندی ہے کیونکہ کوئی جہاد محض جہاد و جہد کی خاطر نہیں ہوتی۔ بلکہ کسی مقصد کی خاطر ہوتی ہے اور کسی مقصد کی واقعی خدمت اسی وقت ہو سکتی ہے جب اس کے لیے جہاد و جہد کا طریقہ وقت اور ماحول کو سامنے رکھ کر مقرر کیا گیا ہو ورنہ جہاد و جہد میں تو سب کچھ بگاڑ دیا جاتے گا مگر اس کا حاصل شاید بھی کچھ نکلے اور یہ یقیناً کوئی دانشمندی کی بات نہ ہوگی اور ہوا بات دانشمندی کی نہیں ہوتی وہ اصول پسندی کی بھی نہیں ہو سکتی اس لیے جہاد فی سبیل اللہ کی شکل کب کیا ہو، اس کا تعین حالات ہی کرتے ہیں۔ اسلام نے اصولی طور پر مختلف حالات کے لیے اس کی جو مختلف قسمیں مقرر کر دی ہیں وہ تین ہیں۔ داخلی جہاد، دعویٰ جہاد، مسلح جہاد۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

داخلی جہاد کا مطلب یہ ہے کہ خود اسلامی معاشرے میں جو برائیاں سر اٹھاتی نظر آئیں ان کے خلاف آواز اٹھائی جاتے اور انہیں مٹا دیا جاتے۔ کیونکہ اندر کی برائیاں اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلم معاشرے سے برائیاں مٹانے کے لیے یہ ہدایت دی ہے کہ،

مجھ سے پہلے جس نبی کو بھی اللہ تعالیٰ نے مبعوث کیا تھا اس کو اپنی امت میں سے ایسے مخلص پیرو اور سامعین ضرور ملے جو اس کے طریقہ کو مضبوطی سے اختیار کیے ہوتے اور اس کے احکام کا اتباع کرتے پھر ان کے بعد ان کی جگہ ایسے ناخلف آتے جن کا حال یہ ہوتا کہ کہتے وہ جس پر عمل نہ کرتے اور کرتے وہ جس کی ان کو ہدایت نہ ہوتی، لہذا جس نے ان کے خلاف اپنے ہاتھ سے جہاد کیا وہ مومن ہے۔

اور جس نے اپنی زبان سے جہاد کیا وہ بھی مومن ہے اور جس نے اپنے قلب سے جہاد کیا وہ بھی مومن ہے اس کے بعد ایمان کا راتی برابر بھی درجہ نہیں ہے ۔

ظاہر ہے کہ یہ ارشاد صرف ایک خبر کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ ایک ہدایت اور حکم کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کا مقصد امت کو یہ بتانا ہے کہ آئندہ چل کر اسے بھی اگر ایسے ہی حالات درپیش آئیں تو اسے کیا کرنا چاہیے ۔

اس حدیث سے دو باتیں صاف اور کھل کر سامنے آتی ہیں ایک تو یہ کہ مسلم معاشرے کے اندر جو بُرائی اور ضلالت بھی پیدا ہو اسے ختم کر دینے کی کوشش جہاد ہے ۔

دوسرے یہ کہ اس جہاد کی عمل صورتیں کیا ہو سکتی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا ایمانی ترہ کیا ہے سب سے افضل صورت تو یہ ہے کہ اس بُرائی اور ضلالت کے خلاف مناسب انداز میں قوت کا استعمال کیا جائے۔ لیکن اگر اتنی جرأت نہ ہو کہ کسی معنی اور کسی صورت میں بھی ہاتھ کی قوت استعمال کی جاسکے تو پھر زبان کی قوت سے کام لیا جائے، بُرائی کو کھلم کھلا بُرائی کہا جائے، نصیحت کی جائے سمجھایا جائے، آخرت یاد دلائی جائے، اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے ڈرایا جائے اور جب ان باتوں سے کام نہ چلے تو موقع ملے کے مطابق زہر و تواریخ بھی کی جائے اور اگر اتنی جہمت نہ ہو تو ایسا لازماً کیا جائے کہ اس بُرائی کے خلاف دل بے چینی سے بھر جائے، آنکھوں میں وہ کاشا بن کر چھینٹی پڑے، آرزو کی جائے کہ یہ بُرائی جلد مٹ جائے، دعائیں کی جائیں کہ اسے اللہ اپنے اس بندے کو شیطان کے حملے سے بچائے۔ اس کے ضمیر کو زندہ اور اس کے ایمان کو بیدار کر دے تاکہ اس بُرائی سے اسے نفرت ہو جائے اور اس کو سخت سے وہ اپنے کو پاک کر دے ۔

مسلم معاشرے کو پاک کرتے رہنے کی یہ تین عملی شکلیں ہیں اور یہی تین شکلیں ممکن بھی ہیں ان میں سے ہر شکل جہاد ہے کیونکہ یہ حق کے قائم رہنے کا ایک حصہ ہے اور ان کی خاطر کوشش کرنے میں کلام جہاد فی سبیل اللہ ہے ۔

برائیوں کے مٹانے اور اچھائیوں کے بڑھانے کا لالہ نے کی جن کوششوں کو یہاں جہاد کہا جا رہا ہے اس کا دوسرا نام قرآن و سنت کی زبان میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے ۔

دعویٰ اور فکر می جہاد

فکری جہاد کا مطلب یہ ہے کہ غیر مسلم حلقوں کی طرف سے اسلام کے خلاف جن شبہات کو

پیش کیا جاتے ان کا مناسب جواب دیا جائے اور کوئی ایسا نہ پہنچے دیا جائے جو اسلام کے چہرے کے لیے باریک سا حجاب بھی بن سکتا ہو۔ مگر دورِ سربراہِ اسیر جہاد کا دور تھا جب کہ اللہ سبحانہ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ

فلا قطع الکافرین وجاحد ہم بے جہاد اکبیراً

ان منکرین کا تم کما نہ مانو اور قرآن کے ذریعے ان سے بھرپور جہاد کرو۔

قرآن کے ذریعے جہاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ منکرینِ اسلام کے سامنے ان قرآنی نواہی کو برابر پیش کرتے رہو جو اسلام کی سچائی کو اور ان کے وجوہ انکار کو بے وقتی کو کھول کر رکھ دیتی ہیں اور ان طرزِ استدلال سے ان کے خوف کی کمزوری برابر حیاں کرتے رہو جو قرآن نے تمہیں سکھایا ہے یہ کام پورے زور کے ساتھ انجام دیتے رہو یہاں تک کہ انہیں اپنے انکار کے حق میں کہنے کے لیے کوئی نام کی بھی مغفول بات نہ ملے جیسے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کو زبان کا جب فرمایا ہے چنانچہ آپ کا ارشاد ہے: البراداد میں ہے:

مشرکوں سے اپنے مالوں اور اپنی جانوں اور زبانوں سے جہاد کرو۔

دعوتی اور فکری جہاد دراصل عقل و استدلال کے ہتھیاروں سے لڑنے کا نام ہے یہ لڑائی اس وقت تک لڑنی چاہیے جب تک کہ اسلام کی مخالفت کے سامنے فکری اور استدلالی قلعے سماں نہ ہو جاقبِ خواہ ان کا تعلق اہلیات سے ہو اور چاہے طبیعات سے، تمدن و تہذیب کے میدان ہوں یا معاشیات و سیاسیات کے، سائنس سے حاصل کیے ہوئے ہوں یا فلسفے سے۔

مسلم جہاد

مسلم جہاد کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کی راہ مانگنے والوں کے خلاف مسلح جنگ کی جاتے۔ اور اس قسم کی جنگ جب تک وہ اس راہ کو کھلا چھوڑ کر ہٹ نہیں جاتے۔ یہ جہاد کی آخری شکل ہے اور اس کا دورِ اصطلاحی نام قتال ہے اور عمل کے میدان میں یہ جہاد کی سب سے مشکل اور صبر آزما قسم ہے لیکن دین کے بقا کے لیے بہت ضروری ہے جیسا کہ اسی وقت واضح کر دیا گیا تھا جس وقت کہ اس مسلح جہاد کا سب سے پہلے حکم دیا گیا تھا۔

کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ کَذَلِكَ وَهَوْنٌ لِّکُمْ وَهَوْنٌ لِّکُمْ

یہ قتال اور مسلح جہاد اسلام اور اہل اسلام کے حق میں بہتر کس طرح ہے اس کی وضاحت ان دو رکعات آیتوں میں ملے گی جن میں قتال کی غایت بتائی گئی ہے مثلاً

وَقَاتِلُوا هُمْ حَتَّى لَا يَكُونُ فِتْنَةً وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ

یعنی جنگ کا حکم اس لیے دیا گیا ہے تاکہ اللہ کا نام لینے اور اس کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنے کی راہ صاف ہو جاتے اور فتنے کی حالت ختم ہو جاتے فتنہ قرآن کا ایک اصطلاحی لفظ ہے اس کی تفصیل آپ دوسرے پارے میں پڑھ چکے ہیں۔

جہاں تک ان رکاوٹوں کا تعلق ہے جنہیں دور کرنے کے لیے مسلح جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔ ہر شخص محسوس کرے گا کہ وہ سب ایک ہی نوعیت کی نہیں ہو سکتیں۔ اس لیے ان کے خلاف کیے جانے والے جہاد کی نوعیت بھی ایک سی نہ ہوگی بلکہ اس میں بھی فرق ہوگا۔ ہائزہ بتاتا ہے کہ یہ رکاوٹیں اصولی طور پر دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ جن کا تعلق اسلام لا چکے والوں سے ہوتا ہے یعنی یہ کہ جو لوگ اسلام لا چکے ہیں انہیں اسلام لانے کے مجرم میں شمار کیا جاتے اور مطالبہ کیا جاتے کہ اسلام سے باز رہنا اور اس غرض سے ان کے خلاف طاقت بھی استعمال کی جاتے۔ دوسری وہ جن کا تعلق غیر مسلم ملتوں سے ہوتا ہے یعنی یہ کہ غیر مسلموں کے سامنے اسلام کو پیش ہی نہ کرنے دیا جاتے یا ان کے اوپر ایسا ایک اجتماعی نظام مسلط رکھا جاتے جس کے ہوتے ہوئے انہیں اسلام کو قریب سے دیکھنے کا موقع ہی نہ مل سکے اور جب رکاوٹیں دو طرح کی ہوتی ہیں تو ان ہی کی مناسبت سے جہاد بھی دو قسم کا ہوگا دفاعی اور اقدامی۔

ان دونوں قسموں پر تفصیلی بحث اور ان کی شرائط آپ کو انشا اللہ سورہ حج پارہ ۱۱ میں ملیں گے۔

کفر کے لیے عذاب کا اشتداد

۹۴۔ بلاشبہ جن لوگوں نے راہ کفر اختیار کی ہے اگر ان کے قبضے میں روئے زمین کی ساری دولت آجائے۔ اور اتنا ہی اور بھی۔ پھر سب کچھ روز قیامت عذاب سے بچنے کے لیے نذر میں دے دیں تو ان سے قبول نہ کیا جائے گا ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ یہ پچھلی آیت میں بتایا تھا کہ انسان خدا سے ڈرنے اس کا قرب حاصل کرنے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے ہی سے فلاح و کامیابی کی امید کر سکتا ہے۔ اس آیت میں متنبہ فرمادیا کہ جن لوگوں نے خدا سے روگردانی کی وہ

آخرت میں اگر وہ کئے زمین کے سائے خزانے بکد اس سے بھی زیادہ خرچ کر ڈالیں اور فدیہ دے کر عذاب الہی سے بچنا چاہیں گے تو یہ ممکن نہ ہوگا، غرض وہاں کی کامیابی تقویٰ، اتھائے وسید اور جہاد فی سبیل اللہ سے حاصل ہوتی ہے رشوت اور فدیہ سے نہیں ہو سکتی۔

موقعہ محل دلیل ہے کہ یہاں راہ کفر اختیار کرنے والوں سے وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے فلاح کی راہ ایمان، تقویٰ، قرب الہی کی تلاش اور جہاد فی سبیل اللہ سے ہٹ کر بے بنیاد سماسوں اور خیالی ہمنار شوش کے اعتماد پر زندگی گزار دی۔ کبھی اپنے نسب کے عالی ہونے اور کبھی اپنی نسبت کے اشرف ہونے کے خیال میں چرگتے اور یہ امید باندھ بیٹھے کہ فلاح ہمارے حصہ میں ہے، اور آخرت میں نجات کے لیے یہ چیزیں کافی ہیں ان کو غلط فہمی یہ ہے کہ خدا برائیاں اور معیار فلاح جس طرح اس دنیا میں لین دین ہے ایسے ہی آخرت میں بھی دے دلا کر کام چل جائے گا قرآن بتا رہا ہے اور بار بار بتاتا ہے کہ کفر کا قدر آخرت میں نہ نسبت سے ہوگا نہ نسبت سے جیسا کہ بنی اسرائیل کا خیال ہے اور نہ جاہ و منصب اور مال و دولت سے ہوگا جیسا کہ مشرکین کا خیال ہے مطلب یہ ہے کہ ان چار چیزوں کے بغیر نجات نہ ہوگی اگر وہ لوگ زمین کے تمام خزانے اور اس کے ساتھ انہی کے برابر مزید خزانوں کے مالک بن جائیں اور ان سب کو عذاب الہی سے بچنے اور چھٹکارے کچھنے فدیہ میں دیں جب بھی ان کا فدیہ قبول نہ ہوگا۔

کفر کے لیے عذاب کا امتداد

۹۵ - وہ چاہیں گے کہ دوزخ سے نکل جائیں لیکن اس سے باہر نہ آسکیں گے ان کے لیے دائمی عذاب ہے۔ احادیث کثیرہ سے ثابت ہے کہ بہت سے گنہگار مومنین ایک مدت تک دوزخ میں رہ کر پھر نکالیں جائیں گے اور حق تعالیٰ اپنے فضل و رحمت سے جنت میں داخل کر دے گا یہ آیت ان احادیث کے مخالف نہیں ہے کیونکہ یہاں شروع آیت سے صرف کنار کا حال بیان کیا گیا ہے۔ مومنین کے متعلق اس آیت میں کوئی حرف نہیں ہے بلکہ پہلی آیت میں کفر کے لیے جس عذاب کے اشتداد کا ذکر ہوا تھا۔ اس آیت میں اسی عذاب کے امتداد کا ذکر ہو رہا ہے۔ دراصل یہ آیت گرامی یہاں بطور استیغاف بیانی آئی ہے یعنی اس میں ذہنوں

میں اٹھے ہرے سوال کا جواب دیا گیا ہے۔ سننے والوں نے جب پہلی آیت سنی تو فوراً ذہن میں سوال آیا کہ جب ان سے فدیہ قبول نہیں کیا جائے گا تو پھر ان کا کیا بنے گا، جواب دیا کہ یہی بنے گا کہ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے۔

پہلی آیت یعنی ان الذین کفروا۔ بھی بطور مبالغہ مستلزم الیٰ تعنی مگر وہ استیغاف اُٹھے ہرے سوال کے جواب کے لیے نہیں بلکہ اپنے سے پہلی آیت کے معنوں کو موکد اور زوردار بنانے کے لیے ہے۔ پہلی آیت میں بتایا گیا تھا کہ آخرت میں کامیابی کا مدار ایمان کے ساتھ روزا کی سے پہنچنے فصاحت کو رہانے اور اللہ کی راہ میں ان تھک محنت پر ہے۔ یعنی مدارِ نجات خود انسان میں ہے انسان سے باہر نہیں ہے جیسا کہ کفار سمجھتے ہیں کہ فدیہ سے کام چل جائے گا۔ اسلام دینِ فطرت ہے اور اللہ کا قانون یہی ہے کہ دُنیا و آخرت میں انسان کی جسمانی و روحانی سعادت کا راستہ خود انسان کی اپنی ذات سے وابستہ ہے۔ عیسائیوں کے عقائد کے مطابق انسان کی نجات مسیح کے فدیہ میں ہے لیکن مسلمان کے اعتقاد میں انسانی سعادت کا مدار خود انسان کا ایمان و عمل صالح سے وابستہ ہونا ہے اسی راہ سے انسان رخصت الٰہی حاصل کر سکتا ہے۔ دُنیا و آخرت دونوں کی فلاح کا مدار یہی ہے۔ شاید یہاں آپ کے ذہنوں میں یہ غلط فہمی ہو کہ دین تو انسان کو آخرت کی طرف جگاتا ہے اور دُنیا سے بے پروا بناتا ہے۔ پھر اسے ایمان و تقویٰ، اعمالِ صالحہ اور اللہ کی راہ میں جہاد سے وابستہ ہونے کے نتیجے میں دُنیا کی فلاح کیسے مل سکتی ہے۔ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے آپ کو انٹرویو پاسے کا انتظار کرنا ہو گا لیکن یہاں یہ اصول حقیقت ذہن نشین کر لیجئے کہ دُنیا کی عزت، یہ اقتدار حکومت جنہیں دُنیا کی فلاح کہا جاتا ہے دین کی نگاہ میں سب سے کمزور چیزیں نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی یہ نعمتیں اور اس کا فضل ہیں۔ چنانچہ قرآن نے آیات میں ان کو بھی حقیقت دی ہے۔ ابھی ابھی آپ ایک رکو رکھ پڑھ چکے ہیں کہ اذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ جعل فیکم انبیاء و جعلکم ملوکا۔ اسی طرح آپ چودہویں پاسے پر پڑھیں گے۔

مرب اللہ مثلاً قرینۃ کانت امنۃ مطمئنۃ یا تبہا من ربہا
مرغدا من کل مکان فکفرت بانعمہ اللہ

اس میں زندگی کی سہولتوں اور رزق کی فراوانیوں کو اللہ کی نعمتیں کہا گیا ہے۔
اور پھر یہ کہ انسان اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا غلیلہ اور نائب بن کر پیدا کیا گیا ہے اس کا منصب یہی ہے کہ وہ اس زمین کا انتظام ہاتھ میں لے اور اسے اپنے مالک کے احکام کے مطابق چلاتے۔

یہ دونوں بنیادی حقیقتیں اگر سامنے ہوں تو زیرِ نظر غلطی اس حد تک بالکل حل ہو جاتی ہے کہ دنیا کی عزت و دولت اور اقتدار ہرگز ایسی چیزیں نہیں ہیں جن سے تعلق رکھنا اور قائمہ اٹھانا دینِ دایمان کے منافی ہو، کیونکہ جو چیزیں اللہ کی نعمت اور اللہ کا فضل ہوں وہ اس کے حق شناس بندوں کے لیے ممنوع نہیں ہو سکتیں۔

یہ تو ہر دینی ہی عزت و دولت کے فضل اور نعمت ہونے کا تقاضا۔

اب انسان کے پیدا ہونے کا مقصد کو سامنے رکھ کر غور کیجئے کہ اس کا تقاضا کیا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا ہے اور چاہتا ہے کہ اس زمین پر وہ اس کے احکام کے مطابق اپنے افعال و استقامت کرے تاکہ یہاں بھی اس کی مرضی پوری ہو جاتی ہے جس طرح کہ باقی کائنات میں پوری ہوتی رہتی ہے تو جب یہاں ایسے لوگ موجود ہوں جو اپنے اس فرض منصبی کا پورا احساس رکھتے ہوں۔ اُس وقت تک یہ بات اللہ تعالیٰ کی حکمت و دانائی اور انصاف کے بالکل خلاف ہو گی کہ انہیں اس زمین کے اقتدار سے محروم رکھے۔ دوسری طرف خود ان فرض شناس اور خدا کے فرمانبردار بندوں کے لیے بھی یہ بات کسی طرح صحیح نہ ہو گی کہ وہ اس اقتدار کے حاصل کرنے سے بے نیازی برتیں۔ جس کے بغیر وہ اپنے فرضِ خلاف سے کسی طرح عہدہ برائے نہیں ہو سکتے۔ جس چیز سے ان کی دنیا کی کامیابی فریضہ وابستہ ہو وہ تو ان کے لیے صرف پسندیدہ ہی نہیں بلکہ ضروری بھی ہو جائے گی۔ ان پہلوؤں کو سامنے رکھتے تو یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمان صرف خودی فلاح ہی کا منہ نہیں بلکہ دنیوی فلاح کا بھی حقدار اور حلقہ گار ہوتا ہے اور اس کے لیے ایسا ہونا اس کی پہلی و بنیادی کا تقاضا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک سچے اور صحیح الفکر مسلمان کی دعا یہ ہوتی ہے۔

ما بنا آتنا فی الدنیا حسنة و فی الآخرة حسنة و قنا عذاب النار

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جَزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا
 مِنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٥٦﴾ فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهِ
 وَأَصْلَحَ فَإِنَّ اللَّهَ يَتُوبُ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٥٧﴾ أَلَمْ تَعْلَمْ
 أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ يُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ وَيَغْفِرُ
 لِمَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٥٨﴾

اور چور مرد اور چور عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ دو، ان
 کے کیسے کی پاداش میں، اللہ کی طرف سے عبرتناک سزا کے
 طور پر اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔ پھر جس نے اپنے
 اس ظلم کے بعد توبہ کی اور اصلاح کر لی تو اللہ تعالیٰ اس پر نظر
 عنایت فرمائے گا بے شک اللہ غفور رحیم ہے۔ کیا تم
 نہیں جانتے کہ زمین و آسمان کی بادشاہت اللہ ہی کی
 ہے وہی جس کو چاہے سزا دیتا ہے اور جسے چاہے

معاف کر دے اور اللہ ہر چیز پر قدرت والا ہے۔^{۹۹}

اسلام میں ضابطہ دیوانی

اسلامی نظام اپنے شہریوں کو چار چیزوں کے تحفظ کی ضمانت دیتا ہے، ایک جان، دوسرے مال، تیسرے اُرد و عزت، چوتھے رومان و دین۔ جیسے وہ جان کی حفاظت کے لیے قانونِ فوجداری پیش کرتا ہے، اسی طرح وہ مال کے لیے دیوانی ضابطہ لوگوں کے سامنے رکھتا ہے۔ جیسے وہ جان کی قدر و قیمت جتنا اور اس کی حفاظت کا نظم قائم کرتا ہے تاکہ شہری سکون و اطمینان کی زندگی بسر کر سکیں ٹھیک اسی طرح وہ شہریوں کے احوال کی بھی حفاظت کرتا ہے تاکہ شہریوں کا سکون بوجہ نہ ہو۔ یہ واقعہ ہے کہ سرمایہ کو راحت و عافیت کے پہنچانے میں بہت بڑا دخل ہے۔ سرمایہ محفوظ رہے تو زندگی پریشانیوں سے دوچار ہو جاتی ہے۔ قرآن پاک میں اسی لیے مال کو زینت سے تعبیر کیا ہے المال والبسوت نہ یسنن الحیاۃ الدنیا۔ اس تعبیر میں مال کو اولاد سے پیسے لائے ہیں اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کا مال و دولت سے کس قدر شدید لگاؤ ہے۔ اسی شدت کا قرآن نے اس طرح اظہار کیا ہے و انتما لحب الخیر لشہید یہ حقیقت ہے کہ دولت جسے انسان ہائز طریقے پر کماتا ہے۔ مالک کو اپنی املاک کی حفاظت کرنے اور دوسروں کو ان پر دست اندازی سے روکنے کا حق حاصل ہے۔ یہ حق ملکیت کے حق کے اولین لوازم میں سے ہے۔ حق ملکیت کو موثر اور حقیقی بنانے کے لیے ضروری ہے کہ مالک کو اس بات کا اختیار ہو کہ وہ دوسرے افراد کو بغیر کسی حق کے اس میں مداخلت کرنے سے روک سکے۔ قرآن نے اس آیت گرامی کے ذریعے مالک کے حق تحفظ کو واضح الفاظ میں تسلیم کیا ہے۔ اس سے اُسگے بڑھ کر اس حق کے استعمال کو بعض حالات میں ضروری قرار دیا گیا ہے تاکہ وہ اہم مقاصد اور مصالح ضائع نہ ہو جائیں جو ملکیت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اپنی ملکیت کی حفاظت کے لیے انسان اپنی جان تک فٹے سکتا ہے جو خود اللہ کی ایک مقدس امانت ہے۔ اپنی ملکیت کی حفاظت میں ماہاجانے والا شہادت کا درجہ پاتا ہے۔ صحیح بخاری میں بحوالہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

من قتل دون ماله فعمو شهید۔

جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں مارا گیا ہے وہ شہید ہے۔

حضرت ابو ہریرہ کا بیان ہے کہ ایک شخص حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ اے اللہ کے رسول آپ کی کیا رائے ہے؟ اگر میرے پاس کوئی شخص میرا مال چھیننے آئے۔ آپ نے فرمایا کہ تم اسے اپنا مال نہ دو۔ اس نے کہا کہ اگر وہ مجھ سے لڑائی کرے تو آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ نے فرمایا کہ تم بھی اس سے لڑائی کرو، اس نے کہا کہ اگر وہ مجھے قتل کر لے تو؟ آپ نے فرمایا کہ تم شہید ہو گئے۔ اس نے کہا کہ اگر میں اسے قتل کر دوں تو آپ کی کیا رائے ہے؟ آپ نے فرمایا کہ وہ جہنم میں جائے گا۔

جب کسی ملک سے کسی دوسرے کا حق بھی متعلق ہو تو اس کا تحفظ صرف ایک انفرادی حق نہیں بلکہ ایک قانونی ذمہ داری بھی ہے۔ قرآن نے چوری کی سزا کا تعین اسی قانونی ذمہ داری کی خاطر کیا ہے۔ مرنہ الجحیم میں ہے جو شخص کسی چیز کا مالک ہو اس پر اس چیز کی حفاظت واجب ہے جس سے وہ انتفاع کر رہا ہے۔

۹۶۔ اور چور مرد اور چور عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ دو۔ یعنی پہلی مرتبہ چوری کرے تو دہانہ ہاتھ گٹھے پر سے کاٹ دو۔ باقی تین میل کتب فقہ میں ملیں گی۔ پچھلے رکوع میں ڈکیتی وغیرہ کی سزا ذکر کی گئی تھی درمیان میں بعض مناسبات کی وجہ سے جن کو ہم بیان کر چکے ہیں مومنین کو چند ضروری نصائح کی گئیں۔ اب پھر اسی پچھلے مضمون کی تکمیل کی جاتی ہے۔ یعنی وہاں ڈکیتی کی سزا مذکور ہوئی تھی اس آیت میں چوری کی سزا بتلا دی گئی۔

چوری کی تعریف

قرآن میں اسارق اور اساروق کے الفاظ بولے ہیں۔ یہ چونکہ صفت کے صیغے ہیں ان سے نشاندہ یہ بات سمجھی جا رہی ہے کہ اس کام کی نوعیت ایسی ہو جسے چوری کہا جاسکے اور جس کے مرتکب کو چور کہہ سکیں۔ لغوی معنی کے اعتبار سے تو مطلقاً ہر چوری سرقہ ہے۔ لیکن قانون کی زبان میں اس سے مراد غیر کے مال کو کسی خاص جگہ اور کسی خاص مقدار میں چپکے سے لے لینا ہے۔ قانون کے

دائرے میں چوری کے چوری ہونے کے لیے نہیں بلکہ چوری کے قابل قطعید ہونے کے لیے کچھ شرطیں ہیں یہ ممکن ہے کہ اور بصورت کی حد تک ایک ایک عمل چوری تو ہو سکتا ہے مگر قابل سزا نہیں ہو سکتا۔ مثلاً آپ نے راہ چلتے کسی درخت سے پھل توڑا ہے یا کسی کھیت سے کچھ سبزی بغیر مالک کی مرضی کے چپکے سے اٹھالی یا کسی کی مال سے کچھ ٹکڑیاں لے لیں یا کسی کے کچن سے کچھ روٹیاں لے لیں۔ یہ سب چوریاں ہیں اور ناجائز و حرام ہیں مگر یہ وہ قانونی چوری نہیں ہے جس پر ہاتھ کاٹنے کی سزا ہے۔ چوری وہ کہلاتے گی جو محفوظ جگہ سے مخصوص مقدار میں حائل بالغ نے نظر بھا کر لی ہو۔ بشرطیکہ جس چیز کی چوری کی گئی ہے وہ کسی کی ملک ہو اور قیمتی ہو۔ فقہانے چوری کے چوری ہونے کے لیے ایک سے زیادہ شرطیں بتاتی ہیں مثلاً چوری کسی قدر قیمت رکھنے والی چیز کی کی گئی ہو۔ محفوظ مال کی کی گئی ہو۔ وہ چیز چور کے پاس امانت نہ ہو اور اس میں اس کا کوئی حصہ نہ ہو بہر حال چوری کے قانونی ہونے کے لیے ان باتوں کا ہونا ضروری ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ چوری نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ چوری تو ہے اور ناجائز بھی لیکن ہاتھ کاٹنے کے قابل نہیں ہے۔ اگر عدالت تقریر دینا چاہے تو کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔

چوری کا نصاب

چوری کے قانونی اور قابل سزا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ چیز جس کی چور نے چوری کی ہے اس کی مالیت دس درہم ہو۔ یعنی ساڑھے سات ماشے چاندی کی قیمت کے برابر ہو۔ یہ امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے اس سے کم پر چور کو ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں دی جاسکتی۔ فقہان کا باہم اختلاف ہے کہ کتنی مالیت کی چوری پر ہاتھ کاٹا جائے۔ علماء کا ہر اس بات کے قائل ہیں کہ سرے سے اس مسئلے میں کوئی نصاب نہیں ہے۔ بہر حال میں ہاتھ کاٹا جائے گا خواہ زیادہ مال چوری کرے یا تھوڑا، قطعید کے لیے نفس مال کی چوری کافی ہے۔ ائمہ اربعہ میں جن کا مذہب چوری دنیا میں رائج ہے۔ ان میں امام مالک نصاب ستر درہم قرار دیتے ہیں اور امام شافعی چوتھائی دینار یہ مقدار بھی تین درہم کے برابر ہے۔ امام اعظم نے جو دس درہم بتاتے ہیں یہ مقدار اس اعتبار سے مناسب تر ہے کہ اس نصاب میں تین درہم اور ربع دینار سب شامل ہو جاتے ہیں اور چونکہ معاملہ ایک انسانی حضور کے کاٹنے کا ہے اس لیے احتیاط اسی کی متقاضی ہے۔ جو لوگ کوئی نصاب نہیں مانتے وہ آیت قرآنی کو استدلال میں پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

اس میں نصاب کی کوئی قید نہیں ہے۔ جمہورِ نصاب کے قائل ہیں حدیثِ نبوی پیش کرتے ہیں۔ امام مالک اور امام شافعی حضرت عائشہ کی یہ حدیث دلیل ہیں پیش کرتے ہیں کہ

پورا کا ہاتھ نہ کاٹا جاتے گا مگر جو قصائی یا اس سے زیادہ دینار کی چوری پر رشتہ مند ہے دوسری حدیث حضرت عبداللہ بن عمر کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ڈھال کی چور پر ہاتھ کاٹا جس کی قیمت تین درہم تھی۔

امام حنظلہ جو حنفیہ دس درہم نصاب کی دلیل ہیں عمرو بن شعیب کی حدیث پیش کرتے ہیں کہ حضور اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

پورا کا ہاتھ دس درہم سے کم مالیت کی چوری پر نہ کاٹا جائے گا۔
حضرت عبداللہ بن عباس کا بیان ہے کہ

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے ڈھال کی چوری پر ہاتھ کاٹا جس کی قیمت ایک دینار یا دس درہم تھی۔ (الرواد و دسنائی)

ایک دوسری حدیث میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،
دس درہم سے کم کی چوری پر ہاتھ نہ کاٹا جائے گا۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ جب ایک مسروقہ ڈھال کی قیمت کے برابر ہو تو ہاتھ کاٹا جائے گا اور پھر ڈھال کی قیمت کے سلسلے میں مراعت ہے۔
ڈھال کی قیمت دس درہم تھی۔

ایک دفعہ ایک چور دربارِ فاروقی میں حاضر کیا گیا جس نے کچھ کپڑے چرائے تھے۔ حضرت عمر نے حضرت عثمان سے فرمایا کہ آپ اس کی قیمت لٹائیں۔
حضرت عثمان نے اس کپڑے کی آٹھ درہم قیمت لٹائی۔

ان تمام روایات کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ نصابِ سرقہ کم از کم تین درہم اور زیادہ سے زیادہ دس درہم حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔ دوسرے نظموں میں یہ کہا جاتے کہ دس درہم ایسا نصابِ سرقہ ہے جس میں ہاتھ کاٹنے میں اتنا رعبہ میں سے کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ اس پر سب کا اتفاق ہے غالباً احتیاط کے ماحی پہلو کے پیشِ نظر اخاف نے دس درہم نصابِ سرقہ قرار دیا۔ ابن عربی کا قول ہے کہ

سفیان ثوری عن حدیث میں اپنا بلند مقام رکھنے کے باوجود اسی کے قائل ہیں کہ دس درہم سے

کم کی چوری میں ہاتھ نہ لانا چاہئے اس لیے کہ ہاتھ ایک محرم عضو انسانی ہے اور اس محرم حصہ بدن اس وقت تک مباح قرار نہیں دیا جاسکتا ہے جب تک اس پر لوگوں کا اجماع و اتفاق نہ ہو جلتے اور یقیناً دس درہم یا اسے نصاب ہے جس پر سب اتفاق کیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ دس درہم یا اس سے زیادہ کی چوری پر اسلام پھر کر معاف نہیں کرتا ہے اللہ اس میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ مال بغفلت رکھا گیا ہو جو مال محفوظ جگہ میں نہ ہو گا اس کی چوری میں ہاتھ نہ لانا چاہئے گا کیونکہ ممکن ہے کہ چور نے یہ خیال کیا ہو کہ مال کو اس کی کچھ زیادہ ضرورت نہیں ہے۔ یہ غفلت خواہ حقیقتہ ہو یا ممکن۔ حقیقتہ مثلاً کسی سپاہی پر کیدار کے پہرے میں ہو اور ممکن مثلاً مکان کے اندر صندوق وغیرہ میں ہو۔ سر راہ اور کھلے پڑے ہوئے مال کے اٹھا لینے پر حد سترہ نہ ہوگی۔ چوکیدار اور پہرہ دار وغیرہ اگر چوری کریں تو وہ خیانت کے مجرم ہیں مگر ہوں گے حد سترہ کے مستوجب نہ ہوں گے اور یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مال کسی کی ملک ہو غیر مملوک مال کی چوری پر حد نہ ہوگی۔

چوری کا ثبوت

چوری کے ثبوت کے دو ہی طریقے ہیں ایک اقرار دوسرے شہادت، اور ظاہر ہے کہ شہادت عدالت میں ہوگی اس لیے چوری کی سزا انفرادی نہیں ہوگی بلکہ عدالت کے ذریعے ہوگی اور عدالت کا وجود حکومت پر موقوف ہے اس لیے مقلد نے اس آیت سے یہ بات بھی سمجھی ہے کہ اُمت پر نظام حکومت قائم کرنا ضروری ہے کیونکہ حدود کا نفاذ اور جو فرض میں ہے اور نفاذ کی صورت پروری اُمت کے اجماع کے فیصلہ کے مطابق افراد سے ممکن نہیں اس لیے حکومت کا نظام ضروری ہے۔ امام رازی نے یہ بات بڑے پتے کی لکھی ہے کہ

مقلدین نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ حکومت کا قائم کرنا اُمت کے

فرائض میں داخل ہے۔

امام رازی کا یہ کہنا بالکل بر محل اور سچا ہے۔ کیونکہ اسلامی قانون جن احکام و ہدایات پر مشتمل ہے ان میں سے بے شمار احکام ایسے ہیں جن کی تعمیل ایک سیاسی نظام اور ایک اختیار حکومت کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ ظاہر ہے کہ احکام قانونی و سیاسی و اجتماعی کی پیروی بھی ٹھیک اسی طرح ضروری ہے جس طرح دوسرے حکموں کی، کیونکہ یہ بھی اسی طرح قرآنی احکام ہی ہیں جس طرح کہ وہ دوسرے

احکام اور ان کی بھی سہا اور سی اسی طرح تقاضائے ایمان ہے جس طرح ان کی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے احکام میں کسی انتخاب کی آزادی نہیں دی ہے کہ جن کی چاہیں تعمیل کریں اور جنہیں چاہیں چھوڑ دیں اس کا مطالبہ کرتے ہیں کہ جو کچھ بھی میری جانب سے نازل کیا گیا ہے سب کی پیروی کرو اور اتباعو ما انزلنا الیکم من ربکم اگر تم نے ایسا نہ کیا بلکہ میرے حکموں میں اپنے منشاء کے مطابق تفریق کی جن احکام پر چاہا عمل کیا جن کو چاہا چھوڑ دیا تو یہ ایمان کی نہیں کفر کی مدخل ہوگی۔ چنانچہ یہود کا تہذیب ہمارے سامنے ہے جن پر اسی طرح کے طرز عمل کی بنا پر صاف نفعوں میں یہ جرم عائد کیا گیا تھا کہ

افتمونون ببعض الکتاب وتکفون ببعض۔

قانون اسلام میں مساوات

اس آیت میں صفت کے صفیے لاکر اٹھ کر دیا ہے کہ یہ چوری کی صفت جہاں بھی پائی جائے گی وہ منرا کا مستحق ہے۔ اس میں امیر غریب، حاکم و محکوم اور چھوٹے بڑے میں کوئی امتیاز نہیں ہے جو بھی چوری کا مرتکب ہوگا منرا پائے گا۔ خواہ کوئی بھی ہو، مرد ہو یا عورت، کافر ہو یا مسلمان، شہری ہو یا دیہاتی، اس قانون میں اس کی برکز گنتاں نہیں ہے کہ کوئی بڑا آدمی یا شریف خاندان کا فرد مجرم کہے تو اسے صاف کر دیا جائے اور غریب و نادار کرے تو اسے منرا کے شکنجے میں کس دیا جائے بلکہ جس جرم کی جو سزا حق تعالیٰ کی طرف سے متعین ہے سب کے لیے ہے، نہ انگریزوں کے قانون کی طرح کالے گھسے کا امتیاز ہے اور نہ منو صالاج کی طرح برہمن شوتر کی کوئی تفریق ہے۔

زمانہ نبوت کا چوری ہی کا واقعہ مشہور ہے اور امام بخاری، امام مسلم مصمیں میں اس سکہ راوی ہیں کہ ایک دفعہ ایک محمدی عورت نے چوری کی اور سرکار نبوت میں اس کی چوری ثابت ہو گئی تو تفریق پر طبعی طور پر یگران نظر آکر ایک نامی گرامی خاندان کی خاتون کا ہاتھ اس جرم میں کاٹا جائے اس لیے کہ اس سے پورے قبیلہ کی توہین ہوتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے یہ طے کیا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس موضوع پر گفتگو کی جائے ممکن ہے کہ اس سے پہلے کی کوئی صورت نکل آئے۔ صحابہ کرام ہر حال آپ کے مزاج شناس تھے اس لیے کسی کو جرأت نہ ہوئی۔ سب نے مل کر حضور انور کے چہیتے حضرت اسامہ کو اس کے لیے تیار کیا کہ وہ خدمت گرامی میں حاضر ہو کر اس موضوع پر آپ سے بات کریں۔ لوگوں کے مشورے کے مطابق حضرت اسامہ نے خدمت اقدس میں حاضر ہو کر ترجمانی کی اور اس محمدی عورت کے سلسلے میں بات شروع کی۔ یہ سننا تھا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ تہمتاً

اٹھ رنگ بدل گیا اور ارشاد فرمایا اے اسامہ تم اللہ کی مقرر کردہ حدود میں سے ایک حد میں سفارش کے لیے حاضر ہوئے ہو، پھر آپ نے ایک غلطی دیا جس میں فرمایا کہ تم کو معلوم نہیں ہے کہ بنی اسرائیل صرف اس دبو سے تباہ ہو گئے مگر انہوں نے باہم امتیازی سلوک برتنا شروع کر دیا تھا۔ ان میں سے کوئی شریف آدمی چوری کرتا تو لوگ اسے چھوڑ دیتے اور اگر کوئی گنہگار آدمی چوری کا مرتکب ہوتا تو اس پر حد جاری کرتے، اس کے بعد آپ نے فرمایا:

خدا کی قسم اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔
ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ دیکھ کر حضرت اسامہ کانپ گئے اور کہنے لگے یا رسول اللہ میرے لیے مغفرت کی دعا فرمادیکھئے، اور اسی پر بس نہیں بلکہ اس کے بعد آپ نے بارود رعایت اس عورت کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ چنانچہ سب قانون ہاتھ کاٹا گیا۔ وہ قانون اس کے بعد بہت دنوں تک زندہ رہی ہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ وہ کبھی کبھی برے گھراؤں میں تھیں۔

اس واقعہ سے اس اسلامی قانون کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ حافظ ابن تیمیہ لکھتے ہیں:
شریف و مکین، قوی و کمزور، سحر پر حدود کا اجراء ضروری ہے۔ کسی حال میں اس منہ کا معطل کرنا درست نہیں ہے، از سفارش سے عروب ہو کر اور نہ بد و سختی سے مرہون ہو کر، جو حاکم اور امیر اقامت حدود پر قادر ہونے کے باوجود حد قائم نہ کرے تو ایسے افراد حکومت پر اللہ اور فرشتوں کی لعنت ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی طرف سے کچھ قبول نہ فرماتے گا۔ اور ان کا شمار ان لوگوں میں ہو گا جو اللہ تعالیٰ کی آیات کے بدلے دنیا سے دلی خریدتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جس کی سفارش اللہ کے احکام کے نفاذ میں آڑ بن جاتے وہ اللہ کے احکام کا مخالف ہے۔

چوری کی سزا میں رعایت

دس درہم یا اس سے زیادہ کی چوری پر سزا وہ سکتا ہو یا اس کی قیمت کی کوئی چیز ہو، دونوں صورتوں میں ہاتھ کاٹا جائے گا۔ لیکن بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کی چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا دی جاتی ہے۔ مثلاً ایسی چیزیں جو رہا نہیں ہوتی ہیں جیسے گوشت اور پھل وغیرہ۔ یہ چیزیں

وہیں درہم سے زیادہ کی بھی اگر کوئی چوری کرے تو ہاتھ کاٹنے کی سزا دی جائے گی۔ نسائی اور ابن ماجہ میں حضرت ابو ہریرہ کے حوالہ سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے کہ:

پہل اور ترکاری کی چوری میں ہاتھ نہ کاٹا جاتے گا۔
معمولی چیزوں کی چوری پر بھی ہاتھ کاٹنے کی سزا دی جائے گی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں۔

معمولی چیزوں کی چوری پر زندہ قبرت میں ہاتھ نہیں کاٹا جاتا تھا۔
کھانے کی چوری میں ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں۔ حضور کا ارشاد ہے کہ:

کھانے کی چوری میں ہاتھ کاٹنے کی کوئی سزا نہیں ہے۔
حضرت علی اور حضرت عثمان کا فیصلہ ہے اور صحابہ کرام میں سے کسی نے اس میں اختلاف نہیں کیا ہے کہ پرندے کی چوری میں ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں ہے۔ نیز یزید، عمرو، علی رضی اللہ عنہما نے سرکاری عزاز سے چوری کرنے والے کا ہاتھ بھی نہیں کاٹا۔ اور اس معاملہ میں بھی صحابہ کرام میں سے کسی کا اختلاف منقول نہیں ہے، اچھے، لیٹرے اور خائن کا بھی ہاتھ نہیں کاٹا جاتا تھا۔
حضور انور کا ارشاد ہے،

خیانت کرنے والے لیٹرے اور اچھے کے لیے قطعید کی سزا نہیں ہے۔
ان ماخذ کی بنیاد پر مختلف ائمہ فقہ نے مختلف چیزوں کو قطعید کی سزا سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک سب سے پہلے ترکاریاں گروشت، چکا ہوا کانا، غلہ جس کا ابھی کلیان نہ کیا گیا ہو۔ کھیل ادھ گانے بجانے کے آلات وہ چیزیں ہیں جن کی چوری میں قطعید کی سزا نہیں ہے نیز جنگل میں چرتے ہوئے جانوروں کی چوری اور بیت المال کی چوری میں وہ قطعید کے قائل نہیں ہیں۔ اسی طرح دوسرے ائمہ نے بھی بعض چیزوں کو اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیا ہے، لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہے کہ ان چیزوں پر سرے سے سزا ہی نہ دی جائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ ان جرائم میں ہاتھ نہ کاٹا جاتے گا۔

رشتہ داروں کی چیز کی چوری

اس طرح کوئی اپنے قریبی رشتہ دار کی کوئی چیز چورے تو اس کو بھی ہاتھ کاٹنے کی سزا دی جائے گی۔ جیسے اولاد مال باپ کی چیز چوری کرے یا باپ اولاد کی چیز یا بیوی شوہر کی چیز چورے

اور شہر ہروی کی۔ قریبی رشتہ داروں میں مہائی، مہن، پچا، ماموں اور چچا بھی داخل ہیں۔ تفصیل کے لیے قانون کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے۔

یہ واضح ہے کہ چوری کے ثبوت میں عدالت کے پاس ذرا بھی تاویل کی گنجائش نکل آئے گی تو پھر عدالت ہاتھ کاٹنے کی سزا دے سکے گی اس لیے کہ لینے والا کہہ سکتا ہے کہ میری نیت چوری کی نہ تھی بلکہ اس ارادہ سے اٹھایا تھا۔ مثلاً کوئی قرآن چوری کرے، اس میں وہ کہہ سکتا ہے کہ پڑھنے کے لیے لیا تھا۔ چوری کے ثبوت کے لیے چور کو خود اقرار ضروری ہے جس میں کسی جبر و اکراہ کو دخل نہ ہو۔ یا دو قابل شہادت مردوں کی گواہی ہو۔

کب کون سا عضو کاٹا جائے

ہاتھ کرنا سا کاٹا جائے اور کہاں سے کاٹا جائے۔ اس سلسلہ میں امرِ قانون کا احادیث کے پیش نظر فیصلہ ہے کہ دایاں ہاتھ کاٹا جائے گا اور صرف پہنچا اتر دیا جائے گا۔ ہاتھ کی صراحت خود قرآن کی اس آیت میں ہے اور دایاں کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ عبد اللہ ابن مسعود ۷۷ آیت کی قرأت خافضوا ایانہما اس طرح بھی آئی ہے۔ شیخ ابن الہمام فتح القدیر میں رقمطراز ہیں:

دایاں ہاتھ کا تعین عبد اللہ بن مسعود کی قرأت میں ہے کہ ان کے دائیں ہاتھ کاٹا اور یہ قرأت مشہورہ ہے لہذا خبر مشہور کا درجہ اسے حاصل ہے جس سے طلاق کی

تقیید درست ہے۔ فتح القدیر ج ۵ ص ۱۵۳۔

یہاں یہ سوال کہ کہاں سے کاٹا جائے تو بتایا جا چکا ہے کہ ہتھیلی سے نیچے والا جوڑ کاٹا جائے گا

حضرت عبد اللہ بن عمر کا بیان ہے کہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چور کا ہاتھ جوڑے کاٹا جو ہتھیلی کے نیچے

ہوتا ہے۔

اس سے مراد ہتھیلی اور کھالی سسے درمیان کا جوڑ ہے اور کاٹنے کے بعد خون بند کرنے کی فوری ترکیب کی جاتی ہے۔ زماذ نبوت و صحابہ میں گرم لوہے سے داغ دیا جاتا تھا تاکہ خون بند ہو جائے در زلزلہ مقصود نہیں ہے۔ حدیث میں ایک چور کا واقعہ ہے کہ وہ خدمت نبوی ۷۷ حاضر کیا گیا۔ آپ نے اسے دیکھ کر فرمایا۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس نے چوری نہیں کی۔ کچھ جو در خود ہو۔ اٹھایا رسول اللہ میں نے چوری کی ہے یہ سنا کر آپ نے فرمایا:

اسے لے ہاؤ اور ہاتھ کاٹ کر اسے درخ دو۔

حضرت علی کے متعلق یہ صراحت آئی ہے کہ

اُس نے چوروں کے ہاتھوں کو کھائی سے کاٹ کر درخ دیا۔
 داغ اس لیے جاتا ہے کہ اگر ایسا نہ کیا جاتے تو ققام جسم کا خون بہہ جاتے گا اور چور ہلاک ہو جاتا

گا، صاحبِ دُرا نے لکھا ہے کہ

اگر داغ نہ جائے تو ہاتھ کی کٹائی ہلاکت کا ذریعہ ہو جائے گی حالانکہ فشا

زبردنا دایب ہے نہ موت و ہلاکت۔

دوبارہ چورمی کی سزا

مزید پتہ چور جب دوبارہ چورمی میں گرفتار ہو کر آئے اور اس کی چوری ثابت ہو جائے تو اس کا بایاں پیر کاٹا جاتے اور تیسری بار چورمی کرے گا تو اسے ہمیشہ کے لیے جیل بھیج دیا جائے گا۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ ایک ہاتھ ایک پیر باقی رکھا جائے گا تاکہ وہ بالکل لنگھا اور کھانے پینے سے مجبور ہو کر نہ رہ جائے۔ حضرت علی فرماتے ہیں کہ :

چور جب چورمی کرے تو اس کا دایاں ہاتھ کاٹا جائے۔ پھر اگر چورمی کرے تو

بایاں پیر کاٹا جائے۔ اور تیسری بار چورمی کرے تو قید خانہ میں ڈال دیا جائے تاکہ

اس میں خیر و صلاح آجائے۔ مجھے اللہ سے شرم آتی ہے کہ میں اسے اس طرح

بنا دوں کہ کھانے اور استنجا کے لیے کوئی ہاتھ اور چلنے کے لیے کوئی پیر باقی نہ

رہے۔
 فتح القدیر ج ۵ ص ۱۵۵۔

اگرچہ قانون کے بعض مدارس یہ بھی کہتے ہیں کہ تیسری مرتبہ چورمی ثابت ہو تو پھر دوسرا ہاتھ کاٹ دیا جائے اور چوتھی مرتبہ میں دوسرا پاؤں لیکن بات یہ ہے کہ وہ اس طرح قوم و ملک پر بار ہی جائے گا۔ ایک طرف وہ سائے اعضا سے محروم ہو جائے گا۔ دوسری طرف اس کے کھانے پینے اور پاخانہ پیشاب کرانے کی ساری ذمہ داری حکومت پر آجائے گی اور ایسا شخص سرکار کے لیے ذرا بڑا
 بن جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اخاف نے اس کا ہر جگہ لحاظ رکھا ہے۔ اس حد تک کہ اگر کسی چور کا دایاں
 ہاتھ شل ہو چکا ہے اور ایسے ہی ایک پاؤں تو اس کا نہ ہاتھ کاٹا جاتے اور نہ پاؤں۔ دُرا یہ میں صراحت
 چور کا بایاں ہاتھ شل یا ٹا ہوا ہو یا اس کا دایاں پیر کاٹا ہوا ہو تو اس کا پہلی

دفعہ میں دیاں ہامتہ اور دوسری دفعہ دیاں پر مذکور ہائے گاکیر نکو اس طرح کرنے میں چھپنے اور پھٹنے کی قوت سے محروم کر دینا ہے۔

جس حدیث میں تیسری مرتبہ میں دوسرا ہامتہ اور چوتھی مرتبہ میں دوسرا ہامتہ کا ٹھنکے کا حکم ہے۔ اولاً محدثین نے اس کی صحت میں کلام کیا ہے ثانیاً اگر وہ حدیث صحیح ہو تو اس صورت میں علماء اسے سیاست پر محمول کرتے ہیں۔

چوری کے مفاسد

چوری کی بُرائی کی وجہ یہ نہیں ہے کہ چور دوسرے کے مال کو اس کی اجازت کے بغیر چھپنے سے تصرف میں لاتا ہے بلکہ یہ محسوس ہے کہ ایک شخص اپنی جائز محنت سے کمایا ہو کچھ حاصل کرنا ہے۔ دوسرا بغیر کسی جائز محنت کے بے وجہ اس پر قبضہ کر کے چھپنے کی محنت کو، کالت کر دیتا ہے اور اگر اس کو روک تھام نہ کی جائے تو کسی کو اپنی محنت کا پھل نہ ملے۔ اس کے علاوہ اس ایک بُرائی میں کتنی برائیاں شامل ہیں۔ بے وجہ دوسروں کے گھر میں داخل ہونا۔ اس کی ملکیت کا جائزہ لینا۔ جب فعل کے خبث باطن کو ظاہر کرتا ہے۔ پھر اس کی بدولت ناحق خون بھی بہتا ہے اور بے گناہ جانیں بھی ضائع جاتی ہیں اور چور کو چور بڑے بڑے سرمائے پر کسی جائز محنت کے بغیر قبضہ پالیتا ہے اس لیے وہ اس کو بُری بیداری سے ضائع کر دیتا ہے اور خود بھی اس سے بہت کم فائدہ اٹھاتا ہے بلکہ اس دولت کا بڑا حصہ اخفا سے مجرم کی خاطر بر باد کر دیتا ہے۔

اہل عرب میں شاید عام افلاس کے سبب سے یہ بیماری اتنی پھیل چکی کہ قرآن نے اس کے اسناد کے لیے مسلمان ہونے والوں سے اس کی ہیئت لینی بھی ضروری سمجھی۔ سورہ متعمز میں ان چند باتوں کا ذکر ہے جن کا عہد مسلمان ہونے وال خواتین سے لیا جاتا تھا۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ چوری نہ کریں گی۔ فتح مکہ کے دن جب کہ ان خواتین اسلام قبول کرنے آئی ہیں تو آپ نے ان سے بھی عہد لیا۔ اس موقع پر ابوسفیان کی بی بی ہند نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ ابوسفیان ایک بھیل آدمی ہیں، وہ میرے اور میرے بچوں کے لیے پورا خرچ نہیں دیتے مگر میں ان کے مال سے کچھ چھپا کر لے لوں۔ فرمایا کہ تم ان کے مال سے اتنا لیا کرو جو انصاف اور دستور کے مطابق تمہارے اور تمہارے بچوں کے لیے کافی ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس مال فقہ جبار فقر ہو اگر ہم اس کو ادا نہ کریں اور وہ حسب ضرورت پوچھے بغیر ہمارے حساب سے کچھ لے لے آئے۔

پوری نہیں ہے۔

چوری کی سزا کی حیثیت

۹۷۔ ان کے لیے کہ پاداش میں اللہ کی طرف سے جو بڑا نیک سزا کے طور پر اود اللہ غاب محنت والا ہے۔
 ہر کوئی غاب ہے اس لیے اسے حق ہے کہ جو چاہے قانون نافذ کرے کوئی چوں و چرا نہیں کر سکتا۔
 لیکن ہر کوئی محنت والا بھی ہے اس لیے یہ احتمال نہیں کر محض اپنے اختیار کامل سے کام لے کر کوئی قانون
 بے موقع نافذ کرے، نیز وہ اپنے ناقص بندوں کے اموال کی حفاظت کا کوئی انتظام نہ کر سکے یہ اس
 کی عزت اور غلبہ کے منافی ہے اور چوروں کو یوں ہی چھوڑے یہ اس کی محنت کے خلاف ہے۔ آیت
 میں بیاکتنا کلاما من اللہ کہہ کر اشارہ کر دیا کہ جو سزا چور کو دی جا رہی ہے وہ مالِ مسروق کا بدلہ نہیں
 بلکہ اس کے فعلِ مسروق کی سزا ہے تاکہ اسے اور دوسرے چوروں کو تنبیہ ہو جلتے۔ بلاشبہ جہاں یہ حد
 جاری ہوتی ہے وہاں دو چار ہی کی سزایابی کے بعد چوری کا دروازہ قطعاً بند ہو جاتا ہے۔ آج کل دعیان
 تہذیب اس قسم کی سزاؤں کو وحشیانہ سزا جانتے ہیں لیکن چوری کرنا اگر ان کے نزدیک کوئی مذہبِ فعل
 نہیں ہے تو قطعاً آپ کی مذہبِ سزا اس غیر مذہب و دستور کے استیصال کا جواب نہیں ہے۔ اگر قوی
 سی وحشت کو رہنا کہ بہت سے چور مذہب بناتے جاسکتے ہیں تو تہذیب کے علمبرداروں کو خوش ہونا
 چاہیے کہ ان کے تہذیبی مشن میں اس وحشت سے مدد مل رہی ہے۔ بعض نام نہاد مفسرِ قرآن بھی اس
 کوشش میں ہیں کہ قطع یہ کہ سزا کو چوری کی انتہائی سزا قرار دے کر اس سے ہلکی سزا ہی کا اختیار نہایت
 حق سے حاصل کر لیں، مگر مشکل یہ ہے کہ نہ تو چوری کی اس سے ہلکی سزا قرآنِ کریم میں کہیں موجود ہے
 اور نہ حدِ نبوت و صحابہ میں اس کی کوئی نظیر پائی گئی۔ کیا کوئی شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اتنے طویل
 عرصہ میں جتنے چور پکڑے گئے ان میں ایک بھی ابتدائی چور نہ تھا جس پر کم از کم میاں جواز ہی کے
 لیے قطع یہ سے کوئی ہلکی ابتدائی سزا جاری کی جاتی۔

کسی ملحد نے پرانے زمانے میں اس حدِ مسروق پر یہ بھی شبہ کیا تھا کہ جب شریعت نے ایک ہاتھ
 کی دیت پانچ سو دینار رکھی ہے تو اتنا قیمتی ہاتھ جس کے کٹنے پر پانچ سو دینار واجب ہوں وہی ہم
 کی چوری میں کس طرح کاٹا جاسکتا ہے۔ ایک عالم نے اس کا جواب دیا انھما لما کانت امینۃ
 کانت ثمیتۃ، فلما خانت خانت، یعنی جو ہاتھ امین تھا جمی تھا جب چوری کیے گئے
 ہوا تو ذلیل ہو گیا۔

دراصل اس فقرے میں قطع دیکھو وہ سبب بتاتے ہیں ایک دیکھ کر یہ مجرم کے جرم سرزد کی منزل ہے دیکھ کر یہ سزا نکال ہے۔ نکال کے معنی کسی کو ایسی سزا دینے کے ہیں جو دیکھنے والوں کے لیے تازیانہ جرت ہو۔ یہ دو ٹول ہائیں چوری کی سزائیں ایک وقت مطلوب ہیں یعنی یہ پاداش عمل بھی ہے اور دوسروں کے لیے سامانِ جرت بھی۔ جو لوگ ان دونوں پہلوؤں پر نظر نہیں ڈالتے وہ بسا اوقات اسی طبلان کا شکار ہو جاتے ہیں کہ مجرم کے افسار سے سزا زیادہ سخت ہے حالانکہ اس سزا میں صرف اس جرم ہی کی سزا نہیں ہے جو مجرم سے سرزد ہوا ہے بلکہ ان جہت سے جرائم کی روک تھام بھی اس میں شامل ہے جن کا وہ اپنے فعل سے محروک بن سکتا ہے اگر اس کو ایسی سزا دی جاتے جو دوسروں کے حوصلے پست کر دے۔

یہ امر واقعہ ہے کہ جنس کی طرح ملل کی بھوک بھی انسان کے اندر بڑی شدید ہے اگر اس مرض کو ذرا ذمیل مل جاتے تو پھر اس کے تسکین کیا کچھ نکل سکتے ہیں اس کا اندازہ کرنے کے لیے موجود زمانے کے حالات میں کافی سامانِ بصیرت ہے۔

اس زمانے کے کسی تمدن سے محمدان ملک کے صرف ایک سال کے وہ ہر ناک جرائم جمع کر لیے جائیں جو محض چوری کی وجہ سے پیش آتے ہیں تو وہ انکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہیں، لیکن شدید جدید کے حصے پر سے انسان کی چٹائی پر کسی کو تو حق اُلوہ ہو جاتی ہے کہ چوری پر کسی کا ہاتھ کٹ جائے لیکن ان ہزاروں دل ہلا دینے والے واقعات سے اس کا دل نہیں پیچتا جو بالواسطہ یا بلاواسطہ چوری کی راہ سے ظہور میں آتے ہیں۔ چوری کوئی مفرد جرم نہیں بلکہ یہ جرائم کا مجموعہ ہے جس سے قسم قسم کے ہر ناک جرائم جنم لیتے ہیں۔ اگر چوری کی راہ سے دودھ جوتے تو یہ یا تو بالکل ناپید ہو جاتیں گے یا کم از کم یکڑا متافی حد تک کم ضرور ہو جاتیں گے۔ چنانچہ تجربہ گوارہ ہے کہ چوری پر ہاتھ کٹنے کی سزا سے صرف چوری کے واقعات انتہائی حد تک کم ہو گئے بلکہ دوسرے جرائم میں بھی کمی آگئی۔ پھر اگر کچھ ہاتھ کٹ جانے سے ہزاروں سرخرواں گھر، اور ہزاروں اُبردقین محفوظ ہو جائیں، علم و شجاعت اور حرث و نسل کی بربادی کے بہت سے ابواب کا خاتمہ ہو جائے تو عقل سلیم تو یہی کہتی ہے کہ یہ جہنگ سودا نہیں ہے بلکہ غایتِ مابرت سودا ہے۔

ہاتھ کی قیمتِ اسلام میں

شیخ الاسلام نے اس کی طرف اجمالی اشارہ کیا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضارِ انبیاء فی اسلام میں

بڑی قدر قیمت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے قانون میں مراعت ہے کہ اگر کوئی کسی انسان کا ہاتھ کاٹ دے تو اسے اسلام کی عدالت سے پانچ سو دینار کی نذر ملے گی اور یہ رقم حکومت کے خزانے میں داخل کرنے کے بجائے اس شخص کو دی جائے گی جس کا ہاتھ کاٹا گیا ہے۔ حضور انور کا ارشاد ہے کہ :

ایک ہاتھ میں آدمی دیت ہے۔
 مدیر ہے کہ اگر کوئی ایک شخص کی ایک انگلی کاٹ دے تو اس کی دیت بھی اسے دلائی جائے گی۔
 اسلام میں ایک انگلی کی قیمت دس اونٹ ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس کا بیان ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ :

دونوں ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں کی دیت برابر ہے، ہر انگلی کی دیت دس

اونٹ ہیں۔
 غور کریں کہ جس ہاتھ کی قیمت اسلام میں پانچ سو دینار ہے وہ محض دس درہم کی چوڑی ہر طرف کاٹ دیا جاتا ہے اور اس سلسلے میں اسلام اس پر کوئی رحم نہیں کرتا۔ اس سے بڑی اذازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلامی قانون میں پُر امن شہری زندگی کی کیا اہمیت ہے۔ اس سے قائم رکھنے کے لیے وہ کس سختی سے کام لیتا ہے۔

حافظ ابن قیم اعلم الموقعین میں رقمطراز ہیں۔

ایک طرف چوتھائی دینار میں ہاتھ کاٹنے کا حکم اور دوسری طرف ہاتھ کی دیت پانچ سو دینار مقرر کرنا انتہائی حکمت و مصلحت پر مبنی ہے۔ اس لیے کہ دونوں جگہ احتیاط ہے اور مال و اعضا دونوں کی حرمت کا لحاظ ہے۔ چوتھائی دینار میں ہاتھ کاٹنا مال کی حفاظت کے لیے ہے اور پانچ سو دینار دیت مقرر کرنا ہاتھ کی حفاظت کی خاطر ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اسلام کے پیش نظر انسان کے مال کی بھی حفاظت ہے اور اس کے ہاتھ کی بھی۔ یعنی دونوں کی حرمت باقی ہے۔ اس کی صورت اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے جو اسلامی قانون نے اختیار کی ہے۔
 حافظ ابن حجر مقلانی لکھتے ہیں :

اگر ہاتھ کی دیت صرف چوتھائی دینار ہوتی تو ہاتھوں کا قانونی تحفظ نہ ہوتا اور اگر نصاب مرتفع پانچ سو دینار مقرر کیا جاتا تو پھر غریبوں کے اموال کے تحفظ کا

سامان نہ ہوتا اور چوریوں زیادہ ہوتیں۔ لہذا حکمت کے تقاضے سے دونوں پہلوؤں کا لحاظ رکھا گیا اور اس طرح کر کے میں دونوں کی قدر و قیمت باقی رہی ہے۔

قاضی عبداللطیف ہاکی نے کیا بھی بات فرمائی ہے کہ

صيانة العظما غلاها ارضعها

خیانتۃ المال فانهم حکمة الباری

اور اہم شافعی کی طرف منسوب کر کے لکھا ہے

هناك مظلومة خالت بقیتمها

وہا هنا ظلمت خانت علی الباری

اور شمس الدین الکروری فرماتے ہیں

قیمة الید نصف الالف من ذهب

فان تعدت فلا تسوی بدینار

سب کا حاصل یہ ہے کہ ہاتھ بیک برائی سے بچ کر رہ قیمتی رہا اور جب برائی کے کرنا بے قیمت ہو کر رہ گیا۔

چوری میں ہاتھ کیوں کاٹا جاتا ہے

شاید یہاں آپ کے ذہن میں یہ غلط ہو کر چوری میں ہاتھ کیوں کاٹا جاتا ہے جب کہ دوسرے جرائم میں بعضا کاٹنے کا حکم نہیں ہے۔ بات معقول ہے مگر ذرا اس پر غور فرمائیے کہ اگر ہر مجرم کا وہ عضو کاٹ دیا جاتا جس سے وہ ارتکاب جرم کرتا ہے تو انسانی معاشرے میں ایک تباہی آ جاتی اور اصلاح کی جگہ اس سے بڑی خرابیوں سے معاشرہ دوچار ہو جاتا۔ اگر بد نظری کے جرم میں آنکھیں نکال لی جاتیں، برائی سننے کی پاداش میں اس کی قوت شنوائی ختم کر دی جاتی، بڑائی کرنے والے کی زبان قلم کر دی جاتی، زانی کو عصا تناسل سے محروم کر دیا جاتا تو پھر کیا ہوتا، یہی ناکہ نرا کہیں زود جو نہ ہو ہمیں بلکہ انسانی زندگی کے لیے بربادی اور تباہی کا سامان ہو جاتیں۔ حالانکہ مقصد جرائم کو ختم کرنا اور انسانوں کی اصلاح ہے۔ قرآن و سنت کا پیش ہنہا دہنا نہیں بلکہ ہنہا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان میں جتنی قوتیں رکھی ہیں انہیں صحیح مصرف میں خرچ کرنا چاہیے، اور انسانی زندگی میں اعتدال پیدا کریں۔ یہی حال حدود کا ہے۔ یعنی بندوں کو ظلم و جبر سے ہٹا کر

صحیح راہ پر ڈالنا اور ایسی سزا دینا جس سے نفسیاتی طور پر دوسرے انسان متاثر نہ ہوں اور ان کو اس طرح کے کاموں کی جرأت نہ ہو لے پائے۔ ہر جرم میں قطع اعضاء سے یہ غشاپور نہیں ہوتا۔
یہ سوال کہ چور کا ہاتھ ہی کیوں کاٹا جاتا ہے اس کی وجہ بھانٹنا میں سمجھا ہوں یہ ہے کہ چور چھپ چھپ کر چوری کرتا ہے اور بھاگتا ہے۔ گویا اس کی آندو یہ ہوتی ہے کہ دوسروں کا مال بھی لے جائے اور کسی کو کانوں کان پتہ نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اسی کو دلو کی بنا پر اس کی سزا ایسی تجویز کی کہ اس کے چھپنے کے جذبات کا رد عمل سامنے آجائے اور ساری دنیا پر عیاں ہو جائے کہ یہ شخص چور ہے۔ حضرت حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے حدود پر جو تبصرو فرمایا ہے وہ بھی سننے کے لائق ہے فرماتے ہیں :

”حق سبحانہ نے جن نافرمانیوں اور قانون شکنی پر حد مقرر کی ہے وہ ایسی نافرمانیاں ہیں جن میں گونا گوں اور مختلف قسم کے مناسد ہیں۔ ان جرائم کی وجہ سے زمین میں فتنہ و فساد کی گم بادی ہوتی ہے۔ مسلمان اور دوسرے شہریوں کے سکون و اطمینان اور پراسن شہری زندگی پر ڈاکر زنی ہوتی ہے۔ ان میں سے بعض جرائم ایک بری لک کی حیثیت رکھتے ہیں، جب انسانی قلوب میں یہ پرست ہر جاتی ہے تو انسان کو بے کاموں پر ابھارتی ہے۔ اور ہر مظلوم کا حال یہ ہوتا ہے کہ غریب بااوقات اپنے سے ان جرائم کے دور کرنے کی قدرت نہیں رکھتا ہے۔ لہذا ان نافرمانیوں اور گناہ کے ایسے کاموں میں صرف مذابِ آخرت سے ڈرنا کافی نہیں ہوتا بلکہ ایسی سخت تکلیف پہنچانے اور عات کرنے کی بھی ضرورت ہے جو ان کو ان کاموں سے روک لے جیسے جنس کی نادر خواہش کردہ شہوت اور عورتوں کے محسن و جمال سے برا بیگنہ ہوتی ہے اور یہ فعل محمود فاعل و مفعول کی باہمی رضامندی سے انجام پاتا ہے لہذا اگر اس جرم کے لیے سزا متعین نہ ہو تو روکن اور انسانوں کی آبرو کو محفوظ رکھنا مشکل ہوتا۔ اسی طرح چوری ہے کہ انسان کو جب کوئی روزگار میسر نہیں آتا تو وہ چوری کی طرف مائل ہوتا ہے اور یہ کام اس طرح چھپ کر کرتا ہے کہ کسی کی نگاہ نہ پڑنے پائے، یا دیکھتی کہ مظلوم میں اس کے دفعیہ کی تاب نہیں ہوتی۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس کی سزا بھی یقینی طور پر سخت ہو۔ چوری کی سزا میں ہاتھ کاٹنا یا بیٹھا ایک دردناک سزا ہے۔ لہذا اس کا ہوا ہونا ایک عار کی چیز ہے اور اس سزا کے اثر کو لوگوں سے چھپانا بھی چاہیے تو چھپا نہیں سکتا۔“

عدالت کو نرا معاف کرنے کا حق نہیں

آیت میں من اللہ کے خلاف سے اشارہ کر دیا ہے کہ جب مقدمہ عدالت میں پہنچ جاتے اور چور کی چوری ثابت ہو جاتے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اسے نرا سے نہیں بچا سکتی۔ کیونکہ یہ وہ نرا ہے جو نرا کی جانب سے ہے۔ اس میں انسان کو دم مارنے کی بھی گنجائش نہیں ہے۔ یہ شرط ضرور ہے کہ چوری کے ثبوت میں کسی قسم کا کوئی شبہ نہ ہو۔ اگر ذرا سا شبہ بھی پیدا ہو گیا تو پھر کسی کو ہاتھ میسی نعمت سے محروم نہ کیا جائے گا۔

ہاں جب تک معاملہ عدالت میں نہ پہنچے صاحب معاملہ کو اختیار ہے کہ وہ معاف کر دے جہتِ زیر کا بیان ہے کہ معاملہ سب عدالت میں پہنچ جاتے تو اس میں سفارش کرنے والے اور سفارش قبول کرنے والے دونوں پر اللہ کی لعنت ہے۔

حافظ زبیری نے غضب الزاری میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ حضرت صفوان بن امیہ مسجد میں سر کے نیچے چادر رکھ کر سو رہے تھے، ایک شخص آیا اور اس نے آہستہ سے وہ چادر کھینچ لی اور بھاگتا چلا گیا۔ حضرت صفوان اسے ساتھ لے کر دربارِ نبوت میں حاضر ہوئے اور واقعہ بیان کیا۔ حضور انورؐ نے ثبوت سے بعد ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، حضرت صفوان کو یہ دیکھ کر رحم آگیا۔ انہوں نے کہا یا رسول اللہ میں نے یہ چادر اسے ہبر کر دی ہے، مطلب یہ تھا کہ درگزر فرمائیے۔ آپ نے فرمایا: میرے پاس لانے سے پہلے ہی کیوں نہ ایسا کیا؟

یعنی پہلے ہی کیوں نہ معاف کر دیا، یہاں کیوں لائے۔ اب عدالت میں پیش ہو جانے کے بعد معافی کی کوئی صورت نہیں۔ چنانچہ اس چور کا سبب قانون ہاتھ کاٹا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ چور جب حاضر عدالت ہو جاتے اور اس کا جرم ثابت ہو جاتے تو پھر عدالت کے فرائض میں نزادینا ہے۔ خود مدعی اور صاحب مال بھی معاف کرنا چاہے تو اس کا مجاز نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کا بیان ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

مَدَدُكَ مَعَ الْمُعَافَاتِ حَتَّى يَكُنْ حُكْمُكَ سَاسَ نَافِئَةٍ اس وقت تک لوگ خود معاف کر سکتے ہیں لیکن جب حکم تکمیل میں آ جاتے تو وہ کتاب اللہ کے مطابق ہی فیصلہ کریں۔

حضرت عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:
 باجم حدود و معاف کر دیا کرو اس لیے کہ حد کا جو معاملہ میرے پاس پہنچ گیا اس
 میں حد واجب ہو گئی۔ (البرداء)

چور کی سزا میں رحم کی اپیل نہیں

بہیں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس سزا میں رحم کی کوئی اپیل نہیں ہو سکتی ہے کیونکہ سزا کا
 جزا تک ہے مگر جرم کے مطابق ہے اور انسانی طبیعت خواہ جس قدر بھی اس سے متاثر ہو مگر اسے
 مجرم کو سزا دینے میں عفو و رحم دیکر ناچاہیے۔ اللہ کی ذات عزیز اور غالب ہے اس وجہ سے اس کوئی
 ہے جو چاہے حکم کرے۔ اور حکیم ہے اس لیے اس کا حکم حکمت پر مبنی ہے اس کے بندوں کو فہم دے
 اس کے سے سزا کی بات ہے اور نہ یہ زبانی ہے کہ وہ اس کے کسی حکم کو خلاف حکمت قرار دی۔ اس
 میں دو بدل باتر نہیں ہے۔ انسان قانون ساز نہیں ہے قانون کا نافذ کرنے والا ہے، سزا کا
 سزا جہاں قرآن نے بتائی ہے وہاں یہ بات مراعت نہ کی ہے۔

لا تأخذکم سرافۃ فی دین اللہ

تم کو ان دونوں پر اللہ کے قانون کے بارے میں کوئی رحم نہ آئے۔

قرآن کے قانون سرقہ کا تعاقب مطالبہ

اس موضوع پر عبدالعزیز دعوہ نے التشریع الجنائی الاسلامی کی جلد اول میں اچھی بحث کی ہے،
 ہم یہاں کچھ اضافہ کے ساتھ ان کی بحث کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔
 اسلام نے چوری کی جو سزا مقرر کی ہے اس کی تفصیل آپ پڑھ چکے ہیں، اب آپ اس کے
 مقابلی میں دوسرے قوانین کا مطالعہ کریں کہ وہ چور کی کیا سزا تجویز کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں بنی
 اسرائیل کے یہاں جو قانون ملتا ہے وہ یہ ہے:

۱۔ اگر چور نعتب زنی کرتے ہوئے اور کوئی ماریٹھے اور وہ مر جائے تو اس کے لیے خون نہ
 کیا جائے۔ (خروج ۲۲)۔

۲۔ اگر چوری کی چیز چور کے ہاتھ میں زندہ پائی جائے تو وہ ایک ایک کے دو دوٹے۔

(خروج)

کوئی تانستان یا کمیت کھلاتے اور چار پستے اس میں چھوڑ دے یا دوسروں کے میدان میں پھرتے تو اپنا اچھا سے اچھا کھیت اور بہتر سے بہتر انگوری باغ اس کے بدلے میں دے۔
۲۔ تم چوری نہ کرو اور نہ جھوٹا معاملہ کرو۔

مصر قدیم نے چوری کے سلسلے میں جو قانون بنایا تھا وہ یہ تھا
مصر میں چوری کوئی بڑا جرم نہ سمجھا جاتا تھا بلکہ وہاں چوری کا ایسا عجیب و غریب طریقہ رائج تھا جس کی نظیر دنیا کے کسی ملک اور کسی قوم میں تلاش نہیں کی جاسکتی۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ جو شخص پولیس کا افسر ہوتا تھا وہی چوروں کا سب سے بڑا سرغنہ ہوتا تھا۔ جو شخص چوری کا پیشہ اختیار کرتا وہ اپنا نام پتہ مذکورہ بالا افسر کے دفتر میں درج کرتا اور جب چوری کرتا تو اس کی پوری کیفیت بھی اگر درج کرتا، رپورٹ ہرنے پر پولیس پر تھائی مال بطور تادان مالک سے کر باقی مال واپس کر دیتی، وصول شدہ مال میں سے کچھ حصہ بخیر کو ملتا اور کچھ سرکاری خزانے میں داخل ہر جاتا، اور بس۔
(نظامِ سلطنت اکبر شاہ)

ہندوستان کے متفق منوہاراج کا جو قانون منوہر تری میں لکھا ہے یہ ہے :
خاندانی عورت نہ بامدہ بواہرات کو جو چرائے تو اسے قتل کر دینا چاہیے۔ جو چور نعب زنی کر کے رات میں چوری کرتے ہیں۔ ان کے دونوں ہاتھ کاٹ کر ان کی ٹہنہ کر لی چاہیے۔ جو چور اول مرتبہ اول بار گرفتار کئے اس کا انگوٹھا اور انگوٹھے کے پاس کی انگلی کاٹنا چاہیے اور دوسری بار اگر تکاب جرم ہو تو ہاتھ باؤل کاٹ دینا چاہیے اور تیسری مرتبہ میں قتل کر دینا چاہیے۔ چہا۳۔ ۲۷۴

سرکارِ برطانیہ کا بنایا ہوا قانون یہ ہے :
جو کوئی شخص سرقہ کا مرتکب ہو اس کو دونوں قسموں میں سے کسی قسم کی سزا دی جائے گی قید کی سزا دی جائے گی جس کی عیادتین برس تک ہو سکتی ہے یا جرمانے کی سزا یا دونوں سزائیں ہوں گی۔

ان سب کے مقابلے میں اسلام نے چوری کی جو سزائیں دی ہیں وہ انسان کی نفسیات سے بالکل قریب تر ہے کہ اس سزا کا تصور ہی اسے لوزہ برا غلام کر دیتا ہے۔ سچر ہرے لیے ان قوانین کے ساتھ اسلام کا قانون جاری کر دیا جائے تو بڑی آسانی سے اندازہ ہو جائے گا کہ اس سزا میں

کیا تاخیر ہے۔ اگر چند بیمنوں میں اس مزار کے اجزاء کے بعد تجرم نہ ہونے کے درجہ میں نہ رہ جائے تو پھر جو چاہیں کہہ سکتے ہیں۔
تاریخ گزرا ہے کہ جہاں بھی اور جب بھی یہ قانون رائج ہوا چوری کا نام و نشان مٹ گیا۔

چور کی چوری تو بے دراصلح

۹۸۔ پھر میں نے اپنے اس ظلم کے بعد توبہ کر لی اور اپنے کو ٹھیک کر لیا تو اللہ تعالیٰ اس پر نظر عنایت فرماتے گا بے شک اللہ غفور درحیم ہے۔ یعنی توبہ اگر ٹھیک ٹھیک ہو جس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ چوری کا مال مالک کو واپس کرے اور اگر تلف ہو گیا ہو تو ضمان دے اور اگر ضمان دے سکے تو معاف کر لے اور اپنے فعل پر نادم ہو اور آئندہ کے لیے اس سے مجتنب رہنے کا ارادہ کرے تو اس طرح کی توبہ سے اُمید ہے کہ حق تعالیٰ انہی عتوبت جس کے مقابلہ میں دنیوی مزار کی کچھ حقیقت نہیں ہے اس پر سے اٹھائے دے۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کا ہاتھ نہ کاٹا جاتے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ہاتھ کٹنے کے بعد جو شخص توبہ کرے اور اپنے نفس کو چوری سے پاک کر کے اللہ کا صالح بندہ بن جاتے وہ اللہ کے غضب سے بچ جائے گا۔ اور اللہ اس کے دامن سے اس داغ کو دھو دے گا۔ لیکن اگر کسی شخص نے ہاتھ کٹوانے کے بعد بھی اپنے آپ کو بدعتی سے پاک نہ کیا اور وہی گندے جذبات اپنے اندر پرورش کیے جن کی بنا پر اس نے چوری کی اور اس کا ہاتھ کاٹا گیا۔ تو اس کے معنی یہ نہیں کہ ہاتھ تو اس کے بدن سے جدا ہو گیا مگر چوری اس کے نفس میں بدستور موجود رہی اس وجہ سے وہ خدا کے غضب کا اسی طرح مستحق ہے کہ جس طرح ہاتھ کٹنے سے پہلے تھا۔ اسی لیے قرآن عزیز چور کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ اللہ سے معافی مانگے اور اپنے نفس کی اصلاح کرے۔ کیونکہ ہاتھ کاٹنا تو منظرِ اہم تہذیب کے لیے ہے۔ اس مزار سے نفس پاک نہیں ہو سکتا۔ نفس کی پاکیزگی صرف توبہ اور رجوع الی اللہ سے حاصل ہو سکتی ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق احادیث میں ہے کہ ایک چور کا جب آپ کے حکم سے ہاتھ کاٹا جا چکا تو آپ نے اسے اپنے پاس بلایا اور اس سے فرمایا کہ استغفر اللہ و اتوب الیہ کہ اس نے آپ کی تلقین کے مطابق یہ الفاظ کہے، پھر آپ نے

اس کے حق میں دُعا فرمائی کہ اللعسم تب علیہ خدا یا اسے معاف کر دے بلکہ
اس آیت میں نفلِ عظم اپنے فاعل کی طرف بھی مضاف ہو سکتا ہے اور اپنے مفعول کی طرف بھی۔
فاعل تو خود چوری کرنے والا ہے اور مفعول وہ ہے جس کی چوری ہوئی ہے۔ مفعول کی طرف مضاف
ہونے کی صورت میں اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس ظلم کے بعد جس کا اس نے اس مظلوم کا مال چور کر اس
پر کیا ہے اور پہلی صورت میں معنی یہ ہوں گے۔ اس ظلم کے بعد جو اس ظالم نے اپنے آپ پر کیا ہے
اور دونوں معنی یہاں صحیح ہیں لیکن زیادہ راجح دوسرے لکھنے ہیں۔ تو بر کھلا اصلاح کا ذکر درحقیقت
توہر کی ایک لازمی شرط کی حیثیت سے ہے۔ بندہ جب کوئی اس طرح کا جرم کرتا ہے تو ایک تو وہ
خدا کی نافرمانی کرتا ہے، دوسرے وہ اپنے نفس کی یاد دہریوں کی حق تلفی کرتا ہے۔ خدا سے معاملہ
درست کرنے کے لیے تاحداً امکان اپنے رتبہ کی اصلاح اور اپنے ظلم کی تلافی ناگزیر ہے۔ نیز اس
دو طرفہ عمل کے توہر بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔

یہ آیت اس بات کی صریح دلیل ہے کہ اجروئے حد کفارہ نہ صرف اس کے لیے کافی نہیں ہے۔ سزا ملنے
کے بعد جب تک توہر نہ کہے اور اصلاح حال نہ کرے تو اس گناہ کی سزا اخروی معاف نہ ہوگی۔ اس
کا مطلب دوسرے نفلوں میں بھی ہے کہ عید و کوثر نہیں بلکہ زواج ہیں۔ یعنی یہاں جو سزائیں دی
جاتی ہیں وہ انتظامِ تقدیر کے لیے اور معاشرہ کو بُرائی سے بچانے کے لیے ہیں اس لیے نہیں کہ اس
کے ذریعے اخروی سزا کا کفارہ ہو گا۔

ایمان باللہ اور تصور ریاست

۹۹۔ کیا تم نہیں جانتے کہ زمین و آسمان کی بادشاہت اللہ ہی کی ہے وہی جسے چاہے سزا
دے اور جسے چاہے معاف کر دے اور اللہ ہر چیز پر قدرت والا ہے۔ یعنی جب حقیقی سلطنت
اور حکومت اسی کی ہے تو بلاشبہ اسی کو یہ اختیار ہو گا کہ جسے مناسب جلنے معاف کر دے اور جسے
اپنی حکمت و عدل کے رافق سزا دینا چاہے سزا دے اور نہ صرف یہ کہ اسے معاف کر دے اور سزا دینے
کے کلی اختیارات حاصل ہیں بلکہ ان اختیارات کے استعمال سے کوئی نفع والا بھی نہیں ہے کیونکہ وہ ہر چیز پر
پوری قدرت رکھتا ہے۔

لے تفہیم القرآن کے تدبر قرآن کے فاضل شیخ الاسلام

یہ آیت بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کا رب اور اللہ ہی نہیں بلکہ ملک بادشاہ اور ملک بھی ہے جس کا کلام پر مطلب یہ ہے کہ انسان کا حقیقی بادشاہ حاکم اور قانون ساز اللہ تعالیٰ ہی ہے اور یہ اس کی مسلمہ اور اہم صفاتوں میں سے ایک ہے۔ جب تک انسان کو اس صفت کا یقین نہ ہو وہ اللہ پر ایمان رکھنے والا مانا ہی نہیں جاسکتا۔ اسی بنا پر آغاز اللہ تعالیٰ سے کیا گیا ہے۔ بظاہر مخاطب حضور انور ہیں لیکن دنیا مسلمانوں کو جارہا ہے کہ زمین و آسمان میں بادشاہت اللہ کی ہے۔ اس وجہ سے ہر ایک کا فرض ہے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کے قانون کے تابع بنائے، نہ کوئی اس سے بھاگنے کی کوشش کرے نہ کوئی اس سے دوسروں کو بچانے کی تدبیر کرے۔ مگر مصلحتوں کو درس توحید دیا جارہا ہے کہ توحید صرف یہی نہیں ہے کہ رکوع و سجود اُسے کیا جاتے یہ بھی توحید ہے کہ یہ یقین پیدا کیا جائے کہ زمین کا ایک ایک ذرہ اللہ کی ملک ہے اور یہاں جو کچھ جتنا کچھ اور جیسا کچھ بھی ہے وہ اللہ کی ملک ہے جب ملک بھی اس کی اور ملک بھی اس کا یعنی ملک بھی وہی اور بادشاہ بھی وہی ہے تو پھر اسے اپنی ملک میں پورا تصرف حاصل ہے اور اپنے ملک میں حکم کے نافذ کرنے سے اسے کون روک سکتا ہے اعلانِ شہنشاہت کے بعد اپنی قدرت کا اعلان یہ بتانے کے لیے ہے کہ بندوں کے لغو و فضول کا رشتہ اسی سے وابستہ ہے۔ یہ بات اس وجہ سے مزوری تھی کہ جو سیاسی فوجداری احکام اس سورت میں بیان ہوئے ہیں پہلی امتیں ان ہی میں ڈنگ لگاتی ہیں۔ انہوں نے ان سے بچنے کے لیے چور و راز نکال لیے یہاں تک کہ یہ تمام قوانین بے اثر ہو کر رہ گئے۔ اگر اس کی حقیقت کا کھوج لگایا جائے تو یہ بات صاف منظر آئے گی کہ ان قوموں نے توحید کی وہ حقیقت فراموش کر دی جس کی اس آیت میں یاد دہانی کرائی گئی ہے۔

مع
الوجه الثاني

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ لَا مَحْزَنٌ لِّلَّذِينَ يَسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ مِنَ الَّذِينَ
قَالُوا آمَنَّا بِأَقْوَالِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوبُهُمْ ۚ وَمِنَ الَّذِينَ هَادُوا ۖ فَسَمِعُوا
لِلْكَذِبِ سَمْعُونَ لِقَوْمٍ آخَرِينَ لَمْ يَأْتُوكَ يُخَرِّفُونَ الْكَلِمَ مِنْ
بَعْدِ مَوَاضِعِهِ يَقُولُونَ إِنْ أُوتِيتُمْ هَٰذَا فَخُذُوهُ وَإِنْ
لَمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوا ۚ وَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ فِتْنَتَهُ فَلَنْ تَمْلِكَ
لَهُ مِنَ اللَّهِ شَيْءٌ ۚ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَمْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يُطَهِّرَ
قُلُوبَهُمْ ۚ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ ۚ وَقُلْ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ
عَظِيمٌ ۖ سَمِعُونَ لِّلْكَذِبِ أَكْثَرُونَ لِلسَّعْتِ ۚ فَإِنْ
جَاءَوكَ فَاحْكُم بَيْنَهُمْ ۖ أَوْ اعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ وَإِنْ تُعْرِضْ
عَنْهُمْ فَلَنْ يَضُرُّوكَ شَيْئًا ۚ وَإِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُم بَيْنَهُمْ
بِالْقِسْطِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ۖ وَكَيْفَ
يُحْكُمُونَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرَةُ فِيهَا حُكْمُ اللَّهِ ثُمَّ
يَتَوَلَّوْنَ مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ وَمَا أُولَٰئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ ۖ



اے پیغمبر وہ لوگ تمہارے لیے غمگینی کا باعث نہ ہوں جو کفر کی راہ
 میں تیز گامی کر رہے ہیں خواہ وہ ان میں سے ہوں جو زبان سے
 ایمان کے مدعی ہیں مگر ان کے دل ایمان نہیں لاتے اور یا
 ان میں سے ہوں جو یہودی ہیں۔^{۱۱} یہ لوگ جھوٹ کے لیے جالوسی
 کرنے والے ہیں ان لوگوں کے لیے جو تمہارے پاس نہیں آتے
 جاسوس ہیں۔^{۱۲} یہ لوگ کتاب اللہ کے حکموں کو باوجودیکہ ان کا
 صحیح عمل متعین ہے اپنے مقام سے ہٹا دیتے ہیں،^{۱۳} اور لوگوں سے
 کہتے ہیں کہ اگر تمہیں یہ حکم دیا جائے تو مانو نہ دیا جائے تو پیچ
 کر رہو،^{۱۴} اور دیکھو جس کے لیے اللہ ہی فتنہ میں ڈالنے کا ارادہ
 کر لیتا ہے تم اس کو اللہ کی گرفت سے بچا نہیں سکتے۔^{۱۵} یہ وہی
 لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ پاک کرنا نہیں چاہتا ہے ان کے
 لیے دنیا میں رسوائی ہے اور ان کے لیے آخرت میں بہت بُرا

غذاب ہے۔ یہ جھوٹ سننے والے اور حرام کھانے والے ہیں
لہذا اگر تمہارے پاس اُمیں اور تم سے فیصلہ چاہیں تو آپ کو اختیار
ہے کہ ان کے درمیان فیصلہ کر دو یا ان سے کنارہ کش ہو جاؤ۔
اور اگر کنارہ کشی اختیار کر دو گے تو یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے
اور اگر فیصلہ کرو تو انصاف کا فیصلہ کرو بلاشبہ اللہ انصاف کرنے
والوں کو پسند کرتا ہے۔ اور یہ لوگ تمہیں منصف کیسے بناتے
ہیں جبکہ تو رات ان کے پاس موجود ہے اس میں اللہ کا حکم ہے
اس کے باوجود وہ اس سے روگردال ہیں واقعہ یہ ہے کہ یہ
ایمان والے نہیں ہیں۔

ایمان اور سیاست کی کش مکش

ان آیات میں منافقین اور یہود کی اس سازش کی طرف اشارہ ہو رہا ہے جو انہوں نے قرآن کے
سیاسی قوانین کی گرفت سے بچنے اور ایک دوسرے کو اس سے بچانے کے لیے باہم کر رکھی تھیں۔ ان
آیات کے نزول تک اگرچہ اسلام کا سیاسی اقتدار بڑے سماراً چمکتا لیکن ابھی براہِ اقتدار مکمل نہیں
تھا۔ یہودی اس وقت تک اسلامی حکومت کے باقاعدہ اور قانونی شہری نہ تھے بلکہ اسلامی حکومت

کے ساتھ ان کے تعلقات معاہدات پر مبنی تھے۔ ان معاہدات کی رو سے یہودیوں کو اپنے اندرونی معاملات میں آزادی حاصل تھی۔ اور ان کے مقدمات کے فیصلے انہی کے قزاقین کے مطابق ان کے اپنے جج کرتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یا آپ کے مقرر کردہ قاضیوں کے پاس اپنے مقدمات لالے کے لیے وہ اندرون کے قانون مجبور نہ تھے لیکن یہ لوگ جن معاملات میں خود اپنے مذہبی قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرنا چاہتے تھے ان کا فیصلہ کرانے کے لیے حضور اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس امید پر لگتے تھے کہ شاید آپ کی شریعت میں ان کے لیے کوئی دوسرا حکم ہو اور اس طرح وہ اپنے مذہبی قانون کی پیروی سے بچ جائیں۔ ان کی عدالتیں ویسے بھی قیامِ عدل و انصاف کے نقطہ نظر سے بالکل بے جان اور بے منفعت ہو چکی تھیں۔ اول تو یہود نے خود ہی قانون کو اپنے اغراض و مقاصد کے لیے منبج کر کے بالکل بے اثر کر دیا تھا، دوسرے جموٹ اور رشوت کا ان کی سوسائٹی میں اتنا ہنگام تھا کہ کسی معاملہ میں دنگو ہوں گی تو اسی کام دیتی اور عدالتوں کے انصاف کا کوئی وزن تھا۔ اقتدار کی یہ دو عملی اور یہودی عدالتوں کی انصاف فروشی ان لوگوں کے لیے ایک چور دروازہ فراہم کرتی تھی جو قانون کے تقاضوں سے گریز پائی اختیار کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ منافقین اور یہود اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کے لیے یہ سازش کرتے کہ جن معاملات میں ان کو ترقع ہوتی کہ حضور اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت سے فیصلہ ان کے حسبِ مشاہدہ ہو جائے گا۔ ان کے لیے حضور اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کرتے۔

یہاں خاص طور پر جس مقدمہ کی طرف اشارہ ہے وہ یہ تھا کہ خیبر کے معزز یہودی خاندانوں میں سے ایک محدث اور ایک مرد کے درمیان ناجائز تعلقات پائے گئے۔ تورات کی رو سے ان کی سزا رجم تھی لیکن یہ کہ دونوں کو سنگسار کیا جائے لیکن یہودی اس سزا کو نافذ کرنا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس مقدمہ کا فیصلہ حضور اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کر لیا جائے اگر آپ رجم کے سوا کوئی اور حکم دیں تو مان لیا جائے اور رجم ہی کا حکم دیں تو مانا جائے۔ ان کی غیلا تھا کہ حضور اللہ کو تورات کے احکام کی خبر نہیں اور اگر خبر بھی ہو تو یہ ایک نئی دعوت لے کر آئے ہیں تورات والا حکم کیوں مینے نیگے بس بہتر ہے کہ معاملہ ان کے حضور میں پیش کر دیا جائے، رجم سزا سے بھی بچ جائیں گے اور فتر داری بھی ہم پر نہ پڑے گی۔ چنانچہ حضور اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مقدمہ پیش ہوا، جیسا کہ آپ شیخ الاسلام کے افادات میں مطالعہ کریں گے یہاں دیکھتے ہیں اس کش مکش میں یہودی اور منافقین چاہتے تھے کہ ایمان کے دعویدار بھی رہیں اور خدا کے

قانون سے بچے رہیں۔ قرآن نے ان نزات میں ان کی اسی دکستی لگ پر اٹھائی رکھی ہے۔

۱۰۰۔ اے پیغمبر وہ لوگ تمہارے لیے حکمیں کا باعث نہ ہوں جو کفر کی راہ میں تیز گامی کر رہے ہیں خواہ وہ ان میں سے ہوں جو زمان سے زمان کے مدعی ہیں مگر ان کے دل ایمان نہیں لاتے یا ان میں سے ہوں جو یہودی ہیں۔ یعنی منافقین اور یہود بنی قریظہ۔ پچھلی آیات میں ذکیق اور چورسی وغیرہ کی حد بیان کی گئی تھیں اب کچھ ان قوموں کی حالت سناتے ہیں جنہوں نے حد دوائے میں تکریم کر کے اپنے کو مذہبِ عظیم کا مستحق ٹھہرایا۔ ان کا منقطع واقعہ بغیر نے معاملہ میں یہ لکھا ہے کہ خیر کے ایک سو کو مرد اور عورت نے جو شادی شدہ تھے زنا کیا، باوجودیکہ تورات میں اس جرم کی سزا جرم سنگ کرنا تھی مگر ان دونوں کی بڑائی مانع تھی کہ یہ سزا جاری کی جاسے۔ آپس میں یہ مشورہ ہوا کہ یہ شخص جو میری میں ہے یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی کتاب میں زانی کے لیے رحم کا حکم نہیں ہے کوڑے مارنے کا حکم ہے تو بنو قریظہ کے یہودیوں سے کچھ لوگ ان کے پاس بھیج کر کہو کہ وہ ان کے ہمسائے ہیں اور ان سے صلح کا معاملہ بھی کر چکے ہیں وہ ان کا خیال معلوم کر لیں۔ چنانچہ ایک جماعت اس کام کے لیے روانہ ہوئی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عندیہ معلوم کر لیں کہ زانی محض کی کیا سزا تجویز کرتے ہیں۔ اگر وہ کوڑے مارنے کا حکم دیتے ہیں تو ان پر رکھ کر قبول کر لو اور جرم کا حکم دیں تو مست مانو۔ ان کے دریافت کرنے پر حضور نے فرمایا کہ تم میرے فیصلہ پر رضا مند ہو گئے ہو۔ انہوں نے اقرار کر لیا۔ اللہ کی جانب سے جبریل جرم کا حکم لے آئے مگر وہ لوگ اپنے اقرار سے پھر گئے۔ آخر حضور نے فرمایا کہ فداک کا ہنر والا ابن مویزہ اتھ میں کیا شخص ہے۔ سب نے کہا کہ آج دوسرے زمین پر ”شرائع موسیٰ“ کا اس سے زیادہ جاننے والا کوئی نہیں ہے۔ آپ نے اس کو بلوایا اور نہایت ہی شدید حلف سے کہ پوچھا کہ تورات میں اس گناہ کی سزا کیا ہے، باوجودیکہ دوسرے یہودیوں اس حکم کو چھپانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے جس کا پیر وہ حضرت عبداللہ بن سلام کے ذریعے فاش ہو چکا تھا تاہم ابن مویزہ نے جو ان کا مستند تھا کسی نہ کسی وجہ سے اس کا اقرار کر لیا کہ بے شک تورات میں اس جرم کی سزا جرم ہی ہے۔ بعد ازاں لے ساری حقیقت ظاہر کر دی کہ کسی طرح یہودیوں نے رحم کو اڑا کر ان کی سزا یہ لکھ دی ہے کہ زانی کو کوڑے لگائے جائیں، کالا سزہ کر کے اور گدھے پر سوار کر کے گشت کرایا جاسے۔ الحاصل حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں مردوں عورت پر جرم کی سزا جاری کی اور فرمایا کہ اے اللہ آج میں پہلا شخص ہوں جس نے میرے حکم کو دنیا میں نافذ کیا اس کے بعد کہ وہ اسے مردہ کر چکے تھے یہ واقعہ ہے۔

لفظ رسول سے خطاب یہاں یہ حقیقت ظاہر کر رہا ہے کہ رسول کی اصل ذمہ داری صرف اللہ کے دین کی تبلیغ اور انذار و تنبیہ کے فرض کی ادائیگی ہے۔ اس امر کی کوئی ذمہ داری رسول پر نہیں ہے کہ لوگ اس کی دعوت کے بارے میں کیا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ اگر رسول نے اپنا فرض رسالت ادا کر دیا ہے تو وہ عذر اللہ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گیا۔ لوگ اگر کفر کی راہ میں سبقت کرتے ہیں تو اس کی پریشانی رسول سے نہیں ہونی ہے بلکہ خود لوگوں سے ہو رہی ہے۔ پھر جو بات رسول سے متعلق نہیں اس کا غم رسول کیوں کرے۔ یہاں چونکہ مقصد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو منافقین اور یہود کی منافقانہ سازشوں پر قلعی درناؤ اس حقیقت کو ظاہر کرنا ہے کہ جن کا خاتمہ میں پڑنا سنتوا للہی کے بموجب معتد ہو چکے ہیں وہ فتنہ میں پڑ کر رہیں گے۔ یہاں امام رازی نے یہ نکتہ آخری خوب کی ہے کہ کیا ایھا الذبی تو قرآن میں متہدد بار کیا ہے لیکن یا ایھا الرسول سے خطاب قرآن میں صرف دو جگہ آیا ہے۔ ایک یہاں دوسرے اسی بارے کے آخر میں یا ایھا الرسول بلغ، اور مان و دون جگہوں پر یہ طرز خطاب شرف و عظمت کے اظہار کے لیے ہے۔ اس لفظ سے محبت و عظمت کے وہ سائے تقاضے بھی پورے ہو جاتے ہیں جو ایک کامل سے کامل انسان کے فطرت انسانی میں موجزن ہوتے ہیں اور عبد و مہبود کی وہ ساری حدود بھی محفوظ رہتی ہیں جو کفر و ایمان کے درمیان حد فاصل ہو سکتی ہیں۔

یسا عود میں تیز گامی سے اشارہ یہاں منافقین و یہود دوستی کی طرف ہے کہ یہ لوگ خدائی قوانین سے گریز پائی کے لیے یہود کو اپنا ٹھکانہ و مادی سمجھتے ہیں۔ اگرچہ زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن جب کوئی معاملہ اور قضیہ پیش آتا ہے تو ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کو حضور اللہ کی عدالت میں پیش کرنے کی جگہ یہود کی عدالت میں لے جائیں تاکہ وہاں سے حسبِ خواہش فیصلہ حاصل کر سکیں حالانکہ اللہ و رسول کی عدالت کے ہوتے ہوئے کسی اہل کی عدالت کی طرف رجوع کرنا ایمان و اسلام کو چھوڑ کر کفر کی طرف ٹوٹنا ہے۔ جو لوگ غیر اسلامی نظامات اور باطل انکار و تہذیب کی اسلامی نظام حیات کے مقابلے میں خدمت کو نہیں اور ان سے نفع حاصل کرنے کے بعد محض نذرہ غار تبس و تہلیل کی بنا پر اپنے کو نجات کا سمجھتے ہیں۔ اس آیت کی روشنی میں ان کو غور کرنا چاہیے کہ کہیں وہ بھی قالوا آئنا و لہ تو من قلوبہم کا مصداق تو نہیں ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ غیر اسلامی نظام سے ان کی وابستگی اتنی پیچھے ہو گئی ہے کہ نہ صرف ان میں ان نظاموں سے باہر نکلنے کی خواہش باقی نہیں رہی ہے بلکہ جب کبھی ان کو خطرہ لاحق ہو رہا ہے تو ان کی تمام کوششیں

ان باطل نظموں کی تہہ و مخاطت میں مصروف رہ جاتی ہیں، انا للہ خالی اللہ المستحی۔

من فقیہ کا چہرہ

۱۰۔ یہ لوگ جموٹ کے لیے جاسوسی کرنے والے ہیں۔ یعنی ان لوگوں کے جاسوس ہیں جو تمہارے پاس نہیں آتے۔ سماحون کے معنی ہیں بہت زیادہ سننے والے اور کان دھرنے والے۔ بہت زیادہ سننا کبھی تو جاسوسی پر اطلاق ہوتا ہے اور کبھی اس کے معنی ہوتے ہیں بہت زیادہ قبول کرنے والا جیسے سید اللہ منی حدہ میں سننے کے معنی قبول کرنے کے ہیں۔ حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز نے یہاں پہلے معنی مراد لیے ہیں لیکن ابن جریر وغیرہ متفقین نے دوسرے معنی پر محمول کیا ہے سماحون ککذب یعنی جموٹ اور باطل کو بہت زیادہ ماننے والے اور قبول کرنے والے سماحون لغوم آخرین یعنی دوسری جماعت جس نے ان کو بھیجا اور خود تمہارے پاس نہیں آئی ان کی بات بہت زیادہ ماننے والے۔

یہ منافقین دیہود کی ملی جلی خصلت بتاتی جا رہی ہے۔ اس کے دو مطلب ہیں۔ سماحون کا لفظ مع سے مبالغہ کا مینہ ہے یہ لوگ چونکہ خواہشوں اور چاہشوں کی بندگی میں بے نظام ہو چکے تھے اس لیے ان کو سہائی سے نفرت تھی اور جموٹ ان کا منی بھانا کھانا تھا۔ ان کے نفس کی پیاس اسی سے بجھتی تھی۔ انہیں جموٹی کواری، جموٹی عدالت، اور جموٹا فیصلہ چاہیے اور وہ نظام حیات جس کی حمایت نامہ دانشناسی اور خدا کی کلمہ کلاباوت پر قائم ہو۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کی مجالس میں جموٹ کی خاطر آتے ہیں تاکہ یہاں جو کچھ دیکھیں اور سنیں ان میں جموٹ کی اپنی جانب سے آمیزش کر کے لوگوں میں پھیلائیں اور اہل ایمان کو بدنام کریں۔ سماحون لغوم آخرین کے بھی دو مطلب ہیں ایک یہ کہ جاسوس بن کر آتے ہیں اور حضور کی مجلس میں اور اہل ایمان کے پاس اس لیے آتے ہیں کہ یہاں سے کوئی راز کی بات مل جائے تو اسے آپ کے دشمنوں تک پہنچا دیں۔ گویا وہ اپنے ذوق و شوق سے اور حق و انصاف کے لیے نہیں آتے بلکہ دوسروں کے پیچھے ہوتے آتے ہیں۔ دوسروں سے اشارہ یہود کے علماء اور لیڈروں کی طرف ہے۔ دوسرے یہ کہ جموٹے الزامات عائد کرنے اور افتراء پردازیاں کر کے لیے

مرا و فراہم کرنے آتے ہیں تاکہ لوگوں میں بدگمانیاں اور غلط فہمیاں پھیلائیں جن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے براہ راست تعلقات پیدا کرنے کا موقع نہیں ملا ہے۔

یہودیوں کی کلامِ الہی میں تحریف

۱۰۲۔ وہ لوگ کتاب اللہ کے حکموں کو باوجودیکہ ان کا صحیح مکمل متعین ہے اپنے مقام سے ہٹا دیتے ہیں۔ یعنی خدا کے احکام میں تحریف کرتے ہیں، کہیں کی بات کہیں لگا دیتے ہیں یا یہ وصف ان یہودی علماء اور زعماء کا بیان ہو رہا ہے جو خود سامنے نہیں آتے اور جن کے اشاروں پر منافقین ناپسندیدہ ہیں۔ یعنی تورات کے جو احکام ان کی خواہش کے مطابق نہیں ہیں ان کے اندر جان بوجھ کر رد و بدل کرتے ہیں اور الفاظ کے معنے بدل کر من مانے احکام ان سے نکالتے ہیں مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کے کلام اور اس کے احکام کا موقع و محل اور اس کا محل و مصداق متعین ہو جانے کے باوجود اس کو اس موقع و محل سے ہٹا دیتے ہیں جس سے حکم کا مقصد بالکل فوت ہو کر رہ جاتا ہے۔ اگر کسی حکم کا موقع و محل اور محل و مصداق واضح نہ ہو جس کی وجہ سے قاضی و منفق تطبیق میں غلطی کر جائیں تو ان کو معذور کہا جاسکتا ہے لیکن موقع و محل کے تعین کے باوجود اس حکم کو اس کے موقع و محل سے ہٹانا صریح تحریف دین ہے۔

غرض پوری ہو تو مالوہ ورنہ نہیں

۱۰۳۔ اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ اگر تمہیں یہ حکم دیا جائے تو مالوہ دیا جائے تو اس سے بچ کر رہو۔ یعنی اگر کوڑے لگانے کا حکم ملے تو قبل کرو ورنہ نہیں۔ مگر خدا کی شریعت کو اپنی ہول کے تابع رکھنا چاہتے تھے بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ ان منافقین کو یہ سکھا کر آپ کے پاس روانہ کرتے ہیں کہ اگر تمہارے معاملہ کا فیصلہ یہ ہو تو مان لینا اور اگر یہ نہ ہو تو اس کو نہ قبول کرنا۔ مگر اول تو یہ حکم یہود اور ملتے قوم خود ہی تحریف کے پورے دروازے سے مجرم کے لیے راہِ فراہم کی نشاندہی کر دیتے ہیں لیکن اگر کارروائی کی کچھ زحمت محسوس کرتے ہیں تو معاملہ سرکارِ نبوت کی عدالت میں بھیجتے ہیں لیکن ہدایت یہ ہے کہ غلط پورا ہو تو مان لینا ورنہ طرح سے جانا۔ غلط ہے

کہ ہر لوگ اس طرح کے فتنہ کا دوا کا شکار ہو جاتے ہیں ان کو ان کی قیمت پر چھوڑ دو آپ ان کی اس حالت پر غمگین نہ ہوں۔ اس آیت میں عوام کے لیے حکماء کے اتباع کا ایک ضابطہ بھی بتا دیا ہے کہ اگر جو عوام کے لیے دوا پر عمل کر لے گا راستہ صرف یہی ہے کہ حکماء کے فتویٰ پر عمل کریں۔ لیکن اس ذمہ داری سے عوام بھکا بری نہیں کرتی لینے اور عمل کرنے سے پہلے اپنے مقتداؤں کے متعلق اتنی تحقیق تو کر لیں جتنی کوئی بیمار کسی ڈاکٹر یا حکیم سے رجوع کر لے سے پہلے کیا کرتا ہے کہ جاننے والوں سے تحقیق کرتا ہے کہ اس بیمار کی اس لیے کون سا ڈاکٹر ماہر ہے اور کون سا حکیم اچھا ہے۔ آپ کی دگر بان کیا کیا ہیں، اس کے مطلب میں سارے ملے مریموں پر کیا گزرتی ہے۔ اپنی امکانی تحقیق کے بعد بھی اگر کسی غلط ڈاکٹر کے حال میں چسٹ گیا یا اس نے کوئی غلطی کر دی تو وہ قابلِ عتاب نہیں، لیکن جو شخص بلا تحقیق کسی غلط حکیم کے حال میں چسٹ گیا اور پھر کسی مصیبت کا شکار ہو گیا، تو وہ اپنی خودکشی کا خود ذمہ دار ہے۔

یہی حال عوام کے لیے دینی زندگی کے بارے میں ہے کہ اگر انہوں نے اپنی بستی کے اہل علم و فن اور تجربہ کار لوگوں سے تحقیق حال کر لے کے بعد کسی عالم کو اپنا مقتدا نہایا اور اس کے فتویٰ پر عمل کیا تو وہ حمد اللہ اور عندنا اس معذور ہو گا۔ ایسی ہی حالت کے بارے میں حضور کا ارشاد ہے فان الله على من القى یعنی ایسی صورت میں گناہ کا بوجھ منفي پر ہو گا۔ لیکن اگر کوئی شخص بلا تحقیق صحت اپنے خیال سے کسی کو عالم و مقتدی قرار دے کر اس کے قول پر عمل کرے اور وہ فی الواقع اس کا اہل نہیں ہے تو اس کا وبال تنہا اس منفي پر اور عالم پر نہیں ہے بلکہ یہ شخص بھی برابر کا مجرم ہے۔ قرآن کی یہ آیت لیے ہی لوگوں کے بارے میں ہے ساعد کذب یعنی یہ لوگ جھوٹی باتیں، افسانے من گھڑت کہانیاں سننے کے عادی ہیں۔ اور امانت و دیانت کی تحقیق کیے بغیر ان کے دعوے مانگے ہوئے ہیں۔ اور ان سے موضوع اور غلط روایات سننے اور ماننے کے عادی ہو گئے ہیں۔

تفاوت کا قانون

۱۰۴۔ اور دیکھو جس کے لیے اللہ ہی فتنہ میں ڈالنے کا ارادہ کر لیتا ہے تم اسے اللہ کی گرفت سے نہیں بچا سکتے۔ ہدایت و ضلالت، خیر و شر کوئی چیز بھی بدون ارادہ خداوندی عالم وجود میں

نہیں آسکتی۔ بیک ایسا اصول ہے کہ جس کا انکار کرنا اس کے تسلیم کرنے سے زیادہ مشکل ہے۔ فرض کر دو کہ ایک شخص چوری کرنے کا ارادہ کرتا ہے لیکن خدا کا ارادہ یہ ہے کہ چوری نہ کرے۔ اب اگر وہ شخص اپنے ارادے میں کامیاب رہا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ معاذ اللہ خدا اس کے مقابلہ میں عاجز رہا اگر خدا ہی کا ارادہ بندے کے ارادے پر غالب آتا ہے تو لازم آتا ہے کہ دنیا میں کہیں چوری وغیرہ کسی شر کا وجود نہ ہے اور اگر خدا غیر دشر میں سے کسی چیز کا بھی ارادہ نہیں کرتا تو اس سے معاذ اللہ اس کا تعطل یا غفلت و سہاوت لازم آتی ہے تعالیٰ اللہ عن کل الشرور، ان تمام صورتوں پر غور کرنے کے بعد ناچار یہی ماننا پڑے گا کہ کوئی چیز بھی اس کے ارادہ تخلیق کے بدون موجود نہیں ہو سکتی، یہ مسئلہ نہایت جہم اور طویل الذیل ہے۔ ہمارا قصد ہے کہ اس قسم کے مسائل سے متعلق مستقل مضمون لکھ کر فوائد کے ساتھ طبع کر دیا جائے۔ واللہ الموفق۔

ہمارے نزدیک یہ مسئلہ نہایت سببی ایک بڑے محقق کے پھلتے علم کے مطابق ہے وہ اس جیسے مقام کے لیے آسان تعبیر یہ ہے کہ صداقتیں وہ ہیں اور دلوں اپنی جگہ پر صمیم ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ تمام دنیا اور اس کے ذرے ذرے پر قدرت مطلقہ رکھتا ہے۔ کوئی چیز کوئی کام اور کوئی حالت نہیں جو اس کے ارادے کے بغیر حرکت کر سکے اس طرح انسان اور اس کے تمام اعمال بھی اسی کے ارادے کے تحت ہیں یہ وہ عقیدہ ہے جو ہر مذہب کی اور بالخصوص اسلام کی مان ہے۔ دوسری طرف یہ بھی صداقت ہے کہ انسان کو اپنے اعمال کے کرنے نہ کرنے کا کسی دوسری طرح اختیار ضرور بنتا گیا ہے کہ اگر یہ اختیار تسلیم نہ کیا جائے اور انسان کو اسی طرح سزا یا مجوز دینا کیا جائے جس طرح دوسری مخلوقات تو پھر انسان کے لیے خیر و شر کا امتیاز، جزا و سزا، شریعت کتاب تعلیم اور انبیاء کی بعثت یہ تمام چیزیں بیکار محض ہو جائیں۔ ظلم و انصاف کے نام کی دنیا میں کوئی چیز باقی نہ رہے، انسان کا اپنے فعل پر قابل مدح یا قابل لعنت ہونا بے معنی ہو جائے۔ کسی اچھے کام پر خدا کا اس کو انعام اور بُرے کام پر عذاب دینا سراسر ظلم بن جاتے بلکہ اس دنیا کی عدالت میں بھی وہ کسی فعل کا ذمہ دار نہ ٹھہرے۔

الغرض یہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ درست ہیں ایک یہ کہ خدا کو اپنی مخلوقات پر قدرت تام حاصل ہے اور اس کا ارادہ ہر جزو کل پر عادی ہے اور دوسری یہ کہ انسان کو بھی اپنے عمل پر کوئی نہ کوئی

ایسا اختیار حاصل ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے اس عمل کا ذمہ دار بنتا ہے۔ نیکی کے کاموں کے کرنے پر وہ تعریف کا اور بدی کے کاموں پر طاعت کا سزاوار محسوس ہے۔ اور اسی وجہ سے وہ اپنی دوسری زندگی میں اپنے فعل کی جزا و سزا پانے کا مستحق محسوس ہوگا۔ اور اسی پر وہ فطرت کے سامنے دنیا کی عدالت میں اور آخرت میں مواخذہ اور باز پرس کی ذمہ داری میں گرفتار ہے۔

قرآن نے ان دونوں صدقاتوں کو پوری تفصیل اور وضاحت کے ساتھ اپنی رہنی چلنے پر تسلیم کیا ہے اور ان کی تبلیغ کی ہے۔ ایک طرف وہ کہتا ہے کہ خدا کے ارادہ کے بغیر ہر شے بھی نہیں کرتا اور دوسری طرف وہ کہتا ہے کہ ہر جان اپنے کاموں کے ہاتھوں گدھے۔ یعنی خدا کی ہر گیر قدرت وسیع اختیار اور ناقابل ارادہ و مشیت کے باوجود اس نے خود اپنے اختیار خود اپنی مشیت اور خود اپنے ارادہ و حکمت سے انسان کو ارادہ اور ارادے کے مطابق اپنے کام کرنے والے اعضا کو جاننے کی مشروط طاقت بخشی ہے۔ یہی ارادہ اور اعضا کو اس کے مطابق حرکت دے سکنے کی محدود قدرت اس کی ذمہ داری تکلیف باز پرس اور مواخذے کی بنیاد ہے اور اسی چر اس کے اعمال، اخلاق اور معاملات کی پوری عمارت کھڑی ہے اس لیے انسان پر اس کے کسی ایسے عمل کی ذمہ داری قانوناً اور شرعاً نہیں جو اس کے ارادے اور نیت سے صادر نہ ہوئی بلکہ اس کے کرنے نہ کرنے میں وہ مجبور و بے اختیار ہو، انما الاحوال بالنیات اس تطبیق سے نذر اللہ سبحانہ کی قدرت و اختیار کی وسعت میں فرق آتا ہے اور نہ انسان کا قاتر مجبور ہونا لازم آتا ہے۔ خدا جب چاہے انسان سے اپنے لیے ہوتے اختیار اور بخشی ہوئی قدرت کو چھین لے مگر ایک وقت مقرر تک اپنے بنائے ہوئے قانون اور فرسے ہوئے وعدہ کے مطابق وہ اس کو اس اختیار اور قدرت سے محروم نہیں کرتا۔

اس آیت میں ہدایت و ضلالت کے باب میں اس نسبت الہی کا بیان ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ حق و باطل میں انسان کو اختیار کی نعمت دے کر آزماتا ہے۔ جو لوگ جانتے بوجھتے اور دیکھتے سنتے شر کو خیر پر اور باطل کو حق پر ترجیح دیتے ہیں۔ خدا کی تنبیہات سے سبق حاصل کرتے ہیں اور زاہل حق کی نصیحتوں سے وہ آہستہ آہستہ اپنے ضمیر اور اپنے عقل و ارادے کو اس درجہ کند اور بے حس بنا لیتے ہیں کہ ان کے اندر حق کی طرف بڑھنے کا کوئی عزم اور حوصلہ سرے سے باقی ہی نہیں رہتا۔ باطل بھی ان کا اور ضنا بکھرتا بن جاتا ہے۔ یہ لوگ ہیں جن کو اللہ اس نفع ہی میں چھوڑ دیتا ہے اس لیے اللہ کی طرف سے فتنہ میں ڈالے جانے کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کے اندر اللہ تعالیٰ بڑے میلانات پرورش پاتے دیکھتا ہے اس کے سامنے پے پیسے ایسے مواقع لاتا ہے جس میں اس کی

سنت آزمائش ہوتی ہے اگر وہ شخص ایسی برائی کی طرف ہمدی طرح نہیں جھکا ہے تو ان آزمائشوں سے سنبھل جاتا ہے اور اس کے اندر بدی کا مقابلہ کرنے کے لیے نیکی کی سورتیں ہوتی ہیں وہ ابھرتی ہیں لیکن اگر وہ برائی کی طرف ہمدی طرح جھک چکا ہو تب اس کی نیکی اس کی بدی کے مقابلہ میں شکست کھا چکی ہوتی ہے تو ہر ایسی آزمائش کو قطع پر وہ زیادہ سے زیادہ بدی کے پھنسے میں پھنستا چلا جاتا ہے۔ یہی اللہ تعالیٰ کا وہ فتنہ ہے جس سے کسی انسان کو بچا لینا اس کے کسی خیر خواہ کا کام نہیں ہے اور اس فتنہ کا شکار صرف افراد ہی نہیں بلکہ قومیں بھی ہوتی ہیں۔ مثلاً یہ ہے کہ جس شخص کے دین کی اللہ آزمائش لینا چاہتا ہے تو اس کے سامنے آزمائش کے لیے مواقع لاتا ہے جس میں اس کی سخت آزمائش ہوتی ہے۔ ٹھیک اس طرح جیسے سونے کو آگ میں تپا کر اس کا کھوٹ منظر عام پر لایا جاتا ہے۔ آپ کا قبضہ و اختیار میں ایسے شخص کو خدا کی جانب سے ہونے والے امتحان سے بچانا چاہیں ہے ٹھیک اس طرح جیسے تانبے کو سونا بنانا آپ کے قبضہ و اختیار میں نہیں ہے۔ زمین کی کانیں ہوں یا انسانی اخلاق و اعمال کی کانیں ہوں سب کے لیے اللہ کا ضابطہ ایک ہے اور ناقابل تبدیل ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کیوں ہے۔ اسی آٹھے ہر تے سوال کا جواب اگلے فقرہ میں دیا جا رہا ہے کہ جب یہ لوگ خود ہی اپنی اصلاح کا ارادہ نہیں کرتے بلکہ اس کے برعکس یہ مصر ہیں تو اللہ کی سنت یہی ہے کہ بندے کے عزم فعل پر اس فعل کی تخلیق بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے اور اس قانون مخفی کو کوئی روک نہیں سکتا۔

شعادت کا آخری مرحلہ

۱۰۵۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ پاک کرنا نہیں چاہتا ہے ان کے لیے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور آخرت میں بھی بہت بڑا عذاب ہے۔ اقل منافقین اور میموک کا طرز عمل بیان فرمایا جس میں یہ چند اعمال بالخصوص ذکر کیے گئے ہیں۔ ہمیشہ جھوٹ اور باطل کی طرف جھکنا۔ اہل حق کے خلاف جاسوسی کرنا بد باطن اور شریر جماعتوں کو مدد پہنچانا۔ ہدایت کی باتوں کو تکریف کر کے بدل ڈالنا، اپنی خواہش اور مرضی کے خلاف کسی حق بات کو قبول نہ کرنا۔ جس قوم میں یہ خصال پائی جائیں اس کی مثال ایسے مریض کی سمجھو جو دوا استعمال کرے نہ ملک اور مضربین زد سے پرہیز کرے۔ اطباء اور ڈاکٹروں کا مذاق اڑاتے۔ فحاشی کرنے والوں کو کھالیاں دے، نسخہ پھاڑ کر پھینک دے یا اپنی ٹلے سے اس کے اجزا بدل ڈالے اور یہ عہد بھی کرے کہ جو دوا

یہی خواہش کے خلاف ہوگی کبھی استعمال نہ کر دیا گیا۔ ان حالات کی موجودگی میں کوئی ڈاکٹر یا طبیب خواہ اس کا باپ ہی کیوں نہ ہو۔ اگر معاملہ سے دستبردار ہو کر یہ ہی الزامہ کرے کہ اس کی سبب اعتدالیں، غلط کاریوں، ضد اور ہٹ دھرمی کا عیازہ جھگٹنے دو تو کیا یہ طبیب کی سبب دھمکی یا بے اعتدالی کا ثبوت ہو گا یا خود مریض کی خود کشی سمجھی جاسکتے گی۔ اب اگر مریض اس بیماری سے ہلاک ہو گیا تو طبیب ڈاکٹر کو مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتے کہ اس نے علاج نہیں کیا اور تندرست کرنا چاہا بلکہ بیمار خود مریض ہے کہ اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنے کو تباہ کیا اور طبیب کو موقع نہ دیا کہ وہ اس کی صحت واپس لانے کی کوشش کرتا۔ ٹھیک اسی طرح یہاں یہود کی شرارت، ہوا پرستی، ضد اور ہٹ دھرمی کو بیان فرما کر جو یہ لفظ فرماتے **ومن يرد الله فتنه** الخ اور **والذين للذين** لہ یرد اللہ ان یطہر قلوبہم (یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے پاک کرنا نہ چاہا) اس کا یہی مطلب ہے کہ خدا نے ان کی استعداد و باور پر کاربوں کی وجہ سے اپنی منظر لطف و معنیت ان پر سے ہٹا لی جس کے بعد ان کے راہ پر آنے اور پاک قبول کرنے کی کوئی توقع نہیں رہی۔ آپ ان کے علم میں اپنے کو نہ گھمائیں لہذا تعالیٰ کا یہی نکتہ **الذین باقوا** پر شبہ کر خدا تو اس پر بھی قادر تھا کہ ان کی سبب شرارتوں اور غلط کاریوں کو جبراً روک دیتا اور مجبور کر دیتا کہ وہ کوئی ضد اور ہٹ دھرمی ہی نہ کر سکیں تو بے شک میں تسلیم کرتا ہوں کہ خدا کی قدرت **لئن** یہ چیز کچھ مشکل نہ تھی و لولہذا ربہ لا من من فی الارض کلہم جمیعاً لیکن اس دنیا کا سارا کارخانہ ہی ایسا رکھا گیا ہے کہ بندوں کے غیر دشر کو آکتاب پر مجبور نہ کیا جاسکے۔ اگر غیر کے آکتاب پر سب کو مجبور کر دیا جاتا تو تکلیف عالم کی حکمت و مصلحت پوری نہ ہوتی اور حق تعالیٰ کی بہت سی صفات ایسی رہ جاتیں کہ ان کے ظہور کے لیے کوئی عمل نہ ہوتا۔ مثلاً **غفور**، **علیم**، **منتقم**، **ذو البطش**، **الشدید**، **قائم** بالقطر اور **ملک** یوم الدین۔ حالانکہ عالم کے پیدا کرنے کی غرض ہی یہ ہے کہ اس کی تمام صفات کمالیہ کا مظاہرہ ہو، کوئی مذہب یا کوئی انسان جو خدا کو خائل مختار ماننا ہے اس تمام کلاس کے سوا کوئی غرض نہیں بتلا سکا۔ یہی ہو کہ ایکہ احسن عملاً؟ اس سے زائد تفضیل کی یہاں گنجائش نہیں بلکہ اس قدر بھی ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

شیخ الاسلام نے جس محکمہ انداز میں یہاں سخن نوازی فرمائی ہے اس کی بزرگی اور برتری

قطعاً یہ خبر ہے لیکن حرام کو سمجھانے کے لیے عرض کرتا ہوں کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ لوگ از خود پاک ہونا نہیں چاہتے ہیں الّا یہ کہ خدا خود زبردستی ان کو پاک کر دے مگر ایسی زبردستی سے پاک کرنا اللہ تعالیٰ کے جاری قانون کے خلاف ہے یعنی اللہ کی عادت نہیں ہے کہ وہ بندے کے ارادے کے بغیر از خود کسی کو پاک کرے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مگر ایسی آئی ہے مگر کن کے لیے بتھریک فرمادیا۔

وَمَا يَعْزِلُ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ اور فَلَمَّا نَرَاَهُمْ اخْرَاجُوا اللَّهُ قُلُوبَهُمْ اور وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ اور بَلِ طَبَعَ اللَّهُ عَلَيْكَ بِكُنْ خَسِرَ ان آیتوں میں سے ہر ایک پر خود کو دہر ایک سے یہ صاف و صریح معلوم ہو گا کہ انسان کی بد اعمالی مقدم ہے اور اللہ کا اس کے جوالی اثر کو اپنی طرف سے ضلالت، گمراہی، زنگ، مہر اور بیماری فرمانا موخر ہے۔ اس سے معلوم ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ضلالت، زنگ، مہر اور بیماری کا اثرنا علت اور انسانوں کا کفر و گناہ و فساد معلول نہیں ہے بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے یعنی انسان کا فسق و فجور، کجی، زنگ، کفر، انحراف، نادانی اور قلب کی بیماری پہلے ہوتی ہے اور خدا کی طرف سے اس کے جواب میں ضلالت و گمراہی اور دل پر مہر بعد کر ہوتی ہے۔ اور یہی طبعی اصول بھی ہے۔ انسان جب گرتا ہے تو چوڑھ لگتی ہے اور ٹھکنیں ہر تہے تب اس کے قطرے ٹپکتے ہیں اگر کوئی اس کو الٹ کر بیان کرے تو یہ کسی محنت نادانی ہے۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اس آیت میں بھی اسی سنت الہی کا ف جو قرآن میں ختم قلوب کے الفاظ سے تعبیر ہوتی، اشارہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دلوں کی تطہیر کے لیے ان کے ہاں ایک خاص ضابطہ ہے۔ لوگ نیکی اور تقویٰ کی راہ پر چلتے ہیں اگر آٹھ گناہ ہیں ان کو کوئی ٹھوکر لگ جاتی ہے وہ جھوٹے ہیں لیکن گرنے کے بعد پھر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور توبہ و املاح کے ذریعے سے دامن جہادگر پھر چل دیتے ہیں تو خواہ ہزار باگھریں اور اٹھیں لیکن ان کے دامن دل پر زنگ جھنے نہیں پاتا۔ لیکن جو لوگ برائی اور نافرمانی ہی کو اپنا پیشہ بنالیتے ہیں اور گناہوں کے شناس ہی میں پڑے رہتے ہیں ان کے دلوں پر آہستہ آہستہ اتنی گندگی جم جاتی ہے کہ ان کی پاکی کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی ہے۔ اللہ سے پاک کرنا نہیں چاہتا جو خود پاک ہونے کی خواہش نہیں رکھتا ہے۔ اللہ کا دستور یہ نہیں ہے کہ جو خود پاکیزگی کا خواہاں نہ ہو اور اس کے لیے کوشش نہ کرے اسے جبراً پکڑ پکڑ کر پاکیزہ بنائے۔ یہودیوں کے یہ زعماء اور ان کے پیروکار گندگی کے لیے خود گھر گئے ہیں کہ ان کی طبائع میں طہارت قبول کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ اللہ تو ان کو ہی پاک کرتا ہے جو خود پاکیزگی کا خواہش مند ہو اور اس کے لیے کوشش کرے۔

اسلامی مملکت میں اجنبیوں کے مقدمات

۱۶- یہ جبرٹ سننے والے اور حرام مال کمانے والے ہیں۔ لہذا اگر تمہارے پاس انہیں اور تم سے فیصلہ چاہیں تو آپ کو اختیار ہے کہ ان کے درمیان فیصلہ کر دیا ان سے کنارہ کشی ہو جاوے ان میں سے ہمارا مفکر مدغیرہ اکابر سلف سے منقول ہے کہ حضور کو یہ اختیار ابتداء میں تھا۔ آخر میں جب اسلام کا تسلط اور نفاذ کامل ہو گیا تو ارشاد ہوا ان احکامہ بینہم بما انزل اللہ یعنی ان کے نزاعات کا فیصلہ قانون بشریت کے مطابق کرو۔ مطلب یہ کہ اعراض اور کنارہ کشی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ یہ اس دور کی بات ہے جبکہ یہودی اسلامی حکومت کے باقاعدہ شہری نہ تھے بلکہ اسلامی حکومت کے ساتھ ان کے تعلقات معاہدات پر مبنی تھے۔ ان معاہدات کی رو سے یہودیوں کو اپنے اندرونی معاملات میں آزادی تھی۔ اور ان کے مقدمات کے فیصلے ان ہی کے قوانین کے مطابق ان کے اپنے جج کرتے تھے۔ اس لیے حکام کا اس میں اختلاف ہے کہ اس آیت میں جو اختیار دیا گیا ہے کہ یہ صرف واقعہ کے ساتھ خاص ہے یا سب معاہدین کا یہ حکم ہے اور یا پھر آیت تمام دنیا کے کفر کے بارے میں ہے۔ مختار صحابہ کے یہ اسلامی حکومت تمام غیر مسلم شہریوں کے بارے میں نہیں بلکہ معاہدین کے بارے میں یہ آیت ہے۔ آج بھی غیر مسلم اگر اسلامی حکومت کے شہری نہ ہوں بلکہ اسلامی مملکت میں کسی معاہدے کے تحت قیام پذیر ہوں تو اسلامی حکومت کے حکم ان کو لا اختیار ہے کہ چاہیں تو ان کے مقدمات فیصلہ کریں اور چاہیں تو نہ کریں وقت کی مصلحت کا جو تقاضا ہو اس پر عمل کریں۔ مطلب یہ ہے کہ اسلامی حکومت کے حکمرانوں پر فیصلہ تو اسلامی حکومت کے شہریوں کے درمیان کرنا واجب ہے۔ دوسرے ملک کے شہریوں کے لیے واجب نہیں ہے صرف ہمارے حسب ضرورت مصلحت، قرطبی اور رازی نے اس کو اپنا لیا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے اوپر قیام عدل کی ذمہ داری اصل صرف ان ہی لوگوں سے متعلق ہے جو تمہارے دائرہ اقتدار و اطاعت کے اندر ہیں۔ جو اس سے باہر ہیں جن کی ذمہ داری ابھی تقسیم ہے۔ جو آپ کے پاس بھی آتے ہیں اور دوسروں سے ساز باز بھی رکھتے ہیں ان کی ذمہ داری شرعاً آپ پر نہیں ہے مصالح کا تقاضا ہو تو ان کے مقدمات کا فیصلہ کر دو اور نہ ہو تو رد کر دو۔

اہم مسئلہ کو اس کے فرائض کی یاد دہانی

۱۰۷۔ اور اگر کراہہ کئی اختیار کر گئے تو یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے اور اگر فیصلہ کرو تو انصاف کا فیصلہ کرو بلاشبہ انصاف کہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ قرآن کریم نے بار بار اس پر زور دیا ہے کہ کوئی شخص کتنا ہی شریعہ اور بر معاش کیوں نہ ہو مگر اس کے حق میں جی تمہارا دامن عدالت و انصاف کے چیمبروں سے داغدار نہ ہوئے ہوتے۔ یہ ہی وہ صفت ہے جس کے سہارے زمین و آسمان کا نظام قائم ہے۔

پہلی آیت میں یہ تو آپ کے اختیار تیزی اور صوابدید پر موقوف رکھا گیا ہے کہ جو لوگ اسلامی حکومت کے شہری نہ ہوں اور وہ بطور خود اپنے مقدمات کا آپ سے فیصلہ کرنا چاہیں تو آپ چاہیں تو فیصلہ کر دیں اور چاہیں تو نہ کریں لیکن اگر ان کا فیصلہ کرنا چاہیں اور مصالح کا بھی تقاضا ہو تو یہ قطعی ہے کہ آپ کو ہر حال میں اللہ کے قانون پر مبنی ہی فیصلہ کرنا ہوگا۔ اس کا اختیار نہیں ہے کہ فیصلہ کسی اور قانون کے مطابق کر دیا جائے۔ دراصل یہ بات آپ کے حوالے اُمت کو ملتی تھی ہے اور نہ اس کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ پہلے اسی آیت میں منافقین اور یہود کا یہود کا یہ ملا جلا چہرہ پیش کیا تھا کہ سماعون کذاب کا دن للہت یعنی یہ جھوٹ کے رسیا اور پکے حرام خور ہیں۔ یہ دونوں مہلے کے میٹھے ہیں۔ اس کے پتر لگنا ہے کہ یہ دونوں بیماریاں ان میں وبا کی طرح پھیلی ہوئی تھیں اور ان کا پورا معاشرہ اس کا شکار تھا۔ جھوٹ اور رشوت کے ساتھ دنیا میں حق و عدل کا کبھی بول بالا نہیں ہو سکتا۔ حق و عدل دو چیزوں کا سماں اچھلتے ہیں۔ ایک یہ کہ حق کی بے لاگ شہادت دینے والے موجود ہوں اور دوسرے یہ کہ قانون عدل و فسطح کے مطابق بے لاگ فیصلہ کرنے والے ہوں۔ جھوٹ اور رشوت ان دونوں کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیتے ہیں۔ شہادت علی الناس اور قیام حق ملنے کے فرض کی ادائیگی اسی وقت ممکن ہے جب تک جھوٹ اور رشوت کی چاٹ نہ لگے۔ اگر جھوٹ اور رشوت کی بیماری معاشرے میں عام ہو جائے تو کچھ لوگ معاشرے سے حق و انصاف کا جنازہ اٹھ چکا ہے قرآن نے منافقین و یہود کی اس بیماری کو بیان کر کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کیا ہے کہ آپ ان کے درمیان جب فیصلہ کریں تو عدل و انصاف پر مبنی کریں۔ ان کے جھوٹ اور

ان کی رشوت کا میل بھی آپ کے لیصلے پر ڈالتے۔ یہ گویا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے پوری امت سے کٹا ہوا ہے کہ فیصلہ یگانوں کے کسی معاملہ کا ہو یا بیگانوں کا ہر حال جے لاگ پیٹ قانون عدل و انصاف کے مطابق ہو۔

شریعت یہود کی گریز پائی

۱۰۸۔ اور یہ لوگ تمہیں منصف کیسے مندے ہیں جبکہ تورات ان کے پاس موجود ہے اس میں اللہ کا حکم ہے اس کے باوجود وہ اس سے روگرداں ہیں، واقعہ یہ ہے کہ یہ ایمان والے شاہیں ہیں یعنی تعجب کی بات ہے کہ آپ کو حکم مٹھاتے ہیں اور جس تورات کو آسمانی کتاب مانتے ہیں اس کے لیصلے پر بھی راضی نہیں ہیں تو حقیقت میں ان کا ایمان کسی پر نہیں ہے، ان قرآن پر تورات پر ایسا کو کج میں تورات و انجیل کی بدح فرما کر متنبہ کیا ہے کہ کسی عمدہ کتاب اور کیسے علوم و ہدایت بخشنے کی ان نالائقوں نے بے قدری کی اور انہیں ایسا صنائع کیا کہ آج اصل چیز کا پتہ لگانا بھی مشکل ہے۔ آخر حق تعالیٰ نے اپنی رحمت کا طرے بالکل آخر میں وہ کتاب بھیجی جو ان سب پہلے کتابوں کے مطابق اصلیکہ محافظ اور مصدق ہے اور جس کی ابدی حفاظت کا انتظام نازل کرنے والے نے خود اپنے فتر لیا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی بددیانتی کو بالکل بے نقاب کر دیا ہے۔ یہ مذہبی لوگ جنہوں نے تمام عرب پر دینداری اور اپنے علم کتاب کا سکہ جھار کھا ہے۔ ان کی حالت یہ ہے کہ جس کتاب کو خود اللہ کی کتاب مانتے ہیں اور جس پر ایمان کے مدعی ہیں اس کے حکم کو چھوڑ کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنا مقدمہ لاتے ہیں جن کو وہ پیغمبر ہی نہیں مانتے ہیں۔ اس سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ یہ لوگ کسی چیز پر بھی صداقت سے ایمان نہیں رکھتے اور اصل میں ان کا ایمان اپنے نفس اور اپنی خواہشات پر ہے جسے وہ کتاب اللہ کہتے ہیں اس سے صرف اس لیے روگرداں ہیں کہ اس حکم ان کی خواہشات اور مفادات کا ساتھ نہیں دیتا اور جن کی نبروت پر ایمان نہیں رکھتے۔ ان کے پاس غرض اس پر اُٹھتے ہیں کہ شاید وہاں کوئی ایسا فیصلہ ہو جسے جو ان کی خواہشات اور مفادات سے ہم آہنگ ہو۔ تورات بھی نالی کے لیے سنگسار کرنے اور قاتل کے لیے قتل کا حکم دیا گیا ہے لیکن جب

کسی بڑے آدمی سے یہ جرائم سرزد ہوتے تو یہودیوں کے دنیا پرست علماء انہیں منزا سے بچانے کے لیے دو دراز کا رتا دلیں کرتے اور طرح طرح کے شرعی جیلے نکالتے۔ چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا جیسا کہ قبچکے پر ٹھہر چکے ہو۔ یہاں اسی معاملہ کی طرف اشارہ ہے فرمایا کہ جب ان کے پاس تورات موجود ہے تو کیوں اس کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے اور کیوں تمہارے پاس فیصلے کے لیے آتے ہیں اس لیے کہ دولت مند بھرموں سے رشوت لے کر یا ان کی جاہ سے مرعوب ہو کر انہیں منزا سے بچانا چاہتے ہیں۔ بن معلوم ہوا کہ یہ لوگ کتاب الہی پر ایمان ہی نہیں رکھتے مگر ایمان کہتے تو راست بازی کے ساتھ اس کے حکموں کا اعلان کرتے۔

یہاں قرآن کے اعجاز کے لیے یہ دلیل بھی بجاتے خود کافی ہے کہ یہود کی ساری اخلاقی کوششوں کے باوجود زنا کاروں کے لیے رجم کی سزا کسی نہ کسی صورت میں آج تک باقی ہے۔ ارشاد میں فیما حکم اللہ کا انداز تبارک ہے کہ جہاں تورات میں اللہ کا حکم موجود ہے وہاں ایسے احکام بھی ہیں جو حکم اللہ نہیں ہیں۔ اگر ساری تورات زمانہ نبوت میں حکم اللہ پر مشتمل ہو تو قرآن کا انداز تعبیر ہوتا، دھوکا تب اللہ یعنی ان کے پاس تورات ہے اور وہ اللہ کی کتاب ہے۔ اس انداز کو ہم مکرر فیما حکم اللہ کی تعبیر بھی بتاتے کے لیے اختیار کی ہے کہ اس میں سارے احکام تو خداوندی نہیں ہیں مگر رحم ضرور اللہ کا حکم اس میں موجود ہے۔

إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ يَحْكُمُ بِهَا
 النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا وَالرَّشَابِثُونَ
 وَالْأَخْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِنْ كُتُبِ اللَّهِ وَكَانُوا عَلَيْهِمْ
 شُهَدَاءَ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِي وَلَا تَشْتَرُوا بِإِيمَانِي مِمَّا
 قَلِيلًا وَمَنْ لَوْ يَخْكُ بِهَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ
 وَكُتِبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنْ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَ
 الْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَالْأَذْنَ بِالْأَذْنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرْمَ
 بِهِ نَاصٌ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ كَفَّارٌ لَهُ وَمَنْ لَوْ يَخْكُ بِهَا
 أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ وَقَفِينَا عَلَى آثَارِهِمْ بَعِثْنَا
 إِيَّاهُمْ مَوْصِيًّا قَالِيبَيْنِ يَدَيهِ مِنَ التَّوْرَةِ وَآمَنَهُ بِالْإِنْجِيلِ
 فِيهِ هُدًى وَنُورٌ وَمَوْصِيًّا قَالِيبَيْنِ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَةِ وَ
 هُدًى وَمَوْعِظَةٌ لِلْمُتَّقِينَ وَلَيَحْكُمَنَّ أَهْلُ الْإِنْجِيلِ بِمَا

أَنزَلَ اللَّهُ فِيهِمْ وَمَنْ لَوْ يَخْلَعُ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ

الْفَاسِقُونَ ﴿٥٨﴾

بلاشبہ ہم نے تو ان کو نازل کیا، اس میں ہدایت اور روشنی ہے۔ اللہ کے پیغمبر جو احکام الہی کے فرمانبردار تھے اسی کے ذریعے یہودیوں کے فیصلے کرتے تھے نیز یہودیوں کے مشائخ اور علما بھی اسی کے مطابق فیصلے کرتے تھے، کیونکہ وہ کتاب اللہ کے محافظ ٹھہرائے گئے تھے اور اس کی خبر گیری پر مقرر تھے۔ لہذا تم لوگوں سے نہ ڈرو مجھ سے ڈرو اور سستے دامنوں پر میری آیات کی نہ خرید و فروخت کرو۔ اور جو کوئی اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا ہے تو یہی لوگ کافر ہیں، اور ہم نے تو ان میں یہودیوں کے لیے لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک،

کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور زخموں کے بدلے ویسے ہی زخم ہیں۔ پھر جو کوئی بدلہ لینا معاف کرے تو وہ گناہ کے لیے کفارہ ہے، اور جو کوئی اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرے گا تو یہی لوگ ظلم کرنے والے ہیں۔ اور پھر ہم نے ان نبیوں کے بعد عیسیٰ ابن مریم کو روانہ کیا، تورات کی تصدیق کرتا ہوا جو اس کے سامنے موجود تھی، اور ہم نے اسے انجیل دی جس میں ہدایت اور روشنی ہے اور تورات کی جو اس کے سامنے تھی سراسر تصدیق ہے اور متقیوں کے لیے نصیحت اور ان کو راہ بتانے والی ہے۔ اور انجیل والوں کو اسی کے مطابق فیصلہ کرنا چاہیے جو اللہ نے نازل کی اور جو کوئی اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا تو یہی لوگ فاسق ہیں۔

کتاب الہی کا چہرہ اور ان کی قانونی حیثیت

نام کی تفصیل کے ساتھ قرآن پاک میں چار آسمانی کتابوں کا ذکر ہے۔ تورات جس کو ایک جگہ صرف موسیٰ جی کی گائیگا ہے اور حضرت داؤد کی زبور اور حضرت عیسیٰ کی انجیل اور خود قرآن ان کے علاوہ ایک موقع پر صنف ابراہیم کا بھی ذکر آیا ہے۔ اس جگہ صرف تین کتابوں کا ذکر کیا ہے یعنی تورات، انجیل اور قرآن۔ یہود تورات کے سوا کچھ نہیں مانتے، عیسائی تورات کے احکام نہیں مانتے۔ لیکن اس کی اخلاقی نصیحتوں کو قبول کرتے ہیں، تاہم انجیل سے پہلے کی دوسری زبانوں اور ملکوں کی آسمانی کتابوں کی نسبت مسلمانوں کی طرح ادب اور احتیاط کا پہلو بھی اختیار نہیں کرتے لیکن قرآن پر ایمان لانے والا مجبور ہے کہ تورات، زبور اور انجیل کو خدا کی کتابیں یقیناً کہے۔ فی الواقع قرآن کی یہ تعلیم دنیا کی بہتر مثالیں تعلیمات میں سے ہے جس کا وجود کسی دوسرے مذہب میں نہیں ہے۔ یہ تعلیم صرف نظر باقی نہیں ہے بلکہ عملاً اس پر اسلامی مملکت کے احکام و قوانین کی تشکیل ہوتی ہے اور قانونی حیثیت دنیا کی قوموں کو قرآن نے چار حصوں میں تقسیم کی ہے اور ان کے علیحدہ علیحدہ حقوق بتاتے ہیں۔ یہ تقسیم حسب ذیل ہے۔

۱۔ مسلمان، ۲۔ اہل کتاب، ۳۔ شہ اہل کتاب، ۴۔ کفار و مشرکین۔

قرآن نے ان کتابوں کا چہرہ بتاتے ہوئے اعلان کیا ہے فیسہ حدی و نوثران آیات میں کس طرحی کے ساتھ قرآن نے اہل کتابوں کی تصدیق اور مدح و تعریف کی۔ اور ان اہل مذاہب کو جو اسلام پر ایمان نہیں لاتے اپنی کتب منزلہ پر عمل کرنے کی دعوت دی اور ساتھ ہی یہ بھی ان کو بتا دیا ہے کہ انہوں نے غلطی کیا ہے اور ان کے عقائد میں خلل ہے۔ ان کے عقائد میں خلل ہے کہ ان کا بیشتر حصہ طاق نسیان ہو چکا ہے اور جو کچھ باقی رہ گیا ہے ان کے ماننے والوں نے اسے سمجھ کر غلط فہمیاں کی پیروی شروع کر دی۔ یہ غلط فہمیاں کیا ہیں کتاب الہی میں تعریف و تعریف کر کے آسانیاں پیدا کرنا اور احکام الہی کے مقابلے میں ان کی حکمت آمیزش ہے۔ اسی بنا پر قرآن نے اہل کتاب کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی ہے اور اسلام قبول کرنے پر ان کو ہدایت تامہ کی بشارت دی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دوسری کتابوں کے مقابلے میں قرآن ہدایت تامہ کامل ہے۔ یہی وہ دین ہے جس کو یہود و نصاریٰ نے کھو دیا تھا اور اب جس کو محمد رسول اللہ کے ذریعے دوبارہ دنیا والوں کے سامنے پیش کیا گیا ہے اس لیے جو ہدایت ان قوموں کے پاس تھی وہ انہیں ملے گی۔

اور قرآن جس کو لے کر آیا ہے وہ تمام اور کامل ہے۔ قرآن کا تورات و انجیل کے مقابلہ میں یہ دعویٰ نہیں ہے کہ وہی ایک ہدایت ہے اور اس کے سوا سب ضلالت ہے بلکہ یہ دعویٰ ہے کہ وہی کامل ہدایت ہے اور بقیہ کتابیں موجودہ حالت میں ناقص ہیں یعنی وہ ابدی اور کامل ہدایت جو اپنے اپنے وقتوں میں سب انبیائے کر آئے تھے چوتھوں کے پیروہی تاویلات، تخریقات، تصرفات اور اختلافات سے اس کو برباد کر چکے تھے اس لیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی کو لے کر آخری دفعہ تشریف لائے ہیں اب وہ ہمیشہ کامل ہے۔ کبھی ناقص نہ ہوگی کیونکہ قرآن تحریف و اختلاف سے محفوظ ہے گا۔

الغرض دین محمدی کو قبول کرنا اس لیے تمام انسانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ دین ازلہ جو ہر مذہب کا جوہر تھا اور جو اس پر مردوں کی تحریف و تصرف سے برباد ہو گیا، اسی کو قرآن لے کر آیا ہے۔ اس سورت کے آغاز میں تکمیل دین کا اعلان کیا تھا اور درمیان میں اس کے علم و عمل کو نور کا مقادہ آندہ آیات میں اعلان ہو رہا ہے کہ قرآن تمام مصحف الہی ہر مہمن اور عادی ہے۔ اس لیے ہدایت و منزلت عمومی اور نہایت کامل اور فلاح عالم اب صرف محمد رسول اللہ کے علم و عمل میں ہے۔

۱۰۹۔ ملاحظہ ہونے تورات نازل کی اس میں ہدایت اور روشنی ہے۔ یعنی وصول الی اللہ کے طریق کے لیے ہدایت اور شہادت و مشکلات میں پسنے والوں کے لیے روشنی کا کام دیتی ہے۔ یہ تورات کی قدر و قیمت واضح کی ہے کہ اللہ نے اس کو زندگی کے اعلیٰ اقدار کے تحفظ کا وسیلہ، اللہ اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے طریقوں کی طرف رہنمائی کا ذریعہ صراطِ مستقیم کی ہدایت اور خواہشات و بدعات کی تائید میں سے نکالنے والی روشنی بنا کر اتارا تھا۔

تورات صرف یہودیوں کے دستور تھا

۱۱۰۔ اللہ کے پیغمبر محمد احکام الہی کے فرمانبردار تھے اسی کے ذریعے یہودیوں کے فیصلے کرتے تھے نیز یہودیوں کے مشائخ اور علماء بھی اسی کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔ یعنی تورات میں یہاں تک کہ ان کے دستور اور آئین ہدایت تھا کہ کثیر القصد پیغمبر اور اہل اللہ اور علماء برابر اسی کے موافق حکم دیتے تھے اور نزاعات کا فیصلہ کرتے رہے۔

مطلب یہ ہے کہ ہم نے تورات کو احکام و قوانین کا مین بنا کر اتارا تھا۔ حضرت موسیٰ اور

ان کے بعد انبیاء بنی اسرائیل ایک زمانے تک اسی تورات کے مطابق فیصلے کرتے رہے۔ اس فقرے میں تورات کے بارے میں یہ باتیں ارشاد ہوئی ہیں۔

ایک یہ کہ اس کے ذریعے یہودیوں کی زندگی کے معاملات و نزاعات کا فیصلہ ہوتا تھا۔ اور تمام اجتماعی و سیاسی اور قانونی معاملات اسی کی ہدایات کے مطابق اور اسی کی روشنی میں انجام پاتی تھیں یہاں خاص طور پر للذین ہادوا فرما کر اشارہ کر دیا ہے کہ تورات صرف یہودیوں کے لیے آئین ہدایت اور زندگی تھی۔ اس کی حیثیت عمومی دستور کی نہ تھی۔

دوسری بات یہ بتائی گئی ہے کہ یہودیوں کے فیصلے تورات کے مطابق انبیاء کرتے تھے۔ آیت میں انبیوں کی صفت الذین اسلموا لاکر یہ بتایا ہے کہ یہ انبیاء جو تورات کے ذریعے یہود کے معاملات کے فیصلے کرتے تھے۔ صرف و مردوں ہی کے لیے تورات کو واجب العمل نہیں سمجھتے تھے بلکہ خود بھی خدا کے فرمانبردار اور تورات کے احکام و قوانین کے پابند تھے۔ لیکن یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ انبیاء کا چہرہ اسلام سے کیوں پیش کیا گیا ہے۔ دراصل حالانکہ اسلام ایک صفت ہے جس میں امتی بھی شریک ہیں۔ گریہ اس میں امت بھی انبیاء کی شریک ہے۔ اگر علامہ زحرفی کی یہ بات مان لی جائے کہ یہ صفت بطور مدح لائی گئی ہے۔ اس سے تفصیل و توضیح مفقود نہیں بلکہ یہود کا پر ایک لطیف تعریض ہے جنہوں نے تورات کو زندگی کے معاملات سے بالکل بے دخل کر رکھا تھا پھر بھی یہ سوال اپنی جگہ قائم رہتا ہے کہ نبوت کی زندگی تو مرپا اسلام ہوتی ہے۔ صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ نبی ہے نبی ہونے کے ساتھ زندگی کا اسلامی ہونا ناگزیر ہے اس لیے اسلام نبوت کے لیے کوئی تعریفی پیمانہ نہیں۔ مدح کے لیے ضروری ہے کہ ایسی صفات خاصہ سے ہو جس سے تمدوح اپنے سے کمتر لوگوں سے متاثر ہو جائے اور ظاہر ہے کہ اسلام ایک صفت عامہ ہے جس کے انبیاء کی امتیں اور ان کے متبعین بھی علم بردار ہوتے ہیں۔ کیا آپ حضور انور کی مدح میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ حضور ایک مرد مومن اور مسلم تھے۔ ایک ادنیٰ سے ادنیٰ امتی بھی یہ شرف رکھتا ہے۔ یہاں علامہ ناصر کی انتصاف میں وہ رائے بے حد پسند آتی ہے جو علامہ جمال الدین قاسمی نے محاسن التاویل میں پیش کی ہے،

جیسا صفت کے ذریعے موصوف کی عظمت بیان کی جاتی ہے ایسا ہی کبھی موصوف کے ذریعے صفت کی عظمت ظاہر کی جاتی ہے۔ یہاں ایسا ہی ہے، بتایا یہ جارہا ہے کہ اسلام تو وہ عظیم الشان راہ ہے جس پر اور تراز اور انبیاء بھی چلتے رہے

ہیں، تہمدی تو وحییت ہی کیا ہے۔ قرآن میں اس کی متعدد مثالیں ہیں۔ حضرت اسی ق کے
باسے میں ہے و بشرناہ با محقق نبیاً من الصالحین یعنی صلاحیت تو وہ مقام ہے
جس کے نبی ہونے کے باوجود حضرت اسحاق بھی حامل تھے۔ اس میں صلاح کو نبی
کی صفت بنا کر نبی کی نہیں بلکہ صلاح کی شان دو بالا کی گئی ہے اور لوگوں کو اس صفت
کے حاصل کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ ٹھیک اسی طرح اس آیت میں اسلام
کی شان کو دو بالا کرنے کے لیے انبیاء کی صفت بنا کر پیش کیا ہے۔ عربی ادب میں
بھی اس قسم کی مثالیں موجود ہیں۔ ایک شاعر حضور کی مدح میں کہتا ہے۔

فان مدحت محمد القصیدتی

فلقد مدحت قصیدتی

میاں ہم اگر یہ نکتہ آفرینی نہ کریں تو بلاغت قرآنی کا خون ہو کر رہ جاتے۔ اب فقرے کا
حاصل یہ ہوا کہ محمد رسول اللہ علیہ وسلم جو اسلام کے نام سے دعوت پیش کر رہے ہیں۔ انبیاء
کی مشرکہ دعوت ہے اور یہ وہ عقیدہ دعوت ہے جسے انبیاء نے اپنا اور قبول کیا ہے۔ وہ سب کے
سب مسلم تھے برخلاف تمہائے کہ تہذیب سے ہٹ کر یہودی بن گئے ہو۔
تیسری بات اس میں یہ بتائی گئی ہے کہ ربا نیون اور احبار تورات کے قوانین کے مطابق یہودیوں
کے مقدمات و معاملات کا فیصلہ کرتے تھے۔

ربا نیون جمع ربانی کی ہے۔ اس سے مراد روحانی اور مومن آداب سے آراستہ اشخاص ہیں۔ یعنی
مشائخ۔ حضرت علی فرماتے ہیں انما ربانی ہذا الامۃ اور احبار جمع حبر کی ہے اس کے
معنی عالم کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مشائخ اور علماء تعالیٰ ان اوقات اور ان جگہوں میں جہاں کہ
انبیاء نہ ہوتے تھے۔ تورات کے مطابق لوگوں کے فیصلے کرتے رہے ہیں۔ گویا وقت کے
علماء اور مشائخ یہودیہ پر لطیف طنز ہے کہ تم جن اسلاف کے خلاف ہو ان میں ایسی برگزیدہ ہستیوں
بھی گزری ہیں جو تہمدی طرح اللہ کی کتاب کے معاملہ میں چور اور بددیانت نہ تھے۔

عہد الہی کی حفاظت کی ذمہ داری

۱۱۱۔ کیونکہ وہ کتاب اللہ کے محافظ مٹھرائے گئے تھے اور اس کی خبر گیری پر مقرر تھے۔
یعنی تورات کی حفاظت کا ان کو ذمہ دار بنایا گیا تھا۔ قرآن حکیم کی طرح انالہ محافظون کا وعدہ

نہیں تھا۔ تو جب تک علماء و مشائخ نے اپنی ذمہ داری کا احساس کیا تو رات معفوٰ و معمول رہی۔ آخر دنیا سے علماء و سادات کے ہاتھوں سے تشریف ہو کر ضائع ہو گئی۔ یہ اس حقیقت کا اعلان ہے کہ تورات کی حفاظت اور زندگی میں عمل درآمد کے لیے یہودیوں کے اکابر علماء و مشائخ کی پردگی میں سے دی گئی تھی۔ استغناظ کے معنی کسی سے حفاظت و نگہداشت میں رکھنے کے لیے سوال کرنے کے ہیں۔ یعنی ان مشائخ اور علماء کو اللہ نے اپنے کتاب کا محفوظ، امین اور لوگوں کے سامنے اسی کا شاہداد گواہ بنایا تھا۔ یہ انداز بیان بھی وقت کے یہودیوں پر ایک بیسیٹی کی تصریح ہے کہ وہ ذرا اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ بزرگان ادب و سائنس ہر کرامتوں نے خدا کے حرم میں کس طرح نسب لگائی ہے اور گواہ ہو کر کس طرح کتمانِ شریعت میں مہارت دکھائی ہے۔ استغناظ سے آیت میں صیغہ مجہول آیا ہے اس میں دونوں احتمال ہیں ایک یہ کہ اللہ نے ان سے اسے محفوظ رکھنے کا مطالبہ کیا، دوسرے یہ کہ انبیائے ان سے اس کا مطالبہ کیا ہو۔ چنانچہ حضرت موسیٰ کا عند پچلے پڑھ چکے ہو، اور یہ بھی فرمایا دکھاوا علیہ۔ مشہور اور وہ اس کے گواہ تھے۔ یعنی ان کے اسلاف مشائخ و علماء اس امر کے گواہ تھے کہ یہ کتاب الہی ہے قولی شہادت بھی دیتے تھے اور عملی شہادت۔ قولی شہادت تو یہ ہے کہ تورات میں بیان کردہ بنیادی عقائد سے لے کر اس کے تفصیلی احکام تک بنی اسرائیل کے سامنے موزوں ترین الفاظ میں وعظ و ارشاد کے درس و تدریس کے ذریعے پیش کرتے، تاکہ یہ دین ان کے مکمل کتاب بن جائے اور ان کے لیے دین موسیٰ کی صداقت ایک واقعہ بن جائے۔ اور عملی شہادت یہ ہے کہ تورات کی جو تصویر الفاظ میں پیش کی جاتے وہ پیش کرنے والے کی اپنی زندگی میں دیکھ لی جاتے یہ نہ ہو کہ دوسروں کو تو وہ وعظ و ارشاد کے ذریعے تورات کی دعوت دیں لیکن خود اپنے آپ کو اس کا مخاطب نہ سمجھیں۔ قرآن حکیم نے

اتامروا اناسی بالہرہ تمنسون انفسکم

کے الفاظ سے ان کی اسی حالت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اعلانِ حق میں کسی کی پروا نہ کرو

۱۱۲۔ لہذا تم لوگوں سے نہ ڈرو مجھ سے ڈرو اور سستے دامنوں پر میری آیات کی خرید و فروخت

ذکر۔ یعنی لوگوں کے خوف یا دنیوی طمع کی وجہ سے آسمانی کتاب میں تبدیلی و تحریف ذکر و اس کے احکام و اخبار کو مت چھپاؤ اور خدا کی تعذیب و انتقام سے ڈرتے رہو۔ تورات کی حلفت شان اور قبولیت جملانے کے بعد یہ خطاب یا قرآن و رسالہ و عطا یہود کو کیا گیا ہے جو نزول قرآن کے وقت موجود تھے کیونکہ انہوں نے حکم و حکم سے انکار کیا تھا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پیشین گوئیوں کو چھپاتے اور ان کے معنی میں عجیب طرح کے ہیر پھیر کرتے تھے اور یا درمیان میں اُمت مسلمہ کو نصیحت ہے کہ تم دوسری قوموں کی طرح کسی سے ڈر کر یا حسب مال و ماہ میں مجلس کر اپنی آسمانی کتاب کو ضائع مت کرنا۔ چنانچہ اس اُمت نے بعد اللہ ایک حرف بھی اپنی کتاب کا گم نہیں کیا۔ اور آج تک اے مبطلین کی تغیر و تحریف سے محفوظ رکھنے میں کامیاب رہی اور ہمیشہ رہیں گے۔

اس فقرے کی نشست مقرر کرنے میں شارحین قرآن کا کچھ اختلاف ہے۔ علامہ زحمری نے تریاق و سباق سے الگ کر کے اس کا مخاطب اُمت اسلام کے حکمرانوں کو قرار دیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

اس میں حکمرانوں کو اپنی حکومت میں اللہ کے سوا کسی سے ڈرنے سے اور نہایت کرنے سے روکا گیا ہے کہ کسی ظالم بادشاہ کے خیال سے یا رشتہ داروں اور دوستوں کی کسی تکلیف کے اندیشہ سے خدا کے حکم کے خلاف فیصلہ نہ کرو۔

لیکن علامہ ابو السود اور دوسرے شارحین قرآن کہتے ہیں کہ بطور التفات یہ زمانہ نبوت کے عطار اور رسالہ یہود کو خطاب ہے اور مطلب یہ ہے کہ جب صورت حال یہ ہے تو تم لوگوں سے ڈر کر احکام الہی کو نہ چھپاؤ بلکہ مجھ سے ڈرو اور میرے سے وفاداری کرو۔ اور کسی دنیوی منفعت کی خاطر کتاب الہی کو بیان کرنا، اس پر عمل کرنا اس پر فتویٰ دینا اور اس کے مطابق فیصلہ کرنا ہرگز نہ چھوڑو۔ یہاں خلعت سے ڈرنا ان کا یہ ہے کہ اگر ہم نے حسب بشارات تورات نبوت محمدی کی تصدیق کر دی تو ہمارے عوام ہمارے ہاتھوں سے نکل جائیں گے۔ عطا یہود کے لیے قبول حق یا تصدیق محمدی سے پہلا مانع بھی حسب ماہ تھا۔ سب سے پہلے یہ اسی پر ضرب ہے اور دوسرا مانع حسب مال تھا۔ اس پر وہاں تشدد سے متنبہ کیا کہ یہ نہ لانے وغیرہ جو عوام سے طے ہیں ان کے بند ہو جانے کا اندیشہ نہ کرو۔

اور کچھ لوگوں نے اس کا تعلق دکاندار علیہ السلام سے قائم کر کے یہ مطلب بتایا ہے کہ ان شہداء میں سے یہ بات کہی گئی ہے کہ ان سے ڈرنا انسانوں سے نہ ڈرنا۔ یعنی چونکہ تمہیں کتاب الہی کا گواہ بنایا گیا ہے اس لیے واجب ہے کہ تم صرف خدا ہی سے ڈرو و دوسروں کا خوف درحسب اپنے سینے سے نکال دو اس کے بغیر ہر طرح کے حادثات میں اس کے لیے کتاب الہی کی شہادت کی ذمہ داریوں کو عہدہ بہما ہونا ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح جو جماعت کتاب الہی کی ایمین بنائی گئی ہے اس پر حرام ہے کہ وہ اپنے دنیوی مفادات و اغراض کی خاطر خدا کی اس امانت میں خیانت کرے اور کتاب الہی میں تاویل و تخریف کرے۔ ملاحظہ فرمائیے کہ یہاں بھی معلوم ہوتا ہے۔ گو ما دراصل اس فقرے میں شہادت کی راہ میں پیش آنے والی رکادوں کی نشاندہی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ رکاوٹ خواہ کوئی ہو اسے ہٹانے کی بھرپور کوشش کی جائے۔ یہ رکادیں دو ہی ہیں حسبِ جاہ اور حسبِ مال یا تنگنواں اس میں حسبِ جاہ اور لا تشعروا میں حسبِ مال کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یعنی نہ توجاہ منصب، قیادت زعامت اور حکومت کو نظر میں لیا اور نہ مفادات، منفعتوں اور خواہشوں کو دھیان میں لاؤ ان سب سے بڑھ کر فرضِ شہادت اسباب ہو۔

قضاء و افتاء میں قانونِ الہی کی خلاف ورزی

۱۱۳۔ اور جو کوئی اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا ہے تو میری لوگ کافریں۔ ما انزل اللہ کے موافق حکم نہ کرنے سے غالباً مراد یہ ہے کہ منصوص حکم سے وجود ہی سے انکار کرنے اور اس کی جگہ دوسرے احکام اپنی رائے اور خواہش سے تصنیف کرے جیسا کہ یہود نے حکمِ رب کے متعلق کیا تھا تو ایسے لوگوں کے کافر ہونے میں کیا شبہ ہے اور اگر مراد یہ ہو کہ ما انزل اللہ کو عقیدہ ثابت مان کر پھر فیصلہ عملاً اس کے خلاف کرے تو کافر سے مراد عملِ کافر ہے نہ اس کی عملی حالت کافروں جیسی ہے بلکہ

یہ آیت قرآنی مہماتِ معارف میں سے ہے اس لیے ضروری ہے کہ اس کے کچھ گوشوں پر یہاں اجمالی تبصرہ کر دیا جائے۔ شیخ الاسلام نے پنچواں اور خلاصہ کے طور پر جو کچھ فرمایا ہے وہ اپنی جگہ لاجواب ہے لیکن بعد مختصر ہونے کی وجہ سے اس سے معالم القرآن کے قاریوں کی تشنگی دور نہ

ہوگی اس لیے عرض ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے حق میں جو خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں۔ کفر کا لفظ بولا ہے اور آگے دو آیتوں میں ظلم اور فسق کہا ہے۔ کچھ نے یہ کہہ کر اس آیت کی زد سے بچنے کی کوشش کی کہ یہ آیت یہودیوں کے بارے میں ہے اور کچھ نے کہا یہ تینوں آیتیں کفار کے متعلق ہیں اور کچھ نے کفر کے معنی میں اپنی طبیعتی جولانی دکھائی ہے۔ یہ بات کہ یہ آیت یہودیوں کے بارے میں ہیں یا یہ کافروں کے متعلق ہیں بالکل صحیح ہے اور اس میں دو درجے ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت براء بن عازب کہتے ہیں کہ یہ آیت کافروں کے حق میں ہیں اور البرادہ میں حضرت عبداللہ بن عباس کا ارشاد ہے کہ یہ آیت کریمہ اور نصیر یہود کے بارے میں ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ ان آیات کے نزول کا پس منظر یہ ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ اسی جرم کا اگر مسلمان ارتکاب کریں تو ان کے حق میں یہ جرم نہیں ہے۔ کیونکہ اہل کتاب تو قرآن کے عالم منظور کا ہوتا ہے مذکر پس منظر اور اسباب کا۔ شاید حضرت حذیفہ کے سامنے اسی قسم کے ذہن کھٹنے والے نے کہا کہ یہ تینوں آیتیں بنی اسرائیل کے حق میں نازل ہوئی ہیں، کہنے والے کا مطلب یہ تھا کہ یہودیوں میں سے جس نے خدا کے نازل کردہ حکم کے خلاف کیا وہی کافر ہے وہی ظالم ہے وہی فاسق ہے اس پر حضرت صدیق نے فرمایا کتنے اچھے بھائی ہیں تمہارے لیے یہ بنی اسرائیل کہ لو کہو اسب ان کے لیے اور میٹھا میٹھا سب تمہارے لیے ہے ہرگز نہیں بخدا تم بھی ان ہی کے نقش قدم پر چلے گے یہ صرف حضرت حذیفہ ہی کا اثر نہیں بلکہ صحابہ میں سے حضرت عبداللہ بن مسعود اور تابعین میں سے الحسن البصری اور ابراہیم نخعی بھی یہی کہتے ہیں۔

ان هذه الايات الثلاث عامّة في اليهود وفي هذه الامة
یہ تینوں آیتیں یہود کے اور امت محمدیہ کے حق میں آئی ہیں۔

علامہ اسماعیل قاضی نے احکام القرآن میں یہ بات بڑے پختے کی گئی ہے کہ قرآن کا ظاہر یہی ہے کہ جو شخص بھی یہودیوں جیسا کردار پیش کرے گا اور خدا کے نازل کردہ قانون کو چھوڑ کر اپنے یا دوسرے انسانوں کے قانون پر عمل کرے گا وہ اسی وعید کا مستحق ہے حاکم ہو یا منصف یا کوئی اور۔ یہ آیت اس بارے میں نص قطعی و ظاہر ہے کہ جو مسلمان دانستہ بلا کسی وجہ شرعی کے خدا کے احکام کی جگہ دوسرے احکام اپنی ملتے اور خواہش سے تصنیف کرے یا دوسروں کے تصنیف کردہ سے کرنا فہم کرے اس کے کفر میں کیا شبہ ہو سکتا ہے وہ یقیناً کافر بھی ہے ظالم بھی ہے اور فاسق بھی کافر اس لیے کہ اس کا یہ فعل حکم خداوندی کے انکار کے ہم معنی ہے، ظالم اس لیے کہ اس کا

یہ فعل عدل و انصاف کے خلاف ہے اور فاسق اس لیے کہ بندہ ہونے کے باوجود وہ اپنے مالک کے قانون کے دائرے سے نکل رہا ہے۔ اسلامی زندگی کا مدار ہی اللہ کی حاکمیت ہے اور شریعت کے نزدیک اس فعل سے بڑھ کر اور کون سا فعل ہے جو ایک مسلمان کے لیے کفر، ظلم اور فسق کا مستوجب ہو گا؟۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس کو دائرے کے لیے وہ وعید فرمائی جو کسی معصیت کے لیے نہیں فرمائی یعنی **عَذَابُ الْكَافِرِينَ**۔ سائے قرآن میں یہ انداز وعید کافروں کے لیے مخصوص ہے۔ لیکن یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جس طرح ایمان و اسلام کی سترے اوپر کچھ شاخیں ہیں اور ان میں سے ہر شاخ ایمان و اسلام ہے اسی طرح کفر کی بھی شاخیں ہیں اور اس کے بھی مراتب ہیں۔ اسی لیے صحابہ و سلف سے مروی ہے کفر دوں کفر و ظلم دوں ظلم۔ امام بخاری نے کتاب الایمان میں باب باندھا ہے کفران العتیر و کفر دوں کفر لیکن دراصل یہ خود صحابہ کرام کے آثار سے ماخوذ ہے جیسا کہ امام احمد نے کتاب الایمان میں عطاء بن ابی رباح کے طریق سے روایت کیا ہے اور امام ابوالحسن الاشعری نے بھی مقالات طوائف الاسلام میں لکھا ہے کہ بتدرج صحابہ سے منقول ہے۔

پھر جس طرح ایمان اعتقادی بھی ہے اور عملی بھی۔ یعنی اعتقادات و افکار میں سے بھی ہے۔ اور عملیات و ظواہر میں سے بھی۔ فکر بھی ہے اور فعل بھی ایمان باللہ و الرسل بھی ایمان ہے اور نماز بھی ایمان ہے۔ تنہیک اسی طرح کفر کی بھی دو قسمیں ہیں اعتقادی اور عملی۔ ایک کفر اعتقادات و افکار کا ہے اور ایک اعمال و افکار کا۔ شرک کفر اعتقادی ہے اور ترک صلاۃ مستعد کفر عملی۔ لہذا یہ جو فرمایا کہ **مَنْ لَمْ يَحْكَمْ بِمَا نَزَلَ اللَّهُ فَادْنُ مِنْهُ**۔ کافر دن۔ قرآن میں اور عموم کفر و ایمان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ نہ لفظ کفر کی یہاں کوئی تاویل کرنی چاہیے اور نہ یہودیوں سے مخصوص کرنا چاہیے۔ قرآن نے جس فعل کو کفر کہا ہے وہ کفر کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ اور جب تک دنیا باقی ہے وہ کفر ہی ہے۔ ہاں کفر بھی دوسرے اعمال کفر کی طرح کفر عملی ہے ذکر کفر اعتقادی و مخزج من الملّت، اس کا کرنے والا دینا ہی فعل کفر کا مرتکب ہو گا جیسا نماز جان کر چھوڑ دینے والا لیکن یہ وہ کفر نہیں جو ملتِ اسلامیہ سے نکال دیتا ہے۔ جب تک ایک شخص اعتقاد کے اس دروازے سے پلٹ نہ جائے جس دروازے سے اسلام میں داخل ہوا تھا

اس وقت تک اس معنی میں کافر نہیں ہو سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ کرنا اور خود تراشی ہوئے یا انسانوں کے بنائے ہوئے قانون پر فیصلہ کرنا قرآن کے نزدیک ان انتہائی معاصی میں سے ہے جو عملاً کفر ہیں اس لیے اس کفر کے بعد جو مسلمان کو قطعاً کافر و مرتد کر دیتا ہے اس کفر سے بڑھ کر کوئی برائی نہیں ہے اور قریب ہے کہ اس کا مرتکب اس کفر کے حدود میں بھی داخل ہو سکتا۔ قرآن میں جن نفلوں میں اس کا ذکر کیا ہے وہ عام نہ ہوں گے بلکہ کبھی اختیار نہیں کیا جاتا۔ یہ انداز بیان اتنا شدید ہے کہ اولیٰ تو کافر کہا جا رہا ہے پھر تاکید بڑھائی اور قصر العذر علی الموصوف کے اندھے اس میں اس قدر سنگینی پیدا کر دی گئی ہے کہ جس دل میں الٰہی برابر بھی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان ہو اس کو لرزائینے اور خوفِ الٰہی سے بدحال کرنے کے لیے کافی ہے۔ اگر ایک مسلمان کا ایمان بالکل مردہ نہیں ہو گیا ہے تو سارے گناہ جو زمین پر کیے جاتے ہیں اس سے سرزد ہو سکتے ہیں مگر اس کفر کے ارتکاب کا کبھی دھیان بھی نہیں کر سکتا۔ اس تاکید اور زور کے ساتھ ان کو کافر قرار دینے کی وجہ وہ اہتمام ہے جو اللہ تعالیٰ ان کو اپنی شریعت اور کتاب کی تعلیم دینے اس کی ذمہ داریوں سے آگاہ کر لے اور اس راہ کے خطرات سے متنبہ کرنے کے لیے فرمایا۔ قرآن نے جن اعمال پر جو تبصر اختیار کیے ہیں اور جو الفاظ استعمال کیے ہیں ہمیں حق نہیں ہے کہ تاویل و توجیہ کر کے ان سے لغوی مفہوم کا اصلی زور گھٹا دیں یا کسی کو کشیں جن لوگوں نے کی ہیں۔ مسلمانوں کو اسلام و ایمان کی عملی زندگی سے محروم کر دیا۔ یہ جو حق تمام عالم اسلامی میں تقریباً دو تہائی مسلمان عملاً ایک قلم مرجی و جہمی زندگی بسر کر رہے ہیں تو اس کے متعدد اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہی فتنہ تاویل ہے۔ اسی بدعت کی وجہ سے اعمال کی اہمیت مطلقیت بالکل ناپید ہو چکی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اخیر سلف نے ہمیشہ ایسی تاویلوں سے انکار کیا اور ان تمام راہوں سے بچتے بچے جو راستے اور نعمت کی بدعتوں کی طرف لے جاتے والی ہوں۔ حافظ ابن کثیر نے براہ بن عازب، عبداللہ بن ابیہان، عبداللہ بن عباس، ابو حصن، ابو جابر، حکمر، حمید اللہ بن عبد اللہ اور الحسن البصری کا یہ خیال نقل کر کے بذلت حدیث الایات فی بنی اسرائیل صحابہ اور تابعین سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ حسن بصری کہتے ہیں کہ ان آیات کا وجوب ہم پر بھی ہے۔ ابراہیم نخعی کہتے ہیں کہ یہ آیات بنی اسرائیل کے باب میں ہیں لیکن اس اہمیت کے لیے بھی اللہ کی رضا یہی ہے۔ عبداللہ ابن مسعود کہتے ہیں کہ مسلمان کا یہ فعل حکم خداوند کے انکار کا ہم معنی

ہے۔ عبد اللہ ابن عباس کہتے ہیں کہ یہ کفر ہے۔ علاء ابن ابی رباح کہتے ہیں کہ یہ کفر دون کفر ہے۔ ان سب بزرگوں کا مقصود یہی تھا کہ اس کی تاویل نہ کرنا چاہیے۔ آیت کا صاف مطلب یہی ہے کہ جو غیر شرعی احکام کو شرعی احکام قرار دے اور انسانی قانون کو خدائی قانون کے مقابلے میں چلائے۔ بڑی جسارت رکھنے والوں کے کفر میں شک کیا ہو سکتا ہے؟

یہودیوں کا ضابطہ فوجداری

۴۱۱۔ اور ہم نے تورات میں یہودیوں کے لیے لکھ دیا تھا کہ ہان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور زخموں کے بدلے جیسے زخم ہیں۔ یعنی قصاص کا یہ حکم شریعتِ موسوی میں تھا اور بہت سے علماء نے تصریح کی ہے کہ جو پچھلی شرائع قرآن کریم یا ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لعل فرمائی ہیں بشرطیکہ ان کی نسبت کسی جگہ حضور نے کوئی انکار یا ترمیم نہ فرمائی ہو تو وہ اس امت کے حق میں بھی تسلیم کی جائے گی گویا بدون انکار کے ان کا سنا نافذ تعلق بالقبول کی دلیل ہے بلکہ

یہ بھی یہودیوں پر طرز ہے کہ تورات میں تو اللہ نے تمہارے لیے یہ قانون بنایا تھا کہ ہان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ۔ اور تم نے یہ کر لیا کہ اگر نصیر کا آدمی قریبہ کے کسی آدمی کو مار ڈالے تو قصاص نہیں لیتے اور آدمی دیتے کہ چھوڑ دیتے ہو۔ اگر قریبہ کا کوئی آدمی نصیر کے کسی آدمی کو مار ڈالے تو اس سے پوری دیت لیتے ہو۔ امیر غریب کی یہ تفریق تورات میں کہاں تھی۔ یہ تو کھلم کھلا خدائی قانون کی بغاوت ہے۔ ہم نے تورات میں بلا تفریق قصاص کا حکم دیا تھا۔ تم نے یہ تفریق کہاں سے نکال ہے۔ اگرچہ ابن عباس سے منقول ہے کہ یہ آیات زمانہ کے کیس میں نازل ہوئی ہیں جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے مگر امام احمد نے مسند میں اور ابن جریر نے تفسیر میں یہ واقعہ بھی عبد اللہ بن عباس کے حوالے سے لکھا۔ ابو داؤد اور نسائی نے بھی اسے روایت کیا ہے۔ قتادہ اور مقاتل بھی یہی کہتے ہیں۔ اسباب میں تعدد ہو سکتا ہے۔ دونوں واقعات پیش آتے ہوں اور وحی اللہ نے ایک ہی جگہ استناد نوعیت کی وجہ سے دونوں کا مدعا کر دیا۔

اس آیت سے بہت سے اصولیین اور فقہائے اسلامی قانون کے اس موقف کو واضح کیا

ہے کہ اسلام سے قبل کے قوانین بھی اسلامی حکومت کے لیے قانونی حیثیت رکھتے ہیں بشرطیکہ ان کا نسخہ ثابت ہوا ہے۔ چونکہ یہاں اس ضابطہ فوجداری کے نسخہ جوئے کا کوئی اشارہ ہمیں اس لیے تمام مدارس قانون کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ یہی اسلام کا قانون فوجداری ہے۔ ابو مصعب بن الصامغ کی کتاب اثلّٰل کے حوالے سے اتنا بھی نقل کیا ہے کہ تمام اُمت کے اہل علم کی اجتماعی قوت اس کی پشت پر ہے۔

جس ضابطہ فوجداری کا تورات کا نام لے کر یہاں ذکر کیا گیا ہے۔ تورات میں سائے تعریفی انتظامات کے باوجود یہ حکم کتاب خرّم ۲۱، ۲۲، ۲۵ کتاب اجار ۲۲، ۲۳ اور کتاب استشاء ۱۹، ۲۱ میں صراحتاً موجود ہے۔

سائے ائمہ لے اس ریت سے استدلال کیا ہے کہ مرد کو عورت کے بدلے میں قتل کیا جائے گا۔ اور اہم ابو حنیفہ النفس بالنفس کے عموم سے اپنے اس قانونی موقف پر بھی استدلال کیا ہے کہ مسلمان اگر قاتل ہو اور مقتول کا فر بشرطیکہ اسلامی مملکت کا شہری ہو اور ایسے ہی اگر آقا قاتل ہو اور غلام مقتول ہو تو مسلمان قاتل سے قصاص لیا جائے گا۔ اگرچہ دوسرے مدارس فقہ کے اس موضوع پر ابو حنیفہ سے اختلاف بھی ہے لیکن کچھ بات یہ ہے کہ رادیوں کی تعبیرات سے الگ ہو کر اگر قرآن کا مطالعہ کیا جائے تو قرآن کا رجحان یہی ہے۔ یہاں تورات کے اس ضابطہ فوجداری پیش کرنے کی رُوح یہ ہے کہ تورات میں واضح احکام کے باوجود یہ یہود کیسے آپ کو حکم بنا کر فیصلے سے گریز پاتی کر رہے ہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دراصل یہ حدود ہی کے معاملات تھے جو یہود کے لیے سب سے بڑا پرچہ استعجاب بنے ہوئے تھے۔ ان کی دینی زندگی کا سب سے بڑا جرم حدود و تعزیرات سے فرار تھا۔ وجہ و اسباب کے تجزیے سے ہٹ کر اگر غور کیا جائے تو موجودہ دور کے مسلمانوں کی اسلامی زندگی میں بھی آپ کو حدود و تعزیرات ہی سب سے بڑی آزمائش محسوس ہوں گے۔

آیت میں والحدود قصاص سے مراد یہ ہے کہ زخم بھی محل قصاص ہیں۔ یعنی جسم انسانی میں ہر زخم کا قصاص لیا جائے گا لیکن جس زخم کے ٹیٹے سے موت کا اندیشہ ہو یا زخم کا طول و عرض اور عمق معلوم نہ ہو سکے تو ان صورتوں میں تاعان لیا جائے گا جس کو قانون کی زبان میں ارش کہتے ہیں

معافی گناہوں کا کفارہ ہے

۱۱۵۔ پھر جو کوئی بدل لینا صاف کر لے تو وہ گناہ کے لیے کفارہ ہے۔ یعنی جرم کے قصاص کو

معاف کر دینا مجروح کے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے جیسا کہ بعض احادیث میں اس کی تصریح ہے۔ اور بعض مفسرین نے اس آیت کو جارج کے حق میں رکھا ہے۔ یعنی اگر مجروح نے جارج کو معافی لئے دی تو اس کا گناہ معاف ہو جائے گا و الراجح ہوا اول یہ ہے

اصل میں آیت میں لفظ لہ کی ضمیر کے مقرر کرنے میں شارمین قرآن کا اختلاف ہے۔ کچھ کہ لاتے ہے کہ اس کا مرجع مجروح یعنی وہ شخص ہے جسے زخمی کیا گیا ہے اور جو معاف کر رہا ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ اگر مجروح اپنے مجرم کو معاف کر دے اور اس سے بدلہ نہ لے تو اس کی یہ نیکی اس کے گناہوں کے لیے کفارہ ہو جائے گی۔ اس طرح یہ آیت مجروح کو معاف کرنے کی ترغیب دے رہی ہے۔ امام شہابی مجددی فرماتے ہیں اور بیشتر مفسرین کی بات بھی یہی ہے۔ ارشاد نبوت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے فرمایا جس کے جسم میں کوئی زخم لگا یا گیا اور اس نے معاف کر دیا تو جس درجہ کی یہ معافی ہوگی اسی کے بقدر اس کے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔ درہات کی تشریح حضور اللہ ہی نے اس ارشاد میں فرمائی ہے جو بحوالہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نقل کیا ہے کہ:

حضور اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی اور بتایا کہ اس کا مصداق وہ شخص ہے جو کسی کا دانت توڑتا ہے یا اس کو زخمی کرتا ہے اور مجروح اسے معاف کر دیتا ہے تو مجروح کے اس قدر گناہ معاف ہو جاتے ہیں جتنی اس نے معافی دی ہے اگر آدمی دیت معاف کی ہے تو آدمی کے گناہ اور اگر بھرتائی معاف کی ہے تو بھرتائی گناہ۔ اگر تہائی دیت معاف کی ہے تو تہائی گناہ اور اگر ساری دیت معاف کی ہے تو سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

اس کے برعکس عبداللہ بن عباس، مجاہد اور حضرت جابر یہ فرماتے ہیں کہ لہ میں ضمیر کا مرجع مجروح نہیں بلکہ جارج ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر مجروح مجرم کو معاف کر دے تو یہ معافی مجرم کے لیے کفارہ بن جائے گی۔ عدالت اس پر کوئی مقدمہ نہ چلائے گی اور قانون اس سے کوئی باز پرس نہ کرے گا۔

قانونی اور اخلاقی تقاضا

دونوں تشریحات میں ایک جوہری فرق ہے۔ پہلی بات معنی ایک اخلاقی و عطلہ تعلیق ہے

جبکہ دوسری رائے ایک قانونی مضابطہ فراہم کرتی ہے وہ یہ کہ مجروح کے صحت کرنے کے بعد عدالت کو مجرم پر مقدمہ چلانے اور لمبے مزا فیصے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ قانونی اور اخلاقی ہدایات کی یہ تقسیم انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ انسانی زندگی کو پوری طرح قانون کے ٹکسنے میں کس دینا نہ تو مناسب اور مفید ہے نہ ممکن العمل۔ اسی طرح ہر ہدایت کو اختیار کا اور اخلاقی درجہ دینا انسان کو ہلاکت کے غار میں پھیل فیصے کے مترادف ہے۔

اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ دنیا میں امن و امان اور عدل و انصاف کے قیام اور فتنہ فساد اور برائیوں کے ہندسے کے لیے دو چیزیں ہیں۔ قانون اور اخلاق، اگرچہ فساد و برائی کا ایک ہے مگر منزل مقصود تک پہنچنے کی راہیں مختلف ہیں اور تنہا ان میں سے ہر ایک میں کچھ کچھ کی ہے جس کی تمنا دوسرے سے ہوئی ہے۔ قانون برائیوں کو روک دیتا ہے مگر دل میں اس برائی کی طرف سے کراہت کا کوئی روحانی کیف پیدا نہیں کرتا۔ جو انسانیت کی جان ہے اور اخلاق پر عمل کرتے کیے ہر شخص کو مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ بہر حال جن مفسرین کی نظر اخلاق پر ہے انہوں نے لا کی ضمیر کا مجروح کو قرار دیا اور آیت قرآنی سے عفو کی ترغیب معلوم کی اور جن کے پیش نظر قانون ہے انہوں نے ضمیر کا مرجع خارج کر دیا اور اس سے عدلیہ کے لیے ایک قانونی دفعہ معلوم کر لی اور دونوں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں اور دونوں کو سلف کی حمایت حاصل ہے۔

خدا کی قانون مخالف فیصلہ کرنے والا ظالم ہے

۱۱۶۔ اور جو کوئی اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرے گا تو میری لوگ ظلم کرنے والے ہیں۔ یہود نے حکم قصاص کے خلاف بھی تعامل قائم کر لیا تھا۔ ان میں بنی نصیر جو زیادہ معتز اور قوی تھے۔ بنو قریظہ سے پوری دیت وصول کرتے اور جب ان کو فیصے کی نوبت آتی تو نصف دیت دیت دیت کرتے۔ بنی قریظہ نے اپنا کزدی کی وجہ سے ان سے اس طرح کا معاہدہ کر رکھا تھا۔ اتفاقاً بنی قریظہ کے ہاتھ سے بنی نصیر کا آدمی مارا گیا۔ انہوں نے دستور سالی کے موافق ان سے پوری دیت طلب کی۔ بنو قریظہ نے جواب دیا کہ جاؤ وہ زنا دیا گیا جب ہم نے تمہاری قوت سے مجبور ہو کر یہ ظلم منظور کیا تھا۔ اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں آچکے ہیں، ان کا دور دورہ ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ جو دیت تم سے لیتے ہیں اس سے دشمنی ادا کریں۔ اس سے عرض یہ تھی کہ جناب محمد رسول اللہ کی موجودگی میں یہ معاملہ ہے کہ کوئی قریظہ کو کچل دے۔ کیونکہ سب کو یقین تھا کہ آپ ہر ضعیف و قوی کے ساتھ یکساں

انصاف کرتے ہیں اور اعلیٰ قوتوں کے مقابلہ میں ضغنا کی دستگیری فرماتے ہیں۔ انہما کار یہ
معامہ حضور کی عدالت میں پیش ہوا اور بنی قرینہ نے یوحنا کو اس پیکر عدل و انصاف کے بارے میں ظاہر کیا
تھا۔ بلا کم و کاست صحیح نکلا۔ حکم قصاص کے بعد وہ من بعد یحکمہ با انزل اللہ فادلت حد
الظالمون۔ فرمانے سے اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے اور چونکہ رسم کی طرح قصاص حکم شرعی ہونے کا
صریح انکار نہیں کیا تھا بلکہ آپس کی مفاہمت سے خلاف حکم شرعی ایک دستور قائم کر لیا تھا تو
قانون کی یہ اعتدالی نہیں صرف عملی مخالفت تھی اس لیے یہاں کافروں کی جگہ ظالمون فرمایا یعنی یہ ظلم
مروج ہے کہ قوی سے کم اور ضعیف سے زیادہ دیت لی جائے۔

یہاں فوجداری قانون ذکر کرنے کے بعد ان لوگوں کو ظالم کہا ہے جو عدل و انصاف کے اس
خداوندی قانون کو محض طاقت کے گھنٹہ میں منظر انداز کرتے ہیں وہ اپنی ذات پر اور اپنے معاشرے
پر سب بڑا ظلم کرتے ہیں۔ قتل دنیا میں سب بڑا ظلم ہے۔ اسی بنا پر ارشاد فرمایا ہے کہ اول
ما یقتنی بین الناس الدمار قیامت کے روز سب سے پہلے جس معاملہ کا فیصلہ چکا یا جائے گا
وہ انسان کا خون ہے۔

شاید یہاں ذہن میں آپ یہ غلط محسوس کریں کہ یہ حدیث مشہور حدیث محاسبہ صلاۃ کے معانی
ہے کیونکہ نماز کے متعلق قصا و فیصلہ کا نہیں بلکہ محاسب کا لفظ آیا ہے۔ بخاری کی روایت میں
اول ما یحاسب بعد المصلات، قیامت میں سب سے پہلے آدمی سے جس عمل کا محاسب
یا جائے گا وہ نماز ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جن کاموں میں محاسبہ ہو گا ان میں سب سے پہلا کام نماز
ہے لیکن جن کاموں میں فیصلہ چکا یا جائے گا ان میں سب سے پہلا معاملہ قتل کا ہو گا۔ ان میں سب
پہلے معاملہ غزو کی طرف اشارہ دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ محاسبہ اور قصا میں فرق ہے۔ کچھ کم انزل
کی ذات سے تعلق رکھتی ہیں اور کچھ دوسروں کے حقوق سے۔ شریعت نے اسی فرق کو حقوق اللہ
اور حقوق العباد سے تعبیر کیا ہے۔ پہلی قسم کے کاموں میں قصا اور فیصلہ کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ
ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے اس کا کوئی دوسرا مدعی نہیں ہے۔ اس میں تاہم جس پر سزا ہے۔ لیکن
دوسری قسم کے لیے پرسکش لانی نہیں فیصلہ چکانے کی ضرورت ہے کیونکہ وہ ایسے کام ہیں
جن میں دوسروں کے حقوق تلف ہوتے ہیں اور وہ بحیثیت مدعی حاضر ہوں گے۔ نماز پہلی

قسم کے اعمال میں سب اہم ہے اور قتل کا معاملہ دوسری قسم میں سب زیادہ اہم ہے لہذا حساب کے موافق پر سب پہلے غارتگی پر چھوڑ کر ہوگی اور جب فیصلہ چکایا جائے گا تو سب پہلے قتل نفس کا معاملہ پیش ہوگا۔ مالیت کے موضوع پر صرف یہ آتا ہے کہ

بندے قیامت کے روز اپنی ٹانگوں پر کھڑے رہیں گے جب تک چار باتوں کے جواب سے فارغ نہ ہوں گے ان میں ایک بڑا سوال یہ ہوگا کہ مال کو کون ذراائع سے حاصل کیا اور کن راہوں پر خرچ کیا۔

تورات کی تصدیق

۱۱۶۔ اور پھر ہم نے ان نبیوں کے بعد حضرت عیسیٰ بن مریم کو روانہ کیا تورات کی تصدیق کرنا ہوا جو اس کے سامنے موجود تھی، اور ہم نے اسے انجیل دی جس میں ہدایت اور روشنی ہے اور تورات کی جو اس کے سامنے ہے تصدیق کرتی ہے اور منتقروں کے لیے نصیحت اور ان کو راہ بتانے والی ہے۔ یعنی ان کے نقش قدم پر حضرت عیسیٰ بھی چلتے تھے وہ خود اپنی زبان سے تورات کی تصدیق فرماتے تھے اور جو کتاب انجیل ان کو دی گئی تھی وہ بھی تورات کی تصدیق کرتی تھی۔ اور انجیل کی نوعیت بھی نزدیک ہدایت کرنے میں تورات کی طرح تھی، احکام و شرائع کے اعتبار سے دونوں میں بہت ہی فیصل فرق ہے جیسا کہ ص ۷۷ حل کسہ بعض الذی حرام علیکم میں اشارہ کیا گیا ہے اور یہ فرق تورات کی تصدیق کے منافی نہیں ہے جیسے ہم آج قرآن کو ماننے اور صرف اسی کے احکام کو ماننے کے باوجود محمدؐ نہ تمام کتب سماویہ کے من عند اللہ ہونے کی تصدیق کرتے ہیں۔

اصل ارشاد فقینا آیا ہے یہ لفظ فقہاء کے معنی گردن کے چھبے حصہ کو کہتے ہیں۔ فقینہ اور قضیت ب۔ اور قضیت بہ معنی غرہ سب کے معنی چھبے چھلنے اور نقش قدم پر چھلنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان ہی انبیاء کے نقش قدم پر جو تورات کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔ ہم نے حضرت عیسیٰ کو روانہ کیا۔ یعنی ان کی شریعت بھی تورات ہی تھی اور حضرت عیسیٰ کو ہم نے انجیل دی۔ حضرت مسیح اور انجیل دونوں تورات کی تصدیق کرتے تھے۔ یہ تصدیق

جی من جملہ علامات نبوت ایک حتی جس طرح ایک ہی درخت کے برگ و بار میں مماثلت ہوتی ہے اسی طرح اس مقدس گروہ کے افراد میں ایک دوسرے کی تصدیق میں ہم آہنگی ہوتی ہے۔ ان میں ہر ایک دوسرے کی تصدیق کرتا ہے اس میں بھی یہودیہ طرز ہے کہ ان کو زمانہ کرتے اپنی بے بصیرتی کا ثبوت دیا ہے احساس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ حضرت مسیح کو قتی یا مذہب کے نہیں مانتے تھے بلکہ وہی ایک دین جو پچھلے انبیاء کا متفقہ دین تھا مسیح کا بھی دین تھا اور اسی کی طرف ان کی دعوت تھی۔ تورات کی اصل تعلیمات میں سے جو کچھ ان کے زمانے میں محفوظ تھا اس کو مسیح خود بھی مانتے تھے اور انجیل بھی اسی کی تصدیق کرتی تھی۔ چنانچہ اس انجیل میں بھی ہے کہ

یہ نہ سمجھو کہ میں تورات کو منسوخ کرنے آیا ہوں، منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں۔
متی باب ۵ آیت ۱۷، ۱۸

یہاں انجیل کے بارے میں اور پچھلے تورات کے بارے میں یہ ایک جملہ آیا ہے کہ فیہ ہدی و فوہ کہ تورات میں ہدایت اور روشنی ہے اور انجیل میں ہدایت اور روشنی ہے۔ دو باتیں الگ الگ ہیں ایک کسی چیز کا ہدایت و روشنی کے لیے ظرف ہو گا اور دوسرے کسی چیز کا بہانے ظرف ہونے کے خود ہدایت اور روشنی ہونا۔ دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ اتنا ہی فرق ہے ایک کسی کے لیے رحمت کا ظرف ہونا اور کسی کا خود رحمت ہو جانا۔ دوسرے انبیاء کے لیے رحمت ظرف ہے اور خلائقا ہر فی رحمتنا اور حضور کی ذات گرامی خود سراپا رحمت ہے اس میں اشارہ ہے کہ قرآن سے پہلے ہر کتاب اور حضور انور سے پہلے ہر نبی اسلام کے باغ میں درخت کی اور مکان میں کمرے کی حیثیت رکھتے تھے جس کتاب کو اسلام کا پورا باغ اور پورا مکان اور جس ذات کو ساری بارات کا دھارا بنا کر روا دیا گیا ہے وہ قرآن حکیم اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اسی لیے جیسے قرآن کو سراپا ہدایت اور رحمت اور نور کہا ہے ایسے ہی حضور انور کو رحمت للعالمین کہی اور نور کہا ہے اس میں اشارہ ہے کہ قرآن اور محمد رسول اللہ جو کچھ لے کر آئے ہیں وہ مکمل اور ان کے ذیلیے دین الہی اپنے تمام اصول و فروع کے لحاظ سے پایہ تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور انور سے پہلے آنے والوں میں سے ہر ایک نے یہی کہا کہ اس کے بعد ایک اور کتاب اور نبوت آئے گی جو اللہ کے دین کی تکمیل کرے گی چنانچہ تورات کہتی ہے کہ حضرت موسیٰ سے خدا نے فرمایا۔

میں ان کے بھائیوں سے تمہارا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور تم کچھ میں سے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا۔

اور انجیل میں ہے :

لیکن وہ غرق قیظہ احمد، پاکیزگی کی مدح ہے جسے آپ خدا میرے نام سے
 نبیجے گا۔ وہی تمہیں سب چیزیں سکھائے گا اور سب باتیں جو میں نے تم سے کہی
 ہیں یاد دلاتے گا۔ یوحنا ۱۴: ۲۶۔

آخر وہ نور، ہدایت، رحمت آیا اور دعویٰ کیا کہ میں بُر ہائی ہوں، نور ہوں، ہدایت ہوں، اور
 رحمت للعالمین ہوں۔ میری کتاب نور میں ہے رحمت ہے ہدایت کا طرہ ہے اور آخر زمانہ قربت
 کے ختم پر وحی الہی نے آپ کی زبان سے یہ اعلان عام کیا۔

الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی۔

اسی تکمیل کا یہ آخر تھا کہ آپ نے یورو بعض سخت فقہی احکام کو حجاز کی سخت گیری کے لیے ان پر
 عائد تھے۔ اور اصل دین ابراہیمی میں داخل نہ تھے۔ یا انسانوں کے اصناف اور تصرفات تھے بدل کر
 ایسے مناسب اور آسان احکام عطا کیے جو ہر زمانہ کے لیے موزوں ہو سکتے ہیں۔ اسی لیے آپ نے
 کسی اپنے بعد میں آنے والے پیغمبر کی پیشین گوئی نہیں کی، نہ کسی نئے کلام کے نزول کی خبر دی۔ نہ کسی
 نئی شریعت کا منتظر کیا کہ سرِ اُپا شریعت، نور رحمت ہونے کے بعد کسی نئے آنے والے، کسی نئے
 کلام اور کسی نئی شریعت کی گمانش کنہاں؟ اور اسی بنا پر قرآن نے ہر جگہ ما انزل من قبلك پر
 ایمان لانے کی تاکید کی اور ما انزل من بعدك کے قبول کرنے کا کہیں اشارہ تک نہیں کیا۔

اور یہاں، انجیل کے تعارف میں یہ جو فرمایا ہے حدی دہم عظمتہ للتقین قریر تورات و انجیل کے
 باہمی فرق کی طرف اشارہ ہے کہ تورات محض قانون ہے اور انجیل محض اخلاق ہے۔ تورات کا مہل
 حادثہ انتقام پر مبنی ہے اس کا حکم ہے۔

جو انسان ملوٹلے گا یا مار ڈالا جائے گا ۱۰۰۰ اور اگر کوئی اپنے بھائی کے پھوٹ
 لگائے سو جیسا کہے گا ویسا پائے گا۔ توڑنے کے بدلے توڑنا، آنکھ کے بدلے
 آنکھ، دانت کے بدلے دانت (اجاب)

اور انجیل کی تعلیم سر تا سرِ عفو ہے۔

تم سن لیجئے ہو کہ کہا گیا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت
 پھر تمہیں میں کہتا ہوں کہ ظالم کا مقابلہ کرنا بلکہ جو تیرے دلہنے گال پر تھپڑ مارے
 دوسرا گال بھی اس کی طرف پھیر دے۔ (متی)

قرآن کی اہل انجیل کو تنبیہ

۱۱۸۔ اور انجیل والوں کو اسی کے مطابق فیصلہ کرنا چاہیے جو اللہ نے نازل کی اور جو کوئی اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا تو یہی لوگ فاسق ہیں۔ یا تو عیسائی جو نزول کے وقت موجود تھے ان کو یہ حکم دیا گیا تھا اسی کو یہاں نقل فرماتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ نزول قرآن کے وقت جو میلان مخاطب تھے ان سے کہا گیا ہو کہ جو کچھ انجیل میں اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے اس کے موافق ٹھیک ٹھیک حکم کریں یعنی ان پیشین گوئیوں کو چھپانے یا انکو اور مہمل تاویلات سے بدلنے کی کوشش نہ کریں جو انجیل میں پیغمبر آخر الزماں اور مقدس فارقیط کی نسبت حضرت مسیح کی زبانی کی گئی ہیں۔ یہ خدا تعالیٰ کی سخت نافرمانی ہوگی کہ جس بادی جلیل اور مصلح اعظم کے متعلق حضرت مسیح نہ فرمائیں کہ ”مجبور وہ روح حق آئے گی تو تمہیں سچائی کی ساری راہیں بتائے گی۔ اسی کی تکذیب پر کمر بستہ ہو کر اپنے لیے ابدی خسران قبول کرو۔“ کیا مقدس مسیح اور اس کے پروردگار کی فرمانبرداری کے یہ ہی معنی ہیں یہ

مطلب یہ ہے کہ اہل انجیل کو انجیل دیتے وقت ہم نے کہا تھا کہ اپنے احوال و ظروف کو انجیل کی تراوی میں رکھ کر توالیس درجہ فاسق ہوں گے۔ اس صورت میں اصل عبارت یوں ہوگی۔ قلنا لیحکمہ اهل الانجیل الہم اور یا مطلب یہ ہے کہ اب ان سے کہا جا رہا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نیت کے باوجود میں اہل انجیل کو فیصلہ انجیل کی روشنی میں کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس وقت یہی پیش پا افتادہ مسئلہ ہے اور لفظ فاسق یہاں لغوی اصطلاح میں عادل کے مقابلہ پر نہیں ہے بلکہ خدا سے غدا ری، عمدہ ٹھکنی اور سرکش کے معنی میں ہے۔ قرآن میں پڑھ چکے ہو۔

الفا سقین الذین ینقضون عہد اللہ من بعد میثاقہ

فاسق وہ ہیں جو اللہ کے عہد کو مضبوط کرنے کے بعد توڑتے ہیں

لفظ فاسق قرآن کے مصطلحات میں سے ہے، درجہ آخر لغت بکھتے ہیں کہ فاسق کے استعمال کی قرآن نے پہلے عربی زبان میں عادت نہ تھی۔ فیروز آبادی فرماتے ہیں کہ عرب جاہلیت کے نظم و نثر میں عربی ہونے کے باوجود لفظ فاسق کا استعمال نہیں ہوا ہے۔ اور ابن الاعرابی

نے کہا ہے کہ زما زجاہیت کے ادبی ذخیرے میں لفظ غاسق نہیں ہے۔ فن بحیثیت فعل
 بے ہاں چیزوں کے لیے ضرور استعمال ہوتا تھا لیکن بحیثیت اسم غاسق کا استعمال کلام عرب
 میں انسان کے لیے نہیں ہے۔

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ
وَمُهَيِّئًا عَلَيْهِمْ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ
عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ لِكُلِّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا وَلَوْ شَاءَ
اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَكِنْ لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ فَاسْتَبِقُوا
الْخَيْرَاتِ إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيهِ
تَخْتَلِفُونَ ۖ وَأَنْ أَحْكَمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ
أَهْوَاءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ أَنْ يَفْتِنُوكَ عَنْ بَعْضِ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ
إِلَيْكَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فاعْلَوْا زَمَّائِرُ يَدِ اللَّهِ أَنْ يُصِيبَهُمْ بِبَعْضِ
ذُنُوبِهِمْ وَإِنَّ كَثِيرًا مِنَ النَّاسِ لَفَاسِقُونَ ۝ اَلْحُكْمُ
الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ حُكْمًا لِقَاؤِ يُوقِنُونَ ۝

اور ہم نے تمہاری طرف پہنچی کے ساتھ کتاب اتاری ہے ان
کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو سامنے موجود ہیں اور ان پر

نگہبان، لہذا تم ان کے درمیان خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ کرو اور جو حق تمہارے پاس اچھا ہے اس سے ہٹ کر ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو۔ تم میں ہر گروہ کے لیے ہم نے ایک شرعہ اور ایک منہاج مقرر کر دی۔ اور اگر خدا چاہتا تو تم سب کو ایک اُمت بنا دیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اور اس لیے نہیں کیا تاکہ جو کچھ اس نے تمہیں دیا ہے اس میں تمہیں آزمائے۔ لہذا نیکی کی راہ میں ایک دوسرے سے اُگے بڑھو، تم کو بالآخر اللہ ہی کی طرف پلٹ کر جانا ہے، پھر وہ تمہیں ان باتوں کی حقیقت بتائے گا جن میں تم اختلاف رکھتے تھے، اور اے پیغمبر، ہم نے تمہیں حکم دیا ہے کہ جو کچھ خدا نے اتارا ہے اس کے مطابق ان لوگوں کا فیصلہ کرو اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو، اور ان کی جانب سے پوچھنے رہو،

کہیں تمہیں اس قانون کے کچھ حصہ سے نہ بچلا دیں جو اللہ نے نازل کیا ہے۔^{۱۳۴} پس اگر یہ لوگ روگردانی کریں تو جان لو کہ اللہ کا ارادہ یہی ہے کہ ان کے کچھ گناہوں کی وجہ سے ان پر افتاد آئے اور یہ واقعہ ہے کہ ان لوگوں میں اکثریت نافرمانوں کی ہے۔^{۱۳۵} اگر لوگ اللہ کا حکم نہیں چاہتے ہیں تو کیا جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں، اور ایمان و یقین والوں کے لیے اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟^{۱۳۶}

قاضی کا چہرہ

دنیا میں وقتاً فوقتاً انبیاء کے ذریعے پیغام آتے رہے ہیں۔ موسیٰ تو رات بے کر آئے اور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک خاص زمانہ اور قوم کے لیے اور وقتی تھے اور اس لیے ان کی دائمی حفاظت کا سامان نہ ہوا۔ ان کی اصل برباد ہو گئی، مدتوں کے بعد مرتب کیے گئے اور ان میں تخریفیں کی گئیں۔ ان کے ترجموں نے ان کو کچھ سے کچھ بنا دیا۔ ان کی تاریخی مذکا کوئی ثبوت باقی نہیں۔ بہت سے جعلی پیغام ان میں شریک کر دیے گئے۔ اگر خدا کا کام معلومت اور حکمت سے خالی نہیں ہوتا ہے تو ان کا ٹٹنا اور برباد ہونا ہی ان کے وقتی فرمان اور عارضی تعلیم ہونے کا ثبوت ہے لیکن ہم پیغام حضور اور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے آیا وہ یقین ہو کر آیا دائمی اور عالمگیر ہو کر آیا اسی لیے وہ جب سے آیا اب تک پوری طرح محفوظ ہے اور سب سے گامزن اس کے بعد کوئی نیا پیغام آنے والا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے

کسی گزشتہ پیغام کے بارے میں یہ نہیں فرمایا کہ اس کی تکمیل نہ ہو چکی ہے اور ان تمام تعلیمات پر جس کو ہم پچھلے آسمانی کتب میں دی گئی تھیں اس کے اندر ان کو محفوظ کر دیا ہے اور وہ ان پر نگہبان ہے۔ یہ صرف قرآن کے بارے میں فرمایا ہے۔ دنیا کے وہ تمام صحیفے جو گم ہو چکے ہیں ان کا گم ہونا بھی ان کے دائمی اور عارضی ہونے کی دلیل ہے اور جو موجود ہیں ان کی ایک ایک آیت تلاش کر لو ان کی تکمیل اور حفاظت کے وعدہ کے متعلق ایک حرف نہ پاؤ گے بلکہ اس کے خلاف ان کے نقص کے اشارے اور تصریحات ملیں گی۔

تورات میں ہے

یہ وہ برکت ہے جو موسیٰ مرشد اپنے مرنے سے پہلے بنی اسرائیل کو بخشی اور اس نے کہا کہ خداوند یسوعا کیلہ اور مسیح کے ان پر طلوع ہوا اور خدایان کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا اور اس کے چہرے ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت ہوگی۔

(استثنا ۲۰، ۲۳)

اس سے معلوم ہوا کہ تورات آخری اور دائمی پیغام کی حیثیت سے نہیں آتی تھی اور یہ تمام پچھلے صد اوتوں کی نگہبان اور محافظ نہ تھی۔ انجیل اعلان کرتی ہے:

میں اپنے باپ سے درخواست کروں گا کہ وہ تمہیں دوسرا فارقیط بخشے گا کہ ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گا۔ (یوحنا ۱۴، ۱۶)

اس سے پتہ لگ گیا کہ انجیل خدا کا آخری پیغام اور دائمی نہیں اور دوسری صد اوتوں کی نگہبان تر کی وہ خود کامل بھی نہیں ہے۔

یہ صرف قرآن ہے جو اپنے بارے میں اعلان کرتا ہے کہ وہ پچھلی تمام صد اوتوں کا محافظ اور نگہبان ہے اور کامل ہے، آخری پیغام ہے، سب کے لیے ہے اور ہمیشہ ہمیش کے لیے ہے۔ قرآن نے کسی آیت میں کسی بدالے فرامیے پیغام کے لیے یہ کہہ کر دھمکیاں عید نہ کوئی جگہ نہیں چھوڑی ہے اسی لیے حفاظت کی وتر داری خود خدا نے لی ہے۔

۱۱۹۔ اور ہم نے تمہاری طرف سچائی کے ساتھ کتاب اتاری یہ ان کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو مٹنے موجود ہیں اور ان پر نگہبان۔ ہمیں کے کسی معنی بیان کیے گئے ہیں۔ امین خاتہ مساکم محافظ و نگہبان اور ہر معنی کے اعتبار سے قرآن کریم کا کتب سابقہ کے لیے یمن ہونا صحیح ہے۔ خدا

کی ہولناکت قورات و انجیل وغیرہ کتب سماویہ میں ودیعت کی گئی تھی وہ مع شے نازلہ قرآن میں محفوظ ہے جس میں کوئی خیانت نہیں ہوئی ہے اور جو بعض فروعی چیزیں ان کتابوں میں اس لئے بیان مخصوص منطہین کے حسبِ حال تھیں ان کو قرآن نے نسخ کر دیا اور جو حقائق ناقص تھیں ان کی تکمیل فرما دی ہے اور جو حصہ اس وقت کے اعتبار سے غیر بہم تھا اسے بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔
اس آیت میں قرآن کا چہرہ پیش کیا جا رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ یہ کتاب چار اوصاف کا حامل ہے، اول یہ کہ اللہ کی جانب سے ہے۔

دوم یہ کہ اس کا نزول بالحق ہوا ہے یعنی یہ کتاب بجاتے خود سچی اور ہر شک و شبہ سے بالایک حقیقت، قولِ فیصل اور انٹ ہیمنے والی ہے۔

تیسرے یہ کہ وہ گزشتہ کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے یعنی یہ بتانے والی ہے کہ وہ بھی منزلِ منزل ہیں اس تصدیق سے ان کتابوں کی تحریفات کی تصدیق ہرگز لازم نہیں آتی۔ اس آیت میں قرآن کی تصدیق کی حیثیت بتاتے ہوئے یہ نہیں فرمایا کہ قرآن اپنے سامنے موجود کتابوں کی تصدیق کرتا ہے، بلکہ فرمایا کہ قرآن الکتاب کی تصدیق کرتا ہے۔ اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ قرآن اور وہ تمام کتابیں جو مختلف زمانوں اور متفرق زبانوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں سب کی سب فی الاصل ایک ہی کتاب ہیں ایک ہی ان کا مصنف ہے، ایک ہی ان کا مدعا اور مقصد ہے، ایک ہی ان کی تعلیم ہے اور ایک ہی علم ہے جو ان کے ذریعے سے نوعِ انسانی کو عطا کیا گیا ہے۔ فرق اگر ہے تو عبارات کا ہے جو ایک ہی مقصد کے لیے مختلف منطہین کے لحاظ سے مختلف طریقوں سے امتیاز کی گئیں۔ بس حقیقت صرف اتنی نہیں ہے کہ یہ کتابیں ایک دوسرے کی مخالف نہیں موجد ہیں تہذیب کرنے والی نہیں مصدق ہیں بلکہ اصل حقیقت اس سے بڑھ کر ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ سب ایک ہی الکتاب کے مختلف ایڈیشن ہیں۔

چہام یہ کہ قرآن بغیر کتابوں پر مبنی ہے۔ عربی میں مبین کے معنی مخالفت، انگریزی، شواہد، اہانت، اند اور حمایت کے ہیں۔ قرآن کہ الکتاب پر مبنی کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے ان تمام برحق تعلیمات کو جو پہلے آسمانی کتابوں میں دی گئی تھیں اپنے اندر محفوظ کر لیا ہے وہ ان پر نگہبان ہے اس معنی میں کہ اب ان کی تعلیمات برحق کا کوئی حصہ ضائع نہ ہونے پائے گا وہ ان کی مود ہے

اس معنی میں کہ ان کتابوں کے اندر خدا کا کلام جس حد تک موجود ہے قرآن سے اس کی تصدیق ہوتی ہے وہ ان پر گواہ ہے اس معنی میں کہ ان کتابوں کے اندر خدا کے کلام اور لوگوں کے کلام میں جو آمیزش ہو گئی ہے قرآن کی شہادت سے اسے چھڑ جھانٹا جاسکتا ہے جو کچھ ان میں قرآن کے مطابق ہے وہ خدا کا کلام ہے اور جو قرآن کے خلاف ہے وہ لوگوں کا کلام ہے۔

مصدق اور ہمیں ان دو صفات کے لانے سے قرآن عزیز کی دو چیزوں کو اجاگر کرنا ہے۔ ایک یہ کہ پہلی کتابوں کے سائے مضامین اس کے اندر آگئے اور اس میں جمع ہیں، دوسرے یہ کہ قرآن ان کتابوں پر بطور نگران کے بھی کام لے گا۔ یعنی ان کی تحریکات و تصرفات کے لیے ایک کوئی کام بھی کام لے گا۔ اسے ذرا اس طرح سمجھئے کہ جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت یہ پیغام یعنی قرآن دنیا میں آیا تو اس نے خدا کے سب دینوں کی عظمت از سر نو زندہ کر دی۔ سب رسولوں کا احترام کرنا فرض و لازم قرار دیا۔ حضرت عیسیٰ کے منکر کو اسی طرح کافر ٹھہرایا جیسا کہ حضور انور کے منکر کو اس نے پہلے ہیوں کے سر پر تختیں لگادی گئی تھیں تھیں و تنقید کی روشنی میں ان کو غلط ثابت کیا۔ خدا کی مقدس کتابوں میں سازشوں کا انکشاف کیا اور اس طرح ان کی عظمت رفتہ کو از سر نو قائم کیا۔ اس نے پہلے رسولوں سے کٹ کر ادا پہلے دینوں کو جو بنا کر کسی نئے دین کی دعوت نہیں دی بلکہ اسی حقیقت کی طرف بلایا جس کی انبیاء دعوت ہمیشہ دیتے تھے۔ تورات یہ نہیں کہتی کہ انجیل کو زنا اور راجیل یہ نہیں کہتی کہ تورات غلط ہے۔ قرآن کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ تورات و انجیل خدا کی نازل کردہ کتابیں نہیں ہیں بلکہ وہ اپنے ماننے والوں پر یہ بھی لازم قرار دیتا ہے کہ تم ان کتابوں کو بھی خدا ہی کی تصور کرو۔ قرآن یہ نہیں کہتا کہ میرے سوا کسی رسول پر ایمان نہ لاؤ بلکہ سب پہلے وہ خدا کے مقدس رسولوں کی عظمت کا سکروں میں جاتا ہے۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ جو کتاب اپنے مہمن ہونے کا دعویٰ رکھتا ہے اسے ایسے ہی تعلیمات کا مجموعہ بن کر آنا چاہیے جس میں تمام عالم کے لیے یکساں ہادویت موجود ہو اور زمانہ ہاضمی میں کسی صداقت پر عمل کرنے والے کی تفسیل نہ کرتا ہو اور آج جب اپنی طرف دعوت دے تو یہ کہہ کر دعوت دے کہ تم میری دعوت کی اپنی کتاب سے تصدیق کر لو۔ قرآن ان سے کسی ایسی بات کا مطالبہ نہیں کرتا جو ان کی کتابوں کے خلاف ہو۔ وہ مطالبہ کرتا ہے تو یہ کہ تم نے صحیح طور پر حضرت عیسیٰ کا مقام نہیں سمجھا۔ حضرت موسیٰ کی شخصیت کو ٹھیک نہیں سمجھا، تورات و انجیل کی صحیح تعلیمات تم نے حاصل نہیں کی۔ تم ایک فرضی عیسیٰ ایک سوہوم موسیٰ، ایک خود تراشیدہ تورات و انجیل پر ایمان رکھتے ہو اور مجھے مان لو میں تمہارے رسولوں اور تمہاری کتابوں کی تعلیمات کا محافظ بن کر رہا ہوں۔

قرآن خدا کی تمام صفات کو اپنے دامن میں جمع کیے ہوئے نازل ہوا ہے۔ کیا وہی صداقت اگر تورات میں ہو اور انجیل میں ہو تو قابل پذیرائی ہے اور وہی اگر قرآن میں ہو تو قابل انکار ہو سکتی ہے۔ وہی رسول جس کی بشارت تورات اور انجیل میں ہو تو قابل انتظار ہو اور اسی کی آمد کو قرآن بتاتے تو قابل قبول ہو۔ پھر صرف ان چند مسائل کی بنا پر جو کہنا ہے ہی لیے تخفیف کہتا ہے ہی لیے سہولت کا ذریعہ ہے یہ صداقت یہ حقیقت کہ ہے۔ ایسی عالمگیر تعلیم، جذبات سے اتنی خالی فرقہ پرستی اور تعصب سے اتنی دور گزشتہ اور موجودہ ادیان سماویہ کا اتنا احترام سکھانے والی، پھر مزیجات زمانہ کے لیے اتنی مناسب اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے ایک ایک شوشے کے ساتھ اتنی محفوظ۔ اگر قرآن سے پہلے کوئی کتاب الہی دانستہ اور نادانستہ تحریفات اور تصرفات سے پرے طور پر بری نہیں رہی۔ لاکھوں انبیاء میں سے چند کے سوا کسی کا صحیفہ دنیا میں باقی نہیں رہا۔ اور جو باقی ہے وہ فنا ہو کر نئے قالب میں بدلتا رہا ہے تورات جل جل کر خاک ہوئی، پھر ان سوسختہ اوراق سے تحریر کی گئی اور ترجموں کی تحریفات سے اپنی اصل کھو بیٹھی۔ انجیل میں تو بلیف و جعل تو اسی زمانے میں شروع ہو چکا تھا۔ پھر ترجموں کی کتب یونانی نے حقیقت بالکل مشتبہ کر دی۔ زردشت کا صحیفہ سکندر کی نذر ہوا۔ ان کتابوں کا یہ حال اس لیے ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو زمین محفوظ رکھا اور آخری کتاب بنا کر نہیں جیجا تھا۔ اسی بنا پر ان کی دائمی حفاظت کا وعدہ نہیں کیا گیا لیکن قرآن کی نسبت پہلے یہ دعویٰ ہوا نزلنا الیک الکتاب بالحق مصداقاً لما بین یدیک من الکتاب و محییٰ علیہ اور یہ وعدہ ہوا کہ انا نحن نزلنا الذکر و انا له لحافظون۔ اور یہ بھی اعلان کیا گیا کہ اس حق میں کسی باطل کی آمیزش کبھی راہ نہ پاسکے گی و انہ کتاب عزیز لا یاتیہ الباطل من بین یدیک و لا من خلفہ اس کتاب کو عزیز فرمایا گیا یعنی جو اپنے پروردگار کو اپنے دلائل کے زور سے پھٹاڑے گی۔ باطل نہ اس کے سامنے سے اس میں مل سکتا ہے اور نہ پیچھے سے یعنی نہ لفظ و عبارت کی طرف سے اور نہ حقیقت و معنی کی طرف سے۔

امت اسلامیہ کی ذمہ داری

۱۲۰۔ لہذا تم ان کے درمیان خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ کرو اور جو حق تھا اسے پاس آچکا ہے اس سے ہٹ کر ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو۔ یہود میں باہم کچھ نزاع ہو گئی تھی ایک فریق جن میں ان کے بڑے مشہور علما۔ اور مقتدر شامل تھے۔ آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور فصل نزاع کی درخواست کی اور یہ بھی کہا کہ آپ کو معلوم ہے کہ عموماً قوم یہود ہمارے

اختیار و اقتدار میں ہے۔ اگر آپ فیصلہ ہمارے موافق کر دیں گے تو ہم مسلمان ہو جائیں گے اور ہمارا اسلام لانے سے جمہوریہ یسود اسلام قبول کر لیں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رشتہ کو قبول کیا اور ان کی خواہشات کی پیروی سے صاف انکار فرمادیا۔ اس پر یہ اذیت نازل ہوئی (ابن کثیر رحمہ اللہ) یہ قرآن سے متعلق محمد و میثاق کی ایک دفعہ ہے، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے آپ کی اُمت سے لیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس میں کتاب حق و باطل کی کسوٹی اور احکام الہی کا قابل اعتماد مجموعہ ہے تم لوگوں کے درمیان اسی کے مطابق فیصلہ کرو۔ اس سے ہرگز مغرب ہو کر منافقین اور یہودی طواغیت و بدعات کی پیروی نہ کرو۔ اس آیت میں یہ بات بالکل واضح طور پر فرمائی گئی ہے کہ قرآن کو چھوڑ کر کسی اور کتاب کے مطابق فیصلے کرنا نسخ ہے خواہ یہ کتاب قرأت ہو یا ابن سبیل۔ یعنی اہل کتاب کا انکار اسلام میں ٹھیک دہری حیثیت رکھتا ہے جو دوسرے کافروں کے انکار کی ہے اور نہ اس کی بھی دونوں کے ایک ہیں۔ قرآن نے اہل کتاب یسودی اور عیسائیوں کے لیے اس طرح کی کوئی گنہائش نہیں رکھی ہے کہ وہ اسلام کے بھگتے اپنے ہی دین پر قائم رہ سکتے ہیں۔ پھر یہ بات اتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ لو کہان موسیٰ حینا ماد سبھا ۷۱ اتنا ہی اگر موسیٰ زندہ ہوتے تو ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا کہ میری پیروی کریں۔ یہ ارشاد نہوت مسئلہ کو اس حد تک واضح کر دیتا ہے جس کے بعد وضاحت کا کوئی درجہ باقی نہیں رہتا ہے۔ جس نبی کی حیثیت یہ ہو کہ وہ کہے انبیاء اگر اچھ کر مٹنے میں مرسود ہوتے تو وہ بھی اسی کے امتی اور پیروکار بننے اور ان کی لائی ہوئی کتابوں کی پیروی کی گنہائش جب خود ان کے لیے باقی نہیں ہے تو قرآن کی پیروی کی ذمہ داری اور ضرورت سے بھلا کوئی عام انسان کیسے منشی ہو سکتا ہے؟ اور جب قرآن کی موجودگی میں نبیوں کی لائی ہوئی کتابوں کی پیروی نہیں کی جا سکتی اور ان کی پیروی قرآن کی نظر میں اتباع ہو رہا ہے تو پھر غیر انبیاء مثلاً دانشور، وکلاء، زعماء، قومی اسمبلی کے ممبران۔ ملک کے حکام اور حکومت کے انتظامی اہلکار عدلیہ کے ججوں اور گورنروں کے بندے ہوتے تو انہیں مضبوط کی پیروی کی، قرآن کی کجاءات سے بچ سکتا ہے اور ان کے مطابق قرآن کو نظر انداز کر کے معاملات کا فیصلہ کرنا کب ہوا ہو سکتا ہے اس آیت میں قرآن سے جہٹ کر قرأت و ابن سبیل کے مطابق معاملات کے فیصلہ کرنے کو قرآن نے اتباعِ اہل ہوا، خواہشوں کی پیروی کہا ہے۔ اس کے ذریعے قرآن نے ایک اصولی مسئلہ رکھا ہے

اور وہ یہ کہ جب تمہارے عمل کے لیے الحق خدا کی جانب سے قرآن کی ضرورت میں آپکا ہے تو اب پہلی کتاب سے بحث کرنا ہی غلط ہے ظاہر ہے کہ اگر پہلی کتابوں کو قائم رکھنا مشاور ہوتا تو ضرور ان کو محفوظ بھی رکھا جاتا لیکن جب محفوظ نہیں رکھا گیا تو معلوم ہو گیا کہ آئندہ قدرت کو اس پر عمل دیا نہ بھی منظور نہیں ہے۔ شرائع سماوی کو سب حق تھیں مگر تعریف کے بعد ان میں بہت باطل داخل ہو چکا ہے جو ماحولم ہے۔ اب اس سے بحث کا حاصل یہی ہے کہ اگر تصدیق کرتے ہو تو باطل کی تصدیق کا احتمال ہے اور مکذیب کرتے ہو تو حق کی تکذیب کا احتمال ہے۔ اس لیے جب عمل کے لیے ایک راہ موجود ہے تو پھر اس گرواب میں پھنسنے کی ضرورت ہی کیا ہے اور اگر تسلیم ہی کر لیا جائے کہ ان میں تخریف نہیں ہوتی تو بھی ہر صداقت پر عمل کرنا اسی وقت موجب سبھات ہو سکتا ہے جبکہ وہ وقت کی کتاب بھی ہو اگر اس کی سبھائے دوسری کتاب آپکی ہے تو اب پہلی صداقت پر عمل کرنا وقتی کتاب کی توہین ہوگی۔ اگر دین صرف اپنی ملت پر ہوتا تو شریعت اور کتاب کی حاجت نہ ہوتی اور جب کتاب کی ضرورت تسلیم ہے تو صرف کسی صداقت کا صداقت ہونا سبھات کے لیے کافی نہیں ہے جب تک کہ اس کا وقتی ہونا بھی ثابت نہ ہو جائے، ہر صداقت کا شریعت ہونا لازمی نہیں ہاں ہر شریعت کا صداقت پر مبنی ہونا ضروری ہے اس لیے یہ محض ایک بے بنیاد خیال ہے کہ جب سب ادیان سماویہ حق ہیں تو ان پر عمل کرنا بھی سبھات کے لیے کافی ہونا چاہیے جس دور میں خود کو کسی علیہ السلام کو وقت کی صداقت پر عمل کرنا ضروری ہے اس میں تورات کا ذکر بے معنی ہے۔

کیا یہ آیت منافی عصمت ہے؟

حیرت ہے کہ اس قدر واضح بات کو جو اس آیت میں بتائی گئی ہے لوگوں نے کچھ سے کچھ بنایا کتنی صاف بات ہے اور کیسی بے عذر ہے کہ اس حق کو نظر انداز کر کے لوگوں کی خواہشات کے دیکھے نہ دیو۔ حضرت مولانا عثمانی شیخ الاسلام نے اس پر سیر مامل بحث کی ہے آپ بھی متغیر ہو کر دیکھتے ہیں کہ گزشتہ ان آیات کی جو شان نزول ہم لکھ چکے ہیں اس سے صاف عیاں ہے کہ آیت کا نزول بعد اس کے ہوا کہ آپ ان کی خوشی اور خواہش پر چلنے سے ڈنکار فرما چکے تھے تو یہ آیات آپ کی استقامت کی تصریح اور آئندہ بھی ایسی ہی شان عصمت پر ثابت قدم رہنے کی تاکید کے لیے نازل ہوئیں۔ جو لوگ اس قسم کی آیات کو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شان عصمت کے خلاف تصور کرتے ہیں وہ منہایت ہی قاصر اعظم ہیں اول تو کسی چیز سے منع کرنا اس کی دلیل نہیں کہ جس کو منع

کیا ہر ایسے وہ اس موضوع پر کلام کا ارتکاب کرنا چاہتا تھا، ثانیاً انبیاء علیہم السلام کی معصومیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی معصیت ان سے صادر نہیں ہو سکتی یعنی کسی کام کو یہ سمجھتے ہوئے کہ خدا کو ناپسند ہے ہرگز اختیار نہیں کر سکتے۔ اور اگر اتفاقاً کسی وقت بھول چوک یا سناٹے و اجتہاد کی غلطی سے راجح و افضل کی جگہ مرجوح و منضول کو اختیار کر لیں یا غیر مرضی کو مرضی سمجھ کر عمل کر لیں جس کو اصطلاح میں نہی لہ کہتے ہیں تو اس طرح کے واقعات مستحکمیت کے منافی نہیں جیسا کہ حضرت آدم اور بعض دیگر انبیاء علیہم السلام کے واقعات شاہد ہیں، اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد دلائل متبع احوال و احادیث سے ملتی ہیں اور احادیث سے ملتی ہیں ان یفتنون عن بعض ما نزل اللہ الیک اور اسی طرح کی دوسری آیات کا مطلب سمجھنے میں کوئی غلطی نہیں رہتا کیونکہ ان میں صرف اس پر متنبہ کیا گیا ہے کہ ان معنوں کی طبع کاری اور سخن سازی سے قطعاً متاخر نہ ہوں اور کوئی ایسی رائے قائم نہ فرمائیں جس میں بلا قصد ان کی خواہشات کے اتباع کی صورت پیدا ہو جائے مثلاً اسی قصہ میں جو ان آیات کی شان نزول ہے یہ بڑے نے کیسی عیاذ اور پُر فریب صورت حضور کے سامنے پیش کی تھی کہ اگر آپ ان کے حسبِ مشا فیصلہ کر دیں تو سب یہود مسلمان ہو جائیں گے وہ جانتے تھے کہ اسلام سے بڑھ کر دنیا میں کوئی چیز آپ کے نزدیک محبوب اور عزیز نہیں۔ ایسے موقع پر امکان تھا کہ بڑے سے بڑا مستقیم انسان بھی یہ رائے قائم کرے کہ ان کی چھوٹی سی خواہش قبول کر لینے میں جبکہ اتنی عظیم الشان دینی منفعت کی توقع ہو رہی ہے اس طرح کے خطرناک منزلۃ الاقدام موقع پر قرآن حکیم حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو متنبہ کرتا ہے کہ دیکھو بھول کر بھی کوئی ایسی رائے قائم نہ کر لیجئے جو آپ کی شانِ رفیع کے مناسب نہ ہو حضور کا کمال تقویٰ اور انتہائی فہم و تدبیر تو نزولِ آیت سے پہلے ہی ان ملامین کے کمر و فریب کو روک چکا تھا لیکن فرض کیجئے اگر ایسا نہ ہو چکا ہوتا تب بھی آیت کا مضمون جیسا کہ ہم تقریر کر چکے ہیں حضور کی شانِ عصمت کے اصلاً مخالف نہیں۔

ہر اہمیت کے لیے شرع اور منہاج

۱۲۱۔ تم میں سے ہر گروہ کے لیے ہم نے ایک شرح اور ایک منہاج مقرر کر دی۔ یعنی خدا نے ہر اہمیت کا ائین و دستور کار اس کے احوال و استعداد کے مطابق جدا جدا رکھا ہے اور باوجودیکہ

تمام انبیاء اور رسل سماویہ اصول دین اور مقاصد کلیہ میں جن پر سمجھاتِ ابدی کا مدار ہے، باہم متحد اور ایک دوسرے کے مصدق ہیں۔ پھر بھی جزئیات و فروع کے لحاظ سے ہر امت کو ان کے ماحول اور مخصوص استعداد کے موافق خاص احکام و ہدایات دی ہیں۔ اس آیت میں اسی فردی اختلاف کی طرف اشارہ ہے۔ صحیح بخاری کی ایک حدیث میں جو سب انبیاء عظیم السلام کو آپس میں عطا کی جاتی تھیں، ہے جن کا آپ ایک ہر اور مائیں مختلف ہوں اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ اصول سب کے ایک ہیں اور فروع میں اختلاف ہے اور چونکہ ہر قوم کی تولید میں کچھ فاعل و مفعول اور ماں قابل اور حمل فاضل بنتی ہے اس سے نہایت لطیف اشارہ اس طرف ہے کہ فروع کا اختلاف منطہ بین کی قابلیت اور استعداد پر مبنی ہے ورنہ مبادی فاضل میں کوئی اختلاف و تعدد نہیں ہے سب شرائع و قوانین سعادۂ کامر چہشمہ ایک ہی ذات اور اس کا علم ازلی ہے۔ ۱۵۔

در اصل یہ استیفاء بیانی ہے اور مخاطبوں کے ذہنوں میں اٹھنے پر تے سوال کا تذکرہ ہے سوال یہ ہے کہ اگر قرآنِ تورات و انجیل ایک ہی صداقت کی دعوت ہیں اور قرآنِ تمام پچھل صداتوں کا مصدق ہے تو پھر شرائع و احکام میں اختلاف کیوں ہے اس کیوں ہوا ہے کہ عبادات کی صورتوں میں حلال و حرام کی قیود میں اور قوانین تمدن و معاشرت کے فروع میں مختلف انبیاء کی شریعتوں میں اختلاف ہے۔

واقعی قرآن کی یہی تعلیم ہے کہ اسلام اسی ایک دین کا نام ہے جو آدم سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک باری باری پیغمبروں کے ذریعے آتا رہا۔ یہ قرآن کا بتایا ہوا راز ہے کہ دین الہی ہمیشہ سے ایک تھا ایک رہا اور ایک رہے گا۔ فرد معرفت ایک ہے خواہ وہ کتنی ہی مختلف شکل و رنگ کی قدریوں میں روشن ہو۔ اصل دین میں سارے پیغمبروں کی تعلیم یکساں تھی، ایک ہی دین تھا جس کو ملے کر اول سے آخر تک سارے انبیاء آتے رہے۔ اس میں زمان و مکان کے تغیر کو دخل نہ تھا اور نہ قوم و ملک کے اختلاف سے اس میں کوئی اختلاف پیدا ہوا۔ وہ ہر زمانہ اور مقام میں یکساں آیا اور وہاں کے پیغمبروں نے اس کی یکساں تعلیم دی۔

یہ دائمی حقیقت اور یکساں تعلیم کیا ہے؟ یہ مذہب کے اصل اصول ہیں یعنی خدا کی ہستی، اس کی توحید، اس کے صفات کا ملکہ، انبیاء کی بعثت، خدا کی خالص عبادت، حقوق انسانی، اخلاق فاضلہ، اچھے

اور بڑے اعمال کی باز پرس اور جزا و سزا یہ وہ بنیادی اصول ہیں جن پر تمام مذاہبِ حق کا اتفاق ہے۔ اگر ان میں کسی جہت سے کوئی اختلاف ہے تو طریقہ تعبیر کی غلطی ہے یا ابھرے ہوئے اگر اس تعلیم میں کوئی تیزیش ہوئی ہے۔

دوسری چیز جس کو قرآن نے شرع اور منہاج کہا ہے وہ جزئیاتِ احکام اور منفعت مقصد کے حصول کے جدا جدا راستے ہیں جو ہر قوم و مذہب کی زمانی و مکانی خصوصیات کے سبب سے بدلتے رہتے ہیں مثلاً عبادتِ الہی، ہر مذہب کا جزو لازم ہے لیکن طریق عبادت میں تمثلاً تمثلاً اختلاف ہر آسمانی مذہب میں موجود ہے۔ عبادت کے لیے کوئی خاص سمت ہر مذہب نے مقرر کی ہے۔ اسی طرح اعمالِ قیوم کا اسناد تمام مذاہب کا منفعت نصب العین ہے مگر اس کے اسناد کے بستے اور طریقے جدا جدا، غرض یہ راستے اور طریقے مختلف ہیں مگر ان کے زمانے میں اگر اصلاح و تبدیلی کے قابل پائے گئے تو بدلتے رہے مگر اصل دین بجز ان کی کمالی اور ابتدائی طاقت ہے ناقابل تبدیلی اور ناقابل تغیر رہا ہے۔

انبیاءِ عظیم اسلام کا وقتاً فوقتاً ظہور اسی ضرورت سے ہوتا رہا کہ وہ اسی ازلی وابدی صداقت کو ہمیشہ اہل دین کے سامنے پیش کرتے رہیں اور دین کو اس کے اصلی مرکز پر ہمیشہ قائم رکھیں اور ساتھ ہی اپنی اپنی قوم و ملک اور زمانہ کے حالات کے مطابق خاص احکام و جزئیات جو قوم کے مناسب حال ہوں وہ اس کو بتائیں اور سکھائیں۔

اس آیت میں یہی انکشاف کیا گیا ہے کہ ہم نے ہر جماعت کے لیے ایک شرع اور منہاج مقرر دی ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ ایک دین مقرر کیا کیونکہ دین تو سب کا ایک ہی ہے۔ اس میں تعدد اور تنوع نہیں ہو سکتا۔ البتہ شرع اور منہاج سب کے لیے یکساں نہیں ہو سکتے تھے۔ ضروری تھا کہ ہر مہم اور ہر ملک کے احوال و ظروف کے مطابق مختلف ہوں لہذا انبیاء کی دعوتوں کا اختلاف اصل کا اختلاف نہیں ہے محض فروع کا اختلاف ہے۔

آیت کا یہ ٹکڑا اپنے سیاق و سباق کی روش سے اہل کتاب سے رواداری کے اظہار کے لیے نہیں بلکہ ان کے رویہ سے بیزاری کے اظہار کے لیے ہے۔

یہاں مکمل سے مراد وہی تین گروہ ہیں جن کا شروع سے ذکر آ رہا ہے۔ یعنی مسلمان، یہودی اور عیسائی۔ فرمایا کہ ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے الگ الگ شرع اور منہاج مقرر کیا ہے۔ شرع اور منہاج سے مراد شریعت کا وہ ظاہری ڈھانچہ اور قالب ہے جو دین کے متعلق کو بروئے کار لانے کے لیے ہر مذہب میں اختیار کیا گیا ہے مثلاً عبادت ایک منظر ہے جس کی واقعات صورت

مختلف مذاہب میں نماز روزہ قربانی اور حج کی مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ بعض حقائق کے لیے قالب خود اللہ سبحانہ نے مقرر فرمایا ہے اور بعض کے لیے اللہ تعالیٰ کے حکم سے نبی نے مقرر فرمایا ہے شہادتِ الٰہی کی رعایت سے آیت میں شرم اور منہاج کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

وحدتِ دین اور قرآن

اس سے یہ بات بھی واضح ہو کر سامنے آگئی کہ وحدتِ دین کا قرآنی منشا کیا ہے یہ اور صرف یہ کہ جس تک دین کے حقائق کا تعلق ہے وہ ہمیشہ سے غیر متغیر ہیں اور غیر متغیر رہیں گے اور اس معاملہ میں انبیاء میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یعنی اصل دین ایک ہی دین ہے جو تمام انبیاء نے پیش کیا لیکن وہ بعد کر ان کے پیروں کی گھٹاوت میں تحریف و تصرف کی وجہ سے بگڑا رہا۔ اسی دینِ ازل کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے اور اسی کا نام اسلام ہے جو اپنے صحیفہ کی بقا و حفاظت، دین کی تکمیل اور نبرت کے اتمام کی وجہ سے ہمیشہ قائم اور باقی رہے گا۔ اگر تمام مذاہب سابقہ اپنے اپنے اصل دین پر ابائی جس کی تعلیم ان کے پیغمبروں نے دی تھی تو وہ ہی دینِ ازل ہو گا جس کا نام اسلام ہے اور نبیؐ ابراہیمی، موسوی، عیسوی اور محمدی میں سوائے اجمال و تفصیل کے کوئی فرق نہ رہے گا۔

قرآن کے پیش کردہ وحدتِ دین کے نظریہ کا یہ مرکز مفہوم نہیں ہے کہ سارے مذاہب سچے ہیں۔ بسنی خدا تک پہنچانے والے ہیں اور سب کے سب آخرت کی فلاح و نجات کا یکساں ذریعہ ہیں۔ یہ وحدتِ دین نہیں وحدتِ ادیان ہے یقیناً قرآن وحدتِ دین کا قائل ہے مگر وحدتِ ادیان کو قطعاً تسلیم نہیں کرتا۔ اگر یہ بات قرآن کے نزدیک صحیح ہوئی کہ سارے دین سچے ہیں اور ہر رسول کی پیروی یکساں طور پر سچی ہے تو اس کا بالکل منطقی تقاضا یہ تھا کہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم یہود و نصاریٰ کو اسلام لانے کی دعوت دیتے کیونکہ وہ خود صاحبِ کتاب تھے۔ اور اگر دعوت دیتے بھی تو کم از کم اسلام لانے کے مطالبہ پر اصرار تو کسی طرح نہ کرتے۔ اس کے برعکس آپ ان سے صرف یہ کہتے کہ تورات و انجیل کی مصلحت نہ پر دی کرو۔ میں تم سے صرف یہ چاہتا ہوں اپنی نبرت کے تسلیم کرنے اور قرآن کی پیروی کا تم سے کوئی مطالبہ نہیں کرتا لیکن عاری دنیا جانتی ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ آپ نے انہیں بھی اسلام لانے کی اسی طرح دعوت دی جس طرح عرب کے مشرکوں کو دی تھی اور ان کے لیے اپنی پیروی کو ویسا ہی ضروری قرار دیا جیسا کہ ان کے لیے ضروری قرار دیا تھا۔

یا ایہا الذین آتوا الکتاب آتسوا بما نزلنا مصداقاً لما معکم

اے دو لوگو جن کو کتاب دی گئی رہمان لاؤ اس کتاب پر جو ہم نے آمادی ہے۔ اور

جو اس کتاب کے عین مطابق بھی ہے جو تمہارے پاس ہے۔

نہ صرف یہ کہ قرآن نے ان کو اسلام لانے کی دعوت دی بلکہ ان میں سے جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا انہیں صاف لفظوں میں کفر کا مرتکب اور دوزخی سٹی کہ بعض منہات پر تو ان کے اس انکار اسلام کو صرف کفر ہی نہیں بلکہ بدترین کفر اور انہیں کافر ہی نہیں بلکہ پکا کافر الکافرون حقا کہا ہے۔ ان کے جس طرز عمل پر الکافرون حقا کا فتویٰ لگایا گیا ہے وہ صرف یہ تھا کہ وہ جہاں دوسرے انبیاء کو اللہ کے رسول اور دوسرے کتابوں کو اللہ کی کتاب مانتے تھے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول اور قرآن کو اللہ کی کتاب نہ مانتے تھے۔ قرآن عزیز نے ایک اور جگہ اہل کتاب کے اس انکار اسلام کا تذکرہ اور پھر اس پر اپنا تبصرہ ان لفظوں میں کیا ہے۔

وإذا قيل لهم آمنوا بما أنزل الله قالوا فؤادنا يؤمن بالله وآياته وإن سلطاننا لا ياتينا به فقل لهم فإنه ليس يؤمنون

مکمل ون پما وسرا دک

دعوت اسلام کے جواب میں وہ یہ جو کہتے تھے اسے خود سے دیکھئے۔ یہ ٹھیک وہی فلسفہ تھا جو آج وحدتِ ادیان کے منظر پر کی بنیاد ہے۔ یعنی یہ کہ جب ہمارے پاس بھی خدا ہی بھیجا ہوا دین ہے تو کیا اس پر ایمان رکھنا اور اس کی پیروی کرنا کافی نہیں ہے۔ آخر پھر کسی اور چیز کو اپنانا ہمارے لیے ضروری کیوں ہو۔ وہ اپنی جگہ حق یہ اپنی جگہ حق۔ لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ ان کے اس فیصلے کو اللہ تعالیٰ نہ صرف یہ کہ صحیح نہیں کہا بلکہ اسے صاف طور پر کفر کا فلسفہ قرار دیتا ہے اور انہیں یہ بھی حق وہ بھی حق کہنے کے باوجود اصل حق کا منکر کافر ٹھہراتا ہے اس لیے آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ

سائے خدا ہب بچے ہیں بسعی خدا تک پہنچانے والی راہیں ہیں اور سب کے سب خیرت کی فلاح و نہایت کا یکساں ذریعہ ہیں۔ یہاں قرآن نے ایک خاص ترتیب کے ساتھ مختلف دعوتوں کا ذکر کیا ہے ذکر حضرت موسیٰ کی تورات سے شروع ہوتا ہے انا انزلنا التوراة فیہا ہدی و نور پھر حضرت مسیح کے ظہور کا ذکر کیا جاتا ہے شہہ فہینا علی انارہ بعد یعنی ابن مریم حضرت مسیح کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ظہور ہوا و انزلنا الیلک الکتاب پھر ان مختلف دعوتوں کے ذکر کے بعد وہ لوگوں کو مخاطب کرتا ہے نکل جعلنا منکم شرعہ و منها جاس میں پوری انسانیت کو مخاطب کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ ہم نے تم میں سے ہر امت کے لیے ایک شریعت اور منہاج مقرر کی تھی۔ ہر امت اپنے دور میں اپنی شریعت کی حامل تھی۔ امت موسیٰ سر تھیلی

کے ظہور تک شریعت موسیٰ کی حامل اور علم برابری تھی اور یہی اس کی شریعت تھی۔ اُمتِ عیسیٰ اپنے زمانے میں محمد رسول اللہ کے زمانہ ظہور تک حضرت عیسیٰ کی شریعت، انجیل کی حامل اور ذمہ دار تھی۔ اور اب تم سب محمد رسول اللہ کے ظہور کے بعد اُمتِ محمد پر اور تمہاری شریعت قرآن ہے لہذا اس پر ایمان لاؤ اس میں یہودی، عیسائی بلکہ ساری انسانیت برابر ہے۔

اختلافِ شریعت تقاضا حکمت ہے

۱۲۲۔ اور اگر خدا چاہتا تو تم سب کو ایک ہی اُمت بنا دیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اور اس لیے نہیں کیا کہ جو کچھ تمہیں دیا ہے اس میں تمہیں آزمانے یعنی کون تم میں خدا کی مالکیت مطلقہ، علم عظیم اور حکمتِ الٰہی پر یقین کر کے ہر نئے حکم کو حق و صواب سمجھ کر بطورِ عذر و غبت قبول کرنا ہے اور ایک وفادار غلام کی طرح ہر جدید حکم کے سامنے گردن جھکا دینے کو تیار رہنا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ بلاشبہ یہ ممکن تھا کہ شروع ہی سے تمام انسانوں کے لیے ایک ضابطہ مقرر کر کے سب کو ایک اُمت بنا دیا جاتا۔ لیکن وہ فرق جو اللہ تعالیٰ نے مختلف دنیا کی شریعتوں کے درمیان لکھا ہے اس کے اندر دوسری مصلحتوں کے ساتھ ایک بڑی مصلحت یہ بھی تھی کہ اللہ تعالیٰ اس طریقہ سے لوگوں کی آزمائش لینا چاہتا تھا جو لوگ اصل دین اور اس کی رُوح اور حقیقت کو سمجھتے ہیں اور دین میں ان ضوابط کی حقیقی حیثیت کو جانتے ہیں اور کسی تعصب میں مبتلا نہیں ہیں، وہ حق کو جس صورت میں بھی وہ آئے گا پہچان لیں گے اور قبول کر لیں گے ان کو اللہ کے پیچھے ہوسنے سابقہ احکام کی جگہ بعد کے احکام تسلیم کرنے میں کوئی تاثر نہ ہو گا۔ بخلاف اس کے کہ جو لوگ دین کی رُوح سے بیگانہ ہیں اور ضوابط اور ان کی تفصیلات ہی کو اصل دین سمجھتے ہیں اور جنہوں نے خدا کی طرف سے آئی ہوئی چیزوں پر خود اپنے حسیے چڑھا کر ان پر جمود اور تعصب اختیار کر لیا ہے وہ ہر اس ہدایت کو رد کرتے چلے جائیں گے جو بعد میں خدا کی طرف سے آئے۔ ان دونوں قسم کے آدمیوں کو تمیز کرنے کے لیے یہ آزمائش ضروری تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے شرائع میں اختلاف رکھا۔

آیت کا مطلب یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ہم نے تم میں سے ہر طبقہ کے لیے ایک خاص شریعت اور

خاص طریق عمل بنایا ہے جس میں اصول مشترک اور مشفق علیہ ہونے کے باوجود فردی احکام میں کچھ اختلاف بمصلحت ہوتے ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو اس کے لیے کچھ مشکل نہ تھا کہ تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا سب کی ایک ہی کتاب ایک ہی شریعت ہوتی لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو اس لیے پسند نہیں کیا کہ لوگوں کی آزمائش مقصود تھی کہ کون لوگ ہیں جو عبادت کی حقیقت سے واقف ہو کر ہر وقت گوش برآواز دیتے ہیں کہ حکم ملے اس کی تعمیل کریں۔ جو نئی کتاب یا نئی شریعت آئے اس کا اتباع کریں اور پہلی شریعت و کتاب ان کو کتنی ہی محبوب ہو اور آباتی مذہب ہونے کی وجہ سے اس کا ترک کرنا ان پر کتنا ہی شاق ہو مگر وہ ہر وقت گوش برآواز طاعت کے لیے تیار رہتے ہیں۔ اور کون ہیں جو اس حقیقت سے غافل ہو کر کسی خاص شریعت یا کتاب کو مقصد بنائیں مثلاً اور اس کو ایک آباتی مذہب کی حیثیت سے لیے ہوئے ہیں اس کے خلاف کسی حکم خداوندی پر کان نہیں دھرتے ہیں۔

اور یہ بھی مطلب بتایا گیا ہے کہ اللہ نے ہر امت کے لیے شرع اور منہاج الگ بنائے ہیں اگر وہ چاہتا تو سب کو ایک ہی منہاج دیتا لیکن اس کی حکمت کا یہ تقاضا ہوا کہ منہاج کی اس تبدیلی کو لوگوں کے امتحان کا ذریعہ بنائے اور دیکھے کہ کون حق کا طالب بنتا ہے اور کون صرف لیکر کا فقیہ اور رسوم و ظواہر کا غلام بن کر رہ جاتا ہے۔ اللہ عقل، اختیار اور شریعت کی جو نعمت دیتا ہے اس میں وہ لوگوں کا امتحان کر رہا ہے کہ کون ان نعمتوں سے فائدہ اٹھاتا ہے ان کی قدر کر رہا ہے ان کے منفرد قشر میں امتیاز رکھتا ہے اور کون بالکل اندھا بہنو بن کر محض ہم کا پیماری بن کر رہ گیا ہے۔

یہ بھی لکھا ہے کہ اگر خدا چاہتا تو تمام نوح انسانی کو ایک ہی امت بنا دیتا مگر تم دیکھ رہے ہو کہ اس نے ایسا نہیں کیا۔ الگ الگ تو ہیں، الگ الگ احوال ہوتے، الگ الگ ضرورتیں ہوتیں۔ بس ضروری تھا کہ فروع اور ظواہر کے طور اور دھنگ بھی الگ ہوں۔

ہم نے بالا زدہ یہاں سب بزرگوں کی تشریحات نقل کر دی ہیں۔ یہ سب تشریحات اپنی جگہ بالکل برعمل اور سہا ہیں۔ مگر پڑھنے والا ان کو پڑھ کر یہ تاثر لیتا ہے کہ شرائع کا یہ اختلاف شاید ایک ہی جگہ اور ایک ہی وقت میں رونما ہوا ہے اور گویا مدینہ میں پہلے وائے مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کو قرآن مخاطب کر کے ان کے بالفعل یا بھی اختلاف کی یہ توجیہ پیش کر رہا ہے اور

لے معاہدۃ القرآن م سس لے تدبر قرآن لے ترجمان القرآن۔

تیار ہوا ہے کہ تمہارے درمیان یہ اختلاف اس لیے ہے کہ اللہ تمہیں آزمانا چاہتا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ کتنا بڑا ناسخہ کہ صورتِ حال یہ نہیں ہے بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ قرآن اپنے مخاطبوں کے گورۂ لہجہ میں یہ بات ڈالنا چاہتا ہے کہ اے انسانو! اگر خدا تمہیں ایک شریعت والی ایک امت بنا چاہتا تو ہاں دیتا۔ اس طرح کہ تمام انسانوں کو دروازہ ہی ایک ہی طرح کی طبیعت ایک ہی طرح کی استعداد اور ایک ہی طرح کی فکری و عملی حالت پر بنادیتا۔ تمہارے اخلاق ایک ہوتے، تمہارے اطوارِ معیشت ایک ہوتے اور ہر زمانے کے انسانوں کے احوال و ظروف میں کیسانی اور ہم آہنگی برتی اور اس طرح ہر دور میں شریعت و قانون بھی ایک ہی ہوتا۔ لیکن خدا نے ایسا نہیں کیا۔ اس کی حکمت کا یہی فیصلہ ہوا کہ انسان تمام مخلوقات میں ایک ممتاز نوع ہو جو اطوارِ حیات میں بدرجہ ترقی کرے۔ نیکے برصغیر کی استعداد اور ہر طرح کی راہ اس کے سامنے کھلی ہوئی ہے اسی تنوع استعداد کے نتیجہ میں ارتقاء کا تنوع رونما ہوا۔ چھکڑے سے ترقی کر کے رائٹ چلائے۔ انفرادی زندگی سے نکل کر بین الاقوامی زندگی اختیار کرے۔ اسی ارتقاء کا نتیجہ ہے کہ انسانی زندگی کے مختلف اطوار میں شریعتیں مختلف آتی رہی ہیں۔ انسانیت کے پچھنے میں جو شریعت تھی وہ یقیناً انسانیت کے لڑکپن میں نہ تھی اور جو لڑکپن میں شریعت تھی وہ انسانیت کی جوانی میں نہیں ہے اور جو جوانی میں تھی وہ لہجہ رشد و کمال کے زائے میں نہیں ہے۔ اب جبکہ پوری انسانی زندگی رشد و کمال کے آخری مرحلہ میں داخل ہو چکی ہے اس لیے ایک ایسے خاتم الشرائع خاتم الکتاب اور خاتم الانبیاء کی ضرورت تھی جو اس ترقی یافتہ دنیا کی ضروریات کی کفالت کر سکے۔ چنانچہ ہمیشہ کے لیے وحی کا دروازہ بند کر کے دنیا کو وحی کے بدلے اجتہاد پر مبنی شریعت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے ملی ہے۔

آیت میں یہ لیسو کہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ اس سے تمہاری استعداد اور صلاحیت کے مطابق ایک مصنف کا معاملہ کرتا ہے اور اس کا یہ امتحانی معاملہ اولیں مخاطبوں سے ہو رہا ہے یعنی پوری دنیا کو چھوڑ کر تمہیں جو بین الاقوامی شریعت کی نعمت عطا کی ہے۔ اس میں تمہارا امتحان مقصود ہے کہ تم کہاں تک اس میں پورے اترتے رہو۔ اور یا مطلب یہ ہے کہ ساری مخلوقات کو چھوڑ کر جو اس شریعت کو اپنانے کی ذمہ داری نوعِ انسانی پر جمی انسانیت اور ملکیت کا مجوں ہونے کی وجہ سے ڈالی گئی ہے اس سے مقصود تمہارا امتحان ہے۔ اللہ جیسے اپنے تمام شانوں میں نزالاً جے مثل اور بے نظیر ہے۔ اسی طرح ابتلاء و امتحان کا جو فعل خدا کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ اس امتحان سے ہو ایک مخلوق دوسری مخلوق کا پلٹی ہے قطعاً مختلف ہے اور اس کو مختلف ہونا چاہیے۔

باقی رہا یہ سوال کہ اللہ کی طرف منسوب ہونے کی صورت میں ابتلا و امتحان یا آزمائے جانے کے ان الفاظ کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ یہ بھی ایسی بات نہیں جو سمجھ میں نہ آئے۔ آخر سب جانتے ہیں کہ قرآن میں ایک جگہ نہیں متعدد مقامات پر بار بار مختلف الفاظ میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ انسانی زندگی کی کوئی خاص حالت و کیفیت ہی نہیں بلکہ جس زندگی کو ہم زمین پر گزار رہے ہیں۔ یہ پوری کی پوری زندگی ہی ابتلا و امتحان ہے خلق الموت والحیاء لیبطلکم عنکم احسن عملاً۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ زندگی کا کوئی خاص پہلو اور خاص رُخ ہی نہیں بلکہ پوری زندگی ہی امتحان و ابتلا کی زندگی ہے اور یہ کیا ہے۔ تمام اُفاق کائنات کے مقابلے میں انسانی فطرت میں خواہ وہ کسی رنگ میں ہو۔ دو ماہوں میں سے کسی ایک راہ یا دو پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کے انتخاب و اختیار کرنے کی جو خصوصیت رکھی گئی ہے دراصل فطرت کے اسی اقتضا کے صحیح استعمال کے مطالبہ کی دوسری تعبیر ہے کہ آدمی کی پوری زندگی ہی ابتلا و امتحان کی زندگی ہے۔ کتنا یہ چاہنا ہوں کہ خدا کی طرف ابتلا و امتحان کے الفاظ منسوب کرنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ جن باتوں کو خدا نہیں جانتا وہ امتحان لے کر جان لے بلکہ مطلب یہ ہے کہ انسانی فطرت میں اقتدار و اختیار، انتخاب و ترجیح کی برتوت رکھی گئی ہے اسی قوت کے صحیح استعمال کا مظاہرہ ہو جائے۔ یہ پوری دُنیا امتحان گاہ ہے۔ حکومت و اقتدار مال و دولت سب کچھ یہاں پر چر امتحان میں۔ آیت قرآنی میں مائیکہ یعنی شریعت محمدیہ کو پرچہ امتحان بنایا ہے یگانوں کے لیے بھی اور یگانوں کے لیے بھی۔ یگانوں کے لیے اس طرح کہ کون مانتا ہے اور کون نہیں مانتا اور یگانوں کے لیے اس طرح کہ ماننے کے بعد کوئی برتا ہے اور کون نہیں برتا۔

خیر میں پیش رفت مقصود شریعت ہے

۱۳۳۔ نیک کی راہ میں آگے بڑھو تم کو یا خیر اللہ ہی کی طرف پلٹ کر آنا ہے پھر وہ ہمیں تہاتے کا دن باتوں کی حقیقت جن میں تم اختلاف رکھتے تھے۔ یعنی شرائع کے اختلاف کو دیکھ کر خواہ مخواہ کی قیلا قال اور کج بحثوں میں پڑ کر وقت نہ گزراؤ، وصول الی اللہ کا ارادہ کرنے والوں کو عملی زندگی میں رہتی دُور و صوبہ دشمنی چاہیے اور جو عقائد، اخلاق اور اعمال کی خوبیاں آسمانی شریعت پیش کر رہی ہے اس کے لینے میں ہمتی دکھانی چاہیے اور انہم کا خیال کہ کس حسنت و خیرات کی تحصیل میں مستعدی دکھانی چاہیے۔ اخلافاات کی سب حقیقت وہاں جا کر کھل جائے گی۔ لے

مطلب یہ ہے کہ جب موردِ حال یہ ہے کہ شریعت سے اصل مقصود نیکیوں کی فراہمی ہے اور وہ اسی طرح حاصل ہو سکتی ہیں کہ جس وقت جو حکم ظاہر اس کی پیروی کی جاتے۔ لہذا جو لوگ اصل مقصد پر نگاہ رکھتے ہیں ان کے لیے شرائع کے اختلافات اور مناجات کے تنوع پر جھگڑا کرنے کے بجائے صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ مقصد کی طرف اس راہ سے پیش قدمی کریں جس کو اللہ تعالیٰ کی منظوری حاصل ہو جو اختلافات انسانوں نے اپنے جہود و تعصب، ہٹ دھرمی اور ذہن کی دہلیز سے خود پیدا کر لیے ہیں ان کا آخری فیصلہ نہ مجلسِ مناظرہ میں ہو سکتا ہے نہ میدانِ جنگ میں۔ آخری فیصلہ اللہ تعالیٰ خود کرے گا جبکہ حقیقت بے نقاب ہو کر لوگوں کے سامنے آ جائے گی۔

اصل ارشادِ فاسخِ الحقائق ہے فاکے دہیے یہ اپنے ماقبل سے مربوط ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر صورتِ حال وہی ہے جو سن چکے ہو کہ تمہیں بھی سابقہ اُمتوں کی طرح شریعت و مناجات سے کر رہا دیکھا ہے تو پھر نیکیوں کی راہ میں تمہیں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ تمہیں اُمتوں کی ہمارے تماشائی کے لیے نہیں بلکہ خیرات کی فراہمی کے لیے رہا دیکھا ہے۔ خیرات کا لفظ سب خوبیوں کا جامع ہے اس میں اخلاقی قدیر، اجتماعی قدیر اور حسانی قدیر سب کچھ ہوئی ہیں یہ نہیں فرمایا کہ نیکی کرو بلکہ فرمایا کہ نیکیوں اور بھلائیوں کے کاموں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی فکر کرو یہ گویا اشارہ ہے کہ جو منصب تمہیں دیا گیا ہے اس کی ذمہ داریوں سے تم صرف ذاتی نیکی سمجھنے بلکہ اجتماعی نیکی کے ذریعے عہدہ برآ ہو سکتے ہو۔

قرآن نے دوسری جگہ یہ بتاتے ہوئے کہ نبوت کو قرآن اگر وحی کے ذریعے ملتا ہے تو اس اُمت کو جسے اللہ نے نبوت کے کام کے لیے منتخب کیا ہے۔ قرآن نبوت سے وراثت کے ذریعے ملتا ہے، ارشاد ہے :

ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا

پھر ہم نے وارث بنایا اس کتاب کا ان لوگوں کو جن کو ہم نے اپنے بندوں میں سے منتخب کیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ مسلمان پروری نزعِ انسانی میں چھانٹ کر اس کام کے لیے منتخب کیے گئے ہیں کہ وہ کتاب اللہ کے وارث ہوں اور حضورِ مصلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے کراؤں۔ یہی امانت کا

وہ منصب جلیل ہے جس کا ذکر قرآن میں شملہ علی الناس میں کیا گیا ہے۔ یہ بتانے کے بعد یہ بھی انکشاف فرمایا ہے کہ اس وراثت کو پانے والے تین قسم کے مسلمان ہوں گے۔

فمنہم طائفہ لنفسہ و منہم مقتصد و منہم سابق بالخیرات
بإذن اللہ ذلک خیرا بفضل الکبیر۔

ظاہر معنی وہ لوگ جو قرآن کو سچے دل سے اللہ کی کتاب اور محمد رسول اللہ کو ایمان داری کے ساتھ اللہ کا رسول مانتے ہیں مگر عطا نبوت کے علم و عمل کی پیر دی کا حق نہیں ادا کرتے۔ بعض میں مگر افغانستان میں۔ مقتصد میاں درویشی وہ لوگ جو ذراں برادر ہیں مگر اپنی ذات کی حد تک اور سابق بالخیرات وہ لوگ ہیں جو ذاتی طور پر نیکیاں کرتے ہیں اور جو کچھ مانتے ہیں اسے دنیا سے منانے کے لیے سرحد کی بازی لگا رہے ہیں۔ یہی دراصل امامت کا حق ادا کرنے والے ہیں۔ یہ نبوت کے لئے ہوتے علم و عمل سے رشتہ استوار کرنے میں پیش پیش ہیں۔ اللہ سبحانہ کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچانے میں پیش پیش ہیں جن کی خاطر قربانیاں کرنے میں پیش پیش اور بھلائی کے ہر کام میں گرسے بہت حاصل کرنے کی فکر میں ہیں فاستبقوا الخیرات کچھ قرآن آیت سے کہہ رہا ہے کہ مقتصد کی لگن کا تقاضا یہ ہے کہ تم اپنی پوری طاقت سابق بالخیرات بننے پر لگا دو۔ اگر تم چاہتے ہو کہ امامت کا حق ادا ہو۔ اسی قسم کی بات البقرہ میں بھی فرمائی گئی تھی، وکل دھمتا ہوا فاستبقوا الخیرات۔ مطلب یہ ہے کہ قبلہ کا معاملہ صرف اسلام ہی کی خصوصیت نہیں ہے دنیا میں جو امتیں آتے ہی ہیں سب ہی کا قبلہ ایک نہ ایک رہا ہے تو پھر قبلہ کے موضوع کو بحث و جدال کا موضوع بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اصل نظر تو واحد پر ہونی چاہیے اور مقصد ہی کے پیش نظر محنت اور کوشش کرنی چاہیے۔ اسی طرح یہاں فرمایا ہے کہ شریعت اور منہاج کو موضوع بحث بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ دنیا میں نبیوں کی جو امتیں آتی رہی ہیں ہر امت کو شریعت اور منہاج ملتا رہا ہے اور اب امتیں بھی یہ نعمت ملی ہے۔ تمہاری نظر محنت اور کوشش پر ہونی چاہیے اور تمہیں تو نیکیاں فراہم کرنے کے لیے ایک دوسرے سے اچھے بڑھنا چاہیے۔ بات ناقص رہ جاتے گی۔ اگر ہم یہاں یہ بتائیں کہ الامان اندلس نے تصریح کی ہے۔ کہ یہاں استیاق سابق کے معنی میں ہے یعنی انفرادی اور ذاتی عمل کا مطالبہ نہیں بلکہ اجتماعی عمل کا قرآن مطالبہ کر رہا ہے۔

خیرات میں مسابقت کا قانون

ادھر پھر بے قید استیاق کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ خیرات میں مسابقت کا مطالبہ کیا ہے۔ یعنی تم سے صرف

فعلِ خیرات مطلوب نہیں بلکہ افعالِ خیرہ میں پوری اُمت کے افراد کا اشتراک اور اس میں مسابقت مطلوب ہے۔ قرآن نے انبیاء کی اُمت کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا: **ادھینا الیہم فعل الخیرات** اس طرح یہ آیت قرآنی اہل ایمان کی اجتماعی فلاح کے لیے ایک دھنّا اصول فراہم کر رہی ہے کہ اُمتوں کو مسابقت کا جذبہ کامیابی اور عظمت کی راہ پر لگاتا ہے۔ مقاصد کی خاطر مسابقت کی کشش اُمتوں میں ان کی جدوجہد کا اصل محرک ہے۔ مسابقت ہی حیات ہے۔ انفرادی زندگی میں ہم روزانہ اس کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ کامیابی اور عزت ان ہی افراد کے حصہ میں آتی ہے جو مسابقت کا جذبہ رکھتے ہیں اور مقصد کے حصول میں زندگی کی دوسری دو کمپیوں کو قربان کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ وہ جسے اپنے مقصد کا شعور نہیں یا مقصد کی خاطر جذبہ مسابقت نہیں رکھتا کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ مسابقت ہی زندگی میں ترقی و تنہیم پیدا ہوتی ہے۔ اور انسانی قوتیں ایک مرکز پر جمع ہونے لگتی ہیں۔ قرآن نے اس آیت میں اُمت کو اس اسی قانون مسابقت کی طرف متوجہ کیا ہے۔ **خیرات** کا لفظ قرآن میں ان اعمال کے لیے استعمال ہوا ہے جن سے اخلاقِ حسنہ کی تکوین ہوتی ہے۔ گویا اُمت کا اُمت ہونے کی حیثیت سے نصب العین پر بتایا گیا ہے کہ خیرات میں مسابقت کی جائے اور اسی الخیرات میں بھرپور اور سر توڑ کوشش کی وجہ سے اُمت کو خیر اُمت کہا ہے۔ اشارۃً بنا دیا ہے کہ یہ اُمت انسانیت کے امن و سلام، مساوات و اخوت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی علمبردار اُمت ہے۔ اخلاقی اور معنوی خوبیاں اس کا جامعاتی اور قومی نشان ہیں۔

دامِ ہمرنگِ زمین

۱۲۴۔ اولے پیغمبر ہم نے تمہیں حکم دیا ہے کہ جو کچھ خدا نے اتارا ہے اس کے مطابق ان لوگوں کا فیصلہ کرو، اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو۔ اور ان کی جانب سے چرکنے دہو کہیں اس قانون کے کبھی حصہ سے نہ بچلا دیں جو اللہ نے نازل کیا ہے یعنی آپس کے اختلافات میں خواہ دنیا کیسی ہی دستِ بگریبا رہے آپ کو یہی حکم ہے کہ مّا نزل اللہ کے موافق حکم مٹیتے رہیں اور کسی کے کہنے سننے کی کوئی پروہ نہ کریں یہ دوسرے شارحین قرآن نے تو اس کو پہلے سے مربوط کیا ہے اور درمیان کے جملے کو جملہ معترضہ قرار دیا ہے۔ مثلاً یہ کہ اس کا عطف کتاب پر ہے اور البتہ اللہ تعالیٰ نے یہاں امرنا کہ

کو مسترد مانا ہے لیکن علامہ طبری کی رائے میں یہ فتنہ پہلے خاتم کے ساتھ مرہط ہے۔ ان کے درمیان اللہ کے قانون کے مطابق فیصلہ کیجئے اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کیجئے اور اب کہا جا رہا ہے کہ ان کے معاملات کا فیصلہ اللہ کے قانون کے مطابق کیجئے اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کیجئے اور مزید یہ کہ جو شیارہ پیسے کو مبادا وہ آپ کو قانون الہی کے کسی حصہ سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ یہاں حالتیں دو ہیں۔ ایک یہ کہ اہل ایمان غیر مسلموں کی وجہ سے خدا کے نازل کردہ شریعت سے دستبردار ہو جائیں۔ یہ ایک کھلی حالت ہے۔ دوسری حالت یہ ہے کہ اہل ایمان غیر مسلم شہریوں یا مسلمان غاصبوں کی سازش کا شکار ہو کر پورے قانون الہی سے تو نہیں کچھ سے دستبردار ہو جائیں اور یہ دستبرداری اسلام بیزار ہی کی بنا پر نہیں بلکہ اسلام سے ہمدردی کی بنا پر اختیار کر لی جاتی ہے۔ مثلاً یہ کہ غیر مسلم آبادی مسلمانوں کو اپنے مسلمان ہونے کی رشوت دے اور کہے مگر اسلام کے سیاسی اور فوجداری ضابطہ کو پس انداز کیا جاتے تو ہم مسلمان ہو جائیں گے فرمایا کہ یہ بہت بڑا فتنہ ہے۔ اس سے بچ کر رہنا، پہلی حالت غلط ہے اور اس سے بچنا ممکن ہے دوسری حالت دائم ہمرنگ زمین ہونے کی وجہ سے زیادہ خطرناک ہے۔ یہ مرحلہ کوئی آسان مرحلہ نہ تھا۔ مخالف قوتیں اس کی سرکردہ کرکشی کر رہی تھیں کہ تعزیری اور فوجداری ضابطہ کو چھوڑ کر اسلام کو پیش کیا جائے۔ یہ کون لوگ ہیں وہی جو مسلمان کا دباؤ پس کر بیویوں سے ملے ہوئے تھے اور ان سے کہتے تھے کہ

سنطیعکم فی بعض الامر

کچھ باتوں میں ہم تمہاری مان لیں گے۔

ان ہی کا قرآن نے آغاز میں من الذین قالوا انا بافوا احد ولس تو من قلوبہم کے الفاظ میں چھوڑ پیش کیا تھا۔ فتنہ کا لفظ خود بتا رہا ہے کہ یہ لوگ نہرت اور اہل ایمان کو کچھ اسلام سے ہٹانے کے لیے اپنا پورا زور صرف کر رہے تھے۔ اسی خطرے کی اہمیت کے پیش نظر پہلے پورے فقرے کو دہرایا ہے اور تاکید کر دی ہے کہ وہ خواہ کتنا ہی زور لگائیں اور کتنا دباؤ ڈالیں اور کہ ساغر شفا سیراغ دکھائیں اور کسی ملکی اور قومی مصلحتیں درمیان میں لائیں تمہیں ہر حال اللہ کے پورے قانون کو دنیا میں نافذ کرنا ہے۔

اس آیت پر سرسری نظر ڈال کر آگے نہ بڑھ جاؤ بلکہ اس کے ایک ایک لفظ پر غور کرو کہ قرآن کیا کہہ رہا ہے اور ہم کیا کر رہے ہیں علامہ محسن ہجو کا کہ عملی طور پر تو گویا پوری طرح ہم بعض مسائل سے دستبردار ہو چکے ہیں اور فکری طور پر بھی دین کی یہ ہمرگیری ایک جھولی بھری داستان بن چکی ہے۔

قانونِ الہی سے روگردانی کرنے والوں کو ڈانٹ

۱۲۵۔ بس اگر یہ لوگ روگردانی کریں تو جان لو کہ اللہ کا ارادہ یہی ہے کہ ان کے کچھ گناہوں کی وجہ سے ان پر افتادائے اوریہ واقعہ ہے کہ ان لوگوں میں اکثریت نافرمانوں کی ہے پوری سزا تو قیامت میں ملے گی لیکن کچھ قصور ہی سی سزا دے کر یہاں بھی مجرم کو زیادہ دوسرے دیکھنے والوں کو ایک گونہ تنبیہ کر دی جاتی ہے اور آپ ان لوگوں کے اعراض و اسخلاف کے زیادہ طول نہ ہوں دنیا میں فرمانبردار بندے ہمیشہ قصور سے ہی ہوتے ہیں و ما اکثر الناس دلوں صحت بموتین ملے

مطلب یہ ہے کہ آپ پورے مائزل الشہب جے رہیں۔ یہ اگر مائزل اللہ کو چھوڑ کر اپنے رسوم و رواج کے بناتے ہوئے گمراہی کے پیر دی پر اڑے ہے تو سمجھ لو کہ وہ وقت دور نہیں کہ اللہ ان کو ان کچھ جرائم کی پاداش میں جلدی سزا دے۔ ان کا یہ جرم کہ مقدمات کا فیصلہ اللہ کے قانون کے مطابق نہ کرنا اتنا سنگین جرم ہے کہ اس دنیا ہی میں ان کو اس کی سزا ملے گی۔ عام شارعیین قرآن تو یہی سمجھتے ہیں کہ یہ یہودی ہیں اور روایات تفسیری میں جو واقعات اور پس منظر بتاتے گئے ہیں وہ بھی یہی تاثیر دیتے ہیں کہ یہ یہودی ہیں لیکن اگر یہ ضابطہ درست ہے اور درست نہ ہونے کی وجہ کیا ہے جبکہ علماء کا طے کر دہ ہے کہ العیون للعلوم اللفظ لا لمخصوص السلب اعتبار تو قرآن کے عموم کا ہر گاہ خاص اسباب کا نہ ہو گا تو پھر قرآن کا سیاق و سباق یہ کتنا ہے کہ یہ ان تمام لوگوں کا حکم ہے جو قانونِ الہی کی موجودگی میں اپنے مفادات، اپنی مصالح کی وجہ سے وضعی قوانین کو اپناتے ہیں۔ اس جرم کی سنگینی کا اندازہ لگانے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ قرآن اس کو بعض ذنوب کہہ رہا ہے اور اس کی سزا کو وہ آخرت پر موقوف نہیں کرتا بلکہ دنیا ہی میں اس کی دھمکی دے رہا ہے۔ اگر ایک یہودی یہودی ہو کر اللہ کے قانون سے روگردانی کرتا ہے اس کی سزا یہ ہے تو ذرا غور فرمائیے ایک مسلمان مسلمان ہو کر اگر یہی جرم کرے تو پھر جرم کی سنگینی کیسی ہوگی۔ ان کو اگر دنیا میں اس جرم کی سزا ملے گی تو کیا اہل ایمان کو یہ سزا معاف کر دی جائے گی۔ ہم جیسے دوسروں کو سزا لینے میں سخی ہیں ایسے ہی اپنے کو رکھائیں جیتے میں بڑے فراخ دل ہیں

قانونِ الہی اور قانونِ وضعی کا تقابل

۱۲۶۔ اگر یہ لوگ اللہ کا حکم نہیں مانتے تو کیا پھر جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں اور ایمان و یقین والوں کے لیے اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کون ہو سکتا ہے۔ یعنی جو لوگ خدا کی خشنایا ہمت، رحمت و کرم اور علمِ عظیم پر یقین کامل رکھتے ہیں ان کے نزدیک دنیا میں کسی کا حکم خدا کے حکم کے سامنے مطلق التفات نہیں ہو سکتا پھر کیا یہ لوگ احکامِ الہیہ کی روشنی اُٹھانے کے بعد غنمی و اہلِ آؤر کفر و جاہلیت کے اندھیرے ہی کی طرف ہانا پسند کرتے ہیں۔

اس آیت میں اسلامی قانون کا غیر اسلامی قانون سے مقابلہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ اسلامی قانون اگر مائزل اللہ اور حکمِ اللہ ہے تو غیر اسلامی قانون حکمِ الجاہلیہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ کیا یہ لوگ اسلامی قانون سے روگردان ہو کر جاہلی قانون کے متلاشی ہیں۔ جاہلیت سے مراد غیر اسلامی قانون ہے۔ یعنی ہر ایسا قانون جو خدائی قانون کے مقابلے میں انسانی دماغ نے بنایا ہو ایک نے بنایا یا جماعت نے۔ اسلامی قانون سراسر مہم ہے کیونکہ اس کو ماننے والا خدا ہے جو تمام حقائق کا علم رکھتا ہے اور اس کے برعکس ہر وہ طریقہ جو اسلام سے مختلف ہو جاہلیت کا طریقہ ہے۔ قرآن کی زبان مائزل اللہ کے مقابلے میں جو نظام ہے وہ نظام جاہلیت اور اس دور کے مقابلے میں جس میں اسلام یعنی مائزل اللہ بروئے کار ہے۔ وہ دور دور جاہلیت ہے اور ان الکفار کے مقابلے میں جو مائزل اللہ نے بتائے ہیں، ہر فکر و فکر جاہلیت ہے۔ قرآن میں صرف حکمِ الجاہلیہ نہیں بلکہ علمِ الجاہلیہ، حقیقتِ الجاہلیہ اور تہجِ الجاہلیہ کی بھی مخالفت آئی ہے اس لیے جاہلیت وہ نظام قانون، نظامِ تہذیب اور وہ نظام تمدن ہے جو اسلامی قانون، اسلامی تہذیب، اور اسلامی تمدن کے مقابلے میں ہو۔ یہاں اسلامی قانون کے مقابلے میں غیر اسلامی قانون کو حکمِ الجاہلیہ کہا ہے۔ یہ طریق کار جمال و درجہ زمانے میں انسان اختیار کریں بہر حال جاہلیت ہی کا طرز عمل ہوگا۔ احادیث میں بھی جاہلیت کا اطلاق اسلامی نظامِ حیات کے مقابلے میں ہوا ہے اسلام سے پہلے اہل عرب پر جو مظہر گزرا ہے اس کو بھی اسی لیے جاہلیت کہا گیا ہے کہ وہ نبوت کے علم و عمل سے بے پروا ہو کر گمراہی میں زندگی گزار رہے تھے۔

قانونِ الہی کے مقابلے میں ہر دور کا بنایا ہوا قانون وضعی جاہلیت ہے خواہ اس کے بنانے والے

کالوں اور یونیورسٹیوں کے فضلا اور دانشوروں۔ چونکہ یہاں حکم الجاہلہ، انزل اللہ کے مقابلہ پر آیا ہے، اس لیے بروہ قانون جو خدا کے آئینے ہوتے قانون کے خلاف بروہ جاہلیت کا قانون ہے چاہے وہ زمانہ گزشتہ میں اسلام سے پہلے ہو اور چاہے آج بیسویں صدی کی روشنی میں۔ حافظ ابن کثیر آثار الہیہ کے حوالہ میں ہوتے ہیں۔ ان آثار میں نے بھی اپنی مملکت میں ایک اپنا خود ساختہ قانون نافذ کر رکھا تھا۔ اسی کا ذکر کرتے ہوئے ابن کثیر نے ان لوگوں کو بتا دیا ہے جو فدائی قانون کے مقابلے اور لے کا یا جزیہ دے دے اور غیر قوموں کے قانون چلاتے ہیں ان کو قطعی کافر قرار دیا ہے، لکھا ہے۔

قرآن کی یہ آیت ان لوگوں کے خلاف لکھا چیلنی ہے جو اللہ کے نازل کردہ قانون سے ہٹ کر آراء واپراء اور اصطلاحات کو اپناتے ہیں جیسا کہ زمانہ جاہلیت والوں کا دستور تھا اور جیسا کہ تاتاری ملکی سیاسیات میں اس قانون کو استعمال کرتے ہیں جو ان کو چنگیز خاں سے ملا ہے۔ چنگیز خاں کا قانونی مجموعہ ان قوانین کو کہتے ہیں جس میں متفرق مذاہب، یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے قوانین کو ملغوبہ کیا گیا ہے اور اس میں اس کے علاوہ اور بھی قوانین ہیں۔ تاتاری اپنی مملکت میں اسی قانون پر عمل پیرا ہیں۔ جو بھی اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کو چھوڑ کر اس قانون کو اپناتا ہے وہ کافر ہے اس سے قبل واجب ہے۔

کیا سخت ہے یہ فیصلہ اور کس قدر سنگینی ہے اس میں۔ یہ تو تاتاریوں کے زمانے میں مسلمانوں کے بائے میں ابن کثیر کا فیصلہ ہے۔ آئیے ذرا انگریز کے دو میں انگریز کے بنائے ہوئے قانون کو چلانے والے مسلمانوں کے بائے میں کچھ غور فرمایا لیجئے اور ان کے اعمال و افکار کا بھی جائزہ لیجئے آپ محسوس کریں گے کہ بہت بڑی حد تک اسلامی قانون، اسلامی نظام ایک جھولی بھری داستان بن چکی ہے۔

عملی صورت حال یہ ہے کہ انسان کے پردہ باطن سے لے کر اس کی اجتماعی زندگی کے آخری کنارے تک چھا جانے والا یہ دین محدود اور خالص ہوں کی محدود ترین حدود و احوال میں محدود ہو چکا ہے اور اس کی اس قید مسلسل پر اس کے پیروؤں نے قریب قریب مکمل صبر و رضا کا دیر اختیار کر لیا ہے زندگی کے اکثر و بیشتر حصوں سے خصوصاً اس کے اجتماعی شعبوں سے اللہ کے دین کی اس بے ڈال پیران کا ایمانی احساس جیسے راکھ کا ڈھیر بنا ہوا ہے اور اس مٹلے میں حوام و خواص، دنیا دار اور دیندار، مفاد پرست اور اہل اخلاص کی کوئی تفریق ہی نہیں ہے۔ اگر ایک طرف دنیا دار مسلمان تعلق

میشست اور سیاست کے میدانوں میں اپنی اغراض اور باطلیوں کے پیچھے دیوانہ وار دوڑ رہے ہیں اور نہیں چاہتے کہ ان کا دین بازاروں، منڈیوں، عدالتوں، قانون ساز اداروں اور حکومت کے ایوانوں میں بھی نہ کران کے افکار و اعمال کی جاگ دوڑ لپنے کا موقع مل سکے اور پھر اپنی اس نامبارک روش پر پردہ ڈالنے کے لیے ہل دی شدت سے یہ پُر فریب نعرے بھی نکالتے ہیں کہ مذہب ہر شخص کی ایک متقدّم مگر ذاتی متاع ہے اسے دنیوی معاملات میں وخیل بنانا اور سیاست میں گھسٹنے پھرنے اس کی عظمت و حرمت کی توہین کرتا ہے تو دوسری طرف مخلص حاکمان دین کو بھی اس صورتِ حال پر کوئی بے چینی محسوس نہیں ہوتی حالانکہ ان کے دلوں کا خدا سے تعلق بھی ہے اور اسلام کا درد بھی ہے اور دین کے معاملے میں ان کے احساسات بڑے ہی نازک ہیں۔ اگر ایک مسجد کی دیوار بلکہ اگر کسی خزانہ کی جالی بھی توڑ دی جاتے تو انہیں ایسا محسوس ہوگا کہ کسی نے ان کے دل پر ہتھوڑا رکھ دیا ہے مگر دین ہی کا جو ایک خاص بڑا حصہ منسلک پڑا ہوا ہے اس کے لیے ان کے دلوں میں کوئی اضطراب نہیں ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ قَالِی اللہ استقل .

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ
 أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَيَنْتَفِئْ عَنْهُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي
 الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ هَذَا الَّذِي كُنْتُمْ تُشَارِكُونَ فِي قُلُوبِهِمْ قُرْءَانٌ يُسَاءَرَعُونَ
 فِيهِمْ يَقُولُونَ نَخْشَىٰ أَنْ تُصِيبَنَا آيَةٌ فَعَسَىٰ اللَّهُ
 أَنْ يَأْتِيَ بِالْفَتْحِ أَوْ أَمْرٍ مِنْ عِنْدِهِ فَيُضْحِكُوهُمْ أَوْ يُبَدِّلَ
 فِي أَنْفُسِهِمْ نَدِيمِينَ ۖ وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا هَؤُلَاءِ
 الَّذِينَ أَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ أَنَّهُمْ لَمَعَكُمْ طَحِطَتْ
 أَعْمَالُهُمْ فَاصْبِرُوا خَيْرِينَ ۖ

اے ایمان والو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ، یہ آپس
 میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ اور تم میں سے جو بھی ان کو
 اپنا رفیق بنائے گا تو وہ ان ہی میں سے ہوگا اللہ ظلم کرنے والوں
 کو رہنمائی نہیں کرتا ہے۔^{۱۲۹} بس تم دیکھ رہے ہو کہ جن کے دلوں

میں نفاق کا روگ ہے وہ ان ہی کی طرف دوڑ رہے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ہمیں اندیشہ ہے کہ ہم پر افتاد ان پڑھے لکھے لوگ وہ دور نہیں ہے کہ اللہ تمہیں فیصلہ کن فتح بخشے گا یا اپنی طرف سے کامیابی کی کوئی بات لے آئے گا تو اس وقت یہ لوگ اس بات پر شرمندہ ہوں گے جو چھپا رکھی ہے،^{۱۳۱} اور ایمان والے کہیں گے کیا یہ ہی وہ لوگ ہیں جو اللہ کے نام سے کڑی کڑی قسمیں کھا کر یقین دلاتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں ان کے سارے اعمال اکارت گئے اور وہ ناکام و نامراد ہو کر رہے۔^{۱۳۲}

یہود و نصاریٰ سے ترک موالیات

اتحادیات قریب جانتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے میں تشریف آوری کے بعد یہود مدینہ سے صلح و مصالحت کا بیجاں کیا اور ایک دستاویز کی صورت میں یہودیوں سے عہدہ بیان کیا۔ اس دستاویز میں یہ بات خاص طور پر لکھی تھی کہ یہودیوں سے جو بھی ہمارے ساتھ ہے گا اس کی مدد کی جائے گی اور ملکی دفاع کی حد تک اس دستاویز میں یہ دفعہ بھی درج تھی کہ

یہود جب تک اہل ایمان کے ساتھ ہو کر دشمن کے خلاف جنگ کرتے رہیں گے اپنے مصالحت خود ہی برداشت کریں گے۔
اور یہ بھی لکھا تھا۔

بنو نضیر کے یہودی اہل ان کے ساتھ ایک امت تصور ہوں گے۔ یہودی اپنے دین پر رہنے کے مجاز ہوں گے اور مسلمان اپنے دین پر خواہ موال ہوں۔ البتہ جو لوگ ظلم یا زیادتی کے مرتکب ہوں گے وہ اپنی ذات یا گھرانے کے سوا کسی کو مصیبت میں نہ ڈالیں گے۔

یہ دستاویز ۵۲ دفعات پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے اس معاہدے کو جے میخا کا نام دیا گیا ہے دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور قرار دیا ہے۔ حافظ ابن القیم زاد المعاد میں رقمطراز ہیں کہ جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لے آئے تو آپ کے مخالفین میں حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک قسم ان لوگوں پر مشتمل تھی جن سے حضور انور نے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کر لیا تھا، وہ کافر ہوتے ہوئے ایک پُر امن شہر کی حیثیت سے رہتے ان کی جان اور ان کے مال کی حفاظت ہوتی تھی ان کو معاہدین کہتے ہیں۔

دوسری قسم ان لوگوں کی جنہوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے اعلان جنگ کیا تھا اور اسلام اور مسلمان کی مدد سے ہی کو اپنا رکھا تھا یہ لوگ معاہدین کہلاتے ہیں۔

تیسری قسم ان لوگوں کی تھی جن سے نہ جنگ تھی اور نہ صلح تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جو حالات کو دیکھتے تھے، حالات کا اونٹ کس کروٹ بیٹھا ہے کون غالب ہوتا ہے۔ حضور انور یا آپ کے مخالفین۔ ان میں وہ بھی تھے جو بدول سے حضور انور کے غلبہ کے خواہاں تھے اور حالات کے دباؤ سے مجبور تھے اور ان میں وہ بھی تھے جو بظاہر مسلمان تھے مگر اندر سے دشمن کے ساتھ تھے۔ قرآن نے ان کو ہی منافقین کہا ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب الگ الگ معاملہ کیا ہے۔ یہودیوں سے صلحت کی۔ مدینہ منورہ میں یہودیوں کے تین قبیلے آباد تھے۔ بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ۔ بنو قینقاع نے بدر کے بعد اعلان جنگ کیا۔ بنو نضیر نے جیسا کہ امام بخاری نے کہا ہے بدر کی کچھ ماہ بعد عہد شکنی کی اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازش کی۔ اور بنو قریظہ نے غزوہ خندق میں عہد شکنی کی۔ یہودیوں کا بھی یہی حال تھا۔ ان ہی اسباب کی بنا پر یہاں قرآن نے مسلمانوں پر ان سے موالات پر پابندی عائد کی ہے۔

آیات کا پس منظر

ان آیات کے پس منظر کے موضوع پر شارحین قرآن کے مختلف خیالات ہیں۔ شیخ الاسلام فرماتے ہیں یہ آیتیں دیکس المنافقین عبداللہ ابن ابی کے باب میں نازل ہوئی ہیں۔ یہود سے اس کے بہت دوستانہ تعلقات تھے۔ اس کا خیال تھا کہ اگر مسلمانوں پر کوئی افتادہ پڑی اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت منسوب ہو گئی تو یہود سے ہماری دوستی کام آئے گی۔ اسی واقعہ کے متعلق اعلیٰ آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

اہم تفسیر ابن جریر طبری فرماتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں تشریف فرما ہونے کے بعد اطراف و ہرینہ کے یہود و نصاریٰ سے ایک معاہدہ کیا تھا لیکن یہودی اپنی سازشی فطرت اور اسلام دشمنی کی وجہ سے اس معاہدہ پر قائم نہ رہ سکے اور مسلمانوں کے خلاف مشرکین مکہ سے سازش کر کے ان کو اپنے قلعہ میں بلانے کے لیے نوطا مکھ دیا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر جب اس سازش کا انکشاف ہوا تو آپ نے ان کے مقابلے کے لیے مجاہدین کا ایک دستہ روانہ کر دیا۔ جو قرینہ کے یہودی ایک طرف دھڑکنے لگے یہ سازش کر رہے تھے اور دوسری طرف مسلمانوں میں گھسے ہوئے بہت سے مسلمانوں سے دوستی کے معاہدے کیے ہوئے تھے اور اس طرح مسلمانوں کے خلاف ہاسوسی کا کام کرتے تھے اس لیے یہ آیت نازل ہوئی۔

ابن ابی شیبہ اور ابن جریر نے عطیہ ابن سعد کے حوالہ سے بتایا ہے کہ عبادہ ابن الصامت نے حضور انور کی خدمت گرامی میں حاضر ہو کر یہودی کی موالات سے بیزاری کا اعلان کیا اور عبداللہ ابن ابی نے یہودی کی موالات کو چھوڑنے سے انکار کیا تو اللہ نے یہ آیات نازل کیں۔

”تاریخی روایات سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ انہی احوال و ظروف کے بعد ان آیات کا نزول ہوا ہے اور ان واقعات کو سبب نزول کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان آیات میں ان کا حل موجود ہے۔“

۱۲۔ اے ایمان والو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ۔ ۱۱۔ یا جامع ولی کہ جسے ولی دوست کو بھی کہتے ہیں، قویب کو بھی ناصر اور مددگار کو بھی۔ غرض یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ بلکہ تمام کفار سے جیسا کہ سورہ نساء میں تصریح کی گئی ہے۔ مسلمان دولت و تعلقات قائم نہ کریں۔ اس موقع پر یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ موالات، مروءت و حسن سلوک، مصالحت و رول واری اور عدل و انصاف یہ سب چیزیں الگ الگ ہیں۔ اہل اسلام اگر مصلحت سمجھیں تو ہر کافر سے صلح و مصالحت اور عہد و پیمان مشروع طریقہ پر کر سکتے ہیں وان جنہم اللہ فاجنہ اللہ فاجنہ لہم توکل علی اللہ عدل و انصاف کا حکم

جیسا کہ گزشتہ آیات سے معلوم ہو چکا۔ مسلم و کافر ہر فرد و بشر کے حق میں ہے۔ مروت، رواداری یا امن سلوک کا برتاؤ ان کفار کے ساتھ ہو سکتا ہے جو جماعت اسلام کے مقابلے میں دشمنی اور عناد کا مظاہرہ نہ کریں جیسا کہ سورہ ممتحنہ میں تصریح ہے۔ باقی موالات یعنی دوستانہ اعتماد اور برادرانہ معاشرت و صلہ تو کسی مسلمان کو حق نہیں کہ یہ تعلق کسی غیر مسلم سے قائم کرے۔ البتہ صوری موالات جو الامان تقویٰ منہم تھا کہ سخت میں داخل ہو۔ اور عام تعاون جس کا اسلام اور مسلمان کی پوزیشن پر کوئی برا اثر نہ پڑے اس کی اجازت ہے۔ بعض خلفائے راشدین کے بارے میں جو غیر معمولی تشدید و تعصیب منقول ہے اس کو محض سداذاتع اور زید احتیاط پر معنی سمجھنا چاہیے۔

یہ اور اس قسم کی دوسری آیات جن میں ترک موالات کا حکم آیا ہے یعنی اس بات پر زور دیا ہے کہ یہود و نصاریٰ یا دوسرے کافروں سے رفاقت و اعانت کے تعلقات نہ رکھو۔ اور اس طرح کے دوسرے احکام جنگ سے ہیں نہ زندگی کے عام احکام یقیناً ہر نیک تحریک کے بانی کا فرض ہے کہ وہ تحریک کے قیام و بقا اور حفاظت کی خاطر اس تحریک کے پیروؤں کو اس کے مخالفین سے میل جول، رانداری اور رفاقت سے روک دے جو زور یا سازش سے اس کے شانے اور برادرانے کے پیچھے ہوں خصوصاً ایسے وقت میں جب اس تحریک کو تیغ و طنز اور فوج و لشکر سے شانے کی کوششیں ہو رہی ہوں اور طرفین میں لڑائی کی حالت قائم ہو یا غلط شبہ اور افواہیں پھیلا کر اس کے پیروؤں کو وہ برگشتہ کرنا چاہتے ہوں۔ اور یہ بات بھی ایک بے غبار حقیقت ہے کہ جب حق و باطل معرکہ آرا ہوں تو اہل حق کے درمیان حق کی خاطر جس قدر محبت ہوگی فطرۃ ان اہل باطل سے اسی قدر بیزاری بھی ہوگی جو اس حق کو مٹانے کے لیے ایٹری چوٹی کا زور لگائے ہوں اس لیے حق کی صفت کی خاطر اہل حق کو اہل باطل سے اس قسم کی محبت اور موالات سے قرآن نے روکا ہے قرآن کے اس قسم کے احکام کے وہی معنی ہیں جو شہزادہ امن کے اس اعلان کے ہیں۔

یہ مت سمجھو کہ میں زمین پر صلح کر دینے آیا ہوں بلکہ تم لو جلائے کو آیا ہوں، کیونکہ میں آیا ہوں کہ مرد کو اس کے باپ اور بیٹے کو اس کی ماں اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کروں، آدمی کے دشمن اس کے گھر کے لوگ ہوں گے، جو کوئی باپ یا ماں کو مجھ سے زیادہ چاہتا ہے وہ میرے لائق نہیں ہے۔ (محنی کی تفسیر، باب ۱۳۴)

یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کے اخلاق میں یہودیوں کے ساتھ وہ نرمی، رحم و ہمدلی نہیں جو دوسروں کے ساتھ تھی، وہ یہودیوں کو بے تکلف سخت سے سخت الفاظ سے

خطاب کرتے تھے۔ جب حجاز کے یہودیوں اور سرحد شام کے عیسائیوں سے مسلمان کی جنگ چھڑی اور بظاہر مال و دولت، ساز و سامان، اسلحہ اور مستحکم قلعوں کے سبب سے ان کا پلہ مسلمانوں سے زیادہ بھاری نظر آتا تھا تو مدینہ کے منافقوں اور کمزور دلوں کی عاقبت، یعنی اور ذور اندیشی ان کو اس پر مجبور کرتی تھی کہ وہ اسلام کے ان دشمنوں سے ساز باز رکھیں تاکہ ان کے مقابلے میں اگر مسلمان کو شکست ہو تو ان کو پناہ مل سکے۔ اسی کے ساتھ وہ مسلمانوں کو اپنے ساتھ لگا کر ان کو دین اسلام سے ہٹانے کی کوشش کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر مسلمانوں کو ان اہل کتاب سے رازدارانہ دوستی و محبت کے تعلقات رکھنے سے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ اے ایمان والو! یہود و نصاریٰ سے رفاقت کے تعلقات نہ رکھو، ورنہ جہان تک ایک انسان کے دوسرے انسان کے ساتھ معاملہ کرنے کا تعلق ہے۔ اصل اس میں محبت و شفقت، ہمدردی و سلوک اور تعاون و سازگاری ہے اس کے سوا کوئی بات نہیں ہر انسان دوسرے انسان کا بھائی ہے خواہ اس کا ہم وطن ہو یا نہ ہو، ہم نسل ہو یا نہ ہو، ہم عقیدہ ہو یا نہ ہو اور امتیاز کی وہ تمام باتیں جو اس انسانی بھائی چارگی کا رشتہ قطع کر رہیں خدا کی طرف سے نہیں ہیں خود انسانوں کی گھڑی ہوئی ہیں، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائوں میں سب سے زیادہ احترام اسی حقیقت کا ہوتا تھا۔ اے اللہ! ان العباد کلہم اخوة لیکن جب تمام ملک و قوم نے اس دعوت کو ناجور کر دیا تو حقیقت کا فیصلہ کر لیا۔ اور اہل ایمان پر محض اختلاف، افکار کی بنا پر ظلم و ستم کرنے لگے تو قدرتی طور پر جنگ کی حالت پیدا ہو گئی۔ اب دو فریق ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تھے ایک فریق مسلمانوں کا تھا جو اپنا بھاد کر رہا تھا دوسرا دشمنوں کا تھا جو حملہ آور تھا۔ ایسی حالت میں ناگزیر ہو گیا کہ دوستوں اور دشمنوں میں صاف امتیاز ہو جائے جو دوست ہیں وہ دشمن کے کیمپ سے تعلق نہ رکھیں۔ جو دشمن ہیں وہ دوستوں سے کس طرح کی سازش نہ کریں۔ قرآن میں جس قدر احکام عدم مواصلات ہیں وہ سب اسی صورت حال سے تعلق رکھتے ہیں اور قرآن کی یہ نیت بھی اسی سے متعلق ہے۔

قرآن نے اس بارے میں ایک عمومی تقسیم کر دی ہے تمام غیر مسلم خواہ کتالی ہوں یا غیر کتالی۔ ان کو دو قسموں میں بانٹ دیا ہے۔ ایک قسم ان غیر مسلموں کی ہے، یہ نہ تو مسلمانوں سے لڑتے ہیں نہ ان پر حملہ آور ہوتے ہیں نہ ان کی آبادیوں پر قابض ہیں اور نہ ہونا چاہتے ہیں۔ دوسری قسم ان غیر مسلموں کی ہے جو یہ ساری باتیں کر رہے ہیں۔ قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ دوسری قسم کے غیر مسلموں کے ساتھ مسلمان کوئی علاقہ نہ رکھیں، اگر رکھیں گے تو ان کا شمار بھی اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں میں ہو گا۔

یہود و نصاریٰ کا سیاسی گٹھ جوڑ

۱۲۸۔ یہ آپس میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ یعنی مذہبی فرقہ بندی اور اندوئی بغض و عداوت کے باوجود وہ باہم ایک دوسرے سے دوستانہ تعلقات رکھتے ہیں۔ یہودی یہودی کا اور عیسائی عیسائی کا دوست بن سکتا ہے لیکن اہل ایمان کے مقابلے میں سب کفار ایک دوسرے کے دوست اور معاون بن جاتے ہیں۔ الکفر ملت واحدہ لیہ آیت کے آغاز میں اہل کتاب کی تعمیر چھوڑ کر یہود و نصاریٰ کھنکھنے کی وجہ یہی ہے کہ ان کی یہ عداوت نبوت اور اسلام سے کٹائی ہوئے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ یہود و نصاریٰ کی سیاسی سنگٹھن کی وجہ سے ہے ورنہ ان کی کتاب قرآن کریم نہیں کہتی ہے۔ وہ اسلام اور مسلمانوں کو اپنے لیے مشترک طور پر ایک سیاسی خطرہ سمجھتے ہیں اور اس خطرے سے فتنے کے لیے باہم ایک دوسرے کے دوست اور معاون ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کا رویہ ان کے ساتھ انفرادی نہیں بلکہ جماعتی بنیاد پر ہونا چاہیے، جس طرح وہ مسلمانوں کے خلاف یکجہت جہت و واحدہ ہیں اسی طرح مسلمان بھی ان کے مقابلے میں ملت واحدہ بنیں۔ جماعت سے الگ ہو کر مسلمانوں کا کوئی گروہ ان کے کسی گروہ کے ساتھ اپنے ذاتی اغراض و مصالح یا ذاتی تعلقات و دہم کی بنا پر اتحاد و دوستی کا ربط و ضبط نہ رکھے۔ مطلب یہ ہے کہ یہودی یہودی اور نصرانی نصرانی تو باہم دوست ہوتے ہی ہیں باقی خود یہود و نصاریٰ کے درمیان بھی بہت کچھ مناسبت ہے۔ کم از کم یہی کہ اسلام اور مسلمانوں کی عداوت پر دونوں متحد ہیں۔ ان کے آپس میں اگر تمہائے خلاف ساز باز ہو جائے تو کچھ تعجب نہیں ہے۔ آج بھی اگر اس سیاسی گٹھ جوڑ اور بعضہم اولیاء بعض کا تماشا دیکھنا چاہتے ہو تو مہر زین غلطین میں یہودیوں اور عیسائیوں کا مسلمانوں کے خلاف گٹھ جوڑ دیکھ لو۔

دشمن کا دوست دشمن ہے

۱۲۹۔ اور تم میں سے جو بھی ان کو اپنا رفیق بنائے گا تو وہ ان ہی میں سے ہوگا اللہ ظالم کار کو کہ رہنمائی نہیں کرتا ہے۔ یعنی فی الواقع یہود کے ساتھ منافقین کی مولات کا اصل منشا یہ ہے کہ یہود جماعت اسلام کے قریب مقابل اور مذہب اسلام کے بدترین دشمن ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو شخص یہود و نصاریٰ

ایسی جماعت کفار کے ساتھ اس نسبت اور حیثیت سے مولات کرے کہ وہ دشمنِ اسلام ہے۔ اس کے گھر میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ منافقین میں کچھ لوگ اور بھی تھے جنہوں نے جنگِ اُحد میں لڑائی کو پانسہ بدلا ہوا دیکھ کر کہنا شروع کیا تھا کہ ہم تو اب فلاں یہودی یا فلاں نصرانی سے دوستا نہ بنائیں گے اور ضرورت پیش آنے پر ان ہی کا مذہب اختیار کر لیں گے۔ اس قحاش کے لوگوں کی نسبت بھی وہیں یہ کہہ لہم منکسر فانسہ منہم کا قحاشی مدلولِ علانیہ صادق ہے لیکن وہ مسلمان جو اس قسم کی نیت اور فحشا سے خالی ہو کر یہود و نصاریٰ کے ساتھ دوستا نہ تعلقات قائم کریں۔ چونکہ ان کی نسبت بھی قویِ ظہور رہتا ہے کہ وہ کفار کی حد سے زیادہ ہم نشینی اور اختلاط سے متاثر ہو کر رفتہ رفتہ ان ہی کا مذہب اختیار کر لیں یا کم از کم مشابہت کفر اور رسومِ فحش کیسے کا رہ اور نفوذ کریں۔ اس اعتبار سے فانسہ منہم کا اطلاق ان کے حق میں بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ حدیثِ المسد من احب نے اس مضمون کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اور جو لوگ کو دشمنانِ اسلام سے مولات کر کے خود اپنی جان پر اور مسلمانوں پر ظلم کرتے ہیں۔ اور جماعتِ اسلام کے مغلوب و مظلوم ہونے کا انتفا کر رہے ہیں۔ ایسی بد بخت، معاند اور دغا باز قوم کی نسبت یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ کبھی راہِ ہدایت پر آئے گی بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو جماعت سے الگ ہو کر ان کو اپنا دوست اور متحد بنائے گا اس کا شمار ان ہی میں ہوگا۔ سن کا دعویٰ اسلام بے حقیقت ہو کر رہ جائے گا۔ یعنی جن یہود و نصاریٰ کا چہرہ پیش کیا جا رہا ہے ان سے اس طرح کا کوئی علاقہ بھی مسلمان نہ رکھیں، اگر رکھیں گے تو ان کا شمار بھی اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں میں ہوگا۔ ایک مسلمان کے سائے گناہوں سے شریعت و دین گزر کر سکتی ہے لیکن اس قسم کے یہود و نصاریٰ سے محبت کرتا ہے یا کسی طرح کا واسطہ رکھتا ہے تو یہ گناہ نہیں اتفاق ہے اور منافقین کو من نہیں ہے۔ آخر میں فرمایا کہ ان اللہ کا یہودی، نصرانی، ظالمین، بدایت سے یہاں منزلِ مقصود تک پہنچنا ہے اور ظالمین سے مراد اپنی جانوں پر ظلم و حملے والے ہیں۔ یعنی جو لوگ اسلام اور اہل ایمان کے متقابل میں ایمان و اسلام کے دشمنوں کو اپنا دوست و متحد بناتے ہیں گے وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کریں گے اور ایسے لوگ راہِ یاب نہ ہوں گے اس لیے کہ انہوں نے راہِ راستہ پر چلنے والوں کا ساتھ نہیں دیا۔

منافقین کے دل کا چور

۱۳۰۔ پس تم دیکھ لیتے ہو کہ جن کے دلوں میں روگ ہے وہ ان ہی کی طرف دوڑے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہمیں اللہ بیشہ ہے کہ ہم پر کوئی افتاد ان پڑے گی۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں شک اور نفاق کی بیماری ہے جن کو خدا کے وعدوں پر اعتماد اور مسلمانوں کی حقانیت پر یقین نہیں، اسی لیے وہ دوڑ کر کافروں کے آغوش میں پناہ لیتے ہیں تاکہ ان کے مہم جو غلبہ کے وقت فترات فتح سے متعلق ہر سکین۔ اور ان کے زعم میں جو غرضیں اور اخلاقیات جماعت اسلام پر اُنے والی تھیں ان سے محفوظ رہیں بخشی ان قیمنہ حاصل کر کے یہ ہی معنی ان کے دلوں میں پوشیدہ تھے لیکن یہ ہی الفاظ جب پیکر اسلام اور مخلص مسلمانوں کے سامنے یہود سے دوستانہ کرکھنے کی معذرت میں رکھتے تھے تو گردش زلزلہ کا یہ مطلب ظاہر کرتے کہ یہود ہمارے ساتھ ہو جائیں۔ ہم ان سے قرض لے لیتے ہیں۔ اگر کوئی نصیبت قطع وغیرہ ان پڑے تو وہ ہمارے دوستانہ تعلقات کی وجہ سے اُسے وقت میں کام آجائیں گے ان ہی خیالات کا آگے جواب آ رہا ہے۔

اس وقت تک عرب میں کفر اور اسلام کی کش مکش کا فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ اگرچہ اسلام اپنے پیروؤں کی سر فہرستوں کے سبب ایک طاقت بن چکا تھا لیکن مقابل کی طاقتیں بھی زبردست تھیں۔ اسلام کی فتح کا جیسا امکان تھا ویسا ہی کفر کی فتح کا بھی تھا، اس لیے مسلمانوں میں جو لوگ منافق تھے وہ اسلامی جماعت میں پہنچتے ہوئے یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ بھی ربط مضبوط رکھتے تھے بلکہ یہ کش مکش اگر اسلام کی شکست پر ختم ہو تو ان کے لیے کوئی نہ کوئی جاتے پناہ ضرور ہے۔ علاوہ انہی اس وقت عرب میں عیسائیوں اور یہودیوں کی ماضی قوت سب سے زیادہ تھی، ساتھ کار می سب سے زیادہ تھی۔ ساتھ یہود و عیسائیوں کے ہاتھ میں تھا۔ عرب کے بہترین سرسبز و شاداب حصے ان کے قبضے میں تھے۔ ان کی سود خوار کی کمال برطرف چھلکا ہوا تھا۔ لہذا ماضی اسباب کی بنا پر بھی یہ منافق لوگ ان کے ساتھ اپنے سابقہ تعلقات برقرار رکھنے کے خواہش مند تھے۔ ان کا گمان تھا کہ اگر اسلام و کفر کی اس کش مکش میں بہترین منہمک ہو کر ہم نے ان سب قوموں سے اپنے تعلقات منقطع کر لیے جن کے ساتھ اسلام اس وقت برسرِ پیکار ہے تو یہ فعل سیاسی اور ماضی دونوں حیثیتوں سے ہمارے لیے خطرناک ہو گا۔

سائے شاد میں قرآن کا اس پر اتفاق ہے کہ اس آیت میں منافقین کا چہرہ پیش کیا گیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ اخلاص نہ ہونے کی وجہ سے ان میں اصول و صداقت کے مقابلے میں منافع و مصالح اور اجل کے مقابلے میں عاجل کو ترجیح دینے کی بیماری پیدا ہو گئی تھی۔ اس سے وہ ایک با اصول، بلند اخلاق، پسند سیرت جماعت کے بلند مقام سے گر کر ایک بے اصول ناقابل اعتبار، ابن الوقت اور مصلحت پرست بن کر رہ گئے تھے۔ ان کے سامنے کوئی اخلاقی معیار نہ تھا بلکہ صرف منافع و مصالح پر ان کا سہارا تھا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ دنیوی کامیابی اور مادی فوائد و منافع ان کا منہ پھلنے لگا نظر تھا۔ اصولی و اخلاقی معیار منافع و فلاح کے مقابلے میں ان کے میاں بے قیمت تھے۔ یہاں سے یہ صدمہ کے انداز بیان نے اس سلسلے میں ان کی نگاہ دو، بھاگ دوڑ، منت اور جانفشانی کر بے نقاب کر دیا ہے۔ ہر دور میں منافقین کا یہی حال ہوتا ہے۔ سیاسی زندگی میں سیاسی پارٹیوں سے ساز باز اور اقتدار بدلنے کے کامیابیوں کی تبدیلی ان ہی لوگوں کا شیرہ ہوتا ہے۔

مستقبل میں ان کی مذمت کا سامان

۱۳۱- وہ وقت دور نہیں ہے کہ انہیں فیصلہ کن فتح بخشنے کا یا اپنی طرف سے کامیابی کی کوئی بات ملے آئے گا تو اس وقت یہ لوگ اس بات پر شرمندہ ہوں گے جو چھپا رکھی ہے۔ یعنی وہ وقت نزدیک ہے کہ حق تعالیٰ اپنے نبی علیہ السلام کو فیصلہ کن فتوحات اور غلبہ عطا فرمائے اور مکہ معظمہ میں بھی جو مقام عرب کا مسلم مرکز تھا حضور کو فائز داخل کرے یا اس کے ماسوا اپنی قدرت اور حکم سے کچھ اور امور بروئے کار لائے جنہیں دیکھ کر ان منافقین کی ساری باطل توقعات کا خاتمہ ہو اور انہیں پتہ لگ جائے کہ دشمنان اسلام کی مہلات کا نتیجہ دنیوی دولت و رسوائی اور اخروی عذاب الیم کے سوا کچھ نہیں۔ جب فضیلت و رسوائی کے یہ تانکے سامنے آجائیں گے اس وقت بجز کچھپانے کے اور کف افشوس ملنے کے کچھ حاصل نہ ہو گا۔

الآن قد ندمت وما ينفع الندم

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اسلام کے عام غلبے اور فتح مکہ وغیرہ کو دیکھ کر تمام اعدائے کے وصلے بہت ہو گئے۔ بہت سے یہود و مسلمانے گئے۔ بہت سے جلا وطن ہوئے۔ منافقین کی ساری امیدیں پر پانی پھریں۔ مسلمانوں کے سامنے ہر یک طور پر جوڑے ثابت ہو گئے۔ مہلات یہودیوں پر جو کوششیں کی تھیں وہ اکارت گئیں اور اخروی و دنیوی ہلاکت ابدی کا طوق گلے میں پڑ گیا۔ اگلی آیت میں

اسی مضمون کو بیان فرمایا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کے دلوں میں تو بڑا سکایا ہوا ہے کہ اس وقت مسلمانوں اور اعلان کے مخالفین کے درمیان جو کشمکش برپا ہے معلوم نہیں یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا ہو سکتا ہے کہ فتح بالآخر مخالفین کی ہو۔ چونکہ ان مخالفین کا تعلق رشتہ مخالف اسلام طاقتوں کے ہی ساتھ تھا اس وجہ سے وہ آسانی سے یہ باور کرنے کو تیار نہیں تھے کہ اسلام کے مقابلے میں ان کے شہرے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو دکھایا اور بتایا کہ آخری اور مکمل فتح آنے والی ہے جس کے بعد دشمن کی قوت بالکل ختم ہو جائے۔ ادا من عندہ یا اللہ کی طرف سے کوئی خاص بات ایسی نمایاں ہو جائے گی جس سے منافقین کا سارا بھرم کھل جائے گا۔ یعنی فیصلہ کن فتح سے کمتر درجہ کی کوئی ایسی چیز جس سے ٹکراؤ لوگوں کو یقین ہو جائے کہ مستقبل میں میدان اسلام کے ہاتھ میں ہو گا۔ اس وقت یہ لوگ مایوس ہوں گے اور یہود کی دوستی جسے اب تک وہ چھپائے ہوئے تھے اس پر ہچکچاتے رہیں گے۔

منافقین کی روش پر اہل ایمان کا تعجب

۱۳۲۔ اور ایمان والے کہیں گے کیا یہ ہی وہ لوگ ہیں جو اللہ کے نام سے کڑی کڑی قسمیں لگا کر یقین دلاتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں ان کے سارے اعمال اکارت گئے اور وہ کام و نامزد ہو کر رہے۔ یہ مسلمانوں کی طرف سے ان منافقین کے حال پر اس وقت اظہار ہو گا جب ان کا سارا باز فاش ہو جائے گا اس وقت مسلمان ہم کہیں گے۔ کیا یہی وہ لوگ ہیں جو بڑے زور شور سے ہمیں قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ اس سے مقصد منافقین کو تنبیہ ہے کہ کب تک اپنی سازشوں کو راز بناتے رکھو گے بالآخر ایک روز ہر سر عام رسوائی ہوئی ہے۔ آخر میں فرمایا کہ حبست اعمالہم یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلان ہے کہ ان کے سارے اعمال اکارت ہو جائیں گے اور وہ نامزدیوں کی تصویر بن کر رہ جائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ انہوں نے جو کچھ اسلام کی پیروی میں کیا، انسانی پر مبنی اور ذرے رکھے، زکوٰۃ دی، جہاد میں شریک ہوئے۔ اسلامی اخلاق و آداب کو اپنایا، یہ سب کچھ اس لیے ضائع ہو گیا کہ ان کے دلوں میں اسلام کے لیے خلوص نہ تھا۔ اعمال کے منتر ہونے کا انحصار تمام تر ایمان و اخلاص پر ہے۔ نفاق کے ساتھ دینداری کی جو نمائش کی جاتی ہے وہ محض نمائش

ہوتی ہے۔ حقیقت کی میزان میں اس کا کوئی وزن نہیں ہوتا۔ ایک مطلب تو یہی ہوتا ہے لیکن علماء اُلوہی فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ ان کے وہ اعمال راتیں گاہیں ہر جا بھی گئے۔ جو وہ یہودیوں سے مورات کی خاطر کرتے تھے اور وہ تمام کوششیں بیکار ہو کر رہ گئیں جو اب تک وہ اس راہ میں کرتے تھے۔

اعجازِ قرآنی کا ایک نمونہ

اس بابت ہر ترو سب کا اتفاق ہے کہ قرآن مجزہ ہے لیکن اختلاف اس میں ہے کہ وہ کس مشیت سے مجزہ ہے اور وہجہ اعجاز کیا ہے؟ ان دو وجہ اعجاز میں ایک وجہ اعجاز قرآنِ مجید کا اعجازِ طیب اور ہمیشہ گویاں ہو جو انسان کے حیطہ امکان سے باہر ہیں۔
ان دونوں آیتوں میں صراحتِ طیب کی خبر دی گئی ہے۔ اگرچہ حسی کے ذریعے دی گئی ہے اور وہ اصلاً امکانِ غالب اور ظنِ غالب ہی کے لیے آتا ہے لیکن جہاں موقعِ دلیل ہو تو حسی وعدے کی تعبیر کے لیے بھی ایک لطیف اندازِ بیان ہے۔ یہاں اسی منہوم میں ہے۔ یہاں فتحِ مکہ کی خبر دی گئی ہے۔ اور دیا نے یہ تماشا آنکھوں سے دیکھ لیا کہ اللہ نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ اپنے بندے کو فتح و نصرت سے نوازا اور مکرِ مقابلِ ساری طاقتوں کو کھلی شکست دی۔ اس سورت کا نزولِ سترہ کا اواخر یا سترہ کا اوائل ہے اور فتحِ مکہ ۱۰ رمضان سترہ یعنی ۱۱ فروری سنہ ۶ میں ہوئی ہے۔ قرآن میں اس قسم کی خبریں اور بھی ہیں۔ اہل کتاب اس قسم کی طیب کی خبروں ہی کو نبوت کہتے ہیں۔

اور اس کے ساتھ ذرا قرآن کی اس مجزہ بلاغت کو پیش نظر رکھیے کہ اس آیت میں کس قدر خوبصورت انداز میں مختلف طریقوں سے اہل ایمان کو یہود و نصاریٰ کی مورات سے روکا ہے۔

- ۱۔ بعضی نہی مورات سے روکا اور نام لے کر روکا۔
- ۲۔ ان کے سیاسی گٹھ جوڑ کی نشاندہی فرما کر مورات سے روکا۔
- ۳۔ یہ کہہ کر روکا کہ ان سے مورات کرنے والے کا شمار ان میں ہی ہوگا۔
- ۴۔ یہ کہہ کر روکا کہ ایسا کرنے والے ظلم کا رہی۔
- ۵۔ یہ کہہ کر روکا کہ وہ اللہ کی رہنمائی سے محروم ہو جاتے ہیں۔
- ۶۔ یہ کہ مورات شک و نفاق کے نتائج میں سے ایک نتیجہ ہے۔

۷۔ یہ کہہ کر روکا کہ مولات کا نشانہ ان کو ہوتا ہے جو مستقبل کو شک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔
۸۔ یہ خبر ملے کہ مولات سے روکا کہ فوج و نصرت منقریب اسلام کی ہوگی اور تمہارے اندیشوں کا گھر و نڈا گر جائے گا۔

۹۔ یہ کہہ کر جن کے اقدار کے اندیشے سے تم مولات کر رہے ہو وہ ذلیل ہوں گے۔
۱۰۔ یہ بتا کہ مولات سے روکا کہ تمہیں اپنے موجدہ کردار پر مستقبل میں شرمندہ ہونا پڑے گا۔
۱۱۔ یہ کہہ کر مولات سے روکا کہ وقت آ رہا ہے جب تم ہر عام دسوا ہو گے اور اہل ایمان کو تم پر حیرت ہوگی۔
۱۲۔ یہ کہہ کر روکا کہ مولات کے سلسلے میں تمہاری ساری کوششیں رائیگاں جائیں گی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ
يَأْتِي اللَّهَ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَتُؤَلِّقُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ
إِغْرَاقًا عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ
لَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ
يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿١٠٧﴾ إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ
وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ
الزَّكَاةَ وَهُمْ سَارِعُونَ ﴿١٠٨﴾ وَمَنْ يَتَوَلَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ
وَالَّذِينَ آمَنُوا فَإِنْ حَزَبَ اللَّهُ هُمْ الْغَالِبُونَ ﴿١٠٩﴾



اے اہل ایمان! جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا
تو قریب ہے کہ اللہ ایسا گروہ پیدا کر دے جنہیں خدا دوست کہتا
ہو اور وہ بھی خدا کو دوست رکھنے والے ہوں، مومنوں کے
مقابلے میں نہایت نرم اور جھکے ہوتے لیکن دشمنوں کے مقابلے

نہایت سخت، اللہ کی راہ میں جان لٹا دیں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔^{۱۳۴} یہ اللہ کا فضل ہے جس کو چاہے عطا فرمائے اور وہ بڑی ہی وسعت والا اور جاننے والا ہے۔^{۱۳۵} تمہارا رفیق و مددگار تو اللہ ہے اس کا رسول ہے اور وہ لوگ ہیں جو ایمان والے ہیں جو نماز قائم رکھتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور ہر حال میں اللہ کے سامنے جھکے ہوئے ہیں^{۱۳۶} اور دیکھو جو بھی اللہ، اس کے رسول اور اہل ایمان سے دوستی رکھے گا تو بلاشبہ اللہ کا گروہ ہی غالب آنے والا ہے۔^{۱۳۷}

مستقبل میں غلبہ اسلام کی پیشین گوئی

یہ آیات دراصل پہلے ہی موضوع کا تکرار ہیں۔ پہلے یہ بات کہول دی گئی ہے کہ کافروں سے مورات کرنے والوں کو کافروں ہی میں شملہ کیا جائے گا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ اس بیماری میں آج مبتلا ہیں وہ مستقبل میں کھل کر اسلام کے مخالفت کیپ میں جا کھڑے ہوں اور اس طرح وہ ارتداد اختیار کر لیں فرمایا اگر مستقبل میں ایسا ہوا تو اللہ کو اپنے دین کی حفاظت کے لیے ان کی پردا نہیں ہے۔ اللہ ایسے لوگوں کے ذریعے اقامت دین کا کام کرائے گا جو صرف اہمیت ہی نہیں بلکہ عشق و شینگی کی ایسی تصویریں ہیں جو مصیبتوں کو مصیبتوں کی طرح جھیلے ہی نہیں بلکہ عیش و راحت کی طرح ان سے لذت و مہم

حاصل کرنے ہیں۔ راہِ محبت کی ہر مصیبت ان کے لیے عیش و راحت کی ایک نئی لذت بن جاتی ہے اگر اس راہ میں کانٹوں پر لوٹنا پڑے تو کانٹوں کی چھبہن میں انہیں ایسی راحت نصیب ہو سکتی جو کسی کو چھو لوگ کسی پر لوٹ کر جہیں مل سکتی۔ حتیٰ کہ اس راہ میں مصیبتیں جس قدر بڑھتی جاتی ہیں اتنی ہی زیادہ ان کے دل کو خوشیلا بھی بڑھتی جاتی ہیں ان کے لیے صرف اس بات کا تصور کہ یہ سب کچھ کسی کی راہ میں پیش آ رہا ہے اور اس کی نگاہیں ہمیشہ اس سے بے غم نہیں ہیں۔ عیش و سرور کا ایک ایسا بے پایاں جذبہ پیدا کر دیتا ہے کہ اس کی سرشت ہی میں جسم کی کوئی کلفت اور زہن کی کوئی اذیت محسوس ہی نہیں ہوتی۔ دواؤں کے مسلمانوں کی محبت کا یہی حال تھا۔ ہر شخص جو ان کی زندگی کی سوانح کا مطالعہ کرے گا بے اختیار تصدیق کرے گا کہ انہوں نے راہِ حق کی مصیبتیں صرف جمیل نہیں ہیں بلکہ دل کی پوری خوشحالی اور روح کے کامل سرور کے ساتھ اپنی پوری زندگی ان میں بسر کر ڈالی۔ ان میں سے جو لوگ ازل و عورت میں شریک ہوئے ان پر شب و روز کی ہانکا ہیوں اور قربانیوں کے پورے ۲۳ سال گزر گئے لیکن اس تمام مدت میں کہیں سے بھی یہ بات دکھائی نہ دی کہ مصیبتوں کی کڑواہٹ ان کے چہروں پر کسی طور نمایاں ہو۔ انہوں نے مال و علقہ کی ہر قربانی اس بوش و سرشت کے ساتھ گوارا کر لیا جہاں کی خوشیاں اور راحتیں ان کے لیے فراہم ہو سکتی ہیں۔ وہ بجمہ و بحسبہ کی ایک جیتی جاگتی تصویر بن گئے۔ تاریخی اسانی ان کی قربانیوں کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ انہوں نے ایمان خالص کو معیار ہی نہیں کیا ہے کہ انسان مہربان باطل کے مقابلے میں خدا کا کوئی ہلا کرنے کے لیے بے تاب ہو اور اس کی راہ میں جان لڑنے پر آمادہ ہو جائے۔ دنیا کی اور نیکیوں میں ذاتی منفعت کی توقع اور خواہشات نفس کی آمیزش ہو سکتی ہے لیکن خدا کی راہ میں جان نثاری صرف محبت کے جذبے سے پیدا ہوتی ہے۔ ماں باپ کی خبر گیری میں رضائے الہی سے زیادہ والدین کی محبت کا جذبہ بھی کارفرما ہو سکتا ہے۔ غریب رشتہ داروں کی امداد میں نوع انسان کی عام ہمدردی پر بھی مبنی ہو سکتی ہے لیکن خدا کے دین کے لیے سر سے دینا صرف رضائے الہی کی طلب کا نتیجہ ہو سکتا ہے جس میں کسی اور جذبہ کی آمیزش ممکن نہیں ہے۔

۱۳۳۔ اے اہل ایمان جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا تو قریب ہے کہ اللہ ایسا گروہ پیدا کرے جس میں خدا دوست رکھتا ہو اور وہ بھی خدا کو دوست رکھنے والے ہوں۔ مومنین کے مقابلے میں نہایت نرم اور جھکے ہوئے لیکن دشمنوں کے مقابلے میں نہایت سخت، اللہ کی راہ میں جان نثاریں گے اور کسی طاقت گر کی طاقت سے نہ ڈریں گے۔ اس آیت میں اسلام کی بادی بقا و حفاظت کے متعلق عظیم الشان پیشین گوئی کی گئی ہے۔ پچھلے آیات میں کفار کی مولات سے منع

کیا گیا تھا۔ ممکن تھا کہ کوئی شخص یا قوم مولا کی بدولت صریحاً اسلام سے پھر جاتے جیسا کہ دمن
یتو لہم منکبہ فافہ منہم میں تبصرہ کی گئی ہے۔ قرآن کریم نے نہایت قوت اور صفائی کے
ساتھ اٹھ کر دیا کہ ایسے لوگ اسلام سے پھر کر کچھ اپنا ہی نقصان کریں گے۔ اسلام کو کوئی ضرر نہیں پہنچا
سکتے۔ حق تعالیٰ مرتدین کے بدلے میں یا ان کے مقابلے میں ایسی قوم لے آئے گا جن کو خدا کا عشق
ہو اور خدا ان سے محبت کرے وہ مسلمانوں پر شفیق و مہربان اور دشمنان اسلام کے مقابلے میں غالب
اور زبردست ہوں گے۔ یہ پیشین گوئی محول اللہ و قوت ہر قرن میں پوری برتی رہی۔ ارتداد کا سب سے
بڑا فتنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صدیق اکبر کے عہد میں پھیلا۔ کئی طرح کے
مرتدین اسلام کے مقابلے میں کھڑے ہو گئے مگر صدیق اکبر کی ایمانی حیوت اور اعلیٰ قدر اور مخلص مسلمانوں
کی سرفروشانہ اور عاشقانہ خدمات اسلام نے اس آگ کو بجھایا اور سارے عرب کو متحد کر کے از نو خلافت
ایمان کے راستہ پر گامزن کیا۔ آج بھی ہم مشاہدہ کرتے دیکھتے ہیں کہ جب کبھی چند عالمی اور طامع انہماک
اسلام کے حلقے سے نکلنے لگتے ہیں تو ان سے زیادہ اور ان سے بہتر تعلیم یافتہ اور محقق غیر مسلموں کو
اسلام فطری کشش سے اپنی طرف جذب کر لیتا ہے اور مرتدین کی سرکوبی کے لیے خدا ایسے وفادار
اور جاں نثار مسلمانوں کو کھڑا کر دیتا ہے جنہیں خدا کے راستے میں کسی کی طاقت اور وطن و تہذیب کی پڑا
نہیں ہوتی ہے

ان آیات میں پہلے اسلام کے لیے ایک رکاوٹ کا ذکر کر کے پھر اُمت مسلمہ کو بتایا ہے کہ اس
رکاوٹ کے بائیں میں اُمت کا رویہ کیا ہونا چاہیے؟

یہ دنیا خیر و شر کا مسکن ہے، یہاں بھلائی کی بھی حقائق موجود ہیں اور بُرائی کی بھی۔ اور دونوں
کو اپنے اپنے طور پر کام کرنے کی پوری آزادی ہے جس کا نتیجہ ہے کہ یہ دونوں باہم ٹکراتی رہتی ہیں
اور ایک دوسرے کو زیر کرنے کے لیے برابر زور لگاتی رہتی ہیں اس لیے ایک فطری سی بات
ہے کہ اسلام کی راہ بھی روکی جاتے اور یہ رکاوٹ کبھی اندر سے ہوگی اور کبھی باہر سے۔ باہر سے
رکاوٹ کا نام کفر ہے اور اندر کی رکاوٹ کا نام نفاق ہے۔ کفر اگر ایمان کا مقابل ہے تو نفاق
اخلاص کا۔ ایمان و کفر کی طرح نفاق کی تمام حالتیں بھی یکساں نہیں ہوتی ہیں۔ چونکہ اصل کے
اقتدار سے یہ حالت بھی انکار ہی کی ایک اقرار نام صورت ہے اس لیے جب برہمنی ہے تو انکار

قطعی کی طرف بڑھتی ہے اور اسی کے خصائص رونما ہونے لگتے ہیں کسی میں کم اور کسی میں زیادہ یہاں اسی کی ترقی یافتہ صورت کو ارتداد کہا ہے۔

تاریخ اسلام بتاتی ہے کہ زمانہ نبوت میں اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال مبارک کے بعد اسلام کو ارتداد کے فتنے سے دوچار ہونا پڑا۔ تاریخ میں اس کی تفصیلات محفوظ ہیں۔ ہم اسی کا خلاصہ بریہ ناظرین کرتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ

اس آیت قرآنی کا مقصد دو باتیں ہیں ایک اس حادثہ کی خبر دینا جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض وفات میں پیش آیا اور آپ کی وفات کے بعد ترقی کر گیا۔ دوسرے اس تدبیر سے آگاہ کرنا جو خدا نے غیب الیب میں اس حادثہ کے لیے مقرر فرمائی ہے تاکہ جس وقت حادثہ رونما ہو لوگ اس سے کچھ ناخبر ہوں اور ان کے دلوں میں کوئی اضطراب نہ ہو اور جب غیب سے وہ تدبیر ظاہر ہو تو اس میں پوئے اہتمام سے کوشش کریں اور اسے پورا کرنے میں بھول نہ ہوں۔

حادثہ ارتداد کی تاریخ

حضور انور کے زمانے میں جو لوگ ارتداد کا شکار ہوئے ان میں بنو نضیر، بنو حنیفہ اور بنو اسد کے تین خاندان ہیں۔ بنو نضیر میں اسد غنی نبوت کا دعویٰ لے کر کھڑا ہوا اور یمن کے شہروں پر قابض ہو گیا اور یزدیج کے ماتھے سے قتل ہوا۔ بنو حنیفہ میں سیر نے دعویٰ نبوت کیا۔ اور بنو اسد میں سے طلحہ بن خویلد نے دعویٰ نبوت کیا۔

حضرت ابو بکر کے زمانہ خلافت میں سات خاندان فزادہ، غطفان، بنو سلیم، بنو ربیع، اقیہ، کذہ، بنو بکر میں نو خاندان کا شکار ہوئے۔ اور عثمان کا قبیلہ حضرت عمر کے زمانے میں مرتد ہوا۔ علامہ زعفرانی لکھتے ہیں کہ عرب کے گیارہ قبیلے مرتد ہوئے، جہن قبیلے تو حضور انور کے آخری زمانے میں۔ باقی حضرت ابو بکر اور عمر کے زمانے میں اور علامہ خطابی رقمطراز ہیں کہ جن لوگوں نے ارتداد اختیار کیا وہ دو قسم کے تھے کچھ تودہ تھے جو اسلام ہی کو کالی طور پر خراب دیکھ چکے تھے۔ ان کی بھی قدیمیں ہیں ایک وہ جو حضور کی نبوت کے منکر تھے اور دوسرے وہ جو اسلامی قوانین کی مجاہدستی زمانے سے ہوتے نماز اور زکوٰۃ چھوڑ دیتے تھے۔ اور ایک قسم وہ تھے جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرتے تھے، زکوٰۃ مکرر کرنا

دیتی تھی۔ یہ لوگ درحقیقت باغیوں کے زمرے میں داخل ہیں لیکن اس دور میں روادے کے غلبہ کے پیش نظر ان کو باغی نہیں بلکہ مرتد کہہ دیا گیا ہے۔

شوکانی نے نیل الاوطار میں اس طرف اشارہ کیا ہے، فرماتے تھے۔

وہ مانعین زکوٰۃ جو اصل دین پر قائم ہوں وہ باغی ہیں ان کو علیحدہ کر کے کافر نہیں کہا گیا۔ اگرچہ ارتداد کی نسبت تاریخ میں ان کی طرف ہے کیونکہ وہ مرتدین کے اس معاملہ میں بھڑکتے۔ لغت میں ارتداد کے معنی پھٹنے کے ہیں ہر شخص جو اختیار کردہ روادے ہمتا ہے وہ مرتد ہے اس معنی لغوی کے لحاظ سے مانعین زکوٰۃ میں طاعت سے انحراف کا رد فرماتا اس لیے ان کو مرتد کہہ دیا گیا۔

حکیم الامت ثناء ولی اللہ نے ازالۃ الخفاء میں اس عارضہ ارتداد پر جو تشریحی نوٹ لکھا ہے وہ بہت قیمتی ہونے کے ساتھ ایک تاریخی دستاویز بھی ہے اس لیے میں یہاں وہ بدیہہ ناظرین کرتا ہوں، فرماتے ہیں کہ

حضرت ابو موسیٰ اشعر و سلم کے آخر زمانے میں عرب کے تین فرقے مرتد ہو گئے اور ہر فرقہ میں سے ایک ایک شخص دعویٰ نبوت لے کر اٹھا اور اس کی قوم نے اس کی تصدیق کی اور ایک فتنہ عظیم برپا ہو گیا۔ اول ذوالخمار عیسیٰ نے جو کائنات اور شبہہ بازی میں بڑی مہارت رکھتا تھا۔ قبیلہ مدحج میں دعویٰ

لے قرطبی نے یہ بات لکھی ہے کہ مرتد اپنے ارتداد میں دو قسم کے تھے۔ ایک قسم تو وہ تھی جس نے اسلام بھی کھو دیا تھا اور ایک قسم وہ تھی جس نے زکوٰۃ کو فرضیت کا انکار کر دیا تھا۔ اس تشریح میں اور علامہ خطابی و شوکانی کے بیان میں جو بڑی فرق ہے۔ اس تشریح کی صورت میں ان سب قتال ارتداد کی بنا پر ہو لیکن خطابی اور شوکانی کی تشریح پر سب قتال روادے کی بنا پر اور مانعین زکوٰۃ سے قتال بھادوت کی بنا پر محمد امام بخاری نے صحیح میں عنوان ہی میں اس طرف اشارہ کیا ہے فرماتے ہیں قتل من ابی قبول الغرض و ما لبسوا الی اللہ وہ۔ ان لوگوں کو قتل کرنا جو فرائض کا انکار کر دیں لاکھ ان کو مرتد نہیں کہا گیا۔ مجھے کرائی کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ یہاں مانعین ہیں۔ اس میں امام بخاری نے اشارہ کیا کہ اگر قبول فرائض کا انکار ہو تو یہ طاعت سے روگردانی ہے اور یہ باغی ہیں اور ان کی طرف ارتداد کی نسبت نہیں ہے۔ ان کا قتل انکار قبول کی وجہ سے ہے۔ اگرچہ حافظ عثمانی نے ماکو مصدر یہ اور حافظ عینی نے ماکو موصولہ قرار دیا ہے لیکن کرائی کی بات جی کو لگتی ہے۔

جنت کے کراٹھا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت معاذ بن جبل کو امداد ان تمام مسلمانوں کو جو ان کے ہمارے خط لکھا کہ وہ ظالم سے لڑنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ حضرت فیروز دہلی نے معاذ کے حکم سے ذوالفقار کو قتل کر ڈالا اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی خبر دیہ دہی اطلاع ہو گئی اور فرمایا غانہ فیرہ نہا کہ فیروز کا یہاں ہو گیا۔ اور بظاہر اس واقعہ کی خبر دیہ اول کے آخر میں حضور کے وصال کے بعد حضرت صدیق اکبر کو ملی۔ دوسرے میلہ کذاب یہ کہیں بنی حنیفہ میں شہر عامر میں دعویٰ نبوت لے کر کھڑا ہوا اور بارگاہ نبوت میں اس گستاخ نے ایک خط بھی لکھا جس کا مضمون یہ تھا،

میلہ رسول اللہ کی طرف سے محمد رسول اللہ کو واقع ہو کر ملک آدھا میرا ہے اور
آدھا رب کا۔

یہ خط میلہ نے بارگاہ نبوت میں دو آدمیوں کے ہاتھ ردا دیا۔ آپ نے ان دونوں سے دریافت کیا کہ کیا تم دونوں اس کی شہادت دیتے ہو کہ میلہ رسول اللہ کا رسول ہے، ان دونوں نے کہا کہ ہاں۔ فرمایا کہ اگر قاصد کو قتل نہ کرنے کا دستور نہ ہوتا تو تمہاری گردن مانے کا میں ضرور حکم دیتا، اس کے بعد حضور انور نے اس خط کا جواب لکھا جس کا مضمون یہ تھا۔

محمد رسول اللہ کی طرف سے میلہ کذاب کو معلوم ہو کر ملک اللہ کا ہے جس کو چاہتا ہے اس کو ملک بناتا ہے اور انجام پذیر گاروں کے لیے ہے۔

اس کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہو گئے اور بالآخر رفیق اعلیٰ سے ۳۷ سالے صدیق اکبر نے بڑے لشکر کے ساتھ حضرت خالد بن الولید کو میلہ کذاب کی طرف ردا دیا۔ انہوں نے اس کا کام تمام کر دیا۔

قبولہ علیہ السلام یہ بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں قبیلہ بنی اسد میں دعویٰ نبوت لے کر اٹھا آپ کی وفات کے بعد حضرت صدیق اکبر نے خالد بن الولید کو اس جماعت کی سرکوبی کے لیے ردا دیا حضرت خالد نے ان کو شکست دی اور ظہیر مجاہد کیا۔ اس کے بعد وہ مسلمان ہو گیا اور جنگ قادسیہ میں خوب کام کیا۔

اس کے بعد ارتداد کی آگ خوب پھیل گئی۔ حرین اور قرہ جو اہل کے علاوہ سارا عرب اس کی لپیٹ میں آگیا اور ایک گروہ نے زکوٰۃ دینی بند کر دی۔ اسی گروہ کے باسے میں فقہائے صحابہ میں باہم مباشرت ہوا کہ یہ لوگ اہل قبلہ ہیں ان سے قتال جائز نہیں ہے۔ ان فقہائے صحابہ میں فاروق اعظم تھے۔ آپ حضرت ابو بکر سے فرماتے تھے کہ آپ ان لوگوں سے جنگ کیسے کر سکتے ہیں جو لا الہ الا اللہ کہتے ہیں حضور انور

کا ارشاد ہے مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک جنگ کروں تا کہ وہ لا الہ الا اللہ کہہ لیں، جو یہ کہہ لے گا اس کی جان اور مال محفوظ ہے۔ حضرت ابو بکر نے فرمایا کہ میں اس شخص سے خود لڑوں گا جو نماز اور زکوٰۃ میں تعزیر کرتا ہے کیونکہ زکوٰۃ حق مال ہے، لہذا اگر وہ ایک بھری کا پیر جو نماز و زکوٰۃ میں ادا کرتے تھے اب نہیں کرتے تو میں اس سے اس کے زینے پر بھی جنگ کروں گا۔ حضرت فرماتے ہیں کہ میں نے کبھی یہ نہیں کیا کہ یہی حق ہے۔

تسبیح میں اس حادثہ کی خبر کے بعد تقدی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا مدا کیا ہے اور اسلام کی راہ میں اس غفیم رکاوٹ کو ہٹایا کیسے جائے گا۔ قرآن نے اس سوال کا جواب فسوف یأتی اللہ بقوم میں دیا ہے کہ ان کی جانب سے اس رکاوٹ کو ہٹانے کا یہ کام ان لوگوں کے سپرد کیا جائے گا جن کا چہرہ قرآن کے مفسرین ہیں۔ ہو گا۔

صحابہ خدا کے محبوب اور خدا ان کا محبوب ہے

اصل ارشاد میں مجھ سے دیکھو، کیا ہے یعنی جن سے خدا محبت کرتا ہے اور جو خدا سے محبت کرتے ہیں، دین و دنیا کی سب سے بڑی نعمت محبت ہے، خاص کر وہ محبت اور پیار جو خدا کو اپنے بندے کے ساتھ ہو۔ یہ غیر فانی نعمت اور یہ لازوال دولت جن ذریعوں سے انسان کو حاصل ہو سکتی ہے ان میں دیگر فضیلتوں کے بعد سب سے بڑا اور اہم ذریعہ حسن اخلاق ہے۔ اللہ تعالیٰ کی محبت پر زور تو سب سے زیادہ ہے مگر اصل سوال یہ ہے کہ خدا کی محبت کے حصول کا طریقہ کیا ہے اور یہ دولت انسان کو کیونکر مل سکتی ہے۔ اس کا جواب قرآن نے دیا ہے مختصر یہ کہ ہر کام اور ہر چیز، افکار و اعمال، اخلاق میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی محبت اللہ کا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی زبان سے فرمایا قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحبکم اللہ۔

اس سے معلوم ہوا کہ جن کا چہرہ میاں مجھ سے ذریعے پیش کیا جا رہا ہے یعنی صحابہ کرام ان کے افکار، اعمال، اخلاق، حضرات انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات، ارشادات، احکام، اخلاق اور اعمال کا پورا پورا عکس اور کاپی تھے۔ اگر ان کے افکار، اعمال اور اخلاق اس قدر تھے جو کہ پیمانہ سے ذرا نیچے ہوتے تو قرآن ان کا چہرہ مجھ سے پیش نہ کرتا اور صرف اتنا ہی نہیں کہ یہ تو مختصر بات ہے بلکہ قرآن نے نام بنام بتایا ہے کہ اللہ کی محبت کے سستی کون لوگ ہیں اور اس دولت سے محروم کون ہیں۔ قرآن نے بتایا ہے کہ خدا کن لوگوں سے محبت کرتا ہے۔ پڑھیے اور ٹھنڈے دل سے

پڑھیے اور پھر سوچئے کہ قرآن مجید ہمیں کون کون کی باتیں کہتا ہے، وہ ان باتوں کا الگ الگ ہی ذکر کیا ہے جن سے اللہ محبت کرتا ہے مثلاً ان اللہ يحب المحسنين اور ان اللہ يحب المتوابين اور ان اللہ يحب المتوكلين اور ان اللہ يحب المقسطين اور ان اللہ يحب المتقين اور ان اللہ يحب الصابرين اور ان اللہ يحب المطهرين اور ان اللہ يحب الذين يقاتلون في سبيلہ صفاً اس کا مطلب صاف ادا کیے مظلوموں میں سے یا کہ جن اشخاص کے بارے میں یہاں قرآن نے اعلان کیا ہے کہ انہوں نے اللہ سے محبت کرتا ہے وہ حضرات اگر ایک طرف اپنے افکار، اعمال اور اخلاق میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے افکار، اعمال اور اخلاق کا کامل ترین نمونہ ہیں اور ہونا بھی چاہیے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو قرآن میں محمد رسول اللہ کے ساتھ والذین احسنوا اور یہی صفت یہ حضرات احسان، توبہ، التوکل، الصفا، تقویٰ، صبر، پاکیزگی اور اللہ کی راہ میں جہاد کے اوصاف سے بھی موصوف ہیں، کیونکہ جیسے کہ دیکھئے اعلان کا تقاضا یہ ہے کہ ان میں یہ صفات موجود ہیں اور ساتھ ہی جیسے کہ اطلاق ہوتا ہے کہ خدا کے ان مجبوروں کے دامن ان رذائل سے بھی پاک ہیں جو محبت الہی کے فیضان سے انسان کو محروم کرتے ہیں۔ مثلاً کفر، فخر و غرور، بدلہ لینے میں حد سے بڑھ جانا، خیانت، ناسمجھی، فساد، اصراف، ظلم، گنہگار، تکبر، قرآن میں ان آیات کا مطالعہ کرو جن میں ان رذائل کا نام لے کر بتایا ہے کہ خدا ان لوگوں سے محبت نہیں کرتا جن میں یہ اوصاف موجود ہوں مثلاً ان اللہ لا يحب الکافرين اور ان اللہ لا يحب المعتدين اور ان اللہ لا يحب کل خوانا شیء، ان اللہ لا يحب من کان غفلاً الخیر اور ان اللہ لا يحب الفرحین، ان اللہ لا يحب المفسدين، لا يحب السرفین، ان اللہ لا يحب المتکبرین ان اللہ لا يحب الظالمین وغیرہ وغیرہ۔

اس صورت میں جیسے کہ مطلب یہ ہے کہ محبت سے جن کا یہاں تعارف کرایا جا رہا ہے وہ اگر ایک طرف ایمان، احسان، توبہ، توکل، انصاف، تقویٰ، صبر، پاکیزگی اور جہاد جیسے اخلاقی فضائل کی دولت سے مالا مال ہیں تو دوسری طرف کفر، بدگرتی، بدلہ لینے میں حد سے بڑھ جانا، فخر و غرور، یعنی خیانت، ناسمجھی، فساد، اصراف، استکبار، ظلم جیسے رذائل کا بھی ان کے دامن پر کوئی داغ نہیں ہے کیونکہ یہ وہ باطنی قیام ہیں جو انسان کو محبت الہی کے ساتھ سے دور کرتی ہیں۔

ان کی خدا سے محبت

صرف اسی پر اتنا نہیں فرمایا کہ انہوں نے اللہ سے محبت کرتا ہے بلکہ فرمایا جیسا کہ وہ بھی اللہ سے

محبت کرتے ہیں۔ یہ فرقہ بتاتا ہے کہ ان کا سینہ اس اذلی وابدی عشق و محبت کے نور سے کس درجہ معمور ہے اور وہ غم خاندانست کی سرشاری کی یاد بیکے ہوتے انسانوں کو کس کس طرح دلائے ہیں۔ ایمان کی سب سے بڑی خاصیت اور علامت حب الہی ہے اور یہ وہ دولت ہے کہ اہل ایمان کی جماعت کو ۴۲ نصیب ہو چکی تھی۔ زبان الہی نے اس کی شہادت دی۔ والدین آسنوا اشد تحبا للہ۔ اس نشہ محبت پر آپ ماں اولاد بھائی بیوی ہاں مال اور خاندان سب کچھ قربان کر دیا جاتا ہے یہاں بھروسہ کی تعبیر تیار ہوتا ہے کہ وہ اس راہ کی ساری منزلوں سے غمگین گزر چکے تھے۔ ایمان اللہ کا حقیقی امتحان محبت میں ہوتا ہے اور یہی وہ کسوٹی ہے جس پر کھرے کھوٹے کی تیز ہوتی ہے۔ اسی پر زندگی کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں۔ اسی سے منظر ایک جائدار، انقلاب انگیز اور متحرک نظام فکرو عمل بنتا ہے۔ اس کا ضمیر عشق کی دولت انگیزوں اور جہنم نوازوں سے تیار ہوتا ہے۔ اسی میں ایثار و قربانی اور سر فروشیوں کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے جن سے پہلے یہ کیا گیا تھا کہ

ان کان ابادکم و اہنا نکم و انہ و اجکم و عشیرتکم و

اموال اقتر فتموھا و متجارۃ تخشون کدھا و ماکن ترضو نھا احب

الیکم من اللہ و رسوله و جہاد فی سبیلہ فقرہ صواحقی یا قی اللہ

اگر تمہارے والدین تمہاری اولاد تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارا خاندان تمہارا

جمع کروہ سرمایہ تمہارا کاروبار جس کے نقصان کا تمہیں اندیشہ ہے اور تمہاری پسندیدہ

رہائش گاہیں، تمہیں اللہ اور اس کے رسول اور اللہ کی راہ میں محنت سے زیادہ

محبوب ہیں تو بس انتظار کرو۔

اب یہاں ان ہی کے بارے میں پوچھی دنیا کو سنایا جا رہا ہے کہ مجھ کو اللہ سے محبت

کرتے ہیں۔

یہ بات کہ اللہ بھانز، محبت کرتے ہیں اور اللہ سے محبت کی حالت ہے۔ اپنے حقیقی معنی میں

ہے لیکن اس کی محبت بھی اس کے علم، اس کی قدرت کی طرح بے مثال ہے اس لیے زمخشری کی

برہنہائی میں محبت کی تاویل ثواب دینے سے کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تفسیر خالص حکما کا ہے

زمخشری نے اس کا بھی انکار کیا ہے کہ بندے اللہ سے محبت کرتے ہیں۔ یہاں بھی وہ تاویل کرتا ہے

کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ طاعت کرتے ہیں۔ صاحب انتصاف نے زمخشری کی جھوٹ تردید کی ہے

امام غزالی نے اعیان العلوم میں حافظ ابن القیم نے مدارج السالکین اور روضۃ الجہین میں علامہ مرتضیٰ زبیدی

نے اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اگر ہمیں اس جلد کی ضخامت کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم اس موضوع پر بیان تفصیل بحث کرتے تاہم خلاصہ کے طور پر اتنا سمجھ لیجئے کہ لغت میں محبت نام ہے صاحبِ محبت کے محبوب کی طرف مائل ہونے کا۔ جن لذتوں کی وجہ سے انسان محبت کرتا ہے وہ دو قسم کی ہیں محسوس اور عقلی۔ محسوس کھانے میں ذوق کی لذت، خوبصورتی میں نگاہ کی لذت، خوشبودن میں ناک کی لذت، فغروں میں گلہن کی لذت اور عقلی جیسے ہوا و منصب، امامت و حکومت اور علوم و فنون کی لذت اور عقلی لذتوں میں بھی فرق ہر مرتبہ ہے۔ علوم کی لذتیں معلومات کے تابع ہوتی ہیں۔ معلومات میں اللہ سے زیادہ کامل اور جمیل کوئی معلوم نہیں ہے۔ اللہ کی معرفت اور اس کے ہلال و کمال کی معرفت سے حاصل شدہ لذت تمام لذتوں سے بالا ہے اور جو محبت اس راہ سے آئے گی وہ سب جہتوں سے برتر ہوگی اور یہی محبت خدا کی طاعت کا باعث ہے اس سے معلوم ہوا کہ بندے کا اللہ سے محبت کرنا نہ صرف ممکن ہے بلکہ امر واقعہ ہے۔ یہ لازم و بشرط ایمان سے ہے۔ لوگ اس محبت میں فرق مراتب رکھتے ہیں۔

صحیح بخاری اور مسلم میں متعدد طریقوں سے حضرت انس سے روایت ہے کہ ایک وفد ایک صحابی نے خدمت والا میں حاضر ہو کر دریافت کیا کہ یا رسول اللہ قیامت کب آئے گی؟ فرمایا تم نے اس کے لیے کیا سامان کر رکھا ہے۔ انہوں نے نام ہو کر شکستہ دل سے کہا کہ یا رسول اللہ میرے پاس نہ تو ناز وں کا بڑا ذخیرہ ہے نہ رو زوں کا اور نہ صدقات و خیرات کا جو کچھ میرا ہے وہ صرف اللہ و رسول کی محبت ہے اور جس فرمایا تو انسان جس سے محبت کرے گا اسی کے ساتھ شہید گا۔ صحابہ نے اس بشارت کو سن کر اس دن بڑی خوشی منائی۔

صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جب خدا کسی بندے کو چاہتا ہے تو حضرت جبریل سے کہتا ہے کہ میں خلائ بندے کو پیار کرتا ہوں تم بھی پیار کرو تو جبریل بھی اس کو پیار کرتے ہیں اور آسمان و ارض بھی اس کو پیار کرتے ہیں اور پھر زمین میں اس کو ہر العزیزی اور حسن قبول بخشتا جاتا ہے۔ عام ایمان خدا و رسول پر یقین کرتا ہے لیکن اس کی آخری منزل اس ماہ میں یہ ہے صحیحین میں ہے کہ خدا و رسول کی محبت کے آئنے تمام سوا کی جہتیں پہنچ ہو کر رہ جائیں۔

ایمان کے سامنے پیچھے ہو اور کفر کے مقابلے میں تنہا ہوتے

ان لوگوں کا چہرہ بیان کرتے ہوئے جن کے ذریعے قرآن فتنہ ارتداد کی سرکوبی کر کے اسلام کا بول بالا کرنا چاہتا ہے دوسری صفت یہ بتائی ہے کہ وہ اپنوں کے سامنے پیچھے ہستے اور غیروں کے

مقابلے میں تن کر رہتے ہیں۔ صلہ اشراف میں اذلتہ علی المؤمنین اعنۃ علی الکافرین کی تعبیر اُلیٰ ہے، یعنی اشراف نے مکہ ہے کہ اذلتہ ذلیل کی جمع ہے اور اس کے معنی خاکسار نیاز مند اور متواضع کے ہیں۔ یہاں پہلے اذلتہ المؤمنین کے اذلتہ علی المؤمنین کی تعبیر یہ بتانے کے لیے اختیار کی ہے کہ یہ نیاز مندی اور خاکساری رحمت و شفقت کی بنا پر ہے اور رفعت شان اور علوم تہ کے باوجود وہ اہل ایمان کے سامنے ہچکے رہتے ہیں اور انہیں اعزۃ علی الکافرین پہلے فقرے کی تکمیل ہے ممکن ہے کوئی اذلتہ علی المؤمنین کا بول سن کر یہ خیال کرے کہ ان میں عزت نفس اور خوداری نہیں ہے اس لیے خاکساری فرمایا نہیں اس لیے نہیں بلکہ ان میں عزت نفس اور خوداری بدرجہ اتم موجود ہے۔ یہ خاکساری اہل ایمان کے مقابلہ میں اختیار کی ہے ورنہ وہ کافروں کے مقابلہ میں عزیز ہیں۔ زرخیزی نے کشمکش میں ابن حیان نے البرکات میں قاضی بیضاوی نے انوار التذلی میں اور ابن کثیر نے تفسیر میں اس آیت کو اشداد علی الکفار کا رد قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ اس آیت کے وہی معنی ہیں جو اشداد علی الکفار صحاح میں معنی کے ہیں الفاظ مختلف ہیں وضع دونوں کی ایک ہے اعنۃ علی الکافرین اور اشداد علی الکفار کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ کافروں کے ساتھ سنگ دل، بے رحمی اور بد اخلاقی سے پیش آتے ہیں بلکہ معنی یہ ہیں کہ یہ اہل ایمان اپنی ہمت، استقلال، باہمی اتحاد اور شدت ایمان کے سبب سے ایسے سخت ہیں کہ کفار ان سے مرعوب ہیں اس لیے محاذ سے کے مطابق اشداد کا ترجمہ یہ نہیں کرنا چاہیے کہ وہ کافروں پر سخت ہیں بلکہ یہ کھنچا پیسہ کہ وہ کفار پر بھاری ہیں یعنی ان پر غالب اور ان کے مقابلہ میں کافی مضبوط ہیں۔ اس سے چار بات اشارۃً معلوم ہر گز نہ کر حق کے مخالفوں کے ساتھ جس شدت اور عزت کا حکم دیا گیا ہے اس کا منشا ذاتی قومی، کلّی اور سانی نفرت و بیزاری نہیں بلکہ وہ صرف حق کی نصرت اور کفر کی نفرت کے لیے دیا گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان اہل کے حامیوں کے ساتھ عدل و انصاف اور نیک برتاؤ سے نہیں روکا۔

تصحیح اخلاق کا اسلامی طریقہ

اخلاقیات پر خود مسلمانوں نے بھی بڑی بڑی کتابیں لکھی ہیں لیکن اگر اسے جزات بے باق قرار دیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ اس قسم کی کتابوں میں زیادہ غیر اسلامی مکتب کے افکار کی تقلید کی گئی ہے اور بزور اسلامی اخلاق پر ان کو چسپاں کرنے کی لا حاصل بلکہ کام کو شش کی گئی ہے۔ اخلاقی مسائل جن کا باکلیہ عمل اور صرف عمل سے تعلق تھا ان کو فلسفہ اور نظریات کی بھول جھلسوں میں اس طرح

گم کر دیا ہے کہ عمل کے لیے مشعل ہی ہے ایک عالمی آدمی ان کتابوں کی روشنی میں کسی لاکھ عمل کا انتخاب کر سکتا ہے۔ قرآن نے اخلاق انسانی کے اس مسئلہ کو اسی آیت میں کس خوبصورتی سے حل کر دیا ہے: اذلت علی المؤمنین اھزۃ علی الکافرین اس فقرے میں فطرت انسانی کے وہ سارے اوصاف جن کی قدرت و جدت سے دنیا بھر میں ہے۔ غصہ، عداوت، حسد، الغرض وہ سب کچھ جن سے دوسروں کو تکلیف پہنچاتی ہے۔ بھائے اس بات کے مسلمانوں کو حکم دیا جاتا کہ اپنے کو ان زائل سے پاک کر دے، کفر کی طرف ان کا رخ پھیر کر عزت کی ان ہی صفات کو قرآن نے کتنا کارآمد اور قیمتی بنا دیا۔ کفر کس چیز کا نام ہے۔ ان ہی چیزوں کا جنہیں اختیار کر کے اپنے ہاتھوں آدمی خود اپنے آپ کو اپنی توانائیوں کو خطرات میں گم چھپا دیتا ہے۔ یہ کیسا لطیف انداز ہے کہ جن صفات کا فقیروں سے انسانیت بے قابضی صرف ایک لحاظ میں قرآن نے ان ہی کو محسوس و محسوس کے اس انبار کی صفائی کا ذریعہ بنا دیا جس کا نام قرآن کی اصطلاح میں کفر ہے جن سے زحمت ہو رہی تھی وہی اولادِ آدم کی خدمت کا وسیلہ بن گئے اس طرے اس آیت میں ہمیں تعلیمی اخلاق کا قرآنی طریقہ بتا دیا۔ کتنا چاہتا ہوں کہ

قدیم فلسفہ اخلاق کے واقف کلام خوب جانتے ہیں کہ انسان کے تمام اخلاق کی بنیاد اس کی دو قوتوں پر ہے قوت غضب اور قوت شہوت۔ بحیثیت کی تعلیم کا فضا انسان کی ان دونوں غضبی اور شہوی قوتوں کا استعمال ہے اور قرآنی تعلیم کی غرض ان دونوں کو افراط و تفریط سے ہٹا کر ان میں توسط اور اعتدال پیدا کرنا ہے۔ امام غزالی کے بقول قرآن نے غصہ کے دبانے کی تعریف کی ہے غصہ کے مٹانے کی نہیں۔ اس نے داکھائیں اظہر فرمایا ہے و الذائقین الغیظ نہیں فرمایا۔

دنیا میں ملو ہمزہ خوشی و مسرت، دلولہ و انبساط، رونق و ترقی، جدوجہد جو کچھ ہے وہ ان ہی دو قوتوں کی ملوث و ارتعاش ہیں۔ اگر یہ دونوں قوتیں ایک قلم مٹ جائیں یا ان میں افراط و تفریط پیدا ہو جائے تو نیکی و سعادت اور خوش بختی کی ادھی دنیا مر جائے۔ فلسفہ اخلاق میں یہ لکھتے طوطا نہیں رہا کہ نفس غصہ اور خوش بختی چیز نہیں ہے بلکہ بے ماعت اور بے عمل خواہش بُری چیز ہے۔ قرآن نے اپنے پیر و دوں میں ان دو قوتوں کو اعتدال کے ساتھ جمع کیا ہے۔ اس نے جہاں اذلت علی الکافرین کہا ہے وہیں اس نے یہ بھی تعلیم دی ہے کہ اھزۃ علی الکافرین۔ اس کو بتایا کہ عزت صرف اذلت اور شہوت اور اس کے ذمہ داروں کے لیے ہے۔

خدا کے لیے ثبوت اور ناراضی

تذکرہ کے دوہن میں یہاں یہ فتنش ہو کر قرآن نے مرے سے نفرت و بغض کی کج بات

ہی کا خاتمہ کیوں نہ کر دیا۔ یہاں تک فطرت کے قوانین سے چٹم پڑتی ہے۔ محبت، عداوت، موافقت اور مخالفت، رضا مندی اور نادمگی انسان کے فطری جذبات اور دنیا کے تمام کام تمام سرگرمیوں اور تمام جدوجہد ان ہی دو برابر کے جذبات کے نتیجے ہیں۔ اگر انسان کو ان دونوں جذبات سے پاک کر دیا جائے تو اس کے نیک و بد ہر قسم کی گرم برشیاں سرور پڑ جائیں اور یہ آگ کا شعلہ جس سے انسان کا دل عبارت ہے برف کا تودہ بن جائے اس لیے یہ ممکن ہے اور نہ مناسب ہے کہ اس کے محبت اور ناراضی کے جذبات کو سرے سے فنا کر دیا جائے بلکہ جو ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے اندر سے ذاتی رجحانات اور شخصی میلانات کا عنصر علیحدہ کر دیا جائے۔ قرآن یہ نہیں کہتا کہ نفس خبیث و غضب اور نادمگی کے فطری جذبات کو نکال کر یہ نیک و بد یقیناً ناممکن ہے بلکہ یہ کہتا ہے کہ ان جذبات کے استعمال کا صحیح موقع و محل متعین کیا جائے چنانچہ قرآن نے ان موقعوں کی تعیین کی ہے اور بتایا ہے کہ کسی سے مخالفت اور آزدگی، ذاتی خود غرضی اور شخصی نفع و نقصان کے لیے نہ ہو بلکہ اگر یہ ہو تو صرف حق کی حمایت نیک کی اعانت اور خدا کی خوشنودی کے لیے ہو۔ صلح و جنگ، دوستی و دشمنی خوشی و ناخوشی اور محبت و عداوت جو کچھ ہو وہ خدا کے لیے ہر الحب لله والبغض لله۔

یہ کتنا بظاہر بہت خوشنما ہے کہ ہر قسم کی ناخوشی کے جذبات سے انسان کو پاک پرنا چاہیے مگر یہ فرض فطرت کے خلاف ہے۔ ناخوشی ناراضی کو سرے سے تنہا نہیں کیا جاسکتا ہے بلکہ جو ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ناخوشی و ناراضی کے موقع و محل کی اصلاح کی جائے۔ یہ ناممکن ہے کہ انسان کسی چیز سے اور اس کی ضد سے بھی برابر کی محبت کرے وہ جب خیر سے محبت کرے گا تو شر سے ضرور نفرت کرے گا وہ ایمان کو چاہے گا تو کفر سے بیزار بھی ہو گا وہ ایکسوں سے دوستی کرے گا تو مشرکوں سے علیحدہ بھی ہو گا سب اہل ایمان کے لیے خاکسار ہو گا تو اہل کفر کے لیے سنگین بھی ہو گا۔ انسان کے سینے میں صرف ایک دل ہے اور ایک ہی چیز کی اور پھر اسی کی ضد کی دونوں کی محبت نہیں ہو سکتی۔ قرآن میں ہے۔ ما جعل الله له من قلبین ف جوہر سینے میں کسی شخص کے دو دل نہیں ہوتے۔

گویا اب ارشاد کا مطلب یہ ہوا کہ وہ مومنوں پر نرم ہیں یعنی اہل ایمان کے مقابلے میں اپنی طاقت کبھی استعمال نہیں کرتے۔ ان کی ذہانت، ان کی ہوشیاری، ان کی قابلیت، ان کا تسویر و اثران کا مال ان کا نور اور کوئی چیز بھی مسلمانوں کو دبانے اور تانے کے لیے نہ ہو مسلمان اپنے درمیان ہمیشہ نرم خو، رحمدل، ہمدرد اور عظیم ہی پائیں اور کفار پر سخت ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ مومن اپنے ایمان کی پختگی، دینداری کے خلوص اصول کی مضبوطی، سیرت کی طاقت اور ایمانی فراست کی وجہ سے مخالفین

اسلام کے مقابلے میں پتھر کی چٹان کے مانند ہوں کہ کسی طرح کسی لاپرواہی کسی مفاد کی وجہ سے اپنے مقام سے ذہنی جاسکے۔ وہ کبھی ان کو موم کی ناک اور نرم چہرہ نہ پائیں انہیں جب بھی اہل ایمان سے سابقہ پڑے ان کو پتہ لگ جاتے کہ یہ اللہ کے بندے مر سکتے ہیں مٹ جاسکتے۔

راہِ خدا میں جہاد

ان لوگوں کا چہرہ پیش کرتے ہوئے جن کے ذریعے فتنہ ارتداد کو ختم کر کے اسلام کو دنیا میں بالادستی دینی ہے تیسری صفت یہ بتاتی ہے کہ وہ اللہ کے راستے میں جہاد کریں گے۔ اصل ارشاد میں عربی تفسیر مجاہدون فی سبیل اللہ ہے۔ جہاد سے یہاں مقصود ہر وہ جہاد ہے جو اللہ کا کلمہ بلند کرنے اور اس کے دین کو قائم کرنے کے لیے کی جاتے۔ یہ ایمان باللہ کی حقیقی کسوٹی ہے۔ ایمان خالص کا معیار بھی یہ ہے کہ انسان مہروران باطل کے مقابلے میں خدا کا بول بالا کرنے کے لیے مصائب بردار اس کی راہ میں جان لڑا دینے پر آمادہ ہو جائے۔ دنیا کی اور نیکیوں میں ذاتی منفعت کی توقع اور خواہش نہ نفس کی آمیزش ہو سکتی ہے لیکن خدا کی راہ میں جان نثاری صرف محبت کے جذبہ سے پیدا ہوتی ہے۔

ایمان باللہ کا حقیقی امتحان صرف جہاد میں ہوتا ہے اور یہی وہ کسوٹی ہے جس پر کھسے کھڑے کی تیسر ہو جاتی ہے اس لیے مسلمانوں کو اپنی نیکیوں پر قانع ہو کر نہ بیٹھنا چاہیے کیونکہ ممکن ہے ہماری نیکیاں خالص اور بے آمیز نہ ہوں بلکہ ان میں ذاتی اور قومی مفاد کی آمیزش شامل ہو۔ اپنے ایمان کا امتحان کرنا چاہتے ہو تو دیکھو خدا کی راہ میں تکالیف و مصائب برداشت کرنے کی خواہش تم میں کتنی ہے کیونکہ یہی خواہش ایمان کی حقیقی کسوٹی ہے۔ چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

من مات ولم یجد دلیلاً یجود بہ لنفسه مات علی شعبۃ من المنافق

جس کو اس طرح موت آئے کہ وہ تو اس لیے خدا کی راہ میں جہاد کیا اور نہ اپنے دل میں جہاد کی خواہش کی تو وہ ایک طرح سے نفاق کی حالت میں مرا۔

اسلام کے لیے وہ میباک ہیں

ان کی آخری صفت یہ بتاتی گئی ہے کہ لایمضانوں کے لئے لاشعہ یعنی اللہ کے دین کی پروا کرنے میں اس کے احکام پر عمل کرنے میں۔ اور اس دین کی رو سے جو کچھ حق ہے اسے حق اور جو کچھ باطل ہے اسے باطل کہتے ہیں انہیں کوئی باک نہ ہو کہ کسی کی مخالفت کسی کی طعن و تشنیع کے

اعتراف اور کسی کی چھٹی اور ادا نہ کی وہ پروا نہ کریں گے۔ اگر کلمۂ عام اسلام کے خلاف ہو اور اسلام کے طریقے پر چلنے کے معنی اپنے آپ کو دنیا میں لکھنے کے ہوں تب بھی وہ اسکی لاپرواہی کریں گے جیسے وہ بچے دل سے حق جانتے ہیں بلکہ دشمنی نے دکھا ہے کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فترے میں داد کو حالیہ قرار دیا جائے اور مطلب یہ ہو کہ ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ اپنے تمام مفادات اور دینی دلچسپیوں سے منہ موڑ کر اور دوسروں کی نصیحتوں اور ملامتوں سے کان بالکل بند کر کے جہاد کے میدان میں اترتے ہیں۔ جو شخص ہر قدم پر پیچھے ہٹ کر دیکھے گا اور اپنے ناصوں اور ملامت گردوں کی نصیحتوں اور ملامتوں کو بھی اہمیت دے گا وہ اگر ایک قدم آگے بڑھائے گا تو دو قدم پیچھے ہٹے گا۔ عجب شعرا جب ادول العزیز، بہادری اور نیا ضی کی داستان سنتے ہیں تو اس کی تہذیب میں ملامت گردوں کی ملامت کا ضرور ذکر کرتے ہیں اس لیے کہ اس راہ کی سب سے بڑی افت یہ ہی ہے ممکن نہیں ہے کہ آدمی کوئی عزم لے کر اٹھے اور دائیں بائیں سے کچھ ناصع اور کچھ ملامت گرد امن گیر نہ ہو جائیں یہ اس راہ کی پہلی آزمائش ہے اور دشمنی لے یہ بھی بتایا ہے کہ داد عاطف ہو اور بتایا یہ جارہا ہے کہ ان کے اوصاف میں سے جہاد ہے اور یہ بات بھی ہے کہ وہ اپنے دین میں اتنے پختہ ہیں کہ جب دین کا کوئی کام شروع کرتے ہیں تو اس میں اتنے منہمک ہو جاتے ہیں کہ ان کو کسی معترض کا اعتراض کسی ملامت گرد کی ملامت مرعوب نہیں کرتی ہے اور سید رشید رضا فرماتے ہیں کہ بلافت اس میں ہے کہ یہ مستقل وصف ہو اور بتایا جا رہا ہے کہ دین میں ان کے قدم اس قدر مضبوط اور ایمان میں ان کو اتنی جماد حاصل ہے کہ وہ کسی قسم کی ملامت کی قطعاً پروا نہیں کرنے لے۔ کیونکہ ان کی عمل زندگی میں کوئی اقدام نہ خراب یا لوگوں کی راہ واد کے لیے ہوتا ہے اور نہ کسی اندیشہ کی خاطر ہوتا ہے بقدر اس لیے ہوتا ہے کہ احقاق حق اور ابطال باطل ہو اور بس۔

مسند امام احمد میں حضرت ابوذر غفاری کا بیان ہے کہ مجھے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سات کاموں کا حکم دیا ہے ایک مساکین سے محبت کرنے اور ان سے قرب ہونے کا، دوسرے اپنے سے کمتر کو دیکھنے اور اپنے سے بالا کو نہ دیکھنے کا تیسرے صدر جمی کرنے کا، چوتھے کسی سے سوال نہ کرنے کا پانچویں حق کہنے کا چارہ کیسا ہی تلخ ہو، چھٹے اللہ کے معاملے میں کسی ملامت گرد کی ملامت کی پروا نہ کرنے کا اور ساتویں لاسول ولا قوۃ الا باللہ بکثرت کہنے کا۔

واقعات کی روشنی میں مصداق آیت

واقعات کی روشنی میں اس آیت قرآنی کا مصداق تاریخ اسلام میں کون سے اور اللہ سبحانہ کا یہ وعدہ کب پورا ہوا اس کے لیے ہم یہاں حضرت شاہ ولی اللہ کا وہ بیان نقل کرتے ہیں جو انہوں نے از اللہ الخفا میں پیش کیا ہے اور واقعات کی روشنی میں اس کا مصداق بتایا ہے۔

اللہ سبحانہ کا وعدہ یہاں ہے۔ لیکن یہ وعدہ حضور انور کے زمانے میں پورا نہیں ہوا کیونکہ آپ کے زمانے میں مرتدوں کے خلاف کوئی فوجی کارروائی نہیں ہوئی اور شیعیان یعنی ابو بکر و عمر کے بعد بھی تاریخ میں ایسی کسی فوجی مہم کا ذکر نہیں ہے جس میں مرتدوں کی سرکوبی کی گئی ہو۔ تاریخ میں اس کا مصداق صدیق اکبر کی فوجی مہم کے سوا کوئی نہیں ہے۔ آپ کی فوج طغیاء کوچ، مکرہدوں کی سرکوبی کے لیے میدان میں آئی اور اس نے بہت جلد اور نہایت عمدہ طریق پر اس فرمن کو انجام دیا اور چونکہ فوج کی ہر رسانی اور اپنی ارتداد سے لڑنا خلافت خاصہ کے لوازم سے ہے کیونکہ خلافت راشدہ کہتے ہی اسے ہیں جو اقامت دین کی خاطر دشمنان خدا سے جہاد کرے اور کلمۃ اللہ کا بول بالا کرنے کے لیے وجود میں آئی ہو۔ اور یہ سب چلتے ہیں کہ مرتدوں سے جہاد کرنا اقامت دین کی اعلیٰ ترین قسم ہے۔ اور اپنی ارتداد سے جہاد کرنے والوں کی تعریف ان آیات میں دوہرے آفتاب سے زیادہ واضح ہے۔

اور یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ سبحانہ نے پوری قوت سے یہ بات فرمائی ہے کہ یہ جماعت مرتدین سے قتال کے وقت میں اللہ کی محبوب اور اللہ کی محب ہونے کے ساتھ مختلف صفات سے موصوف تھے اور یہ تمام صفات کمال ہیں۔ لہذا اگر صدیق اکبر اپنی خلافت میں برحق نہ ہوں تو لازم آتا ہے کہ جس جماعت نے ان کے حکم کی تعمیل میں جہاد کیا اور صدیق اکبر سے بیعت کی اور ان کو غلیلہ بنانے پر راضی ہوتے وہ اوصاف کمال سے تھے دامن ہوں۔ اور یہ بات حراۃ قرآن کے خلاف ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ فقہ ارتداد پیدا ہوا تو اللہ سبحانہ نے حضرت صدیق اکبر کے دل میں ان مرتدین سے جہاد کرنے کا داعیہ پیدا فرمایا اور آپ نے عزم کی پوری قوت اور ہمت و استعمال سے جماعت صحابہ کے ذریعے اس فتنہ کا استیصال کیا۔ تاریخ میں اس کا سر کی اہمیت اور عظمت لگانے کے لیے

شاہ ولی اللہ کا یہ بیان پڑھیے۔

حضرت صدیق اکبر کے دل میں جو راحہ رونما ہوا اس کی حیثیت ایک سو شش ہزار سال کی تھی جو بھی سلسلے آتا اس چراغ کی روشنی میں منور ہو جاتا۔ تمام صحابہ ابو بکر کے ہم نوا ہو گئے اور ہمہ پایہ تکمیل کو پہنچی۔ ابو حصین کہتے تھے کہ انبیاء کے بعد حضرت ابو بکر سے افضل کوئی نہیں۔ انہوں نے زمانہ ارتداد میں وہ کام کیا جو ایک نبی ہی کر سکتا ہے۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ حضور اللہ کی وفات کے بعد حضرت ابو بکر پر وہ افتاد ان پڑی کہ اگر پہاڑوں پر پڑتی تو وہ بھی ریزہ ریزہ ہو جاتے۔ نفاق تمام دینے میں پھیل گیا اور اہل عرب مرتد ہو گئے۔ سبذ لوگوں نے ایک نقطہ میں بھی اختلاف کیا تو یہ والد اسے غم کرنے کے لیے اثر کر گئے۔ (انزالہ الخفا)

عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ ہم اہل بیت میں اس لڑائی کو پسند کرتے تھے مگر آخر میں تو ہم ابو بکر کے شکر گزار ہوئے کہ اسلام کو ایک بڑے فتنے سے بچا لیا۔ اور خادوق اعظم فرماتے تھے کہ اگر صدیق اکبر میری تمام عمر کی عبادت لے لیں اور مجھے صرف اپنی ایک رات اور ایک دن ملے جس تو میں راضی ہوں۔ رات سے غلہ ٹور کی رات مراد ہے اور دن سے فتنہ ارتداد کا دن مراد ہے اور حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ قام فی الدودۃ مقام الانبیاء یعنی فتنہ ارتداد میں ابو بکر نے انبیاء والا کام کیا ہے۔

اللہ کی بڑی مہربانی اور فضل

۴۳۔ یہ انشاء کا فضل ہے جس کو چاہے عطا فرماتے اور اللہ بڑی دستوں والا اور بڑے علم والا ہے۔ انسان کی سب سے بڑی سعادت اور اس پر خدا کا بڑا فضل یہ ہے کہ وہ فتنے کے وقت خود جاہ حق پر ثابت قدم رہے، دوسروں کو ہلاکت سے بچانے کی فکر کرے۔ خدا جن بندوں کو چاہے اس سعادت کو بڑی اور فضل عظیم سے حصہ دے عطا فرماتا ہے۔ اس کا فضل غیر محدود ہے اور وہی خوب جانتا ہے کہ کون سا بندہ اس کا اہل ہے۔ جس کو چاہتا ہے سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کی شہرائی ہوئی سنت کے مطابق اس کے اہل ہوتے ہیں۔ ذالک سے اشارہ ایان اور

ان اوصاف و اعمال کی جانب سے جو اجماعی اور پریمان ہو چکے ہیں۔ اس کے یہاں دستیں اور گنگھائیں لافنا ہی ہیں وہ چاہے تو سب کو ان اوصاف کا حامل بنائے لیکن ان اوصاف سے ان ہی کو موصوفہ کیا ہے جو اس کے علم کامل میں اس کے اہل ہوتے ہیں۔

اس فقرے پر پوری اہمیت کے ساتھ ملاحظہ کر کے حکیم الامت نے جو نکتہ آفرینی فرمائی ہے اسے یہاں نظر انداز کر دینا علم کی ناقصی ہے۔ فرماتے ہیں۔

یہ جو فرمایا ہے ضوفاً یا قی اللہ بقوم۔ اللہ ایک قوم کو لائے گا حالانکہ ظاہر میں مسلمانوں کو مہدیین کی سرکوبی کے لیے جمع کوئے ملے حضرت صدیق اکبر تھے اس کی حیثیت بالکل ایسی ہے جیسے مدد کے موقع پر حضور انور کی مشت خاک کو اللہ نے اپنی مشت خاک بتایا و ماسمیت اذ سمیت و لکن اللہ ساعی۔ فی الواقع ان اوصاف کی حامل جماعت کو میدان میں لے آنا اللہ سبحانہ کا کام تھا۔ حضرت صدیق اکبر کی حیثیت تو اُن کے بارہ کی حتیٰ حور کرنا چاہیے کہ اس مرتبہ کے بعد کون سا مرتبہ اس سے بالا ہو سکتا ہے جو ابوبکر کو ملتا ہے اور نبوت کے بعد ابوبکر جیسا کون کامل اور مکمل ہو سکتا ہے یہ اللہ ہی کا فضل ہے جسے چاہے وہ نوازتا ہے۔

موالات کے لیے اہل ایمان کا میدان

۱۳۵۔ تمنا رقیق و مددگار اللہ ہے اس کا رسول ہے اور وہ اہل ایمان ہیں جو نواز قائم کرتے ہیں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور ہر حال میں اللہ کے سامنے جھکے ہوتے ہیں۔ پچھلے آیتوں میں یہود و نصاریٰ کی مہلات اور رفاقت سے روکا تھا جس کو سننے کے بعد طعنایہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر مسلمانوں کے تعلقات و داد اور معاملات رفاقت کس سے ہونے چاہئیں؟ اس آیت میں بتلادیا گیا کہ ان کا رقیق اصلی خدا پیغمبر اور مخلص مسلمانوں کے سوا کوئی نہیں ہے بلکہ

یا ایہا الذین آمنوا اتخذوا الیہود والنصارى اولیاء۔ میں جو بات منفی انداز میں کہی تھی اور جس کے لیے ایک سے زیادہ تعبیری انداز اختیار کیے تھے اس کو پڑھ کر قاری کے ذہن میں یہ سوال خود بخود پچھیاں لینے لگتا ہے کہ پھر ہم اسے تعلقات کا دائرہ کیا ہے اور ہماری موالات کا میدان

کہاں تک ہے؟ اسی کے جواب میں ارشاد ہوا ہے کہ اہل ایمان کی مولات انہ سے، پھر اللہ کے رسول سے اور پھر اہل ایمان سے ہوتی ہے جو غار اور زکوٰۃ کی پابندی کرتے ہوئے پوری زندگی میں اللہ کے سامنے جھکے ہوئے ہوں۔ راکھوں رکوع سے ہے اور درکوع یہاں اصطلاحی معنی میں نہیں بلکہ لغوی معنی میں ہے عام شاریعین قرآن قرآن کو یقینوں اور یوتون کی ضمیر سے حال قرار دیتے ہیں لیکن میں اسے پورے جوتے سے حال سمجھتا ہوں، یعنی الذین یقیمون الصلاۃ و یؤتون الزکوٰۃ سے اور مطلب یہ ہے کہ اسلام کے برادروں شہداء اور ادا کرتے ہوئے وہ پوری زندگی میں اسلام پر عمل پیرا ہوتے ہیں، منافقین کی طرح نہیں کہ کچھ زندگی میں اسلام کو مانیں اور کچھ میں نہ مانیں۔ اور جو لوگ اس کو یقینوں اور یوتون سے حال بتاتے ہیں، کتے ہیں کہ غار اور زکوٰۃ دل کی پوری خوشنودی اور رضا مندی سے ادا کرتے ہیں۔

اللہ کی جماعت کو غلبہ ہوتا ہے

۱۳۶۔ اور دیکھو جو بھی اللہ، اس کے رسول اور اہل ایمان سے دوستی رکھے گا تو بلاشبہ اللہ کا گروہ غالب آئے والا ہے۔ کفار کی کثرت اور مسلمانوں کی قلت دیکھتے ہوئے ممکن تھا کہ کوئی شیف القلوب اور ظاہرین مسلمان اس تردد میں پڑ جاتا کہ تمام دنیا سے مولات منقطع کرنے اور چند مسلمانوں کی رفاقت پر اکتفا کر لینے کے بعد غالب ہونا تو درکنار، کفار کے عملوں سے اپنی زندگی اور بقا کی حفاظت بھی دشوار ہے۔ ایسے لوگوں کی تسلی کے لیے فرمایا کہ مسلمانوں کی قلت اور ظاہری بے مروتی پر غور نہ کرو۔ جس طرف خدا، اس کا رسول اور سچے وفادار مسلمان ہوں گے وہی پرجہاد ہو گا۔ اس آیت نے گویا حضرت عبادہ ابن الصامت کی حوصلہ افزائی کی جن کے یہود بنی قینقاع سے بہت دوستاہ تعلقات تھے مگر اللہ در رسول کی مولات اور مومنین کی رفاقت کے سامنے انہوں نے اپنے سامنے تعلقات منقطع کر لیے۔ علامہ اموی فرماتے ہیں کہ یہاں نہایت بلیغ ایجاز سے کام لیا گیا ہے پوری بات یوں ہے کہ جو لوگ اللہ، اس کے رسول اور اہل ایمان سے مولات کرتے ہیں وہ اللہ کی جماعت ہیں اور اللہ ہی کی جماعت غالب ہونے والی ہے۔ اللہ کی ولایت تو حقیقی ہے کیونکہ وہ ہر خیر کے فیضان کی علت ہے، اللہ کے پیغمبر کی ولایت اس فیضان میں واسطہ ہونے کی وجہ سے ہے اور اہل ایمان کی ولایت اس فیضان کا ظرف ہونے کی وجہ سے جیسے مجربیت میں بالذات اللہ کی محبت

ہے اور پیغمبر کی محبت اللہ کے رسول ہونے کی وجہ سے ہے اور اہل ایمان سے محبت خدا کے نفع سے ہونے کی وجہ سے ہے۔

ان دونوں آیتوں یعنی ۵۵ اور ۵۶ کو آیات ولایت کہتے ہیں۔ اس سے ہمارے جعفری دوستوں نے حضرت علی کی حضور راہور کے بعد بلا فصل امامت کی صحت پر استدلال کیا ہے۔ چنانچہ شیخ ابو علی الفضل بن الحسن الطبرسی اپنی مشہور تفسیر مجمع البیان میں رقمطراز ہیں۔

هذه الآية من ادنى الدلائل على صحة امامة علي بعد النبي بلا فصل

اور اس کو جو بحر دلائل قائم فرماتے ہیں وہ بھی ذرا ان ہی کی زبانی ملاحظہ فرمائیے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں الذین آمنوا سے جماعت نہیں بلکہ حضرت علی مراد ہیں۔ اس سے کام نہ چلا تو ایک قسم آجے بٹھایا کہ حضرت علی نے حالت رکوع میں ایک سوال کرنے والے کو اپنی انگشت بی دے دی تھی یہ اس آیت کے نزول کی وجہ سے پھر جب اس من گھڑت روایت سے بھی دعویٰ کا پیٹ نہ بھرا تو اس پر یہ اضافہ فرمایا کہ یہاں لفظ ولی رفیق و مددگار کے معنے میں نہیں بلکہ یہ ولایت سے ہے اور صاحب حکومت اور صاحب اقتدار کے معنے میں ہے۔ اس سے بھی جب دعویٰ کی تشنگی نہ رہی تو بلا فصل کا اضافہ اپنی طرف سے کیا۔ اور آیت کا مطلب یہ بتایا کر لے مسلمانوں کو اتنا کہ بلا فصل حاکم حضرت علی ہیں جو اہل ایمان ہیں، نماز قائم کرنے میں زکوٰۃ دیتے ہیں اور حالت رکوع میں خیرات کرتے ہیں۔

یہی بات طبرسی نے احتجاج میں، محقق عارف محمد بن الرضیٰ عنہ نے الغنیۃ الکاشانی میں اور مشہور مفسر قرآن فتح اللہ کاشانی نے مفتی الصادقین میں لکھی ہے۔ آئیے ہم ذرا ان کے اس دعویٰ اور دعویٰ کے ان دلائل کا مطالعہ کریں اور آزاد ماحول میں معلوم کریں کہ ان میں کس قدر جہان ہے۔

وہ فرماتے ہیں کہ ولی اس آیت میں بمعنی حاکم ہے۔ ولی کے یہ معنی خلاف لغت عرب ہیں یہاں اسی ولی کی جمع اولیا آئی ہے بعضہم اولیاء بعض اور لا تحخذوا بيهود والنصارى اولیاء ولی کے جو معنے وہاں ہیں وہی معنے یہاں بھی ہیں۔ مصدر رو آتے ہیں ایک ولی اور دوسرے ولایت ہے۔ ولی کے معنے لگتاؤ اور تعلق کے آتے ہیں۔ اسی ولی صفت مشبہ کا معنی ہے، اسی کی جمع اولیا آئی ہے۔ مصدر اگر ولایت ہو تو البرد کی تصریح کے مطابق ریاست کے معنے میں آتا ہے اسی سے والی صفت کا معنی آتا ہے جس کے معنے حاکم سے ہیں۔ فقہاء کرام کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ اگر کسی جنازے میں ولی اور والی دونوں موجود ہوں تو امامت کس کا حق ہے۔ معلوم ہو کہ ولی اور والی میں فرق ہے۔ خود قرآن کی متعدد آیات میں یہ لفظ محب اور دوست کے معنے میں آیا ہے مثلاً

والمؤمنون والمؤمنات بعضهم اولياء بعض اور الان اولياء الله لا خوف عليهم ولا هم يحزنون میں بغیر اضافت ۲۳ جگہ پر آیا ہے اور لفظ اولیا۔ بلا اضافت ۳۴ بار استعمال ہوا ہے۔ سب جگہ پر آیتیں۔ یہاں آیت کا سیاق و سباق بھی یہی نشانہ ہی کر رہا ہے کہ ولی کے معنی یہاں دوست اور رفیق کے ہیں کیونکہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کی رفاقت سے منع فرمایا ہے۔ اب اس آیت میں یہ ارشاد ہو رہا ہے کہ رفاقت کا دائرہ خدا، اللہ کے رسول اور اہل ایمان تک محدود رکھو۔ اگر اس آیت میں معنی رفاقت کے ذیلے ہاتھیں تو بات بے ربط ہو کر رہ جاتے گی اور یہ قرآن کی ملاحضت کے خلاف ہے۔

ان کا یہ کہنا کہ الذین آمنوا سے حضرت علی مراد ہیں یہ بھی قرآن کے ساتھ جہیں جگہ خود زبان کے ساتھ بھی بہت بڑی بے انصافی ہے۔ آیت کے الفاظ قطعاً عام ہیں کوئی وجہ نہیں کہ ہم صرف حضرت علی کو مراد لیں، سارے اہل ایمان جن میں یہ اوصاف ہوں اس میں داخل ہیں۔ محرم ہی کی وجہ سے جابر بن عبد اللہ نے اس کا مصداق عبد اللہ بن سلام کو قرار دیا ہے۔ چونکہ ان کو یہود نے مسلمان ہونے کی وجہ سے چھوڑ دیا تھا۔ حضرت علی بھی اس کا ایسا ہی مصداق ہیں جیسے حضرت ابو بکر اور دوسرے صحابہ کرام چنانچہ امام ابو جعفر محمد بن علی الباقر کے حوالہ سے امام بنو قسطنطاز ہیں کہ یہ آیت اہل ایمان کے بارے میں نازل ہوئی ہے ان سے کہا گیا کہ یہ تو حضرت علی کے متعلق ہے فرمایا کہ حضرت علی بھی اہل ایمان میں داخل ہیں۔

اس کے لیے اس افسانہ کا سارا لیا کہ حضرت علی نماز پڑھ رہے تھے کہ ساتی نے آکر سوال کیا، حضرت علی نے نماز پڑھنے کی حالت میں بکالت رکوع اپنی انگوٹھی نکال کر اس کو دی۔ اس کہانی کی محققین کے یہاں تاریخی طور پر کوئی قیمت نہیں ہے۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ اس قصہ کی کوئی روایت صحیح نہیں ہے کیونکہ اس کی سند ہی کمزور اور اس کے راوی مبہول ہیں۔

حافظ ابن تیمیہ نے منہاج السنہ کی چوتھی جلد میں اس پر مبسوط بحث کی ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ

شیعوں کو جو ایک جھوٹا قصہ روایت کرتے ہیں اور ترکیب سنوئی جی ما کہون کو یوتون الذکوۃ کا حال بتاتے ہیں اور حالت رکوع میں حضرت علی کا ایک فقر کو انگوٹھی دینا بیان کرتے ہیں اس طرح آیت قرآنی کا سیاق و سباق درہم برہم کرتے ہیں۔

اور پھر اس پر بھی ذرا غور فرمائیے کہ اگر اس آیت میں ولی سے مراد والی اور حاکم ہوتا تو وہ مری آیت کے معنی کیا ہوں گے و من یتول الله ورسوله والذین آمنوا۔ کیا اس کے معنی یہ کیے جائیں گے کہ جو شخص اللہ، رسول اور اہل ایمان پر حاکم بنے گا۔ یہ معنی کوئی صاحب ایمان نہیں کر سکتا۔ دراصل اینٹ کا پہلا رد اہی غلط ہے اس پر جو عمارت اٹھے گل وہ غلط ہوگی۔ اگر اس جلد سے متعظیم ہونے کا اندیشہ نہ ہوتا تو اس پر تفصیلی بحث کرتے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَكُمْ هُزُؤًا
وَلَعِبًا مِنَ الدِّينِ أُولَئِكَ كَتَبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْعُكُوفَ
أُولَئِكَ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ كُنتُمْ مُؤْمِنِينَ ۖ وَإِذَا نَادَيْتُمْ
إِلَى الصَّلَاةِ اتَّخَذُوا هَاهُنَا وَأُولَئِكَ ذَلِك بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ
لَا يَعْقِلُونَ ۖ قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ هَلْ تَنْقُصُونَ مِنَّا
إِلَّا أَنْ آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ
وَأَنْ أَكْثَرُكُمْ فَسِقُونَ ۖ قُلْ هَلْ أَنْتُمْ كُنتُمْ بِشَيْءٍ مِنْ
ذَلِكَ مَثُوبَةً عِنْدَ اللَّهِ مَنْ لَعَنَهُ اللَّهُ وَغَضِبَ
عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمْ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ وَعِدَ
الطَّاغُوتِ ۖ أُولَئِكَ شَرٌّ مَكَانًا وَأَضَلُّ عَنْ سَبِيلِ
السَّبِيلِ ۖ وَإِذَا جَاءَ وَكُنتُمْ قَالُوا آمَنَّا وَقَدْ دَخَلُوا
بِالْكَفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوا بِهِ ۖ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا كَانُوا

يَكْفُرُونَ ۝ وَتَرَىٰ كَثِيرًا مِّنْهُمْ يَسَارِعُونَ فِي الْأَثْمِ
وَالْمُدَّانِ وَأَكْلِهِمُ الشُّعْتَ لَيْسَ مَا كَانُوا
يَعْمَلُونَ ۝ لَوْلَا يَنْهَاهُمُ الرَّبُّنِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ عَنْ
قَوْلِهِمُ الْأَثْمَ وَأَكْلِهِمُ الشُّعْتَ لَيْسَ مَا كَانُوا
يَصْنَعُونَ ۝

اے اہل ایمان تم ان لوگوں کو جنہوں نے تمہارے دین کو مذاق و
تفریح کا سامان بنالیا، یعنی اہل کتاب اور دوسرے کفار کو
اپنا دوست اور رفیق نہ بناؤ، اگر ایمان والے ہو تو متقیانہ
سیرت اپناؤ۔ اور دیکھو جب نماز کے لیے پکارتے ہو تو
وہ اس کا بھی مذاق بناتے ہیں اور اس سے کھلتے ہیں
اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عقل نہیں رکھتے۔ ان سے کہو
کہ اے اہل کتاب تم جس چیز کا ہم سے انتقام لینا چاہتے

ہو وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ہم اللہ پر اور دیں کی اس
 تعلیم پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر نازل ہوئی اور جو کچھ ہم سے
 پہلے نازل ہوئی ہم اسے بھی مانتے ہیں، اور تم میں اکثریت
 فاسقوں کی ہے۔^{۱۳۱} اے پیغمبران سے کہہ دو کیا میں ان
 لوگوں کی نشاندہی کروں جن کا انجام خدا کے یہاں فاسقوں
 کے انجام سے بھی بدتر ہے، وہ جن پر خدا نے لعنت کی
 جن پر خدا کا غضب ٹوٹا جن میں سے بندر اور سور بنا دیے
 گئے، جنہوں نے شریر قوتوں کی بندگی کی، یہی لوگ
 سب زیادہ بدتر درجے میں ہوں گے اور سب زیادہ
 سیدھی راہ سے بھٹکے ہوئے،^{۱۳۲} جب یہ تمہارے پاس آتے ہیں
 تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لاتے حالانکہ وہ کفر لیے ہوئے آتے
 تھے اور کفر ہی لیے ہوئے واپس ہو گئے اور اللہ خوب جانتا

ہے جو کچھ یہ دلوں میں چھپاتے ہوئے ہیں۔ تم دیکھتے ہو کہ ان میں
بکثرت لوگ گناہ اور ظلم و زیادتی کے کاموں میں دوڑ دھوپ
کرتے پھرتے ہیں اور حرام کا مال کھاتے ہیں بہت بُری
حرکات ہیں جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔^{۱۲} کیوں ان کے علم اور مشائخ
انہیں گناہ پر زبان کھولنے اور حرام کھانے سے نہیں روکتے
یقیناً بہت ہی بُرا کارنامہ زندگی ہے جو وہ تیار کر رہے ہیں۔^{۱۳}

اخلاقی اور دینی زندگی کا انحطاط

امتوں میں جب اخلاق اور دین بگڑتے بگڑتے اس وجہ پر آجائیں جس کی حکاسی ان آیات میں کی
گئی تو پھر اہل ایمان کے لیے ان سے رفاقت کے تعلقات خود اہل ایمان کے لیے زہر بن جاتے ہیں۔
امت کی تعمیر فضا کی اخلاق پر کرنے کے لیے رذائل کا بیجا جاگن تصور انھوں کے سامنے رکھا جائے رہے۔
اہل ایمان میں فضا کی علم سنانی کیسے مختلف طریقے اختیار کیے گئے ہیں تعلیم کو محض مذہبی بنا کر کہیں کہیں اچھی اور موثر شیسروں کے نیچے
کہیں اس کے اچھے یا بُرے نتائج کو کھول کر اور کہیں امتوں کے اخلاقی رذائل کا نقشہ اس طرح پیش کیا کہ
سننے والے متاثر ہو کر اس کو چھوڑنے اور فضا کی کو اپنانے کے لیے فوراً تیار ہو جاتے ہیں۔ یہاں
یہودیوں کے اخلاقی رذائل کا نقشہ پیش کیا اور ان کی ان شقاوتوں کا طرٹ شاہ کیا ہے جن کا خود یہودیوں
کو بھی اعتراف ہے اور جو ان کے بعد مسلمان دانتیں ہیں۔ مثلاً اللہ کے دین کا مذاق اُٹانا، اُلوں پر اُڑانے
کنا، احکامِ الہی کی نافرمانی کی وجہ سے ایک گروہ کا ملعون ہونا، ان کا ایمان کو کفر کو کہا کرنا، ظلم اور بھروسہ خوار
میں تیز گام ہونا۔ ان کے علم اور مشائخ کا جھوٹ بولنے اور سوام کھانے میں سب باگ ہونا۔ یہ وہ رذائل

ہیں جن کو اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے جن سے بچنے کا حکم اللہ نے اپنے بندوں کو دیا ہے جن کے کرنے والے اس کے حضور میں نافرمان ٹھہرتے ہیں، جن کی برائی کو ہر عقلمند جانتا ہے اور مانتا ہے اور جن کی بدولت انسانی افراد اور جماعتوں کو روحانی اور مادی نقصانات پہنچتے ہیں اور ان کی معاشرت تباہ ہو جاتی ہے بلکہ جب وہ کسی قوم میں عام ہو جائیگا تو پوری قوم کی تباہی اور بربادی کا سبب بن جاتے ہیں۔ یعنی اس کی دینی اور دنیوی ترقی کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ اور سعادت و افعال کا دروازہ ان پر بند ہو جاتا ہے یہودیوں کی اخلاقی اور دینی زندگی کا یہ نقشہ پیش کر کے اہل ایمان سے کہا ہے کہ کیا تم ان سے مورات کے خواہاں ہو۔ اور ان کی برائیاں اپنے اندر جذب کرنا چاہتے ہو۔ قرآن دراصل کسی شخص سے شخص کی معیشت سے نفرت پیدا کرنا نہیں چاہتا بلکہ دراصل اس کے افعال، اعمال اور اخلاق سے نفرت پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اسی لیے یہاں یہودیوں سے ترک مورات کا حکم لینے کے بعد ان کے اعمال و اخلاق کا نقشہ پیش کیا ہے ورنہ قرآن میں شخصی، نسلی یا وطنی کسی پیدائشی یا دائمی نفرت کا کوئی وجود نہیں ہے۔

۳۱۔ اے اہل ایمان تم ان لوگوں کو جنہوں نے تمہارے دین کو مذاق و تفریح بنالیا ہے۔ یعنی اہل کتاب اور کفار کو اپنا دوست اور رفیق نہ بناؤ، اگر ایمان والے ہو تو متقیانہ سیرت اپناؤ۔ کفار سے مراد یہاں مشرکین ہیں جیسا کہ عطف سے ظاہر ہے۔ گزشتہ آیات میں مسلمانوں کو مورات کفار سے منع فرمایا تھا۔ اس آیت میں ایک موثر انداز سے اسی ممانعت کی تاکید کی گئی ہے۔ ایک مسلمان کی نظر میں کوئی چیز اپنے مذہب سے زیادہ معظم و محترم نہیں ہو سکتی۔ لہذا اسے بتایا گیا کہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین تمہارے مذہب پر طعن و استہزاء کرتے ہیں اور شعائر اللہ اذان وغیرہ کا مذاق اڑاتے ہیں اور جو ان میں خاموش ہیں وہ بھی ان افعال شنیعہ کو دیکھ کر اظہار نفرت نہیں کرتے بلکہ خوش ہوتے ہیں۔ کفار کی ان اعتدائے اور کمینہ حرکات پر مطلع ہو کر کوئی فرد مسلم جس کے دل میں خشیتِ الہی اور غیرتِ ایمانی کا ذرا سا شاہر ہو کیا ایسی قوم سے مورات اور دوستانہ راہ و رسم پیدا کرے، قائم رکھنے کو ایک منٹ کے لیے گوارا کرے گا۔ اگر ان کے کفر و عناد اور حد اوت اسلام کو بھی نظر انداز کر دیا جائے تو دینِ قیم کے ساتھ ان کا یہ تسخّر و استہزاء ہی علاوہ دوسرے اسباب کے ایک مستقل سبب ترک مورات ہے بلکہ یہ گویا اہل کتاب اور دوسرے کافروں سے رفاقت و نصرت کے تعلقات ختم کرنے کے لیے یہ بات سمجھائی ہے کہ جو اہل کتاب اور کفار اس قسم کے رذائل کا شکار ہیں کہ تمہارے دین کا مذاق اڑاتے

ہیں۔ افسوس ہے کہ تم ان سے رفاقت کے تعلقات رکھو۔ تمہیں ایک مسلمان کی حیثیت اپنے ایمان میں بہت زیادہ حساس ہونا چاہیے۔ یہاں مولات کی مخالفت کے لیے یہود و نصاریٰ اور کفار کے اس گندے کردار کو کہ وہ مسلمانوں کے دین کا مذاق اڑاتے ہیں بطور نیا دپیش کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان سے عدم مولات کی علت بھی ہے اور یہ علت جہاں بھی ہو ہو وہ دوستی و رفاقت کے لائق نہیں بلکہ بغض و بیز اور عیندگی کے لائق ہے۔ آخر میں ان کے جذبہ ایمان کو ابھار رہے اور فرمایا ہے کہ اگر تم ایمان رکھتے ہو تو اس کا تقاضا پورا کرو۔ ایمان کا سب سے بڑا تقاضا یہ ہے کہ ان سے مولات چھوڑ دو۔

آذان کا مذاق اڑانا عقل سے محرومی ہے

۸-۱۳۔ اور دیکھو جب تم نماز کے لیے پکارتے ہو تو وہ اس کا بھی مذاق اڑاتے ہیں اور اس سے کہتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عقل نہیں رکھتے ہیں۔ یعنی جب آذان کہتے ہو تو وہ اس سے جھٹکتے ہیں اور غصہ کرتے ہیں، جو ان کی کمال حماقت اور بے عقلی کی دلیل ہے۔ کلمات آذان میں خداوند قدوس کی عظمت و کبریائی کا اظہار توحید کا اعلان، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو تمام انبیاء سابقین اور کتب سماویہ کے مصدق ہیں۔ ان کی رسالت کا اقرار، نماز جو تمام اوضاع جمہوریت کو جامع اور غایت درجہ کی بندگی پر دال ہے۔ اس کی طرف دعوت فلاح داریں اور اعلیٰ سے اعلیٰ کامیابی حاصل کرنے کے لیے بلاوا ان چیزوں کے سوا اور کیا ہوتا ہے۔ پھر ان میں کون سی چیز ہے جو ہنسی اڑانے کے لائق ہو۔ ایسی نیکی اور صداقت و حق کی آواز پر مسخراپن کرنا صرف اسی شخص کا کام ہے جس کا دماغ عقل سے یکسر خالی ہو اور جسے نیک و بد کی قطعاً فیز باقی نہ رہے۔ بعض روایات میں ہے کہ مدینہ میں ایک نصرانی جب آذان میں اشدھان محمد رسول اللہ سنا تو کہتا قدحرق الکلام جبرٹا جل گیا یا جل جاتے، اس کی نیت تو ان الفاظ سے جو کچھ ہو مگر یہ بات بالکل اس کے حسب حال تھی، کیونکہ وہ غیبت جبرٹا تھا اور اسلام کا عروج و شیعہ دیکھ کر آتش حسد میں جلا جاتا تھا۔ اتفاقاً ایک شب کوئی چمکو کری گنگ لے کر اس کے گھر میں آئی، وہ اور اس کے زلی و عیال سو رہے تھے۔ ذرا سی چٹنگا ہی نادانستہ اس کے ہاتھ سے گر گئی جس سے سارا گھر بجھنے والوں کے جل گیا اور اس طرح خدا نے دکھلادیا کہ جھوٹے لوگ دوزخ کی آگ سے پہلے ہی دنیا کی آگ میں کس طرح جل جاتے ہیں۔ آذان کے ساتھ استہزار کرنے کا ایک اور واقعہ صحیح روایات میں منقول ہے وہ یہ کہ فتح مکہ کے بعد آپ حنین سے واپس ہو رہے تھے۔ راستہ میں حضرت بلال نے آذان

کہی۔ چند نوع رکعت کے جن میں ابو مخذومہ بھی تھے، اذان کی ہنسی اور نقل اتارنے لگے۔ آپ نے مسبوک پڑھ لیا۔ آخر نتیجہ یہ ہوا کہ ابو مخذومہ کے دل میں خدا نے اسلام ڈال دیا اور حضور نے ان کو مکہ کا مؤذن مقرر فرما دیا اس طرح خدا کی قدرت نقل سے اصل بن گئی۔

البصا ص نے لکھا ہے کہ یہ آیت بتا رہی ہے کہ نماز کے لیے بلائے کی خاطر اذان بروقی تھا اور غزیرہ رقمطراز ہیں کہ اس آیت کے ذریعے اذان قرآن سے ثابت ہے اور اس آیت سے صرف یہی نہیں کہ اذان کا ہونا معلوم ہوتا ہے بلکہ اذان کے عظیم شہادتِ دینی میں سے ہونا بھی معلوم ہو رہا ہے۔ اذان کا آغاز کیسے ہوا، کب ہوا، یہ ایک محدثانہ بحث ہے۔ انشا اللہ اس پر ۲۸ جلد میں سورہ جمعہ میں سیر حاصل بحث ہوگی۔ یہاں اتنی بات ضرور ذہن میں رکھ لیجئے کہ اذان جس شکل میں موجود ہے اس کو امت کے تواثر قولی اور عملی کے ساتھ قرآن کی تصدیقی و تصویب حاصل ہے۔

شعیرہ ہونے کی حیثیت سے اس کو اتنی اہمیت دی گئی ہے کہ اسلامی ملک میں اس کا اظہار واجب کہا گیا اور اس شعیرہ پر تدفین قائم کرنے والوں سے قتال واجب بتایا ہے۔ بلکہ بعض مدارس فقہ نے تو اذان جمعہ اور عیدین کو ملک کے اسلامی ملکیت برٹانے کی علامت قرار دیا ہے۔

کلماتِ اذان کا روحانی تاثر

اذان اسلام کے امتیازات خصوصی میں سے ہے۔ اس کی خوبصورتی کا اندازہ تعالیٰ سے ہوتا ہے عبادت کے اعلان و دعوت کا ایسا ڈھنگ کہیں نہیں ہے اس کی حمد گئی یہ ہے کہ یہ عبادت کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ سہائے خود بھی عبادت ہے۔ اس کے کلمات میں ایک خاص منطقی ربط ہے۔ جب مؤذن چاہے بار اللہ اکبر کہتا ہے تو سننے والے سن کر چونک جاتے ہیں اور مؤذن کا حیرت سے منکھنے لگتے ہیں اور ان کی حیرت مؤذن کے لیے ایک سوالیہ فقرہ بن جاتی ہے گویا پوچھ رہے ہیں کہ اگر وہ سب سے بڑا ہے تو ہم کیا کریں مؤذن فوراً جواب دیتا ہے اور زور دے کر دوبارہ کہتا ہے کہ اشدان لا ارا اللہ سننے والے یہ سن کر سوچ میں ڈوب جاتے ہیں کہ بات بڑے پتے کی ہے اور ادب کی ہے مگر اے خدا کی تجھے کس نے بتائی ہے مؤذن سننے والوں کے چہروں سے سوالیہ پڑھتا ہے اور جواب میں کہتا ہے اشدان محمد رسول اللہ سننے والے یہ سن کر پھر مجسم سوال بن جاتے ہیں اور گویا پوچھ رہے ہیں کہ ہمیں

کیا کرنا چاہیے مؤذن فوراً کہتا ہے جی علی الصلاۃ مؤذن اس کھنے کے ساتھ سننے والوں کے منہ پر دماغ میں یہ سوال گھونٹنے لگتا ہے کہ نماز میں ہمیں کیا ملے گا کہ مؤذن کہتا ہے جی علی الصلاۃ اب سننے والوں کے قدم ایک غرض منہ کے قدم بن کر اٹھنے والے ہوتے ہیں کہ مؤذن اٹھ ابرا اور لا اور لا اور لا اور لا کہہ کر اس کی نسیات کا علاج کرتا ہے کہ قدم بے غرض ہو کر اٹھا کر نمازی اب اس تاثر سے اب کہ نماز کی طرف جاتا ہے کہ

ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں میری جمین نیاز میں
 دوسری اس کا مذاق اڑاتے، نقلیں امارتے، قرآن نے آخر میں کہا ہے کہ ان کی یہ حرکتیں محض جے قتل کا نتیجہ ہیں۔ اگر وہ جہالت اور نادانی میں مبتلا نہ ہوتے تو انہیں ایمان سے اختلاف کھنے کے باوجود بھی یہی حرکتیں نہ کرتے۔ آخر کون معقول آدمی یہ پسند کر سکتا ہے کہ جب کوئی گروہ خدا کی عبادت کے لیے مادی کرے تو اس کا مذاق اڑایا جائے۔

یہودی یا وہ گوئی کی وجہ

۹-۱۳۔ ان سے کہو کہ اے اہل کتاب تم جن چیز کا ہم سے انتقام لینا چاہتے ہو وہ اس کے سوا کیا ہے؟ کہ ہم اللہ پر اور دین کی اس تعلیم پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر نازل ہوئی اور ہم سے پہلے جو نازل ہوئی ہے ہم اسے بھی مانتے ہیں اور تم میں اکثریت فاسقوں کی ہے۔ کسی کام پر طعن کرنا مذاق اڑانا دو وجہ سے ہو سکتا ہے یا تو وہ کام ہی قابل استہزاء ہو یا کام کرنے والے کی حالت قابل استہزاء ہو۔ پہلی آیت میں بتلایا گیا تھا کہ اذان کوئی ایسی چیز نہیں جس پر بجز پرے و سب سے محنت اور خفیف العقل کے کوئی شخص طعن یا استہزاء کر سکے۔ اس آیت میں اذان دینے والوں کے مقدس حالات پر بعنوان سوال متنبہ کیا گیا ہے۔ یعنی استہزاء کرنے والے جو غیر سے اہل کتاب اور عالم شریعت ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ ذرا سوچ کر انصاف سے بتائیں کہ مسلمانوں سے ان کو اتنی ضد کیوں ہے۔ اور کیا ایسی برائی وہ ہماری طرف دیکھتے ہیں جو ان کے خیال میں لائق استہزاء ہو۔ بجز اس کے کہ ہم اس خدشے و حدہ لا شرک پر اور اس کی تائید پر تمام کتابوں پر اور اس کے پیچھے ہوتے تمام رسولوں پر صدق دل سے ایمان رکھتے ہیں اور اس کے بالمقابل استہزاء کرنے والوں کا حال یہ ہے کہ خدا کی سچائی اور صحیح توحید پر قائم ہیں اور نہ تمام انبیاء و رسل کی تصدیق و تکریم کرتے ہیں۔ اب تم ہی انصاف سے کہو کہ انتہاء و جہ کے نامزدان کو خدا کے

فرمانبردار بندوں پر آوازہ کئے اور طعن و تشنیع کرنے کا کہاں تک حق حاصل ہے بلکہ اصل ارشاد میں تنقیح کیا ہے یہ نعم سے بنا ہے نعم کے معنی انتقام لینا بدلہ لینا اور کسی پر غصہ کھا لینے کے ہیں۔ قرآن یہودیوں سے دریافت کر رہا ہے کہ تم ہم سے کس چیز کا انتقام لے رہے ہو یا کس بات پر ہم پر غصہ نکال رہے ہو۔ وجہ نزاع تو بتاؤ کیا ہے؟ کیا یہ ہے کہ ہم نے انبیاء و رسل کا انکار کر دیا ہے یا ہم ان کے کوششوں کو نہیں مانتے، یا یہ ہے کہ ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ خدا کی سچائی صرف ہمارے حصہ میں آئی ہے اور ہم سے پہلے سچائی سے سب محروم تھے یا پھر ہم نے دین کے نام پر کوئی ایسی چیز پیش کر دی ہے جو تمہارے لیے انتہائی ہے۔ اور اقلیدہ ہے کہ ان باتوں میں سے کوئی بات نہیں ہے۔ اگر ان باتوں میں سے کوئی بات نہیں تو اس ساری دشمنی کی علت اس کے سوا اور کیا ہے کہ ہماری نیکی تمہارے لیے بدی بن گئی ہے۔ آخر ہمارا قصور کیا ہے یہی تاکہ خدا کو مانتے ہوئے اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر اتاری گئی ہے اور ان کتابوں پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو ہم سے پہلے اتاری گئی ہیں۔ یعنی تمہارے نزدیک ہمارا قصور یہی ہے تاکہ ہم ساری صداقتوں کو مانتے ہیں۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت موسیٰ اور عیسیٰ کو بھی مانتے ہیں اور قرآن کے ساتھ تورات و انجیل کو بھی مانتے ہیں برعکس اس کے تمہارا حال یہ ہے کہ تم میں سے اکثر فاسق ہیں۔ اس کتاب پر ایمان رکھتے ہو جو تمہاری طرف اتاری گئی ہے اور نہ اس کتاب پر ایمان لانے کو تیار ہو جو ہم پر اتاری گئی ہے۔ اس طرح قرآن نے اس آیت میں یہودیوں کی بے راہ روی پر یہ کہہ کر مہر لگا دی ہے کہ تم ایمان کی بنا پر ہم سے ناراض ہو، حالانکہ اس میں غصہ اور ناراضگی کی کوئی بات نہیں ہے اور نہ ہی اس میں تمہارے لیے مذاق کا کوئی جواز ہے۔ قرآن نے یہ انداز بیان عرب بلغار کے مطابق اختیار کیا ہے۔ علامہ بیان اسے تاکید المدح لایشبہ اہم یا تاکید الذم لایشبہ المدح کہتے ہیں۔ قرآن کی یہ آیت دوسری قسم سے تعلق رکھتی ہے اور اس میں ان کی کافرانہ زندگی پر طنز کے ساتھ نیکی کا مقابلہ بدی سے کرنے پر تصریح بھی ہے اور اکثریت کو فاسق کہہ کر اشارہ کر دیا کہ جو اقلیت دولت ایمان سے الالال ہو چکی ہے وہ فاسق نہیں ہے جیسے عبداللہ بن سلام وغیرہ۔ حافظ ابن جریر نے بحوالہ عبداللہ بن عباس اس آیت کا جو پس منظر نقل کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے

اولین مخاطب وہ یہودی علماء ہیں جنہوں نے قرآن کی آیت ایمان سننے کے بعد حضرت عیسیٰ کی نبوت پر اظہارِ ناراضگی کیا تھا۔ بلاشبہ آیت کا مصداق اول وہی ہیں اور اپنے عہد کے لحاظ سے ہر ناقم اس کا مصداق ہے۔

یہودی ملعونیت اور مغضوبیت

۱۴۰۔ اے پیغمبران سے کہہ دو کیا میں ان لوگوں کی نشاندہی نہ کروں جن کا انہم خدا کے یہاں فاسقوں کے انہم سے بدتر ہے۔ وہ جن پر خدا نے لعنت کی جن پر خدا کا غضب ٹوٹا جن میں سے بندہ اور سوار بناتے گئے اور جنہوں نے شریعتوں کی بندگی کی یہی لوگ سب سے زیادہ بدترین درجہ میں ہوں گے اور سب سے زیادہ سیدھی راہ سے بھٹکے ہوئے۔ یعنی اگر ایمان بالآخر پر مستقیم ہو گا اور ہر اس چیز کی جو خدا کی طرف سے کسی زمانے میں نازل ہو چکے دل سے تصدیق کر لیں تو خدا کے زعم میں مسلمانوں کا سب سے بڑا جرم ہے اور سب سے بڑی برائی ہے اور اسی وجہ سے تم ان کو موردِ لعن و ظلم بناتے ہو تو او کہ میں تم کو ایک ایسی قوم کا پتہ بتاؤں جو اپنی شرارت اور عناد کی وجہ سے بدترین خلق ہے جن پر خدا کی لعنت اور غضب کا اثر آج بھی نمایاں طور پر آشکارا ہے جس کے بہت سے افراد اپنی مکاری اور بے حیائی اور حرص دنیا کی سزا میں بندہ اور سوار بناتے جا چکے ہیں اور جس نے خدا کی بندگی سے نکل کر شیطان کی غلامی اختیار کر لی اگر انصاف ہے دیکھا جائے تو یہ بدترین اور گمراہ قوم ہی اصل معنی میں تمہارے وطن و استعمار کی مستحق ہر سکتی ہے اور وہ خود تم ہی ہو۔

آیت میں لطیف اشارہ ہے خود یہودیوں کی طرف جن کی اپنی تاریخ یہ کہہ رہی ہے کہ بار بار وہ خدا کے غضب اور اس کی لعنت میں مبتلا ہوئے، سبب کا قانون توڑنے پر ان کی قوم کے بہت سے لوگوں کی صورتیں مسخ ہوئیں۔ حتیٰ کہ وہ منزل کی اس انتہا کو پہنچے کہ طاعت کی بندگی تک انہیں نصیب نہ ہوئی۔ بس کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آخر تمہاری بے حیائی اور مجرمانہ بے باکی کی کوئی حد بھی ہے کہ خود فسق و فجور اور انتہائی اخلاقی منزل میں مبتلا ہو اور اگر کوئی دوسرا گروہ خدا پر ایمان لاکر بھی دینداری کا طریقہ اختیار کرتا ہے تو اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتے ہو۔

گویا ان سے کہا گیا ہے کہ تمہارے نزدیک تو اس دنیا میں ہم سب بڑے ہیں اور اس وجہ سے ہم تمہارے غصہ اور ناراضی کا نشانہ ہیں۔ لیکن کچھ پتہ ہے کہ اللہ کے نزدیک پانچاںجام کے لحاظ سے سب بڑا کون ہے یہ وہ ہے جس پر اللہ کا غضب ہوا، جس پر اللہ نے لعنت کی اور جس کو اللہ نے بندر اور خنزیر بنادیا اور جس نے طاعت کی پرستاری کی۔

من لعنہ اللہ ترکیب میں بش سے بدل ہے اور مصافحہ مذبذوب ہے۔ اصل عبارت یوں تھی بش من ذالک مشوبۃ من لعنۃ اللہ یا یہ مبتدا مذبذوب کی خبر ہے۔ یعنی بڑے میں بدترین وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت ڈالی، اپنی رحمت سے دور کر دیا، ان کے کفر اور معاصی میں انتہاک کی وجہ سے ان پر ناراض ہوا، کچھ کو بندر اور کچھ کو سور بنادیا۔ ایک قویہ کہ واقع میں بندہ اور سور بنادیا جیسا کہ عام شارحین قرآن کا خیال ہے لیکن یہ ملتے بھی سلف ہی سے منقول ہر کر آئی ہے کہ مسیح محض معنوی ہوا تھا۔ انسان کے عمل اور انداز کے درمیان سے جب عقل والہ کی کڑی غائب ہو جلتے اور وہ یکسر اپنی خواہشوں کا غلام بن کر رہ جاتے تو پھر اس کے اور حیوانات کے درمیان کوئی جوہری فرق باقی نہیں رہتا۔ یہ چیز اس کے باطن کو بالکل مسخ کر دیتی ہے اور باطن کے مسخ ہو جانے کے بعد ظاہر بھی بالآخر یکجہ مسخ ہو کے رہ جاتا ہے۔ جو نگاہیں حقیقت میں ہوتی ہیں وہ سیرت کا عکس صورت میں بھی دیکھ لیتی ہیں۔ اگرچہ کچھ منسٹرین نے اس کو مسخ معنوی ہی قرار دیا ہے مگر میرے قلب کا میلان قرآن کے انداز بیان کے پیش منظر ہی ہے کہ مسخ صوری تھا۔ قرآن میں لفظ جفل دو معنوں میں چاہتا ہے۔ اگر معنوں میں ایسی چیز ہو جو پہلے کے خلاف نہ ہو تو تعبیر میں کوئی بلاغت نہیں رہتی۔ مثلاً یوں کہیں جعل القردة قرودۃ تو اس میں کوئی معنویت نہیں رہتی ہاں یوں کہیں جعلہم قرودۃ کہ اللہ نے ان کو بندر بنادیا اور پھر سورہ بقرہ میں جعلہم حاکملا میں بھی کوئی معنویت نہیں رہتی۔ جسمانی نر اور نر نکال بولا جاسکتا ہے مگر عقائد و اخلاق لاسدہ تو خود نر کا سبب ہیں ذکر نر۔ بہر حال اصل چیلنج یہ کہ مسخ صوری تھا اور جنہوں نے اسے معنوی کہا ہے ان کی ملتے ہے اور ملتے کسی کہ ہم قرآن میں کسی پر محبت نہیں ہے۔

عبد الطاعت میں لفظ عبد فعل ماضی ہے اور اس کا بہرہ عطف کے ذریعے من لعنہ اللہ سے ہے۔ سب سے کہ جنہوں نے طاعت کی پرستش کی وہ بھی انہام کے لحاظ سے بدترین ہوں گے اور دوسری قرأت میں اس کو عبد کی جمع بنا کر پڑھا گیا ہے۔ اس صورت میں عبد کا عطف القردہ والٹما زیر پر ہو گا اور معنی ہوں گے کہ انہیں بندر سور اور پرستار شیطان بنادیا۔ طاعت کی

بندگی اور برتری خدا کے نزدیک آسان بڑا سنگین جرم ہے کہ اس کو مزا کی نگاہ میں پیش کیا ہے گویا فریاد کر جنہوں نے اہل کتاب سے جو کڑا عذرت کی بندگی کی وہ استغاثہ کی فکر کریں۔ ہمیں برا بھلا کہنے اور ہم پر لالچ پٹا ہونے سے ان کو کیا ملے گا۔

آخر میں فرمایا ہے اولئک شرکاء و احمل عن سواہ السبیل اس کے دو حصے ہیں اور دونوں میں دو باتیں فرمائی ہیں۔ پہلے حصہ میں ان کے آخرت میں انجام کا ذکر ہے اور دوسرے میں دنیا میں ان کی بلے راہ روی کو بتایا ہے گویا آخرت میں ان کے بدترین ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ دنیا کی زندگی میں گمراہ اور جادو حق سے ہٹے ہوئے تھے یہی مکان کو کہا کہ کفار ہے مکان والوں کے برا ہونے سے گمراہ ان کی شرارت اس قدر عظیم ہے کہ اس سے جگہ بھی متاثر ہو گی۔

یہودیوں کا سازشی گروہ

۱۴۱۔ محبوب یہ تھا کہ اسے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لاتے حالانکہ وہ کفریہ ہوتے آتے تھے اور کفریہ لیے واپس ہو گئے اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ دلوں میں چھپاتے ہوئے ہیں۔ یہاں ان ہی استہزاء کرنے والوں کے بعض مخصوص افراد کا بیان ہے جو غایتاً تو مذہب اسلام پر طعن و تشنیع کرتے اور مسلمانوں کا مذاق اڑاتے تھے۔ لیکن جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا مسلمانوں سے ملے تو ازلو نفاق اپنے کو مسلمان ظاہر کرتے۔ حالانکہ شروع سے آخر تک ایک منٹ کے لیے بھی انہیں اسلام سے تعلق نہیں ہوا۔ نہ پیغمبر علیہ السلام سے ربانی و مخلوق ذکر کا کوئی اثر انہوں نے قبول کیا۔ کیا محض لفظ ایمان و اسلام زبان سے بول کر وہ خدا کو معاذ اللہ و صحرکے ملے سکتے ہیں۔ اگر اس عالم الغیب و انشادات کی نسبت جو ہر قسم کے ضما کر و سرائر پر مطلع ہے۔ ان کا لگان ہے کہ محض لفظی ایمان سے اسے خوش کر لیں گے تو اس سے بڑھ کر کون سی حرکت قابل استہزاء و تفسیر ہو سکتی ہے۔ گویا اس آیت سے یہود و نصاریٰ کے ان مضحکہ خیز افعال و حرکات کا بیان شروع ہوا جن پر متنبہ کیے جانے کے بجائے انہیں خود اپنا استہزاء کرنا چاہیے۔

یہ بھی یہودی کا ذکر ہے یعنی ان لوگوں کا جو اپنے کفریہ عقائد کے باوجود مسلمانوں کی مجلس میں اگر اپنے کو اہل ایمان میں سے ظاہر کرتے۔ مطلب یہ کہ یہ تو ان کا آپ سے دور ہو کر حال تھا اور جبکہ

نہی کے پاس آتے تو کہتے اُمّت ہم بھی رسول پر اور اس کی کتاب پر ایمان رکھتے ہیں۔ عام مسلمان ان کی باتوں سے دھمک میں آجاتے اور ان سے ایک قسم کے حسن ظن میں مبتلا ہو جاتے۔ قرآن نے یہاں ان کو بے نقاب کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ اہل ایمان ہیں سے نہیں ہیں کیونکہ جس کفر کے ساتھ وہ آتے ہیں اسی کفر کے ساتھ واپس جاتے ہیں۔ ایمان نہ مجلس میں آتے وقت ان کے ساتھ ہوتا ہے اور واپسی کے وقت۔ ایمان کا دعویٰ کر سکتے نہیں دھوکہ لے رہے ہیں۔ ان کے دلوں میں جو کچھ ہے اللہ خوب جانتا ہے۔

یہودی عوام اخلاقی جرائم کے خوگر ہیں

۱۴۲- تم دیکھتے ہو کہ ان میں بکثرت لوگ گناہ اور ظلم و زیادتی کے کاموں میں دوڑ دھوپ کرتے رہتے ہیں اور مال حرام کھاتے ہیں۔ یہ لوگ بہت بُری حرکات کرتے ہیں۔ غالباً اُثم سے لازمی اور عدوان سے متعدی گناہ مراد ہیں۔ یعنی ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ بہت شوق اور رغبت سے ہر قسم کے گناہوں کی طرف جھپٹتے ہیں، خواہ ان کا اثر اپنی ذات تک محدود ہو یا دوسروں تک پہنچے۔ جن کی اخلاقی حالت ایسی زہلوں پر اور حرام خوری ان کا شیوہ ہو، ان کی بُرائی میں کسے شبہ ہو سکتا ہے یہ قرآن کے عوام کا حال ہے اُثم خواص کا حال بیان ہو رہا ہے بلکہ یہ یہودی عوام کی اخلاقی زندگی کا خاکہ پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان کی بُری تعداد اُثم اور عدوان اور حرام خوری میں حد سے زیادہ تیز گام ہے۔

اصل ارشاد میں یسار عون فی الاُثم آیا ہے۔ مسامتہ کے حصے نیزودی میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ گویا ان کے معاشرے میں ان برائیوں میں ایک دوسرے پر بہت بے جانے کی انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی اور بھرپور محنت ہو رہی ہے اور مسامتہ کے ساتھ قرآن میں الی آتا ہے جیسے سادحوالی مغفرۃ لیکن یہاں الی نہیں بلکہ فی یہ بنانے کے لیے لایا گیا ہے کہ ان کے عوام اُثم عدوان اور حرام خوری میں بالفعل مبتلا ہیں۔ اگر الی آتویوں سمجھا جائے کہ ان برائیوں میں مبتلا نہیں بلکہ ان تک پہنچنے کی ٹمک دود کر رہے ہیں۔ اُثم اور عدوان میں ایک فرق تو وہی ہے جس کی نشاندہی شیخ الاسلام نے فرمائی ہے کہ اُثم سے لازمی اور عدوان سے متعدی گناہ مراد ہیں۔ لیکن

حافظ ابن قیم فرماتے ہیں کہ یہ دونوں یکساں ہیں اور طہرہ طہیہ بھی ایسے عہدوان نام ہے ان کاموں کے کرنے کا جن سے الشرباک نے روکا ہے یا ان کاموں کے ذکر کرنے کا جن کے کر کے کا اثر طہرہ حکم دیا ہے لہذا ہر عہدوان نام ہے لیکن جب دونوں یکساں آئیں تو ائمہ نام ہے ان گناہوں کا جن کی مجلس ہی حرام ہو جیسے جھوٹ، زنا، شراب نوشی اور عہدوان نام ہے اس گناہ کا جس میں تعدد و زیادت حرام ہو، ایک چیز کا مقدار مقررہ حلال ہے اس سے تجاوز کر کے زیادہ لینا عہدوان ہے اور یہ تجاوز مال میں جان میں اور برو میں ہوتا ہے سناچے کسی کو دو گنا جبریں دی ہیں اب اس کے بدلے میں اس کے گناہوں کے ٹوکے پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کی دوات کسی سے ٹوٹ گئی ہے اس کے بدلے میں آپ اس کی تین دواتیں توڑ رہے ہیں۔ آپ کو کسی نے حبیث کہل ہے اس کے بدلے میں آپ اس کو ماں بہن کی مغلطہ کہیاں دے رہے ہیں۔ عہدوان، حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں میں ہوتا ہے حلال بیرونی کو چھوڑ کر حرام کی طرف قدم بڑھانا عہدوان ہے۔ جیسے یہاں عہدوان کہا ہے اسکی کو سورا اعراف میں بنی کہل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہودی حرام جھوٹ، زنا، شراب نوشی اور فوجداری، دیوانی اور اخلاقی جرائم میں بے لگام ہیں اور یہ جرائم ان میں اتنے عام ہیں اور ان کو ان میں اس قدر احتیاط ہے کہ دیکھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ پورا معاشرہ کبڈی کیل رہا ہے اہلکم السحت میں سود، رشوت یا جبر اور سکر سے حاصل کی ہوئی ہر آمدنی داخل ہے۔ اگر عہدوان میں یہ داخل ہے مگر اس کی شاعت کی وجہ سے طہیہ نہ دیکھا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن اس دعویٰ ایمان کو قطعاً بے وزن سمجھتا ہے جس کے ساتھ رات دن جھاگ دوڑ سنی تلمنی، تعدی اور حرام خوردی کی راہ میں ہو رہی ہو۔

علماء و مشائخ کا کردار

۱۴۳۳۔ کیوں ان کے علماء و مشائخ انہیں گناہ پر زبان کھولنے اور حرام کھانے سے نہیں روکتے۔ یقیناً یہ بہت ہی بڑا کا نام زندگی ہے جو وہ تیار کر لے رہے ہیں۔ سب خدا کسی قوم کو تباہ کرتا ہے تو اس کے حرام گناہوں اور نافرمانیوں میں غرق ہو جاتے ہیں اور اس کے خواص یعنی درویش اور علماء کو محض شیطان میں جلتے ہیں۔ بنی اسرائیل کا یہی حال ہوا کہ لوگ عموماً ذیری لذات و شہوات میں منہمک ہو کر خدا تعالیٰ کی عظمت و جلال اور اس کے قوانین و احکام کو بھلا بیٹھے۔ اور جو مشائخ اور علماء کہلاتے تھے انہوں نے اہل المعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ترک

کر دیا کہ کوئی دنیا کی حرص اور اتباعِ شہوات میں وہ اپنے عوام سے بھی آگے تھے۔ مخلوق کا خوف یا دنیا کا چلچلتی حق کی آواز بلند کرنے سے مانع ہوتا تھا۔ اسی سکوت اور مدافعت سے پہلی قریب تباہ ہو گئیں۔ اسی لیے اُمتِ محمدیہ علی صاحبہا السلام کو قرآن و حدیث کی بے شمار تفصیلات میں بہت ہی سخت تہدید و تاکید کی گئی ہے کہ کسی وقت اور کسی شخص کے مقابلہ میں اس فرضِ امر بالمعروف کے ادا کرنے سے تغافل نہ کریں۔

پہلی آیت میں یہودی عوام کا ذکر اور پیش کیا تھا۔ اس آیت میں ان کے خواص یعنی علماء و مشائخ کا چہرہ پیش کیا جا رہا ہے کہ عوام کا گناہ اگر یہ تھا کہ وہ گناہوں میں جھوٹ اور بے شکام ہوتے تھے تو ان کے علماء و مشائخ کو کیا ہو گیا تھا کہ وہ لوگوں کو حلالِ خوری اور حلالِ ہوں کی گفتار سے کیوں باز رکھتے تھے عوام کا جرم یہ تھا کہ وہ منکرات میں مبتلا تھے اور ان کی ساری زندگی گناہ کی زندگی تھی اور ان کے علماء اور مشائخ کا جرم یہ تھا کہ سارے امتیازات کے باوجود وہ لوگوں کے اعمال پر کوئی گرفت نہ کرتے تھے۔ مجرم دونوں ہیں، عوام بھی کہ وہ گناہ کر رہے ہیں اور خواص بھی کہ وہ گناہوں کو روک نہیں رہے ہیں۔ لیکن تعالیٰ مطالعہ میں قرآن کا انداز بیان بتا رہا ہے کہ بڑے مجرم علماء و مشائخ ہیں اسی بنا پر حافظ ابن جریر نے اس آیت کے بارے میں علماء کا یہ تاثر نقل کیا ہے کہ پورے قرآن میں علماء کو ذرا نٹ والی آیت اس سے زیادہ سخت کوئی نہیں ہے۔ زعفرانی نے عبد اللہ بن عباس کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ آیت سخت ترین ہے اور مشہور تاہی صحاح کہتے ہیں کہ پورے قرآن میں اس سے زیادہ خوفناک آیت کوئی نہیں ہے۔

شاید آپ کے ذہن میں غلطی ہو کر ایسا کیوں ہے!

اس لیے کہ عوام اور خواص کے بارے میں قرآن کا اندازِ تعبیر مختلف ہے۔ عوام کی بدکرداری، بے ایمانی کو قرآن نے بد عملی، بے ایمانی، کاذب، ملعون کہا ہے جبکہ علماء کے کردار کو بد عملی، بے ایمانی، کاذب اور بدکاری کہا ہے۔ اشارہ کیا ہے کہ علماء و مشائخ کا نہ روکنا صرف ان کے فرض کی ادائیگی سے تغافل نہ تھا بلکہ ان کا پیشہ تھا اور اس میں وہ فن کار ہیں۔ زعفرانی نے لکھا ہے کہ علماء مشائخ کے جرم پر صنعت کا لفظ بول کر ان کو جرائم کے مرتکب لوگوں سے زیادہ گناہگار بنا دیا گیا عوام اگر از تکابِ جرم کر کے مجرم ہیں تو ان کے علماء اپنے کردار کی وجہ سے صرف مجرم نہیں

بلکہ جرمِ پیشہ ہیں کوئی عاملِ صالح اور کوئی عملِ منست اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک عمل میں مشغول
قرین کے ذریعے فنِ کاری دیا جائے۔

شاید قرآنِ یسعون کی تعبیر سے ان کے دین اور دینی علوم میں کاروباری ہونے کی طرف اشارہ
کر رہا ہے۔ سب کو یہودیوں اور عیسائیوں کے مذہبی حلقوں اور اداروں کی تاریخ منضبط ہو چکی ہے
اس پر نظر ثانی کرتے تو قرآن کے لہجے کا لہجہ یسعون کی تفسیر میں بے شمار باتیں سامنے آئیں
گی لیکن خصوصیت کے ساتھ یہ بات قابلِ غور ہے کہ بادشاہوں اور امیروں کی مطلب برداری بے
حلال کو حرام اور حلال کو حلال بنا دیتے اور اس کے فتنے دے کر انعام و اکرام لیتے۔ حلال کو حرام بنا
دینے اور حرام کو حلال بنا دینے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ تواریک کے کسی حکم سے انکار کرتے تھے
بلکہ یہ ہے کہ اس کے حکموں کو توڑ مروڑ کر یا خارجِ طرح کے حیلے بہانے نکال کر ایسی صورتیں نکال لیتے کہ انہیں
کی ہوائے نفس پوری ہو جائے۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لِلَّهِ مَغْلُوبَةٌ ۖ فَلَمَّا آيَتْهُمُ وَعِثُهُمْ
 قَالُوا هَٰذَا مَبْسُوطٌ لَّيْسَ بِشَيْءٍ وَلَٰكِنْ بَدَلٌ
 كَثِيرٌ مِنْهُمْ مَّا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا
 وَالْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ
 كُلَّمَا أَقْدَمُوا نَارَ الْحَرْبِ أَطْفَأَهَا اللَّهُ وَيَسْعَوْنَ فِي
 الْأَرْضِ فَسَادًا ۚ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ۝ وَتَوَّانَ
 أَهْلَ الْكِتَابِ آمَنُوا وَاتَّقُوا الْكُفْرَ نَاعْنَهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ
 لَا دُخْلَ لَهُمْ جَنَّتِ النَّعِيمِ ۝ وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَةَ
 وَلَا انْجَبِلَ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ مِنْ رَبِّهِمْ لَأَكَلُوا مِنْ فَوْقِهِمْ
 وَمِنْ تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ ۚ مِنْهُمْ أُمَّةٌ مُقْتَصِدَةٌ ۚ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ
 سَاءَ مَا يَعْمَلُونَ ۝

اور یہودی کہتے ہیں کہ اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔

انہی کے ہاتھ بندھ جائیں اور ان کے کہنے کی وجہ سے ان پر
 لعنت پڑی۔^{۱۴} اللہ کے دونوں ہاتھ کھلے ہوتے ہیں^{۱۵} نہ بچ
 کرتا ہے جیسے چاہتا ہے۔ اور خدا کی طرف سے جو کچھ تم پر
 نازل ہوا ہے یہ ان میں سے بہتوں میں سرکشی اور کفر میں
 اضافہ کا سامان ہو گا۔ اور ہم نے ان کے درمیان روز قیامت
 تک عداوت اور دشمنی ڈال دی ہے۔^{۱۶} جب کبھی یہ جنگ کی آگ
 سلگاتے ہیں اللہ اس کو ٹھنڈا کر دیتا ہے اور یہ لوگ زمین
 میں فساد برپا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اللہ فساد
 کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے۔^{۱۷} اور اگر یہ اہل کتاب
 ایمان لے آتے اور متقیانہ سیرت اختیار کرتے تو ہم ان کی
 برائیاں ان سے دور کر دیتے اور ہم ان کو نعمت کے باغات
 میں پہنچا دیتے۔^{۱۸} اور اگر یہ لوگ قائم رکھتے تو رات اور سبیل کو

اور اس کو جو ان کے پروردگار کی جانب سے ان پر نازل ہوا
 ہے تو ضرور وہ بہرہ مند ہوتے اس رزق سے جو اوپر سے
 برتا اور ان کے قدموں کے نیچے سے اُبتا۔^{۱۵۲} ان میں سے
 کچھ لوگ میانہ رو بھی ہیں لیکن زیادہ تر ایسے ہی ہیں کہ جو کچھ
 کرتے ہیں بُرائی ہی بُرائی ہے۔^{۱۵۳}

انسان شقاوت کی ایک اور تصویر

برہم دھرم کے ابتدائی دور کی طرح اسلام کا ابتدائی زمانہ بھی فکری اور سختی کا زمانہ تھا۔ اور اللہ کے
 دین کا بول بالا کرنے کے لیے مال کی ضرورت برابر پیش آتی رہتی تھی۔ منافقوں پر یہ بات شاق
 گزرتی تھی جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ وہ کہتے کہ یہ جو بار بار خدا کے نام پر مال طلب کیا جا رہا ہے تو کیا
 خدا محتاج ہے اور ہم غنی ہیں۔ ابن ابی حاتم، ابن جریر اور محمد بن اسحاق نے حضرت عبداللہ بن عباس کے
 حوالہ سے اسی زمانہ کا یہ واقعہ بھی نقل کیا ہے کہ حضرت البرہہؓ ایک روز یہود کے بیت المقدس میں
 گئے وہاں بہت سے یہودی اپنے بڑے عالم الفصاح کے گرد جمع تھے۔ فحاص کے ساتھ ان کا ایک اور
 بہت بڑا عالم بھی موجود تھا جس کا نام ریشع تھا۔ حضرت البرہہؓ نے فرمایا کہ اے فحاص تو اللہ سے ڈر
 اور اسلام قبول کر لے تو خوب جانتا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور تمہارے
 پاس اللہ کی جانب سے حق لے کر آئے ہیں۔ اور آپ کی صفات تم قرأت و انجیل میں پاتے ہو۔ اس
 پر فحاص نے کہا کہ مجھ کو ایسے اللہ کی کوئی ضرورت نہیں جو غیر ہے اور ہم سے قرض مانگتا ہے۔ یہ
 بات غالباً اس لیے کہی کہ قرآن نے جب مسلمانوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی دعوت دی اور اس
 دعوت کے لیے یہ موثر انداز اختیار کیا ہے من ذا الذی یقرض اللہ قرضاً حسناً تو یہود نے اسلام

اور قرآن کی تفسیر کے لیے اس دعوت کو خالق بنالیا۔ فخاص کے اس کھنڈ پر کہ اللہ فقیر ہے۔ حضرت ابو بکر نے فخاص کے منہ پر چست مارا اور فرمایا کہ اگر ہمارے اور تمہارے درمیان معاہدہ نہ ہوتا تو میں تجھے قتل کر دیتا۔ فخاص کی اس بات کی یہودی نے کوئی تکذیب نہیں کی تو گویا سب کی فخاص کو شیر بلوہ مل گئی تھی اس لیے یہاں یہ بات سب کی طرف منسوب کر دی گئی ہے۔ کچھ بزرگوں نے اس میں منظر سے بہشت کو آیت کی تشریح کی ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ یہودی کہتے تھے کہ توہرات کے بعد کوئی کتاب نہیں آسکتی اور نہ بنی اسرائیل کے بعد کسی دوسری قوم کو برکت و سعادت حاصل نہیں ہو سکتی ہے خدا کے غزوانے میں سب کچھ ہے مگر اس کے ہاتھ بندھ گئے اب وہ کسی دوسری قوم کو برکت و سعادت نہیں دے سکتا۔ یہاں ان کی اسی شقاوت کی طرف اشارہ ہے اس طرح اس کی نسبت میں کوئی اشکال نہیں ہے۔ یہودی دنیا اسی کیے قابل ہے۔

۱۴۴- اور یہودی کہتے ہیں کہ اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت اہل کتاب کے قلوب ان کی شرارت، کفر و طغیان، بدکاری، حرام خوری وغیرہ کی ممارست سے اس قدر مسخ ہو گئے تھے کہ بارگاہ ربوبیت میں گناہی کرنے سے بھی ان کو کچھ باک نہ ہوتا تھا خداوند قدوس کا احترام ان کے یہاں ایک معمولی انسان سے زیادہ نہیں رہا تھا۔ حق تعالیٰ کی جناب میں بے تکلف ایسے واہی تباہی کلمات بک جیتے تھے جنہیں سن کر انسان کے روتھ گئے کھڑے ہر جائیں کبھی یہ کہ ان اللہ فقیر و ضعیف اغنیاء کبھی یہ الفاظ منہ سے نکالتے یہ اللہ مغلوط اس سے مراد یا تو وہی ہوگی جو ان اللہ فقیر سے تھی کہ خدا ماحذ اللہ تنگ دست ہو گیا اور اس کے خزانہ میں کچھ نہیں رہا۔ یا غنی یہ کہنا یہ ہے بخل دامک سے۔ یعنی تنگ دست تو نہیں مگر آج کل بخل کرنے لگے ہیں لعیاذ باللہ۔ بہر حال کوئی منہ ہلکس کر کٹر کا خشیہ تھا کہ جب تہر و طغیان کی پلاش میں حق تعالیٰ نے ان طاعین پر ذلت و ذمیت، ضیق عیش، بد حالی اور تنگ حالی مسلط فرمادی تو سمجھتے اس کے کہ اپنی یہ کاریوں اور شرارتوں پر متنبہ اور نادم ہوتے اُلٹے حق تعالیٰ کی جناب میں گناہیاں کرنے لگے۔ شاید یہ خیال ہوا ہو گا کہ ہم تو پیغمبروں کی اولاد ہیں، خدا کے بیٹے اور اس کے پیارے تھے۔ پھر کیا معاملہ ہونے لگا۔ آج بنی اسماعیل تو دنیا میں پھیلے جا رہے ہیں۔ یعنی نفعات اور آسمانی برکات ان پر کشادہ ہو رہی ہیں اور ہم بنی اسرائیل کو خدا صرف ہمارا ادہم اس کے تھے۔ اس طرح ذلیل و مغلوب اور تنگ سال بزرگ در بدر جھکتے پھر رہے ہیں۔ ہم تو وہی اسرائیل کی اولاد اور اہل اللہ و احباب۔ آج بھی ہیں جو پہلے تھے مگر معلوم ہوتا ہے کہ جن خدا کے ہم اولاد اور محبوب تھے ماحذ اللہ

اس کے خزانہ میں کمی آگئی یا اچانک بھل و ماسک نے اس کا ہاتھ بند کر دیا ہے۔ احمق اتنا نہ سمجھے کہ حق تعالیٰ کے خزانے تو لامحدود اور اس کے کمالات غیر متبدل اور غیر متناہی ہیں۔ اگر معاذ اللہ اس کے خزانے میں کمی آگئی یا مخلوق کی تربیت و اعانت سے وہ ہاتھ کیسے لیتا تو دنیا کا نظام کسی طرح قائم نہ سکتا تھا اور جو روز افزوں عروج و فروغ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے رفقاء کا کام آنکھوں سے دیکھ رہے ہو یہ کس کے خزانہ اور دست کرم کا رہن منت ہوتا۔ لہذا تم کو کچھ لینا چاہیے کہ اس کا ہاتھ بند نہیں ہوا۔ البتہ گستاخیوں اور فخرانہوں کی وجہ سے خدا کی جو لعنت اور بھگناہ تم پر پڑی ہے اس نے تمہارے حق میں خدا کی زمین باوجود ساری دستوں کے تنگ کر دی اور آئندہ اور زیادہ تنگ ہونے والی ہے۔ اپنی اتنی تنگ حالی کو خدا کی فکر دہستی سے مٹو کہ تمہاری انتہائی سہاہت ہے۔

حضرت شیخ الاسلام نے غل بکر بھل کے لیے کنائی زبان بنا کر جو تفسیر کی وہ قرآنی سیاق و سباق اور لغت عرب کے بہت زیادہ قریب ہے۔ واقعی عربی محاورے کے مطابق کسی کے ہاتھ بند ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھیل ہے، عطا و بخشش سے اس کا ہاتھ رکا ہوا ہے یعنی اللہ معاذ اللہ بھیل ہے۔ غل یہ اور بسطید دونوں عربی ہیں بھیل و سخاوت کے لیے بولے جاتے ہیں اسی سے قرآن میں یہ آیت ہے لَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ

جو اس کی یہی ہے کہ ہاتھ اکثر کاموں میں بطور آکر استعمال ہوتا ہے بالخصوص دولت کے لینے اور خرچ کرنے میں۔ سبب بولی کہ سبب مراد لیتے ہیں۔ اسی لیے سخی کو فیاض الکف جسوٹا لیا اور بھیل کو کز الید صالح اور مقبوض الکف کہتے ہیں۔ لہذا یہ بولی کہ کتنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ واقعی اللہ کے ہاتھ بندے ہوئے ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ اللہ بھیل ہے جو کچھ عطا کرے وہ کچھ نہ لے لے گا اور اس کی گزشتہ عظمت

محض ایک انسان پارسینہ بن کر رہ گئی تھی جس کے پیر واپس آنے کا کوئی امکان انہیں نظر نہیں آتا تھا اس لیے بالعموم اپنے قومی مصائب پر ماتم کرتے ہوئے اس قوم کے نادان لوگ یہ بیہودہ فقرہ کہا کرتے تھے کہ معاذ اللہ خدا تو بھیل ہو گیا ہے۔ اس کے خزانے کا منہ بند ہے۔ ہمیں لینے کے لیے اب اس کے پاس آفات و مصائب کے سوا اور کچھ نہیں رہا۔ یہ بات کچھ بیہودہ بلکہ محض جہل و دوسری قوموں کے جہلا کا بھی یہی حال ہے کہ جب ان پر کوئی سخت وقت

اُنہی کے لئے خدا کی طرف رجوع کرنے کے بھاتے وہ جیل جلا کر اس قسم کی گستاخاں باتیں کیا کرتے ہیں۔

گستاخیوں کی پاداش میں لعنت

۱۴۵۔ انہیں کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور ان کے کہنے کی وجہ سے ان پر لعنت پڑی ہے۔ یہ دعا کے نگ میں پیشین گوئی ہے یا ان کی واقعی حالت کی خبر دی گئی ہے چنانچہ واقع میں کئی دہائیوں کے ہاتھ بالکل بند کر دیئے گئے۔

ان کی اس گستاخی پر لعنت اور پھٹکار ہے۔ اس فوری لعنت اور پھٹکار کی وجہ یہ ہے کہ یہود اللہ اور اس کی شان سے بے خبر نہ تھے وہ ہرگز سے واقف تھے لیکن قرآن اور حضور اللہ کی عداوت میں ایسے اندھے بہرے ہو گئے کہ ان کو یہ احساس تک نہ ہوتا تھا کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ یہاں حضرت مولانا تھانوی کی پرہیزگار فہمیت خوب اور اسلام میں کفر کے لیے قانونی موقف کی اچھی توضیح ہے کہ یہود کا یہ کہنا خواہ ان کے اعتقاد پر مبنی نہ ہو لیکن کفر کا لفظ بھی بظہر اللہ اور غیر تردید کے کفر ہی ہوتا ہے اسی لیے با قاضی کو لعنوا کی علت بنایا گیا ہے۔ شاید اسی بنا پر فقہانے ایمان میں زبان کے اقرار کی ضرورت کو محسوس کیا ہے۔ اگرچہ اس میں اختلاف ہے کہ اقرار کی ایمان میں حیثیت کیا ہے۔ ایک جماعت رکن کی حیثیت بتاتی ہے۔ اور دوسری جماعت شرط قرار دیتی ہے۔ پہلی جماعت کا خیال ہے کہ اقرار بھی ایک قسم کی تصدیق ہے۔ فرق ہے تو صرف یہ کہ ایک تصدیقِ قلب سے ہوتی ہے اور ایک زبان سے۔ اقرار زبان کی تصدیق ہے اس لیے کوئی وجہ نہیں ہے کہ تصدیق کی ایک نوع رکن اور دوسری شرط قرار دی جائے یہ اور بات ہے کہ تصدیقِ قلبی رکن اصلی ہے یعنی کسی حالت میں یہاں تک پہل برداشت نہیں کیا جاسکتا اور اقرار رکن زائد یعنی بعض صورتوں میں یہاں اخص و چشم پوشی کر لینا بھی ممکن ہے جیسا کہ اگر اوّل شیخ ابو منصور ماتریدی، شیخ ابوالحسن اشعری اور امام نسفی کا میلان خاطر اقرار کی شرطیت کی طرف ہے۔ یہ حضرات فرماتے ہیں کہ خبرت اسلام سے قبل ہی احکام اسلام کا نافذ کرنا تو غیر معقول ہے لیکن زبانی اقرار کے بغیر ہمائے پاس اسلام کی کوئی شہادت نہیں اس لیے اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے کہ اسلام کا دغا دار شہری کہنے کے لیے اقرار کو شرط قرار دیا جائے

گرایا میان و کثرو نوں کے لیے زبان کی گفتار معتبر ہے۔ اگر زبان سے اقرار کرتا ہے اور قلب تصدیق نہیں کرتا ہے اور اگر زبان سے انکار کرتا ہے اور قلب تصدیق کرتا ہے تو پہلی صورت میں ہم مسلمان و دوسری صورت میں کافر قرار دیں گے جیسے گفتار ایمان کے لیے شرط ہے ایسے ہی گفتار کفر کے لیے بھی شرط ہے۔

صفات باری کیف و کم سے بالا ہیں

۱۴۶۔ اللہ کے دونوں ہاتھ کھلے ہوتے ہیں۔ حضرت شاہ عبدالقادر نے ان آیات پر جو فائدہ لکھا ہے اس میں دو باتوں سے مراد ہر اور قہر کا ہاتھ لیا ہے۔ یعنی آج کل مہر کا ہاتھ اہمیت محمدیہ پر اور قہر کا بنی اسرائیل پر کھلا ہوا ہے۔ جیسا کہ اگلے آیتوں میں اشارہ فرمایا ہے۔ یہود اس حقیقت سے باخبر تھے کہ عربوں کو قرآن کا خدا صرف قرآن ہی کا خدا نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ وہ اہمیت اور سیادت بھی ان کی طرف منتقل ہو رہی ہے جس کے تنہا اجارہ دار اب تک وہ خود بنے بیٹھے تھے اس حسد نے ان کو جناب الہی میں گستاخ بنا دیا۔ اسی کا جواب یہاں قرآن نے دے رکھا ہے کہ اللہ کی ذات سبیل کے شاہد سے بھی پاک ہے اس کے حمد و سجادہ کریم کی دروزاقی برابر جاری ہے۔

یہاں اللہ سبحانہ کے لیے یہ کے استعمال نے بہتوں کو چونکا دیا۔ زعفرانی نے اپنا شان عقلمانی کو باقی رکھنے کے لیے علی الاعلان کہہ دیا کہ اللہ سبحانہ کے لیے ہاتھ کا ثابت کرنا ٹھیک نہیں ہے اور زعفرانی کی پیروی میں اردو شارحین قرآن میں سے بعض نے بھی یہ بات کھدائی کہ یہ اللہ کے لفظ آجانے سے حق تعالیٰ کے لیے اثبات یہ کا قطعاً کر لی سوال

ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ (تفسیر اجدی)

لیکن خدا کر وٹ کر وٹ جنت نعیم کرے حضرت مولانا شیخ الاسلام عثمانی کو کہ وہ یہ مفید بات لکھ گئے۔

حق تعالیٰ کے لیے جہاں ہاتھ پاؤں، آنکھ وغیرہ نفوت ذکر کی گئی ہیں ان سے مجہول کریم یہ وہم نہ ہونا چاہیے کہ وہ مخلوق اللہ مخلوق کی طرح جسم اور اعضائے جسمانی رکھتا ہے جس طرح خدا کی ذات اور وجود، علم حیات وغیرہ تمامی صفات کی کوئی نظیر، مثال اور کیفیت اس کے

سوا بیان نہیں ہو سکتی۔

مے برتر از خیال و قیاس و لگاں و دوہم
از ہر چہ گفتہ اند شنیدیم و خواند و ایم
منزل تمام گشت و بہلہاں رسید عمر
ماہم چنان در اول وصف تو ماندہ ایم

اسی طرح ان نعمت و صفات کو خیال کرو۔ خلاصہ یہ کہ جیسے خدا کی ذات ہے چون وہ بے پیکر
ہے اس کے سمیع و بصیر اور غیر نعمت و صفات کے معانی بھی اس کی ذات اور شان اقدس کے
لائق اور ہمائے کیف و کم اور بعیر و بیان کے احاطہ سے بالکل ورڈ الرور ہیں بیس کلمہ شیئ
و هو الصبیح البصیر۔

حافظ ابن عبد البر شرح موطا میں رقمطراز ہیں کہ

اہل السنۃ والجماعۃ کا اتفاق ہے کہ قرآن و سنت میں حق تعالیٰ کے لیے جو
صفات آئی ہیں وہ اپنے معنی حقیقی پر محمول ہیں معنی مجازی پر نہیں، ہاں اتنا ضرور
ہے کہ وہ ان کی کیفیت اور کیت سے بحث نہیں کرتے ہیں۔
اور قاضی ابویعلیٰ اپنی کتاب ابطال التاویل میں رقمطراز ہیں۔

ان احادیث کو جن میں صفات الہی کا چہرہ بیان ہوا ہے مقرر کیا جاسکتا ہے
اور نہ تاویل کی جاسکتی ہے۔ ظاہری پر محمول کرنا چاہیے لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ
مخلوقات میں سے ان صفات کے موصوفین اللہ کی ذات مشابہ نہیں ہے، اور
تشبیہ ہر کسی لیے میں بھی اعتقاد نہ ہونا چاہیے۔ صحابہ اور تابعین کا صفات کو
ظاہر پر محمول کرنا اور کوئی تاویل نہ کرنا اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ ان کے یہاں
تاویل پسندیدہ نہ تھی۔

اصلاح الاموال الحنفیہ اشعری کتاب الایمان میں فرماتے ہیں۔

اگر ہم سے پوچھا جائے کہ اللہ کے دو ہاتھوں کے بائے میں تم کیا کہتے ہو
ہم جواب دیں گے کہ ہم وہی کچھ کہتے ہیں جو قرآن کہتا ہے ید اللہ فوق یدینہم

لما خلقت پیدا کی اور جو کچھ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے۔

اور اس موضوع پر طویل بحث کی ہے۔ اس کے علاوہ قاضی ابوبکر الباقلائی نے الا بانہ میں اور شیخ تقی الدین نے رسالہ مدنیہ میں اس پر لطیف بحث کی ہے۔ علامہ آلوسی نے سلف امت کی طرف نسبت کر کے لکھا ہے کہ یہ مشابہات ہیں ہے اس میں مسلک تاویل میں مسک تقویٰ کو اپنا اسلامی کی راہ ہے۔

اصل یہ ہے کہ قرآن نے اس موضوع پر جو راہ اختیار کی ہے وہ ایک طرف تو تشریح کر کے درج کمال تک پہنچا دیتا ہے، دوسری طرف تعطیل سے بچا لیتا ہے۔ وہ فرداً فرداً عام مناسبات اور افعال کا اثبات کرتا ہے مگر ساتھ ہی مشابہت کی قطعی نفی بھی کر دیتا ہے وہ زندہ ہے قدرت والا ہے پالنے والا ہے، رحمت والا ہے، دیکھنے اور سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے اور پھر اتنا ہی نہیں بلکہ انسانوں کی بول چال میں قدرت و اختیار اور ارادہ و فعل کی جتنی شائستہ تعبیرات ہیں انہیں بھی ملتا مل استعمال کرتا ہے۔ مثلاً خدا کے ہاتھ تنگ نہیں ہیں بل یداً بوسطتان لیکن یہ بھی صاف اور بے لچک کہتا ہے کہ اس سے مشابہ کوئی چیز نہیں وہ علم المثال ہے یس کثلہ، شئی للنا ظاہر ہے کہ اس کا زندہ ہونا ہمارے زندہ ہونے کی طرح نہیں ہو سکتا اس کا دیکھنا سنا جاننا و سنا نہیں ہو سکتا جس طرح کے دیکھنے سننے اور جاننے کا ہم تصور کر سکتے ہیں اس کا ہاتھ آنکھ چہرہ ضرور ہے لیکن یقیناً اس کا مطلب وہ نہیں ہو سکتا جو ان الفاظ کے مدلولات سے ہمارے ذہن میں مشکل ہوتا ہے۔

اللہ کا قانون انفاق

۱۴۱- وہ خرچ کرتا ہے جیسے چاہتا ہے۔ یعنی اس کو وہی خوب جانتا ہے کہ کس وقت کس پر کس قدر خرچ کیا جائے۔ کبھی ایک وفاقہ کو امتحان یا اصلاح حال کی غرض سے ملکی اور حسرت میں مبتلا کر دیتا ہے اور کبھی اس کی وفاداری کے صلے میں ٹھاتے آخرت سے پہلے دنیوی برکات کے دروازے بھی کھول دیتا ہے۔ اس کے بالمقابل ایک مجرم متمر و پکسی آخرت کی سزا سے پہلے تنگ حالی، ضیق عیش اور مصائب و آفات دنیوی کی سزا بھیجتا ہے اور کسی وقت دنیوی ساز و سامان کو فراغ کر کے مزید مہلت دیتا ہے کہ یا خدا کے احسانات سے متاثر ہو کر اپنے فسق و فجور پر کچھ شرمائے یا اپنی شقاوت کا پوری طرح پیمانہ بریز کر کے

انتہائی سزا کا مستحق ہو۔ ان مختلف احوال و اغراض اور متفرق حکمتوں کی موجودگی میں کسی شخص کے متنبول مردود ہونے کا فیصلہ خدا کی اطلاع یا قرآن و احوال خارجہ کی بنا پر کیا جاسکتا ہے جس طرح ایک چور کا ہاتھ کاٹا جاسکتا ہے یا فاکٹر کسی مریض کا ہاتھ کاٹے دونوں کی نسبت ہم احوال خارجہ اور قرآن سے سمجھ لیتے ہیں کہ ایک بطور سزا اور دوسرا بطور شفقت و علاج کاٹا گیا ہے یہ

مطلب یہ ہے کہ ان گناہوں کو کھایا جا رہا ہے کہ اب جو فیضان الہی سے تم محروم ہو چکے ہو اس کی وجہ نہ فیض میں کمی ہے اور نہ فیض میں بخل ہے بلکہ اس کی اصل وجہ تمہارے اعمال ہیں ورنہ اس کا فیضان تو اس کی مشیت کے تابع ہے اس کی مشیت میں کوئی دخل نہیں ہے۔ امتوں کی دوسری گزریوں کی طرح ایک فکری گزراہی یہ بھی رہی ہے کہ اکثر ایک لوگوں کی نسبت یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کی مشیت بھی مین خدا کی مشیت ہے اس میں نہ صرف بدعتیدہ لوگ بلکہ اہل توحید بھی غلطی سے مبتلا ہو جاتے ہیں جیسا کہ یہودیوں کے سخن ابناء اللہ و امہاء سے منہوم ہوتا ہے۔ قرآن نے یہاں اس دقیق غلطی سے انکاء کیا اور بتایا کہ دنیا میں مشیت صرف خدا کی ہے۔ اس کی خواہش کے مطابق دنیا چل رہی ہے۔ تمام مشیتیں اور خواہشیں اسی کی مشیت اور خواہش کے تابع ہیں۔ اس کے ساتھ کسی مخلوق کی مشیت عالم کے کاروبار میں شریک نہیں ہے لیکن یہودیوں نے اللہ کی مشیت میں اور ان کی مشیت کو بھی شریک کر لیا تھا۔ قرآن نے بار بار اس حقیقت کو واضح کیا کہ مشیت الہی کے علاوہ اور کوئی مشیت نہیں ہے۔ اور یہاں امام رازنی کا یہ نکتہ آخرینی بھی خوب ہے کہ اس آیت میں کلمے بندوں ان ارباب اعتزال کی بھی تردید ہو رہی ہے جو کہتے ہیں خدا پر مطلق کو ثواب دنیا واجب ہے۔ خدا پر کوئی چیز واجب نہیں وہ بھیچے چاہتا ہے کہتا ہے۔

اسلام کی ترقی سے بیماری میں اضافہ

۱۴۸۔ اور خدا کی طرف سے جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے یہ ان میں سے بہتوں میں سرکشی اور کفر میں اضافہ کا سامان ہو گا ان کی گستاخی کا جواب دیا جا چکا ہے لیکن قرآن کے ایسے حکیمانہ جوابات سے ان صائدین اور سفہاء کو تسکین نہیں ہوتی بلکہ کلام الہی سن کر شرارت اور انکار میں اور زیادہ ترقی کریں گے۔ اگر غلامتے صالح ایک بیمار کے معدہ میں پہنچ کر اس کے مرض کو زیادہ کر دیتی

ہے تو اس میں غذا کا تصور نہیں ہے مریض کے مزاج کی خرابی ہے بلکہ

حافظان کثیر فرماتے ہیں اے اللہ کے پیغمبر اللہ سبحانہ آپ پر جو انعامات فرما رہا ہے یہ انعامات ہی آپ کے خالصین یعنی یہود کے حق میں عذاب کا سامان ہو جائیں گے۔ اہل ایمان میں یہ انعامات اگر ایمان و عمل صالح میں ترقی کا ذریعہ ہیں تو اہل کفر میں یہی انعامات حسد کی آگ بھڑکائیں گے اور حسد کے نتیجے میں وہ کفر اور سرکشی میں بڑھتے جائیں گے۔

مطلب یہ ہے کہ بھاتے اس کے کہ اس کلام کو سن کر وہ کوئی مفید سبق لیتے اپنی غلطیوں اور غلط کاریوں پر متنبہ ہو کر ان کی تلافی کرتے اور اپنی گمراہی ہوئی حالت کے اسباب معلوم کر کے اصلاح کی طرف متوجہ ہوتے۔ ان پر اس کا الٹا اثر یہ ہوا ہے کہ ضد میں اگر انہوں نے حق و صداقت کی اور مخالفت شروع کر دی ہے۔ خیر و صلاح کے مجملے ہوتے سبق کو سن کر خود راست پر آنا تو دکنار ان کی الٹی کوشش یہ ہے کہ جو آواز اس سبق کو یاد دل رہی ہے اسے وادیں تاکہ کوئی دوسرا بھی اسے سننے نہ پائے۔

یہودی اور عیسائی میں آگ پانی کا میر ہے

۱۴۹۔ اور ہم نے ان کے درمیان روز قیامت تک عداوت اور دشمنی ڈال دی۔ اگرچہ قریب میں خاص یہود کا متور ہے لیکن القینا بینہم سے مراد غالباً وہ اور ان کے بھائی سب ہیں یعنی یہود و نصاریٰ سب اہل کتاب کا حال بیان فرمایا ہے جیسا کہ پہلے اسی سورت میں گزرا۔ اور آگلی آیت میں بھی سب اہل کتاب کو خطاب فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جوں جوں ان کی شرارت اور انکار کو ترقی ہوگی اسی قدر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں اور منصوبے زیادہ باندھیں گے اور لڑائی کی آگ لگانے کے لیے تیار ہوں گے لیکن ان کے آپس میں جھوٹ پڑ چکی ہے جو جرمٹ نہیں سکتی۔ اس سبب سے اسلامی برادری کے خلاف ان کی جنگی تیاریاں کامیاب نہیں ہوئیں گے عام شامین قرآن کی رائے یہی ہے کہ بینہم کی ضمیر کا مرجع یہود و نصاریٰ دونوں ہیں۔ ابن جریر نے ام مجاہد سے یہی نقل کیا ہے۔ ابن جریر کے علاوہ دوسرے شامین نے الحسن البصری کی ہمنوائی بھی نقل کی ہے۔ زمانہ نبوت ہی میں نہیں آج بھی جرمن، انگریز اور فرانس میں یہی حال ہے۔

لیکن کچھ مفسرین کا خیال ہے کہ یہ یہودیوں کے بارے میں ہے۔ چنانچہ مولانا آزاد فرماتے ہیں،
 عیسائیوں کی طرح یہودی بھی مختلف فرقوں میں بٹ گئے ہیں اور مذہبی فوق بندی
 نے ہمیشہ کے لیے ان میں باہمی بغض و عناد کے جذبات پیدا کر دیے ہیں۔
 حافظ ابن کثیر کا میلان بھی یہی معلوم ہوتا ہے لیکن ان کی یہ فکرت آفرینی داد کے قابل ہے کہ
 تیسری مخالفت اور کمزور جگہ بعد بھی یہودی کبھی حق پر جمع نہ ہوں گے۔
 اب جو دنیا میں اجتماعیت نظر آ رہی ہے یہ حق پر نہیں بلکہ باطل پر ہے۔ روحانیت پر نہیں اہدیت
 پر ہے۔ ہر حال تفسیری دونوں ہیں اور قرآن کے الفاظ میں گنجائش ہے۔

اہل ایمان کو تسلی کہ یہود کا میاں نہ ہوگا

۱۵۰۔ جب کبھی یہ جنگ کی آگ لگتا ہے تو اللہ اس کو ٹھنڈی کر دیتا ہے اور یہ لوگ زمین میں
 فساد پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اس سے معلوم ہوا
 کہ اہل اسلام میں جب تک باہمی محبت اور اخوت مستحکم ہے گی اور دُشمنی و صلح کے طریق پر گامزن
 ہو کر فتنہ اور فساد سے بچتے رہیں گے گا جیسا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں تھا۔ اس
 وقت تک اہل کتاب کی سازشیں ان کے مقابلے میں بیکار رہیں گی۔
 یہ دراصل اہل ایمان کو تسلی ہے کہ اگرچہ عداوت اور حسد کے جوش میں یہ اندھے ہو رہے ہیں اور
 براہِ قیاسے خلاف جنگ کی آگ بھڑکانے میں کوشاں رہیں گے مگر اللہ سبحانہ ان کو کوششوں
 کو کامیابی عطا نہیں کرے گا بلکہ جب بھی یہ آگ بھڑکائیں گے اللہ تعالیٰ بجھا دے گا۔ اس طرح آگ
 بھڑکانا کناہ ہے جنگ سے اور آگ بجھانا کناہ ہے جنگ کی مدافعت سے۔ اس میں تاریخ کی اس
 حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ کفار نے جب بھی اہل ایمان پر چڑھا لی ہے۔ اس میں یہود
 کی سازش کا مزور تعلق رہا ہے۔ جمہور مفسرین اسے استعارہ کہتے ہیں اور کچھ اسے کناہ کہتے ہیں۔
 جو استعارہ کہتے ہیں وہ آگ کے روشن کرنے سے اہل ایمان کے خلاف سازش مراد لیتے ہیں اور جو
 کناہ کہتے ہیں ان کے لئے میں آگ بھڑکانے سے جنگ مراد ہے۔ اُلوسی کا فیصلہ یہ ہے کہ کناہ
 دالی بات زیادہ لطیف ہے۔

دوسری بات یہ فرمائی گئی ہے و یسعون فی الاماکن فساداً کہ ان کا پیش نہاد اس کردار میں اخلاق و اعمال اور اجتماعی احوال و ظروف کی درستگی اور اصلاح نہیں بلکہ نرا فساد ہی فساد اور بگاڑ ہی بگاڑ ہے ان کی کوشش کا مقصد یہ ہے کہ اہل عرب میں انفریق کی بجائے اجتماعیت، اتحادی اور جماعت کی بجائے علم و دانش اور شرک و بت پرستی کی بجائے توحید اور یگانہ خدا کی عبادت نہ آنے پائے تاکہ ان کی معنوی قیادت کا گھرنہ قائم نہ رہے اور اللہ روئے زمین میں مفسدین کو پسند نہیں کرتا ہے کیونکہ اللہ کے متکونی اور تشرعی نظام میں تصادم واقع ہوتا ہے جس سے زمین کی برکتیں اٹھ جاتی ہیں اور اس سے ان فتنوں کو راہ ملتی ہے جن کی وجہ سے دنیا شیطان کی بازی گاہ بن جاتی ہے۔ اللہ سبحانہ کو دنیا کی صلاح و فلاح مطلوب ہے اس لیے وہ ان مفسدانہ کوششوں کو اسی حد تک پسپانے کا موقع دیتا ہے جہاں تک اس کے قانون ابتلا کا تقاضا ہوتا ہے۔ اللہ کرپسند ان لوگوں کی جدوجہد ہے جو اس دنیا میں نظام حق و عدل کے مجاہد ہیں یہی چیز اس کائنات کے مجموعی نظام سے ہم آہنگ اور فطرۃ اللہ کے موافق ہے۔ اس وجہ سے وہاں کی جو حق و عدل کی شہادت کے تقاضے پورے کرتے ہیں مدد فرماتا ہے اور مفسدین کی مخالفتوں اور ریشہ دانیوں اور جنگ آزمائیوں کے مقابلے میں ان کو فقیاب کرتا ہے۔ اس آیت نے بتا دیا کہ دنیا میں قانون الہی کے نفاذ کی مخالفت کرنا خواہ وہ کسی عنوان سے ہو بہر حال اور بہر صورت فساد فی الارض ہے۔

اہل کتاب کو خاتم النبیین پر ایمان کی دعوت

۱۵۱۔ اور گریہ اہل کتاب ایمان لے آتے اور متباز سیرت اختیار کرتے تو ہم ان کی برائیاں ان سے دُور کر دیتے اور ہم ان کو نعمت کے باغات میں پہنچا دیتے۔ یعنی باوجود ایسے شدید جرائم کے اور سخت شرارتوں کے اگر اب بھی اہل کتاب اپنے رویہ سے تائب ہو کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کر لیتے تو دروازہ توبہ کا بند نہیں ہوا حتیٰ تعالیٰ کمال فضل و رحمت سے ان کو آخر دی و دنیوی نعمتوں سے سرفراز فرما دیتا۔ اس کی رحمت بڑے سے مجرم کو بھی جب وہ غر مسافر و معترف ہو کر آئے تو مایوس نہیں کرتی۔ لہ

اصل ارشاد آمنا آیا ہے یہاں آمنا کا منقول مذکور ہے کچھ شارحین قرآن تو یہی کہتے ہیں کہ یہاں ایمان سے مراد حضور اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان ہے۔ حافظ ابن کثیر نے بھی یہی اختیار کیا ہے

لیکن علامہ اوسی نے سیاق و سباق کی رعایت سے آمرا کا مفعول یہ بتایا ہے بامافی حنعم الایمان یعنی اگر وہ ایمان لے آتے جس کی ان سے نفی کی گئی ہے۔ اس میں حضور اور صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان داخل ہے لیکن اکثریت کی حالت یہی ہے کہ یہاں ایمان سے حضور ہی پر ایمان مراد ہے۔ سید رشید رضا اپنی مشہور تفسیر المنار میں فرماتے ہیں:

اگر اہل کتاب غالم البینین پر ایمان لے آتے اور متقیانِ ہجرت اختیار کرتے یعنی ان خرابیوں اور ریشہ دوانیوں سے دامن ہٹا کر رکھتے جن کا ارتکاب بے ایمانی کی حالت میں کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے پچھلے گنہگاروں کو معاف کر دیتا اور ان کو اپنی نعمت کے باخون میں داخل کرتا۔

علامہ زعفرانی یہاں بھی منید جو کے اور ہوٹ کر ہی گئے کہ ایمان میں عمل کے بغیر نہایت کی ہرگز ضمانت نہیں ہے کہ کو یہاں آمرا کے ساتھ داخل ہوا بھی آیا ہے۔ صاحب انتصاف نے یہاں بھی موصوف کا اچھا تعاقب کیا ہے کہ اس پر منزل اور اہل السنہ دونوں متفق ہیں کہ ایمان کی طاقت ماضی کی غلط کاریوں کو ختم کر دیتی ہے۔ قرآن میں ہے

قُلْ لِّذَیْنِ کَفَرُوا اِنْ یَنْتَهِیَا یُغْفِرْ لَهُمْ مَا قَدْ سَلَفَ

اگر ایک شخص ایمان لاتے ہی موت کی آغوش میں پہنچ جاتا ہے تو سب کے نزدیک اس کی کفریہ سیئات ہر جہان سے گہرے چلا کر، دونوں کا اجتماع شرط نہایت نہیں ہے۔

اہل کتاب کے ایمان کی آرزو

۱۵۲۔ اور اگر یہ لوگ قائم رکھتے تو رات اور بھیل کو اور اس کو جو ان کے پروردگار کی

جانب سے ان پر نازل ہوا ہے تو ضرور وہ بہر مند ہوتے اس رزق سے جو اوپر سے برتا اور ان کے قدموں کے نیچے سے آتا۔ یعنی اگر تو رات و بھیل کو اور قرآن حکیم کو جو تو رات و بھیل کے بعد ان کی تبلیہ اور ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے اس کو قائم کرتے کیونکہ اس کے تسلیم کے بدون تو رات و بھیل کی بھی صحیح معنی میں اقامت نہیں ہو سکتی بلکہ تو رات و بھیل اور جملہ کتبِ سماویہ کی اقامت کا مطلب ہی اب یہ ہو سکتا ہے کہ قرآن حکیم اور پیغمبرِ آخرا زمان صلی اللہ علیہ وسلم جو کتبِ سابقہ کی پیشین گوئیوں کے مطابق بیٹھے گئے ہیں ان کو قبول کیا جائے گویا اقامت تو رات و بھیل کا سوال ہے کہ آگاہ فرمادیا کہ اگر قرآن کو انہوں نے قبول نہ کیا تو اس کے معنی یہی ہیں کہ اپنی کتبوں کے

قبل کرنے سے بھی منکر ہو گئے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو کھاتے یعنی تمام ارضی و سماوی برکات سے ان کو مستمع کیا جاتا اور ذلت و بدعالی اور ضیق عیش کی جو سزا ان کے عصیان و تردید پر دی گئی تھی وہ اٹھا لی جاتی۔

اس آیت کی تشریح میں شارحین قرآن نے ما انزل الیہم منہم ما یحکم کے بارے میں دو مختلف تفسیر اختیار کیے ہیں۔ ایک تو وہ ہی ہے جس کی ترجمانی شیخ الاسلام نے فرمائی ہے کہ انزل الیہم منہم سے مراد قرآن ہے اس کے قائم کرنے کے ساتھ تورات اور انجیل کے قائم کرنے کے سوائے کسی اور ایک تویہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کو قائم کرنا صرف اسی کو قائم کرنا نہیں ہے بلکہ یہ وہ حقیقت تورات اور انجیل سب کی تکمیل کرنے والی اور محافظ ہے، دوسرا یہ کہ اہل کتاب نے محض دنیا کی منافع حقیر کے لیے اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو توڑا اور تورات و انجیل کو برباد کیا اور اب اسی دنیا کی نسبت انہیں قرآن کے قبول کرنے سے مانع ہے۔ اگر یہ تورات و انجیل کو قائم کرتے اور اب اللہ کی اس آخری کتاب کو قبول کرتے اور اس کو قائم کرنے کی جدوجہد میں شریک ہوتے تو آسمان و زمین دونوں ان کے لیے اپنے خزانے اٹھتے۔

قائم کرنے سے مراد زندگی کے معاملات کا اللہ کی کتاب سے تعلق قائم کرنا ہے۔ یعنی لوگ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اس کے احکام و قوانین کے مطابق قائم کریں۔ اگر زندگی کتاب الہی سے بے تعلق ہو جائے تو چاہے زبان سے کتاب الہی کی مدح میں کتنی ہی قصیدہ خوانی کی جائے نیز کتاب الہی کو قائم کرنا ہے اور نہ اس قصیدہ خوانی سے کسی کو قرآین لفظ کا درجہ حاصل ہو سکتا ہے۔

اس لئے کو بڑے بڑے جلیل القدر مفسرین کی ہمنوائی حاصل ہے حافظ ابن کثیر نے عبد اللہ ابن عباس کی یہی طے بتائی ہے۔ آلوسی، قرطبی، نسفی، ابن جریر، رازی اور نیشاپوری وغیرہ نے اس کو اولیت دی ہے۔ رشید رضا، المراغی نے اسی کو ترجیح دی ہے۔

دوسرا موقف یہ ہے کہ ما انزل الیہم منہم سے انبیاء بنی اسرائیل کی کتابیں جیسے کتاب اشیا، کتاب خرقل، کتاب جقوق، کتاب دانیال وغیرہ مراد ہیں مطلب یہ ہے کہ اگر یہودی اور عیسائی تورات و انجیل اور اپنے انبیاء کے دوسرے مصاحف پر عمل کرتے اور ان میں بتائی ہوئی باتوں پر عمل کرتے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت مان لیتے تو بلاشبہ ہر قسم کی نعمتوں سے ہمہوش ہوتے۔

نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ محاسنِ انوار میں القاسمی کا ترجمان بھی یہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہودی اور عیسائی اسی تعلیم پر قائم رہتے جو ان کتابوں میں خدا اور پیغمبروں کی طرف سے منقول ہے تو یقیناً تصحیح انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت وہ ایک حق پرست اور راست رو گروہ پائے جاتے اور انہیں قرآن کے اندر وہی روشنی نظر آتی جو پہلے کتابوں میں ہے۔

میانہ رو اُمت

۱۵۳۔ ان میں سے کچھ لوگ میاں رو بھی ہیں لیکن زیادہ تر ایسے ہیں کہ جو کچھ بھی کرتے ہیں برائی ہی برائی ہے۔ یہ وہ محدوے افراد ہیں جنہوں نے فطری سلاطت سے توسط و اعتدال کی راہ اختیار کی اور حق کی آواز پر لبیک کہی۔ مثلاً عبداللہ بن سلام اور ملک جہشہ سنباشی وغیرہ ایسے اصل ارشاد میں امتِ مقتصدہ آیا ہے اقتصادِ قصد سے بنا ہے اس کے معنی حمل میں راہِ اعتدال اختیار کرنے کے ہیں۔ فلاں اقتصاد فی امر یہ وہ اپنے معاملہ میں میاں رو ہے۔ اس سے کون لوگ مراد ہیں، کچھ کی بات ہے وہ لوگ جو دین میں اعتدال کو اپناتے ہوئے تھے، ان تو افراط کے ذریعے غلو کرتے اور نہ تعزیر کے ذریعے اسے بیکار کرتے، کچھ کا خیال ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اہل کتاب میں سے مسلمان ہو گئے تھے۔

اصل بات یہ ہے کہ دنیا میں کوئی اُمت اعتدال پسند طبقہ سے خالی نہیں ہوتی لیکن اُمت کے زمانہ ارتقاء میں اس طبقہ کی بہتات ہوتی ہے اور زمانہ نزول میں اور انحطاط میں یہ طبقہ قلیل ہو جاتا ہے۔ یہی اعتدال پسند طبقہ نبوت کی اصلاحی دعوت کا استقبال کرتا ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے وقت میں مدینہ میں اہل کتاب کے اسی اعتدال پسند طبقہ نے اپنے عرب صحابہ کے ساتھ مل کر رسالت کے ہر گمراہے کے باوجود اسلام کو قبول کیا۔

اقتصادی اسلامی مملکت کا وہ طبقہ جس میں وہ منفرد ہے اسلام کی خاص خوبی یہ ہے کہ اس کا راستہ افراط و تفریط سے ہٹ کر نقطہ اعتدال پر ہے قرآن پاک میں امتِ مسلمہ کو امتِ وسطا کا خطاب جن وجوہ سے دیا گیا ہے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ ان کا مذہب افراط و تفریط کے درمیان ہے اس لیے اس نے بیشتر معاملات میں اعتدال و اقتصاد اور میاں روی کی تعلیم دی ہے یہاں مزید تفصیل کا متو نہیں ہے اور ۱۱۲۲ پلے میں اس کی تفصیلات آ رہی ہیں۔

يَا أَيُّهَا الرُّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ۚ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ
فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ۚ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا
يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ۝ قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَى شَيْءٍ
حَتَّى تُقِيمُوا الشَّرْعَ وَالْإِسْلَامَ ۚ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ
وَلَا يُزِيدَنَّ كَثِيرًا مِنْهُمْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ طُغْيَانًا
وَكُفْرًا ۚ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا
وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّيِّئُونَ وَاللَّاتِيَّاتِ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ
وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلُوا صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ

يَحْزَنُونَ ۝

اے رسول! تمہاری طرف جو چیز تمہارے رب کی جانب سے آ رہی
گئی ہے اس کو اچھی طرح پہنچا دو، اگر تم نے ایسا نہیں کیا
تو تم نے پیغام نہیں پہنچایا اور اللہ لوگوں کی تمہاری حفاظت

کرے گا اللہ کافروں کو ہمارا دشمن نہیں کرے گا۔ کہہ دو کہ اے اہل کتاب تم کچھ نہیں ہو جب تک تم تورات و انجیل کو اور جو کچھ تمہاری طرف اب روانہ کیا گیا ہے قائم نہ کرو اور اے پیغمبر جو کچھ تمہارے پروردگار کی جانب سے تم پر اتارا گیا ہے وہ ان میں اور زیادہ سرکشی اور انکار کا اضافہ کرے گا آپ ان مکہ میں پیرافسوس نہ کریں۔^{۱۵۵} بلاشبہ اہل ایمان ہوں یا یہودی اور صابی اور نصاریٰ کوئی ہو جو کوئی بھی اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھے گا اور نیک عمل کرے گا تو اس کے لیے نہ تو کسی طرح کا اندیشہ ہو گا اور نہ کسی طرح کی غمگینی۔^{۱۵۶}

ہلوری دنیا کو اسلام کی دعوت

ان آیات اور بعد کی آیات میں یہودی و نصاریٰ کی دینی حیثیت پر آخری ضرب لگائی جا رہی ہے اور میں اس وقت لگائی جا رہی ہے کہ جب وہ پورا زہد اس بات پر صرف کر لے گا کہ میں مسلمانان کی دینی حیثیت تسلیم کر لیں۔ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ پورے عرب میں اسلام کا پھیلنا مدینہ میں مکہ کے بعد یہودیوں کی طاقت تھی جو مجازتے کے کرشمہ کے دروازوں تک پہلے

ہوتے تھے۔ ان کے ہاتھ میں مضبوط تلے تھے۔ فن جنگ سے واقف تھے۔ سامان اور اسلحہ وافر رکھتے تھے دولت کی بہتات تھی، ہامول اور زمینوں پر قبضہ تھا۔ عرب کے تمام مادی فداۃ معاش کے وہ تنہا جہاد کار تھے۔ قرآن نازل ہوا اس طرح کہ اس نے یہودیوں کی ایک ایک برائی کو پشت ازہام کیا اور ان کے مذہبی وقار کے کھوکھلے بن کو طعنے لگا کر اعلان ظاہر کیا۔ اس لیے انہیں صاف منظر آتا تھا کہ یہ نئی طاقت ملک میں ابھر کر ان کو بنیاد سے اکھاڑے گی۔ چنانچہ قریطہ، بنی نصیر، بنی قینقاع اور یثرب، غیر مذکور تیار، مادی القریٰ وغیرہ کے یہودی زمیندار سوداگر، مہاجر، اور قلعہ نشین دل سے چاہتے تھے کہ اس قوت کو کسی طرح ابھرنے نہ دیں اور آخر لڑائیاں پیش آئیں، اور دین توحید کے مقابلے میں انہوں نے اہل شرک کا ساتھ دے کر خندق و احزاب اور غطفان کے معرکے پیش کیے۔ عرب کے سرحدی صوبوں پر ایران اور روم کی سلطنتیں تھیں۔ عراق، یمن اور بحرین پر ایران کی حکومت تھی اور حجاز کی شامی مدد پر قیصر کا قبضہ تھا۔

یہاں قاضی عبدالجبار الہمدانیؒ ۱۱۵ھ میں اپنی شہرہ آفاق کتاب تثبیت دلائل النبوة میں بڑی مفید بات لکھ گئے کہ:

مدینہ میں حضور انورؐ کی تشریف آوری کے بعد یہود اوس اور خزرج قبیلوں کے پاس چل کر آتے اور بولے کہ تم نے اس شخص کو یعنی حضور انورؐ کو نبی مان کر اپنے خلاف ہمدردی دنیا کا جیلنج قبول کیا ہے۔ یہی بات اوس و خزرج سے یہودیوں نے بھی کہی اور ان کو عرب میں نصاریٰ کی طاقت سے ڈرایا اور ساتھ ہی روم کے شاہی طاقت کے اندیشے کا بھی ذکر کیا۔ اور حکم دے دیا کہ یہود و نصاریٰ کو انجنت دے دیے جہے تھے کہ کسی نہ کسی صورت سے حضور انورؐ کو قتل کر دیا جائے۔ ایک طرف اوس و خزرج کو باہم ٹکرانے کی سازشیں کر رہے تھے۔ دوسری طرف ان کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکا رہے تھے۔ یہود کی مدینہ، حجاز اور جزیرہ عرب میں بہت بڑی تعداد تھی، ان کی بستیاں تھیں، ان کے قلعے تھے، ان کے پاس سامان جنگ کی فراوانی تھی۔ ان کے بادشاہوں سے تعلقات تھے اور عرب کے نصاریٰ ان سے بھی زیادہ طاقتور تھے اور ان کی مدد دی طاقت بھی یہودیوں سے زیادہ تھی۔

تثبیت دلائل النبوة ج ۲ ص ۲۶۲

یہاں نبوت کا ان ہی دونوں طاقتوں سے مقابلہ ہے۔ قرآن نے ان کے ہی مقابلے میں اپنے

پیغمبر سے کہا اور یا ایہا المرسلین کے عنوان سے مخاطب کر کے فرمایا کہ اب ڈنکے کی چوٹ جو کچھ آپ کی طرف نازل کیا گیا ہے اسے پہننا جیسے آپ کی حفاظت کی ذمہ داری ہماری ہے۔ آپ کو بمقابلہ میں کفر ہرگز کامیاب نہ ہوگا۔

۱۵۴۔ اسے رسول تمہاری طرف جو چیز تمہارے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے اس کو اچھی طرح پہننا دو اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے پیغام نہیں پہنچایا اور ان لوگوں سے تمہاری حفاظت فرمائے گا۔ بلاشبہ اللہ کا فرد کو ہمارا نہیں کرے گا۔ پچھلی آیات میں اہل کتاب کی شرارت اور نیکیوں کا ذکر کر کے تورات و انجیل اور قرآن اور کل کتب سادہ کی اقامت کی ترغیب دی گئی تھی۔ آئندہ قلی یا اہل الکتاب مستعد علی شیئ الا سے اہل کتاب کے مجمع میں اعلان کرنا چاہتے ہیں کہ اس اقامت کے بغیر تمہاری مذہبی زندگی بالکل صفر اور لاشے محض ہے یا ایہا المرسلین میں اسی دو ٹوک اعلان کے لیے حضور کو تیار کیا گیا ہے۔ یعنی آپ پر جو کچھ پروردگار کی طرف سے اتارا جاتے خصوصاً اس طرح کے فیصلہ کن اعلانات آپ بے خوف و خطر اور بلا تاویل پہنچاتے ہیں اگر بغرض محال کسی ایک چیز کی تبلیغ میں بھی آپ سے کوتاہی ہوئی تو بحیثیت رسول ہونے کے رسالت و پیغام رسانی کا جو منصب جلیل آپ کو تفویض ہوا ہے سمجھا جائے گا کہ آپ نے اس کا حق کچھ بھی ادا نہ کیا۔ بلاشبہ حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں فریضہ تبلیغ کی انجام دہی پر بیش از بیش ثابت قدم رکھنے کے لیے یا ایہا المرسلین سے بڑھ کر کوئی موثر عنوان نہ ہو سکتا تھا۔ آپ نے بیس بائیس سال تک جس بے نظیر اور العزیز، جانفشانی مسلسل جدوجہد اور صبر و استقامت سے فرض رسالت و تبلیغ کو ادا کیا۔ وہ اس کی واضح دلیل ہے کہ آپ کو دنیا میں ہر چیز سے مڑھ کر اپنے فرض منصبی کی اہمیت کا احساس ہے۔ حضور کے اس احساس قوی اور تبلیغی جہاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے حالات کے سخت وظیفہ تبلیغ میں مزید استحکام و تثبیت کی تاکید کے موقع پر موثر ترین عنوان یہ بھی ہو سکتا تھا کہ حضور کو یا ایہا المرسلین سے خطاب کر کے صرف اتنا کہہ دیا جائے کہ اگر بغرض محال تبلیغ میں ادنیٰ سی کوتاہی ہوئی تو کچھ کمزور آپ اپنے فرض منصبی کے ادا کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ اور ظاہر ہے کہ آپ کی تمام کوششوں کا مقصد وحید ہی یہ تھا کہ آپ خدا کے سامنے فرض رسالت کی انجام دہی میں اعلیٰ کامیابی حاصل فرمائیں لہذا یہ کس طرح ممکن ہی نہیں ہے کہ کسی ایک پیغام کے پہنچانے میں بھی ذرا سی کوتاہی کریں۔ مگر تاہم یہ سچ ہے کہ فریضہ تبلیغ ادا کرنے میں انسان چند وجوہ سے متعذر رہتا ہے یا تو اسے اپنے فرض کی اہمیت کا کافی احساس

نہیں ہوتا یا لوگوں کو عام مخالفت سے نقصان شدید پہنچنے یا کم از کم بعض مفادات کے خطرے میں پڑ جانے کا خوف ہو تمہارے اور یا مخالفین کے عام قہر و ظہیل کو دیکھتے ہوئے جیسا کہ پچھلی اور اگلی آیات میں اہل کتاب کی نسبت بتلایا گیا ہے۔ تبلیغ کے سہرا اور منہج پر غصے سے یا یوں ہی جو پہلی وجہ کا جواب یا ایسا دراصل سے فنا یافتہ رسالت تک ہے دوسری کا واللہ یصلح من الناس میں ہے اور تیسری کا ان اللہ ۲ بھادی القوم الکافرین۔ میں ہے۔ یعنی اپنا فرض ادا کیے جاؤ اللہ تعالیٰ آپ کی جان اور عزت و دُکرو کی حفاظت کرنے والا ہے وہ تمام روئے زمین کے دشمنوں کو بھی آپ کے مقابلے میں کامیاب نہیں کرے گا۔ آتی ہدایت و ضلالت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ ایسی قوم جس نے کفر و انکار ہی پر کمر باندھ لی ہے۔ اگر راہ راست پر نہ آتی تو عزم نہ کرے اور نہ ایسے ہو کر اپنے فرض کو چھوڑ دے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ہدایت دہانی اور ایمان آسمانی کے کوئی اُمت کو ہر چھوٹی بڑی چیز کی جلیغ کی۔ نوع انسانی کے خواص و عوام میں جو بات جس طبقہ کے واقع اور جس کی استعداد کے مطابق تھی۔ آپ نے ہلاک و کاست اور بے خوف و خطر پہنچا کر خدا کی حجت بندوں پر تمام کر دی۔ اور وفات سے دو ڈھائی ماہ پہلے حجۃ الوداع کے موقع پر جہاں چالیس ہزار سے زیادہ خلیان اسلام اور عاشقان رسول کا اجتماع تھا۔ آپ نے علی دوس لاشہ اعلان فرمادیا کہ

”اے خدا گواہ رہ میں تیری امانت پہنچا چکا ہوں“

سلاطین و رؤسا کو دعوت اسلام

پہلے سن چکے ہو کہ سورہ مائدہ کا نزول سترہ کے اواخر یا سترہ کے اوائل میں ہوا ہے یہی سورت کے نزول تک پہنچتے پہنچتے حالات میں بہت تغیر واقع ہو چکا تھا۔ اب اسلامی اصول اور نقطہ نظر کے مطابق مسلمانوں کی اپنی مستقل تہذیب بن چکی تھی جو زندگی کی تمام تفصیلات میں دوسروں سے الگ اپنی ایک امتیازی شان رکھتی تھی۔ اخلاق میں شہرت، تمدن میں جہیز میں لب مسلمان غیر مسلموں سے بالکل ممتاز تھے۔ تمام اسلامی مقبوضات میں مسجد اور نماز باجماعت کا نظم قائم ہو گیا تھا۔ ہر سبت اور ہر قبیلے میں امام مقرر تھے۔ اسلامی قوانین دیوانی و فوجداری بڑی حد

ایک تفصیل کے ساتھ بن چکے ہیں اور اسلامی عدالتوں کے ذریعے نافذ ہو رہے تھے۔ یعنی دینی اور غیر دینی فراموش
کے لئے معاملات، بند اور نئے اصلاح شدہ طریقے رائج ہو چکے تھے۔ وراثت کا مستقل ضابطہ بن گیا تھا
نکاح اور طلاق نے قوانین زنا اور قذف کی سزاؤں جاری ہونے سے مسلمانوں کی معاشرتی زندگی ایک نئے پائے
میں داخل گئی تھی۔ اسلامی زندگی کی ایسی مکمل صورت گری ہونے کے بعد غیر مسلم دنیا میں اس طرف سے
قطعاً دایرہ کسی حد تک ممتدی کر کے لوگ جن کا اپنا قد آن بن چکا ہے پھر کسی آن میں آئیں گے۔ اس کو قہر پر
قرآن نے حضورِ اہل صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ آپ کا پیغام صرف عرب کے لیے نہیں پوری کائنات
افسالی کے لیے ہے۔ اس کے ہر پہلو کی حیثیت عالمی اور اخلاقی ہے۔ اور یہ عالیت و افانیت اصل
پیغام کے حاملین اور اخلاقی گیر ہونے کی روشن ترین دلیل ہے۔ اور ان کا پتہ نہیں مگر میں
قرآنی تاریخ کی روشنی میں ایسا ہی سمجھا ہوں کہ صحابہ و صحابیہ کے بعد جب آپ مدینہ منورہ پہنچے تو
آپ کو قرآن نے حکم دیا کہ آپ اس پیغام کو اسے عالم میں پہنچائیے اور تمام طاقتوں کو دعوت دیکھئے
یا اے اللہ! رسول تبلیغ ما انزل الیک من ربک چنانچہ عزم شدہ کو اسی ارشاد کی تعمیل میں پھر دھڑکا
تیار کیے گئے۔ چونکہ اس عزم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیر روانہ ہو گئے تھے اس لیے اغلب
یہی ہے کہ دعوت نامے ادا کی عزم میں روانہ کیے گئے۔ قاضی سلیمان منصور پوری نے مکمل ہے کہ شدہ
کے محرم کی پہلی تاریخ تھی۔ یعنی ارمی شدہ۔ ان میں سے ہر ایک کی تفصیل الگ الگ ہے۔

نباشی شاہ جہشہ کے نام مکتوب

سب پہلا گرامی، امرامہ شاہ جہشہ کے نام تھا جس کا لقب نباشی ہے۔ یہ والا نام حضرت عمر بن
امیر منبری کے ہاتھ لکھا گیا۔ اس کے آغاز میں حضرت مسیح علیہ السلام اور حضرت مریم کی کیفیت قرآنی منظر
سے ٹھیک ٹھیک بیان کر دی گئی تھی جس سے کا تعلق تبلیغ سے ہے وہ یہ ہے۔

میں سمجھتا ہوں اس خدا کی طرف بلاتا ہوں جو یگانہ و یگانہ ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں
ہے اور اس کی فرمانبرداری پر مہلات کی دعوت دیتا ہوں اور اس بات کی کہ تو میری
پیروی کر اور اس تعلیم پر ایمان لا جو میرے پاس آئی ہے۔ میں اللہ کا رسول ہوں
جسے ادرتیری فرجی طاقت کو اللہ سبحانہ، عزوجل کی طرف بلاتا ہوں۔ میں پیغام پہنچا چکا
ہوں اور نصیحت کر چکا میری نصیحت کو قبول کرو، سلامتی ہو اس پر جو ہدایت کا
پیر و کار ہو۔

سناشی نے بے حامل اسلام قبول کیا اور اپنے جوابی معنی میں لکھا کہ یا رسول اللہ اپنے میرے علیہ السلام کے اسیر میں جو کچھ فرمایا ہے میں زمین و آسمان کے ہر درد گاہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ حضرت مسیح رقی بھر بھی اس سے زیادہ نہیں ہیں۔ آپ کے علم زاد بھائی اور ان کے رفیق ہمارے مترتب ہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں۔

قیصر روم کے نام والا نامہ

دوسرا دعوت نامہ ہرقل قیصر روم کے نام تھا۔ اس کے لیے وحید ابن حنیفہ الکلبی کو قاصد یا سفیر مقرر کیا گیا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عام مکاتیب گرامی کی طرح یہ مکتوب گرامی بھی تکلف سے پاک اور تبراً اور صرف مطلب پر مشتمل تھا۔

میں تجھے اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اسلام قبول کرے ساری آفات سے محفوظ رہے گا اور اللہ تعالیٰ تجھے دو گونہ اجر دے گا اور اگر رد کردانی کی تو تیرے سارے شہر میں کا وبال تیری گردن پر ہو گا۔ اور اے اہل کتاب اختلاف و نزاع کی ساری باتیں چھوڑ کر آؤ۔ اس بات پر جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں طور پر مسلم ہے یعنی اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔ کسی ہستی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں۔ ہم میں سے کوئی بھی کسی انسان سے ایسے برتاؤ کا روادار نہ ہو کہ آویا خدا کو چھوڑ کر اسے رب بنا لیا۔ پھر اگر اس سے روگردانی کرو گے تو گواہ رہو کہ ہم خدا کے فرمانبردار ہیں یعنی اسی کو ماننے والے ہیں۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے وحید کو تاکید فرمائی تھی کہ یہ خط حاکم بصری کے ذریعے پیش کیا جائے۔ حضرت وحید نے اسی ہدایت پر عمل کیا۔ قیصر اس زمانے میں بیت المقدس آیا ہوا تھا۔ وحید نے مکتوب گرامی عمارت غسانی حاکم بصری کی وساطت سے قیصر کے پاس بھجوا دیا۔ ہرقل اس سے متاثر ہوا جو لوگ عرب کے حالات سے واقف تھے ان سے بھی مختلف باتیں دریافت کیں۔ اتفاق سے وہاں اہل سفیان ایک قافلے کے ساتھ سہارے کے لیے پہنچا ہوا تھا۔ قیصر نے اہل سفیان سے گفتگو میں بہت سے سوالات کیے۔ اس وقت تک اہل سفیان قریش مکہ کا لیڈر تھا۔ اس کے باوجود اسے کوئی بات ایسی دل نہ لگی جسے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بطور الزام پیش کر سکتا۔ قیصر کو بظاہر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا پختہ یقین ہو گیا۔ پھر اس نے رومیہ کے حاکم اور اسقف ضناطر کے نام ایک خط وحید کو لے کر بھیجا کہ اس کی رائے معلوم کرے۔ ضناطر کے نام ایک خط حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے

نے بھی دیا تھا۔ مضافاً رسول اللہ کی رسالت کی تصدیق کی لیکن قیصر بادریوں کی مخالفت سے اتنا غور و فکر ہوا کہ اسلام کے قبول کرنے کا حوصلہ دکر سکا۔

خمسرو پریز شہنشاہ ایران کے نام

تیسرا دعوت نامہ ایران کے شہنشاہ خسرو پریز کے نام تھا، جو فرخاد و خیریں کے سلسلے میں ہمارے فارسی اور اردو ادبیات کی ایک معروف شخصیت بنا ہوا ہے۔ یہ بھی دوسرے دعوت ناموں کی طرح نہایت سادہ اور مختصر تھا جسے ذیل میں من و عن درج کیا جاتا ہے،

اللہ کے نام سے جو رحمن و رحیم ہے۔ اللہ کے رسول محمد معظمؐ کی طرف سے کسریٰ کے نام جو ایران کا حکمران ہے۔ سلامتی ہو اس پر جو ہدایت کی پیروی کرنے۔ اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاتے، میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں، جسے پورے عالم انسانیت کی ہدایت کے لیے بھیجا گیا ہے تاکہ جو لوگ زندہ ہیں انہیں بد عملیوں کے ناسخ سے ڈرایا جاسے، اسلام قبول کرنے کو پوری جلدی جو کسی قوم یعنی اس وقت کے اہل ایران کا وبال تیری گردن پر ہو گا۔

یہ دعوت نامے ملے جانے کے لیے عبداللہ بن حذافہ بھی مقرر ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں تاکید فرمادی تھی کہ دعوت نامہ حاکم بحرین کے پاس ملے جائیں اور اس کی واسطت سے کسریٰ کے دربار میں پیش کریں عبداللہ بن حذافہ نے اس ہدایت پر حرفاً حرفاً عمل کیا، جب یہ خرد کے دربار میں پیش ہوا تو وہ محض رسول اللہ کا اسم گرامی اپنے نام سے پہلے دیکھ کر مشتعل ہو گیا، کیونکہ مسلمانوں کے مقررہ آداب کے مطابق ساسانی شہنشاہ کا نام ہر حال میں پہلے آنا چاہیے تھا۔ عربوں کے طریق کتب و تہذیب کے مطابق کاتب اپنا نام پہلے اور مکتوب الیہ کا نام بعد میں لکھتا تھا اور یہی طبعی و فطری طریق تھا۔

پریز کی سیمینٹی

پھر، مئی ۱۹۲۵ء کا واقعہ ہے جب پریز رویوں پر غیر معمولی فرحتات کے بعد بے لپے خشکیوں کا ناہرا اپنی سلطنت کے بچاؤ کے لیے شدید تشویشات میں مبتلا تھا۔ ۱۰۱۲ ہجری ۱۲۲۵ء کو یمنی میں آخری خونخوار شکست نے اس پر اک گرد و حشت کی کیفیت طاری کر رکھی تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسے حالات ہر فرد کے احساسات میں غیر معمولی رکاوٹ پیدا کر دیتے ہیں اور وہ بھی مصلے کو سمجھنا اور وجوہات

کے رنگ میں دیکھنے کے قابل نہیں رہتا بلکہ ہر معاملے کو اس رنگ میں دیکھتا ہے گویا جو کچھ اس کے سامنے آ رہا ہے وہ اس کی ٹنکستوں، بزمیوں اور بے چارگیوں کے ہجوم میں دل ہر حجرے کے ٹکڑے کے لیے ہوتا ہوا خاص تیار کیا جا رہا ہے۔ پرویز نے جوش غیظ و اشتعال میں نامر مبارک کو چاک کر ڈالا، رسول اللہ کریم ﷺ اطلاع ملی تو فرمایا، خدا اس کے اقتدار سلطنت کو پارہ پارہ کرے۔ یہی ہوا، پہلے پرویز کا درجہ تقدیر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا، پھر وہ جس سلطنت کے غرور و شوکت میں نامر مبارک چمک کرنے کی جسارت پر آمادہ ہوا تھا وہ سختہ قرطاس کی طرح پارہ پارہ کر دی گئی۔

نامر مبارک چمک کرنے کے بعد پرویز نے یمن کے نائب حکومت باذان کو حکم دیا کہ حجاز کے مدعی نبوت کو ہمارے پاس بھیجا جائے۔ باذان نے دو آدمی ایک خط لے کر مدینہ منورہ بھیجے جہاں میں سے ایک کا نام قمرانہ تھا۔ حضور انور ﷺ نے خط لے کر مسکراتے اور فرمایا، اکل مجھ سے جواب لینا، وہ دوسرے روز حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا:

”اپنے صاحب (باذان) کو یہ خبر پہنچا دو کہ اس کے رب (پرویز) کو میرے رب (اللہ تعالیٰ) نے قتل کر دیا۔“ یہ واقعہ شنبہ کی رات ۱۰ جمادی الاولیٰ ۶۳۰ھ (مطابق ۲۴ ستمبر ۶۵۰ء) کو پیش آیا۔ رات کی سات گھنٹیاں گزری تھیں (یعنی دو گھنٹے اور اڑتالیس منٹ)۔

جب کسی قوم پر بد بختی کا دور آتا ہے تو وہ اپنے ہاتھوں اپنا سب کچھ برباد کر ڈالتی ہے۔ شیریہ نے باپ یعنی شمر کو اس لیے قتل کر دیا کہ وہ ٹنکستیں کھا رہا تھا اور صلح کے لیے تیار نہ تھا۔ شیریہ نے بادشاہ ہفتے ہی دو یوں کی شرطیں مان کر صلح کر لی۔ شیریہ نے باپ کو اس لیے قتل کیا ہوگا کہ عسکری اور کشوری سب لوگ اس کے خلاف ہو گئے تھے۔ پھر شیریہ نے خاندان کے ایک ایک مرد کو چن چن کر قتل کیا تاکہ کوئی مدعی سلطنت باقی نہ رہے۔ صرف وہی ایک دو بچے بچاں کی دسترس سے باہر تھے لیکن خود بھی چھ ماہ کے اندر اندر گناہوں کا گراں بار پشاور اٹھا کر اس عالم میں پہنچ گیا، جہاں محاسبہ نیک و بد سے کسی کے لیے بھی مفر نہیں۔

والی مصر

پھر متحدت نامہ موقوف کے نام تھا جو استغفار اعظم کے منصب پر فائز تھا۔ اور قیصر نے اسے ملکی منظم و نسق کے لیے اپنی طرف سے نمائندہ بنا دیا تھا۔ اس دعوت نے کسی کے لیے

عاطب بن ابی بلترہ نے اپنے آپ کو پیش کیا اور حضورؐ نے فرمایا: "ہاں اللہ فیلت یا عاطب" (عاطب خدا تجھے برکت سے نوازے گا) اس دعوت نامے کی عبارت بھی وہی تھی جو قیصر روم کے دعوت نامے کی تھی اور وہ اوپر نقل ہو چکا تھا۔

سیوطی نے "سنن العاصمہ" میں لکھا ہے عاطب سکندریہ پہنچے تو متوقس کشتی پر دریا تے میل میں سیر کر رہا تھا۔ عاطب نے بھی ایک کشتی کرار پر لے لی تاکہ نامہ مبارک جلد سے جلد متوقس کے پاس پہنچ جائے۔ متوقس نے پوچھا کہ اگر تمہارا نبی سچا ہے تو خدا سے یہ دعا کیوں نہیں مانگا کہ اسے دوسرے سے نکالنے والے مخالفین تبدیل ہو جائیں۔

عاطب نے سب توقف جواب دیا کہ آپ کے عقیدے کے مطابق یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دی اور سولی ہی پر ان کی موت واقع ہوئی۔ انہوں نے خدا سے دعا مانگ کر دشمنوں کو ہلاک کیوں نہ کرادیا؟

متوقس نے جواب دیا کہ بے شک تو خود بھی دانہ ہے اور جس کا تو سفیر ہے وہ بھی دانہ اور حکیم ہے پھر نامہ مبارک کو ہاتھی دانت کی دو تھپتھپوں کے درمیان رکھوا کر سرکاری خزانے میں محفوظ کرا دیا۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک مریضہ بڑے اچھے انداز میں لکھا۔ اس میں کہا کہ یہ تو مجھے علم تھا کہ کہ ایک بچہ آنے والا ہے لیکن میاں گان تھا وہ شام میں ظاہر ہو گا۔ ساتھ ہی حضورؐ ان کی خدمت میں دو معزز قبیلہ لڑکیاں، قیمتی کپڑا اور ایک خمر بھیجا۔ یہی خمر دلدل کے نام سے مشہور ہے جو رسول اللہ کے بعد حضرت علیؓ کے پاس رہا۔

لڑکیوں میں سے ایک حضرت حارثہ تھیں جو رسول اللہ کے صاحبزادے حضرت ابراہیمؓ کی والدہ تھیں۔ دوسری سیرین تھیں حضورؐ نے حضرت حسانؓ کے سپرد فرما دیا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دلدل جیسا خمر اس زمانے میں عرب کے اندر کوئی نہ تھا۔ غالباً اسی وجہ سے اسے ستمہ خاص کے طور پر بھیجا گیا۔

حاکم یامامہ

ہاتھنوں دعوت نامہ ہزادہ بن علی حاکم یامامہ کے نام تھا یہ سلیط بن تیہ بن حمزہ العامری کے ذیلیے سے بھیجا گیا تھا۔ یامامہ آجکل دولتِ سعودیہ کا حصہ ہے اس کے حدود دار البعیر ہیں شمال میں نجد، مغرب میں حماد ولین، جنوب میں احناف و ربع الخالی، مشرق میں عمان بحرین اور خلیج فارس، بحرین ولین کی طرح یامامہ بھی سانیوں کے زیر اثر آگیا تھا لیکن ہزادہ اور اس کے

ہم قوم عرب تھے۔ ہوزہ کے نام جو دعوت نامہ بھیجا گیا وہ بہت مختصر تھا۔ اُغاذ میں فرمایا گیا تھا کہ دین اسلام عرب و عجم میں ہر جگہ پہنچے گا اور غالب رہے گا۔ پھر وہی دو نفل تھے جو دعوت ناموں میں عموماً آتے یعنی اسلام، تسلیم، اسلام قبول کر لے تو محفوظ رہے گا۔

ہوزہ نے نام نہانک بھی پڑھا پھر حضور انور کے سفیر کی ایک نہایت پُر تاثیر تقریر بھی سنی۔ یعنی یہ کہ تو ایک بڑی قوم کا سردار ہے، تیری توجہ سے تیری قوم ایمان کی سعادت کبریٰ حاصل کر سکتی ہے بلکہ تجھے بہترین چیز یعنی اسلام قبول کر لینے کا مشورہ دیتا ہوں اور بدترین چیز یعنی کفر سے بچتا ہوں۔ ان کی جلدت کے لیے کہتا ہوں اور شیطان کی عبادت سے روکتا ہوں۔

لیکن ہوزہ اسلام کی دولت سرمدی سے محروم رہا اور حضور انور فتح مکہ اور غزوہ حنین و طائف سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ پہنچے تو اطلاع ملی کہ ہوزہ فوت ہو گیا ہے۔ اس کی قوم کے ایک وفد نے حاضر ہو کر اسلام قبول کیا

حارث بن ابی شمر غسانی

چھٹا دعوت نامہ شجاع بن دحب اسدی کے ذریعے سے حارث بن ابی شمر غسانی کو بھیجا گیا۔ حارث کا مرکز دمشق تھا، مگر جب شجاع پہنچے تو حارث سخت مصروف تھا کیونکہ قیصر ہرقل بیت المقدس آ رہا تھا اور اس کے لیے جا بجا رسد اور استقبال کے انتظامات حارث ہی کے ذمے تھے۔ شجاع نے حارث کے ایک صاحب سہار و رابطہ استوار کر لیے۔ اس نے رسول اللہ کے منسل حالات سن کر اسلام قبول کر لیا، پھر دمشق کے ایک دربار میں نام مبارک پیش ہوا۔

اس میں فرمایا گیا تھا کہ اللہ پر ایمان لے آ، وہ یگانہ و رکنا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں، تیرا ملک تیرے پاس محفوظ رہے گا۔ حارث نے کہا کہ میرا ملک مجھ سے کون چھین سکتا ہے؟ پھر قیصر کو کھاکر تجھے عرب پر حملہ کی اجازت دی جلتے، نیز گھوڑوں کی نعل بندی کا حکم دے دیا، پھر قیصر کی طرف سے جواب آیا کہ بالفعل یہ ارادہ ترک کر دو اور بیت المقدس پہنچو۔ پھر حارث نے ایک سو مشال سونا شجاع بن دحب کو دینے کا حکم صادر کیا۔ حارث نے جو خفیہ تحفیہ مسلمان ہو چکا تھا زاو راہ اور ہاسچے لیے۔

حارث کی وفات ۳۳ھ میں ہوئی یعنی جس سال مکہ مکرمہ فتح ہوا۔

مزید قاصد

عمر سہ میں ایک ہی وقت چھ قاصد بھیجے گئے اس کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ خلافت عبداللہ بن صفادہ جو خرو پر دین کے نام دعوت نامہ لے کر گئے تھے۔ ان کے ہاتھ ایک دعوت نامہ ہرزان کے نام بھیجا گیا تھا۔ جو اس علاقے کا حکمران تھا جسے کل خوزستان کہتے ہیں۔ ابوا، سوس، رام، ہرز اور تتر یا شتر مشہد شہر تھے۔ غالباً اسی کو ایک زمانے میں مہسویاز کہتے تھے۔ یہ نام گرامی بھی منحصر تھا۔ ہرزان نے حضرت عمر کے عہد خلافت میں اسلام قبول کر لیا۔

۲۔ ایک دعوت نامہ علاربین حضرمی کے ہاتھ منذر بن سادئی حاکم بحرین کے نام بھیجا گیا تھا۔ یہ فتح مکہ کے بعد کا واقعہ ہے۔ منذر بن سادئی اور اس کے بہت سے ہم قوموں نے اسلام قبول کر لیا۔ حضور انور نے علاربین حضرمی کو زکوٰۃ و صدقات اور غیر مسلموں سے جزیے کی تفصیل کے لیے مقرر فرمایا۔ ایک نامہ مبارک بعد میں ابو ہریرہ کے ہاتھ بھیجا گیا۔

۳۔ ایک دعوت نامہ جلد بن لہیم غسانی کو بھیجا گیا تھا۔ اس نے بے رضا و جبت اسلام قبول کر لیا۔ (ادنیٰ السنہ) میں وہ حج کے موقع پر مکہ مکرمہ پہنچا۔ طواف میں جلد کی چادر کا ایک گوشہ اتھاقا ایک بدوی عہ کے پاؤں تلے دب گیا۔ جلد نے بے تامل بدوی کو گلانا چو رسید کیا۔ مسط حضرت عمر کے پاس پہنچا تو فیصلہ ہوا کہ جلد کو بدل دینا ہو گا۔ وہ سمجھتا تھا کہ شہزادے کی عزت حامی شخص کے مقابلے میں بہت زیادہ ہو گی۔ جب معلوم ہوا کہ قانون شریعت کی نگاہ میں شاہ و گدا کے درمیان کوئی تمیز نہیں تو وہ رات کو چھپ کر نکلا اور شام پہنچا اور وہاں سے کسی بن کر قسطنطنیہ پہنچا گیا۔ مگر تمام عمر اس حرکت پر حسرت و انوس کے آئینہ بھاتا رہا۔

۴۔ ایک دعوت نامہ جعفر بن جلدی حاکم عمان کے نام ذیقعدہ ۳۳ھ میں بھیجا گیا یہ عمرو بن العاص لے گئے تھے۔ جعفر کا بھائی عبد بہت صالح اور نیک تھا۔ پھر دونوں جہانوں نے اسلام قبول کر لیا اور اسلامی احکام جاری کر دیے۔ اس میں نیکی اور رسالت کا زیادہ تر حصہ دار عبد ہی تھا۔

۵۔ ایک دعوت نامہ مسود بن سعد کے ہاتھ فروہ بن عمرو الجرامی کے نام بھیجا گیا جو قیصر روم کی طرف سے عمان کا گورنر تھا۔ اس نے اسلام قبول کر لیا۔ ایک گھوڑا، ایک سفید بخر، ایک عسکری گدھا اور عمدہ پہاچات بطور تحفہ بھیجے۔ ان میں ایک عباس بن علی کی تمثیل جس کا حاشیہ سنہری تاروں سے مزین تھا۔ اس پر پارلوں میں شور برپا ہوا۔ قیصر نے فروہ کو اسلام سے منحرف کرنا چاہا لیکن

کامیابی نہ ہوئی لہذا پہلے اس مرحوم کو تیدکید پھر فلسطین کے ایک چٹنے کے پاس جس کا نام مفرقا تھا اسے قتل کرادیا۔ فردہ نے راہِ حق میں یہ تمام آفتیں صابرانہ برداشت کر لیں۔
دینِ حق پر فردہؑ کے ثبات و استواری کا اعلازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ نہ لائے موت کے دقت یہ شعر اس کی زبان پر تھا۔

مسلمان سرداروں تک میری یہ بات پہنچا دو
کہ پروہد گمار کی راہ میں میل جسم اور میری عزت نثار ہیں

متفرق دعوت نامے

ان کے علاوہ بے شمار دعوت نامے تھے جن کی تفصیل کے لیے دفتر کار ہیں، ان کے صرف ہم لکھے جاتے ہیں۔

- ۱۔ بلال بن امیہ (بحرین کا ایک رئیس)
- ۲۔ امیر لہمرئی۔ یہی نامہ گرامی تھا جسے پہنچانے کے لیے حادث بن عمیرؒ تجویز ہونے لگے مگر شرجیل حاکم موتہ نے انہیں راستے ہی میں شہید کرادیا۔ اسی وجہ سے موتہ کی جنگ پیش آئی۔
- ۳۔ اُکیدر حاکم دومتر الجندل
- ۴۔ قبیلہ بنی کلب اور اس کے سردار امین بن عمرو
- ۵۔ ذو کلاع اور ذو عمرو کے قبیلے کا خاندان
- ۶۔ حکمرانانِ عمیر کے افراد و خاندان
- ۷۔ سردارانِ حضرت موت
- ۸۔ سردارِ آند
- ۹۔ البخت سردارِ بھر
- ۱۰۔ بنی حارث
- ۱۱۔ بنی عذہ
- ۱۲۔ شاہِ سمارہ
- ۱۳۔ امراتے بنی وائل
- ۱۴۔ بنی زبیر

۵۔ مختلف مزلوان عرب جن کی تعداد چالیس اور پچاس کے درمیان ہے۔

یہ ان دعوت ناموں کی سرسری کیفیت ہے جو مختلف روایتوں میں محفوظ رہ گئے۔ حقیقی تعداد اور کیفیت کا صحیح اندازہ کرنا کر سکتا ہے۔

اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی زندگی کا ایک ایک لمحہ تبلیغ حق ہی کے لیے وقف تھا چونکہ آپ کی رسالت مقامی نہیں بلکہ عالمی، فاقی تھی اس لیے اس کے لیے مبلغ کا انتظام بھی خاص اہتمام چاہتا تھا۔ اس آیت میں اسی اجتماع کی طرف آپ کو متوجہ کیا جا رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ رسول جبرئیل کی حیثیت سے یہ آپ کے فرائض میں داخل ہے کہ عالمی طاقتوں تک آپ پر پیغام پہنچائیں تاکہ اللہ کی حجت ان پر تمام ہو۔ اس معاملے پر غور کا ایک اور پہلو بھی ہے۔

۱۔ علماء رب العالمین ہے۔

۲۔ اس کا رسول پاک رحمۃ العالمین ہے۔

۳۔ خود ما انزل الیک ذکر للعالمین ہے۔

۴۔ دین حق کا مرکز مشہود یعنی کعبہ مہارک ہدی للعالمین ہے۔

غرض اس کی ہر حیثیت عالمی اور آفاقی ہے

بتایا جا رہا ہے کہ قرآن کی یہ آیت تبلیغ کے عالمی اور آفاقی کرنے کی حضور رافو صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کر رہی ہے اور جن حالات میں کر رہی ہے ان کی سنگینی کا حال تاریخ کے غالب علم پر پوشیدہ نہیں ہے اور قرآن میں واللہ یعمد من الناس کا فقرہ بھی حالات کی سنگینی کو بتا رہا ہے۔ قرینہ دلیل ہے کہ یہاں مراد می عیسائی اہل کتاب ہیں۔ کیونکہ اس وقت اگرچہ ایران کے جہانی مروجانی شہنشاہی کے اوراق منتشر تھے لیکن روم کے حالات اس سے بالکل مختلف تھے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضور انور کو راہنما بنانے والا یہ حالات کی پرکھ دیکھے آپ کی مخالفت کا اللہ نے ذریعہ ہے چنانچہ صلوات اللہ نے بے دھڑک ہو کر حالات کی ساری سنگینی کے باوجود اوروں کے تمام سلاطین و روادوں کو دعوت دی اللہ سبحانہ نے دونوں باتیں بتادی ہیں ایک یہ کہ اللہ آپ کی مخالفت فرماتے گا اور دوسری یہ کہ آپ کے مقابلے میں وہ کامیاب نہ ہوں گے۔ تعمیری بات یہاں سے خود بخود سمجھ میں آ رہی ہے کہ حالات آپ کے ساتھ ہوں گے مستقبل میں آپ کی کامیابی یقینی ہے۔ چونکہ اس وقت رومیوں کی طاقت سب سے بڑی طاقت تھی۔ اسی لیے قرآن نے یہاں عیسائیت کا بھرپور چہرہ پیش کیا ہے۔ جس میں عیسائی، روم میں عیسائی، مصر میں عیسائی غرض کہ دینے کی اگر گرد اصل طاقت کا مرکز عیسائی قوم تھی۔

ادھر یہودی باورسیوں کے بعد اپنی آخری بازی کیلئے کے لیے آخری درجہ میں ان طاقتوں کا سہارا لے رہے تھے۔ اس کا اندازہ اس نقشہ سے ہو سکتا ہے۔ یہ آیت تبلیغ کے نزول کے زمانے کا عرب ہے اس سے آپ کو معلوم ہو گا کہ خلیج فارس کی سمت چھوڑ کر عرب کے شمال میں مملکت بنی حسان اور جنوب میں بنوان اور بکر ایمن کی جانب سلطنت بردم اور بکر احرر کی جانب سلطنت سنجاشی جیشہ میں موجود ہے۔

شیعوں کا عجیب استدلال

غیر نہیں ہمارے شیعہ دوستوں کو کیا ہو گیا کہ اس آیت گرامی کی عالمی اور افاقی حیثیت کو حضرت علی کی خلافت کے مسئلہ کی آڑ میں مجروح کر دیا ہے۔ گویا ان کے خیال میں نبوت کو اسلام کے لیے عالمی طاقتوں سے کوئی اندیشہ نہ تھا بلکہ حضرت علی کی خلافت کے بارے میں خود اہل ایمان سے خطہ تھا۔ چنانچہ علامہ طبرسی نے یہی بات مجمع البیان میں لکھی ہے اور اس کو زور دار بنانے کے لیے ایک استلزام بھی سنائی ہے لیجئے خود ان کی زبانی سن لیجئے :

ابھی ابھی اوصالی کے حوالے سے کہتے ہیں کہ عبداللہ بن عباس اور جابر بن عبداللہ نے بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور ائود کو حکم دیا کہ حضرت علی کا امامت کے لیے تقرر فرمائیں اور لوگوں کو اس کی اطلاع کریں لیکن (معاذ اللہ) حضور ائود ڈھبے تھے کہ لوگ کہہ دیں گے کہ اپنے جیتے کے لیے راہ بنا ہے ہیں۔ اللہ نے آپ پر اس آیت کی وحی فرمائی۔ آپ نے خدیجہ رحمہ اللہ روز اس کا اعلان کیا۔

اللہ تعالیٰ اللہ اللہ کی دیکھ لیا آپ نے کہ مات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ آیت نازل ہو رہی ہے شہد کے اواخر میں اور اس کی پیوند کاری کی جا رہی ہے مسئلہ سے حجتہ الوداع کے بعد اگرچہ اس آیت گرامی کا اس سے کوئی پیوند نہیں ہے لیکن آئیے سر رہے اس کے متعلق بھی کچھ کام کی باتیں ذہن میں تازہ کر لیجئے۔

خدیجہ رحمہ اللہ کا خطبہ اور مسئلہ امامت

حجتہ الوداع سے فارغ ہو کر جب حضور مکہ سے واپس ہوئے اور خدیجہ رحمہ اللہ پر پہنچے۔ خیمہ بنیم نہ مجروح تشدید صم جنہ سے تین میل پر مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک مقام ہے۔ یہاں ایک خدیجہ ہے یعنی

آیت تبلیغ کے زمانے کا سرس



نوٹ: خط کشیدہ اسماء متعلات ہیں باقی تمام نام قبائل کے ہیں۔

مکالم ہے۔ اس جگہ جب حضور پہنچے تو ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔ صحیح مسلم میں حضرت زید بن ارقم کی روایت ہے کہ اس خطبہ میں آپ نے پہلے خدا کی حمد و ثناء بیان کی، پھر غلط نصیحت کی، اس کے بعد فرمایا۔
 اما بعد۔ اے لوگو میں انسان ہوں۔ شاید میرے پاس میرے رب کا قاصد آئے گا یعنی ملک الموت اور میں قبول کروں گا اور تم میں دو بھاری چیزیں چھوڑے جاتا ہوں۔
 پہلی چیز کتاب اللہ ہے اس میں ہدایت اور نذر ہے تو خدا کی کتاب کو پچھڑے رہو، اُداسی سے دلیل لیا کرو۔ لوگوں کو کتاب اللہ کی طرف بہت رحمت دلائی۔ پھر فرمایا کہ دوسری چیز اہل بیت ہیں۔ میں اپنے اہل بیت کے بارے میں تم کو خدا کی یاد دلاتا ہوں۔ یہ الفاظ صحیح مسلم کے ہیں۔ لیکن امام احمد نے حضرت برابر بن عازب اور زید بن ارقم سے روایت کی ہے کہ جب حضور غدير خم پر ٹھہرے تو حضرت علی کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا۔

کیا تم لوگ نہیں جانتے کہ میں مومنین کے لیے اُن کی اپنی ذاتوں سے اولیٰ ہوں سب سے کما کما ہوں۔ فرمایا کہ کیا تم کو معلوم نہیں کہ میں ہر مومن کے لیے اس کے اپنے نفس سے اولیٰ ہوں سب سے کما کما ہوں۔ تب فرمایا کہ اے اللہ جس کا میں مولا ہوں، اس کا علی بھی مولا ہے۔ اے اللہ جو علی کو دوست رکھے ان کو تو دوست رکھ۔ اور جو علی سے عداوت کرے اُس سے تو عداوت کر۔ اس کے بعد حضرت علی سے حضرت عمرؓ نے تو کہا کہ مبارک ہو اے ابن ابی طالب آپ ہر مومن مرد و عورت کے مولا ہو گئے۔

ترندی میں جب حضرت زید بن ارقم سے مروی ہے کہ غدير خم کے خطبہ میں حضور نے یہ فرمایا من کنت مولاہ فعلی مولاہ اور طبرانی وغیرہ نے بسند صحیح روایت کیا ہے کہ حضور نے غدير خم میں شہرات کے نیچے خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس میں کما کما میرے رب لطیف خبر نے مجھ کو خبر دی ہے کہ ہر نبی کی عمر اس کے پہلے نبی سے نصف ہوتی ہے اس لیے میرا گمان ہے کہ اب میں بلایا جاؤں اس کے بعد لوگوں کو اسلامی تعلیمات یاد دلائیں اور ضروریات دین کی تعلیم فرمائی۔ پھر فرمایا، اے لوگو! بے شک اللہ میرا مولا ہے اور میں مومنین کا مولا ہوں۔ اور ان کے لیے اُن کی اپنی ذاتوں سے اولیٰ ہوں تو جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ مولا ہے یعنی حضرت علیؓ، اے اللہ جو علی کو دوست رکھے اس کو تو دوست رکھ اور جو علی سے عداوت رکھے اُس سے تو عداوت رکھ۔

اس خطبہ میں حضور کے اس ارشاد کی ضرورت کیا پیش آئی تھی۔ اس کو ابن حجر کی نے صواعقِ محرقہ میں ذکر کیا ہے۔ سمجھتے ہیں کہ حافظ شمس الدین جزیری نے ابن اسحاق سے نقل کیا ہے کہ جو لوگ حضرت علی سے ساتھ قرآن لکھتے تھے ان میں بعض حضرت علی سے ناراض ہو گئے تھے۔ اور صحیح بخاری سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت بریدہ کو حضرت علی کے ایک فعل کی وجہ سے حضرت علی سے بغض ہو گیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تردید کی۔ حافظ ذہبی نے اس کی تصحیح کی ہے کہ حضرت بریدہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شکایت کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک متغیر ہو گیا اور حضرت بریدہ خود کہتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اے بریدہ! کیا میں مومنین کے لیے اُن کے نفسوں سے ادنیٰ نہیں ہوں، میں نے کہا ہاں یا رسول اللہ! تو فرمایا کہ جس کا میں مولا ہوں اس کا علی مولا ہے۔

ابو داؤد و الترمذی اور حاکم الرازمی وغیرہ نے اس روایت کی صحت میں کام کیا ہے مگر ابن حجر کی سمجھتے ہیں کہ سولہ صحابیوں نے اس قصہ کو روایت کیا ہے اور امام احمد کی ایک روایت ہے کہ جن صحابیوں نے اس میں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا اور حضرت علی کی خلافت کے ایام میں جب آپس میں اختلافات پیدا ہوئے تو ان صحابہ نے حضرت علی کی فضیلت پر اس سے استدلال کیا۔ یہ روایت مختلف اسانید سے مروی ہے جن میں بعض صحیح ہیں بعض حسن۔ اس لیے یہ روایت یقیناً صحیح ہے اور بعض اکابر حدیث کے اختلاف کے باوجود صحیح ہے اور بلاشبہ اس سے حضرت علی کی بہت بڑی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ آپ تمام مومنین کے مولیٰ ہیں۔ آپ کا دوست خدا اور رسول کا دوست ہے۔ اور آپ کا دشمن خدا اور رسول کا دشمن ہے۔

لیکن شیعوں نے اس روایت کو حضرت علی کی خلافت پر سب سے بڑا استدلال بنایا ہے اور شیعوں کی خلافت کے خلاف اس سے استدلال کیا ہے وہ محض لغو ہے اور چوتھو شیعوں کے نزدیک سندِ امامت پر صرف متواتر روایات سے استدلال کیا جاسکتا ہے اس لیے وہ اس روایت کو متواتر بھی کہتے ہیں وہ بھی محض جھوٹ ہے۔

مسلم ہو چکا ہے کہ بعض اکابر حدیث کو اس کی صحت میں بھی لکھتے ہیں۔ متواتر کہاں۔ بخاری نے اس قصہ کو روایت ہی نہیں کیا، امام مسلم خطبہ کا ذکر کرتے ہیں اور اس کے الفاظ بھی روایت کرتے ہیں مگر اس میں وہ الفاظ نہیں ہیں جس پر مجتہد کی بنیاد ہے یعنی من کنت مولاً فعلی مولاً یہ حدیث کثرت طرق کی وجہ سے اگر صحیح بھی ہو پھر بھی امامت پر استدلال اس سے کسی طرح صحیح نہیں۔ مولیٰ چند

صحابی میں مشترک ہے۔ معتن، عقیق، ناصر، محبوب، متصرف فی الامر۔ لیکن کوئی معنی خلافت یا امامت کو مستلزم نہیں ہے۔ اور اگر بالفرض امام اور صلاح کے معنی بھی اس کے لیے جائیں تو اس کا یہ مطلب تو قطعاً نہیں ہو سکتا کہ حضرت علی اسی وقت امام المؤمنین تھے جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہا، اس لیے کہ اس وقت خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم موجود تھے لامحالہ مطلب یہ ہو گا کہ بیعت کے بعد امام حق ہوں گے جیسا کہ ہو رہے۔ اس سے یمنین کے مقابلہ میں خلافت و امامت بالافضل پر استدلال کیونکر صحیح ہو گا۔

جب ہے کہ یہ لوگ اس زور شور سے اس روایت کو حضرت علی کی امامت کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ جس وقت خلافت و امامت کے مسئلہ پر گفتگو ہوئی نہ حضرت علی نے خود اس کو استدلال میں پیش کیا نہ حضرت عباس نے نہ بنی ہاشم نے نہ کسی دوسرے صحابی نے۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں خلافت کے مسئلہ پر گفتگو ہوئی۔ جلیل القدر مہاجرین و انصار اُس میں شریک تھے اور وہ صحابہ بھی شریک تھے جو خدیجہ خم کے خطبہ میں موجود تھے۔ اس خطبہ کے بعد صرف دو بیسٹے درمیان میں گزر رہے تھے مگر کسی نے امامت پر اس سے استدلال نہیں کیا۔ البتہ انہی لوگوں نے پیچھے حضرت علی کی فضیلت پر اس سے استدلال کیا ہے۔

اس کے علاوہ حضرت علی نے بار بار تصریح کر دی ہے کہ حضور نے کسی کی امامت یا خلافت کی تعیین و تصریح نہیں کی۔ خلافت کا انعقاد مسلمانوں کے مشورہ سے ہوا۔ بے شمار روایتیں حضرت علی سے اس باب میں مروی ہیں۔ ذہبی نے ذکر کیا ہے کہ بزار نے بسند حسن اور امام احمد نے بسند قوی روایت کیا ہے کہ حضرت علی سے لوگوں نے استدعا کی کہ اپنا خلیفہ بنائیں تو فرمایا کہ نہیں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو تمہاری لٹے پر چھوڑ دیا اسی طرح ہم بھی تمہاری لٹے پر چھوڑے ہیں اور بزار کی ایک روایت ہے جس کے رجال سنہاری کے رجال ہیں کہ حضرت علی نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو خلیفہ نہیں بنایا۔ دارقطنی، ابن عساکر اور ذہبی وغیرہ نے حضرت علی سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے اجروہ میں بیان کیا کہ خدا کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں سے لے کوئی عہد نہیں کیا۔ اگر رسول اللہ کا عہد ہوتا تو ہم اپنے بھائی بنی تیم بن مرہ کو اور عمر بن الخطابؓ کو رسول اللہ کے منبر پر نیابت دیکر لے لیتے اور اپنے اہل بیتوں سے ان کے ساتھ مقابلہ کرتے۔ ابو نعیم روایت کرتے ہیں کہ حسن المثنیٰ سے کہا گیا کہ من کنت مولاه فعلی مولاه۔ حضرت علی کی امامت پر استدلال ہے تو انہوں نے فرمایا کہ خدا کی قسم اگر رسول اللہ سے رسول اللہ کی عرض امیر یا سلطان بنا ہوتا تو آپ اس

زیادہ صاف اور صریح نظر استعمال کرتے۔ کیونکہ آپ صلیح ایمان تھے۔ اور اگر امامت کے لیے رسول اللہ حضرت علی کی تعیین فرمائیے اور حضرت علی اس علم کے باوجود ساکت رہتے اور رسول اللہ کے حکم کو ترک ہوتا دیکھتے تو سب بڑے گنہگار حضرت علی ہوتے، حاشا وکلاء پرگز نہیں ہو سکتا۔

الغرض اس روایت سے امامت کے مسئلہ پر استدلال کسی طرح صحیح نہیں دلفظہ ذوالفقار اگر صحیح ہوتا تو صحابہ اس سے استدلال کرتے، بنی ہاشم کرتے، حضرت علی کرتے، حضرت عباس کرتے، مگر کسی نے ایسا نہیں کیا۔ اور اس وقت نہیں کیا جب اس کے فیصلہ کی اشد ضرورت تھی۔ مولا کے معنی میاں ناصر یا محبوب کے ہیں اور اس معنی میں کسی طرح کا معذور لازم نہیں آتا۔

تصدیق نبوت محمدیہ کی غیر ایمان نہیں ہے

۱۵۵۔ کہہ دو کہ اے اہل کتاب تم جو کچھ بھی پر وجہ تک تم تورات اور انجیل کو اور اس کو جو تمہاری طرف اب روانہ کیا گیا ہے اسے قائم نہ کرو اور اے پیغمبر جو کچھ تمہارے پروردگار کی جانب سے تم پر اتارا گیا ہے وہ ان میں اور زیادہ سرکشی اور انکار کا اضافہ کر کے گا، آپ ان منکرین پرافسون نہ کریں۔ یہ اعزاز تبار ہے کہ قرآن کا دوسرے سخن کن کی طرف ہے اور پیغمبر کو کن لوگوں کے بامعنی کہا جا رہا ہے کہ ان سے کہہ دو اہل کتاب کو عام اس سے کہ یہودی ہوں یا نصرانی ان سے صاف صاف کہہ دو کہ تم کسی چیز پر نہیں ہو یعنی تمہارا دینی مقام کوئی نہیں ہے اور تمہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نسبت قطعاً سود مند نہیں ہے۔ یہ کلمہ اعزاز تحفہ ہے اعزاز تعلیم نہیں ہے۔ جب تک تم تورات، انجیل اور اس چیز کو جو تمہارے رب کی جانب سے تمہاری طرف تمام صدقوں کی نگران بنا کر اتاری گئی ہے قائم نہ کرو تم کچھ بھی نہیں ہو۔ یعنی تمہارا کوئی مقام نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارا کوئی عمل قبول نہیں ہے کیونکہ قبول عمل کے لیے ایمان شرط ہے اور ایمان کی صحت کے لیے نبی کی تصدیق ضروری ہے۔ اس لیے اگر تم سارے رسولوں کو نہیں مانتے ہو تو تم دین و ایمان کے لحاظ سے کچھ نہیں ایک حرف بے معنی ہو۔ تورات و انجیل اور خدا کی اتاری ہوئی چیز کو قائم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کے مسائل و معاملات سے عملاً ان کا ربط قائم کرو۔ آیت میں ما انزل الیک من ربکم سے مراد قرآن حکیم ہے۔ قرآن حکیم کے سوا کوئی اور چیز مراد لینے کی جہاں گمراہی نہیں ہے۔ اسی آیت میں ایک ہی سانس میں ما انزل الیک من ربک کے الفاظ سے یہ بالکل واضح کر دیا ہے کہ اس سے قرآن ہی مراد ہے۔ یہاں قرآن کے انزال کی ان کی طرف نسبت ان پر ایک شیریں طنز ہے کہ تورات و انجیل دونوں میں

اللہ نے اہل کتاب سے عہد لیا تھا کہ تمہارے پاس ان صفات کا پیغمبر، خدا کا آخری اور کامل پیغمبر کے آئے گا تو تم اس پر ایمان لانا۔ اس کی پیروی کرنا، اس کی مدد کرنا اور اس کی گواہی دینا۔ اسی کی طرف یہاں اشارہ ہے اور اس موقع پر جب کہ قرآن یہ تمام اوصاف لے کر آچکا ہے تو قورات اور انجیل کا قلم کرنا یہی ہے کہ خدا کی تारी ہوئی اس کتاب کو قائم کریں۔ اس کا قائم کرنا ہی قورات و انجیل کو قائم کرنا ہے دین میں آدم سے لے کر نشو و نما تھا۔ کی جو سنت اللہ نے قائم فرمائی ہے۔ اس کے مطابق قرآن کے ذریعے دین البیاد کی تشکیل فرمادی ہے۔ قرآن کا دعویٰ یہ نہیں ہے کہ وہی ہدایت ہے اور اس کے ماضی میں جو کچھ مناسب منکلات ہے بلکہ یہ دعویٰ ہے کہ وہی کامل ہدایت ہے اور بقیہ غائب سابقہ موجودہ حالت میں ناقص ہیں یعنی وہ ابدی ہدایت جو اپنے وقتوں میں سب نبی لے کر آئے ہیں اسی کو محمد رسول اللہ کے آخری دفعہ تشریف لائے اب وہ ہمیشہ کامل ہے گی کبھی ناقص نہ ہوگی اس سے پہلے کر لے اہل کتاب تم کچھ نہیں ہو۔ پہلی آیت میں اہل کتاب کے ماضی کو پیش کیا گیا تھا اس آیت میں ان کے حال اور مستقبل کی عکاسی کی گئی ہے۔ اور سید رشید رضا نے بات خوب لکھی ہے کہ اہل کتاب قورات و انجیل کے مطابق اپنی زندگیاں بنانے پر نہ پہلے قادر تھے اور نہ اب قادر ہیں۔ قرآن ان سے کہہ رہا ہے کہ اس صورت حال کے باوجود ختم نبوت سے تم میں پریشان متھنا کیوں ہے۔ ہم بھی اب امریکہ، جرمنی اور انگلستان کے مشرین سے کہہ سکتے ہیں کہ تم دنیا کو قورات و انجیل کی دعوت لئے سہے ہو، ذرا سوچ کر بتاؤ کہ کس منہ سے تم ایک ایسی چیز کی دنیا کو دعوت لئے سہے ہو جس کو تم خود قائم نہیں کر سہے ہو، تم میں سے کتنے ہیں جو اپنے دشمنوں سے پیار کرتے ہیں اور اپنے پر لعنت کرنے والوں کو مبارک باد بھیجے بغیر بھیجتے ہیں۔ تبصر کا قیصر کو کون دیتا ہے اور ہر ظلم و استبداد کے سامنے خدا کی جانب سے کچھ کر کوئی سرنگوں ہوتے ہو کوئی زیادتی کے جواب میں زیادتی نہیں کرتا بلکہ کون دیتیں رخصت پر چست کھا کر بایں رخصت آگے کرتا ہے۔ تمہاری پلہ کی پلہ کی زندگی اپنی کتابوں کی تعین ہے۔ اسی صورت حال کو قرآن نے ستم علی شی سے تعبیر کیا ہے۔

ہو تا تو یہ چاہیے تھا کہ اہل کتاب اس کتاب کے علمبردار ہوتے۔ لیکن ہر رہا ہے کہ قرآن نے ان کی سرکشی اور کفر میں اور اضافہ کر دیا پہلے یہ صرف انکار کرتے تھے اور یہ پوری طاقت سے اس کو ختم کرنے پر تلے تھے اور اس کے لیے یہود کے قبائل اور مشرکین عرب سے گزرتے عالمی طاقتوں تک بات پہنچ گئی اور وہ پوری قوت سے حق کا مقابلہ کرنے کے لیے میدان میں آگئے ہیں اور اس کے لیے سب کچھ قائم کر سہے ہیں اس کے لیے قرآن نے طغیان کی تعبیر کسی شاندار اور وسیع اختیار کی ہے۔

آخر میں مستقبل کے اسی خطرے کے پیش نظر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ ان کے حال پر غم نہ کرو۔ خلا تاسی علی القوم الکافرین۔ یعنی اس غم اور افسوس میں بڑا کر تنگ دل نہ ہو۔ اپنا فرض امن و اطمینان سے ادا فرماتے رہیں یہ مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگوں پر آپ کوئی افسوس نہ کریں کہ کفر و عن کی طبیعت پہلے چکا ہے آپ کو اللہ کافی ہے۔

اس آیت میں ہماری لیے بڑی عبرت ہے کہ اگر یہودی اور عیسائی قورات و ابھیل سے زندگی کے معاملات و مسائل کا محقق رہنا قائم کیے بغیر دین کی زندگی میں کچھ نہیں ہیں تو مسلمان قرآن سے زندگی کے مسائل و معاملات کو محقق رہنا بوط کیے بغیر دین کی زندگی میں کیوں مستند علی شیعہ کے مصداق نہیں ہیں۔ اللہ کی محبت سے کہنے کے لیے یہاں ہے کوئی وجہ نہیں کہ اللہ یہودیوں سے برگزیدہ امت ہوئے خدا کے محبوب اور پیچھے ہوئے برگزیدہ دین اور پیچھے ہوئے کی اولاد ہوئے کا طرہ بند ذکر ہے اور یہی پیچھے مسلمانوں سے قبول کر لے جبکہ ہماری زندگی کے عملی روابط نبوت کے لئے ہر تہ علم و عمل سے ٹوٹ چکے ہوں۔ افکار، اعمال، اخلاق اور احوال کے سارے نقشے نبوت سے ہٹ کر بن رہے ہوں، اور حکمت دین اور مقاصد سے بے خبر ہو کر کچھ رہے ہیں کہ ہماری دینی بنیاد مستحکم ہے! بحسب انہم علی شیعہ الا انہم ہمد الکاذبون۔

نجات و سعادت کا قانون

۱۵۶۔ بلاشبہ اہل ایمان ہوں یا یہودی، صابی ہوں یا نصاریٰ کوئی ہو جو کوئی بھی اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لکے گا اور نیک عمل کرے گا تو اس کے لیے ذوق کسی طرح کا اندیشہ ہو گا اور کسی طرح کا غم۔ یعنی جو قوم مسلمان کہلاتی ہے یا یہودی و نصاریٰ یا صابی یا اور کچھ فقلاً چند مشہور مذاہب کا ذکر کر دیا گیا۔ کوئی شخص ان ناموں کی بدولت یا نسل رنگ پیشہ وطن وغیرہ احوال و خصائص کے لحاظ سے حقیقی فلاح اور دائمی کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ کامیاب و نامور و مصروف ہونے کا ایک اور صرف ایک معیار ہے یعنی ایمان و عمل صالح۔ جس قوم کو اپنے مقرب الہی ہونے یا کامیاب ہونے کا دعویٰ ہو وہ اسی کوئی پر لپٹے کو کس کر دیکھ لے۔ اگر اس میں کھری تارے تو بے خوف و غم مطلع اور کامیاب ہے ورنہ ہر وقت ایسے خدا کے قہر و غضب کے فیچے کھجے۔ پچھلی آیات میں خاص اہل

کتاب کو تبلیغ تھی۔ اس آیت میں تمام اقوام و مل کے سامنے بلا رو و رعایت ایسا عجیب و غریب منقول اور مضبوط قانون پیش کیا گیا ہے جس کے بعد کسی سلیم الفطرت انسان کو اسلام کی صداقت اور ہمہ گیری میں شبہ نہیں رہ سکتا۔ ایک شخص جب تک خدا اس کے وجود و وحدانیت، صفات کالہ، نشانیات قدرت، تمام احکام و قوانین، کل نابین و سفار اور روز جزا پر ایمان نہ لاتے اور انکی اختیار و کسے کیا عقل سلیم قبول کر سکتی ہے کہ وہ نسیم دائم ضلالتے حق اور سرور ابدی سے ہٹکار ہو سکے گا۔ ایمان بالقرآن کے تحت میں یہ سب چیزیں داخل ہیں۔ فرض کرو ایک شخص روشن دلائل نبوت کی موجودگی میں کسی پیغمبر کی توہین کرتا ہے اور اس کو دعویٰ نبوت میں مجبور ٹاکنہ بھی اس کی توہین ہے تو کیا کسی حکومت کے پیغمبر کی توہین اور اس کے صاف و صریح اسناد رسالت کی تکذیب اس حکومت کی توہین و تکذیب نہیں ہے! اسی طرح سمجھ لو کہ جو شخص کسی ایک۔ سپہ پیغمبر کی تکذیب کرتا ہے اور اس کو قبول نہیں کرتا وہ فی الحقیقت خدا کے ان صاف و صریح نشانات و دلائل کو جھٹلارہا ہے جو اس نے تصدیق نبوت کے لیے اتارے تھے۔

ما نھم لایکذبونک و لکن الظالمین بآیات اللہ یحذون

یہ وہ اصل تھیں نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم جان کر اللہ کی آیات کی تکذیب کرتے ہیں

سوچئے کیا اللہ کی آیات اور صریح و علانیہ نشانات کو جھٹلانیے کے بعد بھی ایمان بالقرآن و دعویٰ نہ سکے گا۔ قرآن نے جن تفصیلات کی طرف ایمان بالقرآن و عمل صالح کے اجمالی عنوان سے یہاں اشارہ کیا ہے، دوسرے مقامات پر وہ پوری شرح و بسط سے موجود ہیں۔ میرے نزدیک زیادہ صحیح اور قوی قول یہ ہے کہ مابین عراق میں ایک لڑقہ تھا جن کے مذہبی اصول عموماً حکمتیے اشرافیہ اور فلاسفہ طبعیین کے اصول سے ماخوذ تھے۔ یہ لوگ روحانیات کے متعلق نہایت غلو رکھتے تھے بلکہ ان کی پرستش کرتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ ارواح مجبورہ اور مہررات فکریہ وغیرہ کی استعانت و استمداد سے ہی ہم رب الارباب یعنی بڑے معبود تک پہنچ سکتے ہیں لہذا ریاضات اخلاقہ اور کسر شہوات سے روح میں تجرد اور منہالی پیدا کر کے عالم روحانیات کے ساتھ ہم کو اپنا رشتہ پیدا کرنا چاہیے۔ پھر ان کی خوشنودی اور دستگیری سے خلاصہ پہنچ سکتے ہیں۔ انبیاء کی اتباع کی ضرورت نہیں ہے۔ کراکب ارواح ہمدہ اور اسی طرح دوسری روحانیات کو اپنے سے ٹوٹ کر رکھنے کے لیے ہر ایک بناتے تھے اور ان ہی ارواح کے لیے نماز روزہ اور قربانی وغیرہ کرتے تھے۔ خلاصہ یہ کہ حنفیہ کے مقابلے میں صابین کی جماعت تھی جن کا سب سے بڑا حکم نبوت اور اس کے لوازم و خواص پر ہوتا تھا۔ حضرت ابراہیم حنیف علیہ الصلوٰۃ والسلام

کی بعثت کے وقت فرد کی قوم صابی العقیدہ تھی جس کے رد و ابطال میں خدا کے خلیل ابراہیم علیہ السلام نے جان نثاری دکھلائی تھی۔

اس موضوع پر ہم جلد اول میں کچھ دھمائی اشارات کر چکے ہیں۔ یہاں شیخ الاسلام نے جو بیرونی اور جامع بات ارشاد فرمائی وہ ان کی علمی بلندیوں کا پتہ لگے رہی ہے اور اس پر مزید کچھ کہنے کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔

لَقَدْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَءِيلَ وَارْسَلْنَا إِلَيْهِمْ رَسُولًا
 قُلْنَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَى أَنْفُسُهُمْ فَرِيقًا كَذَّبُوا
 وَفَرِيقًا تَقَبَّلُوا ۖ وَحَسِبُوا أَلَّا تَكُونَ فِتْنَةٌ فَعَمُوا وَصَمُوا
 ثُمَّ تَابَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوا وَصَمُوا كَثِيرٌ مِنْهُمْ ۖ وَاللَّهُ بِصَدْرِ
 بَنِي إِسْرَءِيلَ عَاطِلٌ ۖ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ
 ابْنُ مَرْيَمَ ۖ وَقَالَ الْمَسِيحُ بَنِي إِسْرَءِيلَ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَ
 رَبَّكُمْ ۖ إِنَّهُ مَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَزَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَا لَهُ
 فِيهَا مِنَ النَّارِ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ ۖ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا
 إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ وَمِمَّنُّوا إِلَهُ وَاحِدٌ وَإِنْ لَمْ يَنْتَهُوا
 عَمَّا يَقُولُونَ لَكَبُشَتْ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابُ أَلِيمٍ ۖ
 أَفَلَا يَتُوبُونَ إِلَى اللَّهِ وَيَسْتَغْفِرُونَ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۖ

ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا تھا اور ان کی طرف

بہت سے رسول روانہ کیے تھے، جب بھی ان کے پاس کوئی رسول ان کی خواہشات نفس کے خلاف کچھ لے کر آیا تو انہوں نے کسی کو جھٹلایا اور کچھ کو قتل کر دیا، اور اپنے تئیں یہ معجزہ بیٹھ ہوئے ہیں کہ کوئی آزمائش نہ ہوگی لہذا اندھے اور بہرے ہو گئے پھر اللہ نے ان سے درگزر فرمایا لیکن اکثر ان میں سے لوگ پھر اندھے اور بہرے ہو گئے اور اب اللہ ان کے کر تو توں کو خوب دیکھ رہا ہے۔ یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ مسیح ابن مریم ہی ہے حالانکہ مسیح نے کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل اللہ کی عبادت کرو جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی، جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا اس پر اللہ نے جنت حرام ٹھہرا دی اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہے۔ یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے

جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے حالانکہ ایک معبود
 کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اگر یہ لوگ اپنی باتوں سے باز
 نہ آتے تو ان میں سے جس جس نے کفر کیا ہے اس کو دردناک
 سزا دی جائے گی کیا پھر یہ اللہ کے حضور میں توبہ نہ کریں گے
 اور اس سے معافی نہ مانگیں گے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے

یہود و نصاریٰ کا تاریخی نقشہ

پہلے اہل کتاب کو مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ لستم علی شیئ اس کے بعد قانونِ نجات بتایا۔ اب
 پہلے یہاں یہود کا تاریخی چہرہ پیش کیا جا رہا ہے کہ اس قانونِ نجات کے مطابق ان کی تاریخ کا فیصلہ خود
 ان کے۔ اب میں کیا ہے۔ فرمایا کہ ان سے ایمان و عمل صالح کا عہد لیا گیا تھا۔ بائبل کی کتاب اجداد
 باب ۲۶ اور استثنا باب ۲۸ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ایک تقریر نقل کی گئی ہے جس میں
 انہوں نے بنی اسرائیل کو بڑی تفصیل سے بتایا تھا کہ اگر تم احکامِ الہی کی ٹھیک ٹھیک پیروی کرو گے
 تو کس کس طرح اللہ کی رحمتوں اور برکتوں سے نوازے جاؤ گے اور اگر کتاب اللہ کو پس پشت ڈال
 کر نافرمانیاں کرو گے تو کس طرح جاثمیں اور مصیبتیں اور تباہیاں ہر طرف سے تم پر ہجوم کریں گے حضرت
 موسیٰ کی یہ تقریر قرآن کے اس مختصر فقرے کی بہترین تفسیر ہے۔ اسی کی تجدید اور یاد دہانی کے لیے
 اللہ نے یکے بعد دیگرے اپنے بہت سے رسول روانہ کیے۔ لیکن ہوا کیا ہے! ان کی تاریخ یہی
 بتاتی ہے کہ انہوں نے عمدہ شکیں کی اور ہر رسول اس کی تجدید کے لیے آئے ان کی تکذیب کر دی یا
 ان کو قتل کر دیا۔ قرآن نے اس تاریخی حقیقت کا انکشاف فریقا کذبوا و فریقا یقتلون کے مختصر
 سے مختصر فقرے کے ذریعہ کیا لیکن اسی حقیقت کو انجیل میں جس انداز سے حضرت مسیح کی طرف

طوب کر کے بیان کیا ہے وہ بھی گوش گزار فرمایا ہے۔

لے ساہوکار ملے دفعی کے پھوتم جہنم کی سزا سے کیونکر بچ سکتے اس لیے میں غیور و داناؤں
اور نصیبوں کو تمنا ہے پاس بیٹھتا ہوں، ان سے بعض کو قتل کر دوں گے اور ملبس ہر چڑھاؤ
گئے اور بعض کو اپنی عبادت خانوں میں کوڑے مار دوں گے اور شہر، شہرستان کے پھر دوں گے

مئی ۳۱ - ۳۲

اس کے بعد قرآن نے بنی اسرائیل کی تاریخ سے ان کے دو دوروں کا پتہ دیا ہے کہ بنی اسرائیل کی قتل
انبیاء کے جہنم میں الشکر کی جانب سے فوری گرفت ہوئی تو وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ اب کوئی پیکر نہیں ہوگا
لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ ان پر نیچے بعد دیگرے دو تہا ہوا۔ آئیں۔ پہلی بریلوی ہالی کے بادشاہ کی جانب
سے دوسری روٹیوں کے حملہ سے۔ قرآن نے یہاں ان دونوں کی طرف فصحا و معطولات حمدا و موصلا
سے اشارہ کیا ہے۔ بنی اسرائیل میں ان دونوں کا تفصیلی تذکرہ آ رہا ہے۔ اس گمبیدی بیان کے بعد یہ سب
کا ذکر شروع ہوا ہے اور بتایا کہ جس طرح یہودی اصل تعلیم سے منحرف ہو کر اندھے بہرے ہو گئے اور ان
کے نتیجے میں خدا کی گرفت ان پر آئی تھیک اسی طرح عیسائی بھی ایمان و عمل سے منحرف ہو گئے، اور
الہیت مسیح اور تثلیث کا اعتقاد پیدا کر لیا۔ یہاں سے دوسرے رکوع کے ختم تک الہیت اور
تثلیث کا باطل بتائے مسیح کی صحیح حیثیت، تثلیث کی تاریخ، اس کا آغاز اور حتمہ عرض کر رہا ہوں
کہ دوسرے طور پر کھول کر بیان کیا ہے، پھر آخر میں اخلاقی اور سیاسی طور پر یہودی و نصاریٰ کا
تقابل مطالعہ پیش کیا ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا ہے کہ آفاقی بیخبر ہونے کی حیثیت میں
نہت کا مقابلہ بین الاقوامی دنیا میں سب سے پہلے نصاریت سے ہوا ہے۔ اسی کے نتیجے ایک سال کے
بعد مسلمان جبر و دم نے دین پر حملے کا حکم دیا ہے اور دوسرے عرب کے عیسائی قبائل اس میں شامل
ہو گئے۔ یہ نہت کے لیے پہلا موقع ہے کہ عرب سے باہر کی ایک سب بڑی طاقت اور شنشہا
آواز پیکار ہوئی۔ یہ نہت کا اعجاز ہے کہ ستر کے افاصل ہی میں اہل ایمان کا اس کے لیے ذہنی
طور پر تیار کر رہا ہے۔ جنگ کے لیے دوسری تیاریوں کے ساتھ سب سے قیمتی تیاری یہی ہے
ان ذہنی تنظیمات کی روشنی میں قرآن کی تشریحات شارحین قرآن کی زبان سے۔

۱۵۷۔ ہم نے بنی اسرائیل سے سچا عہد لیا تھا اور ان کی طرف بہت سے رسول روانہ
کیے تھے۔ جب بھی ان کے پاس کوئی رسول ان کی خواہشات نفس کے خلاف کچھ لے کر آیا تو انہوں
نے کچھ کو جھٹلایا اور کچھ کو قتل کر دیا۔ گزشتہ کہت میں عند اللہ قبولیت کا جو معیار بیان ہوا ہے

یعنی ایمان اور عمل صالح یہاں یہ دکھانا ہے کہ بنی اسرائیل اس معیار پر کہاں تک پہنچے اترتے ہیں۔ اور سمجھایا ہے کہ ان کا وظیفہ یہ رہا ہے کہ ایمان و عمل صالح کے عہد پر قائم رکھنے کے لیے جب بھی ان پاس خدا کے رسول آیا حکم لے کر آتے جو ان کی نفسانی خواہشات کے خلاف ہوتا تو ان کی تکذیب کرتے اور قتل تک کی جرات کر بیٹھتے حالانکہ ظلم کی وفاداری کا امتحان اس میں ہے کہ جبریات کو دل نہ چاہے آقا کے حکم سے گر گئے اور اپنی رائے اور خواہش کو آقا کی مرضی کے تابع بنائے۔

اور صرف ان چیزوں کا مان لینا جو مرضی اور خواہش کے موافق ہوں یہ کون سا کامل ہے۔

اصل یہاں جوہد کی تاریخ بیان ہو رہی ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ ان کی یہ گزند ہی شروع ہی سے رہی ہے کہ وحی الہی کے مقابلے میں وہ اپنے ہوائے نفس کو بالائے سر کشی اور وحی کے ذیلے جو احکام ان کو اپنی خواہشوں یا اپنی ناقص عقل یا اپنی محدود معلومات کے خلاف نظر آتے ہیں ان کا انکار کر لیتے ہیں اور ان کے خلاف علم بغاوت بلند کر لیتے ہیں اور یہ امر واقعہ ہے کہ قدیم ترین زمانے سے دنیا میں دو متقابل دعوئیں پائی جاتی ہیں ایک پڑوسی نفس اور انسان کی مکمل آزادی اور غیر ذمہ داری کی۔ دوسری انسان کی عبدیت اور سبحانہ کے سامنے جو ابدی اور ذمہ داری کی پہلی دعوت کو قرآن کی اصطلاحی زبان میں اتباع ہوئی اور جاہلیت کھتے ہیں اور دوسری کو اسلام اور اتباعِ ہدیٰ کہتے ہیں۔ یہودی علماء پہلی دعوت کے علمبردار تھے جبکہ انبیاء دوسری دعوت کے۔ یہودی پڑوسی اور خواہشوں کے لئے دلائل تھے کہ انبیاء کی دعوت کا مذاق اڑاتے، ان کی تعلیمات پر حملہ کرتے۔ اور ان کی دعوت کو اس حد تک اپناتے جہاں تک ان کی سیاسی قومی، ملکی، تمدنی خواہشیں اور غرضیں پوری ہوتی نظر آئیں اور جوں ہی انبیاء کی دعوت کا ان کے قومی مفادات ان کی سیاسی اغراض، ان کے ملکی مصالح اور ان کی اقتصادی اور معاشی مفاتح سے تصادم ہوتا تو انبیاء کے سامنے ایک حریف کی حیثیت سے آجھرتے اور ان کو کام نہ بنانے کے سائے حربے استعمال کرتے جہاں تک مذہب سے کام چلتا تکذیب کرتے اور اگر تکذیب سے دعوت انبیاء ختم نہ ہوتی تو ان کے قتل کے ذریعے ہرجاتے یہاں اگرچہ علامہ زحمتی نے کہا کہ جواب مذہف مان کر یہ بتایا ہے کہ مطلب یہ ہے کہ جبکہ رسول علم و عمل کا پیمانہ ان کی خواہشات کے برعکس لاتا تو وہ رسالت کا مقابلہ کرتے لیکن علامہ ناصر نے تائید میں یہ کہہ کر اور زور پیدا کر دیا کہ جواب مذہف نہ کھانے کے لیے جدت کی ضرورت نہیں خود قرآن میں

جواب شرط دوم کے مقام پر مذکور ہے۔

اٹھلکھا جادو کدہ رسول بھلا تھوئی انکھو استکبر تہ
یہاں بھی جواب استکبر و اٹھلکھا کے ہے اور مطلب یہ ہے کہ جب نبی نبوت محمد و علی کی دعوت
لے کر آئی وہ سامنے تن گئے۔ یہاں مولانا الطرغی علی کی یہ نکتہ آفرینی خوب ہے کہ استکبار ہی تمام
گناہوں کی جڑ ہے کیونکہ یہاں قرآن نے تکذیب اور قتل انبیاء جیسے سنگین جرائم کو اسی کا نتیجہ قرار
دیا ہے یہاں نفرت شریعہ ماضی اور مضارح کے ذریعے یہاں شروع پیدا کرنے کی وجہ تو صرف یہ بتائی
ہے کہ قیقلون مضارح اس لیے لایا گیا ہے کہ ماضی کیسے گئے اس عظیم جرم کی حال میں حکامی ہر جہاں
لیکن علامہ نضر نے انتصاف میں یہ کہہ کر خوب نکتہ پیدا کیا ہے کہ حال سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ
ہے کہ وہ مخاطبوں کے ذہن میں یہ بات اتارنا چاہتا ہے کہ یہودی اب بھی حضور انور کے قتل کے
دبے ہوئے ہیں۔

اگرچہ عام شارحین قرآن نے کھل جادو رسول کدہ کے صلا کی صفت بتایا ہے لیکن زیادہ ذرا
اس میں ہے کہ اسے استیفاء بیانی قرار دیا جائے۔ گویا سننے والے کو جب یہ بات سنی کہ اس سلا
الیہ صلا، تو ذہن میں سوال پیدا ہو کر پھر یہودیوں کا ان کے ساتھ معاملہ کیا رہا۔ جواب
میں ارشاد ہوا کھل جادو صلا رسول ان کا معاملہ ان رسولوں میں سے ایک ایک رسول کے
ساتھ یہ رہا ہے کہ وہ ان کی تکذیب کرتے تھے اور قتل کرتے تھے یعنی قتل اور تکذیب یہاں متکرر رہا۔
اور یہ معاملہ ان کی تاریخ کا ایک واقعہ نہیں بلکہ اس قسم کے متعدد واقعات ہیں۔

گناہوں کے نتائج سے بے پروائی

۱۵۸۔ اور اپنے تئیں یہ سمجھ بیٹھے کہ کوئی آزمائش نہ ہوگی لہذا اندھے اور بہرے ہو گئے،
پھر اللہ نے ان سے درگزر فرمایا لیکن ان میں سے اکثر لوگ پھر اندھے بہرے ہو گئے، اور اب ان
کے کہ تو توں کو خوب دیکھ رہا ہے یعنی پیختہ عہد و پیمان باندھ کر خدا سے غداری کی، اس کے سفر
میں سے کسی کو جھٹلایا کسی کو قتل کیا۔ یہ تو ان کے ایمان باللہ اور عمل صالح کا حال تھا۔ ایمان بالوہم و الوہم
کا اعجاز اس سے کہ تو کہ اس قدر شدید مظالم اور باغیانہ جرائم کا ارتکاب کر کے بالکل بے فکر ہو بیٹھے
گویا ان حرکات کا کوئی فیاض نہ جھگڑتے نہیں پڑے گا اور ظلم و بغاوت کے نتائج کبھی سامنے نہ آئیں
گئے۔ یہ خیال کہ خدا کی نشانات اور خدائی کلام کی طرف سے بالکل اندھے اور بہرے ہو گئے اور

جو نافرمانی کا مرتکب تھے وہ کیسے جنتی کہ بعض انبیاء کو قتل کیا اور بعض کو قید کر دیا۔ آخر اللہ تعالیٰ نے ان پر بخت نصر کو مسلط کر دیا۔ پھر ایک مدت دراز کے بعد بعض ملک فارس نے بخت نصر کی قید و لذت سے چھڑ کر بابل سے بیت المقدس کو واپس کیا اس وقت ان لوگوں نے توبہ کی اور اصلاح حال کی طرف متوجہ ہوئے، خدا نے توبہ قبول کی لیکن کچھ زمانے کے بعد پھر وہی خیراتیں سو جلیں اور بالکل امداد پھرے ہو کر حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہما السلام کے قتل کی جرات کی اور حضرت عیسیٰ کے قتل پر آمادہ ہو گئے۔

یہاں ان کے ان جرائم کا ذکر کیا ہے جن کا ہوا دش میں بنی اسرائیل کو دو بربادیوں سے دو بار ہوا پڑا، جیسا کہ یسعیاہ اور خرقیل کی کتابوں میں دو بڑے فسادوں اور دو بڑی بربادیوں کا ذکر ہے اور قرآن میں بنی اسرائیل میں اس کو بیان کیا گیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ یہاں جرائم کے چہرے سے پردہ ہٹایا ہے اور وہاں ناسمجھ کو بے نقاب کیا ہے۔ پہلی بربادی بابل کے بادشاہ بخت نصر کے حملے سے ہوئی۔ اس حملے نے صرف یہود کی بربادیوں ہی کو پامال نہیں کیا تھا بلکہ بنی اسرائیل کی نسل و قومیت بھی ہلاک و منتشر ہو گئی تھی لیکن ایک صدی کے بعد گردش زمانے نے پھر پٹا کھلایا اور کار ساز قدرت نے وقت کی سب سے بڑی فاتح شہنشاہیت کو ان کی اعانت و دستگیری کے لیے کھڑا کر دیا یعنی شہنشاہ فارس کو اب یہود کی تمام اجڑی بستیاں پھر آباد ہو گئیں لیکن اس دوسری مہلت کی بھی انہوں نے قدر نہ کی اور اپنی توبہ و انابت کے وہ تمام عہد بھلائیے جو بابل کی اسیری کے زمانے میں کیے تھے تو پھر دوسری ہلاکت کا وقت نمودار ہو گیا۔ یعنی رومی حملہ کا یہ بنی اسرائیل کی آخری ہلاکت تھی۔ اس کے بعد تاریخ گواہ ہے کہ بنی اسرائیل مہلج نہ رہے۔

آیت میں جرائم کو محروم سے تعبیر کیا ہے یعنی اندھے ہوئے اور بہرے ہوئے سے، اندھے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ نبوت کے لاتے ہوئے علم و عمل سے اندھے ہو چکے تھے۔ آنکھیں ہونے کے باوجود نبوت کے معالم اور مناجیح کو نہ دیکھتے، اور یہ دونوں چیزیں ان کے لکھ و مطالعہ اور علم و فہم کا مرکز و محقق بلکہ اپنی اود پرستی میں ان کو اس قدر استغراق ہو چکا تھا کہ نبوت سے ان کا علمی و فہمی منقطع ہو چکا تھا اور بہرے ہوئے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی مہال میں اپنے اجتماعات میں نبوت کی بات سننے کو بھی تیار نہ تھے۔ گویا یہ یہود کے خواص اور عوام کی حالت بیان ہوئی ہے کہ

ہر حال میں جتنے نبوت کے علم سے پہلے تھا اور ان پندرہ طبقہ جن کا اواز نہ سننا بھی گوارا کرتا تھا اور نبوت کے علم و عمل سے اس بیگانگی کا نتیجہ تھا کہ ان کی زندگی کا ہر شعبہ نبوت سے منقطع تھا۔
 انہیں کثیر نہیں کہ اس حق سے اشارہ کر دیا کہ سب ایسے نہ تھے بلکہ کچھ اپنے احوال کا رابطہ نبوت کے علم و عمل سے وابستہ کیے ہوئے تھے لیکن اکثریت کا حال وہ کچھ تھا جو بیان ہوا ہے اسی لیے کثیر یہاں بطور بدل آیا ہے یعنی یہ حال سب کا نہیں بلکہ اکثر کا تھا اور ہزار ہزار میں اکثر ہی کا اعتبار ہوتا ہے۔ انہیں فرمایا اللہ بعینہما یعلمون یعنی وہ اگرچہ خود کے غضب و قہر کی طرف سے اذیت ہو گئے ہیں لیکن خدا ان کی تمام حرکات کو برابر دیکھتا رہا ہے نہایت ان حرکات کی نرا اب امت محمدیہ کے ہاتھوں دلوں پہلے ہے۔

شارحین قرآن نے یہاں بلا وجہ یعلون مضارع کو ماضی کے معنی میں لے کر نکتہ آفرینی کے لیے طبع آزمائی فرمائی ہے لیکن اگر یعلون اپنے ہی معنی میں ہوا اور مطلب یہ ہو کہ اب یہودیوں نے خاتم الانبیاء کے ساتھ جو طرز عمل اختیار کیا ہوا ہے وہ اللہ کی نگاہ میں ہے وہ دیکھ رہا ہے کہ ان کو اتباع ہوئی یعنی جہاد و منصب کی چاہت نے کیسا اندھا اور بہرا بنا رکھا ہے۔ اور خواہشوں کے جہوم میں دن دہائے آفتاب نبوت نظر نہیں آتا ہے، انبیاء کی ساری بشارتوں اور اوصاف سے بے خبر ہو کر وہ اندھے بنے ہوئے ہیں نہ تفاوت آیات سنتے ہیں اور نہ نبوت کے موضوع پر کوئی حجت و برہان پر کان دھرتے ہیں اس کے نتیجے میں وہ وقت قریب ہے جبکہ خدا کا قانون پچھلے کی طرح پھر حرکت میں آئے گا۔

عقیدہ الوہیت مسیح کی تردید

۱۵۹۔ یسینا کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ مسیح ابن مریم ہی ہے حالانکہ مسیح نے کہا تھا کہ میں بنی اسرائیل اللہ کی عبادت کرو جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ جس نے بھی اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کیا اس پر اللہ نے جنت حرام عطا فرمادی ہے اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہے۔ یہاں سے نصاریٰ کے ایمان باللہ کی کیفیت دکھائی گئی ہے کہ وہ کہاں تک عقائدت کے اس معیار پر پورے اترے۔ ان کے ایمان باللہ کا حال یہ ہے کہ حمل کے خلاف ،

فطرتِ سلیمہ کے خلاف اور خود حضرت مسیح کی تصریحات کے خلاف مسیح ابن مریم کو خدا بنا دیا۔ ایک تین اور تین ایک کی بھول بھلیاں تو محض برتے نام ہے۔ حقیقت سارا زور و قوت صرف حضرت مسیح کی الٰہیت ثابت کرنے پر صرف کیا جاتا ہے حالانکہ خود حضرت مسیح خدا کے رب ہونے اور دوسرے آدمیوں کی طرح اپنے مرہوب ہونے کا علانیہ اعتراف فرما چکے ہیں اور جس شرک میں ان کی اُمت مبتلا ہونے والی تھی اس کی برائی کہیں زور و شور سے بیان کر رہے ہیں پھر بھی ان انصاف کو عبرت نہ ہوئی۔

قاضی عبدالجبار ہمدانی نے اپنی شہرہ آفاق کتاب تنبیہ الدلائل الغریبہ میں الٰہیتِ مسیح کے عقیدے کے بارے میں کھول کر بتایا ہے کہ یہ عیسائیوں میں ملکیہ، یعقوبیہ اور نسطوریہ تینوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت مسیح عبد صالح اور رسول منہیں ہیں بلکہ فی الواقع الٰہ اور حقیقت میں الٰہ ہیں۔ وہی آسمانی وزمین کے خالق ہیں، ملائکہ اور انبیاء کے پیدا کنندہ انبیاء کو روانہ کرنے والے اور ان کے لیے سبقتی قوت عطا کرتے ہیں۔

تسبیحۃ الایمان

عیسائیوں نے ۳۲۵ء میں بمقامِ نضا ایک مجلس منعقد کی۔ اس میں ۳۱۸ پادری شریک ہوئے مجلس کے انعقاد کا اہتمام نطنطاس ابن فیلاطس بادشاہِ روم نے کیا۔ مصلحان سب نے مل کر عیسائیوں کے لیے جو تسبیحۃ الایمان تجویز کی جس کے بغیر کوئی عیسائی ایمان کی دولت سے مالا مال نہیں ہو سکتا ہے۔

ہم اللہ بیکانہ باپ پر ایمان رکھتے ہیں جو دیکھی اوسان دیکھی مخلوق کا خالق ہے اور ہم بیکانہ یسوع مسیح پر ایمان رکھتے ہیں جو اپنے باپ کا اکلوتا اور چھوٹا فرزند ہے وہ بنایا نہیں گیا بلکہ واقعی اللہ سے الٰہ ہے اور اپنے باپ کے اس جوہر سے ہے جس سے سارے عالم میں حسن و جمال اور ہر چیز کی تخلیق ہوئی ہے جو ہم انسانوں کی خاطر اور ہماری نجات کی خاطر آسمان سے نازل ہوا روح القدس اور مریم البتول سے جسمانی لبادہ لیا مریم اس سے حاملہ ہوئی اور مریم کے پیدا ہوا، اگر فاجر، سوا، منحہ، وار پر چڑھا اور فیلاطس وہی جسے سامنے قتل کیا گیا، مرگیا و دفن ہو گیا اور نہرے روز اٹھا، اور آسمان پر چڑھ گیا۔ اور اپنے باپ کی دائیں جانب بیٹھ گیا، اور وہ مردوں اور زندوں

کے درمیان فیصلہ کرنے کی خاطر آنے کو تیار ہوتا ہے۔

اس مسئلے میں دائرۃ المعارف بریطانیا کے ایک دوسرے مضمون تاریخ کلیسا کی یہ عہدیت بھی علامہ عبد الجبار ہمدانی کے بیان کی صرف تصدیق نہیں کرتی ہے بلکہ اس کی پوری مدد بھی کرتی ہے۔
 تیسری صدی عیسوی کے خاتمہ سے پچھلے عیسوعی کو عام طور پر دلاکلام، الکاجسدی
 ظہور مان لیا گیا تھا تاہم بکثرت عیسائی ایسے تھے جو عیسوعی کی الوہیت کے قائل نہ تھے۔
 چوتھی صدی میں اس مسئلے پر کافی بحثیں چھڑی ہوئی تھیں۔ آخر کار ۳۲۵ء میں
 نینا کی کونسل نے الوہیت عیسوعی کو باضابطہ طور پر اصل عیسوعی عقیدہ قرار دیا اور مخصوص
 الفاظ میں اسے مرتب کر دیا۔

اس انکشاف کے بعد قرآن نے دادِ عالیہ کے ذریعے یہ بھی بتایا ہے کہ حاکمِ عیسوعی نے یہ بات
 نہیں فرمائی ہے کہ وہ اللہ ہے بلکہ اس نے یہ ضرور بتایا ہے کہ اللہ وہی اور ہم اللہ میرا رب بھی ہے
 اور تمہارا رب بھی، اس لیے تمہارے عبادانہ تعلقات اللہ سے ہر نے چاہیے۔ میں رب نہیں بلکہ اہل
 کا بندہ اور رسول ہوں۔ یہاں بھی صاحبِ نبوتیت دلائلِ النبوت لے انجیل پر حنا کے اقتباسات
 لے کر بتایا ہے کہ اس محرف انجیل سے بھی قرآن کے بیان کی تائید ہوتی ہے اور مولانا دریا بادی نے پرجنا
 اور لوقا کے جواہر سے بھی اس کے قریب قریب تائیدی اقتباسات نقل کیے ہیں۔ یہ بھی نبوت
 کا اجماع ہے کہ باوجود اس کے کہ بعض افراد نے زائیکل پڑھی ہے اور زبان سے تاریخ میں حنا کے
 تعلقات منقول ہیں اس کے باوجود وہی کی دشمنائی میں آپ بتائے ہیں کہ یہ حضرت عیسوعی کی اصل تعلیم ہے
 اور یہ بار لوگوں کا اضافہ ہے۔

توحید کے ساتھ شرک کا ذکر

توحید خالص کی تعلیم کے بعد حضرت عیسوعی نے شرک پر وعید کا بھی ذکر فرمایا اور بتایا ہے کہ ہر قسم
 کا شرک خواہ ذاتی ہو یا صفاتی انسان کو سمجھاتے ہوئے کہہ دیتا ہے۔ توحید عبادت کے ساتھ شرک
 کا ذکر اس لیے فرمایا ہے کہ ذہنوں میں کوئی تصور واضح اسی وقت برپا ہوتا ہے جب اس کے مخالف
 کا تصور بھی ساتھ کے ساتھ بیان کر دیا جائے اس لیے اہم اصول و منطریات کی وضاحت کے
 وقت ضرورتاً اس بات کا اہتمام ضرور کیا جاتا ہے کہ ان کے مخالف اصولوں اور منظر لوں کو بھی
 بالمقابل رکھ دیا جائے۔ عقیدۂ توحید سے زیادہ اہمیت کس نظریے اور عقیدے کو حاصل ہو سکتی ہے

اس لیے ضروری ہے کہ اس کے مخالف منظریے یعنی شرک کو بھی بتا دیا جائے جیسا کہ یہاں مسیح علیہ السلام نے اپنے طرزِ عمل سے ہمیں ہدایت فرمائی ہے۔ چنانچہ آپ نے تو حید کی تعلیم دیتے ہوئے بات صرف اسی پر ختم نہیں فرمائی ہے کہ یگانہ اللہ سے عبادتِ تعلقات پیدا کرو بلکہ پورے فیصل کے ساتھ یہ بتانا بھی ضروری سمجھا ہے کہ جو شخص بھی شرک کرتا ہے اس پر نہ صرف یہ کہ جنت حرام ہے بلکہ اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔

شرک کے معنی سبھی پن کے ہیں اور بہت کی اصطلاح میں شرک نام ہے اس بات کا کہ اللہ کی ذات یا اس کی صفات میں یا ان صفات کے لازمی تعلقوں میں کسی کو اس کا سا بھی ٹھہرایا جائے شرک کی تین قسمیں ہیں۔

ایک شرک وہ جس کا تعلق اللہ کی ذات سے ہوتا ہے
دوسرا وہ شرک جس کا تعلق اللہ کی صفات سے ہوتا ہے
تیسرا وہ شرک جس کا تعلق اس کی صفات کے لوازم سے ہے

پہلے شرک کی عملی صورتیں یہ ہیں۔ ۱۔ کسی کو اللہ تعالیٰ کا ہم جنس قرار دیا جائے، ۲۔ اسے اس کا باپ یا اس کی اولاد سمجھ لیا جائے۔ ۳۔ یہ مان لیا جائے کہ وہ کسی اور ہستی سے مل کر ایک قالب ہو گیا۔ ۴۔ یہ تصور کر لیا جائے کہ وہ کسی مخلوق کی شکل اختیار کر کے نمودار ہوا کرتا ہے۔ یعنی کوئی مخلوق اس کا آثار ہو سکتی ہے مثلاً اہل عرب فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں اور جنوں کو اس کی ذات برادر ہی سمجھتے تھے۔ اسی طرح عیسائی حضرت مسیح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا اکلوتا بیٹا اور اس کا اوتار قرار دیتے تھے۔ دوسرے شرک کی عملی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جن صفات سے موصوف ہے۔ ان میں سے کسی صفت کو کسی اور کے اندر بھی موجود مان لیا جائے اور اسی معنی و مفہوم میں مان لیا جائے جس معنی و مفہوم میں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اندر پائی جاتی ہے۔ مثلاً علم اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کمالی اور چھپی ہر بات کو جانتا ہے۔ اس کے لیے غائب بھی حاضر ہے اور گزرا ہوا زمانہ بھی حال کا زمانہ ہے۔ اب اگر کوئی یہ سمجھ بیٹھے کہ حضرت عیسیٰ بھی اسی طرح ہر بات کو جانتے ہیں تو شرک فی الصفات ہو گا۔ اسی طرح لفع و نقصان پہنچانا اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جس کو چاہتا ہے سرت و راحت پہنچاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے عذاب کرتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ خیال کر بیٹھے کہ حضرت عیسیٰ بھی ہماری بگڑی بنا سکتے ہیں یا ہمیں تکلیف اور نقصان پہنچا سکتے ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت میں سے اسے سا بھی ٹھہرا رہا ہے۔

تیسری قسم کے شرک کی صورت یہ ہے کہ منات الہی کے جوازمی تقاضے ہیں انہیں اور ان سہاکو اللہ ہی کے لیے خاص نہ سمجھا جاتے بلکہ انہیں یا ان میں سے کسی کو بعض دوسری بیوقوفوں کے لیے بھی ثابت اور موجود مان لیا جاتے مثلاً منات الہی کا تقاضا یہ کہ عبادت صرف اللہ کا حق ہے۔ اب اگر کوئی شخص اور کو بھی اس کا سختی قرار دے تو یہ منات الہی کے تقاضوں میں غیر اللہ کو شریک بنانا ہر گز کسی طرح ان منات کا ایک لازمی تقاضا یہ بھی ہے کہ اقتدار اعلیٰ صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے اور حکم نیے اور قانون بنانے کا حق ہلکا اسی کا ہے۔ اس لیے اگر کسی اور کو بھی اللہ کے حکم کے بغیر یہ حیثیت دے دی جائے تو یہ شرک ہر گز۔ حضرت عیسیٰ نے من یشرک باللہ عام فقرہ بولا ہے اس لیے اس میں شرک کی ساری تمہیں داخل ہیں۔

عقیدہ تثلیث کا گروندا

۱۶۰۔ یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے حالانکہ ایک مہبود کے سوا کوئی نہیں ہے۔ اگر یہ لوگ اپنی باتوں سے باز نہ آتے تو ان میں سے جس جس نے کفر کیا ہے اس کو دردناک سزا دی جاتے گی، کیا پھر یہ اللہ کے حضور میں تو بزدل کریں گے اور اس سے صفائی نہ مانگیں گے اور اللہ بخشنے والا ہر مان ہے۔ یعنی حضرت عیسیٰ روح القدس اور اللہ یا عیسیٰ مریم اور اللہ تینوں خدا ہیں۔ العباد باللہ ان میں کا ایک حمد دار اللہ ہوا پھر وہ تینوں ایک اور ایک تین ہیں۔ عیسائیوں کا عام عقیدہ یہی ہے اور اس خلاف عقل و ہدایت عقیدہ کو عجیب گولی مولیٰ اور پیکار عبادتوں سے ادا کرتے ہیں اور جب کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تو اس کو ایک مادہ نقل حقیقت قرار دیتے ہیں

رحمہم اللہ العظیم ما افسد الدھر

العقائد الاغنیہ فی الدیانۃ النعوانیہ کے مصنف نے اس موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے مسیحیت میں تصور تثلیث دراصل بت پرست قوموں سے مانگا ہوا تصور ہے۔ وہ لوگ جو بت پرستی چھوڑ کر کسی ہر تے انہوں نے اپنے بت پرست تصورات کو مسیحیت میں مودیا، خود یورپ کے علمائے مسیحی بتایا ہے کہ یہ عقیدہ خالصتاً بت پرست دھرم ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ تثلیث کا تصور مسیح پہلے ہندوستان کے برہمنوں میں پایا جاتا ہے۔ ان کے یہاں لاہوتی عبادت ہی تثلیث ہے اور ان کے مذہبی زبان میں اس کا نام ”ترے مورتی“ ہے۔ ترے مورتی سے ان کی مراد برہما و خنود اور شیوجی ہیں اور یہ تینوں الٰہی کر ایک ہیں۔ اسی تثلیث کو وہ مختصر سے مختصر کر کے تین حروف یعنی ا۔ و۔ م سے تعبیر کرتے

میں۔ اسی طرح ہر مذہب والے بھی تاریخ میں اسی بیماری کے شکار ہیں۔ یونانی اور رومانی بھی اسی معضلہ کے حامل ہیں۔

تاریخی طور پر یہ سوال بلحاظ امتداد کا حل ہے کہ عیسائیوں میں یہ تصور کیسے آیا جبکہ حضرت مسیح خالص توحید کے پیروار تھے۔ اور ان کا پوتا نہیں مگر انسانی شکل پر پیدا کیے کے حوالہ سے مولانا مودودی نے لکھا ہے۔

باب بیٹا اور روح القدس کی اصطلاحیں یہودی ذرائع کی مبہم پہنچاتی ہوئی ہیں۔ ان کی اصطلاح آخر چرچ و مسیح نے شاذ و نادر ہی کبھی استعمال کی تھی اور پال نے بھی جو اس کو استعمال کیا اس کا مفہوم بالکل غیر واضح تھا۔ تاہم یہودی لٹریچر میں یہ لفظ شخصیت اختیار کر کے قریب پہنچ چکا تھا۔ ایسا ہی حنیہ کا نواسہ میدانی ہے۔ اصل سوال جس پر یہ عقیدہ بنا وہ نہ کوئی اخلاقی سوال تھا نہ مذہبی بلکہ وہ سراسر ایک فلسفیانہ سوال تھا۔ یعنی یہ کہ ان مینوں کا لیم باب بیٹا اور روح القدس کے درمیان تعلق کی حیثیت کیا ہے۔ لکھنا نے اس کا صحیح جواب دیا ہے وہ اس عقیدے میں درج ہے جو تفسیر کی کونسل میں مقرر کیا گیا تھا اور اسے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تمام خصوصیات میں بالکل یونانی فلسفہ کا نمونہ ہے۔

یہودیوں نے عیسائی مذہب کو جس صورت میں قبول لیا تھا اس کی تصویر ڈریپر کے الفاظ میں حسب ذیل ہے۔

دونوں عیسائیت اور بت پرستی باہمی آمیزش کا یہ نتیجہ ہوا کہ دونوں کے قول شری و شکوہ ہو گئے اور ایک نیا مذہب پیدا ہو گیا جس میں بت پرستی و عیسائیت دونوں کی شاخیں پہلو پہلو ابھار گئیں۔ جوں جوں زمانہ گزر رہا وہ مذہب بھی حقاہ جن کی تفصیل ترمکین نے بیان کی ہے متغیر ہو کر ایک عام پسند نگر پایہ اخلاق سے مگرے ہوئے مذہب کی شکل اختیار کرتے گئے۔ ان حقاہ میں قدیم یونانی اصنام پرستی کا عنصر غلط ہو گیا۔ عقیدہ تثلیث قدیم مصری روایات کے سانچے میں ڈھال لیا گیا۔

شاذ و نادر ہی یہاں پر غلط فہمی ہوئی کہ پہلے بتایا ہے کہ عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح ابن مریم ہی خدا ہے اور اب بتایا ہے کہ ان کا عقیدہ تثلیث ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں درست ہیں اور حاصل دونوں کا ایک ہے۔ عیسائی ملتے تو یہی ہیں کہ تین اقنوم ہیں۔ باب بیٹا اور روح القدس مگر عملی رنگ میں صرف مسیح ہی مسیح رہ جاتا ہے کہ نہ کہ نہایت دہشتہ دہی ہے اور سارا تعلق اسی سے ہے

اور سارا زہد اس کی خدائی ثابت کرنے پر صرف ہوتا ہے اور دنیا میں اسی کی خدائی کی اشاعت ہوتی ہے جس دونوں باتیں درست ہیں۔ ایک ان کا کتنا ہی عقیدہ ہے اور ایک عمل۔

آخر میں فرمایا ہے کہ اخلاقیات و یوں میں ان کو تو بہ کی تلقین کی ہے اور بتایا ہے کہ ان کے لیے کو بہ اصلاح کا دروازہ اب بھی کھلا ہوا ہے۔ اب بھی اگر وہ اپنی اس ہرزہ سرائی سے باز آجائیں اور قرآن کی دعوت قبول کر لیں تو اللہ غفور و رحیم ہے۔ لیکن اگر وہ اپنی یادہ گرتی سے باز نہ آئے اور صلہ و اتحاد اور ٹیکٹ ہی کے لہرے بند کرتے رہے تو لازماً ان کو اس کفر کی پاداش میں سزا بھگتنی پڑے گی۔ منہجہ لاکر بتایا کہ ان میں سے اللہ تعالیٰ کا کو بہ سزا ملے گی جو لوگ کو بہ کر جائیں گے وہ سب جائیں گے جو بات یہاں اہل کتاب سے کہی گئی ہے وہی دنیا کے سائے کافروں سے کہی گئی ہے

قل للذین کفروا ان یشکروا لیغفر لہم ما قد سلف
اہل کفر سے کہہ دیجئے کہ اگر وہ باز آجائیں تو جو پچھلے سائے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔

ظاہر ہے کہ جو دین تمام ادیان کو ایک دین اور ساری امتوں کو ایک ملت بنانے آیا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ سائے اہل عمل کی اس مشترک خواہش کو پورا کرنے کی ضمانت دے سب جانتے ہیں کہ یہ سب کی خواہش ہے کہ بندہ اپنے خالق کے قہر سے نہات حاصل کرے اور فطرۃ ربی ہر ایک کی خواہش برائی بھی چاہیے اس لیے قرآن اس کا اعلان کرتا ہے کہ ہر ملک و ملت ہر نسل و قوم کا جو گروہ گمراہ بھی اس کی انحراف میں آجائے گا وہ اس کے گناہوں کی مغفرت اور نہات ابدی کے لیے ضامن ہو گا۔

آیت میں گنہگار سے باز آنے پر عذاب کو اور تو بہ و استغفار پر مغفرت کو موقوف قرار دیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ گنہگار سے باز آنے سے کفر و شرک کی اصل تاریکی محو ہو جائے گی اب اس کے بعد اس کو ایسے اعمال کی بھی ضرورت ہے جو اس کی نئی زندگی کے لیے نشانی کا کام دیں۔ قرآن کی دونوں باتیں نے اس کے لیے یہاں دو عمل بتائے ہیں ایک انہما اور دوسرے تو بہ و استغفار یہ دونوں کام اگر ہر شخص شرائط کے ساتھ ادا کیے جائیں تو بقول شیخ الاسلام

یہ اس غفور و رحیم کی شان ہے کہ ایسے لیے باغی ادا گستاخ مجرم بھی جب توبہ کرے ہو کر اور اصلاح کا عزم کرے کہ حاضر ہوں تو ایک منٹ میں عمر بھر کے جرائم معاف کر دیتا ہے۔

اور ساری دنیا نے کفر کے مقابلے میں قرآن لے اور نبوت لے اہل کتاب کو یہ خاص رعایت بھی دی ہے کہ کئی جویاں لاتا ہے اسے وہ ہر اجر ملتا ہے۔

بر بعض کی فطرت ہے کہ اس کو اپنے دین سے ایک دالہ مذمت اور دوسرے دین سے وقاحت برتی ہے۔ دوسرا دین اختیار کرنا لغو شاق گزارتا ہے۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ اویان سادہ میں کوئی ثابت نہیں ہے یہ ایک ہی صداقت کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ایک دین کے مصداق کو دوسرے دین کی تصدیق لازم ہے، اس لیے اگر کوئی اہل کتاب اسلام قبول کرے تو اس کو دوسرا گزارنا چاہیے کہ اپنے نبی پر اس کا ایمان دینے کا چاہیے بلکہ اگر وہ حضور اللہ پر ایمان لائے گا تو وہ ہر کام مستحق ہو گا، امان یقینی ہے کہ اگر حضور اللہ پر ایمان نہ لایا تو پہلا ایمان بھی قابلِ اجر دے گا کیونکہ رسولوں کے درمیان ایمان کے موضوع پر تقسیم نہیں ہو سکتی جو ایک کا منکر ہے وہ سب ہی کا منکر شمار ہو گا۔ اس بشارت میں دراصل اہل کتاب کو یہ دعوت دی گئی ہے کہ اگر وہ اپنے ایمان کو قائم رکھنا چاہتے ہیں تو اس کی صورت یہی ہے کہ حضور اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئیں۔ آپ پر ایمان لانا سب پر ایمان ہے اور آپ کا انکار سب کا انکار ہے۔

مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ
الرُّسُلُ وَأُمُّهُ حَسَنَةُ كَانَتْ أَبَا كُلِّبٍ الطَّعَامَ أَنْظُرْ
كَيْفَ نَبِّئِينَ لَهُمُ الْآيَاتِ ثُمَّ أَنْظُرْ إِلَى يَوْمِ تَكُونُ ﴿١٥﴾ قُلْ
أَتَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا
وَاللَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿١٦﴾ قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي
دِينِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوا أَهْوَاءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوا مِنْ
قَبْلُ وَأَضَلُّوا كَثِيرًا وَضَلُّوا عَنْ سَوَاءِ السَّبِيلِ ﴿١٧﴾ لَعَنَ
الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ بَنِي إِسْرَءِيلَ عَلَى لِسَانِ دَاوُدَ وَعِيسَى
ابْنِ مَرْيَمَ ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ ﴿١٨﴾ كَانُوا
لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُنْكَرٍ فَعَلُوهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴿١٩﴾
رَأَى كَثِيرٌ مِنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ
لَهُمْ أَنْفُسُهُمْ أَنْ يَخِطَّ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ لَهُمْ خُلْدٌ وَنَ ﴿٢٠﴾



وَلَوْ كَانُوا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمُ مَا اتَّخَذُوا مِنْهُمْ

أَوْلِيَاءَ وَلَكِنْ كَثُرُوا قُلُوبُهُمْ فَبُذِلُوا ﴿٥٥﴾

مریم کا بیٹا مسیح اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ کا ایک رسول ہے اس سے پہلے بھی کتنے رسول ہو چکے، اور ان کی والدہ صدیقہ تھیں، یہ دونوں کھانا کھاتے تھے دیکھو ہم کس طرح ان لوگوں کے لیے دلائل بیان کر رہے ہیں پھر دیکھو کہ یہ لوگ کس طرف پھرے جا رہے ہیں۔^{۱۶} اے پیغمبر ان سے کہو کیا تم اللہ کو چھوڑ کر اس کی پرستش کرتے ہو جس کے اختیار میں نہ تمہارا نقصان ہے نہ نفع اور اللہ ہی سننے والا علم رکھنے والا ہے کہہ دو کہ اے اہل کتاب اپنے دین میں حقیقت کے خلاف حد سے نہ بڑھو اور اس گمراہ کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو جو تم سے پہلے ہی خود گم گمراہ رہ چکے ہیں اور بہتوں کو گمراہ کر چکے ہیں اور وہ حق کی سیدھی

۱۶۲
 راہ کھو بیٹھے۔ بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار
 کی ان پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبانی لعنت ہو چکی ہے، اور
 یہ اس لیے ہوا کہ نافرمانی کرتے تھے اور وہ حد سے تجاوز کرتے
 تھے۔ ۱۶۰ وہ بُرائی سے ارتکاب کے بعد باز نہ آتے تھے، کیسا
 بُرا کام ہے جو وہ کرتے تھے۔ ۱۶۱ اے پیغمبر تم دیکھو گے کہ
 ان میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو کفر کرنے والوں سے
 مدد و رفاقت کا رشتہ رکھتے ہیں کیا ہی بُرا سامان ہے جو انہوں نے
 اپنے لیے آگے روانہ کیا ہے، ان کے خلاف اللہ کی ناراضگی
 ہوئی اور وہ ہمیشہ عذاب میں رہنے والے ہیں۔ ۱۶۲ اگر
 فی الواقع یہ لوگ اللہ کو، اللہ کے رسول کو، رسول پر نازل شدہ
 کتاب کو ماننے والے ہوتے تو مشرکین کو مددگار اور دوست
 نہ بناتے لیکن ان میں اکثریت ایسی ہے جو جادہ سحر پر ہی ہوتی ہے۔

حضرت مسیح کا واقعی چہرہ

ان آیات میں قرآن نے حضرت مسیح کا واقعی چہرہ پیش فرمایا ہے لیکن حق کی حمایت میں وقت تک بھوک میں نہیں سکتی جب تک ہلال کاہل آئیں وہیں میں مومنانہ ہو، تاہم ہر کمال ہو کہ ہے وہ قرآن سے ابر ہے اس لیے واقعی اور چہرہ جو قرآن نے میں پیش کیا ہے، اسے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ حضرت مسیح کا وہ بنا دلی ہو آپ کو معلوم ہو جو عیسائی چاہتے ہیں، کچھ اشارات اس مسئلے میں پہلے ہر چکے ہیں۔ آئیے کچھ اعلان کی بنیادی سن لیتے۔ عیسائیوں کی عقیدہ کتاب "دعائے عظیم" میں مسیح عقیدہ مقدس تھا، عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے۔ جو کوئی نہایت چاہتا ہے اس کو سببا کر کے پہلے ضروری ہے کہ عقیدہ جاسوس کے اس عقیدہ کو برکاتی کمال اور بے دریغ نکال دینے کے لیے شک خطاب میں ہر شے صفا۔

عقیدہ جاسوس ہے۔

ہم ٹیلیٹ میں واحد خدا کی اور توحید میں خلیفہ کی پرستش کریں نہ اقامت کو ہمیں نہ اہمیت کو تقسیم کریں کیونکہ آپ ایک اقوام میں ایک اقوام اور روح القدس ایک اقوام ہے مگر آپ بیٹے اور روح القدس ایک اقوام ہے مگر آپ بیٹے اور روح القدس ایک ہی ہے، جلال برابر عظمت ان کی یکساں، عیسایہ ہے وہ دنیا اور دیا ہی روح القدس ہے۔ آپ غیر مخلوق بیٹا غیر مخلوق اور روح القدس غیر مخلوق آپ غیر محدود بیٹا غیر محدود اور روح القدس غیر محدود ہے۔ آپ ان کی بیٹا ان کی اور روح القدس ان کی۔ ہم تین ان کی نہیں ایک ان کی اسی طرح تین غیر محدود اور تین غیر مخلوق بلکہ ایک غیر محدود ایک غیر مخلوق اور ان کی ہی آپ قادر مطلق، بیٹا قادر مطلق اور روح القدس قادر مطلق، تو یہی تین قادر مطلق نہیں بلکہ ایک قادر مطلق ہے۔ دیا ہی آپ خدا بیٹا خدا اور روح القدس آپ بھی تین خدا نہیں بلکہ ایک خدا، اسی طرح آپ خداوند بیٹا خداوند اور روح القدس خداوند تو یہی تین خداوند نہیں بلکہ ایک خداوند۔

دعائے عظیم مسیح اور افتخار دہلی ۱۹۴۷ء

پادری فلڈ صاحب جو عیسائیوں میں پادری ہونے کی حیثیت میں ادنیٰ مقام رکھتے ہیں بڑی فراخ دل سے لوگوں کو بتاتے ہیں۔

ایمانداروں پر لازم اور واجب ہے کہ جیسا باپ بیٹے پر ویسا ہی روح القدس پر ایمان لاکر اس کی عبادت اور بندگی کریں اور عنایت اور نعمت کی اس سے امید باوجود ہیں۔

(مفتاح الاسرار طبع پنجم)

یہ عنایات بتلہی ہیں کہ ہر ایک ان تینوں میں سے مستقل خدا اور مجبور کہے، یہ ہے یسائیوں کا دعویٰ، اسی مفتاح الاسرار میں یہ بھی صاف صاف لکھا ہے کہ

مسیح نے خدا کی ذات و صفات اور لفظ خدا کو بھی اپنے ساتھ نسبت دیا ہے چنانچہ آئندہ آیتوں سے معلوم ہوتا ہے اور اس بات سے صاف ظاہر ہے کہ وہ ایسے معنی سے خدا کا بیٹا نہیں ہے جن معنی میں متقی پرہیزگار ایماندار لوگ خدا کے فرزند کہلاتے ہیں بلکہ اس معنی سے خدا کا بیٹا ہے کہ صفات اور ذات میں خدا کے برابر ہے۔ پرہیزگار اور ایماندار لوگ تو اپنے ایمان کی جہت سے خدا کے بیٹے ہیں لیکن مسیح وحدت ذات کی نسبت خدا کا بیٹا ہے۔ (مفتاح الاسرار ص ۱۴)

آئیے اب اس کے ابطال میں قرآن کے دلائل دیکھیں:

۱۶۱۔ مریم کا بیٹا مسیح اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ کا ایک رسول ہے اس سے پہلے بھی کتنے رسول ہو چکے ہیں۔ یعنی اسی مقدس جماعت کے حضرت مسیح بھی ایک فرد ہیں انہیں خدا بنالین۔ خدا کا بیٹا کہنا یا تین میں سے ایک کہنا تمہاری سناہمت ہے بلکہ قرآن کی یہ آیت ایک دعویٰ اور دلائل پر مشتمل ہے۔ دلائل اگر حکیمانہ ہوں تو تین قسم کے ہوتے ہیں ایک کو دلیل خلف دوسرے کو استقراء تیسرے کو تفہیل کہتے ہیں۔

خلف یہ ہے کہ جب دو تفسیروں میں سے ایک کو باطل کر دیا جائے تو دوسری کا وجود ضروری ہو یا ایک کا وجود ثابت ہو تو دوسرے کا عدم ہو مثلاً ثابت کیا جائے کہ کسی خاص وقت میں رات نہیں تو دن ضرور ہو گا اور اگر ثابت کیا جائے کہ کسی خاص وقت میں دن ہے تو رات نہ ہو گی۔ استقراء وہ دلیل ہے جس میں حکم بہت سی جزئیات اور نظائر کو تلاش کے بعد لگایا جائے مثلاً بہت آدمیوں کو دو پاؤں والا دیکھ کر یہ حکم لگادیا کہ انسان دو پاؤں پر ہوتا ہے۔

تفہیل وہ دلیل ہے جس میں حکم کی بنیاد مشابہت جو جیسے مشابہ کے نشہ پر دوسری نشہ اور

بہر زور کیا قیاس

قرآن کی اس آیت میں ان تینوں دلائل کی طرف اشارہ ہے دعویٰ یہ ہے کہ مسیح اللہ کے رسول ہیں۔ اصل ارشاد مالمسیح بن مریم اللہ صلی علیہ وسلم آیا ہے۔ یہاں یہ فقرہ بطور اثیناف لایا گیا ہے گویا سننے والے جب پہلی آیات سنی ہیں کہ تثلیث غلط ہے، اللہ کی ذات واحد ہے نہ اس میں اصول کی ترکیب ہے اور نہ اقامت کہ کو معاذ بن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر صورت حال یہی ہے تو پھر حضرت مسیح فی الواقع کیا ہے۔ اسی کا جواب ہے مالمسیح بن مریم اللہ صلی علیہ وسلم مسیح بن مریم صرف اللہ کے رسول ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ رسول ہونے کی وجہ سے وہ ایک انسان ہیں، نہ وہ خدا ہیں اور نہ خدائی میں ان کا کوئی حصہ ہے۔ یہ دعویٰ مخاطبوں کے ذہنوں میں واضح طور پر پیش کرنے کے بعد اس کے دلائل پیش کیے۔ اس لفظ میں مسیح اللہ کے رسول میں تثلیث کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی جیسے رسول ہونے کی حیثیت میں اس دنیا میں اللہ کے دوسرے رسول کا مقام ہے وہی مسیح کا مقام ہے۔ انسانیت رسول کا ایک کمال ہے۔ کیونکہ اصلاح کے لیے صرف علم کافی نہیں احساس کی بھی ضرورت ہے جو علم نہیں کہتا وہ ایک غمزدہ کی پمدی قسلی بھی نہیں کر سکتا اور جو فطرت انسانی کی گزیر سے واقع نہیں وہ کمزوریوں پر اغماض بھی نہیں کر سکتا۔ اسی لیے قرآن عزیز نے ہابہا رسولوں کا ان ہا ایک مستقل انعام قرار دیا ہے۔ لفظ رسول ایسا پر عظمت کلمہ ہے کہ حضرت مسیح کے واقعی تعارف کے لیے اس سے زیادہ موزوں اور کوئی کلمہ نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول کا لفظ ہر دور میں مشہور و معروف رہا ہے، اس کے لازم سب کے ذہن نشین ہیں اس کے خلائق سب کو معلوم ہیں۔ اس کی شخصیت و احترام سے سب آشنا ہیں اور یہ تو کسی نا سمجھ انسان پر بھی پوشیدہ نہیں ہے کہ بادشاہ اور اس کے رسول کے درمیان نوازش و کرم کے سوا برابر بنی اور مسامحت کا کوئی شاہرہ تک نہیں ہوتا۔ ایک لفظ رسول سے سننے والوں کے دلوں میں وہ ساری عظمتیں دوڑنے لگتی ہیں۔ محبت و توقیر، اطاعت و فرمانبرداری کے وہ تمام جذبات اٹھنے لگتے ہیں جو رسول کے لیے امت نہا نچا ہتیں اور ایک وقت وہ تمام حدود بھی غمزدگی کے سامنے آجاتی ہیں جو ایک بادشاہ اور اس کے پہلی درمیان فاصلہ رہتی چاہتیں، اس لیے محبت و اطاعت کے جذبات کے ساتھ ان کا جوہر توجید شرک کے گرد سے کبھی بے آب نہیں ہوتا۔

اور ساتھ ہی یہ فرما کر قد خلت من قبلہ السائل کہ حضرت مسیح سے پہلے اور رسول گزر چکے ہیں۔ استقرار کی طرف اشارہ کر دیا ہے یعنی سائے منبر جو خدا کی طرف سے آئے ہیں وہ نہ خدشتے

اِس کا اقرار و برود ہے اور اِس کے بیٹے اور اقوام ہے تو پھر حضرت مسیح رسولِ بر خدا، خدا کے بیٹے اور اقوام کیوں کر ہو سکتے ہیں۔ عربی میں دوسرے کی خدمت انہماک لینے کے لیے دو ہی لفظ ہیں ایک رسول دوسرے وکیل۔ ان دونوں کا تصرف دراصل دوسرے کے لیے ہوتا ہے اپنے لیے نہیں ہوتا مگر ان دونوں میں جو ہر ہی فرق ہے۔ وکیل کا تصرف بہ نسبت رسول کے زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ وکیل اپنے عمل کی جانب سے مختار ہوتا ہے جو چاہے بطور خود ہی کر سکتا ہے۔ رسول صرف اس امانت کے پہنچانے کا ذمہ دار ہوتا ہے جو اسے پروردگار کی گئی ہے۔ اسی لیے پہلے کو حکم ہوتا ہے کہ اعلان کرو قتل است علیکم بیکل میں وکیل نہیں ہوں۔

مسیح کے معبود نہ ہونے کی واضح ترین دلیل

۱۶۲ - اور ان کی والدہ صلیقہ تھیں وہ دونوں کانا کاتے تھے۔ دیکھو ہم ان لوگوں کے لیے کس طرح دلائل بیان کر رہے ہیں، پھر دیکھو کہ یہ لوگ کدھر پھیرے جاتے ہیں۔ جمہور امت کی تحقیق یہی ہے کہ خواتین میں نبوت نہیں آتی یہ مردوں ہی کے لیے مخصوص رہا ہے۔ حضرت مریم بتول بھی ایک خدا رسیدہ لڑکی تھیں، نبی نہیں۔ اس آیت پر غور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ جو شخص کانا کھینے کا محتاج ہو وہ تقریباً دنیا کی ہر چیز کا محتاج ہے۔ زمین، ہوا، آگ، پانی، سورج، حیوانات حتیٰ کہ پھلے اور کھانے جیسا کہ اسے اشتغاف نہیں ہو سکتا۔ غذا کے پریش میں پہنچے اور ہضم ہونے تک خیال کرو۔ بالواسطہ اور بلاواسطہ کتنی چیزوں کی ضرورت ہے۔ پھر کھانے سے جو اخراجات اور ناساتج پیدا ہوں گے ان کا سلسلہ کہاں تک جاتا ہے۔ احتیاج و افتقار کے اس طویل الذیل سلسلہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے، ہم الہیتِ مسیح و مریم کے ابطال کو بشکل استدلال یوں بیان کر سکتے ہیں کہ مسیح کانا کھینے کی ضرورت سے مستغنی نہ تھے جو مشاہدہ اور قوت سے ثابت ہے اور جو کھانے پینے سے مستغنی نہ ہو وہ دنیا کی کسی چیز سے بھی مستغنی نہیں ہو سکتا۔ پھر تم ہی کہو کہ جو ذات تمام انسانوں کی طرح اپنے بقا میں عالم اسباب سے مستغنی نہ ہو وہ کیوں کر خدا بن سکتی ہے۔ یہ ایسی قوی اور واضح دلیل ہے جسے عالم و جاہل یکساں طور پر سمجھ سکتے ہیں یعنی کانا کھینا الہیت کے منافی ہے۔ اگرچہ دکانا الہیت کی دلیل نہیں ہے ورنہ معاذ اللہ کھانے پینے سے مستغنی خدا بن جائیں۔

ان چند نظموں میں عیسائیوں کے عقیدہ الوہیت مسیح کی ایسی صاف تردید کی گئی ہے کہ اس سے زبردہ منافی کے ساتھ ممکن نہیں ہے۔ مسیح کے بارے میں اگر کوئی یہ معلوم کرنا چاہے کہ فی الواقع وہ کیا تھے؟ قرآنِ معلّات سے بالکل غیر مشتبہ طور پر معلوم کر سکتا ہے کہ وہ محض ایک انسان تھے۔ ظاہر ہے کہ جو ایک وحدت کعبہ بیٹ سے پیدا ہوا، جو انسانی جسم رکھتا تھا، جو ان تمام حدود و قیود سے مقید اور ان تمام صفات سے متصف تھا جو انسان کے لیے مخصوص ہیں، جو سوتا تھا کھاتا تھا، اگر مری اور مری مسموم کرتا تھا اس کے متعلق کون متعلق انسان یہ تصور کر سکتا ہے کہ وہ خود خدا ہی یا خدا میں خدا کا شریک ہے لیکن یہ انسانی ذہن کی ضلالت پذیری کا ایک عجیب کرشمہ ہے کہ عیسائی خدا اپنی مذہبی کتابوں میں مسیح کی زندگی کو مریخا ایک انسانی زندگی پاتے ہیں اور پھر بھی اسے خدائی سے متصف قرار دیتے۔ پھر امراد یکے چلے جائے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اس تاریخی مسیح کے قائل ہی نہیں ہیں جو عالم واقعہ میں ظاہر ہوا تھا بلکہ انہوں نے خود اپنے وہم و گمان سے ایک خیالی مسیح تصنیف کر کے اسے خدا بنالیا ہے۔

انسان پر کتبِ بڑا تصدق ہے کہ ایک طرف حضرت مسیح اپنے سامنے کلماتِ بشری کے باوجود خود کو انسانی بشری سے منزہ نہ سمجھے اور ماں بیٹا دونوں قرآنے بشری سے مرکب تھے اور کھانے پینے اور ساری انسانی ضرورتوں کے محتاج اور دوسری طرف یہ لوگ اس طرح کے خرافات میں کھوئے گئے ہیں کہ باپ بیٹا اور روح القدس میں ہوا جدا اور مستقل اقنوم ہیں۔ عالمِ لاہوت میں تینوں کی وحدت ایک خدا ہے۔ تین خدا نہیں، بیٹا ازل ہی میں خدا سے پیدا ہوا۔ اور روح القدس کا صدور بھی ازل ہی میں خدا سے ہوا ہے۔ روح القدس کا صدور اکیلے باپ سے نہیں بلکہ بیٹے سے بھی ہوا۔ خدا ہونے میں تینوں اقنوم برابر کے شریک ہیں۔ ایک ایک پر اور باقی دونوں اپنی اپنی جگہ جزوی حصہ ہیں۔ یہاں ترکیب سے وحدت پیدا ہوتی ہے اور وحدت کا نام ہی نام ترکیب ہے۔ یا اور اس قسم کی دوسری خرافات جو مفتاحِ الاسرار کے مصنف پادری فنڈر نے اور رسالہ مسیح ابن اللہ کے مصنف نے قدم قدم پر درج کی ہیں۔ ان کو دیکھو اور پھر قرآن کے صاف سادہ اور ہر شخص کے سمجھ میں آنے والے مسیح کے تعارف کو دیکھو اور پھر خود ہی انصاف سے بتاؤ کہ حقیقت وہ کون ہے کہ وحدہ ہے جو کسی دیا بتا رہا ہے یا وہ ہے جو قرآن پیش کر رہا ہے۔ امامِ داری نے اسی

پریشان ہو کر پہچان نہ کر سکا ہے۔ سورہ ناک کی تفسیر میں فرماتے ہیں:
بلانشہد اس موضوع پر تصدیق کا مذہب بالکل مہمل ہے۔

اور پھر فرماتے ہیں

خلاصہ یہ ہے کہ جیسا اس مسئلے میں جیسائی مذہب بڑا ہی رکیک اور عقل سے

بعید ہے۔ ایسا دنیا میں کوئی مذہب رکیک اور بعید از عقل نہیں ہے۔

اور پھر اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

دنیا میں کوئی متاثر جیسائیوں کے متاثر سے زیادہ فاسد اور باطل نہیں ہے۔

اس موضوع پر حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب احسن الاحوال فی ابطال التعلیث بڑے معرکہ کی کتاب ہے۔

عبادت صرف اللہ کا حق ہے

۱۶۳۔ اے پیغمبران سے کوئی تم اللہ کو چھوڑ کر اس کی پرستش کرتے ہو جس کے اختیار میں

ذاتہما نقصان ہے اور نہ نفع اور نہ ہر شے سننے والا اور علم رکھنے والا ہے۔ یعنی معبود بننا صرف

اس ذات کے ساتھ خاص ہے جو ہر قسم کے نفع و ضرر کا مالک ہو اور پورا با اختیار ہو، کیونکہ

عبادت انتہائی مذلل کا نام ہے اور انتہائی مذلل صرف اسی کے سامنے اختیار کر سکتے ہیں جو انتہائی

عزت، غلبہ رکھنے والا، ہر آن سب کی سننے والا اور سب کے احوال کا پوری طرح جاننے والا ہو

اس میں تعلیث کے عقیدہ شرکیہ کے ساتھ تمام مشرکین کا رو ہو گیا ہے

مطلب یہ ہے کہ جب یہ حقیقت ہے کہ اللہ ہی ہے جو سب کے سامنے اچھا ہے کہ حضرت محمد

اور ان کی والدہ اپنے تمام اہل گائے کی محتاج ہیں تو پھر تمہیں خود سرچ لینا چاہیے کہ بھلا اپنی ذات تک

احتیاجات رکھتا ہے وہ دوسروں کے لیے حاجت روا کیوں کر ہو سکتا ہے۔ ایک ذات محتاج

بھی ہو اور معبود بھی ہو یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ خدا ہی کی شان ہے کہ وہ کسی کا محتاج نہیں ہے اور سب

اس کے محتاج ہیں، وہ کسی کا محکوم نہیں سب اس کے محکوم ہیں اور جن کا حال یہ ہو کہ کھانا

پینا سونا اور جاننا، بھڑکنا اور پیاس، صحت اور بیماری، موت اور زندگی، عمری اور سہری سب

اس پر حکمران ہوں اور ان تمام حکمرانوں کا اس پر دباؤ ہو اور وہ ان سب کے ناز اور دہلے کو بہتا ہو اور جو دوسروں کو توڑ کر اپنے کو بھی نفع نہ پہنچا سکتا ہو کیا وہ اس لائق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے اور اس ذات گرامی کی عبادت چھوڑ کر کی جائے جو ہر قسم کے نفع و نقصان کا مالک ہے۔

اور اصل یہ بھی مسیحوں کی غلط فہم کی دوسرے انداز سے تردید ہے اور ماتعبدون سے مراد حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتے جیسے اللہ کی ذات تمہاری جانوں اور مالوں، بلائیں اور مصائب کے ذریعے تمہیں نقصان پہنچا سکتی ہے اور ایسے ہی یہ دونوں تمہیں ویسا نفع نہیں پہنچا سکتے جیسے اللہ کی ذات تمہیں تندرستی کی نعمت، اموال میں فراوانی اور زندگی میں خوشحالی دے کر نفع پہنچا سکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دونوں قطعاً تمہارے نفع و نقصان کے مالک نہیں اس لیے اللہ کی عبادت چھوڑ کر جس قبضہ و قدرت میں تمہارا ہر قسم کا نفع و نقصان ہے۔ ان کی عبادت کرنا جو کبھی نفع و نقصان کے مالک نہیں ہیں کس قدر عقل کی محرومی اور دانش کی قیسی ہے۔

فتح البیان میں نواب صدیق حسن خاں کا یہ استنباط لطیف اور بالکل بر محل ہے۔

جب اللہ کا فیصلہ حضرت عیسیٰ کے حق میں نبی ہونے کے باوجود یہ ہے تو اویلا کسے بامس خدا کا فیصلہ کیا ہو گا؟ اس کا اندازہ کرنے کے لیے کسی مراحت کی ضرورت نہیں ہے۔

عیسائیوں کی دو گراہیاں

۱۶۴۔ کہہ دو کہ اے اہل کتاب اپنے دین میں حقیقت کے خلاف حد سے زبردستی اور اس گروہ کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو جو تم سے پہلے خود ہی گم کردہ راہ ہیں اور بہتوں کو گمراہ کر چکے ہیں اور وہ حق کی سیدھی راہ کھو بیٹھے۔ عقیدہ کا غلو یہ ہے کہ ایک مولود بشری کو خدا بنا دیا۔ اور عمل میں غلو وہ ہے جسے رہبانیت کہتے ہیں۔ یہودی کی جو قباحت بیان ہو چکی ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا پرستی میں غرق ہونے کی وجہ سے دین اور دینداروں کی یہاں کوئی عظمت و وقعت نہیں رہتی۔ حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام کی توہین و قتل و غیرہ ان کا خاص شعار تھا برخلاف اس کے کہ نصاریٰ نے تعظیم انبیاء میں اس قدر غلو کیا کہ ان میں سے بعض کو خدا کا بیٹا کہنے لگے اور ترک دنیا کر کے رہبانیت اختیار کر لی اور ساتھ ہی بتایا کہ دین میں اس بگاڑ کا غلو کی صورت کا سرچشمہ کیا

ہے فرمایا کہ اصل انجیل وغیرہ کتب سماویہ میں اس عقیدہ شریک کیا کہیں پڑ نہ تھا۔ بعد میں یونانی بت پرستوں کی تقلید میں پولوس نے اسے اسی پر سب پل پڑھے اور اسی پر بے شہ۔ ایسی اندھی تقلید سے سمجھات کی توقع رکھنا کسی حائل کو زیبا نہیں ہے۔

اس آیت میں دو باتوں سے منع کیا ہے ایک دین میں ناحق غلو سے اور دوسرے گمراہ قولوں کی پیروی سے۔ غلو کے لیے اصل ارشاد یہ ہے لا تغلوا فی دینکم غیر الحق۔ فلا یغلوا سے مننے بڑھنے زیادہ ہونے کے ہیں۔ دیگر میں ابال اہائے تو پڑھتے ہیں غلت المقدس یہاں غلو کے ساتھ دو قیدیں ہیں ایک فی دینکم اور دوسرے غیر الحق۔ دین میں غلو یہ ہوتا ہے کہ دین میں جس چیز کا جو درجہ تہذیب یا جو وزن اور مقام ہے اس کو بڑھا کر کچھ سے کہہ کر دیا جائے۔ یہ عقائد میں بھی ہوتا ہے اور اعمال میں بھی۔ عقائد کی حد تک جیسے عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بندے اور رسول تھے ان کو انہوں نے خدا کا بیٹا بنایا اور پھر اسے خداوندی کے عرش پر بٹھا دیا۔ حضرت مہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام والدہ تمہیں ان کو نعوذ باللہ خدا کی ماں بنا دیا۔ حضرت جبریل علیہ السلام کے بندے اور فرشتے ہیں ان کو بھی ایک انترم کی حیثیت دے کر خدائی تثلیث میں شریک کر دیا۔ اور اعمال میں غلو یہ ہے کہ جو حکم صرف استحباب و استحسان کا درجہ رکھتا ہے اس کو فرض و واجب کا درجہ دے دیا جائے۔ حضرت مسیح نے دنیا اور دنیوی زندگی کے زخارف سے بچنے کی تلقین کی تو عیسائیوں نے دہشت کا ایک پورا نظام کھڑا کر دیا۔ یہ اور اس قسم کی ساری باتیں غلو میں داخل ہیں اور جس طرح مذہب کے معاملہ میں تعریض ایک بہت بڑا جرم ہے اسی طرح یہ افراط بھی بہت بڑا فتنہ ہے۔ افراط ہر یا غلو، قنطہ ہر یا حدود ان اس سے مذہب کا وہ مزاج جو مرتما سر اعتدال ہے بالکل درہم برہم ہر کہ رہ جاتا ہے اور اس سے وہ خدائی ترکیب و تالیف جو دین کے اجزاء کو حسن و جمال کا ایک دلادینر پیکر بناتی ہے بالکل مسخ ہو جاتی ہے۔ یوں اس غلو میں سائے ایمان مبتلا ہیں لیکن نصاریٰ کو اس میں امامت کا درجہ حاصل ہے۔ ان کی اصل بیماری یہی ہے کہ انہوں نے عقائد و عمل میں غلو کر کے پورے دین کا عملیہ بیگاڑ کر رکھ دیا ہے۔

یہاں علامہ محمد حشری کی یہ نکتہ اخروی خوب ہے کہ غیر الحق کی قید نے یہ بنا دیا ہے کہ غلو بھی دین میں دو طرح کا ہے ایک غلو حق دوسرے غلو غیر الحق۔ غلو حق یہ ہے کہ جو کچھ فرمایا جا رہا ہے اس

حق کے حقائق کی تلاش و جستجو کی جاتے اس کے بعد سے بعید تر معانی پر غور کر کے اس کے منطوق کے ساتھ اس کے مدلول اور اس کے مضمون سے قانونی دفعات کا استنباط کیا جاتے۔ یا حق کے ثابت کرنے کے لیے عقلی دلائل کا سرمایہ فراہم کیا جاتے۔ یہ غور و فکر ہے کیونکہ یہ غور و فکر ہے اور منسلک غیر حق ہے کہ وہ دلائل حق سے ہٹ کر اپنی چاہتوں کے مطابق پیمانہ بنا دیا جاتے۔ دونوں دونوں کے اعتبار سے الگ ہیں اور دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اسے مثالاً یوں سمجھ لیجئے کہ پیمانہ عقیدہ و عمل کا آپ خود بنائیں اور اس کے لیے نبوت کے علم و عمل میں اس کے مذاق کے خلاف دلائل تلاش کریں۔ اور آپ اسے توڑ مروڑ کر اپنے مزعومہ پر چسپاں کریں اور نبوت کے علم و عمل کی کھلی ہدایات سے بے پروا ہو کر اپنے بوقت پر جبے رہیں۔ مثلاً یہی مسئلہ تثلیث ہے۔ اس موضوع پر انجیل کی کھلی اور واضح کفایت آیات کو چھوڑ کر اپنے بولے نفس کے بندے ہو کر پیمانے پر اڑے ہوئے ہیں۔ انجیل پر جمع رہی ہے کہ۔

میشہ کی زندگی یہ ہے کہ وہ تجھ خداوند خداوند اور برحق اور یسوع مسیح کو جسے تو نے بھیجا ہے جانیں۔ (یوحنا باب ۱۷ آیت ۳)

اس سے پرچا کہ سب حکمران میں اولیٰ کلن ملتے ۱۶۔ یسوع نے جواب دیا کہ اولیٰ ہے ۲۰۔ اے اسرائیل سن خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے۔

(انجیل مرقس باب ۱۲ آیت ۲۸)

اے استاد کیا خوب تو نے پوچھا کہ وہ ایک ہی ہے اور اس کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ (مرقس باب ۱۳ آیت ۳۲)

اور جو کلام تم سنتے ہو وہ میرا کلام نہیں بلکہ باپ کا ہے جس نے مجھے بھیجا ہے۔ (یوحنا باب ۱۴ آیت ۲۴)

یسوع نے کیا نکھا ہے کہ تو اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر انوس کہ مسیحی ان نصوص صریحہ کے مخالف ہیں اور تثلیث میں ہکے جاتے ہیں اور ان کا پتہ نہیں مگر پلورسی فنڈر جو ہندوستان میں عیسائیوں کے امام مناظرو مانے جاتے ہیں۔ ان کی کتاب مفتح الاسلام اسکی غلو کا ثبوت ہکا ہے۔ سینے اور ماتم کیجئے۔

یسوع نے اپنی الہیت کا اشارہ کر کے یوحنا کے باب ۸ آیت ۲۳ میں یہودیوں سے ایسا فرمایا ہے کہ تم پستی میں ہو اور میں بلندی پر ہوں۔ تم اس جہان کے رہو میں

اسی جہاں کا نہیں ہوں۔ اور اسی باب کی آیت ۵۸ میں فرمایا ہے کہ ہیشتر اس کے کبراہیم
سویں ہوں۔ اور اس آیت کو بیان کر کے یہ کتاب باب ۱۴ آیت ۵ میں کہا ہے کہ اب
اب تو مجھے اپنے ساتھیوں کے ہلال سے جو میں کو نیا کی پیدا کن سے ہیشتر تیرے ساتھ
رکھتا تھا بندگی سے اور مکاشفات کے پہلے باب کی ۱۱ آیت میں فرمایا ہے کہ میں
اینا اور امکا اول و آخر ہوں۔ اب ان آیتوں میں مسیح صاف بیان کرتا ہے کہ میں
آسمان سے اترا اور ابراہیم سے ہیشتر۔ بلکہ سائے عالم کے پیدا ہونے سے پہلے موجود
اور اول و آخر ہوں جس ظاہر و حیاں ہے کہ مسیح قدیم اور ازلی ہے۔

(مفتاح الامر طبع بنعم)

دیکھا آپ نے کہ کس کس انداز سے آیات کے مطالب کو مسیح کر کے مسیح کی خدائی کا پرچم
لہرائے کی کرشمش ہو رہی ہے یہی وہ غلو باطل ہے جس سے قرآن اہل کتاب کو روک رہا ہے۔
اسی بنیاد پر خداوند صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو دین میں غلو سے منع فرمایا ہے۔ مسند امام احمد
نسائی اور ابن ماجہ میں بحوالہ عبداللہ بن عباس جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔
مسلمانز اتھیں دین میں غلو سے بچ کر رہنا چاہیے تم سے پہلے لوگ دین میں
غلو کی وجہ سے تباہ ہو گئے۔

امام بخاری نے کتاب الانبیاء میں بحوالہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی
نقل کیا ہے۔

میری تعریف میں حد سے ایسے نہ بڑھ جانا جیسے عیسائی حضرت عیسیٰ کی تعریف
میں آگے چلے گئے۔ بلاشبہ میں ایک بندہ ہوں مجھے اللہ کا بندہ اور اللہ کا
رسول ہی کہو۔

عیسائیوں کی تنکلات کا سرچشمہ

دوسری بات جس سے اسی آیت میں اللہ نے اہل کتاب کو روکا ہے وہ یہ ہے کہ گمراہ قوموں
کی پیروی نہ کرو۔ اصل ارشاد یہ ہے لا تتبعوا احوال قوم قد مضوا من قبل۔ اس میں
ارشاد ہے ان گمراہ قوموں کی طرف جن سے عیسائیوں نے غلط عقیدے اور باطل طریقے لیے،
خصوصاً فلاسفہ و زبان کی طرف جن کے تنکلات سے متاثر ہو کر عیسائی اس مراط مستقیم سے ہٹ

گئے جس کی طرف اہلِ حق کی رہنمائی کی گئی تھی۔ مسیح کے ابتدائی پیرو جوعقائد رکھتے تھے وہ بڑی حد تک اس حقیقت کے مطابق تھے جس کا مشاہدہ انہوں نے خود کیا تھا اور جس کی تعلیم ان کے ہادی و رہنما نے ان کو دی تھی مگر بعد کے عیسائیوں نے ایک طرف مسیح کی عقیدت و تعظیم میں غلو کر کے اور دوسری طرف ہمسایہ قوموں کے اودھام اور فلسفوں سے متاثر ہو کر اپنے عقائد کی مبالغہ آمیز فلسفیانہ تعبیریں شروع کر دیں۔ اور ایک بالکل ہی نیا مذہب تیار کر لیا جس کو مسیح کی اصل تعلیمات سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ اس باب میں خود ایک مسیحی عالم و فہیات رولانڈ چارلس اینڈرسن سکات کا بیان قابلِ ملاحظہ ہے۔ انسائیکلو پیڈیا نیکیکس کے پورہ جوبی ایڈیشن میں "یسوع مسیح" کے عنوان پر اس نے جو طویل مضمون لکھا ہے اس میں وہ کہتا ہے۔

"پہلی تین انجیلوں میں مرقس لوقا میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے یہ گمان کیا جاسکتا ہو کہ ان انجیلوں کے لکھنے والے یسوع کو انسان کے سراپا اور جگتے تھے ان کی نگاہ میں وہ ایک انسان تھا ایسا انسان جو خاص طور پر خدا کی روح سے فیض یاب ہوتا تھا اور خدا کے ساتھ ایسا غیر منقطع تعلق رکھتا جس کی وجہ سے اگر اس کو خدا کا بیٹا کہا جائے تو حق بجانب ہے۔ خود مرقس اس کا ذکر برسی کے لیے کی حیثیت سے کرتا ہے اور ایک جگہ بیان کرتا ہے کہ پطرس نے اس کو مسیح تسلیم کرنے کے بعد الگ ایک طرف بے جا کر اسے ملاست کی۔ متی ۱۶-۳۲۔ لوقا میں ہم دیکھتے ہیں کہ واقعہ صلیب کے بعد یسوع کے دو شاگرد اودس کی طرف ہاتھ ہوتے اس کا ذکر اس کی حیثیت سے کرتے ہیں کہ وہ خدا اور ساری امت کے نزدیک کام اور کلام میں قدرت والا نبی تھا۔ لوقا ۱۲-۱۹۔ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ اگرچہ مرقس کی تصنیف سے پہلے مسیحوں میں یسوع کے لیے لفظ خداوند عام طور پر چل پڑا تھا لیکن مرقس کی انجیل میں یسوع کو کہیں اس لفظ سے یاد کیا گیا ہے اور مرقس کی انجیل میں۔ بخلاف اس کے دونوں کتابوں میں یہ لفظ اللہ کے لیے استعمال ہوا ہے۔ یسوع کے ابتداء کا ذکر تینوں انجیلیں پورے زور کے ساتھ کرتی ہیں جیسا کہ اس واقعہ کے شیانِ شان سے مگر مرقس کی فذرہ والی عبارت اور آخری فہج کے مرقہ پر چند الفاظ کو مستثنیٰ کر کے ان کتابوں میں کہیں اس واقعہ کو وہ معنی نہیں پہناتے گئے ہیں جو بعد میں پہناتے گئے ہیں۔

اس کے بعد یہی مصنف لکھتا ہے

وہ سینٹ پال تھا جس نے اعلان کیا کہ واقعہ رفع کے وقت اسی فعل رفع کے ذریعے سے یسوع پورے افعیات کے ساتھ ابنِ اللہ کے مرتبہ پر علانیہ فائز کیا گیا۔

یہ سوال یہاں بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ مسیحیت میں یہ انقلاب یکبارگی آیا یا دیر سے دیر سے؟ اس کا جواب قاضی القضاۃ محمد الجبار بجدالی نے بڑی تفصیل سے دیا ہے۔ یاد رہے کہ قاضی صاحب موصوف پوختی صدی میں ہوئے ہیں اور پانچویں صدی ہجری کے آغاز میں ان کی وفات ہوئی ہے۔ ان کی کتاب تثبیت دلائل النبوة دو جلدوں میں ۱۹۶۶ء میں لبنان میں دارالعرفیہ نے شائع کی ہے اور ڈاکٹر عبدالمحکم شمان نے اس پر تحقیق کام کیا ہے۔ قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ دین مسیحی میں یکبارگی تبدیلی نہیں آئی ہے بلکہ آہستہ آہستہ مختلف نفاذ میں تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ اہل حق کم ہوتے تھے اور باطل کا اطلال کی تعلیم برصغیر میں تھی تاں انکو اہل باطل کا فخر ہو گیا اور حق غم ہو گیا۔

آغاز میں مسیحی ایدھیوں کی عبادت گاہیں مشترک تھیں ایک ہی جگہ غازی پڑھتے اور تہواریں مناتے ہیں۔ مسیح کی ذات کی حد تک ان میں باہم اختلاف تھا۔ دونوں دینیوں کی حکومت میں بہتے تھے۔ عیسائی رومی سرکار سے یہودیوں کی شکایات کرتے تھے۔ رومی حکومت ان شکایات کے جواب میں ان سے کہتی کہ یہودیوں سے ہمارا معاملہ ہے کہ ہم ان کے دین میں مداخلت نہ کریں گے تم اگر ان سے الگ اپنا دینی ڈھانچہ قائم کر لو اور ان سے بالکل الگ ہو کر یہودی طرح مشرق کی طرف منہ کر کے غازی پڑھو اور ہائیز و ہائیز بنو۔ ہمارے طرح کے اختیار کر لو تو ہم تمہاری مدد کر سکتے ہیں اور اس کے بعد یہودی تمہارا بال بھی چمکا کر سکیں گے۔ تم ان سے زیادہ ہمارے یہاں معزز نہ رہو گے ان لوگوں کو جب یہی کہیں ان کرلی قزاقوں نے کہا کہ ہمارے سر پر آوردہ لوگوں اور اپنی کتاب کر لے کر آؤ۔ یہ لوگ اپنے ساتھیوں کے پاس آئے اور صحابہ سے کہانی سنائی اور کہا کہ تم بھی چلو اور اسماعیل بھی لے کر چلو۔ ان لوگوں نے ان صحابہؓ کو اپنے دلوں کو سخت سست کیا اور بتایا کہ تم نے جو کچھ کیا غلط کیا، ہم کسی حال میں بھی اپنا دین نہیں چھوڑیں گے۔ اب ہمارے اور اسماعیل مقدسؑ کے درمیان ہے۔ تم یہ معاملہ کر کے دین عیسائی سے نکل گئے اور مرد ہو گئے۔ اب ہمارے اور تمہارے تعلقات ختم ہیں بلکہ ہمارے دینی ذمہ داری ہے کہ تمہارا معاشرتی بائیکاٹ کریں اور اسماعیل مقدسؑ کو بھی تمہیں ہمارے ہاتھ نہ چمکنے دیں۔ اس طرح دونوں میں ایک عظیم کشمکش پیدا ہو گئی۔ بالآخر معاملہ کرنے والا جتہ رومی سرکار میں حاضر ہوا اور سرکار سے درخواست کی کہ ان ساتھیوں کے مقابلہ میں جلدی نہ کریں اور ان سے ہمیں اسماعیل لے کر دیں۔ سرکار نے ان کے وارنٹ گرفتاری جاری کر دیے یہ لوگ درپوش ہو گئے۔ مرکزی گورنمنٹ نے موصول اور بحیرۃ العرب کے گورنروں سے نام ان کی گرفتاری کے لئے میں سرکار جاری کر دیے، کچھ پکڑے گئے، جا پیے گئے اور قتل کر دیے گئے اور اسی کشمکش میں اسماعیل کے لئے بھی نذر آتش ہو گئے۔ ان سے کیسے ہونے کے بعد ان مسیحیوں کی

میں لگ ہوئی جنہوں نے یہ کار سے معاہدہ کیا تھا اور اس میں یہ طے پایا کہ ایک متبادل اسمبلی ضرور ہونی چاہیے اور اس کے لیے علمی سرمایہ میں طرح فراہم کیا کہ نورات میں انبیاء کی جگہ پیدائش، ان کی عمریں اور تاریخ وفات موجود ہیں اس سے مدد ملتا ہے اور اسمبلی جو کچھ جسے بھی یاد ہے اسے لکھا جاتا ہے اور حضرت کے حلقہ جہنمی باتیں زبانی یاد ہیں ان کو قلم بند کیا جاتا ہے چنانچہ اس طرح کچھ لوگوں نے اس مقررہ خانہ کے مطابق اسمبلی تیار کر لی۔ پھر بعد ازیں کچھ لوگوں نے اور اسمبلیں بھی ہیں۔ اس طرح ایک بعد دیگرے لکھتے لکھتے اناجیل کی تعداد ۱۰۰ ہو گئی۔ اور نقل و اختصار کے بعد چار اسمبلیں قانونی رہی ہیں باقی غیر قانونی ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ ان اناجیل میں کوئی اسمبلی بھی حضرت مسیح کی زبان میں نہیں ہے یعنی اس عبرانی زبان میں جس میں اسمبلی نازل ہوئی تھی جو حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ کی زبان تھی۔ عبرانی زبان کو چھوڑ کر دوسری زبانوں میں اسمبلی کی تدوین ایک گہری سازش کی نشاندہی کر رہی ہے۔ مقصد یہ تھا کہ اس طرح سے دین مسیحی کو بگاڑنے اور مسیح کو کفر کی سازش آسانی سے پایہ تکمیل کی پہنچ سکتی ہے کیونکہ اس دور میں عبرانی زبان دینی سرمایہ کی زبان تھی اور اہل علم کا علمی ڈھانڈا اسی سے وابستہ تھا۔ اس سے ہٹ کر دوسری زبانوں کی آغوش میں مدہ صرف اس لیے لی گئی ہے تاکہ وقت کے اہل علم کی نگاہوں سے اوچھل جائے اور ان کی سازشوں پر پردہ پڑا جائے اور اس طرح ان کو اپنے دیوبی مقاصد کے حصول میں آسانی ہو۔

اس طرح مسائل میں بھی تدبیر کی طوطی پر تیرا دھنا ہوا ہے۔ اسی سلسلہ میں انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے ایک مضمون تاریخ کلیسا کی یہ عبارت بھی قابل ملاحظہ ہے

تیسری صدی عیسوی کے خاتمہ سے پہلے مسیح کو عام طور پر درکلام، اکاجدی ظہور تو مان لیا گیا تھا۔ تاہم بچرت عیسائی ایسے تھے جو مسیح کی الوہیت کے قائل نہ تھے، چوتھی صدی میں اس مسئلہ پر سخت بحثیں پھڑکی ہوئی تھیں جن سے کلیسا کی بنیادیں ہل گئی تھیں۔ آخر کار ۳۲۵ء میں قسطنطنیہ کی کونسل نے الوہیت مسیح کو باضابطہ سرکاری طور پر اصل مسیحی عقیدہ قرار دیا اور مخصوص الفاظ میں اسے مرتب کر دیا۔ اگرچہ اس کے بعد بھی مدت تک جھگڑا چلتا رہا۔ لیکن آخری فتح قسطنطنیہ کے جیسے کہ ہم نے پہلے مشرق و مغرب میں اس حیثیت سے تسلیم کر لیا کہ صحیح العقیدہ عیسائیوں کا ایمان اسی پر مبنی چاہیے جیسے کہ الوہیت کے ساتھ روح القدس کی الوہیت بھی تسلیم کر لی گئی اور اسے اصطلاح کے کلمہ اور راسخ الوقت شمار میں باپ جیسے کے ساتھ جگہ دی گئی۔ اس طرح قسطنطنیہ میں مسیح کو جو تصور قائم کیا گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عقیدہ تثلیث اصل مسیحی مذہب کا ایک جزو لاینفک قرار پا گیا۔

پھر اس دعوے پر کہ بچے کی الوہیت مسیح کی ذات میں جسم بمثل حق ایک دوسرا مسکہ پیدا ہوا جس پر
چوتھی صدی میں اور اس کے بعد بھی مقلد تک بحث و مناظر کا سلسلہ جاری رہا۔ مسئلہ تھا کہ مسیح
کی شخصیت میں الوہیت اور انسانیت کے درمیان کیا تعلق ہے۔ مسئلہ میں کانسٹیڈن کو کونسل
نے اس کا یہ تصفیہ کیا کہ مسیح کی ذات میں دو طبیعتیں ہیں ایک الہی طبیعت دوسری انسانی طبیعت اور
دونوں متحد ہر جہت کے بعد بھی اپنی جدا گانہ خصوصیات بلا کسی تغیر و تبدل کے برقرار رکھے ہوئے ہیں۔
تیسری کونسل میں جو مسئلہ میں تمام قسطنطنیہ ہوتی اس پر اتفاقاً اضافہ کیا گیا کہ دونوں طبیعتیں اپنی الگ
الگ مشیتیں بھی رکھتی ہیں۔ یعنی مسیح بیک وقت دو مختلف مشیتوں کا حامل ہے۔ اسی بیان میں
کیسلا گنا اور فضل کے مسئلہ پر بھی خاص توجہ کی اور سوال مقلدوں زیر بحث رہا کہ نہایت کے معاملہ میں
خدا کا کام کیسے اور بندے کا کام کیا، آخر کار ۱۵۵۳ء میں اورنجی کی دوسری کونسل میں ۱۰۰۰۰ یہ نظریہ اختیار
کیا گیا کہ بہر حال آدم کی وجہ سے ہر انسان اس حالت میں مبتلا ہے کہ وہ نہایت کی طرف کوئی قدم نہیں اٹھا
سکتا جب تک وہ اس فضل خداوندی سے جو اصطلاح میں عطا کیا جاتا ہے نہ نجات دہی حاصل نہ کرے یہ نئی
زندگی شروع کر سکے کے بعد اسے حالت غیر میں استمرار نصیب نہیں ہو سکتا جب تک وہ فضل خداوندی
و اٹھا اس کا مددگار نہ ہے اور فضل خداوندی کی وجہ دائمی اعانت اسے صرف کیتھولک کیسلا ہی کے توسط
سے حاصل ہو سکتی ہے۔

ان تصدیقات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ عیسائیت کی گمراہی کا اصل باعث رومی افکار ہیں الہدائی
نے صاف لکھا ہے۔

هذا التلیث الذی للنصارى قد کانت فلا سفۃ الروم تھو صھو

حضرت عیسیٰ اور داؤد نے لعنت بھیجی ہے

۱۶۵۔ بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے ان پر داؤد اور عیسیٰ امین مریم
لعنت ہو چکی ہے اور یہ اس لیے ہوا کہ وہ اللہ کی نافرمانی کرتے تھے اور حد سے تجاوز کرتے تھے۔ یوں
تو تمام نسب سماویہ میں کافروں پر لعنت کی گئی ہے لیکن بنی اسرائیل کے کافروں پر جب وہ معصیانہ
قرم میں حد سے گزر گئے کہ نہ مجرم کسی طرح مجرم کے ارتکاب سے باز آتا تھا اور نہ حیر مجرم کو مجرم سے
روتا تھا بلکہ سب غیر و مشرک ہو کر رہے تکلف ایک دوسرے کے ہم پیالہ و ہم نوالہ بنے ہوئے تھے
منکرات و فواحش کا ارتکاب کرنے والوں پر کسی طرح کے انقباض و کھلم اور ترغی و ترہی کا اظہار بھی نہ

ہوتا تھا تب خدا نے حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت یسوع علیہ السلام کی زبان سے ان پر لعنت کی ،
جیسے گناہوں پر ان کی جہارت حد سے گزر چکی تھی ، یہ لعنت بھی جو ایسے جلیل القدر انبیاء کے توسط سے کی
گئی۔ غیر معمولی طور پر تباہ کن ثابت ہوئی ہے۔

اب روئے سخن یہی باتوں سے ہٹ کر پھر یہودیوں کی طرف ہرگیا ہے۔ بنی اسرائیل پر لعنتوں
کے لیے قرآن نے یہاں حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ کا حوالہ دیا ہے۔ حضرت داؤد نے زبور میں کئی
دفعہ بنی اسرائیل کی سرکشی اور نافرمانی کا قلم اپنے سوز و گداز کی لے میں کیا ہے۔ زبور ۷۸ میں ہے۔

لے میرے گردہ میری تقسیم پر کلن رکھ ، میرے منہ کی بات کان صحر کے سن

نکاح آنے والی پشت سے وہ فرزند پیدا ہوں جو سیکھیں اور وہ خدا پر توکل کریں اور خدا
کے کاموں کو نہ جھلا دیں بلکہ اس کے حکموں کو حفظ کریں اور اپنے باپ دادوں کی طرح
ایک ایک شریعت اور سرکش نسل نہ ہوں۔ نہ ایسی نسل کہ جس نے اپنا دل مستعد نہ کیا اور ان
کے ہی خدا سے نہ گئے تھے بار جو اس سب کے پھر انہوں نے گناہ کیے اور

اس کے عہد قنوت کے سبب اعتماد نہ کیا لیکن انہوں نے اپنے منہ سے

اس کے ساتھ ریاکاری کی ، اور اپنی زبانوں سے اس سے جھوٹ بولے اور وہ اس

کے حمد میں وفادار نہ رہے کیونکہ ان کے دل ان کے ساتھ قائم نہ رہے کتنی بار

انہوں نے بیاباں میں خدا کے ساتھ بناوت کی اور ویرانہ میں اسے بیزار کیا جس پر ہی

انہوں نے خدا تعالیٰ کو آزمایا اور اسے بیزار کیا اور اس کی شہادتوں کو حفظ نہ کیا ، بلکہ

برگشتہ ہوتے اور اپنے باپ دادوں کی مانند بیوفائی کی۔ وہ ڈیڑھ سو سال کے مانند

ایک طرف پھر گئے۔

زبور ۱۰۸ میں ہے۔

لے میرے لوگو سنو کہ میں تجھ پر گواہی دوں گا۔ لے اسرائیل اگر تو میری سنے گا

تو میرے درمیان کوئی دوسرا معبود نہ ہو تو کسی اجنبی معبود کو سجدہ نہ کرنا ، خداوند تبارک و تعالیٰ

میں ہوں جو تجھے مصر کی مرز میں سے باہر لایا۔ اپنا منہ کھل کر اسے بھر دوں گا۔ پھر

میرے لوگوں نے میری آواز پر کان نہ دھرا اور اسرائیل نے مجھے نہ چاہا۔ تم میں نے

اما کے دلوں کی سرکشی کے بس میں چھوڑ دیا۔
 بہت سے بنی اسرائیل پر حضرت داؤد سے باغی ہو کر لڑنے پر آمادہ ہوئے تھے۔ حضرت داؤد
 نے ان کے متعلق یہ بددعا کی کہ

تو وہ خدا نہیں جو شرارت سے خوش ہو، شریہ تیرے ساتھ نہیں رہ سکتے تو
 سب بد کرداروں سے عداوت رکھتا ہے تو ان کو جو جھوٹ بولتے ہیں ناپرد کر دے گا
 لے خداوند اپنی صداقت میں میرا رہبر ہو، میرے دشمنوں کے سبب میرے
 سامنے اپنی راہ سیدم کر ان کے باطن میں سر اسر کھوٹا دینا ہے لے خدا
 تو انہیں ملزم جان کر ایسا ہو کہ وہ اپنی مشورتوں سے آپ ہی گر جائیں۔ ان کو ان
 کے گناہوں کا کثرت کے سبب نکال پھینک کہ انہوں نے تجھ سے سرکشی کی ہے۔
 حضرت عیسیٰ نے بھی بنی اسرائیل کو لعنت کی اور فرمایا:

لے دیا کا فقیہ اور فریسا: تم پر افسوس کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند
 ہو جو باہر سے بہت اچھی معلوم ہوتی ہیں پھر بہتر مردوں کی قبریوں اور ہر طرح کی ناپاک
 سے بھری ہیں، اسی طرح تم ظاہر میں لوگوں کو راست باز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں
 دیا کا اور شرارت سے بھرے ہو۔ لے دیا کا فقیہ اور فریسا: تم پر افسوس کیونکہ
 نبیوں کی قبریں بناتے ہو اور راست بازوں کی گوری سنو اتے ہو اور کہتے ہو کہ اگر
 ہم اپنے باپ دادوں کے دلوں میں ہوتے تو نبیوں کے خون میں شریک نہ ہوتے۔
 اسی طرح تم اپنے اوپر گراہی دیتے ہو کہ تم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہو پس اپنے
 باپ دادوں کا پامانہ بھرد لے ساں پو! اور لے ساں پو! کے بہتو! تم جہنم کے خدا
 سے کیوں کر بھاگو گے۔ (متی ۲۳، ۲۴، ۲۵)

برائے بول باز آنے کا احساس رہا

۱۶۶۔ وہ برائی سے آنکھ کے ہمد باز آتے تھے۔ اصل ارشاد میں لایتنا ہوتا ہے۔ اس
 کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ نہیں کہتے تھے کمالی روح المعانی، دوسرے یہ کہ نہیں روکتے
 تھے کما ہوا المشور، سب بدی کسی قوم میں پھیل جائے اور نہ کئے لڑنے والا کوئی نہ ہو تو عذاب عام
 کا اندیشہ ہے بلکہ یہ بھی اٹھتے ہوئے سوال کا جواب ہے۔ عصیان و عدوان کو سن کر مخاطب کے

ذہن میں غش ہوئی کہ اس کی صورت کیا۔ ارشاد فرمایا کہ اس طرح کہ برائیوں میں پڑ کر پھر اس سے باز آنے کا احساس ان میں باقی نہیں رہا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب اُسمت کی حالت ایسی ہو جاتے کہ برائیوں میں پڑ کر پھر ان سے باز نہ ہونے کا احساس اور ولولہ نہ پیدا ہو اور اپنی حالت پر قانع ہو جاتے تو اس بات کا خبرت ہے کہ برائی اور شقاوت کی انتہائی حالت پیدا ہو گئی۔ یہ ٹھیکہ ان کے جرائم کی سنگینی پر کم کر کے بنا رہا ہے کہ وہ صرف جرائم کا ارتکاب ہی نہ کرتے تھے بلکہ اس سے انبیا۔ اور راست بازوں کے روکنے کے باوجود باز آتے تھے اور ان کے روکنے کی کوششوں کو بالکل خاطر میں نہ لاتے بلکہ ان کے دشمن ہو جاتے۔ کسی قوم کی اخلاقی برابری اور ایمان میں منہاسی کی بھی وہ حد ہے جس پر پہنچ کر وہ اللہ کی لعنت کی مستحق ہو جاتی ہے۔

کچھ شارحین قرآن نے یہاں لافظ ہون کے نہیں روکتے تھے کے معنی لکھے ہیں لیکن ہماری رائے میں اس کے معنی نہیں رکھتے تھے، سیاق و سباق اور لغت کے زیادہ مناسب ہیں۔ دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ برائیوں کے دلدل میں اس طرح چلنے گئے تھے کہ باوجود اس کے روکنے والے ان کو روکتے تھے مگر وہ روکتے ہی نہ تھے۔ گویا برائی ان کی طبیعت بن گئی تھی۔ اسی بنا پر قسم کھا کر ان کے اس کردار کی مذمت کی ہے لیس ماکانوا یفعلون، دوسری صورت یہ ہے کہ ان کو برائیوں پر روکنے والا ہی کوئی نہ تھا اور لورا کا لورا معاشرہ برائیوں میں گھر گیا تھا۔ دونوں معنی صحیح ہیں اور آیت میں دونوں معنی کی گنجائش ہے۔

یہود کی اخلاقی پستی کی انتہا

۱۶۶۔ اے پیغمبر تم دیکھو گے کہ ان میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو کفر کرنے والوں سے مدد و قوت کا رشتہ رکھتے ہیں کیا ہی برا سامان ہے جو انہوں نے اپنے لیے آگے روا کیا ہے۔ ان کے خلاف اللہ کا غضب ہوا اور وہ ہمیشہ عذاب میں رہنے لگے ہیں۔ غالباً اسی لغت کے نتیجہ میں ان میں سے بہت افراد ظاہراً باطناً بندہ و خنزیر کی شکل میں مسخ کر دیے گئے اور باطنی مسخ کا دائرہ تو ان قدر وسیع ہوا کہ ان کے بہت سے لوگ آج بھی ان مسلمانوں کو چھوڑ کر جو خدا کی تمام کتب سماد تمام انبیاء کی تصدیق و تعظیم کرتے ہیں۔ مشرکین مکہ سے جو بہت پرست اور نبوت وغیرہ سے جاہلی محض ہیں مسلمانوں کے خلاف دوستی کاٹھتے ہیں۔ اگر ان اہل کتاب کو خدا پر اور وحی الہی پر واقعی اعتقاد ہوتا تو کیا یہ ممکن تھا کہ اس قوم کی ضد میں جو ان تمام چیزوں کو مکمل طور پر مانتے ہیں بت پرستوں

سے سالانہ ڈکوتے، یہ سہ حس اور بدذاتی اور غلبہ ستوں سے بھاگ کر بت پرستوں سے دوستی کرنا اسی لعنت اور پشکار کا آخر ہے جس نے انہیں خدا کی رحمت غلیظہ کے کوسوں دور کر دیا ہے۔ پچھلی آیات میں ان کی گزشتہ کمزریات اور جرائم کو بیان کیا تھا اور اب ان کے ملعون ہونے کے آثار کو بیان فرمایا تاکہ اب بھی اپنی ملعون حرکات سے باز اگر حق و صداقت کے راستے پر چلنے کی کوشش کریں، اس پر کرم میں ان کی موجودہ حالت پر غصہ کرتے ہوئے بتا دیا کہ واقد اور مسیح علیہما السلام کی زبانی جو لعنت ہوتی تھی اس کے آثار آج تک موجود ہیں۔ اہل انشاء اور عارفین سے لغزت و عداوت اور جاہل مشرکوں سے محبت یہ مکمل دلیل اس کی ہے کہ ان کے قلوب خدائی لعنت کے اثر سے مسوخ ہو چکے ہیں۔ اگر وہ بھی انہیں نے اپنی حالت کو نہ سمجھایا اور حق کی طرف رجوع نہ کیا تو ایسی شدید لعنت کے مورد بنیں گے جو خود تعالیٰ خاتم المرسل کی زبان سے ان پر بھیجے گا۔ یہاں کافروں سے مراد مشرکین ہیں اھل ان آیات کا مصداق یہود مدینہ میں جنہوں نے مشرکین مکہ کے ساتھ سازش کر کے مسلمانوں سے لڑائی کی تھی۔

اس آیت میں یہود کی اخلاقی پستی کی یہ انتہا بیان ہوئی ہے کہ وہ مشرکین تک اہل ایمان کے مقابلے میں دوستی و اعتماد کے منایات گہرے تعلقات رکھتے تھے اور ان کو مسلمانوں سے زیادہ ہدایت یافتہ مانتے تھے۔ یہ گراؤ اور پستی اخلاقی کی انتہا ہے۔ یہ انطباق انگیز تبدیلی جو یہود کی ذہنیت اور نفسیات میں ہوئی تھی کہ ان میں اصول صداقت کے مقابلے میں منافع و مصالح اور اہل کے مقابلے میں عاجل کو اور ایمان کے مقابلے میں کفر کو ترجیح دینے کا مرض پیدا ہو گیا تھا۔ یہی گریبان کے ملعون ہونے کے اسباب تھے۔

ایمان و کفر میں تضاد ہے

۱۶۸۔ اور اگر وہ فی الواقع الزکوٰۃ، الزکوٰۃ کے رسول کو، رسول پر نازل شدہ کتاب کو ماننے والے ہوتے تو مشرکین کو مددگار اور دوست نہ بنتے لیکن ان میں اکثریت ایسی ہے جو جادہ حق سے ہٹ ہوئی ہے۔ البتہ سے آیت میں مراد بعض منافقین نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اور بعض نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو لیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ان یہود کو واقعی یقین حضرت موسیٰ

کی صداقت اور تعلیمات پر ہوتا تو نبی آخر الزمان کے مقابلہ میں جن کی بشارت خود حضرت موسیٰ نے دی تھی مشرکین سے دوستی نہ کرتے یا یہ کہ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر مخلصانہ ایمان لے آتے تو ایسی حرکت ان سے سرزد نہ ہوتی کہ دشمنان اسلام سے ساز باز کریں اس دوسری صورت میں آیت کا مصداق منافقین یہود ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ خدا، نبی اور کتاب کے ماننے والے ہوتے ہیں انہیں فطرۃً مشرکین کے مقابلے میں ان لوگوں سے زیادہ ہمدردی ہوتی ہے جو مذہب میں خواہ ان سے اختلاف ہی رکھتے ہوں مگر بہر حال ان ہی کی طرح خدا اور سلسلہ وحی و رسالت کو مانتے ہوں لیکن یہ یہودی عجیب قسم کے اہل کتاب ہیں کہ تو حید اور شرک کی جنگ میں کلمہ کھلا مشرکین کا ساتھ دے رہے ہیں۔ اقرار نبوت اور انکار نبوت کی لڑائی میں علانیہ ان کی ہمدردیاں منکرین نبوت کے ساتھ ہیں اور چہرہ بھی وہ بلا کسی شرم و حیا کے یہ دعویٰ رکھتے ہیں کہ ہم خدا اور پیغمبروں اور کتابوں کے ماننے والے ہیں بلکہ آیت میں بتایا ہے کہ اگر ان کا واقعی اللہ، رسول اور نبوت کی ہدایات پر ایمان ہوتا تو وہ بڑی اور مفاد کشی کو نہ اپناتے اور دنیوی ترقی اور مادی فوائد ان کا منہ لے نہ لیتے۔ اصول و اخلاق اور منافع و فوائد کے مقابلے میں اپنی اہمیت نہ کھوتے اور ایمان کے مقابلے میں کفر صریح کو نہ ترجیح دیتے۔ بہر حال اسلام کے خلاف عداوت کے جنون نے ان کو انتہائی پستی میں گرا دیا تھا۔ یہاں تک کہ اہل کتاب ہونے کے باوجود مشرکین سے دوستی و رفاقت رکھتے تھے گویا ان کا تصور حق و صلاقت ہی تبدیل ہو گیا تھا اور اہل کتاب ہونے کا دعویٰ محض فحاشی جس کی حقیقت کوئی نہ سمجھتا۔ دین سے ان کو جو کچھ محبت تھی وہ صرف اپنے وطن کے بچانے تک محدود تھی، اس کے نتیجے میں ان میں اتباع حق کی جگہ جتنا بندی اور گروہ پرستی کی روح پیدا ہو کر حق و باطل کا امتیاز باقی نہیں رہا تھا۔ مگر وہی تعصب چاہتا ہے کہ جس طرح بھی بنے اپنی بات بنائی جاسے اور مخالف گروہ کو ذک پہنچائی جائے۔ اگر ایسا کرنے میں اسے خود اپنے اصولوں اور عقیدوں کے خلاف بھی جانا پڑے تو بلا تاویل چلا جائے، یہی حال مدینے کے یہودیوں کا تھا وہ ہمیشہ بت پرستی کے مخالف رہے اور بت پرستوں کی تحقیر کرتے رہے لیکن اب اہل ایمان کی ضد میں اگر بت پرستوں سے دوستی و رفاقت کرتے بلکہ بت پرستوں کی تعریف کرتے اور رکھتے کہ ہاد لاء

اھدی من الذی امنوا ان مسلمانوں سے تو مشرکین ہی زیادہ ہدایت یافتہ ہیں۔ اسی بنا پر قرآن نے کہا تھا کہ اولئك الذین لعنہم اللہ ہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے۔ یعنی یہ لوگ جہنم لے اہل کتاب ہو کر افراسنائی کی وجہ سے طریق کفر کو اسلامی شاہراہ ہدایت سے افضل بتایا ہے ان پر خدا کی لعنت ہے۔

الحمد للہ معالم القرآن کی چھٹی جلد آج مورخہ ۱۰ جمادی الاول ۱۴۲۹ھ مطابق ۱۶ اپریل ۲۰۰۸ء بھر کے روز بوقت ۹ بجے شب اللہ تعالیٰ کی توفیق سے مکمل ہوئی۔
مرحب تعبتل منی انت انت السميع العليم

